۲۵ —— ۲۶

قیمت
۵ روپے

شائع کردہ:۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی۵

اس شمارہ کی ساری کہانیاں طبعزاد اور غیر مطبوعہ ہیں !!

ترتیب

ادارہ

ثناء اللہ
قمر سلطانہ

ثناء اللہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے مطبع سعیدی قرآن محل سے چھپوا کر دفتر نیا دور پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ سے شائع کیا۔

اداریہ

بابائے اُردو .....

'ہندی مسلم ثقافت' سے (سمبل کے طور پر) دو چیزیں ہمیں ورثہ میں ملی ہیں — ایک 'تاج محل' اور دوسری اردو زبان۔ یہ دونوں چیزیں ہماری تہذیبی روایات کی وہ بنیادیں ہیں جن پر ہمیں اپنی قومی تہذیب کی عمارت کو وسیع تر اور بلند تر کرنا ہے۔ اس پر نہ کسی اختلاف کی گنجائش ہے اور نہ کسی قسم کے تذبذب کی۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل ہی ہم اس بات کو تسلیم کر چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ایک طرف ہم اپنی تہذیبی روایات میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے اور دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ نے اردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنا لیا تھا۔ اس تعلیم یافتہ طبقہ نے اردو زبان کی سرزمین میں نئے نئے پودے لگائے جنہوں نے اپنے اپنے طور پر خوب خوب پھل اور پھول دیئے۔ اس زمانہ میں اردو زبان میں لکھنا، بولنا اور پڑھنا ایک قابل فخر بات تھی جس میں اپنی قومی روایات سے وابستگی کا شدید احساس موجود تھا۔ وہ لوگ بھی اردو میں لکھتے تھے جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ پاکستان بننے کے بعد سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ تہذیبی اعتبار سے ہم اپنے موقف سے پھر ہٹنے لگے ہیں۔ اور اب چودہ سال میں پھر اسی جگہ آ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی پھر سے قدم جما رہی ہے۔ اس کی اہمیت معاشی و تہذیبی اعتبار سے روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بیک وقت دولت، عزت اور شہرت کا ذریعہ ہے۔ اب ابتدائی تعلیم بھی بچے اسی زبان میں حاصل کر رہے ہیں۔ ماں باپ بچوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ آجکل تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر جس زبان میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہا ہے اس میں آدھے الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں اور آدھے اردو کے۔ اس قسم کی زبان استعمال کرنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ یہ تعلیم یافتہ طبقہ اس سلسلہ میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ان کے خیالات کا اظہار اردو میں چونکہ ممکن نہیں ہے اس لئے مجبوراً انہیں انگریزی الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اور اس صداقت کی نوعیت کیا ہے؟ زبان کا مسئلہ کچھ ایسا ہے کہ کوئی بھی زبان، خواہ وہ مادری زبان ہو یا نہ ہو، محنت سے سیکھے بغیر نہیں آتی۔ جب بچپن سے ہمارے بچے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کریں گے اور اُردو

کو ایک حقیر زبان سمجھ کر پڑھیں گے تو ایسے میں، ظاہر ہے کہ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی اسی زبان کا ہوگا جس کو وہ برتر و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ان کی قوتِ اظہار اردو کے مقابلہ میں انگریزی میں زیادہ بہتر ہوگی۔ یہ بات دوسری ہے کہ عمر بھر انگریزی میں تخلیقی کام کرنے کے باوجود ان کا کوئی کارنامہ قابلِ قدر شمار نہیں ہوتا۔ بہرحال ان سطور میں ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انگریزی زبان لکھنے، پڑھنے اور بولنے کا رجحان ایک بار پھر زور پکڑ گیا ہے اور ہم اس وقت یہ سمجھ رہے ہیں کہ صرف یہ زبان ہمارے سارے معاشی، سیاسی، دفتری اور تہذیبی مسائل کا حل ہے۔ اس وقت سارے معاشرہ میں یہ رجحان عام ہے کہ وہ قابل و زیرک ہے جو روانی کے ساتھ انگریزی بول سکتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر مرعوب ہوتے ہیں۔ اسے اونچی کرسی پر بٹھلاتے ہیں اور وہ جو زیادہ روانی کے ساتھ اردو پڑھ اور لکھ سکتا ہے حقیر و نقیر ہے۔ اعلیٰ ملازمتیں، اعلیٰ امتحانات، اور اعلیٰ عہدے سب انگریزی کے دامن سے وابستہ ہیں۔ ہمارے ہاں کا اعلیٰ طبقہ صرف انگریزی بولتا ہے اور صرف اسی زبان کو اپنی ضروریات کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ بات آپ ہم سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ یہ امر سارے معاشرہ اور اس کی تہذیبی یک جہتی کے لئے کس درجہ خطرناک ہے اگر اعلیٰ طبقہ اپنی زبان کو ترک کر کے کسی بیرونی زبان کو استعمال کرنے پر فخر محسوس کرنے لگے۔ تہذیبی عوامل کے ماہر اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ معاشرہ اس منزل پر پہنچ کر مستقل بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس معاشرہ سے وحدتِ فکر و عمل غائب ہو جاتے ہیں —— ایک طرف تو ہمارے ہاں تہذیبی سطح پر یہ عمل ہو رہا ہے اور دوسری طرف ہم قومی کلچر کی تلاش و جستجو میں بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ اور قومی کلچر ہے کہ ہم سے روز بروز سایہ کی طرح دور ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا دیر کو بھی ہماری توجہ اس طرف مبذول نہیں ہو رہی ہے کہ قومی وحدت کی اساس و بنیاد کسی معاشرہ کی قومی زبان پر قائم ہے۔ کسی معاشرہ کا مخصوص اندازِ فکر، احساس اور طرزِ عمل کا اظہار اور اس کا تحفظ صرف اس معاشرہ کی قومی زبان کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اور جب زبان کی نہ تو حفاظت کی جا رہی ہو، جیسا کہ ہمارے یہاں ہو رہا ہے، اور نہ اسے معاشرہ میں کوئی اہمیت دی جا رہی ہو اور نہ اسے تہذیبی و معاشی مسائل کے حل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہو اور نئی تعلیم یافتہ نسل اپنی صلاحیتوں کے دھارے کسی غیر زبان کے سمندر میں ڈال کر ضائع کر رہی ہو تو قومی فکر، قومی احساس اور طرزِ عمل کا اظہار کیسے اور کہاں ہو سکتا ہے؟

یہ تو ہمارا خیال ہے جس سے آپ بزعمِ خویش اتفاق نہیں کریں گے۔ اب آیئے ذرا دیر کو مغربی فلسفیوں سے بھی رجوع کرتے چلیں کہ علمائے مغرب بیچ اس مسئلہ کے کیا فرماتے ہیں؟ ہماری نظر اس وقت نورتھروپ پر پڑتی ہے، جو ییل یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر ہے اور "دی میٹنگ اوف ایسٹ اینڈ ویسٹ" کا مصنف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ——

"مغربی دنیا سے طرزِ زندگی درآمد کرنے کا مسئلہ خواہ یہ طرزِ زندگی امریکہ سے درآمد کی جائے یا روس سے، ایک خطرہ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس سے خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ایشیا والے خود اپنے کلچر سے منقطع ہو گئے ہیں اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو ایشیا والے وہ رہے جو اصل میں وہ تھے اور نہ وہ مغرب کی سائنسی، فلسفیانہ، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر مضبوطی سے اپنے قدم جما سکے جو مغرب کے آلات، اشیاء اور خیالات کو پورے طور پر سمجھنے اور برتنے کے لئے ضروری تھا کہ جس سے ایشیا والے نہ ادھر کے رہے اور نہ اُدھر کے۔ وہ مشرق و مغرب کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ لوگ مشرقی اور مغربی دونوں اعتبار سے بالکل سطحی ہو گئے ہیں — اتنے سطحی کہ وہ کچھ بھی نہیں رہے۔"

اس بات کے آئینہ میں ذرا اپنے معاشرہ کو دیکھئے تو آپ کو اسی قسم کی تصویر نظر آئے گی۔ ہمارا نیا تعلیم یافتہ طبقہ اسی سطحیت کا شکار ہے۔ وہ اپنی تہذیبی روایات سے بے خبر ہے اور اپنی صلاحیتوں کو اسی سطحی انداز پر مغرب کی نقل پر ضائع کر رہا ہے۔ یہی درآمدی مال اس کا سرمایۂ حیات ہے۔ جب سارے معاشرہ کا یہ حال ہو تو ایسے میں قومی یک جہتی کی ساری کوششوں اور قومی کلچر کی پیدائش کی ساری کاوشوں کا وہی حشر ہونا لازمی ہے جو ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔ قوم تو ایک ایسے 'سماج' کا نام ہے جو ایک وحدت کے طور پر ردعمل کا اظہار کرتی ہے جس کا اپنا آدرش ہوتا ہے جس کا اپنا طرزِ فکر اور اندازِ نظر ہوتا ہے۔ جو اپنی روایات پر پورا ایمان رکھتی ہے اور اس کی ان سب چیزوں کا اظہار ہر سطح پر اس کی اپنی زبان میں ہوتا ہے۔ جو زبان کو بناتی اور سنوارتی بھی ہے اور اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر ہمارے ہاں بحیثیت مجموعی کیا آدرش ہے جسے حاصل کرنے کے لئے ہم انفرادی و اجتماعی طور پر کوشاں ہیں؟ اس کا جواب دینے والے یہ جواب دیں گے کہ خوشحال زندگی۔ لیکن یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا خوشحال زندگی بغیر کسی طرزِ عمل اور بغیر کسی آدرش اور وحدتِ فکر و عمل کے وجود میں آسکتی ہے؟ کیا "لفظوں کا بنا ہوا" قانون ہماری زندگیوں میں نئے معنی پیدا کر سکتا ہے؟ کسی معاشرہ کا کوئی قانون، کوئی معاشی، سیاسی یا تہذیبی ادارہ اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتا جب تک آدرش کی سطح پر اس معاشرہ میں وحدت موجود نہ ہو۔ تہذیبی سطح پر آدرش کی اہمیت یہی ہے کہ وہ سارے معاشرہ کے اندر لگن اور کارکردگی کا ایسا انتھک جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ فرد کو سارے معاشرہ کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں ایک نیا لطف اور زندگی میں ایک نئے معنی نظر آنے

لگتے ہیں۔ یہی وہ وحدت ہے جو ایک طرف معاشی و سیاسی مسائل کو حل کرتی ہے اور دوسری طرف قوم کو فکر و عمل کی یک جہتی کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیتی ہے۔ اور اسی کی کوکھ سے قومی تہذیب کی انفرادیت جنم لیتی ہے جس میں اس قوم کی زبان۔ سب سے اہم کردار بن کر اس کے آدرش اور فلسفہ کا ہر سطح پر مکمل ذریعۂ اظہار بن جاتی ہے۔

ممکن ہے آپ اسے ہماری ذاتی پاس پرستی سے منسوب کریں لیکن ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ اس کے بغیر قومی یک جہتی، قومی تہذیب اور قومی وحدت ایک دیوانے کے خواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کیا ہمارے اہلِ فکر اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے؟ ——————

سیتا ہرن

قرۃ العین حیدر

۱

وہ دوپہر بھی ہمیشہ کی طرح بڑی عام سی دوپہر تھی جب ڈاکٹر ستیہ مرچندانی کو معلوم ہوا کہ جمیل نے دوسری شادی کر لی۔ گھڑی اسی طرح ٹک ٹک کر رہی تھی۔ نومبر کے آسمان پر پرندے اسی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔ ایشین تھیٹر انسٹی ٹیوٹ میں لڑکیاں اور لڑکے "بچوں کے تھیٹر" کی کلاس میں اسی طرح کتھا کلی یا بھرت ناٹیم سیکھ رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں اسی طرح "دیہاتی تھیٹر" پر لیکچر دیا جا رہا تھا۔ نئی دلی کی سڑکوں پہ بسیں اسی طرح چل رہی تھیں۔ وہ للتا سے ملنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ تین بجے اسے ہما کے یہاں پہنچ کر شہزاد کے ہمراہ "مدرا راکشس" کی ریہرسل میں جانا تھا۔ رات کو ماڈرن تھیٹر کے اراکین نے اپنے سرڈول سین کے یہاں کھانا کھانے کے لئے مدعو کیا تھا (زندگی کتنی مصروف تھی اور کتنی خالی تھی) ڈھائی بجے وہ متھرا روڈ سے بس میں بیٹھ کر گولف لنک روڈ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ ٹھیک تین بجے آ کر پہلی کوٹھی [illegible] بجری والی طویل سڑک پر پہنچی تھی۔ "پہلی کوٹھی" کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو ملو مہر کرتی "پہلی کوٹھی" کے گارڈن ہاؤس کی گیلری میں داخل ہوئی تھی۔ دروازے کے باہر شہزاد کا کمرہ تھا۔ اس نے پردے میں سے دیکھا تھا کہ شہزاد آتش دان کے سامنے مزے سے ستار بجا رہا تھا۔ وہ ہما کے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب گیلری کے دوسرے فون کی گھنٹی تھرانا شروع ہوئی۔ فون بہت دیر سے بج رہا تھا۔ اور بیچ میں چند لمحوں کے لئے رک گیا تھا۔ شہزاد نے سوتی سوتی آواز میں جھنجھلا کر پکارا تھا۔ "ارے بھئی کوئی فون کیوں نہیں اٹھاتا۔" اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا تھا۔ اس وقت تین بجا تھا۔ دوسرے سرے پر بلقیس زور زور سے کہہ رہی تھی۔ "ہما۔ کیا ستیہ تمہارے یہاں پہنچ گئی ہے؟"

"جی — بلقیس — میں ستیہ بول رہی ہوں۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"ارے تم بڑی جلدی پہنچ گئیں۔ خاص بات —؟ اوہ — ارے با با ہا — آج بڑا مزا آیا —" دیپ نے کامران سے کہا —"

"بلقیس تم نے اس وقت مجھے کیوں فون کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔ ایسے ہی ۔۔۔" بلقیس کی آواز معمول سے زیادہ پرسکون تھی "سیتی بی بی۔ میں نے سوچا ذرا معلوم کروں آج کی خبریں کیا ہیں۔ تم نے دت کو تعزیت کا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟" اس کے بعد کوئی بیس منٹ تک بلقیس نے شہر کی تفریحی گوسپ کی تھی۔ ڈرامہ سیزن شروع ہو چکا تھا اور شہر کے تیس چالیس ڈرامہ گروپ بھانت بھانت کے ڈرامے اسٹیج کرنے میں جٹے تھے۔

اب ساڑھے تین بج چکا تھا۔ سیتا نے عاجز آ کر کہا تھا "۔۔۔ ڈیئر ۔۔۔ کیا تم نے مجھے یہ سب بتلانے کے لئے فون کیا ہے؟"

"ارے نہیں ۔۔۔ وہ ۔۔۔"

"نیو یارک سے کوئی خط آیا ہے؟"

"ہاں" بلقیس کی آواز کا مصنوعی جوش یک لخت مدھم پڑ گیا۔

"کیا بات ہے بلقیس ۔۔۔؟"

"جمیل بھیا نے ۔۔۔ جمیل بھیا نے شادی کر لی ۔۔۔"

گھڑی کی ٹک ٹک۔ شہزاد نے زور سے کروٹ بدلی اور اس کے پلنگ کے اسپرنگ بج اٹھے۔ باہر عنابی گلاب کی کیاریوں کے پاس ہما کا بچہ نہیوں نہیوں کرکے رویا۔ کھانے کے کمرے میں لشٹن سنگھ نے کھٹاک سے الماری بند کی۔

"کیا ہے ۔۔۔؟" سیتا نے اس طرح پوچھا گویا اندھے کنوئیں میں سے بول رہی ہے۔

"کوئی کونٹیننٹل لڑکی ہے ۔۔۔" میلوں دور چانکیہ پوری میں بلقیس کے گھر کی زندگی بھی معمول کے مطابق جاری تھی۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ چائے کے برتن کھنکھنا رہے تھے۔ چھوٹی خالہ رام اوتار پر بگڑ رہی تھیں۔ ڈرائینگ روم میں بلقیس کی بڑی بھانجی فرشتہ ۔۔۔ ٹیپ ریکارڈ چلا رہی تھی ۔۔۔ "تمام عمر غمزہ و ادا کا شکار ۔۔۔ دروازہ کھلا رہے ۔۔۔ خاموش! ارے بولے مت چلے جائیں ۔۔۔ واہ واہ بہت خوب۔ کیا بات ہے ۔۔۔ غمزہ و ادا کیا ہے ۔۔۔ ارے بھئی دوبارہ پڑھئے گا ۔۔۔ تمام عمر رہا ۔۔۔"

یہ غزل بلقیس کے یہاں چند روز ہوئے کسی شاعر نے ترنم سے پڑھی تھی۔ اور سیتا کو بہت پسند تھی۔

ان سب آوازوں میں مل کر بلقیس کی آواز صاف سنائی نہیں دی۔

"ذرا زور سے بولو بھئی تمہارے یہاں بہت رولا مچ رہا ہے" سیتا نے تقریباً چلا کر کہا تھا۔

"ایک کونٹیننٹل لڑکی ہے۔ تفصیل معلوم نہیں صرف اتنا ہی لکھا ہے۔ یو۔ این میں ان کے دفتر میں

کام کرتی ہے ــــ کوئی ہوگی ــــ ارے منظر بھیا ــــ میرے سر پر کیوں جھول رہے ہو۔ باہر جا کر کود و۔
ــــ ارے ہاں کوئی ہوگی ویٹرس یا ٹائپسٹ۔ کم بخت ــــ"

"وہ میری طرف سے ایلزبتھ ٹیلر سے بیاہ کرلیں مجھے کیا مطلب ــــ" ستیا نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ اب وہ فون کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر ٹک چکی تھی۔ گیلری بہت تاریک تھی۔ اور غیر معمولی طور پر سرد۔

"اس میں صرف ایک قباحت ہے ستیا ڈیئر ــــ ایلزبتھ ٹیلر تو بیاہ رچا چکی ہے اور شاہ پرنسس مارگریٹ کے بھی آج ہی کل میں ہاتھ پیلے ہونے والے ہیں۔ ساری دنیا میں یہی دو لڑکیاں انہیں پسند تھیں۔ اور نمبری نرگس۔ تو وہ بھی حال ہی میں اپنے گھر بار کی ہو چکی ــــ"

بلقیس انور علی ملک کی چوٹی کی اسٹیج ایکٹرس ہونے کے ناطے اب پھر بڑی نارمل آواز میں بات کر رہی تھی۔ پچھلے سال اس نے بمبئی کی انڈین اکیڈیمی آف ڈرامیٹک آرٹ سے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ اس سال اسے دہلی ناٹیہ سنگھ کی طرف سے بہترین ایکٹرس ہونے کا ایوارڈ ملا تھا۔ ماڈرن تھیٹر کی اگلی پیشکش میں رہ غضب کی المیہ اداکاری کرنے والی تھی۔ پھر وہ اپنی آواز سے کس طرح ظاہر ہونے دیتی کہ دراصل کیا سوچ رہی ہے۔

"بلقیس ــــ"

"ہاں بھائی ستیا ــــ"

"تم اس قدر رنگین کیسے ہوسکتی ہو ــــ اچھا میں ذرا ہما سے مل لوں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔ ــــ بائی ــــ"

"بائی ستیا ــــ"

۲

بلقیس نے ریسیور رکھ دیا اور لاونج میں سے گذر کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ درمیان والے کمرے میں چھوٹی خالہ فاسی شال میں سر سے پاؤں تک لپٹی تسبیح پڑھتی آئے ہوئے کسی رشتہ دار سے باتوں میں مصروف تھیں۔ پچھلے لان پر بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اواخر خزاں کا سورج بہت دھندلا دھندلا ذرد شیشوں میں سے جھانک رہا تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر بلقیس نے سنگھار میز پر سے خط اٹھایا جو کلینکس کے ڈبے پر آدھا کھلا پڑا تھا۔ اسٹول پر ٹک کر اس نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کے چھیتے خالہ زاد

بھائی نے ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد آخر میں صرف ایک پیرا اور لکھا تھا ـــــ

"ـــ میں نے پچھلے اتوار کو ایک اسپینش لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ میرے ہی سیکشن میں کام کرتی ہے۔ بہت معقول لڑکی ہے۔ انٹلکچوئل نہیں ہے۔ اسمتھ کالج کی تعلیم یافتہ ہے جو یہاں کا بڑا سخت اسٹوکریٹک کالج ہے۔ چنانچہ اطمینان رکھو تمہاری بھاوج شاپ گرل نہیں جو تم نٹو لڑکیوں کا راسخ عقیدہ ہے کہ تمہارے تخلف بھائی لوگ مغرب میں آکر شاپ گرلز اور بقول تمہارے دھوبنوں کو سمیٹ لاتے ہیں ـــ واقعی !! تم لوگ کس قدر زبردست اسنوب ہو! بہرحال۔ تصویر آئندہ بھیجوں گا۔ کارمن خوبصورت نہیں مگر ساری پہن کر بالکل ہندوستانی لگے گی۔ کیونکہ تو آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال ـــــ وغیرہ۔ یہ بات اماں کو بتا دینا۔ راہل اچھی طرح ہے۔ کارمن سے ابھی سے بہت ہل گیا ہے۔ اور خوب موٹا ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ سے میں کل ہی کارمن کے ساتھ اس کے سکول گیا تھا۔

"تم اگلے سال فال کے زمانے میں یہاں آؤ جب مشرقی ساحل کے شاندار جنگل سرخ پتوں کی آگ سے بالکل دہک اٹھتے ہیں۔ سنا ہے تم کو یہاں آکر ایکٹنگ سیکھنے کے لئے اسکالرشپ مل گیا ہے۔ کب تک آرہی ہو ـ ؟ ہم لوگ کرسمس کے لئے بوسٹن جائیں گے۔"

سیتا کے متعلق اسنے ایک لفظ نہیں لکھا تھا۔

سیتا جو اس کے بیٹے راہل کی ماں تھی۔

۱۹۵۵ء میں بلقیس کے پاس جمیل کا خط اسی نیویارک سے آیا تھا۔ اس روز بھی وہ اسی طرح ایک ریہرسل کے لئے باہر جانے والی تھی۔ یہی سب لوگ تھے۔ یہی دنیا۔ یہی مصروفیتیں، اور چند گھریلو باتوں کے بعد اسنے آخر میں لکھا تھا۔

"ـــ اور کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں ـــ

ہاں ایک چیز البتہ بتلانا بھول گیا۔ میں نے پچھلے ہفتے ایک سندھی لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ کولمبیا میں سوشیالوجی پڑھ رہی ہے۔ بے حد ذہین لڑکی ہے بڑی زبردست انٹلکچوئل قسم کی۔ ذات کی عامل ہے جو سندھیوں میں بڑی اونچی ذات سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اماں کو کم از کم یہ اطمینان ہو جانا چاہئے کہ میں نے کسی نیچ فرنگن کو پلّے نہیں باندھ لیا۔ اب بٹیا تم اس اشتیاق میں مری جارہی ہوگی کہ اس کی شکل کیسی ہے۔ تو بھئی بے حد گوری ہے۔ ایک دم سرخ و سفید۔ اور کافی خوبصورت ہے۔ عورتوں کے حسن کی تعریف کے معاملے میں ہمیشہ کا کنجوس ہوں۔ کیونکہ ذرا سی تعریف سے ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اگر یہ واقعی

اچھی خاصی قبول صورت لڑکی ہے۔ قد میں تم سے ذرا سا نکلتی ہے۔ اردو بہت صاف نہیں بولتی۔ مگر بڑا پائجامہ پہن کر میں منہ چاند پور موضع تلسی پور ضلع فیض آباد کی سیدانی معلوم ہوگی۔ اطمینان رکھو۔۔۔

"ہم نے ابھی سے طے کر لیا ہے کہ بچے کا نام راہل رکھیں گے۔ راہل [illegible] ۔ چونکہ تم بالکل مطلق ہو اس لیے بتا رہا ہوں کہ راہل گوتم بدھ کے بیٹے کا نام تھا۔ اب تم کو زبردست شاک پہنچا ہوگا کہ میری لیڈی ایسی فرسٹ [illegible] ہے کہ ابھی سے اس طرح کی باتیں ڈسکس کرتی ہے تو بیٹا قصہ یہ ہے کہ تم جو اب تک ایک نمبر کی دقیانوسی "اولڈ انڈین [illegible]" ہو باوجود اپنی ساری اعلیٰ تعلیم اور ترقی پسندی کے، سماجی لحاظ سے اب تک سخت فیوڈل بھی ہو۔ سیتا ایک دم نئی عورت ہے۔ تم لوگوں کی طرح قدامت [illegible] لہٰذا بچے کا ذکر سنتے ہی شرم کر کمرے سے بھاگ جائے ۔۔۔ لاحول ولا ۔۔۔ بہرحال تو بچے کا نام راہل ہوگا۔ اور اگر لڑکی ہوئی تو اس کا نام نگار رخ رکھیں گے کہ یہ نام سیتا کو بہت پسند ہے۔ [illegible] گرلز اسکول میں اس نام کی ایک ہم جماعت پٹھان لڑکی اس کی بہت پیاری گرل فرینڈ تھی [illegible] عقل [illegible] میں تمہاری؟"

ملتی نے خط میز پر رکھ دیا۔ بڑی لرزہ خیز بات تھی۔ دونوں خط ایک [illegible] لکھے تھے ۔۔۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر الماری کھولی اور سارا سامان نکال کر [illegible] تیار ہو کر مسز [illegible] کی ریہرسل لینے کے لئے جانا ہے۔ [illegible] دو گھنٹے میں وہ سب اکٹھے ہوں گے وہ سب پرانے دوست ۔۔۔ ملتی ۔۔۔ راکیش ۔۔۔ کامران ۔۔۔ عبیدہ ۔۔۔ [illegible] جانے پہچانے چہرے مانوس ہستیاں۔ زندگی اسی طرح جاری رہے گی۔

۳

گیلری کی دوسری طرف ہما کے ڈریسنگ روم میں کوئی چیز گرنے کی آواز آئی [illegible] لپیٹ کر غسل خانے کے دروازے سے باغ میں نکل چکی تھی۔ اس کے کمرے کا جو دروازہ [illegible] کھلتا تھا اس پر زرد گلاب کی بیلیں جھک آئی تھیں۔

وہ فون بند کر کے اٹھی اور دروازے میں جا کر سکتے کے عالم میں [illegible] کے کمرے میں گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ وارڈ روب پر بہت سے پکچر پوسٹ کارڈ اور [illegible] سجی تھی جو کسی اعلیٰ ٹریننگ کیلئے لندن گیا ہوا تھا۔ بچے کی بید کی ٹوکری مسہری کے برابر رکھی تھی [illegible] نیلے رنگ کی کنتھ کی ساری پڑی تھی جو ہما اسی صبح کو [illegible] سے خرید کر لائی تھی۔ [illegible]

جیتا جی کی انڈین پینٹنگز کی میز پر دودھ کی بوتل دھری تھی۔ سرخ روشنی فرش پر خزاں کے مدھم سونے کی رقم اسیں بکھری ہوئی تھیں۔ گارڈن ہاؤس کے سامنے ندوانسے باغ میں کھلتے تھے جہاں زرد پتے اڑ کر لواڑوں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔ بڑا سناٹا تھا۔

چند لمحوں بعد برابر کے کمرے میں کھٹ پٹ ہوئی۔ ہما کا چھوٹا بھائی جنید سو کر پلنگ پر سے اترا۔ اور جب غسل خانے کے شاور میں سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ ۔ جو بیڈ روم پیلی کوٹھی کے رخ پر تھا اس کے دروازے میں ہما کی اماں مونڈھا بچھائے بیٹھی گیتا پڑھ رہی تھیں۔ وہ بے حد مذہبی عورت تھیں۔ نئے تعلیم یافتہ روشن خیال بچوں کی بے حد ماڈرن مذہبی ماں ۔۔ عجیب سا لگتا تھا۔ اس کی اپنی ماں بھی اتنی ہی مذہبی تھی اس کی ساس بھی۔ سیفی کی ماں بھی برتوں اور روزوں میں لگی رہتی تھیں ایسی چھوٹی چھوٹی مورتیاں جو سر سے اپنے بچوں کے لئے دعائیں مانگتی تھیں اچھے اور برے شگون مانتی تھیں۔ بہت اور روزے رکھتی تھیں۔ مائیں مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ وہ خود ماں تھی۔ ہما بھی اب ماں بننے والی تھی۔ جو اپنا سارا جدید فلسفہ بھلا کر کل سے اپنے بچے کی معمولی سی بیماری کی وجہ سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور ڈاکٹروں کو فون پر فون کر رہی تھی۔

وہ گیلری کی سیڑھیاں اتر کر باہر آ گئی۔ لان کے اس پار پیلی کوٹھی کے چبوترے پر بان کی کھری کھاٹ بچھائے اوما جی اپنے لڑکے کو ہندی پڑھا رہی تھیں۔ روش کے دونوں طرف بڑے بڑے گلاب روشن تھے۔ وہ روش پہ سے گذر کر چبوترے پر آئی۔ اوما جی نے اس کی آہٹ پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ذرا سی مسکرائیں اور پھر کتاب پر جھک گئیں ۔۔۔ ہاں پڑھو ۔۔۔

بندیلے ہر بولوں سے ہم نے سنی کہانی تھی
خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

لیکن بچے نے پڑھنے کے بجائے اپنی ماں سے جھگڑنا شروع کیا ۔۔ ممی ۔۔ میں تو نہیں پڑھتا۔ اچھا ایک روپیہ لاؤ تو آگے پڑھوں گا ۔۔"

"چلو شرارت مت کرو ۔۔ پڑھو آگے۔" اوما جی نے ڈانٹا ۔۔

"یہ مردانی کیا ہوتا ہے ۔۔ ؟"

"بہادر ۔۔" اوما جی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

بچے نے ہل ہل کر پڑھنا شروع کیا۔ ستیا چند لمحوں تک ٹھٹھک کر یہ پر سکون منظر دیکھتی رہی۔ پھر ہما کے پرانے کمرے میں داخل ہوئی جس میں وہ اپنے بیاہ سے پہلے رہا کرتی تھی۔ الماریوں میں اس کی

کتابیں بیکسی کے عالم میں پڑی تھیں۔ دیواروں پر مانی پوری ٹوپیاں اور جگن ناتھ جی کے چوبی مجسمے آویزاں تھے۔ برابر کے کمرے کی ایک الماری بھی دیوی دیوتاؤں سے بھری ہوئی تھی۔ درمیانے تختے پر دیوی کی تختی رکھی تھی۔ منگل کے منگل دیوی کو اشنان کرا کے بھوجن کرایا جاتا تھا اور نئی پوشاک پہنائی جاتی تھی۔ اس گھر میں دیوی دیوتاؤں کی اس قدر بھرمار تھی کہ ستیا کا جی ہولا جاتا تھا۔ ہما ان مورتیوں کو کلچر کا ایک حصہ سمجھ کر ان کی طرف سے بالکل بے نیاز تھی۔ وہ مذہبی یا غیر مذہبی کچھ بھی نہیں تھی۔ ایک بے حد نارمل قسم کی لڑکی تھی۔ یہ تو ستیا جیسے دماغ میں نشتر تھا کہ وہ مذہب، سیاست، زندگی، محبت، دنیا بھر کی ہر چیز کے متعلق سوچ سوچ کر دیوانی ہوتی جاتی تھی — مگر اب ہما کی امی، جیسے نوزائیدہ بچے کو لے کر ہر منگل کو نہلا دھلا اور پھوپھیوں کے ساتھ کالکا جی کے مندر جاتی تھیں۔

سیتا ڈرائنگ روم سے نکل کر سامنے کے برآمدے میں آگئی۔ جدھر سے پرائیویٹ روڈ مڑ کر علی پور روڈ کی سمت مڑتی تھی۔ سامنے سے ہما کی ایک اور کزن پرمیلا اپنے دفتر سے واپس آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر ستیا کو ہیلو کہا اور امرتوں میں غائب ہو گئی۔ سیتا پھر اندر لوٹی اور سارے گھر میں ٹہلتی گھومتی پھری۔ اسے یہ کوٹھی ہمیشہ سے پسند تھی۔ اس گھر میں آکر اس کے مکینوں سے مل کے اسے ہمیشہ ایک عجیب سی راحت اور حفاظت کا احساس ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی کتنی پُرامن تھی۔ ان کے یہاں کوئی دماغی یا نفسیاتی یا جذباتی الجھنیں نہیں تھیں۔ ساڑھے تین سو برس سے یہ خاندان پانچ چھ بڑی بڑی کوٹھیوں میں اسی طرح رہتا آیا تھا۔ ان کے پرکھے اورنگ زیب کے زمانے سے مغل دربار میں وقائع نویس اور منشی تھے۔ اور مغل بادشاہوں نے ان کو رائے راجہ کا خطاب دے دیا تھا۔ سعید احمد مارہروی کی کتاب "امرائے ہنود" کے کئی ابواب اس خاندان کے بزرگوں کے تذکرے سے پُر تھے۔ دلی کی ٹکسالی اردو کے سلسلے میں اس نستعلیق گھرانے کی زبان بھی سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ ہما کے دادا صاحب دیوان تھے۔ پردادا نے لغت تصنیف کی تھی۔ مگر دادا نے فارسی شعرا کا تذکرہ لکھا تھا۔ ہما کی اماں بعض وقت ایسے ایسے محاورے استعمال کرتیں جو ستیا کی سمجھ میں نہ آتے جس پر وہ کہتیں — اری لکھنؤ میں تیری سسرال ہے اب تو زبان سیکھ لے۔ پھر خود ہی ناک بھوں چڑھا کر کہتیں — اور لکھنؤ والے نگوڑے بھی اردو کیا جانیں — پوربیے نہیں تو ...

واقعی یہ اس قدر شائستہ، مہذب، نستعلیق، بے حد متعدد اور بے انتہا غیر سیاسی قسم کے لوگ تھے کہ ستیا کو حیرت ہوتی تھی۔ اتنا بڑا ہنگامہ آکر گذر گیا۔ دنیا تہ و بالا ہو گئی مگر یہ لوگ اسی سکون سے ان کوٹھیوں میں بیٹھے رہے۔ وہ خود بے خانماں ہو کر ہندوستان کے مختلف ریفیوجی کیمپوں میں سے ہوتی ہوئی ۴۸ء میں دلی آئی تھی۔ یہیں اس کی ملاقات ہما سے ہوئی جس کی بڑی بہن نرملا باجی کے گھر پر ہوئی تھی۔

جو کرسچن کی ممبر تھیں۔ ان کے یہاں صبح سے شام تک شرنارتھیوں اور مہاجر مسلمانوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اور وہ انتہائی دردمندی اور تندہی کے ساتھ ان سب کے لئے دوڑ دھوپ کرتی رہتیں۔ ہما جو اسی سال آئی۔ اے۔ ایس میں آ کر اب دلی کی وزارت آبادکاری میں کام کر رہی تھی۔ اس روز فرخندہ باجی کے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ایک خوف زدہ سی لڑکی کو بلقیس نے اپنے قریب بلا کر ہما سے کہا تھا — "یہ جو ابھی وقت اپنی لمبی عنابی رنگ کی نیش ڈرائیو کرتی ہوئی آ کر اتری تھی"، ہما — ان ہی کی بات کل سنا ہے گورنمنٹ کی ساری بنوانے کو کہہ رہی تھیں۔ سیتا کی والدہ بڑی خوبصورت ساریاں کاڑھتی ہیں۔"

"— ہاؤ ونڈرفل —" ہما نے کہا تھا۔ "ایک کاٹن ساری کا پلو اور بیل آپ کتنے میں بنوا دیں گی —؟"

"دس روپے —" سیتا نے ڈر کر ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس وقت یہ محسوس کر کے کہ وہ مفلس اور قابلِ رحم شرنارتھی ہے، اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا — پھر ایک روز وہ بلقیس کے ساتھ ہی ہما کے گھر گئی تھی۔ اس کے کنبے کے دوسرے افراد کی کوٹھیاں پاس پاس تھیں اور اپنے رنگوں کی مناسبت سے مشہور تھیں۔ ہما اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ "پیلی کوٹھی" میں رہتی تھی۔ اس کے تایا "نیلی کوٹھی" میں، منجھلے چچا "لال کوٹھی" میں اور چھوٹے چچا "ہری کوٹھی" میں رہتے تھے۔ یہ سب بے حد زندہ دل، خوش باش، دوست نواز اور پرخلوص قسم کے لوگ تھے۔ ان کی ان گنت لڑکیاں کالجوں اور اسکولوں میں پڑھ رہی تھیں۔ لڑکے بھی زیادہ تر زیرِ تعلیم تھے۔ شہزاد۔ مہتاب۔ اقبال۔ گلزار۔ نہال۔ خوش وقت۔ اور پیارے لال کون کون — خود ان لوگوں کو یہ نام معلوم نہیں تھا۔ اس کے باوجود سیتا شروع شروع میں ان سے کھنچی کھنچی رہتی۔ وہ اس وقت بہت کم عمر اور بے حد حساس تھی۔ فرخندہ بی بی اور ہما اس سے بڑی بہنوں کا سا برتاؤ کرتیں تو اس کی آنکھوں میں فوراً آنسو آ جاتے۔

یہ اس کے ساتھ کیسی مصیبت تھی کہ دردمندی اور اخلاص کی ایک ایک ذرا ذرا بات اس کے دل پہ لکھی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ گرمیوں میں جب وہ سب نرگس کی نئی فلم کا ایک سیکنڈ شو دیکھنے کناٹ سرکس گئے تھے اور برآمدے کے ستونوں کے پاس ایک پھول والا جوہی کے گجرے بیچ رہا تھا۔ سیتا نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ نعمت بھائی نے فوراً اس کے لئے گجرا لا دیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ دوبارہ سنیما دیکھنے ادھر گئے تو نعمت بھائی کار سے اتر کر خود ہی لپکے ہوئے جا کر گجرا خرید لائے تھے — "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں سفید پھول پسند ہیں —" انہوں نے کہا تھا — نعمت بھائی اب اتر پردیش میں کہیں فارمنگ کر رہے تھے۔

ان کا بیاہ ہو گیا تھا۔ شہزاد بھی اب بڑا ہو چکا تھا۔ بلکہ اسے تو آئی۔ اے۔ ایس میں آئے بھی سات آٹھ

سال ہونے آئے تھے۔ اب تک وہ مغربی بنگال کے اضلاع میں تعینات تھا اور حال ہی میں تبدیل ہو کر مرکز میں آگیا تھا۔ ہما کے والد کے انتقال کو اب تین سال ہو چکے تھے۔ ہما نے شادی کر لی تھی اور شوہر کے لندن جانے کے بعد وہ گارڈن ہاؤس میں اپنے والد کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اب وہ اپنے بچے میں اس قدر مصروف تھی کہ سیتا کی طرف توجہ کرنے کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ شہزاد تو کبھی سے تھیٹر موومنٹ میں جٹا ہوا تھا۔ ہما کی ساری چچازاد بہنیں تعلیم سے فراغت پا کر ملازم ہو گئی تھیں۔ چند ایک اپنے اپنے گھر سدھار گئی تھیں۔ لڑکے بڑے ہو گئے تھے۔ انوّل اور مہتاب فوجی افسر تھے۔ اور کشمیر میں تعینات تھے۔

پچھلے دس سال میں اس خاندان میں کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ یہ گھر جو ہمیشہ امن سکون کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا ذرا بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی بدل چکی تھی۔

لیکن یہ کمرے۔ یہ قالین۔ پرانا فرنیچر۔ تصاویر۔ پردے۔ فرش کے گملے۔ باغ کے پھول۔ ہر چیز ویسی تھی۔ یہ گھر۔ یہ بھی بندرگاہ میں ٹھہرا ہوا ایک محفوظ خاموش جہاز تھا جس میں کبھی کبھی آ کر وہ یہاں کے سکون سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ آس پاس کی رنگ برنگی کوٹھیاں ہیتے کی طرح پرسکون نظر آ رہی تھیں۔ نیچے بل کھاتی ہوئی طویل خاموش سڑک کے پرے تبت ہاؤس، اسی سکون سے بھری تھیں۔ کیا واقعی اتنا سکون ممکن ہو سکتا ہے! مُردوں کا سا چکر لگا کر وہ پھر ہما کے پرانے کمرے میں واپس آ گئی۔

"اری سیتا —— کہاں گھومتی پھرے باؤلی سی۔ باہر آجا۔ اندر بڑی سیلن ہے" چبوترے پر سے ہما کی اماں کی آواز آئی جو کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتی اپنے دیوی دیوتاؤں والے کمرے کی طرف جا رہی تھیں —— وہ ان کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں گئی اور ذرا سہم کر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"اری ان کو پرنام تو کرلے۔ تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ بھگوان تو ہر شے میں ہیں۔ اری باؤلی ڈر رہی کیوں —— میری بھی دو بھتیجیوں نے مسلمانوں سے بیاہ کر لیا۔ آج کل یہی ہوا چلی ہے۔ اب ان کو گھر سے نکال تھوڑا ہی دیا۔ باپ نے اتنا بڑا ایٹ ہوم دیا تھا —— کیا نام ہے اس کا۔ مجھے نگوڑے کا نام ہی یاد نہیں رہتا۔ میری اپنی ہما نے غیر کف میں شادی کر لی۔ اتنی دُور مرہٹواڑے چلی گئی —— پھر اب کیا ہو —— زمانہ ہی ایسا ہے" اماں نے الماری کھول کر منتر سے دیپ محل میں چراغ جلاتے ہوئے کہا۔

وہ الماری کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی جہاں گھروندے کی طرح دیوی دیوتا سجے تھے۔ پیچھے مہنتوں سادھوؤں اور جوگیوں کے فوٹوگراف رکھے تھے اور ان پر گیندے کے ہار پڑے ہوئے تھے۔

ہما کی اماں سے سیتا کی ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا اس وجہ سے وہ ان سے ذرا سی خائف

دس سال سے وہ اردو پڑھ رہی تھی ــــ "مجھے جو سنت سے بڑی اونچی روحانی طاقت کے ملے ــــ" انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ ــــ"

"آج دیوی کو ہما کی پھوپھی کے یہاں جانا ہے۔" اماں نے مورتی پر تلک سجا کر کہا۔

"اچھا ــــ"

وہ باہر آ گئی ــــ

بے معنی ــــ بے معنی ــــ زندگی کس قدر بے معنی تھی۔

اب لان پر ہما کے تین چار کزن جمع ہو چکے تھے۔ ہما گلابی ہاؤس کوٹ میں ملبوس ٹہل ٹہل کر بچے کو سلا رہی تھی۔ شہزاد بھی نہا دھو کر اندر سے نکل آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ وہ اس قدر خوبصورت تھا کہ ستیا اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ بہت کم عمر تھا۔ حد سے حد چھبیس ستائیس برس کا رہا ہوگا۔ اور کمبخت کی قیامت کی آنکھیں تھیں اور کس قدر خوبصورت بال۔

"ہلو ستیا۔ دِس از کیلاش" شہزاد نے کہا۔

"ہلو ــــ"

"مسز جمیل آپ آج ہماری ریہرسل دیکھنے آ رہی ہیں ــــ؟" نوجوان نے بڑی یگانگت اور بیساختگی سے بات شروع کی۔ ان ڈرامہ گروپ والوں کی بڑی عجیب سی جتھہ بندی تھی

"ڈاکٹر مرچندانی ــــ" اسنے آہستہ سے کہا۔

"اوہ ــــ آئی ڈو بیگ یور پارڈن ــــ" پھر اسنے شہزاد سے پوچھا ــــ "یار ہم نے اینٹ تو نہیں گرا دی ــــ؟"

"ارے نہیں یار ــــ سب چلتا ہے ــــ" شہزاد نے جواب دیا۔ پھر اسنے مڑ کر ستیا سے پوچھا ــــ "تم ابھی چلتی ہو یا بعد میں آ کر پک اپ کر لوں؟" وہ بے اختیار ہو کر کیلاش کی آنکھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر کیلاش گھبرا گیا اور زیادہ تندہی سے پرمیلا کے ساتھ بات کرنے لگا۔

"ستیا ــــ!" شہزاد نے دوبارہ کہا۔

"اوہ ــــ" وہ چونکی ــــ "میں ہما کے ساتھ آ جاؤں گی۔ تم لوگ جاؤ۔" ہما بچے کی فکر میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کا بچہ رات کو نہیں سویا تھا اور کسی طرح سوتا نہیں تھا۔ اس نے ستیا کی بات نہیں سنی۔

"ہمتا ۔۔۔" سیتا نے کہا۔

"فضول ۔۔۔ فضول ۔۔۔ ہر چیز فضول ۔۔۔"

"اوہ سوری ۔۔۔ ماں سیتا۔ نہیں میں لیٹ جا سکتی ہوں۔ آنٹی کی یہ حالت ہے ۔۔۔"

"اچھا تم چھ بجے کافی ہاؤس آجانا ۔۔۔ کیلاش تم کو وہیں سے پک اپ کرے گا" شہزادہ نے کہا اور دونوں لڑکے گھاس پر گذرتے کار کی طرف چلے گئے۔

سامنے نیلی کوٹھی کے چبوترے پر ساری لڑکیاں نیٹنگ میں مصروف تھیں اور ٹیلیفون سے کھا رہی تھیں اور بڑی آرام دہ نارمل باتیں کر رہی تھیں۔

ہمت آپا کو بلوا کر دودھ کی بوتلیں صاف کروانے میں مصروف ہو گئی۔

"ہمتا ۔۔۔ میں ذرا اپنے گھر ہو آؤں ۔۔۔" سیتا نے منڈھے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"گھر ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔ قرولباغ ۔۔۔ وہیں سے ان لوگوں کے یہاں چلی جاؤں گی ۔۔۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سیتا ۔۔۔"

وہ اپنا بیگ اٹھا کر سرخ بجری والی سڑک پر آئی اور بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گئی۔

۴

کامران ایک ستون کے پیچھے چھپا کچھ کھٹر پٹر کر رہا تھا۔ پھر اس نے فرش پر پڑے ہوئے تاروں کے گچھے پر جھک کر سوئچ دبا دیا۔ اسٹیج پر مدھم سفید اجالا پھیل گیا ۔۔۔ اسٹیج ڈائرکٹر نے خالی اوڈیٹوریم کو مخاطب کیا ۔۔۔

"۔۔۔ قصہ مختصر کرتا ہوں ۔۔۔ مجھے اکادمی کی طرف سے ہدایت کی گئی ہے ۔۔۔ تم کو چاہئے کہ "راکھشس کی انگشتری" نامی ناٹک جو مہاراجہ بھاسکر دت کے بیٹے اور سامنت واتیشور دت کے پوتے تمثیل نگار وساکھ دت نے لکھا آج پیش کرو ۔۔۔ میں بھی بہت مطمئن ہوں کہ ایک ایسے مجمع کے سامنے یہ ناٹک کھیلا جائے گا جو ایک ادبی تخلیق کی خوبیاں سراہ سکتا ہے۔

کیونکہ ۔۔۔

ے "مدرا راکھشس" کے پہلے منظر کا اولین مکالمہ

دھان کی اچھی فصل کا انحصار بونے والے کی ذاتی خوبیوں پر نہیں ہوتا — اب میں گھر جاتا ہوں تاکہ اپنی گھر والی کے ساتھ سنگیت کی تیاری کر سکوں —" پھر اس نے اسٹیج کا ایک چکر لگایا۔ —" یہ رہا ہمارا مکان — اب میں اندر جاتا ہوں —" اسنے چاروں طرف دیکھا۔" آہا۔ کیا بات ہے! ایسا لگتا ہے جیسے کسی تہوار کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ نوکر اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ ایک داسی پانی لا رہی ہے دوسری خوشبودار جڑی بوٹیاں کوٹتی ہے۔ یہ لڑکی ہار گوندھنے میں جٹی ہے۔ اور اس داسی کو دیکھو جو کوٹنے چھاننے کے ساتھ گنگنا تی جاتی ہے۔ اب میں گھر کی بی بی کو بلاتا ہوں —"

کھٹاک — پلائی ووڈ کا بڑا تختہ ایک طرف کو سرکا اور سردار پردیپ سنگھ اودر رال پہنے ہاتھ میں ہتوڑا لئے نمودار ہوئے۔ —

"پردیپ تم کو بھی اسی وقت ہلہ کرنا ہے" بلقیس نے ہال میں سے چلا کر کہا۔ "یہ اتو بیڑا غرک ہوگیا — شہزاد کدھر ہے؟" پردیپ نے غصے سے کہا۔

"ارے رے رے یہ تخت ادھر گھسیٹو بھائی —"

"اے پاکباز عورت گھڑ اور خوش تدبیر — میرے گھر کی سیاست کی ماہر — اے میرے گھربار کی مالکہ — ادھر آ —" رگیش بولے جا رہا تھا۔ "ب ایکٹرس" سامنے آئی "مہاراج میں یہاں ہوں۔ اپنی ہدایات سے مجھے سرفراز کیجئے"

بلقیس نے پھر آواز دی —" راکیش اس کے آگے جہاں" ظالم حملہ آور" والا جملہ ہے اسے ذرا پھر سے کہو —"

"اچھا — دیکھو! ظالم حملہ آور کیتو کے ساتھ چندر ماں کو زیر کرنا چاہ رہا ہے — ہا — کون ہے!! جب کہ میں یہاں کھڑا ہوں اور —"

اب سات بجا تھا۔ ستیا اب تک نہیں آئی۔ بلقیس نے گھڑی پر نظر ڈال کر سوچا — اب پاٹلی پتر کے نند راجہ کے وزیر راکھشش کا دوست "چندن داس" کہہ رہا تھا۔

میرے سر پر بادلوں کی گھن گرج ہے

میرا پریتم بہت دور ہے۔ یہ کیا ہوا —؟

امر بوٹیاں برفیلے پہاڑوں پر ہیں۔

اور سر پر کنڈلی مارے ناگ بیٹھا ہے۔

— اب — اب "چندر گپت" کہہ رہا تھا۔

دہ منہ زوروں سے جھجکتی ہے۔ ڈرپوکوں کے پاس نہیں رہتی۔ کیونکہ اسے بے آرامی سے ڈر لگتا ہے اسے احمقوں سے نفرت ہے۔ وہ بڑے بڑے گنوانوں سے بھی بے تکلف نہیں ہوتی۔ ہر دوں سے گھبراتی ہے۔ وحشی ہرنی کی مانند اسے بھی بڑی مشکل سے رام کیا جائے گا ــــ"

"ستیا جی، آگئیں" کامران نے پانیبہ کے مکان کی کھڑکی میں سے منہ نکال کر کہا۔ تو یہ ستیا ہال میں سے گذر کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی جہاں اندھیرا تھا۔

کامران نے دوسرا سوئچ دبایا۔ اسٹیج پر اداس زرد روشنی پھیل گئی۔ ــــ اب چند۔ گیت کہہ رہا تھا ــــ

"افق کا منظر خزاں نے کتنا خوبصورت بنا دیا ہے"

کیونکہ ــــ

آہستہ آہستہ خشک ہوتی ہوئی ندیوں کے دونوں طرف

رتیلے کنارے جگمگا رہے ہیں ــــ

سارسوں کے ہجوم اور کنول کے جھنڈ

اور چاندی کے بادل اور اڑتے ہوئے بگلے۔

اور شام کے آسمان پر سلگتے ستارے ــــ"

"ــــ ستیا ــــ" بلقیس نے برآمدے میں نکل کے پکارا ــــ

"ہائی ــــ بلی ــــ"

بلقیس اس کے نزدیک جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی "یہاں کافی خنکی ہے۔ اندر چلو ــــ"

"نہیں ــــ یہیں ٹھیک ہے ــــ"

"اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ ہم لوگ کافی بنا رہے تھے اس وقت تمہارا بہت انتظار کیا۔ تمہارے لئے دو تین فون بھی آئے تھے ــــ"

"کس کے ــــ؟"

"معلوم نہیں۔ سنو ستیا ــــ اس وقت تم نے میری بات پوری نہیں سنی اور کھٹ سے فون بند کر دیا ــــ"

"اب اور کون سی بات بتانا رہ گئی تھی تم کو؟"

"وہ تو ٹھیک ہے ستیا ڈیر ــــ مگر ــــ" بلقیس نے بے چینی سے پہلو بدلا "اصل میں کل رات

منجھلی خالہ نے کراچی سے ٹرنک کال کیا تھا۔ قیصر کی شادی ہے نا اگلے ہفتے۔ تو منجھلی خالہ نے سخت اصرار
کیا ہے کہ تم اس میں ضرور شریک ہو ۔۔۔ بڑی خالہ تلسی پور سے نہیں جا سکتیں اصغر بھیا کی بیماری کی وجہ سے۔
ان کی بہو کی حیثیت سے ان کی نمائندگی تمہیں ہی کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ۔۔۔" اس نے حلق صاف کیا۔ سردی
کے باوجود وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

"کراچی ۔۔۔" سنیتا کا دل دھک سے رہ گیا "کراچی ۔۔۔"

"ہاں ہاں۔ اور کب ۔۔۔" بلقیس نے دفعتاً خود کو سنبھالا اور پھر ایکٹنگ شروع کردی ۔۔۔ "چلی چلو
بڑا مزا آئے گا۔ سب پاکستانی رشتے داروں سے ملیں گے۔ ان سب کو تو میں نے نو سال سے نہیں دیکھا۔
آٹھ دس دن بعد چلے آئیں گے۔ نادر نے بہت لمبا چوڑا پروگرام بنا کر بھیجا ہے۔ موہن جوڈارو دیکھتے ہوئے
کار کے ذریعے لاہور جائیں گے۔ وہاں دو روز منور باجی کے وہاں ٹھہر کر واپس دلی ۔۔۔ کیا خیال ہے؟"
پھر وہ سنیتا سے نظریں نہ ملا سکی اور جلدی سے تمثیل کا فائل الٹنے پلٹنے لگی۔ "چلی چلو واقعی پھر اگلے مہینے
مجھے تھیٹر سیمینار کے لئے بمبئی جانا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم بہت مصروف بہت اہم آدمی ہو۔ ہندوستان کا سارا کلچرل موومنٹ تمہارے
ہی دم سے چل رہا ہے۔"

"بکو مت ۔۔۔ ارے ارے ۔۔۔ رو کیوں رہی ہو کریک داس۔ سچی ۔۔۔ چلو ہمارے ساتھ کراچی۔"
پھر اس نے خوشدلی کی سعی کی۔ "ذرا سوچو۔ میں آج تک کسی فارن کنٹری نہیں گئی۔ ایک فارن کنٹری تو دیکھ آؤں
بقول محبّ ز ۔۔۔"

سنیتا خاموش رہی۔

"چلو یہاں سے مسز حسین کے ہاں جانے کے بجائے سیدھے گھر چلیں گے۔ اور کھانے کے بعد بیٹھ کر
اسکریبل کھیلیں گے۔ اب کی دفعہ لیٹن لفظ بنائے جائیں۔ اتنی دیر میں کیوں آئیں؟ کیا اپنے گھر چلی
گئی تھیں؟"

"ہاں ۔۔۔ میں ۔۔۔ کچھ دیر ممی کے پاس چپ چاپ بیٹھنا چاہتی تھی۔"

"تم نے ۔۔۔ تم نے ان کو بتلا تو نہیں دیا؟"

"ہاں ۔۔۔ بتا دیا ۔۔۔"

"کیا کہتی تھیں؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔ کہنے لگیں۔ سب کرموں کا پھل ہے ۔۔۔"

اندر سے "چندر گپت" کی آواز پھر بلند ہوئی۔ وہ اپنا مکالمہ دہرائے جا رہا تھا۔
اور چاندی کے بادل اڑتے ہوئے چلے۔
اور شام کے آسمان پر سلگتے ستارے ـــ"

"مخمل خالہ کا خط میرے پاس بھی آچکا ہے۔" سیتا نے آہستہ سے کہا۔ "بہت عجیب کا ہے۔ ابھی انہوں نے ممی سے یہ بھی کہا کہ مخمل خالہ نے مجھے کیتھر کے بیاہ کے لئے کراچی بلایا ہے۔ کہنے لگیں ضرور جاؤ۔ تمہارا اصل گھر تمہاری سسرال ہے۔ کراچی میں تمہارے جیٹھ رہتے ہیں اور جیٹھ سسر کے برابر ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہرگز مت ٹالو ـــ اینڈ سو آن اینڈ سو فورتھ ـــ"

بلقیس برآمدے کے نیچے لگے ہوئے پھولوں کو دیکھتی رہی۔ اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً اس نے ایک فرض شناس ڈائریکٹر کی حیثیت سے اندر سے آتی ہوئی "چندر گپت" کی صاف اور گہری آواز پر کان لگا دیئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اور شام کے آسمان پر سلگتے ستارے
اور پھر ـــ
ندیوں کی اٹھتی لہریں موسم کی بات مان کر اپنے اپنے دھاروں میں سمٹ گئیں۔
دھان فرطِ انکسار سے جھک گئی۔
مور اپنا غرور چھوڑ چکے ہیں۔
اچنبھے کی بات ہے کہ کس طرح ساری دنیا کو
خزاں نے مقبولیت کے راستے پر چلنے کے لئے دھیما کر لیا۔
پن کٹی کی مانند جو مجنونوں کے قصے بڑی مہارت سے سناتی ہو۔
پت جھڑ نے گنگا کو دریاؤں کے خدا کے پاس پہنچا کر
اسکے سکون کو بحال کر دیا ہے۔"

اب "بھاٹ" کہہ رہا تھا۔

"آسمان پر اس کے پھولوں کی پیلی روشنی
شیو کے جسم کی راکھ کی ایسی پھیلی ہے۔
ٹھنڈی کرنوں والے چاند نے بادل بکھیر دیئے جو
شیو کی ہاتھی کی کھال کی مانند گرد آلود تھے۔

تیز چاندنی اس کی کھوپڑیوں کی مالا کی طرح چمک رہی ہے۔
ہوا میں اڑتے راج ہنس
اس کی ہنسی کی مانند جگمگاتے ہیں۔
خدا کرے خواں جو کشتو کے بدن کی مانند زرد ہے۔
تمہاری مشکلیں دور کرے ـــ"
ـــ اب "چانکیہ" کہہ رہا تھا ـــ
"چاروں ساگروں کے ریتیلے ساحلوں تلک جن پر تاڑ کے پتوں نے تاریک جنگل سایہ کئے ہوئے ہیں۔ جن کے گہرے پانی ہیبتناک مچھلیوں کے تیرنے سے مضطرب ہیں۔
تمہارا حکم تازہ پھولوں کے گجرے کی مانند
ایک سو راجاؤں نے اپنے سر پر لیا ہے ـــ"
"بلقیس ـــ" پیچھے سے کیلاش کی آواز آئی۔ وہ ہال کے آخری دروازے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آیا۔
"ہاں بھئی" بلقیس نے پیچھے مڑ کر دریافت کیا "واٹ از اِٹ؟"
"تعارف میں کیا کیا لکھا جائے گا؟" وہ فرش پر دو زانو بیٹھ گیا "آؤٹ لائن بنا دو میں اندر جا کر لکھ لوں گا۔"
"اسے بس یہی لکھ دو کہ یہ ماڈرن تھیٹر کی چوتھی کلاسیکل پیش کش ہے۔"
"یہ تم نے کس قدر رنگین اور پرو فاؤنڈ بات بتائی ہے۔ مانتا ہوں۔"
"اور یہ لکھو کہ ـــ" بلقیس نے سوچتے ہوئے سر کھجایا۔
"ساتوں ایکٹ کا الگ الگ خلاصہ؟ اور شروع میں کیا لکھوں؟"
"بلقیس نے فائل کھولا۔ "یہاں کچھ ٹھیک ہی نہیں رہا۔ اندھیرے میں۔ یہ لکھ دو کہ یہ ناٹک چوتھی صدی عیسوی میں گپتا عہد میں لکھا گیا۔ ڈراماٹسٹ وساکھ دت اس کا مصنف تھا۔ لاؤ مجھے دو ـــ میں پڑھتی جاتی ہوں۔" دروازے میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی کی طرف جھک کر اس نے کاغذات پلٹے۔
"وساکھ دت اس کا مصنف تھا۔ شہنشاہ چندر گپت دوئم کے عہد میں پاٹلی پتر میں پہلی بار اسٹیج ہوا۔ چندر گپت دوئم کا زمانہ ـــ شاید ـــ ۳۷۵ء سے ۴۱۳ء تک ہے۔ کتاب میں سے چیک کر لینا ـــ"
سیتا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ذرا باہر جاتی ہوں۔"

ملقیس نے اس کی بات نہیں سنی وہ اپنے کام میں دوبارہ منہمک ہو چکی تھی۔ ہوا کی طرح اس کے پاس بھی ستیا کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ کہتی رہی ـــ "اور یہ لکھو کہ بڑا سخت سیریس اور سیاسی قسم کا پلے ہے سنسکرت ڈرامے اور یوروپی آرٹ تھیٹر کا ذکر کرو گلے پیراگراف ہیں ـــ رمو نے آؤٹ تیار کر دیا؟"

"گیلی پریس سے آجائے تب ہی تو وہ لے آؤٹ بنائے گی۔" کیلاش نے جواب دیا۔

ـــــ اندر "جہانگیر" کہہ رہا تھا۔

"چیلیں اور گدھ دھوئیں کے مرغولوں کی طرح آسمان پر چکر کاٹ رہے ہیں۔ دوران پرواز میں ان کے پر بالکل ساکن ہیں۔

گھوڑے آسمان کو اپنی ٹاپوں سے اڑائے دے رہے ہیں۔
فوجوں کے آگے آگے چلنے والے ہاتھی ساکت کھڑے ہیں اور
جو ار بھاٹا کے نشانوں کی مانند ان کی گھنٹیاں خاموش ہیں ـــ"

ستیا پوری عمارت کا چکر لگا کر پھر برآمدے میں آگئی۔ ملقیس اور کیلاش اسٹیج کی طرف جا چکے تھے وقت ہے کہ ارا چلا جا رہا ہے۔ وہ پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

اندر پانچویں ایکٹ میں شہزادہ ملا یا کیشو کا جعلی دوست بھاگو رائین شہزادے سے مخاطب تھا۔

"راجکمار، وہ جو سیاست میں عملی طور پر حصہ لیتے ہیں سیاسی مقاصد کی ضرورت دشمنوں، ساتھیوں اور غیر جانب دار فریقین کی گروہ بندی کا تعین کرتی ہے۔ غیر سیاسی انسانوں کی طرح محض ذاتی پسندیدگی کی بنا پر یہ دوستیاں استوار نہیں کی جاتیں شہزادے ـــ سیاسی مقاصد کی وجہ سے دوست دشمن میں اور دشمن دوستوں میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ حکمت عملی سارے پرانے بندھنوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی ہے جس طرح انسان اپنی موجودہ زندگی میں پورب جنم کی باتیں بھول جاتا ہے۔" ایک افسر اسٹیج پر آیا۔

"مہاراج کی جے ہو!" اس نے کہا "حفاظتی چوکی کے نگران درگھ رکش کی عرضداشت ہے کہ ایک شخص جس کے پاس پروانہ راہداری نہ تھا ایک خط کے ساتھ شاہی خیمہ گاہ سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

اب "بھاگو رائین" کہہ رہا تھا ـــ

"مہاراجکمار! ہمیں پورہ پر تیز بول دینا چاہیئے۔
تاکہ ـــ

لودھرا کے پھولوں کے زردانے سے سجے رخساروں والی گوڑ کی عورتوں کے چہرے خاک آلود ہو جائیں اور ان کے بھنورا ایسے گھنگریلے بالوں کی چمک ہمارے شہسوار دستوں کی ٹاپوں سے اڑائی ہوئی دھول کے

ستونوں میں چھپ جائے۔ اور فلک کے بگولوں کے یہ ستون ہمارے جنگی ہاتھیوں کی سونڈوں سے برستے پانی سے کٹ کر دشمن کے سروں پہ جا گریں۔

برآمدے میں سے ایک گروہ باتیں کرتا گرین روم کی طرف چلا گیا۔ برساتی میں سے ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ چاند املتاس کی اوٹ میں سے نکل آیا۔

کچھ دیر بعد یہ سب لوگ مسز ڈولی سین کے یہاں جائیں گی۔ اور سگریٹ کے دھوئیں سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم کے قالینوں پر بیٹھ کر زیادہ جوش و خروش سے اپنی پروفیشنل گفتگو میں مصروف ہوں گے۔

پیچھے سے اسے کیلاش کی آواز سنائی دی۔ وہ گیلری سے نکلتے ہوئے پردیپ سے کہہ رہا تھا "سنو سین کے ہاں جانے سے پہلے باہر جا کر تھوڑا حلق تر کر لیا جائے —"

یہ حلق تر کرنا اسے بھی بہت پسند تھا۔ ان لڑکوں کو یہ بات معلوم نہیں ورنہ وہ اسے فوراً مدعو کر لیں۔ ان کے گروہ کی کوئی لڑکی ڈرنک نہیں کرتی تھی۔ اب گیارہ بج رہا ہے۔ بارہ بجے گا۔ آدھی رات ہو گی۔ فقط ڈرنک کرکے یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت معدوم ہو گیا۔ کیلاش کتنا خوبصورت ہے۔

ڈرامہ قریب الختم تھا اور "سمیدھر" کہہ رہا تھا۔

"ان دوستوں سے جدائی جن کی جگہ دل میں ہے۔

راگ رنگ میں مصروف اور شراب خانوں میں مے نوشی کرتے ہوئے بھی دل میں کشاکش ہے۔

کیا حسب حال مکالمہ ہے! وہ مسکرائی۔ کس سے جدائی —؟ کس کی جدائی —؟ کس کس کی جدائی —؟

اور کھٹک گئیں —!! ڈیم — ڈیم — ڈیم —

اب آخری ایکٹ کے شروع میں راکشس آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"یہ باغ کتنا سنسان ہے"

کیوں یہاں —

بارہ دری جو ایک طاقتور شاہی خاندان کی طرح تعمیر کی گئی تھی ٹوٹ کر گر چکی ہے۔

بغیر پھولوں کے درخت نااہل بادشاہوں کی سیاسی کارروائیوں کی طرح اجاڑ ہیں۔ زمین پر جھاڑ جھنکاڑ بے وقوف انسانوں کے دماغ کے ناقابلِ عمل منصوبوں کی طرح اگ رہا ہے۔

اور —

کلہاڑیوں سے کٹی ہوئی شاخیں فاختاؤں کی کوکو کی وجہ سے گویا درد سے کراہ رہی ہیں۔ سانپ اپنے پیارے دوستوں کے اس دکھ کو دیکھ کر ان کی ڈالیوں سے اس طرح لپٹے ہیں جیسے ان کے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوں —

پتیوں سے عاری درخت اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی کی ارتھی کے ساتھ جانے کیلئے تیار ہوں۔
اسٹیج کی روشنیاں بجھنے لگیں۔ کامران نے ہال میں سے اسے پکارا ــ "ستیا جی ــ"
وہ چونکی ــ
"آپ کا فون ــ مسٹر چودھری ــ"
وہ اٹھ کر اسٹیج کے پچھلے کمرے میں گئی۔ بلقیس اور نیلاکش میز پر جھکے تندہی سے تعارفی کتابچے کا مضمون لکھنے میں مصروف تھے۔

"آج تمہارے بہت فون آئے ہیں بھئی ــ" للتا نے اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر کہا ــ
"ہلو ــ" اس نے ریسیور اٹھایا۔
"ہلو ــ ستیا ــ"
"ہلو یس ــ"
"ستیا ــ ہم قمرل بول رہے ہیں۔ ہم آج ہی صبح کلکتے آئے ہیں۔ نیشنل تھیٹر سے اپنا پتا لے کر ــ تم کو صبح سے کئی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی ــ آخر معلوم ہوا کہ تم ادھر بلقیس کی ریہرسل میں آنے والی ہو ــ بلقیس کیا پروڈیوس کر رہی ہے ــ؟"
"ہاؤ آر یو ــ تم ــ؟"
"فائن ــ تم بتاؤ ــ نیویارک سے کب آئیں ــ؟"
"کافی دن ہو گئے۔ تم تو بہت عرصے سے یہیں ہو ــ"
"ہاں لیکن مارچ میں ہم ماسکو جا رہے ہیں یہیں پلے کے ساتھ ــ اور کچھ پرانی باتیں کرو ستیا ــ نیویارک، ہمارے آنے کے بعد اداس تو نہیں ہو گیا؟ ہاؤ از اولڈ جمیل ــ بعد میں اس سے ملنا ہوا؟ ــ تمہارا کیا پروگرام ہے؟ ستیا تمہیں دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے ــ سنو تم ایسا کرو ــ کہ تم ابھی کونسٹی ٹیوشن ہاؤس آ جاؤ۔ یہاں سے اکٹھے اشوکا ہوٹل چلیں گے۔ پرو جیش بابو نے پارٹی میں بلایا ہے نہیں تم لیٹ کر رہی ہو۔ بالکل نہیں کرو گی۔ پرو جیش کو نہیں جانتیں؟ تم نے اب تک دنیا میں کیا کیا ہے؟! میں تمہاری "نہیں" "نہیں" سنوں گا۔ آ رہی ہو نا؟ گڈ ــ ابھی فوراً آ جاؤ ــ"
ستیا ہنس ہنس کر اس کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اور بلقیس بھنچے لکھتے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا کی۔

۵

ستیا سے بات کرنے کے آدھے گھنٹے بعد ابو الفصاحت قمر الاسلام چودھری اشوکا ہوٹل کی طرف

رواں تھا۔ چند منٹ قبل مادھوری رنگاراؤ اپنی کار میں اسے لینے کے لئے آپہنچی تھی اور کہا تھا چلو جلدی۔ چاندنی میں تمہارا بہت دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔ اور اس وقت تک وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اسے سیتا کو کونسٹی ٹیوشن ہاؤس بلایا ہے۔

قمر الاسلام چودھری مرشدآباد کا رہنے والا تھا۔ اس کی بہت خوبصورت آواز تھی لانبی لانبی پلکیں۔ سانولا رنگ۔ خالص رومینٹک شکل۔ وہ ایسا آدمی تھا جس پر کالجوں کی شاعر پرست لڑکیاں زہر کھاتی ہیں۔ کلکتہ سے ایم اے کرنے کے بعد کئی سال تک وہ ترقی پسند ڈرامے پروڈیوس کرتا رہا۔ فلموں میں کام کیا۔ بنگالی اور انگریزی میں شاعری کی۔ فنکاروں کے ڈیلیگیشن کے ساتھ روس، مشرقی یورپ اور عوامی چین کے چکر لگائے پھر امریکا چلا گیا۔ وہیں اس کی انگریزی شاعری کو "ڈسکور" کیا گیا۔ حال ہی میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ لندن سے شائع ہوا تھا جس نے انگریزی ادب میں دھوم مچا دی تھی۔ ڈوم موریز کے بعد یہ دوسرا ہندوستانی تھا جس نے انگلستان اور امریکہ کے عظیم ترین نقادوں سے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ نیو سٹیٹسمین اور ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ میں اس کے متعلق لمبے لمبے مضمون لکھے جا رہے تھے۔ اتنی بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ لڑکیوں کی نظروں میں اور زیادہ گلیمرس ہو گیا تھا۔ مگر قمر الاسلام کافی لاپروا اور غیر ذمہ دار تھا۔ دوستوں سے پیسے ادھار لے کر واپس نہ کرتا تھا۔ عموماً بیکار رہتا تھا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جسے عورتوں پر خود عاشق ہونے کی زحمت گوارا کرنا ہی نہیں پڑتی تھی عورتیں اسے اپنا محبوب بنانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

بلقیس کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اور وہ اسے ابوالحماقت قمر الاسلام چودھری کہتی تھی۔ اس کی غیر پروفیشنل حرکتوں سے جلتی تھی۔ اور اس کے پوز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ان دنوں مادھوری رنگاراؤ اس پر بُری طرح فدا ہو چکی تھی۔ وہ مالاباری حسن کا مکمل نمونہ تھی اور سیتا سے کہیں زیادہ دلکش اور فرمانبردار تھی۔ اور اس کو سیتا سے کہیں زیادہ گرم جوشی سے چاہ رہی تھی۔ سیتا کے متعلق اسے یقین نہ تھا کہ وہ اب اس کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کرے گی۔

اور قمر الاسلام چودھری انگریزی زبان کے اس مقولے میں یقین رکھتا تھا کہ ہاتھ پر بیٹھی ہوئی ایک چڑیا جھاڑیوں میں چھپی ہوئی دو چڑیوں سے زیادہ بہتر ہے۔

(۶)

دلہن رخصت ہو کر جا چکی تھی۔ منجھلی خالہ کونوں میں منہ چھپا کر روتی پھر رہی تھیں۔ بڑے بھیا بار بار آنسو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگوں کے اٹھنے کے بعد شامیانے کے نیچے صوفے اب فضلے بے ترتیبی سے پڑے تھے

کارچوبی مسند پر جہاں ابٹن اور بعد میں آرسی مصحف ہوا تھا اب بچے کود رہے تھے اور پھولوں کے ہار بکھرے پڑے تھے۔ میراثنیں گاتے گاتے تھک چکی تھیں۔ شہر کی ادبی سوسائٹی کے اراکین دولہا دلہن کو خدا حافظ کہتے موٹروں میں سوار ہو رہے تھے۔ بلقیس رشتے داروں کے ہجوم میں اندر تک زور زور سے ہنس رہی تھی۔ سیاہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس اس کا کزن نادر مہمانوں کو سگریٹ پیش کرتے کرتے ایک کرسی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی بھابی جان شامیانے کے ایک کونے میں اس کے دوستوں کے ہجوم میں کھڑی مسئلہ کشمیر پر دھواں دھار تقریر کر رہی تھیں۔ ہمارا بیڑا غرق کروائیں گی۔ نادر نے بڑی پریشانی سے سوچا۔ اور پھر کافی منگوانے کے لئے کوٹھی کے اندر چلا گیا۔

وہ اسی طرح کھڑی بحث میں الجھی رہی تھی جب ایک بے حد شاندار شخص ہاتھ میں کافی کی پیالی لئے اس کے قریب سے گزرا۔ اور اسے دیکھ کر بڑی اداسی سے مسکرایا۔ گویا اس کی آنکھوں میں تیرتے بے پایاں الم کو سمجھتا ہو۔ یا سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے بالوں کے انداز میں جمیل کی ہلکی سی جھلک تھی جس نے ایک لمحے کے لئے اسے بہت مضطرب کیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا تھا کہ وہ کارچوبی مسند کے قریب کھڑا بلقیس سے بڑے اخلاق سے گفتگو کر رہا تھا اور وہ بھی اسی اخلاق سے اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

ایک رشتہ دار لڑکی کافی کی ٹرے لے کر اس کی طرف آئی۔ "یہ کون صاحب ہیں؟" اس نے لڑکی سے پوچھا —

"ارے یہی تو عرفان بھائی ہیں —" لڑکی نے جواب دیا اور آگے چلی گئی۔

پھر نادر خشک میوے کی پلیٹ لے کر اس کے نزدیک آیا۔ اس نے ذرا جھجک کر پھر وہی سوال کیا —

"یہ کون صاحب ہیں؟"

"ارے! — آپ ابھی ان سے نہیں ملیں! ٹھہرئیے ابھی ملاتا ہوں —" وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس شخص کے پاس پہنچا — "عرفان بھائی۔ ادھر آئیے آپ ہماری بھابی جان سے اب تک ملے ہی نہیں۔ واہ —" وہ اسے اپنے ساتھ لے کر پھر واپس آیا۔ "جناب عالی۔ یہ ہمارے جمیل بھیا کی دلہن ہیں۔ ڈاکٹر ستیا جمیل۔"

اس نے بڑی ادا سے حسبِ عادت آداب عرض کیا۔

"آداب۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "آئیے یہاں بیٹھ جائیں۔ آپ اتنی دیر کھڑے کھڑے تھک تو نہیں گئیں؟ میں آدھ گھنٹے سے آپ کی تقریر سن رہا ہوں۔" وہ تینوں دور ایک کونے میں رکھے ہوئے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔

"میں اپنے کیس کا نقطۂ نظر بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر آپ لوگ دوسری پارٹی کا نقطۂ نظر

سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے ۔ ہونہہ ۔۔۔ ذرا تو منطق استعمال کیجئے۔ فوراً EMOTIONAL ہو جاتے ہیں آپ لوگ ۔۔۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے یہاں بہت پڑھے لکھے لوگ بھی بہت بھولے بھولے سے ہیں ۔۔۔"

"EVERY CASE IS EMOTIONAL, THE REST IS ARGUEMENT."

عرفان نے مسکرا کر جواب دیا ۔"

وہ ذرا تعجب سے اسے دیکھنے لگی ۔ اتنے میں اس کے ایک اور سسرالی رشتہ دار ناصر بھائی قریب آکر بیٹھ گئے ۔ "بھابی جان کافی منگواؤں ؟" نادر نے پوچھا "آپ کو کراچی کیسا لگا ؟" عرفان نے پوچھا (کیسا شدید احمقانہ سوال محض سوشل گفتگو کی خاطر مجھے بھی کرنا پڑ رہا ہے ۔ اسنے دل میں سوچا)

اب نادر، ناصر اور عرفان تینوں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں ۔ عرفان نے اس سے پوچھا ۔" آپ کیسی ڈاکٹر ہیں ۔۔۔؟ دواؤں والی یا دوسری ۔۔۔؟"

"جی نہیں صاحب ۔ یہ دوائے دردِ دل بیچتی ہیں ۔۔۔" ناصر نے دیور کے رشتے سے اس سے مذاق کیا ۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی یہ لوگ اس کے لئے پیچھے پیچھے بچھے جا رہے تھے ۔ رشتے کے دیور اور نندیں ہر وقت اسے چھیڑتے ۔

تلسی پور کی ہیرسنیں جو اس خاندان کے ساتھ ہی ہجرت کر کے کراچی آ گئی تھیں اور یہاں لانڈھی میں رہتی تھیں رات کو قہقہ اور بلغمیں کو سن سنا کر اس سے مخاطب ہوئیں ۔

ساس ہماری یوں کہہ گئی تھیں + بہو جوگی کو چٹکی دیجیو نا ری
میں البیلی بھول گئی تھی + میں نے جوگی کو ہنڈی نے ڈاری رے

نادر اس کے لئے طرح طرح کے پروگرام بناتا خصوصاً اس خیال سے کہ جمیل نے اس کو طلاق دیئے بغیر دوسری شادی کر لی ۔ یہ لوگ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے ۔ "دلہن ہم تو تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں ۔" منجھلی خالہ بار بار کہتیں ۔

"نہیں صاحبزادے میرے سامنے ۔ ورنہ مارے جوتوں کے فرش کر دیتا ۔۔۔ ان کو میرا غصہ معلوم ہے ۔۔۔" بڑے بھیا نے اس سے کہا تھا ۔

منجھلی خالہ دلہن کی تصویریں ہر آنے گئے کو دکھاتیں ۔۔۔ "دیکھو کیسا چاند سا ہے ۔ بالکل ہمارے جمیل جیسا ہے ۔۔۔"

"ہماری بھابی جان بے حد قابل ہیں ۔۔۔" نادر نے بڑے فخر سے عرفان کو اطلاع دی ۔ عرفان نے نظریں

اٹھا کر ستیہ کو دیکھا۔ وہ ذرا گھبرا سی گئی۔ اتنے میں بڑے بھیا وہاں آئے۔ ستیہ نے فوراً ساری کے پلوسے سر ڈھانپ لیا۔ تینوں نوجوان تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھابی دلہن۔" بڑے بھتیجے نے اسے مخاطب کیا۔ "بلقیس کہہ رہی ہیں کہ اگلے اتوار کو آپ بمبئی جا رہی ہیں۔ بتائیے کیا ارادہ ہے ——؟"

اگلے اتوار کو —— وہ سہم سی گئی۔ اتنی جلدی —— اتنی جلدی وہ یہاں سے چلی جائے گی اور پھر شاید اس شخص کو کبھی عمر بھر دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ "ہم تو چاہتے تھے کہ ابھی کچھ دن تم یہاں رہو۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ مگر بیٹی جلدی مچا رہی ہیں کہ ان کو جلد از جلد بمبئی پہنچنا ہے۔" بڑے بھیا کہہ رہے تھے۔

"بڑے بھیا ہم نے سوچا تھا کار سے لاہور جائیں گے۔" انور نے کہا۔ "آیئے بھابی جان اندر چل کر بلقیس سے بات کرلیں۔"

وہ عرفان کو شب بخیر کہہ کر انور کے ساتھ کوٹھی میں گئی۔

اسی رات جب وہ جہیز کے کمرے میں چیزیں سنگوانے میں دوسری لڑکیوں کی مدد کر رہی تھی تو منجھلی خالہ نے اچانک اس سے پوچھا۔

"دلہن —— تم عرفان کو دیکھ لیو؟"

"جی ہاں۔"

"ان کی ماں بلقیس بٹیا کے لئے دلی ان کا پیغام بھیجن ہیں۔ ہم بلقیس کا ای لئے یہاں بلائے ہیں کہ عرفان کا دیکھ لیں۔ مگر وہ ایسی الٹی عقل کی ہیں کہ دیکھو جو ان کے جی پر بیٹھیں۔"

"اچھا؟" ستیہ نے ایک سعادت مند بہو کی طرح خاندانی مسائل میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو خاصے معقول آدمی دکھے۔"

"معقول تو ہیں۔ مگر بلقیس بھی تو سمجھیں۔"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"بہت اونچی نوکری ہے۔ ڈیڑھ دو ہزار پاوت ہیں۔ لاکھن کا اور کا چہئے! ذات رات کی بھی ٹھیک ہے۔" منجھلی خالہ نے تکیوں کے ڈبے اوپر تلے چنتے ہوئے جواب دیا۔ "ہردوئی کے رہنے والے ہیں۔ ہردوئی جانت ہو؟"

"جی نہیں —— جی ہاں ——" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ہمری بلقیس کے دماغ کا کیڑا ایک یہ ہے کہ پاکستان نہ آئیں۔ اب وہاں تو پاکستان ہے۔"

ستیتا لٹکے ہوئے جوڑے اٹھا اٹھا کر مسہری پر رکھتی گئی۔

"کل تم نادر بھیا کے ساتھ جاؤ کے تنک اپنی کوٹھی تو دیکھ لیو ـــــ" منجھلی خالہ نے کہا۔

کراچی آنے سے ایک روز قبل وہ بلقیس کو اپنے گھر قرولباغ لے گئی تھی۔ بلقیس کو اسنے آجتک اپنے گھر مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں کسی کو اپنا صحیح پتہ نہ بتاتی تھی۔ مگر جس روز وہ کراچی کیلئے اسباب باندھ رہی تھی اس کی ماں نے اصرار کیا تھا کہ وہ بلقیس کو کھانے پر بلالے۔ کیسی بُری بات ہے کہ میں نے آج تک تمہاری نند کو نہیں دیکھا۔ ستیتا کچھ مہینے سے ایک سرکاری محکمہ میں ملازم ہو گئی تھی اور دفتر سے اسنے بلقیس کو فون پر دعوت دی تھی۔ اس کے فوراً بعد بلقیس نے ہما کو فون کیا تھا کہ وہ شام کو ستیتا کے گھر جا رہی ہے اور اسے پک اپ کرے گی۔ دوپہر کو وہ لنچ کے وقت کناٹ سرکس کے ایک ریسٹوران میں بلقیس سے ملی تو بلقیس نے اس سے کہا تھا ـــــ "میں پرانی دلی جا کر ہما کو لیتی ہوئی آٹھ بجے تک تمہارے یہاں آجاؤں گی ـــــ"

"ہما کو لیتی ہوئی ـــــ؟"

"ہاں ـــ ہاں ـــ کیوں؟"

"تم نے ہما کو کیوں بلایا ـــــ؟"

بلقیس بھونچکی رہ گئی تھی۔ "ہما تمہاری اتنی پرانی دوست ہے۔ اس کو بلانے میں کیا حرج تھا؟ میرا تو خیال تھا کہ تم پہلے ہی اس سے کہہ چکی ہوگی ـــــ"

"مگر بلقیس ـــــ ہما اتنی شاندار کوٹھی میں رہتی ہے۔ میں اسے اپنے گھر کیسے بلاؤں۔ میرے ہاں تو بیٹھنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ تم میری رشتے دار ہو تمہاری دوسری بات ہے ـــــ"

"ستیتا ـــــ" بلقیس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا "ستیتا۔! اور تم کلاس اور طبقاتی شعور کے متعلق اتنی تقریریں کیا کرتی ہو ـــــ!؟"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" اسنے چڑ کر جواب دیا تھا ـــــ

BUT I HAPPEN TO HAVE A LOT OF PERSONAL PRIDE.

"مگر سچ تو ـــــ تو اب میں ہما کو کیسے منع کروں؟"

"ابھی منع کر سکتی ہو ـــــ"

[illegible] کے چلتے ہوئے جب وہ قرولباغ کی ایک گلی میں پہنچی۔ [illegible]

میں سے سنیتا کی چھوٹی بہنیں جھانک رہی تھیں۔ سنیتا کی ماں نے دروازہ کھولا۔ یہ کسی نچلے متوسط طبقے کے مسلمان کا چھوڑا ہوا تنگ و تاریک چھوٹا سا مکان تھا۔ ممی دونوں لڑکیوں کو وسطی کمرے میں لے گئیں اور دری پر بٹھا دیا۔ ایک طرف کو پلنگ بچھا تھا اور دیوار کے برابر ٹرنک چنے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ... کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ کچھ دیر بعد ممی نے الماری کے پیچھے سے فریم کیا ہوا ... نکالا اور ... پونچھ کر اسے میز پر رکھ دیا۔ ملقیس۔ یہ ... اس کمرے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتار کر حفاظت سے رکھ دیا ہے کئی بار سنیتا سے کہا کہ اسے تمہارے ہاں پہنچا دے کہ شاید کبھی غلطی سے یہاں کسی سے بے ادبی ہو جائے۔ اب تم لیتی جانا۔"

"جی اچھا۔" ملقیس نے جواب دیا تھا۔

ممی نے تھالیاں اور کٹوریاں دری پر پروسیں۔ ... اور ملقیس بڑے آرام سے ٹانگیں پھیلا کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئیں اور ممی اور اس کی چھوٹی بہنوں ... سے مزے مزے کی باتیں کرتی رہیں۔ سنیتا دوسری دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی تھی۔ مقابل کی دیوار پر ہنومان جی کی تصویر ٹنگی تھی جو پہاڑ ہتھیلی پر اٹھائے اڑے چلے جا رہے تھے۔ میں نے بھی زندگی کا پہاڑ اٹھا کر آسمانوں پر اڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

"بی بی ـــــ کراچی عامل کالونی میں ہماری اٹھارہ کمروں کی دو منزلہ کوٹھی تھی ـــــ" ممی گلاسوں میں پانی انڈیلتے ہوئے ملقیس سے مخاطب تھیں۔

سنیتا نے بڑی کوفت سے ان کو دیکھا تھا۔ یہ قصہ ہر ایک کو سنا کر انہیں کس قسم کا اطمینان محسوس ہوتا ہے؟

"اس کوٹھی میں ڈاکٹر صاحب نے ـــــ سنیتا کے ڈیڈی نے ـــــ چھ کمروں میں سنگِ مرمر کا فرش لگوایا تھا۔"

"ممی اب ختم کرو یہ رام کہانی ـــــ" سنیتا نے چڑ کر کہا تھا۔

"نہیں ملقیس تم جا کر دیکھنا ضرور ـــــ اس کی نیلے رنگ کے شیشوں کی کھڑکیاں میں۔ دولت رائے محل" اوپر لکھا ہوا دور ہی سے نظر آتا ہے۔ جمشید روڈ سے موتی لال نہرو روڈ پر جب مڑو ـــــ"

"ممی ـــــ بھئی ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے۔ تم تم نے وہی ہٹ نے ـــــ" اسی وقت ڈیڈی ... آ گئے تھے۔

"کیوں بھئی ـــــ ہم کو دولت محل کے قصے سنا ... [illegible]"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا ... [illegible]

"بی بی تم دونوں تنے برسوں بعد ... [illegible]

سمجھ کر پھر بھی آنا ——

"صبح کو ناشتے کے بعد نادر تم کو تمہاری کوٹھی دکھا لائے گا ——" منجھلی خالہ نے نقرئی برتن سنگواتے ہوئے دوبارہ کہا ——

"جی نہیں —— نہیں دیکھوں گی —— کیا ضرورت ہے ——" اس نے جواب دیا —— منجھلی خالہ چپ ہو گئیں۔

چاند پور ہاؤس میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ چاند پور ہاؤس اس کے جیٹھ کی سکینڈے نیوین طرز کی دو منزلہ کوٹھی کا نام تھا جو انہوں نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں بنوائی تھی۔

"یہ ظاہر کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے کہ آپ لوگ ایک بیچ سے سابق تعلقہ دار ہیں اور ایک چھوٹا سا چاند پور نامی آپ کا تعلقہ موضع تلسی پور ضلع فیض آباد میں ۱۹۴۷ء تک موجود تھا۔ اور کچھ نہیں تو پاکستان آکر آپ ریفیوجی لوگ پرانے ناموں ہی سے چپکے ہوئے ہیں ——" بلقیس نے ایک روز صبح کو ناشتے کی میز پر حسب معمول اپنے پاکستانی عزیزوں سے جھگڑنا شروع کیا۔

"ہمارا چاند پور ہاؤس تھا کہ نہیں لکھنؤ میں جوپلنگ روڈ پر" منجھلی خالہ نے رسان سے کہا۔ ان کی آواز میں سیتا کو اپنی ماں کی آواز کی جھلک سنائی دی۔ وہ کوفت سے دریچے کے باہر دیکھنے لگی۔

ڈرائیو پر اس کی کار آکر رکی۔ وہ اترا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ بلقیس بے نیازی سے توس پر مکھن لگانے میں مصروف رہی۔

—— اس ایک ہفتے کے دوران میں وہ روزانہ صبح شام چاند پور ہاؤس آتا اور گھنٹوں بیٹھا سب سے باتیں کرتا رہتا لیکن ہمیشہ اس موقعے کی تلاش میں رہتا کہ سیتا کے نزدیک بیٹھ سکے لیکن کسی پر یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیتا کہ وہ سیتا کی قربت کا خواہاں ہے۔ منجھلی خالہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہیں کہ وہ بلقیس کی وجہ سے آرہا ہے۔ جب ایک آدمی اتنی خوشامد کرے گا تو لامحالہ لڑکی کو ہاں کرنا ہی پڑے گی —— انہوں نے فوراً بلقیس کی ماں کو ان کی بڑی بہن بھتیں تلسی پور اس مضمون کا خط بھی لکھ بھیجا کہ ماشاء اللہ سے بٹیا کی بات یہاں تقریباً پکی ہو گئی ہے۔

نوجوان پارٹی زیادہ وقت نادر کے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں گزارتی۔ ایک روز وہ برآمدے میں بیٹھے سہ پہر کی چائے پی رہے تھے جب عرفان نے دفعتاً سیتا سے کہا —— "آپ کو واپس جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ ہم پاکستانی اتنے بُرے نہیں! کچھ دن تو اور ٹھہر جائیے ——"

"میں تو دنیا کی کسی قوم کو بھی بُرا نہیں سمجھتی۔ مذہبی جنون اور شاونزم کا فلسفہ تو آپ جیسے غیر اشتراکی لوگوں ہی کی برکت ہے!"

"واقعی بھائی جان! ایک مہینہ اور ٹھہر جائیے۔ ورنہ آپ کا میں بڑھوا دوں گا فلائٹ ——" نادر نے کہا۔

"کیسے ٹھہر جاؤں۔ میرے پیچھے سی آئی ڈی نہیں لگ جائے گی۔"

"خیر سیّتا! —— اب تم اتنی اہم بھی نہیں کہ سی آئی ڈی تمہاری فکر میں اپنی راتوں کی نیندیں حرام کرے۔" بلقیس نے ہنس کر کہا "چند سال بعد اگر اسی رفتار سے ترقی کرتی رہیں تو ایجنسیوں کے تمہارے پیچھے لگنے کے امکانات البتہ ہیں!"

اس نے دانت سے ان تینوں کو دیکھا۔

فضول —— فضول —— دنیا کتنی فضول جگہ ہے۔

"آپ کا میکے کا نام کیا تھا —" عرفان نے پوچھا۔ وہ 'پرڈکشن' رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا جو نادر بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

"حیدرآبادی ——" اس نے چونک کر جواب دیا۔

"ہمارے یہاں بہ دوئی میں ایک سندھی انجینئر صاحب نیا نیا ہو کر آئے تھے۔ میرے لڑکپن میں" عرفان نے کہنا شروع کیا "ان کا نام مرید آفتی تھا۔ تو ایک روز وہ ملنے آئے تو نوکر نے اندر آ کر کہا بیگم صاحب چھچھوندی صاحب آئے ہیں اس کے بعد وہ بہت دنوں تک انہیں مرید آفتی کہتا رہا۔ یہ واقعہ مجھے اب تک یاد ہے —— ہم نے اس زمانے میں سندھی دیکھے ہی نہیں تھے۔ گرچہ میں دو تین سندھیوں کی دوکانیں تھیں۔ اور بس۔"

"ہاں" نادر چہک کر بولا "بلقیس تم کو فرنٹ مارٹ والا سندھی یاد ہے جب تم نے انڈیا والوں کے لئے اس سے پوچھا تھا کہ کیا ان کی شادی ہو گئی ہے اور کیا وہ واقعی بہت زیادہ کریک ہیں۔ تو اس نے جواب دیا تھا۔

YES MADAM, SHE IS MAD AND MARRIED BOTH

ہاہاہا —— ہم لوگ ان کے اس برجستہ جواب پر کس قدر ہنسے تھے۔"

"ہاہاہا —" عرفان بھی ہنسا۔ وہ پھر رسالہ دیکھنے لگا۔ نادر پرانی یادوں میں ڈوب گیا۔

فضول —— فضول —— وقت گزر رہا ہے۔

دفعتاً اس نے عرفان سے پوچھا —— "آپ کو معلوم ہے تھرڈ ڈگری کس طرح کی جاتی ہے ——؟"

"کیوں؟ آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟" عرفان نے پوچھا۔

"ایسے ہی۔ خیالات میں ربط یا منطق کا کیا ذکر؟"

عرفان نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بات ٹالنا چاہی "آپ نے وہ لطیفہ سنا ہے؟"

"کون سا؟"

"دی کہ ایک مرتبہ نیویارک میں لفٹ ونگ ادیبوں کے ہفتہ وار جلسے میں آدھے سے زیادہ خفیہ پولیس کے لوگ ہوا کرتے تھے تو ایک روز ایک جلسے میں ایک ادیب نے اٹھ کر حاضرین کو اس طرح مخاطب کیا ——

COMRADES, AND GENTLEMEN OF THE F. B. I.

"ہاہاہا —" نادر نے قہقہہ لگایا۔

پھر وہ چاروں بے حد کھوکھلی ہنسی ہنستے رہے۔

شام ہوئی تو سمجھ میں نہ آتا کہ اب کیا کیا جائے۔

"چلئے پکچر بھابھی جان ۔" نادر اس سے کہتا۔

"روز پکچر — اتم لوگوں کا اتنے انگریزی امریکن فلم دیکھتے دیکھتے جی نہیں اُوبھ جاتا ——؟"

عرفان سے بحث کرتے کرتے وہ جھنجھلا کر کہتی ۔" کوئی پولیٹیکل انڈر اسٹینڈنگ نہیں کتابیں نہیں ہیں تجھے فلم دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اخباروں میں لے دے کر وہی ایک مارننگ اسٹار ۔ جو قوم مارننگ اسٹار پڑھ کر اور اس کے کارٹون دیکھ دیکھ کر ساری عمر گذار دے اس کی سائیکولوجی کا کیا حشر ہوگا ——"

"بھابھی جان آپ واقعی ہارا ہیڑا کروا دیں گی۔ خود تو چلی جائیں گی اور ہمارا ہو جائے گا کونڈہ شریف۔ آپ ہر منل میں اس طرح کی انٹ سنٹ فضول باتیں اڑاتی رہتی ہیں ——"

وہ نادر کے احتجاج کا کوئی نوٹس نہ لیتی اور اسی طرح جائیں جھائیں کرتی رہتی۔

عرفان کی رخصت ختم ہو چکی تھی اور اسے لاہور واپس پہنچنا تھا۔ یہ طے ہوا کہ وہ سب دو موٹروں پر اکٹھے لاہور جائیں گے۔

اس روز شام کے وقت ستیا برآمدے میں اکیلی بیٹھی "لائف" رسالہ دیکھ رہی تھی جب وہ آگیا۔ یہ پہلا وقعہ تھا جب ان دونوں کے پاس تیسرا کوئی نہیں تھا ۔" پرسوں صبح چلنے کا انتظام ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب ۔" وہ ذرا فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے ڈاکٹر صاحب مت کہا کیجئے بہت برا لگتا ہے ۔"

"اچھا پھر کیا کہیں؟ مسز جمیل —بیگم صاحبہ —شریمتی جی —"

"آپ کو معلوم ہے میرا نام سیدھا سادا ستیا ہے ۔"

"بے حد پیارا نام ہے۔ اسی لئے لیتے ہوئے ذرا ڈر سا لگتا ہے ——"

وہ خاموش ہو گئی۔ وہ بلقیس کے سگے خالہ زاد بھائی کی بیوی تھی۔ وہ گویا اس کا ہونے والا نند وئی تھا۔ اور اس لحاظ سے مذاق کے رشتے کا پہلو نکلتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اسے مستقل چھیڑتا رہتا تھا۔ شاید ——

"آپ کے رام چندر جی اپنا راج پاٹ سنبھالنے اجودھیا کب لوٹیں گے؟" عرفان نے دریافت کیا اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ رام چندر جی نے دوسرا بیاہ کر لیا ہے۔ یہ خالص خاندانی معاملہ تھا اور عرفان بہرحال غیر آدمی تھا۔ "ابھی ان کی ٹرم دو سال کے لئے اور بڑھ گئی ہے۔ آپ نیویارک گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کب؟—"

"جب آپ وہاں نہیں تھیں۔"

"میں تو وہاں ۱۹۴۹ سے ہوں۔"

"میں بھی وہاں ۱۹۴۹ء ہی میں پہلی بار گیا تھا۔ دراصل میرے اور آپ کے حلقے مختلف رہے ہوں گے۔ اب امریکہ واپس کب جا رہی ہیں؟"

"ابھی کچھ طے نہیں۔" اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا اور دعا مانگی کہ بلقیس یا کوئی اور وہاں آ جائے اور یہ موضوع ختم ہو۔

جس روز صبح وہ لوگ سفر پر روانہ ہونے والے تھے اسی رات بلقیس کو فلو ہو گیا اور جانا چند روز کے لئے ملتوی کرنا پڑا۔

اب بلقیس بیمار پڑ گئی تو ستیا ہی اکیلی نادر اور عرفان کے ساتھ باہر جاتی رہی۔ اتنے عرصے میں وہ نادر کے دوستوں کے حلقے میں بہت مقبول ہو گئی تھی۔ نادر کے دوست زیادہ تر انٹلکچوئیل قسم کے لوگ تھے انہوں نے ستیا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عرصے بعد ان کو ایک زندہ جیتی جاگتی ہندو لڑکی نظر آئی تھی۔ پہلی مرتبہ جب نادر نے اپنے چند انٹلکچوئیل دوستوں کو ستیا سے ملوانے کے لئے چاند پور ہاؤس مدعو کیا تو منجھلی خالہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر کہا تھا۔

"یہ نادر بھیا کی پارٹی ہے یا شیو جی کی بارات ۔ایک سے ایک ہونق آدمی چلا آ رہا ہے۔"

"یہ سب لوگ بھابی جان سے ملنے کے لئے بلائے گئے ہیں۔" ایک لڑکی نے جواب دیا تھا۔

"تمہاری بھابی جان بھی تو خبطی ہیں —" منجھلی خالہ نے کہا تھا۔

اب عرفان بے تکلفی سے ستیا کا نام لیتا تھا اور اسے "تم" کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ قیصر چلنے کے لئے آئی ہوئی تھی اور دو دن بعد اپنے شوہر کے ساتھ پشاور جانے والی تھی۔

رات کو قیصر کے سسرال والوں کے اعزاز میں چاند پور ہاؤس میں بڑا بھاری ڈنر تھا۔ بلقیس اب ٹھیک ہو چکی تھی۔ اور نادر نے ان دونوں کے ساتھ شام کو رٹیس میں ایک پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔

تیسرے پہر کو ستیتا جلدی جلدی تیار ہو کر باہر جانے لگی تو ملقیس نے اسے آواز دی۔

"ملقیس آپی ——؟" ستیتا نے دروازے میں ٹھٹھکتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی باہر جا رہی ہو؟"

"ہاں۔ تم ساڑھے پانچ بجے پلیس ہوٹل آجانا۔ میں تم کو وہیں بار پر ملوں گی۔"

"بار پر ——؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں نے وہیں ڈِک سے اپوائنٹمنٹ کیا ہے۔ وہ کل اتفاقاً مجھے انفنسٹن اسٹریٹ میں مل گیا۔ میرے ساتھ کولمبیا میں تھا۔ یہاں ورلڈ بنک کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ کیوں ——؟"

"ستیتا ڈارلنگ ——" ملقیس نے پلنگ پر سے اتر کر ہاؤس کوٹ پہنتے ہوئے کہا: "تم ضرورت سے زیادہ EMANCIPATED ہو گئی ہو۔ یہ امریکہ یا انگلینڈ نہیں ہے۔"

"اوہ —— مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔" اچھا تو پونے چھ تک عرفان کے گھر آجاؤ۔ میں ڈِک سے کہوں گی مجھے وہاں اتار دے۔ عرفان پیلیس کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کچہری روڈ پر۔ کل ہم لوگوں نے انہیں وہاں ڈراپ کیا تھا ——"

"عرفان کے گھر ——" ملقیس نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ "ڈارلنگ وہ بیچلر آدمی ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔ تم اسکے گھر کیسے جا سکتی ہو؟"

"او مائی گاڈ —— اچھا۔ سوری۔ میں تم کو زیادہ شوک نہیں کرنا چاہتی۔"

"ڈنر کے لئے ابھی سے مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ تم کو واپس آکر تیار بھی ہونا ہے۔ نادرہ سے کہو آج بیچ گول کرے۔" ملقیس نے کہا۔

"اچھا۔" اسنے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

اپنے امریکن کلاس فیلو سے پیلیس کی بار پر ملاقات کرنے کے بعد اسنے کاؤنٹر پر جا کر عرفان کو فون کیا۔ اب اسے جلد چاند پور ہاؤس واپس جانا چاہیے تھا مگر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ شام تنہا عرفان کے ساتھ ہی گذار دے۔

چند منٹ بعد عرفان آگیا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست عثمان بھی تھا۔ وہ تینوں جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

ستیتا نے سرخ رنگ کی کانجی ورم کی ساڑی پہن رکھی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ڈنر کا وقت

آگیا مگر وہ بے پروائی سے میٹھی باتیں کرتی رہی۔ عرفان نے اس کے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے سراپا پر نظر ڈالی اور مسکرا کر پوچھا۔

"سیلِ بے جا ہے گنج میں سورج گہن کا آج
تم کس لئے بہ غیرتِ شمس و قمر گئے ---؟"

وہ ہنسنے لگی "سچ مچ آپ اردو والوں میں بڑا چینس ہے۔ یہ تو بقول نادر کو نڈہ شریف ہو گیا۔"

"اور اردو والے بھی کون --- لکھنؤ! --- جو نہ ہو اور آرزو سے کم تو بات ہی نہیں کرتے!!" عرفان کے دوست نے کہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ستیتا سے اجازت لی اور چلا گیا۔

اب رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پیلیس ہوٹل کے اس حصے میں نسبتاً خاموشی تھی۔ لوگ لاگو رسے کی طرف جا چکے تھے۔

"کافی دیر ہو گئی!" عرفان نے پوچھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ غروبِ آفتاب کے بعد محض سیاہ قہوے پر اکتفا کرنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔

"تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔"

"تسلیم۔"

پھر اس نے ستیتا کے بالوں پر نظر ڈالی۔

"تم مانگ میں سیندور نہیں لگاتیں؟"

"دراصل ---- وہ ---- میری سیندور کی ڈبیا ہی کہیں کھو گئی کراچی آتے ہوئے --- مجھے خالہ بھی کئی بار کہہ چکی ہیں کہ دلہن تم نے سیندور لگانا کیوں چھوڑ دیا۔ تمہاری سونی مانگ دیکھ کر ہول آتا ہے۔ ان کی خاطر میں نے سوچا کہ ضرور لگاؤں گی۔ مگر یہاں مل جائے گا سیندور ---؟"

"معلوم نہیں ---" عرفان نے آہستہ سے جواب دیا۔ "تلاش کروالو۔"

"آپ کہیں سے ڈھونڈ کر لادیجئے ---" پھر وہ یکلخت چپ ہو گئی۔ اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کیسی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ اس نے اس آدمی سے سیندور لانے کے لئے کیوں کہا۔ جسے وہ جمیل کے نام پر لگائے گی۔

اومائی گاڈ --- وہ دل میں کیا سوچتا ہوگا اس وقت۔ اس نے طے کیا کہ اسے ساری بات بتلائے۔

"آپ کو معلوم نہیں ---" اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "میں سیندور کس کے لئے لگاؤں۔ جمیل مجھے چھوڑ چکے ہیں۔" پھر وہ تیوری پر بل ڈال کر اور پلکیں جھپک جھپک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تاکہ آنسو نہ نکلیں۔

تیسرے پہر کو سیتا جلدی جلدی تیار ہو کر باہر جانے لگی تو ملقیس نے اسے آواز دی۔

"کہاں چلیں ——؟" سیتا نے دروازے میں ٹھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی باہر جا رہی ہو؟"

"ہاں۔ تم ساڑھے پانچ بجے پیلیس ہوٹل آجانا۔ میں تم کو وہیں بار پر ملوں گی۔"

"بار پر ——؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں نے وہیں ڈِک سے اپوائنٹمنٹ کیا ہے۔ وہ کل اتفاقاً مجھے انفنٹری اسٹریٹ پر مل گیا۔ میرے ساتھ کولمبیا میں تھا۔ یہاں ورلڈ بینک کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ کیوں ——؟"

"سیتا ڈارلنگ ——" ملقیس نے پلنگ پر سے اتر کر ہاؤس کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "تم ضرورت سے زیادہ EMANCIPATED ہوگئی ہو۔ یہ امریکہ یا انگلینڈ نہیں ہے۔"

"اوہ —— مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ اچھا تو پونے چھ تک عرفان کے گھر آجاؤ۔ میں ڈِک سے کہوں گی مجھے وہاں اتار دے۔ عرفان پیلیس کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کچہری روڈ پر۔ کل ہم لوگوں نے انہیں وہاں ڈراپ کیا تھا ——"

"عرفان کے گھر ——" ملقیس نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ "ڈارلنگ وہ بیچلر آدمی ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔ تم اس کے گھر کیسے جا سکتی ہو؟"

"او مائی گاڈ —— اچھا۔ سوری۔ میں تم کو زیادہ شوک نہیں کرنا چاہتی۔"

"ڈنر کے لئے آٹھ بجے مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ تم کو واپس آکر تیار بھی ہونا ہے۔ نادر سے کہو آج کچھ گول کرے۔" ملقیس نے کہا۔

"اچھا۔" اسنے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

اپنے امریکن کلاس فیلو سے پیلیس کی بار پر ملاقات کرنے کے بعد اسنے کاؤنٹر پر جا کر عرفان کو فون کیا۔ اب اسے جلد چاند پور ہاؤس واپس جانا چاہئے تھا مگر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ شام تنہا عرفان کے ساتھ ہی گذار دے۔

چند منٹ بعد عرفان آگیا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست عثمان بھی تھا۔ وہ تینوں جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

سیتا نے سرخ رنگ کی کانجی ورم کی ساری پہن رکھی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ڈنر کا وقت

آ گیا مگر وہ بے پروائی سے میٹھی باتیں کرتی رہی۔ عرفان نے اس کے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے سراپا پر نظر ڈالی اور مسکرا کر پوچھا۔

"میلہ ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج
تم کس لئے بغیرت شمس و قمر گئے ـــــ؟"

وہ ہنسنے لگی "سچ مچ آپ اردو دانوں میں بیٹھ کر میرا تو لقول نادر کوندہ شریف ہو گیا۔"

"اور اردو والے بھی کون ـــ لکھنوا ـــ! جو زبان اور آرزو سے کم تو بات ہی نہیں کرتے!!" عرفان کے دوست نے کہا۔ کچھ دیر بعد اسنے سنیتا سے اجازت لی اور چلا گیا

اب رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پلیتن ہوٹل کے اس حصے میں سنسان خاموشی تھی۔ لوگ لاگو سے کی طرف جا چکے تھے۔

"کافی پیوگی؟" عرفان نے پوچھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ غروب آفتاب کے بعد محض سیاہ قہوے پر اکتفا کرنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔

"تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔"

"تسلیم۔"

پھر اسنے سنیتا کے بالوں پر نظر ڈالی۔

"تم مانگ میں سیندور نہیں لگاتیں؟"

"دراصل ـــ وہ ـــ میری سیندور کی ڈبیا ہی کہیں کھو گئی کراچی آتے ہی ـــ منجھلی خالہ بھی کئی بار کہہ چکی ہیں کہ دلہن تم نے سیندور لگانا کیوں چھوڑ دیا۔ تمہاری سونی مانگ دیکھ کر ہول آتا ہے۔ ان کی خاطر میں نے سوچا کہ ضرور لگاؤں گی۔ مگر یہاں مل جائے گا سیندور ـــ؟"

"معلوم نہیں ـــ" عرفان نے آہستہ سے جواب دیا "تلاش کر والو۔"

"آپ کہیں سے ڈھونڈ کر لا دیجئے ـــ" پھر وہ یکلخت چپ ہو گئی۔ اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کیسی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ اسنے اس آدمی سے سیندور لانے کے لئے کیوں کہا۔ جسے وہ جمیل کے نام پر لگاتی تھی۔

او مائی گاڈ ـــ وہ دل میں کیا سوچتا ہوگا اس وقت۔ اسنے طے کیا کہ اسے ساری بات بتلائے۔

"آپ کو معلوم نہیں ـــ" اسنے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "میں سیندور کس کے لئے لگاؤں۔ جمیل مجھے چھوڑ چکے ہیں۔" پھر وہ تیوری پر بل ڈال کر اور پلکیں جھپک جھپک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تاکہ آنسو نہ نکلیں۔

"مجھے معلوم ہے" عرفان نے دبی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے جب کسی نے نہیں بتایا تھا تب ہی معلوم ہو گیا تھا۔ میں پہلے روز جب تم سے شامیانے کے نیچے ملا تھا میں نے تمہاری آنکھوں میں پڑھ لیا تھا کہ تم کتنی دکھی ہو۔

آؤ ــــ" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "چاند پور ہاؤس چلیں۔ تمہیں تو قیصر کی دعوت میں ویسے بھی پہنچنا چاہئے۔ تم اس گھرانے کی بہو ہو ــــ"

"اور آپ کو بھی دیر نہیں لگانا چاہئے۔ آپ اس گھرانے کے داماد بننے والے ہیں" مستقیل نے آہستہ سے کہا۔

کیا کروں ــــ کیا ہو سکتا ہے۔

"بالکل نہیں ــــ تمہیں معلوم ہے بلقیس کو میری ذرا برابر پروا نہیں۔"

"اور آپ کو ــــ آپ کو بھی اس کی پرواہ نہیں ؟"

"قطعی نہیں ــــ مگر تمہیں اس کا یقین کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو اٹھو دیر نہ کرو۔"

اس رات وہ چاند پور ہاؤس کے ڈنر سے جلد واپس چلا گیا۔ گھر پہنچا تو دیر تک نیند نہیں آئی۔ سنسان کمرہ اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ آخر جھنجلا کر اس نے عثمان کو فون کیا۔

"میں اعظم کی اسٹیگ پارٹی میں جا رہا ہوں۔ تم بھی جم خانہ آجاؤ" عثمان نے جواب دیا۔

"میں اب مزید کسی پارٹی میں نہیں جا سکتا۔"

"یار تم آ تو جاؤ۔ ایک کونے میں بیٹھ کر تمہاری ستیا ہی کی باتیں کرینگے۔ آؤ حسن یار کی باتیں کریں!"

"اچھا۔ میں پہنچتا ہوں۔"

وہ اپنے فلیٹ سے اتر کر ٹہلتا ہوا جم خانہ پہنچا۔ عثمان ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ برآمدے میں بہت دور جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

ستیا ــــ ستیا ــــ

ــــ ستیا جمیل بڑی زبردست فلرٹ معلوم ہوتی ہے ــــ" وہ چونک پڑا۔ پام کے گملوں کے ادھر زور شور سے گفتگو ہو رہی تھی۔ شاید وہی اسٹیگ پارٹی جاری تھی جس کے لئے عثمان نے اسے مدعو کیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کئے سنتا گیا۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ پر ہتوڑے چل رہے ہیں۔

"ایسی دیسی خالص MAN-EATER OF KUMAYON معلوم ہوتی ہے۔"

"اور اوپر سے بنتی پروگریسو ہے ــــ"

"سرخوں کے یہاں تو اخلاق کا تصور بہت بلند ہے۔"

"اچھا ــــ!"

"روسی تو اس سلسلے میں اچھے خاصے وکٹورین ہیں ــــ"

"بکواس۔ ان میں سب چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔"

"شاید آپ کو علم نہیں کہ روسیوں کو "پانی کے گلاس" کی تھیوری رد کئے بھی زمانہ ہو گیا۔"

"آپ کو ان خاتون محترمہ نے برین واشن کر دیا ہے۔"

"اجی وہ بے چاری کیا برین واشن کریں گی مگر آپ حضرات ان لوگوں میں سے ہیں جن کے قلوب پر اللہ میاں نے مہر لگا دی ہے۔ سچ ہے۔ جہالت میں بڑی برکت ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان کی نجی زندگی کو اسکے سیاسی عقائد کی کسوٹی پر کیوں کسا جائے۔"

"افوہ، آخر بعض اس لڑکی سے اس قدر کیوں کنفیوزڈ ہیں۔ آپ سب کی اشتہا لڑکیوں پر حکم لگاتے ہیں۔ بات یہ ہے یہاں ابھی کوئی نہیں ۔ ستیا جمیل۔ اٹل بینت ۔ یہاں صرف ہائی کلاس ٹائپ منگوانے کی اجازت ہے اور ستیا جیسی MONEY لڑکیاں ــــ"

"خیر۔ گائے کو دوسرے کے کھیت کی گھاس ہمیشہ زیادہ ہری نظر آتی ہے۔"

"بڑی ذہین ہے۔ کل رحمان کے وہاں کھانے پر گھنٹہ بھر سے چونکی لڑائی۔"

"سنا ہے ناچتی خوب ہے ــــ کتھا کلی۔"

"بھئی عورتیں کتھا کلی نہیں ناچتیں ــــ"

"چلئے خیر۔ میں کوئی بھانڈ تو ہوں نہیں جو مجھے ناچ کی اقسام معلوم ہوں۔"

"بہت اچھی لڑکی ہے بھئی۔ بس ذرا پیتی زیادہ ہے۔ بقول شخصے مچھلی کی طرح پیتی ہے۔"

"یہی تو اس کی ایک ادا ہمیں پسند آئی۔"

"واہ ــــ جانِ عالم واجد علی شاہ آپ ہی تو ہیں ــــ"

"ہم نے سنا ہے کہ اس نے اپنے میاں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اچھا۔ تو موقع ہے۔ قسمت آزمائی جائے ۔ ادھر ادھر عرفان صاحب چھپے بیٹھے ہیں۔ ۔ ارے بھئی عرفان۔ کیا خیال ہے۔ تم روشنی ڈالو اس معاملے پر ــــ"

"عرفان صاحب سے بات کرنا بیکار ہے۔ ولی اللہ آدمی ہیں۔"

وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

دوسری صبح ستیا اسے چاند پور ہاؤس کے پھاٹک ہی پر مل گئی۔

"رات آپ کھانے کے بعد اتنی جلدی چلے گئے۔ یہاں خوب گانا وانا ہوتا رہا۔" اسنے کہا۔

"اچھا۔"

"میں نے آپ کو کوئی رات گئے فون بھی کیا تھا۔ نوکر نے بتایا کہ آپ جم خانہ چلے گئے ہیں۔"

"اچھا ـــ"

"کیوں ـــ آپ کو کیا ہو رہا ہے۔؟" اسنے ذرا سہم کر پوچھا۔

"ستیا ـــ"

"جی ـــ؟"

"لوگ تمہارے لئے طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کیا دلّی میں بھی لوگ، اسی قسم کی باتیں تمہارے لئے کرتے ہیں؟"

"ضرور کرتے ہوں گے مجھے پتہ نہیں ـ"

"پرواہ بھی نہیں ـــ؟"

"اونہہ ـــ" وہ یکلخت جھنجھلا گئی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ "اندر چلئے۔ اسباب بندھ چکا ہے۔ آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔" اسنے سرد مہری سے جواب دیا۔

اندر باقاعدہ رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ کراچی کی رشتہ دار بیبیاں شادی میں آئی ہوئی ہندوستانی بیبیوں سے گلے مل مل کر زار و قطار رونے میں مصروف تھیں۔ ملقیس سوں سوں کرتی پھر رہی تھی۔ مرد لوگ بھی ناک سنک سنک کر آنسو پونچھ رہے تھے۔ مخملی خالہ لپٹ لپٹ کر سب کی بلائیں لے رہی تھیں۔

عرفان نے گیلری کے دروازے میں کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھا اور اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "یہ سب لوگ کتنے گدھے ہیں۔" اسنے چپکے سے ستیا سے کہا۔

سارے ہندوستانی رشتہ دار ہوائی جہاز سے واپس جا رہے تھے۔ صرف ملقیس اور ستیا نادر اور عرفان کے ساتھ لاہور جانے والی تھیں۔ کراچی سے بھی دو تین کزن لاہور تک ہمراہ جا رہے تھے۔ ساری پارٹی باہر آ کر موٹروں میں لدی۔ ستیا ملقیس کے ساتھ نادر کی کار میں بیٹھ گئی۔ عرفان نے دوسرے عزیزوں کو اپنی شیو میں بھرا۔ "امام ضامن کی ضامنی" کے غل میں موٹریں "فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ" کے ٹیڑھے میڑھے راستے سے نکل کر ڈرگ روڈ پر آ گئیں اور ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

۷

"نگر ٹھٹھہ ـــ" نادر نے شاہ جہاں کی مسجد کے سامنے کار روکتے ہوئے گویا اناؤنس کیا۔

جب وہ بھری دوپہر میں جامع مسجد کا چکر لگا کر بنیوں کی گلی میں سے گذر رہے تھے اس وقت ان اجاڑ مکانوں میں جو سرکنڈے اور مٹی سے بنائے گئے تھے ہوا یکلخت بہت تیزی سے سنسنانے لگی۔ اور اب معلوم ہوا جیسے یہ جگہ دنیا کی ساری پریشان حال آوارہ غریب الوطن روحوں کا لرزہ خیز مسکن ہے سیتا خاموشی سے پیچھے پیچھے بلقیس کے ہمراہ چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد عرفان اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"آپ کو معلوم ہے اس کا نام ٹھٹھہ کیوں ہے" اسنے کو گلزاتا۔ تے ہوئے عرفان سے پوچھا۔

"نہیں —"

"مغل دربزدوں کے زمانے میں یہ شہر اتنا بارونق اور اتنا آباد تھا کہ یہاں پوری ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ آپ کو تاریخ کی پرانی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟"

"بالکل نہیں —"

"اوہ —"

جب وہ کاروں میں سوار ہونے لگے تو بلقیس نے اسے چپکے سے کہا۔ تم عرفان کی کار میں بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا نسیم باجی وغیرہ سے گپیں ہانکنا چاہتی ہوں لیکن میں ان کی کار میں جو کر بیٹھی تو عرفان اور میں دونوں خواہ مخواہ کی کوفت محسوس کریں گے خصوصاً نسیم باجی وغیرہ کے سامنے — میں اس سب کو نادر کی کار میں بلوائے لیتی ہوں۔"

چنانچہ ٹھٹھہ سے روانہ ہوتے وقت سیتا کو عرفان کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ تینوں رشتہ دار نادر اور بلقیس والی کار میں منتقل کر دیئے گئے۔

اب وہ لوگ صحراؤں میں سے گذر رہے تھے۔ سیتا نے عرفان سے پوچھا "آپ نے اس روز مجھ سے سوال کیا تھا کہ مجھے کراچی کیسا لگا۔ اب یہی سوال میں آپ سے کرتی ہوں۔ میرا سندھ آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

وہ اس پر نظر ڈال کر چپ رہا۔

"اب مجھے یہ سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی ہے کہ ڈیڈی مجھ سے سارے سوالوں کے ناک میں دم کر دیں گے۔ تم نے فلاں جگہ دیکھی۔ فلاں گاؤں سے گزریں۔ ممی نے کہا تھا کہ اپنی کوٹھی دیکھ کر آؤں کس حال میں ہے۔ میں نے وہ بھی نہیں دیکھی۔

"تمہارے ڈیڈی کراچی میں کیا کرتے تھے؟"

"ڈاکٹر تھے — رام باغ میں ان کا کلینک تھا —"

"رام باغ —؟"

"رام باغ کراچی میں ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا ــــ؟"

"ارے ہاں۔ اسے اب آرام باغ کہتے ہیں ــــ"

سامنے سے اونٹوں کا قافلہ جا رہا تھا۔ ایک بکری سڑک پار کرتے ہوئے کار کی زد میں آگئی تو اس نے زور سے بریک لگا دی۔ دھچکے کی وجہ سے ستیا تقریباً عرفان کے اوپر جا گری۔ "سوری" ستیا نے گھبرا کر کہا۔

"قصور میرا تھا۔ بکری کا نہیں ــــ اب ــــ اب تمہارے ڈیڈی دلّی میں پریکٹس کرتے ہوں گے" عرفان نے بھی اپنی گھبراہٹ میں سلسلۂ گفتگو وہیں سے جوڑنا چاہا۔

"جی نہیں ــــ وہ کئی سال سے بیمار ہیں۔ اس لئے کچھ نہیں کرتے۔ میرا چھوٹا بھائی بھلائی کی اسٹیل مل میں انجینئر ہو گیا ہے۔ اسی بے چارے کی وجہ سے گذر ہوتی ہے۔"

"اوہ ــــ"

"وہ سامنے دیکھئے۔ ہم لوگ حیدر آباد جاتے ہوئے اکثر اس درخت کے نیچے کار روکتے تھے۔ یہیں پر ایک بار میری ٹانگ میں بڑی چوٹ آگئی تھی۔"

وہ چپ چاپ کار چلاتا رہا۔

"کیا آپ کو اس کا احساس نہیں کہ یہ میرا دیس ہے۔ میرے کھیت۔ میرے گاؤں۔ میرے پیرُوں کے مزار ــــ" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس قدر سنٹی منٹل ہو ــــ" عرفان نے کہا۔

"جب کبھی آپ دلّی آئے تو راستے میں جمنا کے پل پر سے گذرتے ہوئے میں دیکھوں گی کہ آپ سنٹی منٹل ہوتے ہیں یا نہیں ــــ"

"میں یادوں کا روگ نہیں پالتا ــــ"

"اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے یہ بات بتا دی ــــ!"

"دوسری بات یہ کہ ــــ میں دلّی آنے ہی کیوں لگا ــــ"

"کیونکہ وہاں آپ کی سسرال جو بننے والی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ پھر تم نے میکے سسرال کا وظیفہ شروع کر دیا۔ عورتوں والی چیپچر باتیں ــــ" اس نے کار کی رفتار زیادہ تیز کر دی۔ وہ برابر نادر کی کار کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اور یہ خیال رکھتا تھا کہ اس کے پیچھے نہ ہونے پائے۔ تاکہ وہ دونوں پچھلی والی موٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظروں کے سامنے

رہیں ——

کس قدر محتاط آدمی ہے، واقعی بستیا نے سوچا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دھول اڑاتی ہوئی ایک ٹرک قریب سے نکل گئی۔ اب وہ ایک قدیم قبرستان کے برابر سے گذر رہے تھے۔

"سارا سندھ قبروں کا ملک ہے۔" عرفان نے چند لمحوں کے بعد اظہار خیال کیا۔

"آپ کو پتہ ہے یہ کتنا پرانا ملک ہے؟" غالباً اس کی معلومات بہیں ختم ہونے پر تلی بیٹھی تھی۔ واقعی بہت تلی لڑکی ہے۔ یہ کچھ دیر چپکی کیوں نہیں رہ سکتی؟ مگر شاید انسان اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے متواتر باتیں کئے جاتا ہے —— فرائڈ کی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے —— عرفان نے سوچا۔

"نہیں ——" میں نے با آواز بلند کہا۔ "میں تاریخ میں ہمیشہ بہت کمزور رہا۔"

"می بتا یا کرتی تھیں کہ پرانوں میں لکھا ہے کہ راجہ بدر سمبی کی اولاد بلوچستان میں پھیلی اور اجودھیا کے رام چندر کے بھائی بھرت سندھ دیش کا راج گدی پر بیٹھے۔ وہ بڑے یقین سے کہتی ہیں کہ مہا بھارت کے بعد کلی یگ شروع ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس کے بعد پرانوں میں سندھ کا ذکر نہیں ملتا۔"

"اچھا!؟ اور بتاؤ۔"

"مذاق مت اڑایئے۔"

"ارے —— نہیں نہیں۔ بتاؤ بھئی۔ میں بہت دلچسپی سے سن رہا ہوں۔"

"یونانی اس ملک کو انڈو سیتھیا کہتے تھے کیونکہ جنوبی سندھ کے لوگ آریہ نہیں بلکہ سیتھین تھے۔"

"اچھا —— !؟ مجھے ان دونوں نسلوں کا فرق نہیں معلوم بھئی میں بہت جاہل آدمی ہوں۔ مگر تم بولے جاؤ۔ تمہاری آواز سننا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"گڈ گاڈ ——"

اب وہ حیدر آباد کے قریب پہنچ رہے تھے۔ "وسط ایشیا سے آئے ہوئے یہی سیتھین لوگ کاٹھیا واڑ اور راجستھان تک پھیل گئے۔ جو بعد میں اب راجپوت کہلاتے ہیں نا ——"

"اچھا —— !"

"پراچین زمانے میں میرپور خاص میں برہما کی بڑی سندر مورتی کا مندر تھا اور ملتان میں سوریہ کا مندر تھا۔ سیہون میں پرانے آریوں نے شیو کے مندر بنائے تھے۔"

"تم کبھی مندر گئی ہو؟"

"ہاں — بچپن میں بہت گئی ہوں۔ سندھ و آدم میں ان گنت شوالے تھے۔ اسی لئے یہ سندھ کا کاشی کہلاتا ہے۔ سیم کورٹ میں مہادیو کا مندر تھا جہاں ماں کے ساتھ ایک بار گئی تھی۔ ورکلفشن پر جو مندر تھا وہاں میں شور اتری کے روز ممی کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ میری دادی کالی کی بہت پوجا کرتی تھیں جانے یہ کالی کا ایک روپ تھر ماہی کہلاتا تھا یعنی تھر ریگستان کی دیوی۔" پھر وہ چپ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی بات شروع کی "ممی بڑی رام بھگت ہیں۔ کراچی میں تھیں تو بڑی منت کی تھی کہ تیرتھ کے لئے اجودھیا جائیں۔ جب میں نے جمیل سے شادی کی تو ان کو پتا لگا کہ جمیل کا گاؤں تلسی پور اجودھیا سے صرف چار پانچ میل دور ہے۔ کتنی عجیب بات ہے نا —"

"کوئی خاص عجیب بات تو نہیں۔ تم زندگی کے ہر معمولی سے معمولی واقعے کو بھی حد سے زیادہ ڈرامیٹک بنا دیتی ہو۔"

"ارے — ارے۔ آپ مجھے بالکل مورکھ سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں سندھی میں ایک کہاوت ہے کہ عورت کی عقل اس کی ایڑی میں ہوتی ہے۔ اور سورج ڈوبنے کے بعد وہاں سے بھی غائب ہو جاتی ہے۔ آپ کا بھی شاید یہی خیال ہے! — مگر میں تو ساد ھ بیلا بھی جاؤں گی —"

"ضرور جانا بھئی۔ تم 'جذباتی سفر' پر نکلی ہو اب کیا کیا جا سکتا ہے —"

"شٹ اپ۔"

"بلو —! ذرا میرا ادب کرو —!"

"اینگٹ بل —!"

"ایک بات بتاؤ۔"

"جی —"

"تم ہندو لوگ پیپل کی شاخ کاٹنے پر اتنا بلوہ کیوں کرتے تھے؟ ہر دوسرے دن جب بھی تعزیہ پیپل میں اٹکا اور ہوا سر پھٹول —"

"پیپل میں مہادیو جو رہتے ہیں۔"

"اوہ — آئی سی!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا: "پیپل کی بھی ہماری زندگیوں میں عجیب و غریب اہمیت تھی۔ اماں کہتی تھیں کہ پیپل میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ پیپل کے نیچے شہید مرد کے مزار

LIKE HELL ـــــ

ہوتے تھے۔ ہر ودی میں میرے گھر کے سامنے پیپل کا جو درخت تھا اماں کبھی ہم بچوں کو دونوں وقت ملتے اس کے نیچے نہیں جانے دیتی تھیں کہ سایہ نہ ہو جائے۔ اور روز شہید مرد کے مزار پہ چراغ جلواتی تھیں۔"

اس کی آواز جذباتی ہو گئی۔

"اب سنتی مثل کون ہو رہا ہے" بسنتا نے کہا۔

"شٹ اپ!"

دور سے حیدرآباد کے بادگیر نظر آنے لگے۔

"اب مٹوں سوں کرکے رونا شروع کر دینا — لو رومال" عرفان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالا ——

وہ ہنس پڑی۔

مرکٹ ہاؤس کی سڑک پر کار موڑتے ہوئے اس نے بسنتا سے کہا "تم مجھے سندھ کا قصہ سنا رہی تھیں وہ تو پورا کرو۔ سیتھین لوگ آئے۔ پھر کیا ہوا۔"

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے بیٹھ گئی گویا یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہو —— "پھر یہاں بدھ مت خوب پھیلی۔ اور یہاں سرسوت برہمن رہتے تھے۔ اور راجپوت اور جاٹ اور ٹھیر کے۔ یہی مسلمانوں کے حملے کے وقت پنجاب بھاگ گئے۔ میری ممی لاہور کی ٹھاکر ہیں۔ سندھی لوگ مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنے پرانے مذہب کی عزت کرتے رہے۔ بے شمار درگاہیں بن گئیں ان سب پیروں کا ایک ایک نام ہندو تھا۔ اور ایک ایک محمڈن ——"

"اچھا واقعی ——"

"ہاں۔ راجہ بھرتری لال شہباز بنے۔ پیر تھو پیر سلطان۔ زندہ پیر خواجہ خضر۔ اودیرو لال شیخ طاہر بن گئے۔ لالو جسراج منگھو پیر بنے ——"

"منگھو پیر —— ارے وہی کراچی والے منگھو پیر ——؟"

"جی ہاں۔"

"بھئی کمال ہے ——"

"کبھی آپ میرے ڈیڈی سے ملئے تو وہ آپ کو یہ سب قصے سنائیں گے۔ انکو سندھ کی ہسٹری بہت معلوم ہے۔ اب بھی اکثر بیٹھے جھنجھو نامہ پڑھا کرتے ہیں۔"

"اور بتاؤ —"

"بس — جیسے ہندوؤں کے یہاں ہر چیز کیلئے ایک نہ ایک دیوی دیوتا ایجاد کر لیا جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے یہاں ہر چیز کیلئے الگ الگ پیر بن گئے۔ راگوں کے پیر، مٹی کے برتنوں کے پیر، پنگوڑے کے پیر، سارا سندھ پیروں کا دیس، بنگیا سانپوں کے منتر جاننے والے جوگی سب مسلمان ہوتے تھے مگر شیو کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور گورکھ ناتھ کو مانتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ رمضان کا مہینہ ہندوؤں کے لئے پوتر بن گیا اور وہ تعزیوں کے سامنے نذر نیاز چڑھانے لگے۔ آپ کی طرف بھی یہی سب ہوتا تھا —؟"

"ہاں —"

"مذہب نے واقعی ہم لوگوں کے لئے پہلے سینکڑوں برس تک زبردست انیم کا کام کیا ہے اور اس کے بعد گولے بارود کا —"

"اب تم اپنی تقریر بند شروع کرو۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ سرکٹ ہاؤس پہنچتے ہی کھانے کا انتظام کرو میرے لئے —"

"آپ کو سمجھانا بالکل بیکار ہے۔ ری ایکشنری!"

رات کو کھانے کے بعد نادر نے سیتا کو سگریٹ جلا کر دیا اور وہ اور بلقیس اور دوسرے لوگ باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وہ میز پر بیٹھی گلدان میں سے ایک پھول نکال کر اس کی پنکھڑیاں الگ کرتی رہی۔ عرفان سامنے کی کرسی پر نیم دراز سے سگریٹ کے کش لگاتے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم سگریٹ بھی پیتی ہو —"

"اس 'بھی' کا کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں — تم — تم اس وقت ضرورت سے زیادہ اداس ہو۔ تم نے یہاں کا باغ دیکھا۔ کتنا خوبصورت ہے —"

"جی —"

"آج چاندنی رات ہے اس لئے اور زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔"

"جی —"

ڈرائنگ روم میں سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

عرفان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح خوش کرے۔ نفسیات کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر انسان کی الجھنیں دور کرنا ہوں تو اس سے اس کے بچپن کی باتیں کرو۔

"مجھے کچھ اپنے بچپن کے متعلق بتاؤ۔" اس نے بڑے ماہرِ فن کی طرح کہا۔

"آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے ٹیگ کی روح آپ ہی میں حلول کر گئی ہے۔"

"ہا ہا ہا ——" وہ پھر اپنی کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"پھر آپ اپنے بچپن کے متعلق بتائیں گے —— معاف کیجئے۔ یہ بھی بڑی پٹی پٹائی تکنیک اور گھِسی پِٹی سجسٹشن ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ تم تو کوئی بات کرنے ہی نہیں دیتیں۔ تمہیں بیرسٹر ہونا چاہئے تھا۔"

——جمیل نے بھی اسے اپنے بچپن کے متعلق بتایا تھا۔ اس نے بڑی جذباتی آواز میں کہا تھا۔ ہمارا گھر گھا گھرا تے دراددر پہ ہے۔ میری اماں کھانا بہت عمدہ پکاتی ہیں۔ میری چھوٹی بہن کا نام زینب ہے۔ بڑی سخت چڑچڑی ہے۔ اب وہ بڑے بھیا کے ساتھ پاکستان چلی گئی ہے۔ بڑا بھیا اسے بہت مارتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے اسے لے جاکر کوٹھے پہ بند کر دیا اور نیچے سے سیڑھی ہٹا دی۔ پھر میری خوب ٹھکائی ہوئی۔ میری دو خالائیں ہیں۔ فرخندہ باجی چھوٹی خالہ ہی کی لڑکی تو ہیں۔ فرخندہ بجیا بہت دیش بھگت اور بڑی گریٹ آدمی ہیں۔ بالکل دیوی ہیں ایک دم۔ تم ان سے دلّی میں کبھی ملنے نہیں گئیں؟ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ان کی ایسی بن جاؤ۔ ان کی چھوٹی بہن کا نام ملقیس ہے۔ میں اور ملقیس تلسی پور میں بڑے ابا کی بگیا میں جاکر خوب امرود چرایا کرتے تھے۔ اور جب قیصر کی بچی جاکر چغلی کھاتی تو ——

فضول —— فضول —— وقت گذر رہا ہے۔

مگر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کے تلخ لہجے نے عرفان کو رنجیدہ کر دیا ہے۔ اس نے واقعی عرفان کے خلوص کا جواب بدتمیزی سے دیا تھا۔ اور وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ (وہ تو جمیل کو بھی ناراض نہیں چاہتی تھی۔ پھر یہ کیا ہوا ——)

"میں —— میں اسی حیدر آباد میں پیدا ہوئی تھی۔" اس نے ذرا احساسِ جرم کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ اور پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا کہ وہ سن رہا ہے یا نہیں —— "ہم چار بہن بھائی تھے —— ہم چار ——" پھر اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"دراصل ——" عرفان نے اس سے کہا۔ "میں تقسیم سے پہلے کبھی سندھ نہیں آیا اسی لئے اس طرح کرید کرید کر تم سے سوالات کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں لاہور اور پشاور اور کراچی اور حیدرآباد سندھ کیسی جگہیں تھیں۔ اور ان کے باشندے ——"

"ان جگہوں میں سے ایک کی باشندی تو میں خود ہی آپ کے سامنے موجود ہوں ——"

"باشندی" پر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ اور بڑے پیار سے سیتا کو دیکھنے لگا۔" واللہ خوب شے ہیں آپ بھی ——" پھر اسنے کہا۔" دراصل سیتا —— تم مجھے بے حد غیر جذباتی سمجھتی ہو۔ مگر جلاوطنی کا مسئلہ مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ مغربی برلین میں، ہانگ کانگ میں، ہر جگہ میں نے بناہ گزینوں کو دیکھا ہے۔ امریکن شہروں میں مشرقی یوروپ سے بھاگے ہوئے لوگوں سے ملا ہوں۔ جورڈن میں فلسطین مہاجروں کی حالت دیکھی ہے —— اور میں جو بات بات پر تم سے الجھتا ہوں اور تمہاری ہر بات مذاق میں ٹالنا چاہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جس میں چالیس کروڑ انسانوں کی نفسیات یکسر بدل گئی ہے۔ ان کے خیالات۔ نظریئے۔ جذبات۔ ردِ عمل میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی قدرِ مشترک باقی نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم لوگ کیا سوچتے ہو۔ کیا پڑھتے ہو کیا کرتے ہو۔ جب بلقیس اپنی منسٹریکل مصروفیات کا ذکر کرتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کسی دوسرے کرّے کی باتیں سن رہا ہوں۔ چھوڑو۔ ہم نے پھر پولیٹکس شروع کر دی جس سے مجھے نفرت ہے ——"

"آپ میرے بچپن کے متعلق پوچھ رہے تھے۔" سیتا نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں —— ہاں ——"

"ہم چار بہن بھائی تھے ——" اسنے فرمانبرداری سے بھر بچوں کی طرح گویا سبق سنانا شروع کر دیا۔
"پہلے ہم یہیں حیدر آباد میں رہتے تھے۔ حیدر آباد میں ہمارا مکان تھا جو ہمارے دلدادے نے بنوایا تھا۔ پھر ڈیڈی نے کراچی میں پریکٹس شروع کر دی۔ اور وہاں کوٹھی بھی بنوالی۔ میں گریمر اسکول اور اس کے بعد سینٹ جوزفز کالج میں پڑھتی رہی۔ ہمارا بہت بڑا خاندان تھا۔ رشتے کے چاچے اور ماموں اور ماسیاں۔ ان میں سے کچھ عامل کوٹ میں رہتے تھے اور کچھ لاڑکانہ اور حیدر آباد میں۔ میرا بھائی صرف ایک ہے، اور دو بہنیں ہیں۔ یہ تینوں پارٹیشن کے سمے کافی چھوٹے چھوٹے سے تھے۔" پھر اس کی آواز اداس ہوتی چلی گئی۔" جب پارٹیشن ہوا تو ہم لوگ جہاز پر بیٹھ کر کاٹھیاواڑ کے ایک پورٹ پر جا اترے۔ اگست کے بعد اگلے تین مہینوں میں لاکھوں شرنارتھی ہوائی جہاز، ریل اور سمندر کے ذریعے یہاں سے گیا تھا ——"

"اس زمانے میں ٹرین چلتی تھی ——؟"

"جی ہاں۔ اسپیشل ریفیوجی ٹرین چلائی گئی تھی جو میرپور خاص سے مارواڑ جنکشن تک جاتی تھی۔ وہاں ٹرانزٹ کیمپ قائم کر دیئے گئے تھے۔ جو لوگ یہاں سے گئے وہ زیادہ تر شہری پیشہ ور تھے۔ زمینوں پر بسانا انہیں بہت مشکل تھا۔ یہ سب کے سب بمبئی پریذیڈنسی مدھیہ پردیش اور راجستھان کے ریفیوجی کیمپوں میں بھیج دیئے گئے۔ میرے رشتہ دار بھی احمد آباد، جودھ پور، وندھیا پردیش جانے کہاں کہاں بکھر گئے۔ بہت سے

سندھی شرنارتھی بھوپال بھیج دیے گئے ——"

"تم لوگ کہاں رہے؟"

"ہم پہلے گاندھی دھام میں رہے۔ پھر الہاس نگر میں۔ یہ سندھیوں کے لئے نئے سیٹلمنٹ بسائے گئے تھے۔ گاندھی دھام ہی میں ڈیڈی بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ سارے سندھی شرنارتھیوں کی طرح ان کو بھی دو سال تک مالی امداد دی جاتی رہی۔ سنتالیس کے شروع میں یہ امداد بند ہوگئی۔ کچھ کیمپوں میں بیماروں اور بوڑھوں کو رکھا گیا تھا۔ ڈیڈی بھی چند روز کے لئے وہاں بھیج دیئے گئے۔ اس کے بعد ہم سب دلی آگئے۔ اس وقت تک سب شرنارتھی کاروبار کی تلاش میں سارے ہندوستان میں پھیل چکے تھے۔" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

ڈرائنگ روم میں اب اندھیرا ہو گیا تھا۔ عرفان نے سگریٹ جلایا۔ لیکن اسے پیش نہیں کیا۔

"اب ہم وہ لوگ ہیں جن کا کوئی دیس اپنا نہیں۔ بتا چکی ہوں کہ کم از کم مشرقی پنجاب تو مل گیا۔"

"تمہارے ڈیڈی اب کچھ نہیں کرتے ——؟"

"نہیں۔ میں نے بتایا تو۔ وہ مستقل بیمار رہتے ہیں۔ ہم عامل لوگ زیادہ تر ڈاکٹر وکیل پروفیسر اسی طرح کے لوگ تھے۔ جیسے آپ کے یہاں کائستھ ہوتے ہیں نا یو۔پی میں۔ اسی طرح کی یہ کاسٹ تھی۔ کلہوڑہ اور تالپور امیروں کی حکومت میں یہی لوگ سارا ایڈمنسٹریشن کرتے تھے۔ اس لئے عامل کہلانے لگے۔"

"تم لوگ کیا ہو —— برہمن —— ؟"

"نہیں بھئی —— عامل کھتری ہوتے ہیں مگر اب ہجرت کی وجہ سے سارے طبقے الٹ پلٹ ہو گئے۔ عاملوں اور برہمنوں کو بھی وہاں نٹ پاتھ پر دوکانیں کھولنا پڑیں۔ پرانی ریت رسمیں پیر فقیر درگاہیں مندر سب وہیں رہ گئے۔ یہاں کا اصل مذہب صوفی ازم تھا۔ اس صوفی ازم کے اثر سے ہم لوگ کٹر قسم کے مذہب پرست کبھی نہیں رہے۔"

چند منٹ تک وہ میز کی چادر پر کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہی۔

"تم سندھی پڑھ لیتی ہو؟"

"ارے بالکل۔ آپ کیا سمجھتے ہیں میں اتنی میم صاحب ہوں کہ اپنی زبان نہیں جانتی؟ آپ نے تو یہاں سندھی ضرور سیکھ لی ہوگی۔"

"نہیں ——" عرفان نے ذرا جھجک کر جواب دیا۔ پھر پوچھا —— "تمہارا مضمون ڈاکٹریٹ کے لئے کیا تھا؟"

"یہی —— سنتالیس کے بعد ہندوستان کا سماجی انقلاب۔ آپ کے یہاں بھی اس سبجکٹ پر بہت

کام ہو رہا ہوگا۔ مجھے کچھ کتابوں کے نام بتانے پڑیں گے۔ میرا موضوع "پنجاب کے شہر نازکی" تھا۔"

"اب ساڑھے بارہ بج رہا ہے ستیا۔ جا کر سو رہو۔"

"بہت اچھا" وہ اسی فرمانبرداری سے اٹھی اور اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے برآمدے میں کھڑی تھی اتنے میں سرکٹ ہاؤس کا مالی پھولوں کی ڈالی لے کر آیا۔ عرفان اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ "بیگم صاحب کے لئے پھول لایا ہوں صاحب۔" مالی نے کہا۔

"اچھا دے دو بیگم صاحب کو۔۔" عرفان نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

موٹروں میں سوار ہوتے وقت عرفان نے اس سے کہا — "کل تم نے بے حد میرا دماغ چاٹا ہے۔ آج ذرا میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے تم نادر کے ساتھ جاؤ۔"

جس وقت وہ لوگ خیرپور سے گذر رہے تھے ستیا نے دفعتاً کہا — "میں پیر اللہ بخش جمالی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

سب نے اسکو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اسنے بیگ سے نوٹ بک نکال کر ان کا پتہ بتایا۔ "ڈیڈی کے دوست تھے۔ ڈیڈی نے کہا تھا اور کسی سے نہیں تو کم از کم ان سے ضرور مل لینا —"

بہت دیر تک وہ پیر اللہ بخش جمالی کی کوٹھی ڈھونڈتے پھرے۔

"چلو سرکٹ ہاؤس پہنچکر وہاں سے معلوم کروالیں گے۔" بلقیس نے تجویز کیا۔ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس جاتے ہوئے انہیں پیر صاحب کی کوٹھی نظر آگئی۔

شام کی چائے کے بعد دفعتاً اندھیرا ہوگیا۔ "میں بھول گیا تھا کہ جاڑوں کے زمانے میں سورج جلدی ڈوب جاتا ہے۔" نادر نے کہا۔ "چلئے اب آپ کو آپ کے پیر صاحب کے وہاں چھوڑ آئیں۔ عرفان بھائی آپ بھابی جان کو لے جائیے ہم سب کی پوری بارات کے جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اب تم پھر میرے سر پر سوار ہو گئیں۔" عرفان نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے آہستہ سے کہا "میرا خیال تھا کہ اب چھٹکارا مل گیا —"

پیر صاحب کی کوٹھی کی برساتی میں پہنچ کر اسنے ستیا سے کہا۔ "تم اندر ہو آؤ۔ میں گھنٹے بھر بعد آ کر لے

جاؤں گا۔"

"واہ آپ کیوں نہیں ساتھ چلتے؟"

"مجھے سندھیوں سے ملتے ہوئے ذرا گھبراہٹ ہوتی ہے" عرفان نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"اچھا کمال ہے!"

"یعنی تم ہی بتلاؤ۔ وہ ہوں گے پرانی قسم کے اصلی تے وڈے وڈیرے — نہ میں ان کی سمجھوں گا نہ وہ میری۔ اللہ یہ تو بڑے غضب کی بات ہوگی کہ باہر سے آ کر تمہیں ان سے جذبات کی ترجمانی کرنا پڑے۔"

سنیتا کار میں بیٹھے بیٹھے باغ کے گھنے درختوں کو دیکھتی رہی۔ "میں بچپن میں ڈیڈی کے ساتھ یہاں آیا کرتی تھی۔ ڈیڈی پیر صاحب کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ہمارے دادا حیدرآباد کے مشہور وکیل تھے۔ بیرسٹر مرچنلانی کا نام آپ نے کبھی سنا ہو۔"

اس نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا۔ سگریٹ جلا کر خاموش رہا۔

"دادا جی پیر صاحب کے قانونی مشیر تھے۔ دوسرے وڈیروں کی طرح پیر صاحب بھی مستقل مقدمے لڑا کرتے تھے۔" عرفان نے ہارن بجایا۔ سنیتا نے دوسری طرف سے ماتھا سمیٹتے ہوئے پھر بات شروع کی "آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں معلوم —!" عرفان نے تبسم کے ساتھ اس کی بات کاٹی۔

"آپ کو معلوم ہے انگریزوں کے زمانے میں ہندوؤں نے خوب ترقی کر لی اور ہندو مہاجنوں کے پاس مسلمان تقریباً گروی ہو گئے۔ سندھی مسلمانوں کی کوئی مڈل کلاس نہیں بنی۔ اور یہ وڈیرے لوگ اسی طرح اپنی فیوڈلزم میں قلعہ بند بیٹھے رہے اور شاید اب بھی اسی طرح بیٹھے ہیں۔"

"سارے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی یہی ایک سی کہانی تھی۔ شاید اسی وجہ سے پاکستان بنا" عرفان نے جواب دیا۔

"بچپن میں میں پیر صاحب کی بیویوں کے زیور اور لباس دیکھ دیکھ کر مسحور ہوا کرتی تھی۔ یہ لوگ کس قدر بیک ورڈ اور کتنے دولت مند ہیں اس کا آپ کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔"

ایک مچھیل سندھی ملازم بڑے گھیر کی سیاہ شلوار میں ملبوس اندر سے نکلا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نو واردوں کو سلام کیا اور ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ سنیتا فوراً اندر زنانخانے میں چلی گئی۔ عرفان ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرہ بیش قیمت فرنیچر سے اٹا ٹوٹ بھرا ہوا تھا۔ فرش پر اعلیٰ ترین قالین بچھے تھے۔ دبیز ریشم کے پردوں پر سنہری ڈوریاں بندھی تھیں۔ کچھ دیر بعد گھنی داڑھی اور غلافی آنکھوں والے پیر اللہ بخش جالی اندر سے تشریف لائے۔ جھک کر دونوں ہاتھوں سے عرفان سے مصافحہ کیا۔ اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں

ٹھوس چاندی کے ٹی سٹ میں چائے آگئی۔ اور انہوں نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد ملکی سیاست کی بوالعجبیوں پر گفتگو شروع کی۔ یہ سر فیروز خاں نون کی وزارت کا زمانہ تھا اور ملک میں شدید افراتفری مچی ہوئی تھی۔

پھر وہ اٹھ کر اندر گئے اور سیتا کو ساتھ لے کر واپس لوٹے۔ اور بڑے ریشمی رومال سے آنسو پونچھ پونچھ کر سیتا کے سر پر ہاتھ پھیرا کئے۔ جب سیتا پیر صاحب سے سندھی میں باتیں کر رہی تھی اس وقت عرفان کو شدت سے محسوس ہوا کر وہ اس جگہ پر کتنا اجنبی ہے۔

مچھیل ملازم نے بڑا سا اٹیچی کیس کار میں رکھا۔

کار اسٹارٹ کرنے کے بعد عرفان نے مذاقاً پوچھا" بہت زبردست تحفے مار لائیں۔"

"میں نے دیکھے نہیں۔ انہوں نے ڈیڈی ممی اور میرے لئے الگ الگ جانے کیا کیا چیزیں دی ہیں۔ بہت قیمتی سامان ہی ہوگا۔ یہ لوگ بے حد جذباتی اور بے حد دیالو ہیں۔"

"تم جذبات کی اتنی قدر کرتی ہو اور اوپر سے بنتی اتنی منطقی ہو۔ فراڈ ——!!"

دوسرے روز ان لوگوں کا قافلہ خیرپور شہر میں سے گذر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب پرانی اینٹوں کی اداس عمارتیں تھیں جن کی محرابوں کے نیچے بوڑھے باوقار سندھی کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ لوگ بات بات پر ہاتھ جوڑتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز اور سوتے سوتے موسیقی ریز لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ بڑی عجیب اداس نرم دھیمی دھیمی تہذیب تھی جو عرفان نے اس ملک میں نو سال تک رہ چکنے کے باوجود اب تک نہیں دیکھی تھی۔

"کمال ہے"۔ عدالت کے سامنے گیئر بدلتے ہوئے اسنے سیتا سے کہا۔

"واقعی عجیب سی بات ہے کہ میں اس ملک کا باشندہ ہوں اور تم غیر ملکی ہو ——"

"لیکن مجھے اب اس صورتِ حال کی عادت پڑ چکی ہے۔ پچھلی مرتبہ جب میں نیویارک سے ممی کے ساتھ ہندوستان آئی تھی تو مجھلی خالہ اپنے بھانجے سے ملنے کے لئے کراچی سے لیفٹ آباد آگئی تھیں۔ اور انہوں نے مجھے سارے لکھنؤ کی سیر کرائی تھی اور تلسی پور اور چاند پور کی پرانی ریت رسموں سے روشناس کرایا تھا۔ مگر لیفٹ آباد سے لکھنؤ پہنچتے ہی ایک غیر ملکی کی حیثیت سے ان کو پولیس اسٹیشن میں اپنی آمد اور اس کے بعد روانگی کی اطلاع درج کروانا پڑی تھی۔"

سندھ کے شہروں میں ہر طرف اداسی اور بے رنگی اور ریت اور دھول تھی۔ انگریزی عہد کی یادگار ضلعوں کی عمارتیں۔ سول لائنز کی گرد آلود سڑکوں کے کنارے خاموش کھڑی تھیں۔ انگریز سارے برصغیر میں

پشاور سے لے کر مدارس تک اور بہار سے لے کر سندھ تک اضلاع کے طرز تعمیر اور ماحول اور مسائل کو یکساں پیٹرن بنا کر جا چکے تھے۔ وہی کچہریاں۔ وہی باغات وہی ڈاک بنگلے۔ وہی ریلوے اسٹیشنوں کے کول تارسے پیے اونچی ڈاٹ والے ویٹنگ روم اور انکا یکساں بھدا فرنیچر۔

سکھ کا پیر کٹ ہاؤس جس میں وہ سب ابھی آن کر اترے تھے بلند شہر یا پرتاپ گڑھ یا سیتاپور یا گیا کسی جگہ بھی اٹھا کر رکھا جا سکتا تھا۔ وہی خانساماں تھا جس نے لپکتے ہوئے سامنے آکر بڑے صاحب کو سلام کرنے کے بعد پوچھا تھا کہ حضور یا حاضری کس وقت کھائیں گے۔ اس کا نام یار رسول بخش تھا یا محمد بخش۔ مالی کا نام چراغ دین تھا یا رام کھلاون۔ مگر دنیا تبدیل ہو چکی تھی۔ انسان بدل گئے تھے۔ کیا واقعی انسان بدل گئے تھے؟ اس سوال کا جواب دیانت سے دینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔"

"میں ربوہ ہو آؤں گی۔ میں وہاں ہمیشہ سالانہ میلے میں جاتی تھی۔ خوب میوزک کمپیٹیشن ہوتے تھے"

سیتا نے دہرایا۔

شام کے وقت لانچ میں بیٹھ کر وہ دریا عبور کرنے گئے۔ دوسرا دیو پیکر ٹاور پرے سے جہاز کی طرح لہروں کی وسط میں کھڑا تھا۔ کنارے پہنچ کر وہ سیڑھیاں چڑھے۔ کنارے پر بڑا سا پولیس تھانہ جس کی دیواروں پر گیروی بانیاں منقش تھیں۔ ٹیلوں پر عمارتیں سنسان پڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ ان گنت چھوٹے بڑے مندر اور شوالے۔ لڑکوں کا ہوسٹل۔ کلب ہاؤس۔ سیتا عرفان کو ساتھ لئے چاروں طرف گھومتی پھری۔ پارٹی کے دوسرے لوگ تھک کر نیچے ایک بنچ پر بیٹھ چکے تھے۔

"مجھے بھائی جان پر بڑا ترس آتا ہے۔" سیتا کو ٹیلے پر ایک اندھیرے مندر کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر نادر نے آہستہ سے کہا۔

مندروں کی دیواروں پر عجیب عجیب خوفناک اور مضحکہ خیز شکلوں والی مورتیوں کے نیچے پنسل سے اردو میں طرح طرح کے جملے لکھے ہوئے تھے۔

دیوی ماں۔ میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ مجھ پر اپنی دیا رکھنا ——— ۱۲ / نومبر ۴۷ء

بھگوان میں آج تمہارا شرن چھوڑ کر انڈیا بھاگ رہا ہوں مجھے معاف کرو ——— ۵ / ستمبر ۴۷ء

ماتا۔ میں تم کو چھوڑ رہا ہوں۔ اب کبھی پرشاد نہ چڑھا سکوں گا۔ میرے بچوں پر دیا کرتی رہنا۔

۱۹ / دسمبر ۴۷ء

سیتا اور عرفان ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان درد ناک جملوں کو پڑھتے پھرے یہاں تک کہ سورج مہران کی لہروں میں ڈوب گیا۔

دوسرے ٹیلے پر گرگئے نیچے ایک اور ریک مندر تھا۔ اندر گھپ اندھیرے میں لٹھیں کپڑوں میں ملبوس راد تھا کی قدآدم مورتی اوندھی پڑی تھی۔ عرفان کو بڑی وحشت ہوئی ——— "سب باہر چلو ——" اس نے جلدی سے کہا۔

نیچے اتر کر کلب ہاؤس کی مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے ستیتا نے بلاجت اس سے پوچھا ——— "یہ جگہ بھوتوں کا شہر نہیں ہے؟ ——— میری دادی محبت اکثر رات کو کہا کرتی تھیں۔ آج میں نے تیرے لئے بڑا اچھا سپنا دیکھا۔ رات کسی گوسائین کی نیک آتما گھر کے اوپر سے گذری ہوگی ——— یا آج میں نے بڑا بُرا سپنا دیکھا۔ کسی موچی کی بدروح بچھواڑے سے گذری ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض بدروحیں بچوں کی شکل میں نکلتی ہیں اور ان کے ہاتھوں میں چار چار انگلیاں ہوتی ہیں۔ اور بدروحیں ہوا میں چراغوں کی طرح بھی اڑتی ہیں ——— ادھر دیکھئے۔ نہیں ہوا میں چراغ جل رہے ہیں؟ سادھو تیلا میری ساری قوم کا قبرستان ہے۔"

وہ اٹھ کر دوسری سیڑھی پر جا بیٹھی "کیسا اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں میری ساری آرزوئیں سارے آدرش سائے چھپاوے اگیا بیتال کی طرح جگمگاتے ہیں ——— ابھی میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے ایسا لگا جیسے بھیڑ کی سواری کا کتا۔ لکڑ بگھے پر سوار ہو کر قبرستانوں کی طرف جانے والی چڑیلیں ہزاروں برس کی مری ہوئی روحیں، ان سب نے مل کر مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اور میں بہت جلد مر جاؤں گی۔" اس نے سہم کر عرفان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہمارے یہاں ایک بڑی ڈراؤنی رسم تھی" اس نے چند لمحوں کے بعد پھر کہنا شروع کیا "کہ اگر کوئی کنوارا مر جائے تو اسے سرخ کپڑے میں لپیٹ کر شمشان لے جاتے تھے اور زور زور سے ڈھول بجایا جاتا تھا۔ گویا موت کے ساتھ ساتھ اس کا بیاہ بھی ہو گیا۔"

"یہ سامنے جو سندھ بہہ رہا ہے ہمارے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس کے پچھم میں جہاں چاند ڈوبتا ہے موت کا دیس ہے۔ اور ہر سندھی جو مرتا ہے اس گنوماتا پر جو اس نے زندگی میں برہمنوں کو دان کی ——— اس کی دم سے چمٹا ہوا اس دریا پر سے گذر جائے گا۔ بھادوں کی پورن ماشی میں اس کی آتما اس ناؤ پر سوار ہو کر واپس آتی ہے جو اس کے گھر والے پورنماشی سے دو روز پہلے سندھ دریا میں چھوڑ دیتے تھے۔

"چیت کے مہینے میں بڑا بھاری میلہ ہوتا تھا۔ دراصل ہمارا سب سے بڑا خدا یہی دریا تھا۔ کیونکہ ریگستان میں بہتا تھا جس طرح پرا چین مصر والے نیل کو دیوتا مانتے تھے۔ اس سکھر میں مچھلی کی پیٹھ پر سوار دریا دیوتا کا مندر تھا۔ اسی کو مسلمان دریا پیر اور خواجہ خضر کہتے تھے۔ جنوبی پنجاب کے ہندو اسے دریا صاحب کہتے تھے ——— ذرا سوچئے ——— کتنے فلسفی ٹینگ عقیدے تھے! ناگ دیوتا کے لئے یہ طے تھا کہ وہ ٹھٹھہ کے آگے سندھ

بہت دشوار تھی۔ وہاں سے آگے بڑھے تو چاندنی اور زیادہ تیز ہو گئی۔ روشنی میں چمکتی ہوئی سیدھی سڑک پر کار چھوڑ کر عرفان نے ستیتا سے کہا۔

"صحرا کی خنک عجیب چاندنی رات۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں اگر مجھے اختر شیرانی کے شعر یاد آرہے ہیں ——ہم اسکول کی اردو کتابوں میں پڑھا کرتے تھے —— صبح بنارس۔ شام اودھ۔ شب مالوہ —— صبح بنارس اور شام اودھ تو سمجھ میں آجاتی تھی مگر یہ پتے نہیں پڑتا تھا کہ ریگستان کی رات میں سونے خاک دھول کے کیا رکھا ہوگا۔ اب یہاں آن کر معلوم ہوا۔ تم نے بنارس کی صبح اور اودھ کی شام دیکھی ہے——؟"

"جی ہاں ——"

"چاندنی میں اس کے ہاتھ کا کنگن تیزی سے جگمگا اٹھا۔ وہ کچھ دیر سے چپکی بیٹھی اسے کلائی پر گھما رہی تھی۔

"بڑا خوبصورت کنگن ہے —— اطالوی ہے نا؟" عرفان نے دریافت کیا۔

"جی ہاں ——"

"نیپلز میں خریدا تھا؟"

"جی نہیں کینیڈا میں ——"

"کینیڈا —— دنیا میں اور بھی ہزاروں ملک ہیں۔ تم کو کینیڈا جانے کی کیا سوجھی تھی؟" عرفان نے تبسم کے ساتھ پوچھا۔

"میرے ماما وہاں تجارت کرتے تھے۔ پارٹیشن کے بعد انہوں نے ڈیڈی کو لکھا کہ آپ کی مالی حالت اب ایسی نہیں کہ ستیتا کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکیں۔ اسے میرے پاس بھیج دیجئے۔"

"تم تو بے حد خوش ہوئی ہوگی ——"

"ظاہر ہے۔ ایک اکیس سالہ بے انتہا حساس لڑکی جو شرنارتھی کیمپوں میں گھومنے کے بعد قرول باغ کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہو اور بس میں بیٹھ کر دور راجپس کالج پڑھنے جاتی ہو اچانک اسے یہ بتایا جائے کہ اسے کینیڈا یا امریکہ بھیجا جا رہا ہے۔ میرے لئے تو یہ بالکل پریوں کی کہانیوں ایسی بات تھی —— ماما کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اور مامی بیس پچیس سال سے امریکہ میں رہ رہے تھے۔ ان کا کاروبار کافی پھیلا ہوا تھا۔ اور سال میں چھ مہینے نیویارک میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید کر بھیج دیا اور کولمبیا میں میرا داخلہ کروا دیا۔"

"وہیں جاکر تم سرخوں کی سنگت میں پڑ گئیں۔"

دو ہنسی۔ "سرخوں کی سنگت میں تو میں دلی ہی میں پڑ گئی تھی۔ میرے ایک کزن جو لاہور سے شرنارتھی بن کر آئے تھے اردو کے افسانہ نگار تھے۔ بشیشر پرشاد منور —— آپ نے ان کے افسانے ضرور پڑھے ہوں گے۔ وہ بڑے سخت

رہتے تھے۔ ان کے گھر پر ہفتہ وار ادبی میٹنگ ہوتی تھی اور دوستوں پر افسانے پڑھے جاتے تھے۔

"پھر ــــ"

"پھر کیا ــــ"

"نیویارک میں کیا ہوا ــــ"

وہ چپ ہو گئی۔

دراصل جو بات پوچھنا چاہتا تھا اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

"آپ ــــ آپ شاید جمیل کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں۔" کچھ توقف کے بعد اس نے فرمانبرداری سے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ گویا اپنے استاد کے سامنے سبق سنا رہی ہو ــــ "جمیل سے میں ایک سرخوں کے جلسے میں ملی تھی۔ اس زمانے میں بک تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور گرینچ ولیج میں کافی لیفٹ ونگ گروپ تھے جن میں زیادہ تر یہودی نیگرو اور تھوڑے سے ہندوستانی شامل تھے۔ جمیل وہاں اس سال یو۔ این میں ملازم ہو کر انڈیا سے آئے تھے ــــ"

"پھر ــــ"

"پھر کیا ــــ پھر ــــ!"

"بہت خوب۔ مانتا ہوں کہ تم بھی اہلِ زبان کہلانے کی مستحق ہو گئی ہو!"

"ایک فیض آباد والے سے بیاہ جو کیا تھا۔ اتنی اردو بھی نہ سیکھ جاتی ــــ جمیل سے ملنے کے بعد میں نے اردو میں دلچسپی لینا شروع کی کیونکہ وہ لٹریچر کے بہت شائق تھے۔ اور ان سے باتیں کرنے کے لئے میرے لئے لازم تھا کہ میں خود کو ان کا ہم مذاق بناؤں۔ اردو میں باتیں سوچوں اور کروں جو ان کو پسند تھیں۔ جب وہ مجھ سے زیادہ قریب آ گئے تو بعض دفعہ بے ساختہ اودھی میں مجھ سے بات کرنے لگتے تھے۔ جب میں ان کی دیہاتی زبان کا بہت مذاق اڑاتی تو وہ فخریہ کہتے ــــ "جناب میں اور میرے گھر والے وہ زبان بولتے ہیں جس میں تلسی داس جی نے رامائین لکھی تھی ــــ!"

"شادی سے پہلے میں روز شام کو کیمپس سے سیدھی جمیل کے اپارٹمنٹ پر جاتی جہاں ایک سردار جی جو ان کے بہت گہرے دوست تھے باقاعدہ مجھے اردو پڑھاتے۔ مگر ان سردار جی کو افسانے لکھنے کی جھک تھی۔ لہٰذا مجھے پہلے گھنٹہ بھر بیٹھ کر ان کے تازہ افسانے سننے پڑتے۔ کمرے میں ٹہل ٹہل کر وہ کہا کرتے کہ بہت جلد کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو ڈاؤن کرنے والے ہیں۔ پتہ نہیں بے چارے اب کہاں ہیں۔

"اردو مجھے بہت آسانی سے آ گئی کیونکہ اس کا اور سندھی کا اسکرپٹ ایک ہی ہے نا ــــ مجھے یاد ہے

جمیل نے شادی کے دو سال بعد اپنی بہن کو لکھا تھا کہ میری بی بی اردو میں ایسی طاق ہو گئی ہے کہ تم لوگوں کو طاق پر رکھ دے ——!

"—— آپ کو معلوم ہے میں بہت کمینی بھی ہوں ——"

"اچھا۔ وہ کس طرح —— بتاؤ ——!"

"جمیل سے جب میں پہلی بار ملی تو ان کے ادریسکر ایک مشترکہ دوست نے بتایا کہ یہ فرخندہ باجی کے کزن ہیں۔ یہ معلوم کر کے میں ان سے اور زیادہ خصوصیت سے ملی۔ ورنہ شاید شروع میں ان کو SNUB کر دیتی۔"

"اچھا۔ آپ شروع میں لوگوں کو SNUB بھی کر دیتی ہیں!"

"ڈونٹ آپ —— بات تو سنیئے۔ لیکن میں نے ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں فرخندہ باجی یا ملقیس کو اتنی اچھی طرح جانتی ہوں۔ کیونکہ انہوں نے مجھے شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ ان کی منگنی کنبے ہی میں ایک کزن سے ہو چکی ہے۔ جو شاید ملقیس کی چچا زاد بہن اور ایک رشتے سے جمیل کی بھانجی ہوتی تھی۔ آپ مسلمانوں میں اس قسم کا گھپلا بہت چلتا ہے۔ خیر —— تو اگر میں ان کو یہ بتا دیتی کہ میں فرخندہ باجی کو جانتی ہوں تو وہ فوراً دلی خط لکھتے کہ ستارہ حیدر ان سے شادی کر رہے ہیں اور اس اطلاع پر فرخندہ باجی اور ملقیس مجھے کتنا کمینہ اور ذلیل سمجھتیں۔ احسان فراموشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ دونوں دلی میں میرا کتنا خیال کرتی تھیں۔ اور اب میں ان کی ایک بہن کے منگیتر کو پھانس رہی تھی ——"

"اپنے لئے ایسے بُرے الفاظ مت استعمال کرو۔"

"نہیں بالکل ٹھیک تو کہتی ہوں۔ سب لڑکیاں کسی نہ کسی طریقے سے مردوں کو پھانستی ہیں۔ خالی انکے MODUS OPERANDI مختلف ہوتے ہیں۔ اور آپ احمقوں نے اس کا نام محبت وغیرہ رکھ چھوڑا ہے۔ ہر لڑکی کا زندگی میں صرف ایک مقصد اور صرف ایک تمنا ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بے وقوف کو پھانس کر اس سے شادی کر لے —— باقی سب بکواس ہے۔"

"ماشاء اللہ! آپ کے گوناگوں فلسفے قابلِ داد ہیں ——"

"تسلیم ——"

ہوا سے اڑتے بالوں کو پیشانی پر سے ہٹانے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جمیل سے جس روز میں پہلی بار ملی تھی اس روز رات کو اپنے ہوسٹل واپس آ کر میں نے اپنی روم میٹ گریس سے کہا تھا۔ "آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہاکلسبنگ میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا تھی۔ اب ایک عورت ہوں ——!"

"شادی سے پہلے میں جمیل سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتی تھی۔ اور بہت جلدی من بھی جاتی تھی تو ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا ——— تم کبھی شیرنی کی طرح بپھر جاتی ہو کبھی بلی کے بچے کی طرح خر خر کرتی ہو۔ میں نے فوراً کہا تھا۔ لاحول ولا ——— سب سے پہلے ان سے یہی فقرہ کہی تھی۔" اس میں لاحول کی کیا بات ہے ——— انہوں نے کہا تھا ———

اسی لئے ——— میں نے منہ بنایا تھا جب وہ کہنے لگے کہ تم اس معاملے سے بنی ہو جس سے اولڈ میڈ تخلیق کی جاتی ہیں ———

شادی کے بعد جب میں خفا ہو کر کمرہ اندر سے بند کر لیتی تو وہ باہر ٹہلتے ——— دھیمی آواز میں ستار پر ٹھمری گنگناتے ——— جمیل الفانا کے بادشاہ تھے"

کئی رنگ میل بربرسے گذر گئے۔

"پھر ———" عرفان نے بہت دیر بعد پوچھا "شادی کیسے ہوئی"

"ایک روز ہم کہیں سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں ٹرین بدلتے ہوئے ایک اسٹیشن پر اترتے ہوئے جمیل نے کہا۔

"سب ہو گئے ہیں ——— ؟"

"جی ہاں۔ شام کے پانچ بجے کے بعد بھر گئے ہیں۔"

"چونکہ بڑی سخت غیر رومنٹک بات تھی ———"

"بالکل ——— مگر جمیل کو HUM BUG سے چڑ تھی۔ میں چونکہ پلیٹ فارم پر ہجوم کے دھکے سے آگے بڑھ چکی تھی اس لئے انہیں کافی زور سے چلانا پڑا اور جب میں دوسری ٹرین پر چڑھ رہی تھی تو انہوں نے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا تھا ——— ستیا ——— مجھ سے شادی کرو گی۔ جواب دو جلدی ——— وقت بہت کم ہے۔ انہوں نے اس طرح گھڑی دیکھی تھی جیسے ایک دو منٹ کی دیر سے بڑا فرق پڑ جائے گا۔ اور میں نے اسی رش میں دروازہ میں چڑھتے ہوئے پلٹ کر زور سے جواب دیا تھا ——— ہاں ———"

"پھر ———"

"پھر میں نے ماما کو نہیں بتایا اگلے ہفتے ایک ہندوستانی دوست کے گھر پر ہماری شادی ہوئی۔ خوب تصویریں کھنچیں جو شام کے اخباروں میں چھپیں ——— ہولی ٹنل انڈین برائڈ ——— وغیرہ۔ دوستوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ ماما کو میں نے دہشت کے مارے نہیں بتایا۔ حالانکہ میں اس وقت چوبیس سال کی ہو چکی تھی۔ ماما کو اخبار کے ذریعے ہی معلوم ہوا۔ اور انکو صدمے کے مارے دل کا دورہ پڑ گیا۔ اور وہ مرتے مرتے

بچے۔ انہیں مجھ سے بے حد محبت تھی انہوں نے مجھے بیٹی بنایا تھا۔ جمیل ان سے ملنے کے لئے ان کے دفتر گئے تو وہ ان سے ملے بھی نہیں۔ مامی حالانکہ پرانی قسم کی ہیں مگر ماما سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ میرا خیال ہے عورتوں میں کومن سنس زیادہ ہوتا ہے۔ پھر بیس برس امریکہ میں رہ کر وہ ذرا روشن خیال بھی ہو گئی ہیں۔ ماما بہت پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ مامی جمیل سے ایک ڈرگ اسٹور میں آ کر ملیں اور انہیں بہت پسند کیا۔ جمیل میں بھی تو ایک بات تھی۔ محمد تغلق کا دل پل کی پل میں موہ لیتے تھے۔ پھر مامی نے میری ممی کو خط لکھا — سیتا نے بیاہ کر لیا ہے لڑکا اپنی ذات برادری کا نہیں۔ نام جمیل ہے۔ بعد میں مامی مجھ سے ہنس کر کہتی تھیں۔ جمیل اور جمیل میں کیا فرق ہے محض نکتوں ہی کا تو فرق ہے!

چند روز بعد انہوں نے ممی کو بھی راز میں شریک کر لیا اور وہ بھی اس نکتوں کے فرق والی تھیوری کو مان گئیں۔ ڈیڈی سے انہوں نے یہی کہا کہ لڑکا ہے تو ہندو مگر بہت آزاد خیال ہے کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ اور آج کل کون ہندو لڑکا مذہب کو مانتا ہے — ڈیڈی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں بھی دلی آنے کے بعد شیام بھائی صاحب کی وجہ سے ترقی پسندی کی چرچا رہنے لگی تھی — "

"یہاں تم نے ثابت کر دیا کہ ابھی پوری طرح اردو والی نہیں بنیں۔ 'چرچا' اردو میں مذکر ہے۔"

"اوہ — سوری — چرچا رہنے لگا تھا۔" اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ ادا کیا۔ "چند مہینے بعد میں نے اور جمیل نے اکٹھے ڈیڈی کو خط لکھا اور ساری بات بتا دی۔ ڈیڈی نے مجھے لکھا — میں تم سے خفا ضرور ہوں لیکن اگر تم خوش ہو تو ٹھیک ہے۔ جمیل کو انہوں نے لکھا — وہی جو سب بیٹیوں کے باپ اپنے دامادوں سے کہتے ہیں — میری نازوں کی پالی لڑکی ہے۔ اس کا دل کبھی مت دکھانا" — پھر وہ خود ہی ہنسی — "بے چارے ڈیڈی — ڈیڈی بے حد لٹریری آدمی ہیں۔ انہوں نے جمیل کو اس خط میں رامائن QUOTE کی تھی۔ — جس طرح ہمالیہ نے گری جا مہیش کو، سمندر نے لکشمی ہری کو سونپی تھی اسی طرح جنک نے سیتا رام کو سونپی — اور اسی طرح بیٹے ہم اپنی سیتا تمہیں سونپتے ہیں۔ — جمیل خود تلسی داس کے ہم وطن ٹھہرے — یہ پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ "کانپور والے تو کافی آزاد خیال ہوتے ہیں۔ مگر ممی نے اپنے میکے والوں سے جو کٹر آریہ سماجی ہیں یہ خبر آج تک چھپائے رکھی ہے کہ میں نے ایک مسلمان سے شادی کر لی ہے۔ وہ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ لڑکا یو پی کا کائستھ ہے۔ سکسینہ نامی۔

"جب راحل پیدا ہوا تو ممی ڈیڈی ماما مامی سبھی بہت خوش ہوئے اور اس بات سے زیادہ خوش تھے کہ جمیل اتنے آزاد خیال ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا ہندو نام رکھنے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔

"دو سال بعد جمیل کو تین مہینے کی فرلو ملی تو ہم لوگ دلی آئے۔ فرخندہ باجی بلقیس وغیرہ مجھ سے اتنی

محبت سے ملیں گی یہ شرمندہ ہو گئی۔ ممی نے پہلے ہی والے اردو والوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ لڑکا لکھنؤ کا رہنے والا ہے۔ اسی لئے اُردو اتنی اچھی بولتا ہے اور بات بات پہ لاحول ولا کہتا ہے اور خدا کی قسم کھاتا ہے۔ ہم شرنارتھی لوگ یو۔ پی والوں سے پہلے ہی ناخوش تھے۔ اس لئے خاندان والے اصولاً اس بات پہ خفا ہیں کہ لڑکی غیر مسلموں میں کیوں گئی۔ دلی ہم جیت۔ رونق کی شہرت کے بعد وطن چاندپور اور نلسی پور چلے گئے۔ یہاں سے فیض آباد اور لکھنؤ دیکھا۔ کشمیر کی سیر کی۔ اس کے بعد واپس امریکہ ـــ

"اسی سال ایک لڑکا کلکتے سے ایکٹنگ سیکھنے کے لئے نیویارک آیا۔ اس کا بہت لمبا چوڑا نام تھا۔ ابوالفصاحت قمرالاسلام چودھری ـــ"

"قمرالاسلام چودھری ـــ؟ مشہور انگریزی شاعر ـــ جو آج کل ہندوستان کا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کہلاتا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہی ـــ اس وقت وہ بالکل مشہور نہیں ہوا تھا۔ اور اداکاری کے میدان میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ کئی ترقی پسند بنگالی فلموں میں کام کر چکا تھا اور انگریزی میں نظمیں بہت اچھی لکھ رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گیا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو بڑا انقلابی کہتا تھا۔ مگر اب تو جب سے لندن میں اس کی کتاب چھپی ہے میں نے سنا ہے وہ ANGRY YOUNG MAN بن گیا ہے۔"

"اس کے بعد ـــ"

"اس کے بعد کیا ـــ آپ تو لگتا ہے جیسے کہانی لکھنے بیٹھے ہیں۔"

"فضول کی بات مت کرو۔ آگے سناؤ۔"

"اس زمانے میں ـــ خیر چھوڑیئے ـــ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ ـــ"

"نہیں۔ نہیں ـــ ضرور بتاؤ ـــ مجھ سے کوئی بات چھپاؤ نہیں ـــ"

"آپ میرا سائیکولوجیکل علاج کر رہے ہیں؟ کہیں اس خیال میں بھی نہ رہیئے گا ـــ"

"لاحول ولاقوۃ ـــ"

"اچھا خیر ـــ پھر وہی ہوا ـــ نہ جانے کیا ہوا ـــ میں یونیورسٹی میں اپنے کام میں مصروف تھی۔ گھر واپس آکر راہل کی دیکھ بھال کرتی۔ کھانا بناتی۔ دوستوں کا حلقہ بھی وہی تھا۔ ساری باتیں پرانی جیسی تھیں مگر جانے کیوں جمیل آہستہ آہستہ ری ایکشنری بنتے گئے خیر میں اس کو بھی برداشت کر لیتی۔ مگر انہوں نے شراب حد سے زیادہ پینا شروع کر دی۔ جب وہ رات گئے شراب خانوں سے لوٹتے اور میں کھانا بنا کے ان کے انتظار میں راہ دیکھا کرتی اس وقت قمر میرے پاس بیٹھا رہتا ـــ"

"اور تم سے ہمدردی کرتا۔ یہ ہمدردی کا ریکیٹ بھی خوب ہوتا ہے۔"

"آپ خود اس وقت اس ریکیٹ میں شامل نہیں ہیں؟"

عرفان نے غصے سے اسے دیکھا۔ اللہ کی قسم تم بالکل ناقابل برداشت ہو۔۔۔ قصہ سناؤ۔۔۔"

"جانے نہیں سناتے۔۔۔ اچھا خیر۔۔۔" اس نے سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔۔۔" نہیں ہمدردی کی بات نہیں عرفان۔ بس جو ہونے گیا ہوا ان واقعات اور وقت کے دھالے میں بہتا چلا جاتا ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اصل میں میری اور قمر کی دوستی اس طرح شروع ہوئی کہ ایک روز کیمپس پر قمر نے مجھ سے کہا کہ میں شام کو اسکے اپارٹمنٹ پر آؤں اس کی ایک دوست جو کالج میں ایلوکیوشن سکھاتی تھی اس سے ملنے آرہی ہے۔ میں اس سے ملاقات کرکے بہت خوش ہوں گی۔۔۔ میرے اور جمیل کے اوقات بالکل مختلف تھے۔ وہ کھانا پکاتے۔ ایم پی ہی کھاتے اور اکثر شام کو گھر آئے بغیر وہیں سے دوستوں کے ساتھ شراب خانے چلے جاتے۔۔۔

جمیل دوسری عورتوں سے فلرٹ نہیں کرتے تھے۔ اس بات کا مجھے آج تک وشواس ہے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ وفادار رہے۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیا ہوا۔۔۔ حالانکہ عام طور پر گھر دوسری عورتوں کی وجہ سے برباد ہوتا ہے۔۔۔"

"یا دوسرے مردوں کی وجہ سے۔"

"جی ہاں۔ بہرحال۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اتنا مکمل اعتماد تھا کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔۔۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"سگریٹ لو۔۔۔"

"شکریہ۔ اس نے سگریٹ جلالیا۔" میں سگریٹ محض اس لئے نہیں پیتی کہ یہ عورت کی سماجی اور اقتصادی آزادی اور مردوں سے ہمسری کا سمبل ہے بس امریکہ میں کالج میں داخل ہوتے ہی اس کی عادت پڑگئی تھی۔۔۔ آپ کو برا تو نہیں لگتا۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" کار کی رفتار ایک دم تیز ہوگئی۔ اس کے سگریٹ پینے یا نہ پینے پر میں اعتراض کرنے والا کون؟ اسنے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا؟"

"ہم کیا کہہ رہے تھے۔۔۔؟"

"میں۔۔۔؟"

"اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ اتنے برس جمیل کے ساتھ رہ کر مجھے 'مستقل' میں' کے بجائے 'ہم' کہنے کی عادت پڑگئی

تھی۔ آپ اودھ والے ہم بولتے ہیں نا ۔۔۔ میں بہت احتیاط سے ہم کہتی تھی۔ اور ہمارے کے یہاں' اور 'بہت' کے بجائے 'بہُت' ۔۔۔ جمیل کے لہجے میں اردو بولنے کی نقل کرتی تھی۔ نجانے کتنا چھوڑ کر باقاعدہ 'دلپ' عرض کہتی تھی۔ سب لگتی ہے میں نے اپنے آپ کو جمیل کے کلچر میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ بہر کیف کسی حرکت سے پتی کے لئے اتنا کچھ کیا ہوگا ۔۔۔ میں نے محض اسی لئے شراب بھی زیادہ پینی شروع کر دی تاکہ شام کو ان کے ساتھ ساتھ رہ سکوں مگر جب میں ان کے ساتھ بار میں جاتی تو وہ خفا ہو جاتے کہ کیوں ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی ہو ۔۔۔

پھر جب ہم گئے، محرم کا زمانہ آگیا۔ جمیل کے گھر پر بڑے زور کا محرم ہوتا تھا۔ میں بھی کالی ساری پہن کر خوب اپنی ساس نندوں کے ساتھ مجلسوں میں شامل ہوئی۔ حالانکہ میں ہر مذہب کو لالعینی سمجھتی ہوں۔ جب مجھے اسلام ہی سے کوئی دلچسپی نہیں تو شیعہ سنی کے قضیے سے کیا مطلب۔ ہوتا۔ مگر جمیل شیعہ گھرانے کے ہوتے۔ لہٰذا مجھے ساری دنیا کے شیعہ بہت اچھے لگنے لگے۔"

"کسی عقلمند آدمی نے بہت ٹھیک کہا ہے۔ عورتیں بے حد بور ہوتی ہیں!"

"بات تو ٹھیک ہے ۔۔۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں مجھے وہ تلسی پور کا محرم یاد آگیا۔ کیسا خواب کا ایسا وقت گزرا تھا اور وہاں میں نے ایک بات اور عجیب دیکھی کہ وہاں مجلسوں میں اکثر پنجابی اور سندھی شرنارتھی عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ فرخندہ باجی نے بتایا کہ تقریباً ساری یو۔پی۔ اسٹیٹ میں یہی ہو رہا ہے آج کل۔ دیکھئے کلچر پیٹرن کس طرح بدلتے ہیں! ۔۔۔ تلسی پور میں ان سیدوں کے گھر خالی پڑے ہیں جو پاکستان چلے گئے۔ مگر کوئی شرنارتھی ان میں نہیں رہتا کہ سیدوں کے گھروں کی بے ادبی ہوگی ۔۔۔ اس طرف سندھ اور پنجاب میں سیدوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی!" ۔۔۔

"یا اللہ ۔۔۔!"

"جی ۔۔۔؟"

"معلومات کا سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے ۔۔۔!!"

"آپ بات تو کرنے نہیں دیتے ۔۔۔"

"میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ جمیل غریب بھی دل میں کیا کہتا ہوگا کہ لڑکی کیا پوری لائبریری کی لائبریری سے شادی کی ہے۔"

"ویری فنی — ہا ہا!"

"اچھا قصہ جاری رکھو —"

"— تو شام کو جب قمر کے وہاں پہنچی۔ اس کے کمرے میں سب بوہیمین جمع تھے۔ عرفان۔ اس لڑکی جینیفر کرین کو دیکھ کر میری تو ہستی گم ہو گئی۔ اور جب قمر نے سب سے اپنی منگیتر کہہ کر اس کا تعارف کروایا تو ہم لوگ بھونچکے رہ گئے۔ مگر ہم سب انٹلکچوئیل تھے اور انٹلکچوئیل لوگ دنیا سے انوکھی نرالی باتیں کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جینیفر کرین انتہا سے زیادہ موٹی اور بے ہنگم تھی اور قمر کافی ہینڈسم لڑکا ہے۔"

"ہاں میں نے انڈین ہائی کمیشن میں اس کا ایک فلم دیکھا ہے۔"

"ہے نا ہینڈسم — اور جینیفر کرین خوفناک حد تک موٹی تھی مگر اس کی شکل بہت پیاری تھی۔ اسی لئے اور زیادہ بھدّی معلوم ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے کسی بڑے سے گلیشیر کے پیچھے سے سر نکالے جل پری جھانک رہی ہو — یہ قمر کو بوسٹن کی کسی تھیٹر ورکشاپ میں ملی تھی پھر اس کے پیچھے پیچھے نیویارک آ گئی۔ ایکٹنگ کی بڑی قابل استاد سمجھی جاتی تھی۔ قمر سے ملنے سے پہلے وہ ایک گجراتی لڑکے پر عاشق تھی۔ جب وہ اسے دل شکستہ چھوڑ کر بمبئی واپس چلا گیا تو یہ بیئر پی پی کر روتی جاتی اور تجریدی نظمیں لکھتی۔ اس کی نظمیں "نیو ورلڈ رائٹنگ" اور "ہڈسن ریویو" میں چھپتی تھیں۔ اس چیز کا ہم سب پر بڑا رعب تھا کیونکہ ہم لوگ کافی کم عمر تھے۔ اور سب کے سب انٹرنیشنل سطح کے بیٹنک بننا چاہتے تھے مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح بنیں —"

"اب قمر تو بن گیا۔"

"جی ہاں مگر قمر کی ایسی قسمت ہر ایک کی تو نہیں ہوتی۔ وہ اور جینیفر ایسا عجیب الخلقت جوڑا معلوم ہوا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے اور بہت خوشیاں منائی گئیں۔ شراب کے دور چلے۔ جینیفر چونکہ خود بوہیمین تھی اس لئے اپنے موٹاپے کا خود مذاق اڑاتی تھی۔ سب کو سامنے بٹھا کر اپنی 'نفسیاتی الجھنوں' کا تجزیہ کرتی تھی اور قمر سے مصر تھی کہ وہ اس کے سامنے کسی اور لڑکی پر عاشق ہو جائے تاکہ وہ حسد اور ٹریجڈی کے جذبات کا تجزیہ کر کے بہتر نظمیں لکھ سکے۔

"ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ ہندوستان کی روح کے اندر جھانکنا چاہتی ہے۔ اس لئے قمر سے شادی کر رہی ہے۔"

"خوب —"

VERY FUNNY al

"قمر نے اُس سے شادی تو نہیں کی مگر وہ قمر ہی کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئی۔ ہم لوگوں نے اس بات کا بالکل نوٹس نہیں لیا کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ OLD MORALITY کے ۔۔۔"

"ہاں۔ہاں۔معلوم ہے۔ قصہ مختصر کرو۔۔۔"

"سال بھر بعد قمر کلکتے واپس چلا گیا۔ پھر جینیفر کرین روز رات کو میرے پاس روتی ہوئی آتی۔ گھنٹوں بیٹھتی اور مزید تجریدی شاعری کرتی۔ چند روز بعد وہ بھی انڈیا چلی گئی اور وہاں پہنچ کر اُس نے بیچ بیچ قمر سے شادی کرلی۔ مگر اُس کے بعد ۔۔۔ آپ بور تو نہیں ہورہے ۔۔۔؟"

"بیہ ہے وقوفی کے سوالوں کا جواب نہیں دیا کرتا۔ کہانی سناتے جاؤ۔"

"مگر یہ تو بہت لمبی کہانی ہے۔"

نادر نے برابر آکر زور سے ہارن بجایا۔ وہ ملتان کچہری پہنچے تھے۔

ملتان شہر میں داخل ہوتے ہوئے نادر نے زور سے نعرہ لگایا۔

"اور دیوان شرر ملتانی - مونچھ سفید اور رستہ بے جوانی

اور دیوان ۔۔۔"

"کس قدر بے تکے ہیں آپ واللہ ۔۔۔!" عرفان نے کھڑکی میں سے سر نکال کر داد دی۔ "آگے ارشاد ہو۔"

"آگے یاد نہیں ۔۔۔" نادر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

وہ سرکٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ کار سے اترتے ہوئے نادر نے بات جاری رکھی۔۔۔ "کمال ہے اس وقت میں سوچ رہا ہوں کہ بچپن کی بعض چیزیں ذہن پر کس بُری طرح نقش ہوجاتی ہیں۔ عرفان بھائی آپ کچھ روشنی ڈالیے۔ آپ تو بڑے بھاری ماہر نفسیات ہیں ۔۔۔"

"واقعی ۔۔۔!" ستیا نے خوشدلی سے منہ بنا کر کہا۔ "جبھی یہ راستے بھر مجھ سے میرے بچپن کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ میں نے بچپن میں نیرنگِ خیال میں ایک نظم پڑھی تھی۔ جو دیوی رانی کے انگریزی فلم کرنا کے متعلق کسی نے لکھی تھی۔ بیحد پر لطف۔ اکبر کے دلی دربار کی قسم کی۔ اس کا بس ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے۔ کچھ اور بھی تھا ۔۔۔ ملقیس یاد ہے؟" نادر نے پوچھا۔

"جمیل بھیا کو ساری نظم ازبر تھی۔ ان کو تو ہزاروں شعر نوکِ زبان رہتے ہیں ۔۔۔" پھر وہ ستیا کی طرف دیکھ کر اچانک چپ ہوگئی۔

نادر نے ہڑبڑا کر دفعتے کو سنبھالنا چاہا۔ ۔ اور دیوان شرر ملتانی ۔ اور دیوان شرر ملتانی ۔"

اس نے بے وقوفوں کی طرح الاپنا شروع کیا۔ وہ سب برآمدے میں داخل ہوئے۔

ملتان سے روانہ ہو کر جب وہ دوبارہ سیدھی سڑک پر آئے تو عرفان نے کہا۔

"شہرزاد۔ اپنی داستان شروع کرو۔"

"اور کہاں تک سناؤں، انجام تو آپ کو معلوم ہے۔"

"نہیں، مجھے انجام معلوم نہیں، معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"تاکہ آپ اپنا حکم لگا سکیں۔"

"تاکہ میں اپنا فیصلہ کر سکوں۔"

"اوہ ۔۔۔ آپ غیر اشتراکی لوگ کس قدر رومینٹک ہوتے ہیں! ۔۔۔ ہاں تو میں کہاں تک پہنچی تھی؟"

"جمیل ترے کلکتے جا کر نوکری پر رہ کر لی۔"

"ہاں ۔۔۔ وہاں ان کے بیان کے مطابق چند مہینے ہی گذرے ہوں گے، ایک روز میں باورچی خانے میں رات کے لئے دال تیار کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دوڑ کر کھولا سامنے قمر کھڑا تھا۔ میرے منہ سے نکلا تم کیسے آ گئے۔ تم نے تو کلکتہ اور دیوپارک گھر ٹھکانہ بنا رکھا ہے ۔۔۔ تب اس نے ایک سخت ڈرامائی بات کہی ۔۔۔ وہ بڑی گمبھیر بنگالی رومینٹک آواز میں بولا ۔۔۔ میں ستیا میں تمہاری وجہ سے واپس آیا ہوں!"

"پہلے تو میں سمجھی کہ وہ اپنے کسی ڈرامے کا ڈائیلاگ بول رہا ہے۔ میں نے اسے مذاق میں ٹالنا چاہا۔ مگر وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"بس ۔۔۔ اس کے بعد ۔۔۔" وہ آہستہ آہستہ کہتی رہی ۔۔۔ "جانے کس طرح ہم ایک اور رشتے میں بندھ گئے۔ جمیل مجھ سے بعض دفعہ تین تین دن تک بات نہ کرتے تھے۔ صبح کو چپ چاپ دفتر جانے کے لئے تیار ہوتے ۔۔۔ بچے کو پیار کیا ۔۔۔ وہ اپنے بچے پر عاشق تھے ۔۔۔ اور آدھی رات کے بعد گھر لوٹے۔ ۔۔ ۔۔ پہلے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں جمیل کی بے پروائی کا انتقام لے رہی ہوں مگر اصل بات یہ تھی ۔۔۔ کہ ۔۔۔"

"کہ ۔۔۔؟"

"کہ میں واقعی قمر کی اور کھنچتی ہی چلی گئی ۔۔۔ جیسے سانپ کی اور اس کا شکار کھنچا چلا جاتا ہے۔

"ایک روز مجھے بتائے بغیر قمر جمیل کے پاس ان کی بارک میں گیا اور ان سے کہنے لگا ۔۔۔ جمیل مجھے تمہاری لیلیٰ سے عشق ہو گیا ہے ۔۔۔"

"گڈ گاڈ ۔۔۔ نو ۔۔۔!" عرفان نے کہا۔

"جمیل بھی پہلے یہی سمجھے کہ قمر اپنے ڈرامے کا ڈائیلاگ بول رہا ہے مگر جب ساری بات ان کی سمجھ میں آئی

تو انہوں نے ——"

"ظاہر ہے۔" عرفان نے اس کی بات کاٹی۔ "انہوں نے پہلے قمر کی ٹھکائی کی ہوگی پھر گھر آکر تمہاری ٹھکائی کی ہوگی۔ اچھی طرح ——"

"آپ کو کیسے معلوم؟" ستیا نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اگر میں جمیل کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔"

"انہوں نے بالکل یہی کیا۔ انہوں نے قمر کے بھی خوب گھونسے لگائے۔ اور گھر آ کر مجھے بہت مارا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جمیل ایسے دھیرے اور نرم مزاج کے آدمی پر اتنا جنون سوار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے خوب مارا ——"

"شاباش میرے شیر ——!" عرفان نے کہا "اور اس وقت جمیل نے یہ بھی کہا ہوگا کہ ابھی ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ —— اور رات کا وقت تھا۔ اور باہر بارش ہو رہی تھی۔"

ستیا ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی "جی ہاں —— بالکل یہی ہوا تھا۔" اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"دیکھو ستیا ——" عرفان نے رسان سے کہا "تم جو کہتی ہو کہ ہر بات مختلف اور اوریجنل اور انوکھی اور گہری ہونی چاہئے —— ستیا ساری زندگی ہزاروں لاکھوں بار دہرائی ہوئی داستان ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ لوگ اسی طرح محبت میں گرفتار ہوں گے ملیں گے۔ دوسرے سے مایوس ہوں گے اسی طرح دل ٹوٹیں گے اسی طرح دکھ اٹھائے جائیں گے۔ تم یا جمیل یا قمر انوکھی عجوبہ روزگار ہستیاں نہیں ہو۔ تم مجھے سطحی اور غیر جذباتی سمجھتی ہو مگر میں جانتا ہوں کس طرح تم جمیل کے گھر سے (جو تمہارا گھر تھا) نکلی ہوگی۔ کس طرح اُس نے طلاق تم کو دینے سے انکار کیا ہوگا۔ کس طرح تم مدد مانگنے قمر کے پاس گئی ہوگی۔ اور شاید اس نے بھی تمہیں سہارا دینے سے انکار کیا ہو —— ایسی باتیں تم لوگوں کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے تھیں۔ کیونکہ تم اور جمیل اور قمر بڑے غیر معمولی دل و دماغ کے لوگ تھے۔ مگر زندگی کی چکی میں سب ایک ساتھ پستے ہیں۔ اس میں انٹلکچوئل اور غیر انٹلکچوئل کی کوئی تفریق نہیں ——"

وہ سر کھڑکی میں ٹکا کر سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔ اب پنجاب کے سرسبز کھیت شروع ہو چکے تھے۔ سرخ اور سیاہ لہنگے پہنے کسان عورتیں پگڈنڈیوں پہ سے گذر رہی تھیں۔ منٹگمری کے ضلع سے آگے غروب آفتاب کی روشنی میں آسمان بالکل سرخ انگارہ سا ہو گیا۔ سڑک پر مکمل سناٹا تھا۔ جوہڑوں پر پن ڈبیاں چکر کاٹ رہی تھیں۔ ایک کسان بڑا سا پگڑ باندھے اور سفید تہمد پہنے بیلوں کی جوڑی ہنکاتا گھر جا رہا تھا۔ بہت دیر تک گھنٹیوں کی سریلی آواز شام کے گہرے سناٹے میں تیرا کی۔ ستیا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کھول دیا۔ ریڈیو سیلون سے لتا کا گیت شروع ہو گیا جس میں گٹار بڑی جان لیوا آواز میں بج رہا تھا۔

"بند کر اسے۔" عرفان نے جھنجھلا کر کہا۔

ستیا نے فوراً تعمیل کی اور سوئچ آف کرنے کے بعد پھر سر کھڑکی میں رکھ دیا۔

"رو دو مت ـــ" عرفان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

اس نے سسکی بھری اور جھنجھلاہٹ سے آنکھ کا کونہ صاف کیا۔

"میں تمہارے لئے جو کچھ ممکن ہو گا کروں گا ستیا۔ مگر بتاؤ بھلا میں کر کیا سکتا ہوں؟"

"عرفان مجھے میرا انل چاہئے اگر آپ کو مجھ سے ذرا سی بھی ہمدردی ہے تو جمیل سے میرا بچہ واپس دلوا دیجئے۔"

"انل جمیل کے پاس ہے؟"

"وہ اسے پاگلوں کی طرح چاہتے ہیں۔ یہاں امریکہ سے آنے والے دوستوں نے مجھے بتایا ہے کہ دفتر سے سیدھے گھر آ کر بس اسی کو لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک نیگرو بڑھیا اس کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لی ہے۔ شام کو گھر پر ہی تنہا بیٹھ کر ڈرنک کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی دوسری شادی سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو انہوں نے اسے اسکول کے بورڈنگ میں ڈال دیا ہے۔ کسی طرح مجھے میرا بیٹا واپس دلا دیجئے عرفان ـــ"

"تم نے ان کے گھر والوں سے کہا؟"

"میں ان سے کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"تو کوئی مشورہ کیا؟"

"میں کچھ نہیں کر سکتی ـــ میں نے فرخندہ باجی سے ذکر کیا تھا۔ وہ بے چاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں انہوں نے جمیل کو ان گنت خط لکھے۔ مگر یہ ایک الجھا ہوا معاملہ ہے۔ کیونکہ جمیل ان کے بھائی ہیں۔ انہوں نے مجھے طلاق دیئے بغیر دوسری شادی کر لی۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ـــ"

"ارے۔ تم نے سول میرج نہیں کی تھی ـــ؟"

"نہیں مسلمان ہو کر میرا نکاح پڑھایا گیا تھا۔ کیونکہ جمیل کے بابا نے ان سے کہا تھا کہ اگر انہوں نے امریکہ میں کسی غیر مسلم سے سول میرج کی تو وہ ان کو عاق کر دیں گے۔ کیونکہ وہ شیعہ مجتہد ہیں۔ جمیل نے مجھ کو یہ بات بتائی میں ان کے عشق میں اس شدت سے مبتلا تھی کہ میں نے جواب دیا کوئی حرج نہیں۔ ان کی یہ شرط ضرور پوری کر دیجئے بوڑھے ماں باپ کا دل دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور فرق کیا پڑتا ہے مسلم اور غیر مسلم ـــ میں تو ان جھگڑوں کو مانتی ہی نہیں سرے سے ـــ نکاح نامے پر میرا اسلامی نام شاید سعیدہ بیگم لکھا گیا ہے۔ میں نے بے حد اصرار کر کے بالکل شرعی مہر لکھوایا جو صرف چند ڈالر بنتا تھا۔ چونکہ جمیل نے مجھے طلاق نہیں دی اس لئے اس اسپینش لڑکی کو بھی مسلمان کر کے ہی بیاہ کیا ہوگا۔

"وہ مجھے طلاق نہ دیکر اسی طرح سزا دینا چاہتے ہیں۔ قصور سراسر میرا تھا۔ میں نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔ میں کئی مہینے تک متواتر دوپہر کو یا رات کو جب بھی موقعہ ملتا قمر کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ اس کے دوستوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کی مسٹریس بن چکی ہوں۔

"لیکن جس وقت جمیل نے مجھے گھر سے نکالا میں کئی گھنٹے باہر بارش میں سائڈ واک پر کھڑی رہی۔ اگر اس وقت وہ ایک مرتبہ بھی دروازہ کھول کر صرف اتنا کہہ دیتے سیتا —— بارش میں مت بھیگو —— اندر آ جاؤ —— تو میں —— تو میں واپس جا کر ان کے قدموں سے لپٹ جاتی —— عمر بھر ان کو دھوکہ نہ دیتی۔ مگر دروازہ اسی طرح بند رہا —— اندر سے راہل کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بیڈ روم کی روشنی جلا کر اسے سُلانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کا سایہ میں نے کمرے کی کھڑکی پر پڑتے دیکھا۔ وہ راہل کی پلنگڑی پر جھکے اسے سلا رہے تھے اسے کمبل اڑھانے کے بعد وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں دیر تک سانس روکے کھڑکی کے اندر دیکھا کی۔ شاید وہ مجھے اندر بلا لیں۔ مگر وہ اسی طرح مبت بنے اندر بیٹھے رہے۔ اور اس کے بعد روشنی بجھا دی۔

"آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ میں وہاں سے ٹیکسی لے قمر کے گھر پہنچی۔ اس وقت اس کے یہاں محفل گرم تھی۔ اس نے مجھے تعجب سے دیکھا —— اتنی بارش میں کیوں آئیں —— کیسی ہو ——!

"میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ خاموش ہو گیا پھر اس نے کہا —— میں نے غلطی کی تھی —— میں تم سے کبھی نہیں نبھا پاؤں گا —— میں بہت غیر ذمہ دار آدمی ہوں۔ واپس جاؤ اور جمیل سے کہو تمہیں معاف کر دیں۔ وہ بہت نوبل آدمی ہیں۔ ضرور معاف کر دینگے —— میں بھی ان سے معافی مانگ لوں گا۔ ہم دونوں جذبات کے سیلاب میں بہہ گئے تھے سیتا رانی —— زندگی کا اصل سکون تمہیں ایک SOLID آدمی ہی کے گھر میں مل سکتا ہے —— وہ جانے کیا کیا ڈائیلاگ بولتا رہا۔ میں باہر آ گئی۔

"چند روز میں نے اپنی دوست گریس کے اپارٹمنٹ میں گزارے اور پھر ماتھی سے کرائے کا روپیہ لے کر دلی چلی آئی۔ اب سال بھر سے دلی میں ہوں ——"

"تم نے بچے کے لئے جمیل کو لکھا؟ خلع کی کوشش نہیں کر سکتیں؟"

"عرفان یہ سب اتنی ڈراؤنی باتیں ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس آدمی کو میں نے اپنی زندگی، اپنا دل، دماغ، روح سبھی کچھ سونپ دیا تھا ایک روز اس سے علیحدگی حاصل کرنے کے لئے قانونی جھگڑے کرنا پڑیں گے۔ میں جھگڑا زیادہ نہیں بڑھانا چاہتی تھی کیونکہ ڈیڈی کو سب تفصیل معلوم ہوتی تو ان کا صدمے سے مارے ہارٹ فیل ہو جاتا۔ ایک بیرسٹر دوست کے ذریعے البتہ جمیل کو خط لکھوا دیا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس عورت کی اخلاقی حالت ایسی نہیں کہ ایک معصوم بچے کی پرورش کر سکے —— اور عرفان —— ان کا یہ

پوائنٹ شاید ٹھیک بھی تھا ــــ کم از کم دنیا کی نظروں میں ــــ"

"واٹ رَبش ــــ"

لاہور اسٹیشن پر انڈیا جانے والی ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے پلیٹ فارم کی سلاخوں کے ادھر بیٹھے ہوئے کانسٹیبل نے کاغذات کی خانہ پری کے لئے سوالات شروع کئے تو ایک خانے پر آکر اسنے پوچھا۔

"مذہب ــــ؟"

سب گڑبڑ گئے ــــ بلقیس فارم مکمل کروا کے ٹرین کے قریب کھڑی حسب معمول رشتے داروں سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ نادر اور عرفان ستیا کے ساتھ پولیس کی میز پر موجود تھے۔ کانسٹیبل نے پاسپورٹ کھول کر دوبارہ دیکھا ــــ اور ستیا پر نگاہ دوڑائی ــــ

نام :- مسز ستیا جمیل

سفر کا مقصد :- عزیزوں سے ملنے پاکستان آئی تھیں۔

شوہر کی قومیت :- جمہوریہ ہند کا شہری

اس نے پھر ایک مرتبہ ستیا پر نظر ڈالی۔ عجیب سا نام ہے۔ ماتھے پر بندی لگا رکھی ہے۔ پاکستان سے انڈیا جا رہی ہیں۔ خاصا پر اسرار معاملہ تھا۔

"مذہب ــــ؟" اسنے دوبارہ سوال کیا۔

"یہ سوچنا پڑے گا ــــ چلئے فری تھنکر لکھ دیجئے ــــ" عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔

کانسٹیبل نے لکھدیا۔

"ہاہا ــــ" نادر نے قہقہہ لگایا ــــ "بھابی جان فری تھنکر ــــ اسلئے یہ شگون بڑی خالہ سے پوچھ پوچھ کر تلسی کی پوجا میں کرتی تھیں جب جمیل بھیا بیمار پڑ گئے تھے ــــ ہاہا ــــ"

"ہاہاہا ــــ" عرفان بھی کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"ہاہاہا ــــ" ستیا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

۸

ٹرین لاہور سے دلی پہنچ گئی۔ بلقیس اسی روز پالم جا کر بمبئی روانہ ہوگئی۔ ستیا قرولباغ واپس پہنچی۔ دوسرے روز ہسپتال، تیسرے روز سے دفتر جانے لگی۔ اس کی مصروف اور خالی زندگی کے معمولات کا سلسلہ د میں

سے دوبارہ شروع ہو گیا۔ جہاں اسے چھوڑ کر وہ تین ہفتے کے لئے پاکستان گئی تھی۔

بلقیس کے کمرے سے لوٹنے کے بعد دوسرا ایکٹ شروع ہونے والا تھا۔ اور ماڈرن تھیٹر کے اراکین اس کی تیاریوں میں بے طرح مصروف تھے۔

"فرسٹ نائٹ" کے موقع پر ستیا تھیٹر ہال کی سیڑھیوں پہ کھڑی چند دوستوں سے باتیں کر رہی تھی۔ جب اسے محسوس کیا کہ ستون کے پیچھے سے ایک آدمی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی صورت کچھ مانوس سی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون ہے۔ وہ اطمینان سے باتوں میں منہمک رہی۔ جب سب لوگ اندر جانے لگے تب بھی اس آدمی نے ایک دو بار مڑ کر اسے اچٹتی نگاہوں سے دیکھا۔ کھیل کے اختتام پہ جب وہ بلقیس کو مبارکباد دینے کے ارادے سے للتا کے ڈریسنگ روم میں گئی اس وقت وہ آدمی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اور چار پانچ لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے۔ اپنے انداز سے وہ کوئی بڑی اہم ہستی معلوم ہوتا تھا۔ للتا نے ستیا کا اس سے تعارف کرایا —— "پرویش کمار چودھری!"

پرویش کمار چودھری —— ملک کا عظیم ترین مصور —— عالمگیر شہرت کا ایکسپریشنسٹ آرٹسٹ —
جس کی تصویریں اس نے نمائشوں اور رسالوں اور کتابوں میں دیکھی تھیں جس کے متعلق امریکہ کے آرٹ میگزینوں میں مضمون پڑھے تھے —— پرویش کمار چودھری —— اس کے جیتا جاگتا اس کے سامنے موجود تھا ——!!

"ہیلو ستیا دیوی ——" وہ کہہ رہا تھا —— "للتا سے تو آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اس وقت آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آئیے —— ادھر بیٹھ جائیں۔"

وہ ملبوسات کے انبار کے پاس اسٹولوں پہ ٹک گئے۔ پرویش بے حد اخلاق سے گفتگو کرتا رہا۔
یہ سوچ کر کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مصور سے باتیں کر رہی ہے اسے بڑی عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔

پرویش خاصی پختہ عمر کا انسان تھا۔ اس کی شخصیت بہت دلکش تھی اور عورتوں کو موہنے کا فن بھی اسے خوب آتا تھا۔

"بچپن سے میں آپ کا نام سنتی آرہی ہوں۔ کولمبیا میں ہم لوگوں نے آپ کی تصویروں کی نمائش بھی کی تھی۔ انڈیا ایوننگ کے سلسلے میں ایک مرتبہ ——" ستیا نے کہا۔

"اچھا ——" وہ بڑی شفقت اور اپنائیت سے مسکرایا۔

"بچپن سے آپ کا نام سنتی آرہی ہوں ——" یہ کیا رسمی اور احمقانہ بات کہہ دی میں نے۔ مگر یہ واقعہ تھا کہ اس وقت وہ یکبارگی بے حد نروس ہو گئی تھی۔ مشہور شخصیتوں سے مرعوب ہونا اس کی بہت بڑی

کمزوری تھی۔ اور اسے اس کمزوری کا احساس بھی تھا۔ پل کی پل میں ان سب مشہور لوگوں کا جلوس اس کے ذہن سے منڈلایا جن کی وہ لڑکپن سے ہیرو ورشپ کرتی آئی تھی — "میرا مطلب یہ نہیں کہ — میں بہت چھوٹی ہوں —" دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر کہا۔

"کیوں نہیں — تم تو میری بیٹی کے برابر ہوگی۔"

"خیر یہ تو غلط ہے — بیٹی —؟" اس نے ذرا رک کر پوچھا۔

"ہاں۔ اگر میرے کوئی بیٹی ہوتی تو تم سے کوئی چار پانچ سال ہی چھوٹی رہی ہوتی عمر میں —"

سیتا کو معلوم تھا کہ جب سے اپنی ہنگیرین بیوی کو اس نے طلاق دی تھی (جو خود بڑی مشہور سنگتراش تھی) پروفیسر کمار چودھری نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ جس طرح ٹیگور کی ساری دنیا کو اپنی یونیورسٹی سمجھتا تھا۔ پروفیسر ساری دنیا کی خوبصورت عورتوں کو اپنی حرم سرا کی ممکن کنیزیں تصور کرنے کا قائل تھا۔ اور ایسا سوچنے میں وہ حق بجانب تھا کیونکہ بہت کم عورتیں اس کی شخصیت کے سحر سے بچ سکتی تھیں۔ پچھلے تیس سال سے اس کے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں اس کے معشوقوں کے "پیریڈ" مشہور تھے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۱ء تک جب الہ آباد کی کشمیری نژاد آرٹسٹ پریا بخشی پر عاشق تھا وہ زمانہ اس کی ہسٹری کا "کشمیری پیریڈ" کہلاتا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے چیکوسلواکین، گجراتی اور راجستھانی "ادوار" جاری رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک جب نامور ہندی ادیبہ کماری راج رانی مصرا نے اس سے متاثر ہو کر تین ضخیم ناول لکھے وہ پروفیسر کمار چودھری کا "گنگا جمنی دور" سمجھا گیا۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک اس کے علیحدہ علیحدہ مرہٹہ، فرانسیسی، روسی اور پنجابی پیریڈ شروع ہو کر ختم ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں اس کی ہنگیرین بیوی آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ ادھر کچھ عرصے سے اس کی جذباتی زندگی کا کوئی "پیریڈ" منظر عام پر نہیں آیا تھا۔

وہ سیتا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا بہت دیر تک سیتا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا سیدھی سادی غیر تکلف غیر مابعد الطبیعیاتی باتیں۔

"اسے — یہ اتنا بڑا آدمی اتنا نائس اور سیدھا سادا نکلا۔

اس کی طبیعت میں کتنا انکسار تھا۔ کتنی ملائمیت" سیتا نے حیرت سے سوچا اور جب پروفیسر نے کہا کہ ہفتے کی رات کو میرے ساتھ کھانا کھاؤ تو اس نے فوراً منظور کر لیا۔ "قمر اور مادھوری بھی آ رہے ہیں۔" پروفیسر نے اضافہ کیا۔

"اوہ — ہاؤ ونڈرفل — میں قمر سے بہت زمانے سے نہیں ملی —" سیتا نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

ہفتے کی شام کو جب وہ پروجیش کمار چودھری کے ہمراہ ریسٹوراں میں داخل ہو رہی تھی تو ان دونوں کو گھٹنے دیکھکر برآمدے میں کھڑی ہوئی کسی لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا — "شوگر ڈیڈی —"!!
ستیا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ شکر ہے کہ پروجیش نے یہ لچر ریمارک نہیں سنا۔ اس نے سوچا۔
وہ دونوں اندر جاکر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ہال قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ آرکیسٹرا کوئی تازہ ترین امریکن دھن بجانے میں مصروف تھا۔ لوگ آ آ کر میزوں پر بیٹھ رہے تھے یا باہر جا رہے تھے۔ پروجیش اپنے کسی شناسا سے بات کرنے کے لئے اٹھ کر دوسری میز پر چلا گیا۔ ستیا اپنی جگہ پہ بیٹھی ریسٹوراں کے مجمع کو دیکھتی رہی۔ کیسے کیسے لوگ۔ نئی ہندوستانی اسٹیج کے اداکار — اردو کے شاعر اور ادیب — نئے دولت مند سندھی اور پنجابی جو دس سال قبل اسی شہر میں پاکستان سے شرنارتھی بنکر آئے تھے۔ باہر کناٹ سرکس کے راستوں پر موٹروں کا جوار بھاٹا امنڈ رہا تھا — مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدے دار فلم سمینار کے لئے آئے ہوئے بمبئی اور کلکتے کے مشہور ایکٹر اور ایکٹریسیں اور ڈائریکٹر — کانگریس اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کے نیتا — اسی نئی سوسائٹی کے متعلق ریسرچ کر کے اسنے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی — چند منٹ بعد پروجیش میز پر واپس آیا اور نرم نرم آواز میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ ان کمبخت بنگالیوں کی آواز میں کتنا جادو ہوتا ہے۔ —
تھوڑی دیر میں قمر اور مادھوری آ گئے۔ — مادھوری کی مانگ میں سیندور تھا۔
"مسز چودھری —" پروجیش نے ستیا سے تعارف کرایا۔
"مبارک ہو قمر —!" ستیا نے مسکرا کر کہا۔
"تھینکس — ستیا — ہم لوگوں نے اتنی جلدی میں شادی کی ہے کہ سب دوستوں کو خبر بھی نہیں کر سکے — اور تم تو پاکستان چلی گئی تھیں۔"
قمر نے بڑی محبت اور خلوص سے ستیا سے باتیں شروع کیں جس طرح دو پرانے دوست ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔
اسی وقت پروجیش نے ایک روسی دوست کو اپنی میز پر بلا لیا۔ جو اردو میں ریسیرچ کرنے کے لئے ماسکو سے علی گڑھ آئی ہوئی تھی کچھ دیر بعد دو اور روسی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں بھلائی میں انجینئر تھے۔ یہ لوگ "ہندی والے" تھے اور "اردو والی" روسی لڑکی سے اردو ہندی کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ اور نہایت ثقیل اردو اور نہایت شدھ ہندی بول رہے تھے۔
پروجیش قہقہہ مار کر ہنسا — "اردو ہندی کا جھگڑا ایسا ہے کہ تم روسیوں کو بھی لے ڈوبا —"

اسے کہا۔

جوں جوں رات گہری ہوتی گئی پروجیکشن کے مہمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ڈنر کے اختتام پر جب ستیا باہر نکلنے لگی تو قمر اور مادھوری نے اسے بڑی گرم جوشی سے آئندہ اتوار کو اپنے گھر مدعو کیا۔

قمر اور مادھوری کی شادی کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں سمندر نگر کے ایک فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ مادھوری سرکاری افسر تھی اور اپنی کار چلاتی تھی۔ اس وجہ سے قمر کو اپنی مالی کامیابی کے باوجود کار خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان دنوں وہ دونوں اپنا گھر اپنے ہی آرٹسٹک انداز سے سجانے میں جٹے ہوئے تھے۔ اور زیادہ تر شام کو باہر جانے کے بجائے وہ اپنے قریبی دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کر لیتے تھے جہاں سب مل کر کھانا بنانے میں مادھوری کی مدد کرتے۔

اتوار کی شام حسب وعدہ وہ پروجیکشن کے ہمراہ قمر کے گھر پہنچی۔ قمر گھنٹی کی آواز سن کر بہت خوش خوش دوڑتا ہوا نیچے استقبال کے لئے آیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے مہمانوں کو سٹنگ روم میں چھوڑا اور ان کی خاطر میں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ پروجیکشن نے جو بہت بڑی پینٹنگ قمر کو شادی کے تحفے میں دی تھی اس کے نیچے دیوان پر بیٹھے ہوئے ستیا نے دیکھا کہ کامیابی نے قمر کو ایک حد تک مختلف شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے انداز میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ شاید وہ اب اتنا لیا دیا بھی نہیں رہا تھا۔ مہمانوں سے باتیں کرتے کرتے وہ کبھی کبھی نظریں اٹھا کر بڑے پیار سے مادھوری کو دیکھ لیتا تھا۔ ــــ مادھوری نے اس پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ اس کی بوہیمین ازم دور کرنے میں تندہی سے مصروف تھی۔

قمر الاسلام چودھری اس وقت ایک کامیاب، نامور، دولت مند انسان تھا۔ اور مسرور اور مطمئن ــــــ کامیابی روح کے لئے کتنی عمدہ شے ہے۔

اس وقت وہ بڑی بے نیازی اور بے پروائی سے اپنے برطانوی اور امریکن پبلشرز کا ذکر کر رہا تھا۔ اور ستیا نے دیکھا کہ اس کی گفتگو میں کہیں پر بھی عجز یا اترابٹ یا خودستائی کی جھلک نہیں تھی۔ کامیابی انسان کو انکسار بھی سکھلا دیتی ہے۔ چند روز بعد وہ ماسکو جا رہا تھا۔ اس کی نئی تمثیل مشرقی برلن میں اسٹیج کی جانے والی تھی۔ حال ہی میں اس نے اپنا پہلا ناول مکمل کیا تھا۔ اس ناول کو چھپوانے کی اسے جلدی نہیں تھی۔ کیونکہ نظموں کے مجموعے کی اشاعت سے اسے اتنی شہرت مل گئی تھی کہ اب اسے مزید شہرت کی چنداں پرواہ نہیں رہی تھی ــ کامیابی انسان کو قانع بنا دیتی ہے۔

گھنٹی بجی اور ستیش گوپال اور جینیفر کرین اندر آئے۔ جینیفر ستیا کو دیکھتے ہی نعرہ لگا کر اس سے لپٹ گئی۔ "ڈارلنگ ــ تم کو اتنی صدیوں بعد دیکھا ہے ــ کیسی ہو ــ ؟ میں اب مسز گوپال ہوں ــ اور تم؟

ستیش گوپال نے مسکرا کر ستیا کو نمستے کیا۔ ستیا اس سے ایک بار بلقیس کے وہاں مل چکی تھی۔ وہ بڑا خوش اخلاق اور ملنسار قسم کا پنجابی لڑکا تھا۔ محکمۂ اطلاعات میں کام کرتا تھا اور اردو میں شعر کہتا تھا۔

"ہندوستان کی روح کے اندر جھانکنے کی تمہاری پروجیکٹ ابھی مکمل نہیں ہوئی ——؟" کھانے کے لئے جاپانی وضع کی لمبی چوکی کے نزدیک کشن پر بیٹھتے ہوئے ستیا نے جینیفر سے دریافت کیا۔

"بنگال کے بعد پنجاب کا جائزہ لینا بے حد ضروری تھا ——" جینیفر نے اطمینان سے پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی تو ہندوستان کی بہت ساری اسٹیٹس اور باقی ہیں جینیفر ڈیر ——!"

ستیا نے کہا۔

"خدا میری مدد کرے ——" جینیفر نے آنکھیں گھما کر چھت کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ستیا جی —— " ستیش نے اسے مخاطب کیا۔ "قمر صاحب اب مصر ہیں کہ میں ان کے ناول کا اردو میں ترجمہ کروں۔ آپ نے پڑھ لیا اسے؟"

"ابھی تو نہیں ——"

قمر فوراً مسودے کا فائل نکال لایا۔

"نام تو بڑا اچھا ہے —— "بادلوں کا شہر" —— مطلب —— ؟" پروجیش نے عنوان پر نظر ڈال کر کہا۔

"ارے صاحب وہ نیویارک کے اسکائی اسکریپر کے باسی بادلوں میں رہتے ہیں نا —— اپنی تو سمجھ میں یہی آیا —— گو اسے بھی قمر صاحب نے آپ کی پینٹنگز کی طرح ناقابلِ فہم بنانے کی کوشش تو پوری کی ہے ——"

ستیش گوپال نے جواب دیا۔

کھانے کے بعد قمر مسودہ لے کر ستیا کے پاس آ بیٹھا۔ "ستیا —— میں کسی روز یہ ناول تمہیں خود پڑھ کر سناؤں گا —— سنو گی —— ؟ تمہیں نیویارک کی وہ طوفانی رات یاد ہے جب برستی بارش میں تم میرے پاس آئی تھیں اور میں کچھ نہ کہہ سکا تھا —— یاد ہے نا —— ؟ میں نے اس طوفانی رات کا باب اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے ——" اس نے آہستہ سے کہا۔

ستیا نے نفرت سے اس پر نظر ڈالی —— تم زندگیوں سے اس لئے کھیلتے ہو کہ بعد میں ان کے متعلق کامیاب ناول لکھ سکو۔ تم انٹلکچوئل لوگ دراصل کتنے بڑے فراڈ ہو۔ اس نے دل میں کہا۔

جینیفر اب قہوہ بنانے میں مادھوری کی مدد کرنے باورچی خانے میں جا چکی تھی اور وہ دونوں کسی

بات پر خوش خوش ہنس رہی تھیں ستیش پھلکاری کے ٹکڑے پر بیٹھا بک کیس میں کتابیں دیکھنے میں مصروف تھا ــــ اور تم سے کوئی بات کہہ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے ستیتا کا سر چکرا گیا۔ یہ یورپین اسٹلکچوئیل لوگ شادیوں کے سلسلے میں ایک قسم کی میوزیکل چیئرز کھیل رہے تھے۔ اور کتنے ناقابلِ اعتبار تھے ــــ کیونکہ خود انہیں اپنی زندگیوں پر اعتبار نہ تھا ــــ

یکلخت اسے عرفان یاد آیا ــــ اور اس یاد نے اسے بے حد دل گرفتہ کیا۔ اس لمحے وہ نجانے کہاں ہوگا۔ لاہور۔ پٹنہ اور پنڈی۔ وہ بھی اسے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اور عرفان دو مختلف کروں پہ زندہ تھے۔

عرفان نے اس کی روانگی کے وقت لاہور کے پلیٹ فارم پر دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"تم مجھے غیر جذباتی سمجھتی ہو مگر اب تمہارے جانے کے بعد میں مستقل یہ شعر پڑھ پڑھ کر آنسو بہایا کروں گا ــــ آنسو بہانا کیا معنی دھاڑیں مار مار کر رویا کروں گا ــــ"

"کون سا شعر ــــ؟"

"عرض کرتا ہوں ــــ

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں"

۹

پانچ چھ مہینے گزر گئے ــــ

ایک روز کافی رات گئے بلقیس کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لئے غسلخانے کی طرف جا رہی تھی جب زور زور سے فون کی گھنٹی بجی ــــ "ستیتا ہوگی۔ وہی اس طرح وقت بے وقت فون کرتی ہے ــــ" بلقیس نے چھوٹی خالہ سے کہا اور لاؤنج میں جا کر ریسیور اٹھایا۔

اس کا خیال ٹھیک تھا۔ ہمسائے کے گارڈن ہاؤس سے ستیتا بول رہی تھی۔

"ہلو ــــ میں کل صبح کولمبو جا رہی ہوں ــــ"

"کیا کہا ــــ؟ کولمبو ــــ؟ خدا کے لئے ــــ کیوں بھئی ــــ؟"

"کولمبو بھی ــــ" ستیتا کی آواز میں بڑی نقاہت تھی۔

"مگر کیوں؟"

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ جمیل وہاں یو۔ این کے کسی کام سے آئے ہوئے ہیں۔"

"تو ——؟"

"میں جا کر آخری بار ان سے پرارتھنا کروں گی کہ ڈائل مجھے دے دیں۔"

"یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے سیتا ڈیر —— اور تم وہاں کیوں جاؤ —— شاید وہ دلّی بھی آئیں گے۔ اتنے قریب آ کر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں —— مگر انہوں نے ہمیں کولمبو آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا ——"

"وہ وہاں صرف ہفتہ بھر کے لئے آئے ہیں۔ سیدھے جکارتا چلے جائیں گے اور پھر واپس نیویارک ۔ میں نے یو۔ این انفرمیشن آفس سے سب معلوم کر لیا ہے ——"

"اور کولمبو میں تم انہیں پکڑ لوگی۔"

"ہاں —— میں سب انتظام کر لوں گی ——"

"یا اللہ —— تم روز بروز زیادہ پراسرار ہوتی جا رہی ہو سیتا ڈیر —— وہ کس طرح ! بڑی زی سوزس گل ہو جاتی۔"

"وہ تمہارے والے بھاشے بھی آج کل وہیں پر ہیں۔ کسی کانفرنس کے چکر میں گئے ہیں۔"

"میرے والے بھاشے کون ؟"

"وہی —— وہ ذرا جھکی —— "عرفان"۔"

"تم کو کیسے معلوم ؟"

"میں —— مجھے انہوں نے لکھا تھا۔"

"اچھا —— آپ ان سے خط و کتابت بھی کرتی رہی ہیں۔ تم واقعی بڑی زبردست DARK HORSE ہو سیتا ما ئی ! اگر کہیں خدا نخواستہ میں ان سے شادی کرنے والی ہوتی تو اسی وقت آکر تم سے ڈوئل لڑتی !!"

"چونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم ان سے شادی نہیں کر رہیں اس لئے میں نے ان کے خطوں کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔"

"اوہ —— نیور مائنڈ —— میں مذاق کر رہی تھی۔ تم کس قدر بور بھی بنتی جا رہی ہو —— مجھے تمہاری طرف سے فکر ہو گئی ہے —— چیئر اپ !"

"تو —— وہ —— عرفان صاحب بڑے سمجھدار آدمی ہیں۔ میں ان سے کہوں گی کہ جمیل کو سمجھا بجھا کر راضی کرنے کی کوشش کریں —— تمہارے ناطے —— انہوں نے مجھ سے پاکستان میں وعدہ کیا تھا کہ ہر ممکن

مدد کریں گے ـــــ اس کے علاوہ میں ڈیڑھ سال کام کرتے کرتے تھک گئی ہوں ـــــ ذرا سیر بھی کرلوں ـــــ"

"تو سیر کرنے کے لئے یہاں جگہیں کم ہیں۔ کشمیر یا نینی تال چلی جاؤ۔ اتنی دور جاکر روپیہ برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے ـــــ اور پھر تم نے وہی بیہودہ بات کہی ـــــ میرا مطلب کیا ـــــ؟"

"میرا مطلب یہ کہ وہ تم لوگوں کے فیملی فرینڈ ہیں ـــــ"

"دوسری بات یہ کہ جیل بھیا دوسروں کے سمجھانے سمجھنے کے بجائے اور زیادہ چڑ جائینگے۔ تم ان کا غصہ نہیں جانتی ہو ـــــ میں ان کی بہن ہوں ـــــ میں جانتی ہوں"

"میں ان کی بیوی ہوں ـــــ بلقیس ـــــ"

"گڈ گاڈ ـــــ ستیا تم کو عقل کی بات بتانا بالکل بیکار ہے ـــ سیدھے سبھاؤ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ چونکہ ہمارے لئے پاکستان جاکر عرفان سے ملنا قریباً ناممکن ہے اور ہم سب کے لئے AWK WARD بھی۔ اس لئے تم محض ان سے ملاقات کرنے کو لمبو جارہی ہو ـــــ تم کس کو بے وقوف بنانا چاہ رہی ہو۔ ستیا ڈیر ـــــ؟"

"بلقیس ـــــ" ستیا نے غصے سے کہا ـــــ "تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں کررہی ہو؟"

"اس لئے کہ تم دن بدن زیادہ احمق ہوتی جارہی ہو۔ لوگ یہاں تمہارے اسکینڈل بیان کرتے ہیں تو شرم تو ہم لوگوں کو آتی ہے"

"گیٹ آؤٹ بلقیس ـــــ" ستیا نے غصے سے لرزتے ہوئے زور سے ریسیور پٹخ دیا۔

"کس سے لڑ رہی تھیں؟" کملا نے بچے کو لوری دیتے ہوئے اپنے کمرے سے بڑی میٹھی آواز میں پوچھا۔

"تم لوگ سب مل کر مجھے کھا جاؤ گے" ستیا نے زہر بھرے لہجے میں جواب دیا اور بیگ اٹھا کر تیر کی طرح گیلری سے باہر نکل گئی۔

۱۰

"وانی اور وناٹک کو میرا پرنام جنہوں نے الفاظ اور ان کے معانی ایجاد کئے ـــــ والمیکی، ہنومان، بھوانی اور شنکر، رام اور سیتا کو میرا پرنام۔ ہری ہر ـــــ جس کے کارن یہ دنیا حقیقی نظر آتی ہے ـــــ جس طرح رسی کو سانپ سمجھ لیا جاتا ہے۔ ہری ہر ـــــ جس کے چرن ہی ایسی ناؤ ہیں جن کے ذریعہ سنسار ـــــ پیدائش ـــــ اور موت ـــــ کے سمندر کو پار کیا جاسکتا ہے ـــــ وشنو ـــــ جس کا چہرہ

بالمتی کا الپ ہے، جو کالی یگ کی بدی کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے ـــ مجھ پر اپنا رحم کر ـــ
'دودھ کے سمندر میں رہنے والے خدا جو نیل کنول کے مانند نیلا ہے ـــ مجھ پر رحم کر ـــ
گرد رام چندر کے قدموں کی دھول سے، جو امرت ہے، میں اپنی خرد کی آنکھوں کو صاف کروں گا ـــ
سنتوں کے کرم کپاس کے پھول ایسے ہیں ـــ خشک اور سپید اور ملائم ـــ میرا گرو جو دنیا میں مجسم پریاگ ہے ـــ جہاں سے گنگا بہتی ہے، جو رام کی بھگتی ہے ـــ جو دھیان ہے ـــ جو سرسوتی کی مانند ہے ـــ ہری اور ہر کی کہانی ترہینی ایسی ہے ـــ دھرم برگد کا مضبوط درخت ہے ـــ بدنفس اس دنیا میں کیتو کی طرح تباہ کن ہیں، اور کمبھ کرن کی طرح ستاتے ہیں ـ خدا اور بندہ، دولت اور افلاس، بادشاہ اور بھکاری، کاشی اور مگدھ[1]، گنگا اور کرم ناشش[2]، مارواڑ اور مالوہ[3]، برہمن اور قصائی ـــ ویدوں نے ان کا فرق بتایا ہے ـــ میں سفید کاغذ پر وہی لکھتا ہوں جو سچ ہے ـــ ملیا سے جو لکڑی آتی ہے اسے بڑا بیش قیمت سمجھا جاتا ہے اسے محض لکڑی کون سمجھتا ہے؛ وشارد[4] کی بوندیں سیپی میں گرتے ہی پورنماشی کی رات کو صدف بن جاتی ہیں ـ

اودھ کے بیحد مقدس شہر اور بیحد مقدس سرجو کو میرا پرنام ـ سیتا اور رام جو اس طرح ہیں جیسے لفظ اور اسکے معنی ـ پانی اور اس کی موج ـ رگھوپتی کی بھگتی برسات کا موسم ہے ـ رام کے بھگت دھان کے اگتے ہوئے پودے ـــ رام نام کے حروف ساون بھادوں کے مہینے ـــ پرخلوص محبت وہ جنگل ہے جس میں رام اور سیتا گھومتے ہیں ـ ذہنی سوالات کشتیاں ہیں ـ ان کے جواب ماہر ملاح ـ رام کے الفاظ مضبوط گھاٹ ہیں ـ

منو بادشاہ جو نسل انسانی کا باپ ہے ـ اس کا پوتا ہری بھگت تھا ـ منو اور ان کی بی بی نے راج پاٹ تج کر تپسیا کے لئے جنگلوں کا رخ کیا ـ میاں اور بی بی جنگل میں اس طرح چلے تھے گویا خرد اور عقیدہ ہمراہ ہوں، ناوم نامو بھگوتے واسودیو، کا جپ کرتے وہ جب گومتی کنارے پہنچے اور ہزاروں سال عبادت کرتے رہے تب خداوند عالم نے ان سے کہا، مانگو ـــ تمہاری کیا خواہش ہے ـــ منو نے کہا ـــ خداوندا

---

[1] کاشی نیکی ہے ـ مگدھ بدی
[2] گنگا کی ایک شاخ جسکے متعلق عقیدہ ہے کہ اسکو چھونے سے سارے کرم کا ناس ہو جاتا ہے ـ
[3] مارواڑ صحرا ہے ـ مالوہ سرسبز
[4] بارش

— میں تجھ ایسا بیٹا چاہتا ہوں — خداوند عالم نے کہا — میں لاثانی ہوں — میرا جیسا دوسرا کوئی نہیں۔ میں یہ البتہ کر سکتا ہوں کہ تیرے بیٹے کے روپ میں دنیا میں آؤں —"

"اری مہتا —" اماں نے رامائن کے صفحے پر انگلی رکھ کر اپنے کمرے سے آواز دی — "اری کیا ستیا چلی گئی؟ اسے کھانا تو کھلا دیا ہوتا —"

مہتا نے کوئی جواب نہیں دیا — وہ بیڈروم اندر سے بند کئے بچے کو سلانے میں مصروف تھی۔ سارا گارڈن ہاؤس خاموش پڑا تھا۔ شہزادہ ابھی نئی دہلی سے واپس نہ آیا تھا۔ اماں نے عینک لگا کر دوبارہ پڑھنا شروع کیا —

"مہاراجہ سینہ کیتو کے بیٹے کے راج میں سارے دیس میں دودھ کی ندیاں بہہ گئیں۔ وہ راجہ بے حد نیک اور بہادر تھا۔ ایک روز وہ وندھیاچل کے پہاڑوں میں ہرن کا شکار کھیلنے گیا اور ایک بے حد حسین جنگلی سور کا پیچھا کرتے کرتے ایک کھوہ میں جا پہنچا۔ جہاں ایک شہزادہ جوگی کے بھیس میں رہتا تھا۔ اسے راجہ نے میدانِ جنگ میں شکست دی تھی اور تب سے وہ اس کا دشمن تھا۔ راجہ اس کو پہچان نہ سکا اور نقلی جوگی نے کہا "میرا نام ایک تنو ہے۔ ابتدائے عالم سے میں ایک ہی جسم میں رہتا آیا ہوں کہ تپسیا سے انسان بڑی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ سادہ لوح راجہ نے اس سے کہا اگر وہ ایسی دعا دو کہ میں اور میرا راج پاٹ امر ہو جائے۔ اس چالاک سنیاسی نے کہا یہ جبھی ممکن ہے جب تم برہمنوں کو تابع کرو۔ برہمنوں کے شراپ سے ساری طاقتیں زیر ہو جاتی ہیں۔ تم میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا روزانہ ایک لاکھ برہمنوں کو کھلاؤ اور وہ تمہارے تابع فرمان ہو جائیں گے۔ جوگی کی مدد سے راجہ نے برہمنوں کی ضیافت کی۔ جیسے ہی برہمنوں نے کھانا شروع کیا آسمان سے آواز آئی خبردار اس بھوجن کو ہاتھ نہ لگانا اس میں برہمن کا ماس پکا ہے — لہٰذا برہمنوں نے راجہ کو شراپ دیا کہ اس کا اگلا جنم راکشس کی صورت میں ہوگا۔ تب آکاش سے آواز آئی برہمنو! تم نے بغیر سوچے سمجھے شراپ دیا ہے۔ راجہ بے قصور ہے۔ مگر برہمنوں کا دیا ہوا شراپ واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اگلی مرتبہ راجہ راکشس کی صورت میں پیدا ہوا اسکے دس سر تھے اور بیس ہاتھ۔ اور وہ بے حد بہادر جنگجو تھا۔ اور اس کا نام راون تھا۔ اس کے ذریعے اس کے چھوٹے سوتیلے بھائی وی بھی شن کے روپ میں جنم لیا۔ جو بڑا وشنو بھگت اور عاقل تھا۔ جب راون نے بڑی تپسیا کی تو برہما نے پوچھا مانگ! تیری کیا خواہش ہے — راون نے کہا — میں چاہتا ہوں کہ صرف انسان یا بندر کے ہاتھ مارا جاؤں — برہما نے کہا — تیری یہ آرزو پوری ہوگی۔

سمندر کے وسط میں ایک پہاڑ ہے۔ اس پر برہما نے ایک مضبوط قلعہ بنایا جو اندر کے شہر

امراوتی سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ اور لنکا کہلاتا تھا۔ اسکے چاروں اور سمندری پانی کی خندق تھی اور اس کی دیواریں سونے کی تھیں جن میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ راون نے اس لنکا کو اپنی راجدھانی بنایا اور اس میں اطمینان سے رہنے لگا۔ عشرت، دولت، بیٹے، افواج، فتح و نصرت، طاقت، ذہانت، سب کچھ اس کا تھا۔ اس کا بھائی کمبھ کرن جو بے حد پیٹو تھا سال میں چھ مہینے سوتا تھا۔

اپنی طاقت کے نشے میں آکر ایک روز راون نے ساری کائنات کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ——— ساری دنیا اس کی محکوم ہوگئی ——— نیکی اس جہان سے رخصت ہوئی۔

تب خداوند عالم نے کہا ——— میں نے مدتیں گذریں کیشیپ اور آدتی سے ان کی ایک آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب میں سورج بنسی خاندان میں پیدا ہوتا ہوں اور میرا نام رام ہوگا۔

اودھ کے شہر میں رگھوبنشی راجہ دسرتھ حکومت کرتا تھا جو ویدوں کا ماہر اور نیک اور عقلمند اور دوراندیش کا بندہ تھا ———

باہر موٹر آکر رکی۔ شہزادہ آہستہ آہستہ سیٹی بجاتا اندر آیا۔ پھر اس کے قدموں کی چاپ اس کے بیڈ روم میں بچھے ہوئے قالین میں ڈوب گئی۔

اماں نے کئی ورق الٹے اور آگے پڑھنا شروع کیا ———

"اور جب دونوں شہزادے اس خوبصورت شہر کے باہر پہنچے جہاں دریا کے کنارے اور بہت سے شاہزادوں نے خیمے لگا رکھے تھے تب وشوامتر نے کہا رگھو! ہم یہاں ٹھہریں گے۔

جب متھلا کے راجہ کو معلوم ہوا کہ رشی وشوامتر تشریف لائے ہیں تو وہ خود ان سے ملنے کے لئے آئے اور انہوں نے پوچھا ——— اے مہاراج ——— بتلایئے ——— یہ دونوں خوبصورت لڑکے جن میں سے ایک سانولا ہے اور ایک گورا ——— آپ کے ساتھ کون ہیں ——— کیا ذاتِ مطلق جسے ویدوں میں "یہ نہیں ہے" کہا گیا ہے دو کے روپ میں ظاہر ہوگئی ہے؟ اور وشوامتر نے بتایا کہ یہ دونوں عاقل اور بہادر بھائی رام اور لکشمن ہیں۔

اور شہر کی عورتیں جو کھڑکیوں کی جالیوں سے جھانک رہی تھیں انہوں نے ایک دوسرے سے کہا ——— وہ سانولے بدن اور کنول نینوں والا جس نے تیر کمان اٹھایا ہوا ہے کوشلیا کا بیٹا رام ہے۔ اور وہ گوری رنگت والا جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اس کا وفادار اور لاڈلا بھائی اور سمترا کا بیٹا لکشمن ہے ——— اور یہ دونوں یہاں دھنش توڑنے کے مقابلے کا نظارہ کرنے آئے ہیں ———

——— اور سیتا گوری کی پوجا کے لئے باغ میں آئیں اور رام نے ان کی پائل کی جھنکار پر نظریں اٹھائیں

اور ان کی نظریں سیتا کے چہرے پر ایسے جمیں جیسے چاند چکور کو دیکھتا ہے۔ اور لکشمن نے کہا ـــ بھیّا ـــ یہ جنک کی بیٹی سیتا ہے جسکو حاصل کرنے کے لئے دھنش توڑنے کا مقابلہ کیا جا رہا ہے ـــ

درختوں کے کنج سے سیتا نے رام پر نگاہ ڈالی اور ان کی نظریں رام پر ایسے جمیں جیسے چکور خزاں کے چاند کو دیکھتا ہے ـــ انہوں نے رام کو آنکھوں کے ذریعے دل میں داخل کر کے پلکوں کے کواڑ بند کر لئے۔

تب رام سیتا کو بیاہ کر ایودھیا لوٹے ـــ"

"اماں ـــ" بھائی نے دروازے میں آکر کہا ـــ "آنند رو رہا ہے ذرا آکر چپ کرائیے ـــ"

"لاکی تو مجھے کبھی چین سے بیٹھ کر پاٹھ نہیں کرنے دیتی ـــ" کتاب ہاتھ میں لئے بڑبڑاتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں آئیں اور آنند کو گودی میں ڈال کر دوسرے گھٹنے پر کتاب رکھ لی۔ اور ہلکورے دے کر اسے سلاتے ہوئے بولیں ـــ "لے تو بھی سن ـــ رام نام سن کر دیکھیں تو تو کیسے اپنی ماں کو تنگ کرتا ہے ـــ" پھر انہوں نے مزید چوپائیاں پڑھنا شروع کیں۔

"ـــ دسرتھ کی رغبت ایک جنگل کی مانند تھی جس میں راحت مسرور پرندوں کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اس جنگل میں بھیل شکارن ـــ کیکئی ـــ اپنے الفاظ کے شکرے چھوڑنے والی تھی ـــ اس نے کہا ـــ مہاراج ـ ایک مرتبہ آپ نے مجھے وچن دیا تھا کہ میں جو بھی فرمائش کروں گی آپ اسے پوری کرینگے ـــ سورج ونشی راجہ اپنے قول سے نہیں پھرا کرتے ـــ اب میری ایک آرزو پوری کیجئے ـــ رام کے بجائے میرے بیٹے بھرت کو گدی پر بٹھائیے اور رام کو چودہ برس کی بن باس دیجئے ـــ"

بچے نے زور سے اپنا ننھا سا ہاتھ مارا اور کتاب پٹ سے بند ہو کر نیچے گر پڑی۔ اماں نے اسے اٹھا کر پڑھنا جاری رکھا۔

"ـــ رام اور لکشمن کے درمیان سیتا اس طرح چل رہی تھی جیسے ذات مطلق اور انسانی روح کے درمیان فریب نظر ـــ گھنے جنگلوں میں رشیوں کے ہجوم ہمدم کے ساتھ ساتھ چلے اور چترکوٹ پہنچ کر مندکنی ندی کے کنارے رام نے قیام کیا ـــ"

"اماں ـــ لچھمن سنگھ پوچھ رہا ہے صبح کو کھانا کیا بنے گا ـــ؟" اوما جی جی نے ڈائننگ روم میں سے آواز دی۔ بچہ اب سو چکا تھا۔ اسے ٹوکری میں ڈال کر وہ بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آکر انہوں نے جھانک کر بچے پر نظر ڈالی اور اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ بیتا اب غسل خانے سے نکل کر چہرے پر کولڈ کریم لگانے کے بعد سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ اسے پھر اماں کی آواز سنائی دی ـــ

"ہما — ادھر آ —"

"جی اماں —" اسنے گیلری میں آکر پوچھا۔ اماں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پلنگ پر لیٹ چکی تھیں ــ "ابھی سے پرکرت سو —" انہوں نے کہا۔

"جی اماں —؟"

"میری آنکھوں میں درد ہو رہا ہے — تو تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر مجھے رام نام سنا —"

"بہت اچھا اماں —" ہما نے ایک لمبا سانس بھرا اور کرسی کھینچ کر فرمانبرداری سے بیٹھ گئی۔ "کہاں سے پڑھوں؟"

"کہیں سے پڑھ — بن باس کا قصہ پڑھ۔"

"اچھا —"

"کالی گھٹا کے مانند سانولے سلونے رام گوداوری ندی کے کنارے پہنچے تو لکشمن نے کہا — بھیا — مجھے گیان اور بے تعلقی اور فریب مجاز کے متعلق تبلایئے۔"

"اور آگے چلو —"

"اوہ — اچھا —" انسویا نے کہا —" یہ پڑھوں؟"

"ہاں یہ پڑھو —" اماں نے آنکھیں بند کر کے آرام سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"— انسویا نے کہا — سنو راجکماری — ماں اور باپ اور بھائی سب اپنے دوست اور مددگار ہیں۔ مگر جو مسرت ان سے حاصل ہوتی ہے محدود ہے — شوہر کی رفاقت کی مسرت اتھاہ ہے۔ وہ عورت کمینی ہے جو اپنے شوہر کی عزت نہ کرے۔ ہمت، اصول، دوست اور بیوی — یہ چار چیزیں آڑے وقت پر کھی جاتی ہیں۔ شوہر اگر بوڑھا ہو، یا بیمار یا احمق یا اندھا یا بدمزاج یا سخت مصیبت میں مبتلا — اگر اس سمے بی بی نے اس کی عزت و توقیر نہ کی تو وہ نرکھ میں جلے گی۔ ویدوں اور پرانوں کے مطابق عورت کے چار درجے ہیں۔ بہترین عورت وہ ہے جو سمجھے کہ اس کے شوہر کے علاوہ دنیا میں اور کوئی مرد نہیں۔ دوسرے درجے پر وہ عورت ہے جو شوہر کے علاوہ سارے مردوں کو باپ اور بھائی اور بیٹا سمجھے — وہ عورت سب سے کمتر ہے جو محض موقعے کے نقدان کی وجہ سے پاکدامن رہے —"

"اور آگے چلو —"

"— ایک روز راون کی بہن سور پنکھا گوداوری کے کنارے آئی۔ ادھر سے دونوں شہزادے نظر آئے۔ اے گرڑ! عورت خوبصورت مرد کو دیکھ کر اس طرح پگھل جاتی ہے جیسے سورج کے سامنے رتیلا پتھر"

"آئیے چلو ——"

—— جب لکشمن نے طیش میں آکر سورپنکھا کی ناک کاٹ لی —— یہاں سے سناؤں ——؟"

"ہوں ——"

—— تو وہ روتی ہوئی راکھشسوں کے پاس پہنچی اور ان کا سردار دھوم گیتو چودہ ہزار راکھشسوں کی فوج لے کر رام اور لکشمن پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا ——

راما سے جنگل میں گپ اندھیرا چھانے لگے —— بھوتوں، بدروحوں اور سانپوں نے کھوپڑیاں جمع کیں —— خونخوار عفریتوں نے ان کھوپڑیوں کے ڈھول بجائے اور چڑیلیں ان کی تال پر ناچیں۔ سورپنکھا نے اپنے بھائی سے کہا ——

"آئیے چلو —— جہاں سیتا ہرن ہوتا ہے ——"

—— بہت دنوں سیتا نے دیکھا کہ ایک سنہرا ہرن جنگل میں بھاگا جا رہا ہے۔ ناتھ! انہوں نے کہا۔ اس کا شکار کرکے اس کی کھال میرے لئے لا دیجئے —— رگھوپتی بھو گئے کہ یہ ہرن کون ہے اور دیوتاؤں کا مقصد پورا کرنے کے لئے انہوں نے تیر کمان اٹھائی۔ رگھوپتی نے لکشمن سے کہا —— بھائی —— جنگل میں راکھشس گھوم رہے ہیں۔ دھیان اور فہم اور طاقت کے ذریعے سیتا کی حفاظت کرتے رہنا —— رام کو دیکھتے ہی ہرن تیزی سے بھاگا اور رام نے اس کا پیچھا کیا —— اور بہت دور نکل گئے۔

جب ہرن رام کے تیر سے گھائل ہوکر گرا تو اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔ اور چیخ کی آواز سنتے ہی سیتا نے گھبرا کر لکشمن سے کہا —— بھیا —— تمہارے بھائی پر کوئی آفت آئی ہے —— وہ جس کی ابرو کے اشارے سے ساری کائنات تخلیق ہوئی اس وقت خود خطرے میں گھرا ہے —— فوراً جاؤ —— اور لکشمن سراسیمہ ہوکر رام کو ڈھونڈنے چلے گئے۔

اور راون جوگی کے بھیس میں سیتا کی کٹی پر پہنچا اور انہیں زبردستی اٹھا کر لے چلا۔ سیتا چیخیں —— رگھورائے —— رگھورائے —— رگھورائے ——

ہما کو اب نیند آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں مل کر اماں کو دیکھا کہ شاید وہ بھی سو چکی ہوں مگر وہ اسی طرح بڑی شردھا سے آنکھیں نیم وا کئے لیٹی پاؤں ہلا رہی تھیں۔ یہ چوپائیاں وہ ہزاروں مرتبہ پڑھ چکی تھیں مگر جنے یہ کیا مصیبت تھی —— اس نے جمائی لے کر پھر پڑھنا شروع کیا۔

"راون نے سیتا کو رتھ پر بٹھالا اور تیزی سے اڑ گیا۔ سیتا شکاری کے جنگل میں پھنسی ہوئی خوفزدہ ہرنی کی طرح چیختی چلاتی آسمان پر سے گزری۔ جب اس نے نیچے ایک پہاڑی پر بندروں کو بیٹھے دیکھا تو

ہری کا نام لے کر اپنا دوپٹہ ان کی طرف پھینکا۔ راون نے اسے اپنی راجدھانی میں لے جا کر اشوک کے جنگل میں قید کر دیا —"

وہ پھر جمائی لینے کے لئے رکی اور پرامید نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی کہ شاید اب وہ بس کرنے کو کہیں۔

"اب ہنومان جی والی چوپائیاں پڑھو —" انہوں نے آنکھیں بند کئے کئے اطمینان سے فرمائش کی۔

"او — کے اماں —" تہمینہ نے ٹھنڈا سانس لے کر جواب دیا۔

" — اور بندروں نے لنکا تک پہونچنے کے لئے پل بنایا اور رگھوراج نے اس پر کھڑے ہو کر سمندر پر نگاہ کی اور مگرمچھ اور سمندر کی ساری مخلوق ان کے درشن کے لئے باہر نکل آئی اور پل پر اس قدر بھیڑ لگی کہ بندروں کو ہوا میں اڑنا پڑا —

— بندروں نے ساحل پر پہنچ کر خوب پھل کھائے — (ہاؤ سوئیٹ — ! تہمینہ ہنس پڑی — ہول — اماں نے غصے سے ہنکارا بھرا —) اور پہاڑوں کے ٹکڑے توڑ توڑ کر لنکا کی طرف پھینکے — سامنے لنکا تھی — سونے کے گھر۔ چوک اور بازار — اور گلیاں — اور ہاتھی اور گھوڑے — اور رتھ اور رکھشسوں کی فوجیں۔ اور جنگل اور پھل بن۔ اور جھیلیں اور تالاب۔ اور انسانوں اور ناگوں اور گندھرووں کی خوبصورت بیٹیاں۔ ہنومان نے اس جگہ کی مضبوط قلعہ بندیاں دیکھ کر رگھو پر دھیان لگایا اور بچھر کی صورت بنکر لنکا میں داخل ہوئے اور ایک راکھشس نے جس کا نام لنکنی تھا للکار کر کہا — تم میری بغیر اجازت یہاں کیسے آئے — اور ہنومان نے اسے ایک گھونسہ رسید کیا اور —"

(۱۱)

"بینگ — بنیگ — بنیگ — انجنوں کا شور کم ہوا اور ہوائی جہاز بڑی سہولت سے رتما لنا ایرپورٹ پر اتر گیا۔ مدراس سے یہاں تک گہرے بادلوں کی وجہ سے پرواز بہت خراب رہی تھی۔ وہ جہاز سے اتر کر سیدھی انڈین ایرلائنز کے کاؤنٹر پر گئی اور کولمبو پلان کے دفتر فون کیا — جی نہیں۔ یہاں تو کوئی مسٹر عرفان نہیں ہیں — شاید کسی دوسری عمارت میں ہوں — ٹھہریئے معلوم کر کے بتاتا ہوں — آپ گھنٹہ بھر بعد دوبارہ —" اس کا دل دھک سے رہ گیا — اب کیا ہوگا ؟

"یہ۔ آئی کا دفتر کدھر ہے ؟" اس نے ٹیکسی والے سے دریافت کیا۔

ڈرائیور نے ٹیکسی ایک عمارت کے سامنے لے جا کر کھڑی کر دی — اس کے اندر وہ بیٹھا ہوگا۔

تمیں ۔۔۔ اپنے ڈیسک پر اپنے کام میں مصروف ہوگا ۔ اگر وہ اس وقت باہر نکل آئے ۔۔۔ تو کیا ہو ۔؟ بلجیت ؟ اسے بے حد ڈر لگا اور سیدھی ماؤنٹ لیوینیا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی ۔

اس روز سارے دن بڑی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی ۔ سمندر کے ساتھ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے سرخ بیچ دور دور تک گھنے درخت اور ناریل کے جھنڈ اور سمندر کی لہریں ۔۔۔ ہر چیز جگمگا رہی تھی ۔ ماؤنٹ لیوینیا کے نیچے ساحل پر انگریز اور امریکن آفتابی غسل میں مصروف تھے ۔ فضا پر بڑی عجیب سی کاہلی چھائی ہوئی تھی ۔

پہنچ کر ۔۔۔ اس نے ہانپتے ہوئے کچھ دیر بعد اپنے دریچہ کھولا ۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ سیاہ فام سنہالی آیائیں چند انگریز بچوں کو ریت پر کھلانے میں مصروف تھیں ۔ ایک سنہالی عورت بالوں میں پھول اڑسے ہوئے نگے کے ہار بیچتی دریچے کے نیچے سے گذری ۔۔۔ ہینڈ میڈ میڈم ؟ ۔۔۔ ویری نائس ہینڈ ۔۔۔ اس نے اوپر جھانک کر کہا ۔

اس نے دریچہ بند کر دیا اور سنگھار میز کے سامنے آکر بیٹھ گئی ۔ ۔۔۔ اب کیا ہوگا ۔۔۔؟

گھنٹہ بھر بعد دروازے پر دستک ہوئی ۔ دو سفید سیر رنگ میں ملبوس بیرے نے اندر آکر ایک کارڈ پیش کیا ۔۔۔ "عرفان احمد کاظمی"۔

"اوہ !! ۔۔۔ تھینک یو ۔۔۔!!" بوڑھا سنہالی بیرہ بڑی شفقت سے مسکرایا ۔ وہ جلدی جلدی بال درست کر کے نیچے چلی گئی ۔

عرفان ٹیرس پر رنگین چھتری کے نیچے بیٹھا کسی سنہالی سے باتیں کر رہا تھا ۔ اسے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھا ۔۔۔

"مسٹر رتن سنگھ جے سوریہ ۔۔۔ مسز ۔۔۔ اور ۔۔۔ ڈاکٹر مرچنڈانی ۔۔۔" اس نے سنہالی سے تعارف کرایا ۔

"مسٹر جے سوریہ یہاں کے ایک بڑے اہم سنہالی اخبار کے ایڈیٹر اور میرے بہت پرانے دوست ہیں ۔"

ستیہ نے مسکرا کر ہاتھ جوڑے ۔ تینوں بیٹھ گئے ۔ سنیتا نے ذرا بے چینی سے چاروں طرف نظر ڈالی ۔ ادھیڑ عمر کے مسٹر جے سوریہ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے ۔ عرفان نے اپنی بات ختم

کرنے کے بعد انہوں نے سیتی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور اجازت چاہ کر وہاں سے رخصت ہوئے
عرفان نے پہلو بدل کر سگریٹ جلایا۔
"تو آپ تشریف لے آئیں ——"
"جی ہاں ——"
"اتنے دنوں بعد یہ بڑی UNCEREMONIOUS سی ملاقات تھی۔
"تم نے یہ لکھا ہی نہیں کراچی تک یہاں کیوں نازل ہو رہی ہو۔ میں سمجھا تم بھی کسی سرکاری کام کے لئے آنے والی ہو۔ کولمبو انٹرنیشنل کانفرنسوں کا شہر ہے ——"
"خط میں پوری داستان کیا لکھتی۔ آپ کو خود ہی اچھی طرح معلوم ہے ——"
"واقعہ یہ ہے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ مجھے تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم ——"
اس کا دل ڈوب سا گیا —— دوسرے لمحے اسنے سنبھل کر پوچھا —— "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں ؟"
"میں بھی یہیں ٹھہرا ہوں —— تم نے یہ بھی نہیں لکھا تھا کہ کس روز پہنچ رہی ہو۔ بہرحال تمہیں تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی ——"
"جمیل سے ملاقات ہوئی ؟"
"جمیل یہیں ہیں۔ ؟۔ ان سے ملنے آئی ہو —— ؟ بڑی سخت DARK HORSE ہو —— "اسنے اسٹیل ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ دفعتاً وہ بڑا مایوس نظر آیا۔
"آپ کا کیا خیال تھا میں اتنی دور چل کر محض آپ کے درشن کے لئے آئی ہوں
YOU HAVE HOPES! —— "اسنے ہنس کر جواب دیا۔
یکلخت ماحول کا کھنچاؤ دور ہو گیا —— وہ بھی خوب ہنسا —— ہاہا ——
"آپ ان سے جا کر ملئے —— آج —— ابھی —— فوراً —— یو۔ این والوں سے معلوم کر لیجئے کہ وہ کہاں ٹھہرے ہیں ——"
"کیا پتہ وہ بھی یہیں ہوں ——!"
وہ سفید پڑ گئی۔ پھر اسنے جلدی جلدی کہنا شروع کیا —— "آپ ان سے راحل کے متعلق بات کیجئے اور ان سے کہئے کہ ایک بار مجھ سے مل لیں —— صرف ایک بار ——"
وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے چند لمحوں تک کوٹ کی جیب میں سگریٹ کیس تلاش کرنے کے

بعد لینے لگا ۔ ۔۔ "میں ان سے آج تک نہیں ملا ہوں سنتا ۔۔۔ میری ان سے اتنی بے تکلفی کیسے ہو سکتی ہے کہ میں چھوٹتے ہی ان کے خالص نجی معاملے میں اس طرح بیکار ٹانگ اڑاؤں ۔۔۔"

"مگر آپ نے کہا تھا ۔ ۔۔"

"ہاں ۔۔ ہاں ۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے ۔۔۔ میں خود ان سے ملوں گا ۔ ابھی کوئی ترکیب سوچتے ہیں ۔ تم اس وقت تو ذرا ریلیکس کرو ۔۔۔ سگریٹ لو ۔۔"

"میں کس طرح ریلیکس کر سکتی ہوں ؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔" وہ پھر منہ لٹکا کر خاموش ہو گئی ۔

سامنے سے بے حد خوبصورت ڈچ رنگ لڑکیوں کا ایک پرا گذرا ۔ ان میں سے ایک لڑکی سنہلا فراک اور شیلی نکیچر ہیٹ اور نیلے دستانے اوڑھے تھی ۔ شکل انگریزی زدہ کی فیشنیبل معلوم ہو رہی تھی ۔۔۔ ہندوستانی ساریوں میں ملبوس سنہالی اور تامل عورتیں ۔ قیمتی سوٹوں میں ملبوس سیاہ فام مرد ۔ سنجیدہ شکلوں والے انگریز ۔ بے فکرے امریکن ادھر ادھر ٹہل پھر رہے تھے ۔ ٹیرس کے نیچے سمندر شور کر رہا تھا ۔

"شام کو کیا کر رہی ہو ؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔"

"مجھ سوریے کی پارٹی میں چلو ۔۔۔ کال سنیں ۔۔"

"میں یہاں سوشل ملاقاتوں کے لئے نہیں آئی ۔"

"تو کیا جنگل میں بیٹھ کر تپسیا کرو گی ؟"

یہ آدمی بھی کیا بورکس تھا ۔۔۔ ! اب کیا ہو گا ۔۔۔ اب کیا ہو گا ۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے ؟"

"جہنم کا ۔۔۔"

"ارے رے رے ۔۔۔ خفا ہو گئیں ۔۔۔ اتنی جلدی ؟"

اب کیا یہ بھی جنگل کا شیر تھی اور پیلی کے بچے وال جبار دھرلنے والا تھا ۔۔۔

او مائی گاڈ ۔۔۔

وہ ریلنگ پر جھک کر ساحل کی طرف دیکھنے لگی ۔ "آپ یہاں سے کب واپس جا رہے ہیں ؟"

اس نے چند لمحوں بعد موضوع تبدیل کیا ۔

"دس پندرہ دن اور لگیں گے۔"

"واپس لاہور؟"

"نہیں —— میرا تبادلہ پیرس ہو گیا ہے۔ کراچی پہنچ کر اگلے مہینے پیرس روانہ ہو جاؤں گا ——"

"ہاؤ ونڈرفل —— لکی یو ——!"

"پیرس جانا کوئی خاص ونڈرفل بات تو نہیں۔ اور لکی، تو میں زندگی میں آج تک کسی سلسلے میں نہیں رہا۔"

"وہاں کتنے عرصے رہئے گا؟"

"پتہ نہیں۔ فی الحال تو دو سال کے لئے جانا ہے —— اچھا اگر تم ڈنر پر نہیں چل رہی ہو تو مجھے اجازت دو۔ مجھے ابھی ذرا کانفرنس کے چند لوگوں سے بھی ملنا ہے۔ میں جلد از جلد تمہارے پتی دیو کو پکڑنے کی فکر کرتا ہوں۔ اور پھر انہیں گلٹی ڈیبیٹ کرنے کی کوشش کروں گا —— تمہاری خاطر ——"

"لوگوں کو گلٹی ڈیبیٹ کرنا تو آپ کو خوب آتا ہے۔ کوشش کی کیا ضرورت ہے ——" ستیا نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔

وہ ہنسا —— "اچھا۔ اب خدا حافظ ہو —— چیئر اپ! کل سویرے ہی سے کانفرنس کا اجلاس ہے۔ اگر موقعہ ملا تو فون کروں گا۔ تم بریکفاسٹ کے لئے نیچے آؤ گی؟"

"جی نہیں ——"

"اچھا تو میں کانفرنس میں جانے سے پہلے فون کر دوں گا —— گڈ نائٹ ——"

"گڈ نائٹ ——"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹیرس سے اتر کر باہر چلا گیا، وہ ریلنگ پر سر رکھ کر سمندر کو دیکھتی رہی جہاں سورج ڈوب رہا تھا اور کنارے پر بکینی میں ملبوس ایک انگریز عورت قہقہے لگاتی آگے آگے بھاگ رہی تھی اور ایک موٹا انگریز ہانپتا کانپتا ریت پر اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

دوسرے روز وہ شہر کا چکر لگا کر سہ پہر کے قریب لوٹی تو ریسپشن کاؤنٹر پر اسکے نام عرفان کا پرچہ رکھا تھا ——" مجھے اس نمبر پر فون کرلو —— بے حد ضروری بات ہے ——"

اس نے اپنے کمرے میں جا کر دھڑکتے دل کے ساتھ فون کیا۔

عرفان اپنے کمرے سے بول رہا تھا ——" بھئی ستیا —— سنو —— گھبرانا مت —— کل رات بڑا فقہ ہو گیا۔ جے سوریہ کے ڈنر میں تبلی صاحب بھی آئے تھے۔ بہت دیر تک ان سے تعارف نہ ہو

سکا وہ دور ایک کونے میں بیٹھے مے نوشی میں مصروف تھے۔ اس کے بعد پارٹی میں شامل ہو گئے مگر کسی سے ایک لفظ بات نہیں کی ـــــ جے سوریہ نے مجھے بتایا کہ وہ کل سے بے حد ڈپریسڈ ہیں۔ کیونکہ انہیں اطلاع ملی ہے کہ ان کی بیوی ایک پاکستانی کے ساتھ بھاگ آئی ہے اور ماؤنٹ لیونیا میں ٹھہری ہے۔ اور ستیا ان کی خفگی اور رنجیدگی حق بجانب ہے ـــــ یہ واقعہ بھی ہے ـــ"

جی ـــ؟

"یہ واقعہ بھی ہے کہ تم ماؤنٹ لیونیا میں ٹھہری ہو! ـــ ہاہا ـــ اچھا۔ اب بھلا یہ معلوم ہونے کے بعد میں ان سے کیا بات کرتا۔ میں تو ڈنر ختم ہونے سے پہلے ہی کان دبا کر بھاگ آیا۔"

"آپ اتنے۔ اتنے ڈرپوک نکلے ـــ"

وہ پھر ہنسا ـــ "ارے بھائی میں مذاق کر رہا ہوں۔ اب ایک دم یہ کوئی آغا حشر کا ڈرامہ تو ہو نہیں رہا ہے کہ میں بھی ان کے سامنے جا کر ڈائیلاگ بولنا شروع کر دوں ـــ توفیق کس حال میں ہے اور شیر لوہے کے حال میں ہے۔ ذرا ایک دو دن میں موقع محل تلاش کر کے ان سے بات کروں گا۔ آدمی کافی ٹیڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے باقی خاندان والوں سے بالکل مختلف۔ کل شام ٹیرس پر مجھے تم سے باتیں کرتا دیکھ کر ڈنر پر بہت سے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کون پری زاد تھی جس کے ساتھ آپ چائے پی رہے تھے۔ ـــ وغیرہ ـــ تم جانتی ہو گوسپ کی عادت انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اسے بدلا نہیں جا سکتا ـــ اب کانفرنس میں جا رہا ہوں۔ شام کو اگر کہو تو تمہارے کمرے میں آ کر ساری رپورٹ دوں۔ نیچے پبلک میں تم سے ملنا ذرا مخدوش ہے۔"

"جی نہیں۔ رات کو دس بجے کے بعد فون کیجئے گا۔"

"اچھا ـــ"

رات کو اس کا فون نہیں آیا۔ تیسرے دن وہ سیڑھیاں اتر کر باغ میں جا رہی تھی جب ہال کی طرف سے آتا ہوا وہ مل گیا۔ "بھائی ستیا مجھے معاف کرنا" اس نے جلدی جلدی کہا "میں رات پھر بہت دیر میں واپس آیا۔ سنو ـــ ادھر آؤ ـــ میں آج لنچ پر جمیل صاحب سے ملاقات کر رہا ہوں" ـــ وہ ایک گل بوٹے کے نیچے کھڑے ہو گئے "سنو ـــ یہاں پہ ایک جگہ سان مشیل ہے۔ جھیل کے اندر ایک جزیرہ ہے جہاں ایک ریستوران ہے۔ میں شام کو وہاں آ جاؤں گا۔ تم بھی تشریف لے آؤ۔ ساری رپورٹ گوش گزار کر دوں گا۔"

"وہاں تو کوئی ہندوستانی پاکستانی نہیں ملیں گے؟" اس نے ذرا خائف ہو کر پوچھا۔

SAN MICHAEL ؎

"میرے خیال میں تو کوئی ہندوستانی پاکستانی اتنی دور نہیں جائے۔ شام کا وقت زیادہ تر لوگ شہر کے نائٹ کلبوں میں گذارنا زیادہ پسند کرتے ہیں ——— اچھا تم چھ بجے وہاں ضرور پہنچ جانا۔"

"اکیلی ——؟"

"ارے ساری دنیا گھوم چکی ہو۔ وہاں اکیلی نہیں پہنچ سکتیں۔ حد ہے ——!"

"اچھا —— اچھا ——" سیتا نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ تیزی سے روش پر سے گذرتا ڈھلوان پر اتر گیا۔

ٹیکسی کولمبو کے مضافات سے نکل کر سیدھی سڑک پر روانہ ہوگئی جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ اور جنگل کے اندر پہنچ کر بل کھاتے ہوئے رستوں سے گذرتی جھیل کے کنارے جا رکی۔ درختوں کے نیچے دو تین موٹریں کھڑی تھیں۔ وہ اتر کر لکڑی کے بوٹ ہاؤس میں گئی۔ اسے دیکھ کر کشتی والے نے موٹر بوٹ سیڑھیوں سے لگا دی۔ پھوس کی چھت والے اس سنسان بوٹ ہاؤس میں جلتی ہوئی سرخ لالٹین بڑی پُر اسرار سی معلوم ہوئی۔ اتنے میں تین چار لوگ اور آگئے اور سب کشتی میں جا بیٹھے۔ وہ تامل مرد اور عورتیں تھے۔ اور سب بڑے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بوٹ نے گھڑ گھڑ کرتے ہوئے پانی پر چلنا شروع کر دیا۔ جھیل پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ دور کناروں پہ ناریل اور چندن کے جھرمٹ کھڑے تھے۔ آسمان کا رنگ سُرخ ہوگیا تھا۔ جھیل کے وسط میں سان مشیل کے ٹاپو پر روشنیاں جل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد بوٹ گھاٹ سے جا لگی۔ وہ لکڑی کا طویل کوریڈور طے کر کے ریستوران کی طرف گئی۔ روِش کے اوپر زرد رنگ جاپانی قندیلیں جل رہی تھیں۔ اندر ریستوران میں چند سنہالی کیتھولک لڑکیاں اور لڑکے رقص میں مصروف تھے۔ برآمدوں میں اِکا دُکا لوگ کھڑے تھے۔ بڑا اداس اور ڈیپرسنگ ماحول تھا۔ آرکیسٹرا ایک پرانی دھن کا اداس سا نغمہ بجا رہا تھا اور ایک ڈچ برگر لڑکی مائیکرو فون کے سامنے کھڑی گا رہی تھی۔

O COME ALONG WITH ME

TO MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

AND DREAM A LITTLE DREAM

IN MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ عرفان کہیں نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں اُتر کر جزیرے کے دوسرے کنارے کی طرف گئی جہاں ایک چوبی پویلین جو جھیل کے عین وسط میں لکڑی کے کھمبوں پر ایستادہ تھا، ایک چھوٹے سے پُل کے ذریعہ جزیرے سے ملحق تھا۔ وہ اس پویلین میں داخل ہوئی۔ یہ بھی سنسان پڑا تھا۔ ایک سرے پر کوئی سنہالی جوڑا ریلنگ سے ٹکا پانی کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اب سورج ڈوب چکا تھا۔ جھیل کا پانی زمردیں ہو چکا تھا۔ چند لمحوں میں یہ سُرخی رات کی سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔

"سیتا۔"

سنے مڑ کر دیکھا۔

عرفان کونے کی میز پر سے اُٹھ کر آیا۔ "تم نے دیکھا نہیں۔ میں اس طرف بیٹھا تھا۔"
وہ ریلنگ کے نزدیک بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سیتا جھیل کی لہروں کو دیکھنے لگی۔ "کتنی خوبصورت جگہ ہے۔"

"ہوں۔ ہاں۔ خوبصورت تو ہے مگر اب کام کی بات سنو۔"

"فرمائیے۔" سیتا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت "بزنس لائیک" نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا ... دور رقص گاہ میں لڑکی کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونج رہی تھی۔

YOU WILL SOON FORGET THAT THERE IS ANY
OTHER PLACE
AND IF YOU CARE TO STAY IN MY LITTLE
CORNER OF THE WORLD
THEN WE CAN HIDE AWAY IN MY LITTLE CORNER
OF THE WORLD.

"کل سے آج تک بہت سے واقعات ہو گئے۔" عرفان نے سگریٹ جلا کر جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "ایک تو یہ کہ یہ بات کافی کھیل گئی ہے کہ تم یہاں آئی ہوئی ہو۔ اور بڑی عجیب سی بات ہے نا کہ تم اور کھنہ صاحب بہادر دونوں اسی شہر میں موجود ہیں۔ اور لوگ باگ جلنے کیوں لگے رقیب روسیاہ سمجھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ تم نے پہلے اس کے متعلق کیوں نہیں سوچا؟ اب کانفرنس کے بعد شام کی محفلوں میں لوگوں کو یہ بے حد عمدہ گوسپ ہاتھ آگئی ہے اور انڈو پاکستان جھگڑوں کے پیشِ نظر یہ صورتِ حال اور بھی زیادہ تشویشناک ہے۔ چند حضرات کو تو یہ یقینِ کامل ہے کہ میں جمیل

کی بی بی کو اڑا لایا ہوں اور اُسے ماؤنٹ لیوینیا میں چھپا رکھا ہے۔ آج ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ میاں پریشان کیوں ہوتے ہو دوسرے کی بیوی کا اغوا کرنا خلاقی کا گھر نہیں۔"

ستیا نے ایک جھرجھری سی لی" اب کیا ہوگا؟"

وہ ہنسا: ہوگا کیا انڈو پاکستان تعلقات مزید خراب ہوں گے ممکن ہے کوئی کرائسس بھی ہو جائے جس پر ہمارے وزیر خارجہ کا بیان چھپے گا۔ تمہارے یہاں لوک سبھا میں سوالات کئے جائیں گے۔ اخباروں میں ادھر ادھر خبریں چھپیں گی۔ دیکھتی جاؤ۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے بھائی ــــ!"

"آپ کسی وقت بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔ یہ بتائیے اب میں کیا کروں؟"

"میں پوچھتا ہوں تم یہاں آئیں کیوں؟ اگر جمیل سے ملنا تھا تو امریکہ چلی جاتیں۔"

"امریکہ چلی جاتی" اور وہاں تک جانے کا کرایہ آپ دیدیتے۔" اُسنے غصے سے کہا۔

"آج لنچ پر جمیل صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ حضرت آئے ہی نہیں۔ چنانچہ تیسرے پہر کو بقول شخصے سر پہ کفن باندھ کر جے سوریہ کے ہمراہ گال مینس گیا۔ جہاں موصوف قیام فرما ہیں۔ بھائی اپنے کمرے میں قلعہ بند حسب معمول مے نوشی میں مصروف تھے۔ میں نے جے سوریہ کو اندر بھیجکر کہلوایا کہ میں اس سارے قصے کی تشریح کرکے ان کی یہ خوفناک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ جے سوریہ جواب لایا کہ عرفان صاحب سے کہہ دینا کہ قمر الاسلام چودھری کی جیسی ٹھکائی میں نے نیویارک میں کی تھی' وہ آج تک نہیں بھولا ہوگا۔ لہٰذا اگر اپنی جان کی خیر منانے ہو تو میرے سامنے نہ آنا ــــ"

پویلین میں ہوا کا خنک جھونکا داخل ہوا جس سے ستیا کے بال اڑنے لگے اسنے اپنی سیاہ لنگی سمیٹ کر سر ڈھانپ لیا۔

"تمہیں پتہ ہے ــــ" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا" تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو۔ قمر کا قصہ تو جو تھا سو تھا۔ جمیل کو پرونیسر چودھری کی خبریں بھی پہنچ چکی ہیں۔"

وہ سفید پڑ گئی۔

"آپ کو کس نے بتایا ــــ؟"

"مجھے برابر تمہارا خیال رہتا ہے اور اگر تم برا نہ مانو ــــ کیونکہ تم ADULT بننے کی کوشش بہت کرتی ہو مگر ہو نہیں۔ ــــ کہ تمہیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ مجھے تم میں کافی دلچسپی ہے۔ غالباً تم اس کا مداوا نہیں کر سکتیں کہ لوگ تم میں اوبدا کے دلچسپی لیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی حد تک تم بھی ان کا دل نہیں توڑنا چاہتیں۔"

"آپ نے اس وقت یہ اس قدر ذلیل اور کمینے پن کی بات کہی ہے کہ میں اس کا جواب نہیں دینا چاہتی۔ میں آپ کو اپنا دوست سمجھ کر کولمبو آئی تھی ــــ"

"دوست ــــ! دوستی گیا بلا سے ــــ! ڈیم ــــ"

شام کے گہرے سناٹے میں جزیرے سے آتی ہوئی موسیقی اب بہت صاف سنائی دینے لگی۔

رقص گاہ سے اندر لڑکی وہی گانا دوبارہ گا رہی تھی ــــ

I ALWAYS KNEW, I'D FIND SOME ONE LIKE YOU

SO WELCOME TO MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب رات کافی ہو گئی ہے۔ کولمبو واپس جاؤ۔ تم پہلی کشتی سے کنارے پر واپس چلی جاؤ۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔ کیا پتہ واقعی ریسٹوران میں کوئی مجھے یا تمہیں پہچان لے۔ رات پڑے یہاں مجھے زیادہ ہو جاتا ہے ــــ گڈ نائٹ ــــ"

دوسرے بولیوں کے جوبلی پل تک پہنچنے تک بھی نہیں آیا۔ وہ روشن پیاؤ۔ گھاٹ کی سمت جانے کے لئے رقص گاہ کے راستے ہوتے گذری تو ریسٹوران کے سنہالی منیجر نے جو ڈی جے۔ پہنے بالکل نیکولن لگ رہا تھا سامنے آکر مس سے کہا "مس ــــ! آپ بہت جلدی واپس جا رہی ہیں۔ ڈنر کے لئے نہیں ٹھہریئے گا ــــ؟" قریب سے گذرتی ہوئی دو ٹالی خواتین نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کوریڈور تک پہنچی۔ کوریڈور کے سرے پر ایک اور سنہالی جوڑا ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ رات کے آسمان کی وسعت اور سناٹے کے مقابل میں ان کا سلہوٹ بہت المناک اور بے بس سا معلوم ہوا۔ اُن کے سر کے اوپر ایک سُرخ اور سبز جاپانی قندیل جل رہی تھی۔ چاروں کھونٹ بے پایاں تنہائی تھی۔

گھاٹ سے اتر کر وہ موٹر بوٹ میں بیٹھ گئی۔ اندر رکسی سفارت خانے کے چند مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس جگہ کا سحر ایسا تھا کہ شاید بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ یہ سحر ٹوٹ نہ جائے۔

دوسرے روز عرفان اُسے لاؤنج میں ملا۔ "میں نے آج پھر سلسلہ جنبانی کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ ملاقات پر تیار نہیں ہیں۔ لاحول ولا قوۃ تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو مصیبت میں پھنسایا۔ میرا خیال تھا تینوں متمدن افراد ہیں اور اسی سطح پر یہ خالص NU MAN معاملہ آپ کے صلاح مشورے سے طے ہو سکے گا۔"

"پھر تم نے اڑنگ بڑنگ اٹھانا شروع کیا۔" عرفان نے چڑ کر جواب دیا۔ "میں اگلے چھ دن تک کانفرنس کے کام میں بے حد معروف رہوں گا۔ تم یہاں اتنا وقت بیکار کیسے گذارو گی۔ بہتر یہ ہے کہ اسکینڈل کا زور

کم کرنے کے لیے کم از کم ہفتہ بھر کے لئے کینڈی وغیرہ چلی جاؤ۔ اگلے منگل سے مجھے فرصت ہے۔ اس کے بعد ہم
مل کر کچھ سوچ سکیں گے۔"

"مگر جمیل ـ"

"ان کی فکر نہ کرو ۔۔۔ وہ بھی ابھی ہفتہ دس دن اور ٹھہر رہے ہیں۔ لیکن تم اب خدا کے لئے یہاں سے
روانہ ہو ۔۔۔ کسی امریکن ٹورسٹ پارٹی کو ہمراہ لے لو۔ ہوٹل ان سے بھرا ہوا ہے۔ دو مہر راتھ ہو جائے گی۔
اور تم بھی ہو تو ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرتی رہنا۔"

"اچھا ۔۔۔" اس نے ایک بار پھر فرماں برداری سے جواب دیا۔

"میں امریکن ایکسپریس سے بات کر کے ابھی تمہارے لئے بہت سخت فرسٹ کلاس ٹور کا انتظام
کروائے دیتا ہوں ۔۔۔" اس نے کاؤنٹر پہ جا کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

(۱۲)

سوا چھ فٹ اونچے اور نیلی آنکھوں اور سرخی مائل زرد بالوں والے ڈاکٹر ازل وسنٹ مارتن نے
ریسٹ ہاؤس کی برساتی میں پہنچ کر کار روک دی۔ اور ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید وہ سبز رنگ کی
بل مین جس میں وہ خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی اس طرف آتی ہو۔ وہ کولمبو کے مضافات سے لے کر یہاں تک اس
کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ بھی اس ریسٹ ہاؤس پہ آ کر ٹھہرے گی۔ مگر جنگل
کے درمیان سے گزرنے والی بل کھاتی ہوئی سرمئی سڑک سنسان پڑی تھی۔ وہ کار سے اتر کر برآمدے میں
آیا۔ بیرے نے ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے لا کر رکھی۔ اس نے سیاہ قہوے کی ایک پیالی ختم کرنے کے
بعد ٹائپ رائیٹر کھولا۔ اور مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ "جنوبی ایشیا میں کمیونزم کا اثر" اپنی کتاب کا
دوسرا باب اسے جلد از جلد مکمل کر کے رسالے کے ایڈیٹر کو بار در بھیجنا تھا۔ اور وقت بہت کم تھا۔ اسے ابھی
یہاں سے مغربی بنگال اور کیرالا بھی جانا تھا۔

برآمدے میں اکا دکا یوروپین ٹورسٹ بیئر کا گلاس سامنے رکھے چپ چاپ بیٹھا اخبار پڑھ رہا
تھا۔ باغ میں سرخ پھول کھلے تھے۔ آسمان بہت شفاف اور نیلا تھا۔ اس نے سامنے کے پرسکون منظر کو دیکھ
کر ایک گہرا سانس لیا اور دوبارہ ٹائپ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

گھنٹے بھر بعد وہ ایک بار پھر خاموش سرمئی سڑک پہ رواں تھا جس کے دونوں طرف ربر کے گھنے جھرمٹ
تھے۔ اور الائچی کی جھاڑیوں پر زرد تتلیاں اڑ رہی تھیں۔

تامل ہو یا سنہالی؟"

"تامل ۔ مگر میں کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتی ۔ مجھے معاف کیجئے گا ۔ مجھے اسی وقت کولمبو واپس جانا ہے ۔" لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا اور نمستے کر کے آگے چلی گئی ۔

کھانا ختم کر کے وہ باہر آیا ۔ برآمدے میں سری لنکا اور نیو گوترووا کا نقشہ اور پراکرم باہو اول کا فرمان فریم میں آویزاں تھا ۔ "بارش کا تھوڑا سا پانی بھی انسان کے کام آئے بغیر سمندر تک نہ بہنا چاہیئے ۔ ۔ ۔

پراکرم باہو"

اس نے "جنوبی ایشیا میں کمیونزم کا اثر" کا مسودہ بند کر کے پورٹ فولیو میں سے دوسرا مسودہ نکالا اور نقشے کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھ کر جلدی جلدی نوٹ لینے شروع کئے ۔ ۔ ۔

" عیسیٰ کی پیدائش سے پانچسو سال پہلے ہندوستان کے پرنس وجے نے لنکا پر حملہ کیا ۔ اس کے ہمراہ آئے ہوئے لوگ جو مگدھی نسل کے تھے سنہالی کہلائے اور ان کی مناسبت سے یہ جزیرہ سنہلدیپ کہلایا ۔ یعنی شیروں کا جزیرہ ۔ پرنس وجے نے لنکا کی شہزادی سے شادی کر لی تھی ۔ لنکا کے قدیم باشندے PRE - DRAVADIAN ASTROLOIDS تھے ۔۔۔ چھوٹا ناگپور کے علاقے سے چل کر یہ نسل ملایا، جاوا اور آسٹریلیا تک پھیل گئی ۔ لنکا میں ان لوگوں کی راجدھانی کا نام لنکا پورہ تھا ۔ غالباً اسی کو ہندوؤں کی قدیم ایپک رامائن میں شمالی ہند کے آریوں نے اپنی نسلی برتری کی احساس کی بنا پر سیاہ فام راکھشسوں کی قوم کہا ہے (ایشیا میں نسل و رنگ کا امتیاز ۔۔۔ مشرق کی کلر بار ۔۔۔ اس مسئلے پر مجھے مزید کام کرنا پڑے گا اس نے حاشیے پر لکھا ۔ اور کیپل سگریٹ جلا کر پراکرم سمدر کی موجوں کو دیکھنے لگا ۔ اس کاسنی ساری والی لڑکی کا خیال دماغ سے نکال کر چند لمحوں بعد اسنے دوبارہ لکھنا شروع کیا) سیلون کے موجودہ جنگلی قبائل جو اڑیسے کے جنگلی قبائل سے بہت مشابہت رکھتے ہیں ۔ ویدہ کہلاتے ہیں ۔ اور ان ہی اوریجنل باشندوں کی اولاد ہیں ۔

سنہالی بادشاہ کئی صدیوں تک اس جزیرے پر حکمراں رہے ۔ انورادھا پورہ ان کا دارالسلطنت تھا ۔ اشوک کا بیٹا شہزادہ مہندر پہلا بدھسٹ مشنری تھا جس نے انورادھا پورہ آ کر سنہالی بادشاہ دیونام پیا تسیا کو بدھ مت میں داخل کیا ۔ شہنشاہ سمدر گپت کے الہ آباد ستون پر لکھا ہے کہ جن فرماں رواؤں نے اس سے گذارش کی کہ گپتا حکومت کے چارٹر کے ذریعہ انہیں اپنے اپنے علاقوں پر رہنے دیا جائے ان میں سنہالا کے لوگ بھی شامل ہیں ۔ بائیبل میں جنوبی لنکا کے ساحلی شہر تارشش یا گال کا ذکر ہے جہاں سے ملکہ سبا اور سلیمان کے لئے مور اور ہیرے ایکسپورٹ کئے جاتے تھے ۔

" آٹھویں صدی عیسوی تک لنکا شمالی ہند کی موریہ اور گپتا کلچر سے متاثر رہا اور نویں صدی سے

جنوبی ہند کے سیاسی اور تہذیبی حلقۂ اثر میں داخل ہو گیا۔ دریائے کرشنا کے جنوب میں اس وقت چولا اور پانڈیہ
اور کیرالا کی بادشاہتیں قائم تھیں۔ لنکا کے تخت کے مختلف دعویدار اپنی خانہ جنگیوں کے دوران اکثر ان
بادشاہوں سے مدد مانگتے تھے۔ گیارھویں صدی میں چولا لوگوں نے انورادھا پورا کی بادشاہت کو شکست دے
کر جزیرے کے بیشتر حصے کو چولا سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور پولونرووا کو اپنی راجدھانی بنایا۔ مگر اسی صدی
میں سنہالی بادشاہ پراکرم باہو اول نے جنوبی ہند کے تسلط سے آزاد ہو کر دوبارہ اپنی سلطنت قائم کی۔

'لنکا کا پایۂ تخت انورادھا پورہ تیرہ سو سال تک آباد رہا۔ --- یہ روم اور قرطاجنہ اور تھیبز سے
زیادہ لمبی مدت ہے --- اور پھر جنگل اُسے کھا گیا۔

'پولونرووا لنکا کے عظیم ترین بادشاہ پراکرم باہو اول کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے
شاندار تعمیرات، محلات، تصویر خانے، ستوپ، اور مندر تعمیر کروائے۔ اس سارے جزیرے میں آبپاشی
کا ایسا زبردست اور حیرت انگیز انتظام کیا کہ دور دراز کشمیر کے فرماں روا یہاں سے انجینئر منگواتے تھے۔
(--- کولمبو چلو اس وقت ہی شروع ہو گیا تھا --- لیزلی مارش نے دل میں کہا)

'پراکرم باہو نے یہ عظیم الشان مصنوعی سمندر تیار کروایا --- لکھتے لکھتے اُس نے سمندر کی طرف دیکھا
اور پھر سامنے لگے ہوئے فرمان پر نظر ڈالی: بارش کا تھوڑا سا پانی بھی انسان کے کام آئے بغیر سمندر میں
نہ بہنا چاہیئے۔'

'اس کے بعد زوال آیا۔' لیزلی مارش نے لکھنا جاری رکھا 'اور رفتہ رفتہ اگلی صدیوں میں پولونرووا
بھی جنگل کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ڈوب گیا۔'

اُس نے گھڑی دیکھی۔ اب چلنا چاہیئے۔ ورنہ رات تک سگریہ نہیں پہنچا جا سکتا۔ کتابیں اور کاغذات
سمیٹ کر اس نے پورٹ فولیو میں رکھے اور ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلا۔ چند قدم پر پراکرم باہو کا عظیم الشان
مجسمہ ایک نیچے سے ٹیلے پر کھڑا تھا --- اس مجسمے کو سنہالی سنگتراشوں نے نو سو برس پہلے بنایا تھا --- اس
کے سامنے میں کھڑے ہو کر لیزلی مارش نے خود کو بے حد حقیر محسوس کیا --- میں کون ہوں --- دور دراز نیو انگلینڈ
سے آیا ہوا لیزلی ونسنٹ مارش --- جو اس وقت بزعمِ خود مشرق کو تہذیب سکھلانے نکلا ہے --- جو سمجھتا ہے
کہ مشرق کے سارے دکھوں کا علاج صرف اس کے پاس ہے۔ مشرق کو اپنے دکھوں کا خود ہی مداوا کرنے کا کوئی
حق حاصل نہیں ---

مجسمے کے قریب بے حد بکھرے بالوں اور سیاہ رنگ کا ایک نوجوان دیدہ [illegible] کھڑا تھا
اور غالباً اس سے بخشش کا طالب تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے یہ دیدہ ان قدیم جنگلوں، ان سرسبز پہاڑیوں

اس نیلی پیاری نیلی جھیل، اس سنگ سرخ کے مہیب مجسمے کی روح ہے جو آج کی "متمدن" دنیا کے تاریک لاشعور میں سے دفعتاً نمودار ہو کر اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔

کیمرہ سنبھال کر وہ ٹیلوں پر سے اترتا سائیں سائیں کرتے اونچے درختوں کے جنگل میں داخل ہوا جہاں سنگِ سرخ کے کھنڈر چاروں طرف دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔

منقش ستونوں والے پویلین کے "مرن استھون" پر بیٹھ کر وہ اپنا کیمرہ فوکس کر رہا تھا جب اُسے اچانک وہ نظر آ گئی۔ وہ دوسری طرف سے سیڑھیاں اتر کر برآمد ہو کے "پچاس کمروں والے محل" کی سمت جا رہی تھی۔ وہ فوراً اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گھاس پر بکھری ہوئی زرد پتیوں پر اُس کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ پیچھے مڑی۔

"ہائی ——" لزلی مارش نے مسکرا کر کہا۔

"ہائی —— !" جواباً وہ بھی مسکرائی۔

وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ "یہ اس قدر خوبصورت جزیرہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔" سے بات شروع کی۔

"ہاں" کاسنی ساری والی لڑکی نے جواب دیا۔ "ہماری مقدس کتاب رامائن میں لکھا ہے کہ سبز اور سنہرا لنکا اس قدر دلفریب تھا جیسے آکاش پر باغ لگا ہو۔"

"کتنا حسین طرزِ تعمیر ہے یہ" —— لزلی مارش نے محل کو دیکھتے ہوئے ٹھٹک کر کہا۔ "میں جب بھی ایشیا آتا ہوں اپنے آپ کو بے حد حقیر محسوس کرتا ہوں۔"

"تم نے جنوبی ہند کے مندر دیکھے ہیں؟"

"ہاں —— تم بھی ہندوستانی ہو نا؟"

"ہاں —— وہ دیکھو —— "سات محل وہار" —— اسے رانی روپ وتی نے بنایا تھا —— میں نے ابھی گائیڈ بک میں دیکھا۔"

"میرا نام ڈاکٹر لزلی ونسنٹ مارش ہے۔ میں ہارورڈ سے آیا ہوں۔"

"میں ڈاکٹر مرچندانی ہوں۔ میں نے سنہ ۵۴ء تک کولمبیا میں پڑھا ہے۔"

"مس مرچندانی یا مسز مرچندانی ——؟"

"مرچندانی میرا میڈن نام ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے میں کولمبو سے کر یہاں تک تمہارا تعاقب کرتا آیا ہوں۔ تم نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر

نہیں دیکھا۔"

"ہارورڈ کے لوگ تو بہت سنجیدہ اور مقبولیت پسند مشہور ہیں۔"

"ہاہاہا —— تم کولمبیا میں انگلش ڈیپارٹمنٹ کے ڈاکٹر ایڈورڈ مارش کو جانتی ہو؟ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے ——"

کھنڈروں کے چکر لگاتے ہوئے انہوں نے امریکہ کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ اسی پس منظر سے نکل کر آیا تھا جس پر وہ خود اتنے عرصے رہی تھی۔ اور جہاں اس نے اپنی زندگی کا بہترین وقت گزارا تھا۔ شاید اسی لئے اس اجنبی امریکن سے اس نے ایک عجیب سی یگانگت محسوس کی۔

"انتھروپولوجی اور آرکیالوجی میرے محبوب مضمون ہیں لیکن یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتا ہوں۔ آج کل ایک کتاب لکھنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ تم بھی —— کتاب لکھنے آئی ہو؟"

"نہیں تو —— وہ دیکھو ——" اس نے جلدی سے گائیڈ بک کھولی۔ —— "وہ رانیوں کے نہانے کے لئے کنول کی شکل کا تالاب —— یہاں لکھا ہے کہ زمین دوز نالی کے ذریعہ پراکرم سمندر سے پانی لا کر اس میں بھرا جاتا تھا۔"

وہ سارے میں گھومتے پھرے۔ لنکا تلک مندر —— جیت ون وہار —— رانی روپ وتی کا بنایا ہوا استوپ —— پراکرم باہو کی ملکہ سبھدرا کا بنایا ہوا کیرتی وہار —— جنوبی ہند کی طرز کے ٹوٹے پھوٹے شیو دیوالے۔ اینٹوں سے بنایا ہوا بے تحاشا اونچا گوتم بدھ جو سیدھا کھڑا تھا۔ اور جس کے گوتھک وضع کے مندر کی چھت گر چکی تھی۔ گھاس پر سرمئی چٹانوں کے درمیان لیٹا ہوا گوتم بدھ جسے پری نروان حاصل ہو چکا تھا اور جس کے سرہانے آنند ہاتھ باندھے اپنے آقا کی موت پر اداس کھڑا تھا —— ایک وسیع و عریض چبوترے پر پدم آسن میں بیٹھا ہوا گوتم بدھ جس کے سامنے درختوں پر پجاریوں نے اپنی اپنی مرادیں حاصل کرنے کے لئے سفید کترنیں باندھ رکھی تھیں —— اور جس کے چاروں اور سنہالی عورتیں آ آ کر سجدے میں گر رہی تھیں —— موروں اور ہاتھیوں اور راج ہنسوں کی ریلیف والے نفیس اور سُبک مون اسٹون۔ لڑکی ایک ایک چیز دیکھ کر بے حال ہوا جا رہا تھا۔ "تم امریکن بھی خوب چیز ہو۔" ستیا نے ہنس کر کہا۔

"وہ دیکھو سات محل پرساد ——" لڑکی نے سامنے اشارہ کیا۔ "اس زمانے میں لوگ سات سات منزلیں تعمیر کر لیتے تھے۔ کمال ہے ۔۔!"

"رامائن میں تلسی داس نے لکھا ہے کہ لنکا کے محل خود وشوکرما نے خدائے دولت کوبیر کے رہنے کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے ——" ستیا نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں؟ پھر سے کہنا۔" اُسنے فوراً اپنی نوٹ بک نکالی بستیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اور یہ بھی لکھو۔ وشنو نے جادو کا شہر بسایا تھا۔ اس میں شہزادی دشوموہنی رہتی تھی۔" وہ ایک شکستہ ستون پر بیٹھ گئی۔ لڑکی نے نوٹ بک بند کر دی۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔" اسنے کہا۔ "بند روڈیو مالا اور رامائن کی کہانی پڑھ کر میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ ستیا کیسی ہو گی۔"

"اور وہ تم نے آج دیکھ لی!" وہ اور زور سے ہنسی۔

فضول — فضول —— وقت گذر رہا ہے۔

واپسی میں انہیں دور سے راج کوٹ دیہار کا عظیم الشان ستوپ نظر آیا جیسکے وسیع و عریض گنبد پر گھنا جنگل اُگ آیا تھا۔ "کتنی ڈراؤنی بات ہے۔" ستیا نے کہا۔ "انسان جنگل کے سامنے بے بس رہ جاتا ہے۔"

"ہاں۔" لڑکی نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔"

ریسٹ ہاؤس کے سامنے پہنچ کر اُسنے ستیا سے کہا۔ "اگر تم یہ نہیں چاہتی ہو کہ میں دوبارہ مبتلا اشعار قوت شروع کر دوں تو تم میری کار میں آجاؤ —— اور اپنے ڈرائیور سے کہدو کہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔"

ستیا نے ایسا ہی کیا۔

پولونرواکے کھنڈر عقب میں چھوڑ کر وہ پھر سیدھی سڑک پر آگئے۔ ستیا نے سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ پچھلے سال وہ عرفان کے ساتھ بہاولپور کی گرد آلود سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ عرفان اس وقت کولمبو میں تھا۔ جمیل بھی کولمبو میں تھا۔ وہ لیزلی ولسنٹ مارش کے ساتھ سگریہ جارہی تھی۔

رات ہو گئی۔

ساوتری نے جنگل میں کہا تھا —— رات ہمارے چاروں اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ سورج ڈوب چکا ہے رات کے حیوان چاروں کھونٹ گھوم رہے ہیں۔ اور بڑی بے رحمی سے طنزیہ قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کے چلنے سے پتیاں کھڑکھڑا رہی ہیں۔ جنوب مغرب سے آتی ہوئی گیدڑوں کی بھیانک چیخیں میرے دماغ کو ٹکرا رہی ہیں —— میرے دماغ کو —— میرے دماغ ——

رات کی تاریکی میں سگریہ ریسٹ ہاؤس پر گہرا سکوت طاری تھا۔

"تمہارا ریزرویشن موجود ہے؟" لیزلی نے کار سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ——"

"آپ کا کمرہ اس طرف کے ونگ میں ہے ڈاکٹر مارش —— " ریسٹ ہاؤس کے منیجر نے سامنے

آکر کہا۔
"اچھا ــــ شکریہ" وہ اپنی کیس اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسرے برآمدے کی سمت روانہ ہو گیا۔
صبح کو جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تو وہ برآمدے میں بیٹھا بڑی تندہی سے ٹائپ کر رہا تھا۔
"گڈ مارننگ!" اسنے سر اٹھا کر کہا۔
"گڈ مارننگ ڈیوی پروفیسر!" ستیانے جواب دیا اور قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
وہ ٹائپ کرنے میں مصروف رہا۔
"کیا لکھ رہے ہو؟"
بیزلی نے ٹائپ شدہ کاغذات اس کی طرف کھسکا دیے۔
جنوبی ایشیا میں کمیونزم کا اثر ـــ جمہوری کی سری لنکا فریڈم پارٹی کا ڈھونگ" دوسرے باب کا
پہلا عنوان تھا ـــــ وہ چند صفحوں پر نظر دوڑا کر کوفت کے ساتھ باہر دیکھنے لگی۔
"تمہاری باتوں سے لگا تھا کہ تم معقول قسم کے ڈیموکریٹ ہو ــ"
چند منٹ بعد اسنے کہا۔
بیزلی ٹائپ رائٹر بند کرکے ہنسنے لگا "میں نے کل شام ہی طے کر لیا تھا میں تم سے بحث کرنے کے بجائے کر
لیا ہے کہ اتنے خوبصورت لمحات سیاسی گفتگو میں برباد نہیں کروں گا کیونکہ جب تم تقریر شروع کر دیتی ہو تو دوسرے
کو کوئی اور بات نہیں کرنے دیتیں۔ اور اس طرح بہت قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے۔ تم ایسی حسین لڑکیوں کو
انٹلکچوئل بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"
ستیانے کوئی جواب نہیں دیا اور اسکے ساتھ بریکفاسٹ کی میز کی طرف چلی گئی۔
ناشتہ ختم کرکے اسنے گھڑی دیکھی۔
"اب جلدی سے سگریا دیکھ آنا چاہیے۔"
"کیوں ــــ؟ جلدی کیا ہے؟" بیزلی نے اس کا سگریٹ جلاتے ہوئے کہا ـــ میرا تو جی چاہ رہا ہے
کہ ایک دو دن یہیں رہا جائے۔"
"مجھے منگل کی صبح کولمبو واپس پہنچنا ہے۔"
"کولمبو پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ تم تو کبھی کہتی تھیں کہ پرانی لنکا کی سیاحت کے لئے آئی ہو انگریزوں
کے بسائے ہوئے اس کولونیل شہر میں کیا رکھا ہے؟"
وہ میز پر ماچس کی تیلیوں سے حروف بنانے میں منہمک رہی۔ ایک بہت کم عمر سنہالی جوڑا جن کے

اندازے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں ماہِ عسل منانے آیا ہے اپنے کمرے سے نکل کر کاؤنٹر پہ آیا۔ لڑکی کولمبو ٹرنک کال کر رہی تھی۔

"مما — ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ بہت اچھا — کھانا — ؟ ہاں کھانا بہت اچھا ہے — ہاں ہاں — میں نے اوولٹین پیا ہے — میں رتنا کو بہت سے پکچر پوسٹ کارڈ بھیجوں گی — پارتی سے بات کیجئے —"

قہوہ ختم کر کے لیزلی اٹھ کھڑا ہوا — "جو تمہاری مرضی — چلو سگریہ دیکھ آئیں۔"

سگریہ کی چھ سو فیٹ اونچی ہیبتناک چٹان کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگ گیا۔ ہوا بہت تیز تھی۔ اور مدھم دھوپ نیچے حد تک کھیتوں پہ پھیلی ہوئی تھی — دور افق پر نیلی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

چوٹی پر پہنچکر چاروں طرف دیکھتے ہوئے اپنے کلینٹ لیزلی سے کہا۔

"احساس جرم سگریہ کی چٹان کی طرح مہیب اور اٹل اور سیاہ اور خوفناک ہے —"

"تم بعض دفعہ ایسی گنجلک باتیں کرتی ہو کہ ان کے لئے باضابطہ فٹ نوٹس کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے — بتاؤ دنیا کی کس لائبریری میں تمہاری باتوں کے اشارے مل سکیں گے —" لیزلی نے کہا۔

سیتا نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا کس قدر احمق آدمی ہے۔

فضول — فضول — فضول —

ایک اور چٹان کی سطح کو پار کر کے وہ فریسکوز کی طرف جانے والی آہنی سیڑھیوں کے نیچے پہنچ گئے —

لیزلی نے ایک قدم منڈیر پہ رکھ کر اوپر دیکھا —

"اگر وہاں سے گر جائے آدمی تو کیسا رہے ؟" اپنے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کرتے ہوئے پھر چاروں طرف دیکھا — دفعتاً اسنے مڑ کر سیتا سے سوال کیا۔ "تم احساسِ جرم کی کیا بات کر رہی تھیں —؟"

"کچھ نہیں —" وہ منڈیر پر بیٹھ گئی —

"مجھے مزید بتاؤ —" لیزلی نے ضد کی۔

"رات میں سگریہ کی کہانی پڑھ رہی تھی —" سیتا نے بات ٹالنے کے لئے کہنا شروع کیا — "کوئی چھٹی صدی عیسوی میں دھتوسین لنکا کا راجہ تھا۔"

لیزلی نے فوراً نوٹ بک نکال لی اور گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے سامنے بیٹھ گیا —

"اس کے دو بیٹے تھے —" سیتا نے ہوا کے تھپیڑے سے اڑتے ہوئے پلو کو کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا — "کیشیپ اور موگلنا۔ راجہ کی بیٹی کی شادی اس کے سپہ سالار سے ہوئی تھی۔ ایک روز راجکماری نے اپنے

باپ سے کہا کہ اس کے شوہر نے اسے کوڑوں سے مارا ہے۔ دھتو سین نے غصے میں آ کر اس کی ساس کو زندہ جلوا دیا۔ سینا آپتی بادشاہ پر خود حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسنے کیشیپ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور کیشیپ نے بغاوت کرنے کے بعد باپ کو زندہ دفن کیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ موگلنا جان بچا کر ہندوستان بھاگ گیا مگر اس کے بعد مہاراجہ کیشیپ کو احساسِ جرم نے ستانا شروع کر دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ انتقام کی دیوی اسے اس کے جرم کی سزا دے گی۔ لہٰذا اس مستقل خوفزدہ بادشاہ نے سگریہ کی اس اونچی چٹان پر اپنا قلعہ بنایا تاکہ دنیا سے محفوظ رہ سکے۔ اس چٹان کی سطح پر اسنے محل رومحلے اور تالاب اور گلشن بنوائے اور یہاں رہنے لگا مگر اٹھارہ سال بعد ۔۔۔ نادیہ نے اٹھ کر اسنے پھر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ لیزلی نوٹ بک سنبھالے ساتھ ساتھ سر جھکائے بڑے دھیان سے کہانی سنتا جا رہا تھا ۔ چلتے چلتے ایک سیڑھی پر سنیتا کا پیر رپٹا ۔۔

"ارے ارے سنبھل کر چلو ۔۔۔" اسنے گھبرا کر کہا ۔۔۔ "ہاں ۔ پھر ۔۔۔؟"

اٹھارہ سال بعد موگلنا فوجیں لے کر ہندوستان سے لوٹا اور اس چٹان کے نیچے اپنے بھائی سے جنگ کی اور کیشیپ نے میدان جنگ میں خودکشی کر لی۔

اب سب نے خطرناک آہنی زینے پر چڑھنا شروع کیا اور چند منٹ میں اوپر پہنچ گئے۔ چوٹی کے بالکل کنارے ایک سیدھی کھڑی چٹان کی دیوار پر اجنتا کی نقل میں فریسکو بنے تھے۔

"پھول برساتی ہوئی اپسراؤں کی پروڈکشن اتنی مرتبہ دیکھا ہے کہ اس وقت اسے سچ مچ میں دیکھ کر یقین نہیں آرہا ۔۔۔" لیزلی نے کہا۔

"تم نے اجنتا کے فریسکو دیکھے ہیں؟" سنیتا نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ اب جا کر دیکھوں گا ۔۔۔ ذرا سوچو یہ خوبصورت تصویریں کن فنکاروں نے کتنی جوکھم سے چڑھ کر بنائی ہوں گی۔"

"اجنتا دیکھنے کے بعد یہ پانچ چھ چھوٹی چھوٹی تصویریں بالکل مسخرہ پن معلوم ہوتی ہیں ۔۔۔ مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی۔ خواہ مخواہ اتنی اوپر چڑھ کر آئی ۔۔۔ چلو اب نیچے جا کر گریفیٹی دیکھیں ۔۔۔" سنیتا نے گائیڈ بک کھول کر کہا۔ لیزلی تصویریں دیکھنے میں محو تھا۔ وہ اسکے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔

"تمہاری تصویر اگر کسی قدیم سنگلاخ دیوار پر اسی طرح بنائی جاتی تو کیسی لگتی ۔۔۔؟" لیزلی نے پلٹ کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جانے یہ لڑکیاں کون رہی ہوں گی ۔۔۔" سنیتا نے بالوں کی لٹ پیشانی پر سے ہٹا کر آہستہ سے کہا ۔۔۔ "دیوتا ۔۔۔ بجلی کی شہزادی ۔۔۔ میگھ لتا ۔۔۔ بادل کی شہزادی ۔۔۔ اپسرائیں ۔۔۔ رمبھا ۔۔۔ مینکا ۔۔۔"

فرسکو سے آگے بڑھ کر وہ گرتفینی کی طویل دیوار کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ نیچے شہر کے عظیم الشان ہجوں کے درمیان سے نکل کر چند سیاح سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ سنہاگیری کا ہولناک سایہ دور دور تک کھیتوں پر پڑ رہا تھا۔

"اس دیوار پر صدیوں پہلے سگریہ آنے والے سیاحوں نے جو کچھ لکھا تھا اسی طرح محفوظ ہے ..." استیا نے گائیڈ بک کھول کر پڑھنا شروع کیا ۔۔۔ "اس گرتفینی پر جو شیشے کی دیوار کہلاتی تھی چھ سو اتی تحریریں مختلف ہیں جنہیں ہماری آپ کی طرح سیاحوں نے لکھا ہوگا ۔۔۔ بہت سی مذاقیہ نظمیں سوال جواب کی صورت میں ہیں ۔۔۔

"دوست ۔۔۔ ایک جگہ لکھا ہے ۔۔۔ ان سنہری لڑکیوں کی تصویریں جگہ جگہ سے خراب ہو گئی ہیں ۔۔۔ کہیں کہیں پر ان کا رنگ اڑ گیا ہے ۔۔۔ کیا اب کوئی ایسا باقی نہیں جو ان کے زمانے میں ان سے پیار کرتا تھا؟"

"ایک جگہ کسی عورت نے لکھا ہے ۔۔۔ سنو سنو ۔۔۔ ہم لڑکیاں تم سے مخاطب ہیں ۔۔۔ تم احمقو! تم جو سگریہ آئے ہو ۔۔۔ گیت گانے اور نظمیں لکھنے کے علاوہ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہم عورتیں ہیں اور ہمیں مدد چاہئے ۔۔۔"

کینڈی میں شاطو کے دریچے میں سے جھیل نظر آ رہی تھی جس کے چاروں طرف پہاڑیوں پر سرخ چھتوں والی کوٹھیاں پام کے گھنے جھرمٹوں میں چھپی کھڑی تھیں۔ پہاڑیوں پر بل کھاتی ہوئی سایہ دار ڈرائیوز تھے جن کے نام سابق برطانوی گورنروں کی بیویوں کے نام پر رکھے گئے تھے ۔۔۔ لیڈی ہورٹن ۔۔۔ لیڈی بلیکس ۔۔۔ لیڈی مک کیلم ۔۔۔ آسمان کے مقابل، بائبل روک، استادہ تھی۔

شاطو کا مالک کوئی رومن کیتھولک برسٹر تھا جس کا آدھا نام پرتگالی، آدھا سنہالی اور آدھا تامل تھا۔ نچلی منزل کے ڈرائنگ روم میں اپنے فیملی گروپ آویزاں تھے۔ اوپر کھانے کے کمرے میں بیرسٹر کے کسی پرکھ کی روغنی تصویر سجی تھی۔ تصویر کے نیچے ان کا نام لکھا تھا ۔۔۔ "ڈون فرننڈیز ڈی کوستا سمر سنگھا ردنا مدلیار ۔۔۔"

"کولونیل مشرق اور سامراجی مغرب کا یہ ناجائز اختلاط مجھے ہانگ کانگ سے لے کر گوا تک ہر جگہ دیکھنے کو ملتا ہے ۔۔۔" لیزلی نے نیپکن اٹھا کر دریچے کے قریب کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے کینڈی کے رقاصوں کا ناچ دیکھا ہے؟" ستیا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں جنگ کے زمانے میں برما جاتے ہوئے یہاں چند روز کے لئے ٹھہرا تھا۔ اتفاق سے اسی شاطو میں ٹھہرا تھا ۔۔۔ جس زمانے میں کینڈی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا ۔۔۔ پھر وہ

رک کر کسی سوچ میں ڈوب گیا —

"کیا سوچتے ہو —" سیتا نے سلاد کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں —" وہ چونک کر بولا — "میرا باپ بری طرح زخمی ہوا تھا اور کئی سال جنگی قیدی رہا تھا۔ میرے دو چھوٹے بھائی ٹوکیو پر بمباری کرتے ہوئے مارے گئے تھے — جنگ بڑی خوفناک چیز ہے سیتا"

"اور اب تم ایک اور جنگ لڑنا چاہتے ہو —"

"کیونکہ تمہارے اس خوبصورت ایشیا کو کمیونزم سے بچانا ہی ہے سیتا —"

سیتا نے ایک بار پھر خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔

"چلو اچھے سیاحوں کی طرح "دانت کا مندر" دیکھ آئیں۔ کھانے کے بعد اس نے ذرا اکتا کر لیزلی سے کہا۔

کینڈی کے مشہور و معروف "دانت کے مندر" میں شام کی پوجا ہو رہی تھی۔ اس سے ملا ہوا کینڈی کے آخری بادشاہ (سری) وکرم راج سنگھ کا چھوٹا سا چوبی محل سنسان پڑا تھا۔ لیزلی اس کی دیواروں کے چوبی نقش و نگار انگلیوں سے چھوتا پھرا — اس بادشاہ کو ۱۸۱۵ء میں انگریزوں نے شکست دے کر ملک پہ قبضہ جمایا تھا — سیتا کو یاد آیا — اس نے کولمبو میوزیم میں سری وکرم راج سنگھ کی رانی کا اطلسی بلاؤز ایک شوکیس میں رکھا دیکھا تھا جس کے شانے پر خون کا مدھم سا دھبہ تھا۔ بلاؤز کے نیچے ایک پرچی پر لکھا تھا —

"کینڈی کو تاراج کرنے کے بعد راج محل پر حملہ کرتے ہوئے برطانوی سپاہیوں نے مہارانی کے کانوں سے جو بالیاں نوچی تھیں یہ اس کا خون ہے —!"

جھانسی کی لکشمی بائی — لکھنؤ کی ملکہ حضرت محل — کینڈی کی مہارانی —

شاطو واپس آ کر رات کا کھانا کھانے کے بعد لیزلی سے مزید باتیں کرنے کے بجائے وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس سے تین دن تک متواتر باتیں کرتے کرتے اب اکتا گئی تھی۔

رات گئے تک لیزلی کے کمرے سے ٹائپ رائٹر کی آواز آئی کی۔ شاید وہ اس وقت — "جنوبی ایشیا میں کمیونزم کے اثرات" کا تیسرا باب لکھ رہا تھا۔

دوسرے روز سویرے وہ کینڈی سے روانہ ہوئے۔ شہر سے باہر مہاویلی گنگا میں ہاتھی نہا رہے تھے۔ چند میل کے فاصلے پر سیلون یونیورسٹی کی سنگ سرخ کی خوبصورت عمارات دور دور تک سرسبز پہاڑیوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ سایہ دار راستوں پر سوتی ساریوں میں ملبوس سانولی سلونی لڑکیاں کتابیں اٹھائے ادھر ادھر آ جا رہی

تھیں۔ — جانے ان بے چاریوں کی قسمتوں میں کیا کیا لکھا ہے — کار میں لیزلی کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اُس نے سوچا — وہ بھی کسی زمانے میں اسی طرح ذوق و شوق سے کتابیں سنبھالے پڑھنے جایا کرتی تھی — اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی سسرال کی بڑی بوڑھیاں کنواری لڑکیوں کے سلام کے جواب میں "اللہ نصیبا اچھا کرے" کیوں کہا کرتی تھیں — اور بڑی خالہ، منجھلی خالہ، چھوٹی خالہ، تینوں اس کے جواب میں اسے "بوڑھ سہاگن ہو" "اور مانگ سے ٹھنڈی رہو" کی دعائیں دیتی تھیں —!

کیٹی سے آگے، چائے زیادہ بلند پہاڑ شروع ہو گئے۔ پام کے جھنڈ اب ختم ہو رہے تھے اور ان کی جگہ اونچے اونچے لیاٹن درختوں نے لے لی تھی۔

تیسرے پہر کو وہ نوارا ایلیا کے ہل اسٹیشن پر پہنچ گئے — نیورا ایلیا — "روشنیوں کا شہر" — انگریزی کنٹری ہاؤس کی وضع کا دو منزلہ "گرینڈ ہوٹل" ایک پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی پر ایستادہ تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو چکی تھی۔ ہوا میں پہاڑی گلابوں کی تیز مہک تھی۔ ہر طرف ڈیزی اور کارنیشن کے پودے لہلہا رہے تھے۔ ہوٹل کے اندر سے مدھم مغربی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔

"اوہ — " لیزلی نے کار سے اتر کر ہوا کو سونگھتے ہوئے کہا۔

" — مجھے یکایک ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ایشیا کے تند و تیز سحر سے بچ کر ایک بار پھر اپنے محفوظ اور سرد مغرب میں واپس آ گیا ہوں!"

جتنی دیر میں سیتا اپنا سامان سنبھال کر برساتی میں اتری وہ ہال میں جا کر کاؤنٹر پر جھکے ہوئے کلرک سے بات کرنے میں مصروف ہو چکا تھا — وہ بھی قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

کلرک نے رجسٹر کھولا۔ اور لیزلی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ڈبل روم سر — ؟"

"ہاں — " لیزلی نے جواب دیا۔

"نام — ؟"

"مسٹر اینڈ مسز لیزلی مارش — " لیزلی نے جواب دیا۔

کلرک نے لکھ لیا۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے سیتا — ؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

وہ چپ رہی۔

دوسری صبح پہاڑوں پر بہت گہرا کہرہ چھایا ہوا تھا۔ دھند چھٹی تو سیتا ہاؤس کوٹ پہن کر دریچے میں

تھی اور سرخ پھولوں والا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔

"آج کا کیا پروگرام ہے؟" اسنے پلٹ کر لیزلی سے پوچھا۔

"تم ہی بتاؤ۔" اسنے شیو کرتے ہوئے سنگھار میز کے سامنے سے جواب دیا۔

"میں تمہارے اختیار میں ہوں۔"

سیتا کھڑکی کے سرد شیشے سے ناک چپکائے دیر تک باہر کا منظر دیکھا کی۔

لیزلی اب انتہائی بے سُری آواز میں جنوبی پاپا بیٹلز کا ایک ... نغمہ گنگنا رہا تھا۔ باہر چوٹیوں پہ بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ دور پہاڑوں پہ آبشار نظر آ رہے تھے۔

نورا ایلیا کے باہر زمین ایک جگہ سے سیاہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سیتا کو بچانے کے لئے یہاں آ کر ہنومان نے سارے پہاڑ کو آگ لگا دی تھی۔ جب ہی سے یہ زمین جلی ہوئی ہے۔ سیتا یہیں کھو گئی تھیں ـــ راون نے سیتا کو لا کر اسی جگہ پہ قید کیا تھا۔

دوپہر کو سیتا اور لیزلی پہاڑوں پر گھومتے پھرتے ایک آبشار کے کنارے جا پہنچے ـــ "ذرا یہاں رکنا" ـــ سیتا نے لیزلی سے کہا۔ آبشار سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا مندر کھڑا تھا۔ وہ کار سے اتر کر تیزی سے بھاگتی مندر کی سمت گئی۔ لیزلی بھی کیمرہ سنبھال کر پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مندر کے نیچے پہاڑی ندی کا شور مچاتا ہوا پانی بہہ رہا تھا۔ اندر سے پجاری نکلا۔ امریکن ٹورسٹ کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا کہ آج خدا کے دولتمند کے درشن ہو گئے۔ دس روپے سے کیا ہی کم بخشش دے گا۔

"یہ سیتا پتیشوری کا مندر ہے۔" بالوں کا جوڑا بنائے سر پہ ہاتھی دانت کی کنگھی اڑسے ایک راہ چلتا سنہالی سیتا کو بتا رہا تھا ـــ "دیکھئے میڈیم ـــ وہ جو آبشار کے برابر میں چھوٹی سی سُرنگ ہے اسکے ذریعے سیتا کو ایلیا سے یہاں لا کر پہنچایا جاتا تھا ـــ راون یہاں سے اڑتیس میل دُور ایلیا میں رہتا تھا۔"

"گڈ گاڈ ـــ!" سیتا زور سے ہنسی۔ لیکن لیزلی بڑی عقیدت سے اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا۔

"یہ سب باتیں میری کتاب میں FOLKS BELIEFS کے باب میں آئیں گی۔ میں ثابت کروں گا کہ تمہاری ساری کمیونزم کے باوجود پورے ایشیا میں ـــ ہندوستان، پاکستان، لنکا ہر جگہ عوام کس شدت سے اپنے اپنے مذاہب کے پابند ہیں۔ اور اپنی مذہبی روایات میں کتنا اٹل اور گہرا یقین رکھتے ہیں ـــ اب اس بیچارے غریب سنہالی مزدور کو دیکھو ـــ یہ کتنے وثوق سے تمہیں بتلا رہا ہے کہ راون یہاں سے اڑتیس میل دُور ایلیا میں رہتا تھا ـــ یہ مشرق کی لازوال طاقت ہے جسے تمہاری انڈین کمیونسٹ پارٹی یا برما کے تخریب پسند یا یہاں کے اشتراکی اور "ہمسفر" ـــ کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا۔

سیتا چٹان پر جھک کر اس سرنگ کے اندر جھانکنے کی کوشش میں مصروف رہی جس کے ذریعہ سیتا کے لئے کھانا سپلائی کیا جاتا تھا۔

لیزلی نے مندر کی نیم تاریک کوٹھری کے اندر جاکر پجاری کا انٹرویو شروع کر دیا۔ پجاری نے اُسکے ماتھے پر تلک لگایا۔ ڈاکٹر لیزلی مارٹن نے بڑے ذوق وشوق سے سُرخ اور سفید تلک لگوایا ـــ ماتھے پر تلک لگائے ہوئے وہ بے حد مسخرہ معلوم ہوا۔ بے چارہ ـــ بے وقوف ـــ امریکن ـــ

نورا ارا ایلیا کے اس کنٹری ہاؤس کے اس سُرخ پھولدار پردوں والے کمرے میں جسکے باہر پہاڑی گلاب کھلے تھے اور دور سے آبشاروں کی آواز آتی تھی۔ وہ چار دن تک رہے۔

(۱۳)

ـــ اور ہنومان جی راکھشش کے محل کے اندر گئے۔ مگر سیتا وہاں نہیں تھی۔ اس محل کے برابر ایک اور محل تھا جسکے اندر ہری کا مندر بنا تھا۔ یہاں وبھیشن رہتا تھا جو ہری بھگت تھا۔ اور اسنے ہنومان جی سے کہا ـــ میں اس جگہ پر اس طرح رہتا ہوں جیسے دانتوں کے بیچ میں زبان۔

ـــ رگھوپتی نے لکشمن سے پوچھا۔ بھائی تم نے جنک کی بیٹی کو جنگل میں تنہا چھوڑ دیا ـــ جہاں چاروں طرف راکھشش گھومتے پھر رہے ہیں ـــ؟

رام جنگل میں پوچھتے پھرے ـــ پرندو، جانورو، بھنورو ـــ تم نے مرگ نینی سیتا کو کہیں دیکھا ہے؟ مور، طوطے، ہرن، مچھلیاں، بجلی، کنول، خزاں کا چاند، سانپ، کام کا ترکش، بطخیں، ہاتھی، شیر اب اپنے اپنے حسن پر دوبارہ نازاں ہو سکتے ہیں۔ سنو جانکی! بیل کا پھل، سونا اور کیلا اب خوش ہیں، کیونکہ تم جا چکی ہو۔ وہ مطمئن ہیں کہ حسن میں اُن کا رقیب اب کوئی نہیں رہا۔

رام نے جنگل سے گذرتے ہوئے لکشمن سے کہا ـــ دیکھو لکشمن ـــ جنگل کتنا خوبصورت ہے، کون ایسا حسن دیکھ کر مضطرب نہ ہوگا! جب ہرن ہماری آہٹ پر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ تو اِن کی ہرنیاں ان سے کہتی ہیں، ڈرو نہیں ـــ تم تو جنم جنم کے ہرن ہو۔ لیکن یہ دونوں تو ایک سنہرے ہرن کی تلاش میں آئے ہیں' ـــ بھیا! دیکھو بسنت رُت کتنی خوبصورت ہے۔ کام دیو سیتا کے کھو جانے کی وجہ سے مجھے اُداس دیکھ کر جنگل اور شہد کی مکھیوں اور چڑیوں کی اعانت سے میرے اوپر حملہ کرنے آرہا ہے۔ درختوں پر پھیلی ہوئی بیلیں اس کی فوج کے خیمے ہیں۔ کیلے اور تاڑ کے پتے اسکے عَلم ہیں۔ پھولوں کی جھاڑیاں اُس کے تیر انداز اور کوئل کی آواز گویا اُسکے جنگلی ہاتھی کی چنگھاڑ ہے۔ بگلے اور مینائیں کام دیو کے اونٹ ہیں، مور

اور راج ہنس اُس کے عرب گھوڑے ہیں۔ یا موز پرندے اور جنگلی تیتر اس کے پیادے ہیں — جنہیں کام دیو کے رتھ ہیں۔ آبشار اُس کے نقارے معطر ہوائیں اسکے جاسوس اے لکشمن! جو کام دیوتا کی فوج کا مقابلہ کر سکے وہ سچ مچ بڑا جری ہے۔ کام دیوتا کا سب سے بڑا ہتھیار عورت ہے۔

— اب سبز زمین گھاس سے اس طرح ڈھک گئی ہے کہ پگڈنڈیاں دکھلائی نہیں دیتیں۔ جس طرح مقدس صحیفے بدعتیوں کے مباحثوں میں چھپ جاتے ہیں۔ ابر آلود رات کے اندھیروں میں جگنو اس طرح چمک رہے ہیں جیسے ریاکاروں کا خفیہ جلسہ ہو رہا ہو۔ تھکے ہوئے مسافر اِدھر اُدھر اس طرح آرام کر رہے ہیں۔ جیسے سنیاسی گیان حاصل کرنے کے بعد آرام کرتے ہیں۔

لیکن لکشمن! دیکھو — ساون بیت گیا۔ خزاں آگئی۔ زمین اب پھولوں کی نقرئی گھاس سے اس طرح ڈھک گئی جیسے بڑھاپا آہستہ آہستہ آتا ہے۔ راستوں پر بہتا ہوا بارش کا پانی اس طرح خشک ہو گیا ہے جیسے آسودگی ہوس کو ختم کر دیتی ہے۔

(۱۴)

اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے نیچے کالی گنگا شور کرتی ہوئی اُودی چٹانوں پر بہہ رہی تھی۔ درختوں میں پرندے رات کا بسیرا لینے سے پہلے زور زور سے چہچہا رہے تھے۔ ہوا ناریل کے جھرمٹ میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سیتا بہت دیر سے کھڑکی میں بیٹھی ندی کی تاریک لہروں کو دیکھتی رہی تھی۔ نوارا ایلیا سے واپس لوٹتے ہوئے یہاں پہنچ کر لیزلی مارش نے اُسے خدا حافظ کہا تھا اور اپنے سفر پہ آگے روانہ ہو چکا تھا۔ نیورا ایلیا میں اُسے کیبل ملا تھا کہ اُسے فوراً کولمبو لوٹ کر تین دن کے اندر کلکتے پہنچ جانا چاہئے۔

سیتا نے اُسے خدا حافظ کہنے کے بعد اپنے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ یہ ڈاک بنگلہ سیلون کے گھنے جنگلوں میں چھپے ہوئے باقی ڈاک بنگلوں کی مانند ماڈرن اور جگمگاتا ہوا نہیں تھا۔ اس کا فرنیچر بھی دقیانوسی تھا۔ فرش پر مونج کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ سنگھار میزوں کے آئینے بہت دھندلے تھے۔ کوئی اور غیر ملکی سیاح اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ سارے ریسٹ ہاؤس میں بالکل تنہا تھی۔ امریکن ایکسپریس کا ڈرائیور کار کو گیراج میں بند کرنے کے بعد شاگرد پیشے کی طرف جا چکا تھا۔ کھانا کھلاتے وقت بیرے نے دانت نکوس کر اُس سے کہا تھا۔ میڈیم —!

"برج اوِن ریور کوائی" کی شوٹنگ اسی جگہ پر ہوئی تھی۔ وہ سامنے والی کھائی جس میں گنگا بہہ رہی ہے وہ برج اسی پر بنایا گیا تھا — ایلک گنس اور ولیم ہولڈن اور سب بڑا بڑا ایکٹر اسی ریسٹ ہاؤس

میں ٹھہرا تھا۔ بڑی رونق رہی تھی ۔۔۔! میڈیم ۔۔۔! تو اس اطلاع سے بھی وہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ کمرے میں جا کر کھڑکی میں بیٹھی رہی تھی اور اس کے بعد روشنی بجھا کر پلنگ پر لیٹ رہی تھی۔ کل صبح اُسے کولمبو واپس جانا ہے۔

رات گہری ہوتی گئی ۔۔۔ رات جو چندن کے جنگلوں میں آوارہ تھی، لونگ اور الائچی کی جھاڑیوں میں سو رہی تھی۔ رات کینڈی کے مندر کی سیڑھیوں پر کھلے ہوئے سفید پھولوں پر لیٹی تھی۔ رات کالی گنگا کے کنارے دریائی گھاس میں سانپ کی طرح سرسرا رہی تھی۔ رات جو تاریک جنگلوں میں چھپے ہوئے ڈیچ اور پرتگالی گرجاؤں کی طرح خاموش تھی۔ رات جو ندی کی تہہ میں سنگلاخ چٹانوں پہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ رات جو کینڈی کے شاہی ہاتھیوں کے شاہی مہاوت کی طرح باوقار اور مغرور تھی۔ رات جو مہاویلی گنگا میں نہانے والے ہاتھیوں کی طرح سیاہ فام اور سست رو تھی۔ کینڈی میں ٹارچ لائٹ جلوس نکل رہا ہے۔ بدھ کے دانت کا جلوس۔ بدھ کا دانت سونے چاندی میں منڈھے ہاتھی کے جگمگاتے ہودے کے اندر ہیرے جواہرات کے صندوقچے میں رکھا ہے۔ گھاس پر لیٹا ہوا بدھ دانت نکوسے ہنس رہا ہے۔ اسنے نقلی دانت لگا رکھے ہیں۔ جہاتما بدھ کے دانت کھانے کے اور ہیں دکھانے کے اور

رات جو ڈھولوں کی آواز ہے، بانسری کی آواز، بیگ پائپ کی آواز ستاروں کی آواز۔

پریام میورہ پرتی نرتیتی ۔۔۔ مور اپنی محبوبہ کی طرف ناچتا ہوا جا رہا ہے، پریام ۔۔۔ ارے میں تو ساری زبانیں بھول گئی۔ بھلا میں کتنی زبانیں جانتی ہوں ۔۔۔؟ ایک بھی نہیں۔ میں بالکل گونگی ہوں۔

الفاظ کے بادشاہ ۔۔۔ اے الفاظ کے بادشاہ ۔۔۔ داتی اور دنایک کو میرا پرنام جنہوں نے الفاظ اور ان کے معانی ایجاد کئے۔ میں وساکھ دت ہوں، مہاراجہ بھاسکر دت کا بیٹا۔ میرے سر پر بادلوں کی گھن گرج ہے میرا پریتم بہت دور ہے۔ یہ کیا ہوا ۔۔۔؟ ارے بھئی یہ کیا ہوا ۔۔۔؟ امرلوٹیاں پر نیلے پہاڑوں پر ہیں۔ اور سر پر کنڈلی مارے ناگ بیٹھا ہے، کنڈلی مارے ناگ۔

ابوالمحافت قمرالاسلام چودھری نے مجھے چنڈی داس کا وہ کون سا گیت سنایا تھا ۔۔۔؟ 'رات اندھیری ہے اور بادل گہرے۔ تم ایسی رات میں کیسے آسکے! وہ پھول تن میں کھڑا بارش میں بھیگتا ہے، میری ساس، نندیں بہت ظالم ہیں۔ چنڈی داس کہے ۔۔۔ سکھی ری ۔۔۔ سکھی ری ۔۔۔

اور مہابدھو پادھیائے شری پرو جیشن کمار چودھری نے ودیاپتی کے کون سے گیت کے معنی بتلائے تھے ۔۔۔؟ رادھا کی نیم باز آنکھوں کی پتلی ایسی ہے جیسے کنول کے پھول پر بھنورا بیٹھا ہو ۔۔۔ ہاہا ۔۔۔ اور ہوا کے جھونکے کے زور سے پنکھڑیوں کے اندر سرک جائے ۔۔۔ نہانے کے بعد اس کی آنکھیں کاجل

لگا کر ایسی لگتی ہیں جیسے کنول پر سیندور لگا ہو ۔۔ اور ۔۔۔

ای ی ی ک ۔۔۔ ای ی ی ک ۔۔۔

۔۔۔ اور وہ رات کو شب رنگ ساری پہن کر کرشن سے ملنے جاتی ہے ۔

جی سنادے سنادے سنادے کرشنا، تو بنسری کی تان سنادے کرشنا ۔ آں آں آں سنادے ۔

راماین میں لکھا ہے تلسی داس جی نے کہ نوجوان عورت شعلے کی لو کی مانند ہے ۔ اے آتما! تو اس کا پروانہ نہ بن ۔۔۔ مگر کوئی الو کا پٹھا تلسی داس جی کی بات نہیں سنتا ۔

زن پورہ میں اگر مجھے وہ چنتامنی ہیرا مل جائے جو ساری خواہشیں پوری کر دیتا ہے ۔

سری لنکا کے سامنے پہاڑ نیچے چھپے ہو گئے ۔

خدا کرے خزاں جو دشمن کے جسم کے مانند زرد ہے

تمہاری مشکلیں دور کرے ۔۔۔

گہرے پانی ہیبت ناک مچھلیوں کے تیرنے سے مضطرب ہیں ۔

تمہارا علم تازہ پھولوں کے گچھے کے مانند ۔

میں نے اپنے سر پر لیا ہے ۔

بیلا پھولے آدھی رات گجرا میں کے کے گرے ڈاروں ۔۔۔ ارے بھائی میں گجرا میں کے کے گرے ڈاروں ۔

مہاراج کی جے ہو ۔ ایک شخص جس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا ایک خط کے ساتھ ہمارے کیمپ سے فرار ہونا چاہتا تھا ۔۔۔ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے ۔۔۔

تھرڈ ڈگری کس طرح کیا جاتا ہے ؟ تھرڈ ڈگری، ایف، بی، آئی ۔ سی، آئی، ڈی ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ کے ۔ ایل ۔ ایم ۔ پین امریکن ۔ ایر انڈیا انٹرنیشنل ۔

پتیوں سے عاری درخت اس طرح کھڑے ہیں جیسے کسی کی ارتھی کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں ۔

اب میں شمشانوں میں جا کر پریت منتر جگاتی ہوں ۔ جے کالی کلکتے والی ۔ ماری پور کے راستے میں شمشان گھاٹ تھا ۔ اس میں بے چارے مسلمان ریفیوجیوں نے جھونپڑیاں ڈال لیں ۔۔۔ جے کالی کلکتے والی ۔

کائنات کی ابتدا کا اسرار کالی کے جسم کے مانند تاریک ہے ۔ شفق کی سرخی کالی کا غیض ہے ۔ طوفان اور وبائیں اور موت اس کے ساتھی ہیں ۔۔۔ ہم بنگال والے صدیوں سے کالی کے منتر کا تماشہ دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ مسٹر پردیپ کمار چودھری کا اسسٹنٹ ٹو دی پریس ۔۔۔ بورژوا ایکسپریشنسٹک تصویریں بنانے والا ۔

بوگس بوگس بوگس ۔ کالی کا تصور ایکسپر شینسٹک ہے ۔ بوگس ۔

میری ریکھا کھا پچی بالکل بیکار گئی ۔

انسویا نے کہا سنو راج کماری ۔

تقدیس، پتی ورتا معصومیت ۔ وفاداری ۔ ہائے ہائے ۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین ۔ کامریڈز ―― پانیو تے بینو ―― آپ سب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سیتا آج کی دنیا کے خوفناک جنگل میں کھو گئی ۔ اس سیتا کو آج کی دنیا کا راون اڑا کے لے گیا ۔ حضرت ! یہ آج کی دنیا جو دو کیمپوں میں بٹی ہے ۔ اینگلو امریکن سامراج کی شکار دنیا جس میں معصوموں کو تھرڈ ڈگری کیا جاتا ہے تو انہیں کوئی ہنومان بچانے نہیں آتا ―― للتا ڈیر مائیکرو فون فیل ہو گیا ۔ ۔ ارے کیلاش ناتھ ماتھر ―― ذرا کرنٹ تو منگاؤ جلدی سے ―― ہاں تو حضرات میں کہہ رہی تھی کہ آج کی دنیا میں جہاں ہائیڈروجن بم کے راون اپنے بان سے شہروں کو آن کی آن میں بھسم کرنے والے ہیں ، جہاں ایشیا اور افریقہ کی لاکھوں سیتائیں اغوا کر لی جاتی ہیں ―― اے رامائن پڑھنے والے رنگا بھگتو ―― تم نے ۴۷ء میں کتنی مسلمان سیتائیں اڑائی تھیں ۔ ذرا ان کا حساب تو لگاؤ ―― اور اے یزید اور شمر پہ لعنت بھیجنے والے مسلمان مجاہد ―― تم ―― جو ――

سیتا مرچندانی ―― رول نمبر ۹۶۳ ―― ؟

یس پلیز ۔

جی ہاں میرا ہی نام سیتا ہے ۔

آمار سنہیر ― آمار پریو سیتا ۔

ہائی سیتا ―― ہنی ―

سیتا میری جان

جانِ من ۔

سیتا ڈارلنگسٹ ۔

بتاؤ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے ؟

میری خواہش ؟ وہی کہ سری لنکا کے جواہرات کے سنہر رتن پورہ کے سارے ہیرے مجھے مل جائیں ۔

پھر دیکھو تم سب کا کیسا بیڑا کرتی ہوں ۔

ہائے ہائے میں بڑی سخت پٹی بورژوا ہوں ۔

ہلو ہلو ہلو ـــ آوازیں ـــ کیسی کیسی آوازیں۔ ٹیلی فون کے تاروں کی جھنجھناہٹ ریل کے پہیوں کی چھک چھک چھک چھک چھک ـــ موٹر بوٹ کی گھر گھر۔ طیارے کے انجن کی زوں زوں زوں گھوں گھوں شائیں شائیں ہائیں ماہیں لیٹش جیپ پیاٹ ریپ ریپ اولڈ انڈین پینٹرس ڈیمپلاٹ فلفٹ ظہر اختر ڈگلس اسکاٹ ـــ رواں رواں دعائیں دعائیں چھو چھو ـــ ڈھولک کی آواز ـــ جہیز میں بیٹا لادی لے لیجئے ـــ بیگم صاحب آج کیا پکے گا۔ تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار۔

ڈھول۔ بنارس کے مندروں کی روشن چوکی۔ نسیم کی بارات کا بینڈ۔ مہاراجہ کی آئے گی بارات۔ ٹھنڈے کے ٹھنڈے ـــ محرم کا تاشہ ـــ جعفر باندی کا نوحہ ـــ اے بلبل کو گل پسند گلوں کو ہوا پسند ـــ ہم بوڑھا ہیں کو۔ ہے خاک شفا پسند ـــ مجھ کو آرام پسند نہیں کربلا پسند نہیں کربلا ـــ ہمیں کربلا پسند ـــ راون جلتا ہے۔ سیتا جلتی ہے۔ لنکا جل کر راکھ ہو گیا۔

ہرا ہے بھسما۔ راتی کی ہنسی۔ جمیل کا قہقہہ۔ شراب کے گلاسوں کی کھنکھناہٹ۔ دو بوڑھے میاں بی بی جو بروکلین برج پر کھڑے چپکے چپکے کسی بات پر ہنستے تھے۔ بچوں کی طرح مسرور ـــ میں مر جاؤں گی ـــ موت ـــ اور میری ٹانگیں پیچھے کی اور کر دی جائیں گی تاکہ میری آتما ناؤ میں سوار ہو کر ستلج ہو جہاں ساگر پر سے گزر سکے۔ چتا کے شعلے۔ موم بتیاں۔ تازہ پھول۔ قبر کی تازہ مٹی۔ تیسی پور کا قبرستان جہاں جمیلہ باجی کو دفن کرنے لے گئے تھے۔ ارے جمیلہ باجی کون تھیں ـــ ؟ اور ان کے میاں جو دھائیں دھائیں سوں سوں بھوں بھوں رو رہے تھے۔ بلقیس نے بتایا کہ اسی سال دوسری شادی رچانے کی فکر میں لگ گئے۔ سوامین ـــ آئی مین آر سوائین ـــ جمیل ڈارلنگ یہ اب بھی راتوں کو اکثر ڈر پریشان خواب دیکھتی ہوں کہ میں ایم۔ اے کا پرچہ کر رہی ہوں جو کسی ایسی زبان میں لکھا ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور تین گھنٹے پورے ہونے والے ہیں ـــ دو گھنٹے ـــ ایک گھنٹہ ـــ بیس منٹ ـــ پانچ منٹ ـــ ایک منٹ ـــ

GIVE ME FIVE MINUTES MORE

ONLY FIVE MINUTES MORE

ONLY FIVE MINUTES MORE OF YOUR CHARM

GIVE ME FIVE MINUTES MORE

IN — YOUR — ARMS —

SWINE. ALL MEN ARE SWINE

ہاتھی کی شکل کی چٹان ـــــ اونچی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کرو تو پاؤں رپٹ جاتا ہے۔ میں سگریٹ سے بنی اونچی چٹان پہ جاکر چھپوں تب بھی پکڑی جاؤں گی۔

آپ کی تعریف ـــ؟

جی میں ـــ؟ مسٹر بیچ لکٹر آری ہوٹل۔

اور آپ ـــ؟ شری اشوک کا ہوٹل ـــ؟ پدھاریے، پدھاریے۔

انڈیا دیٹ از بھارت نے مہاراج دھیراج اشوک کے ستون دریافت کئے۔ اشوک چکر دریافت کیا۔ اشوکا ہوٹل ندیا فت کیا۔

اور آپ کی تعریف؟

یہ میری نند ہیں۔ نند بجلی بسنت۔ بلقیس انور علی ـــ نمبر ون ایکٹریس پروڈیوسر انٹلکچوئیل۔ دلّی کے دل کی دھڑکن۔ اے جمنی بیگم ـــ امرآو بیگم ـــ کھیتو بیگم ـــ سب جتنے ادھر آؤ۔ اے یہ کالا نوجن کیا مچی ہے جمیل کی دُلہن اپنی ایڑی دیکھو کہیں نظر نہ لگ جائے۔ رتم پر ٹیکہ پڑے بھوری بیگم ایسا پانیچہ بھاری کرکے بیٹھیں کہ بس اب آئیں دوگھڑی کے لئے چھدّ اتارنے ـــ بندتی بوا ـــ اے بندتی توا کل سے جمیل بھیا کا پنڈا پھیکا ہے۔ میرے تو دل کو پنکھے لگ رہے ہیں۔ رات میں نے مولا مشکلکشا کے نام کا روپیہ دھو کے اٹھایا ـــ اور سنو کیا کیا کھیتو بیگم نے بندتی نگوڑی پہ توتے چوڑے جیسے خود تو بڑی ست ونتی بیوی نا ہیں ـــ عروج کی دُلہن بڑی دھونسال ہیں اُن کے بھرّے میں بھی نہ آیئے گا اماں ـــ وہ کسی کو کیا کھلائیں گی ـــ مانگہ تنگی بسیا کہ بھوکی ـــ رات مولا مشکلکشا خواب میں تشریف لائے۔ جمیل بھیا ـــ اے جمیل بھیا ـــ

I AM A COW

مسٹر سینڈ مین ـــ مسٹر سینڈ مین ـــ میرے جی کے درندا بن میں ـــ

IN MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

TO NIGHT MY LOVE — TONIGHT MY LOVE —

بُدھ سمادھیوں پر رات اُتر آئی ہے۔

ارے یہ رات نے پھر مجھ پر حملہ کر دیا ـــ؟

ہوا کتنی تیز ہو گئی۔

ہوا پراکرم سمندر پہ بہتی آرہی ہے۔ کالتینی گنگا پر ہو رہی ہے۔ کولمبو کی سمت بھیسر بھیسر رُرتی ہوئی رواں ہے۔ ہوا۔

صبا۔

چاند۔

چاند صندل کی ڈالیوں پہ سوتا ہے۔ اُن لوگوں کی آنکھوں میں جو پرانی کافوں میں سو رہے ہیں۔ صدیوں کی نیند ہے — ڈورین فرنینڈیز ڈی کوسٹا سمر سنگھا رونالڈ لبار۔ رتن سنگھ جے سوریہ۔ گن پال گن وردن۔ ان کی آنکھوں میں جنگل کی نیند ہے۔ زرہ بکتر پہنے پرتگالی ڈچ قلعوں پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ انگریز پلانٹرز کی روحیں مہا آبنیا کی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی سیاحوں سے بھیک مانگ رہی ہیں۔ چاند اب مہاویلی گنگا میں نہا رہا ہے۔ ہاتھی جو ہزاروں برس کی جنگل میں مقید روحیں ہیں۔

چاند۔

رات۔

رات سیتا مہارانی کے بال ہیں۔ راتم گھوڑے کا ر الزابدن ہے۔ کالی کا چہرہ ہے تخلیق سے پہلے کی تاریکی۔ ہم سب ہر وقت اسی تخلیق سے پہلے کی تاریکی میں مقید ہیں اور سمجھتے ہیں بڑا ایوولیوشن ہو گیا۔ سیاہ سیاہ سیاہ رات۔

میں نے اپنی نیند نیویارک میں کھو دی۔ جنگلوں میں تاڑ کے سیاہ درخت اونچے ہو کر سرخ آسمان سے جا لگے۔ ممی تلک کا کھنڈر دانت لگائے ہنستا ہے — ہی ہی ہی — کنول کا تالاب بے خواب آنکھ کی طرح کھلا ہوا ہے۔ لیلاوتی — روپ وتی — ستیاوتی —

رن کوٹ وہار کے ستوپ میں ہڈیاں ایک دوسرے سے انٹرنیشنل سچوایشن پر گفتگو کر رہی ہیں۔ پیرا کرمباہو اول ایشیا میں کمیونزم کا پانچواں باب لکھ رہا ہے۔ جنگل نے مجھے کھا لیا۔

میرے گہنے کیسے کیسے تھے۔ چوہڑی خالہ نے مجھے رونمائی میں دیئے۔ دُلہن کے گہنے — رتن پورہ کے سنار جڑاؤ چندن ہار بنا رہے ہیں۔ روشنی۔ روشنی — چمک چمک چمک — جنگل کی آوازیں، چڑیوں کی، سمندر کی، سڑکوں کی، ہاربر کی، پہاڑوں کے سناٹے کی آوازیں۔

آواز —

صرف ایک ہے۔

یہاں آؤ — میرے پاس آؤ — میرے پاس آؤ — آؤ —

(۱۵)

"میں ابھی ابھی آ کر پہنچی ہوں — کیا نیوز ہے —" سیتا نے ماؤنٹ لیوینیا میں اپنے کمرے

شام کے وقت فون کیا۔

"اوہ ___ ہلو ستیا ___ اِتم آگئیں!! ہاؤ ونڈرفل ___ اجازت ہو تو اوپر تمہارے کمرے میں آجاؤں۔"

"آیئے ___"

وہ پانچ منٹ بعد کمرے میں موجود تھا ___ "تم تو بے حد پُرشاش معلوم ہو رہی ہو۔جنگل کی ہوا نے تم پر بہت اچھا اثر کیا۔ آئی ایم سو گلیڈ!"

"بیٹھئے ___"

وہ پہلی دفعہ اس کے کمرے میں آیا تھا اور ذرا گھبرایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کا ایک چکر لگا کر وہ کونے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پلنگ کے کنارے بیٹھی ننگ میں مصروف رہی۔

"کیا بُن رہی ہو؟"

"راجَل کے لئے سوئیٹر کوٹ ___ میں نے سوچا تھا مکمل کر کے جمیل کو دیدوں گی کہ لے جاکر راجَل کو دے دیں ___ مگر مجھے معلوم ہی نہیں اب وہ کتنا بڑا ہے۔ پتہ نہیں یہ اُسے آئے گا بھی یا نہیں۔ اٹکل سے بُن رہی ہوں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسنے پوچھا ___ "اور بتاؤ ___ پھر کیا ہوا؟"

"پھر ___؟ پھر ___!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم ایک ہفتہ بے طرح یاد آئیں۔ کانفرنس میں کسی طرح جی نہ لگا میرا ___ نہ جانے رپورٹ میں کیا انٹ سنٹ لکھ کر آیا ہوں۔ تمہارا سفر بہت دلچسپ رہا ___؟"

"بہت دلچسپ ___" اسنے سلائیاں تبدیل کیں۔

"امریکن بڑھیاں کیسی تھیں؟"

"امریکن بڑھیاں تو نہیں ایک امریکن ٹورسٹ پولو تروا سے ساتھ لگ گیا تھا۔ اور وہ بوڑھا نہیں تھا ___"

YOU ARE A BITCH ___ عرفان نے یکلخت زیرِ لب کہا اور چپ ہو گیا۔

"آپ نے اپنی عادت کے مطابق پوچھا نہیں کہ پھر کیا ہوا ___" چند لمحوں کی مکمل خاموشی کے بعد ستیا نے پوچھا۔

"تم خود ہی بتاؤ۔"

"اور — وہ امریکن آرکیالوجسٹ تھا۔"

"پھر تو تم نے خوب اس کے ساتھ لوتھاگی تاریخ ڈسکس کی ہوگی — جیسے تم نے مجھے سندھ کی
[illegible]ری پڑھائی تھی۔ —"

"ہاں —" وہ بے تعلقی سے نٹنگ میں مشغول رہی۔

وہ کچھ دیر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر یکبارگی آگ بگولا ہو کر صوفے سے اٹھا۔ اسکے ہاتھوں
[illegible]سلائیاں اور اون جھپٹ کر ایک طرف پھینکی اور اسے کھینچتا ہوا دریچے میں لے گیا۔

"تاریخ ڈسکس کرنے کے علاوہ اور کیا ہوا —؟" اسنے گرج کر پوچھا۔

وہ سفید پڑ گئی۔

"میں پوچھتا ہوں اور کیا ہوا — بولتی کیوں نہیں؟"

دفعتاً وہ غصے سے سرخ ہو گئی — "شٹ اپ — آپ کو اس طرح کے سوال کرنے کا کیا حق ہے؟
حد سے آگے بڑھے جاتے ہیں —"

وہ ہونٹ کاٹتا رہا — "حق تو تمہارے اوپر قانونی شوہر کا بھی کچھ نہیں ہے جسے چھوڑ کر تم وہاں
رنگ رلیاں منا رہی ہو —"

"شٹ اپ عرفان —" وہ پوری قوت سے چیخی — "گیٹ دی ہل آؤٹ آف ہیر —
[illegible]آؤٹ — گٹ آؤٹ — ورنہ میں ابھی — میں ابھی گھنٹی بجا کر بیرے کو بلاتی ہوں —" وہ
[illegible]پا لرز رہی تھی۔

ایک لمحے تک وہ ساکت کھڑا اسے تکتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم رکھتا دروازہ کھول کر کمرے سے
چلا گیا۔ دروازے کے باہر جا کر اسنے بڑی نارمل اور نیچی آواز میں سکون کے ساتھ کہا۔

"بڑی کوششوں کے بعد جمیل نے ملاقات کا وقت لیا ہے۔ آخر کار وہ آج رات کو ملنے کے لئے تیار
ہے ہیں۔ میں ان سے گال فیس ہوٹل میں ڈنر پر ملاقات کر رہا ہوں — اس کے بعد ان کا جواب تم تک
دوں گا — گڈ نائٹ —"

رات کو بارہ بجے کے بعد اس کے سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی دیر تک بجتی رہی مگر اس نے فون
[illegible]اٹھایا۔

(۱۶)

وہ رات بھر روتی رہی تھی۔ اتنا وہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اس رات بھی نہیں روئی تھی جس کی صبح وہ اور

اس کے خاندان والے کراچی سے کاٹھیاواڑ روانہ ہوئے تھے ۔۔۔ یا جب نیویارک میں جمیل نے اسے اسکے گھر سے باہر نکالا تھا۔ قرولباغ میں وہ اکثر راتوں کو جگ کر رانی کے لئے چپکے چپکے رویا کرتی تھی۔ اور صبح صبح آنگن میں لگے ہوئے نلکے پر جاکر آنکھوں پر خوب اچھی طرح چھپکے مارتی تھی۔ تاکہ اس کے باپ کو اس کے الم کا پتہ نہ چلنے پائے۔ مگر اس وقت ماؤنٹ لیوینیا کے اس خوبصورت کمرے میں اس کے آنسو دیکھ کر پریشان یا رنجیدہ یا پشیمان ہونے والا کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ اطمینان سے بستر پر لیٹی رہی۔ اس کے سامنے سارا دن، ساری زندگی، ساری دنیا خالی پڑی تھی۔ بھیانک تاریک خلا کا طوفانی سمندر جس کا کہیں پہ کوئی کنارا نہ تھا ۔۔۔ آٹھ بجے کے قریب بیرہ ناشتہ لے کر آیا۔ مہربان، شفیق مسکراہٹ والا بوڑھا سنہالی جو اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر متفکر نظر آیا۔ کیونکہ وہ بھی دو جوان بیٹیوں کا باپ تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر وہ چپ چاپ باہر چلا گیا۔

دس بجے کے قریب تیار ہو کر اسنے ریزرویشن کے لئے ہوائی جہاز کے دفتر فون کیا اور نیچے ٹیرس پر اُتر آئی۔ سمندر پر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی چمک آنکھوں کو بُری لگ رہی تھی۔ ساحل پہ چند انگریز بچے ریت کے قلعے بنانے میں مصروف تھے۔ بہت دور مونگوں کے ہار بیچنے والی عورت سر جھکائے ایک سمت کو جا رہی تھی۔ اور گیلی ریت پہ اس کے پیروں کے نشان بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔ دن بڑا اجاڑ تھا۔ سارا ماؤنٹ لیوینیا سارا کولمبو، ساری دنیا اجاڑ تھی۔ اجاڑ اجاڑ اجاڑ۔

چند منٹ ریلنگ کے سہارے کھڑے رہنے کے بعد اسنے طے کیا کہ دوپہر بھر شہر کا چکر لگاتی رہے اور پیکنگ کرنے کے بعد وقت سے بہت پہلے ہی ایئرپورٹ چلی جائے۔ اسی وقت ہال پورٹر نے آکر اس سے کہا کہ ریسپشن میں اسکے لئے فون رکھا ہے۔

۔۔۔ ہوائی جہاز کے دفتر نے اسے اطلاع دی تھی کہ مختلف کانفرنسوں میں آئے ہوئے مندوبین واپس جا رہے ہیں اس لئے تین دن تک جگہ ملنا بڑا مشکل ہے۔

اسنے بیگ کھول کر ٹریولرز چیک کے کتابچے پر نظر ڈالی۔ چیک ختم ہونے والے تھے۔

"میڈم آپ نے کیلانیا مندر دیکھ لیا ۔۔۔؟" ریسپشن کلرک نے اس سے پوچھا۔

"نہیں اب جاکر دیکھوں گی ۔۔۔" اسنے چونک کر جواب دیا اور باہر چلی گئی۔

ڈرائیو آکر اسنے ایک ٹیکسی والے کو اشارے سے بلایا۔

"کیلانیا ٹمپل ۔۔۔"

"سوری میڈیم ۔۔۔" اسنے سر ہلا کر کہا۔

"کیوں۔۔؟
"شاید کرنیولنگ جانے بشہر میں ٹال سنبھالی جھگڑے کا اندیشہ ہے ۔۔"
او مائی گاڈ ۔۔۔ وہ ایک درخت سے ٹنگ گئی۔۔۔ یہاں بھی ۔۔

اب کیا کروں ۔۔؟
یکایک اسے رتن سنگھ جے سوریہ کا خیال آیا۔ اس اجنبی ملک میں وہ عرفان اور لیزلی مارٹش کے علاوہ صرف تیسرے آدمی جے سوریہ سے ملی تھی۔ شاید وہ کوشش کرکے ہوائی جہاز میں جگہ دلوا دے۔
اندرونٹ کرا سنے جے سوریہ کو فون کیا۔ اس وقت جے سوریہ کے اخبار کے دفتر میں ایک ہنگامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اس کی آواز سنکر کافی متعجب ہوا۔
"ہلو ۔۔ ہلو ۔۔ ڈاکٹر رضی چندانی ۔۔ آپ نے کیسے یاد کرلیا؟"
اسنے ریزرویشن کے متعلق پوری بات بتائی۔
"اوہو ۔۔ سنیئے ۔۔ اس وقت میں بے حد مصروف ہوں ۔۔ آپ نے صبح کا اخبار پڑھ لیا ہوگا"
اس نے صبح کا اخبار نہیں پڑھا تھا۔
"اگر آپ ہی زحمت کرکے یہاں چلی آئیں ۔۔ مسٹر عرفان کب واپس جا رہے ہیں؟"
"پتہ نہیں ۔۔"
"اوہ ۔۔ اچھا آجایئے ۔۔ میں آپ کا منتظر ہوں ۔۔"

اخبار کے دفتر میں ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ ٹیلی پرنٹرز اور ٹائپ رائیٹروں کی لگاتار کھٹ کھٹ، سب اڈیٹروں اور رپورٹروں کی بھنبھناہٹ اور ٹیلی فون ایکسچینج پر بیٹھی ہوئی کالی لڑکی کی بے انتہا مصنوعی شیریں آواز میں یکساں تنکا دیپ ۔۔ گڈ مارننگ کی تکرار نے اس کی دل کی دھڑکن میں اور اضافہ کر دیا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد چیف ایڈیٹر نے اسے اندر بلوا بھیجا۔ وہ ہال سے گذرتی ہوئی جے سوریہ کے کیبن میں داخل ہوئی۔
وہ ایک لمبے چوڑے ڈیسک پر بیٹھا دو ٹیلی فونوں پر بیک وقت بات کر رہا تھا۔ اور بیچ بیچ میں انٹرکام پر کچھ بولتا بھی جاتا تھا۔ وہ کونے میں رکھی ہوئی کرسی پر ٹک گئی۔ جے سوریہ نے ایک طرف کا ٹیلی فون بند کرتے ہوئے گھومنے والی کرسی اس کی طرف ذرا سی پھیر کر اسے ایسی عجیب نظروں سے دیکھا کہ وہ پسینہ پسینہ ہوگئی۔ ۔۔ ڈرٹی اولڈ مین ۔۔ اسنے شدید کراہیت کے ساتھ زیر لب کہا۔ جے سوریہ نے دوسرا

ریسیور بھی ہاتھ سے رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

"گڈ مارننگ ڈاکٹر مرجیدانی ——! اجازت دو تو تمہیں سیتا کہہ کر پکاروں —— آرام سے بیٹھ جاؤ —— کل رات مجھے عرفان نے ساری بات بتائی ——"

دوسرے فون کی گھنٹی بجی۔ اور اسنے فوراً اس پر سنبھالی میں گفتگو شروع کر دی ——

سیتا کو چکر آگیا —— اسنے مضبوطی سے کرسی کا ہتھا پکڑ لیا۔ اور چند لمحوں کے لئے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں —— کیوں نہیں زمین پھٹتی تاکہ میں اس میں سما جاؤں —— مگر چونکہ یہ سیتا اور ساوتری کی دنیا نہ تھی۔ کالی یگ تھا اس لئے نہ زمین پھٹی نہ سیتا اس میں سمائی۔ دوسرے لمحے اسنے پرس سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ جلایا۔

جے سوریہ فون پر بات ختم کر کے اس کی طرف مڑا ——" اوہ معاف کرنا —— میں نے تمہیں سگریٹ پیش نہیں کیا؟" —— اسنے سیتا کو ذرا غور سے دیکھا —— وہ بے انتہا سفید نظر آرہی تھی —— اس بیچاری کے اعصاب ضرورت سے زیادہ کمزور ہیں۔ اسنے دل میں سوچا پھر اس سے کہا "گھبراؤ مت —— میں عرفان کا پرانا رازدار ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ وہ اور میں جنگ سے پہلے کئی سال جرمنی میں اکٹھے رہے ہیں —— اس وقت تم تو بہت چھوٹی سی بچی رہی ہو گی ——" اسنے ایک بار پھر سیتا کو انہی لرزہ خیز نظروں سے دیکھا —— "عرفان کی نجی اور جذباتی زندگی کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں —— تمہارا راز بھی میرے پاس محفوظ رہے گا —— بعض دفعہ جرنلسٹوں پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے!! —— اچھا —— اب ایک خوشخبری سن لو —— آج کرفیو نہیں لگ رہا ہے —— کافی پیو گی ——؟" اسنے گھنٹی بجائی۔

"نہیں —— شکریہ ——" سیتا کو اپنے سارے وجود سے انتہا نفرت محسوس ہوئی۔ میں یہاں کیوں آئی ——

"میں —— ذرا —— وہ —— ہوائی جہاز کی سیٹ ——" اس نے شدید نقاہت کے ساتھ کہا۔

"شیور —— شیور —— مائی ڈیر —— مجھے فوراً کل کا اڈیٹوریل لکھنا ہے —— اپنے سکریٹری سے کہتا ہوں۔"

وہ انٹرکوم کی طرف جھکا ——" رتنا —— ذرا مارٹن کو بھیج دو —— اور تم بھی آؤ۔"

دوسرے لمحے اس کی سنبالی سکریٹری اور کلرک اندر آئے۔ ان کے پیچھے نیوز اڈیٹر لپکا ہوا آیا اور ڈیسک پر جھک کر اس سے جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔

ایک بار پھر جے سوریہ سیتا کی موجودگی فراموش کر کے اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک

بیٹھی چھت کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی ـــ اس کمرے میں گھنگھریالے بالوں اور گہری سانولی رنگت کا ایک تامل نوجوان کھڑکی کے پاس کھڑا نیچے سڑک پر ٹریفک دیکھ رہا تھا ـــ شاید وہ بھی جے سوریہ سے ملاقات کا منتظر تھا۔ سیتا نے زینے کی طرف جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ جے سوریہ کی سکریٹری اسے بلانے کے لئے دوڑی آئی۔ اور اسے کیبن میں دوبارہ جانا پڑا۔ اتنے میں جے سوریہ نے انٹرکام پر "اچھا رتنا ـــ مسٹر راما سوامی کو آنے دو ـــ"

پردہ اٹھا اور وہی تامل نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے متبسم نظروں سے سیتا کو دیکھا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اپنے اسٹاف سے باتیں کرتے کرتے کرسی سیتا کی طرف گھما کر جے سوریہ نے کہا "سیتا یہ میرا بے حد عزیز نوجوان دوست راما سوامی ہے۔ ہمارے ملک کا مشہور سیاسی کالم نگار ہے۔ ہمارے مخالف اخباروں کے لئے لکھتا ہے۔ لیکن مجھ ایسے فرقہ پرستوں سے بھی کبھار مل لیا کرتا ہے۔ بیٹھو ـــ رامو ـــ ہماری ہندوستانی مہمان ڈاکٹر مس چنڈانی سے ملو ـــ ہندوستانی ہونے کے ناطے ممکن ہے یہ تمہاری ہم خیال نکلیں ـــ!" اس تعارف کے بعد جے سوریہ پھر اپنی گفتگو میں منہمک ہو گیا۔

راما سوامی نے سیتا کو نمستے کیا اور بڑی شائستہ بے تکلفی سے اس سے باتیں کرنے لگا۔ کیا وہ بمبئی سے آئی ہے؟ اچھا! دہلی سے ـــ وہ بھی دہلی میں نامہ نگار کی حیثیت سے کئی سال رہ چکا ہے ـــ دہلی میں وہ فلاں فلاں صحافیوں کو جانتا ہے ـــ؟ وغیرہ وغیرہ، اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا آدھا خاندان مدراس میں رہتا ہے۔ مگر وہ خود "اوورسیز انڈین" ہے۔

اور اس وقت دفعتاً ایک بڑی انوکھی بات ہوئی ـــ اجنبی سنہالیوں کے مجمع میں گھرے ہوئے، سیتا نے اپنے ہم عمر اس تامل نوجوان کے لئے ایک عجیب سی یگانگت محسوس کی ـــ جس طرح صدیوں پرانے، ابدیت پرست پولونروا کے سنسان کھنڈروں کے درمیان اس نے جدید انسان ـــ لیزلی مارش ـــ کے لئے اس جذبے کو محسوس کیا تھا ـــ کیونکہ وہ اس کی مانوس، بیسویں صدی کی، مغربی، مادہ پرست دنیا کا ایک فرد تھا ـــ پولونروا ابدیت تھی، ڈاکٹر لیزلی ونسنٹ مارش تاریخی وقت ـــ جس طرح اس لیزلی مارش کے مقابلے میں پہاڑی راستوں پر سے گذرتے ہوئے اپنے بالوں کے جوڑے بنائے اور سارنگ پہنے سنہالی کسان مردوں اور عورتوں کے لئے یگانگت محسوس کی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی اپنی تہذیب کا ایک حصہ تھے ـ اور لیزلی مارش غیر ملکی، مسیحی، مغربی انسان تھا ـــ جس طرح ماؤنٹ لیونیا کے ڈرائنگ ہال میں بیٹھے ہوئے فیشن ایبل سنہالی مردوں اور عورتوں کے مقابلے میں پاکستان سے آیا ہوا عرفان بالکل اس کا اپنا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے برعکس

کا بسنے والا تھا اس کی تہذیب کا ایک حصہ تھا ـــــ انسان اپنی پیچیدہ زندگی میں بیک وقت کتنی مختلف اور متضاد سطحوں پر زندہ رہتا ہے۔

اب راما سوامی بھی بے سوریہ کے ساتھ کسی بحث میں الجھ چکا تھا۔ کیبن میں باتوں کا شور بے حد بڑھ گیا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اچانک بے انتہا متوحش ہو کر وہ کیبن سے باہر نکلی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گئی۔

وہ دکانوں کے سامنے برآمدے میں بلا مقصد اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ کتابوں کے اسٹال پر جا کھڑی ہوئی اور اسٹال والے سے آئی۔اے سی کے دفتر کا پتہ دریافت کیا۔

"چلیئے میں آپ کو وہاں پہنچا دوں ـــ"

اسنے پلٹ کر دیکھا۔ راما سوامی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"شکریہ ـــ مجھے صرف پتہ سمجھا دو، میں خود وہاں پہنچ جاؤں گی ـــ"

"تمہارے چلے آنے کے بعد مسٹر بے سوریہ بہت پریشان ہوئے کہ تم کہاں غائب ہو گئیں۔ مگر اس ٹامل سینہالی کرائسس کی وجہ سے وہ اتنے چکرائے ہوئے ہیں کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اسوقت جب تم اٹھ کر چلی آئیں وہ فون پر اپنے بڑے بھائی سے بات کر رہے تھے جو کابینہ میں وزیر ہیں۔ آج ان کی وزارت بھی خطرے میں ہے۔"

وہ برآمدے میں سیتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"یہ جھگڑا کیوں ہو رہا ہے۔" سیتا نے گھڑی دیکھتے ہوئے بے خیالی سے سوال کیا۔

"آؤ دس منٹ کہیں بیٹھ کر کافی پی جائے ـــ تم آج ہی دلّی واپس جانا چاہتی ہو؟"

وہ ایک قہوہ خانے میں داخل ہوئے جہاں یونیورسٹی کے طالبِ علم اور اخبار نویس زور شور سے بحثوں میں مصروف تھے۔ یہاں بھی بڑا شور ہو رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ایک میز پر بیٹھ گئے۔ سیتا آہستہ آہستہ انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں دبانے لگی۔ کتنا شور تھا، ساری دنیا میں کتنا رولا مچ رہا تھا۔

"اوہ ـــ معاف کرنا ـــ میں ابھی آتا ہوں ـــ" اتنا کہہ کر رام تیزی سے مرشد آبادی ریشم کی ساری میں ملبوس ایک لڑکی کی طرف گیا جو اسی وقت قہوہ خانے سے باہر جا رہی تھی۔ دروازے کے نزدیک ٹھٹھک کر وہ دونوں چند منٹ تک جلدی جلدی ایک دوسرے سے کچھ کہتے رہے۔ لڑکی نے پلٹ کر قہر بھری نگاہوں سے سیتا کو دیکھا اور باہر چلی گئی۔ رام رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا واپس آ کر بیٹھ گیا۔

"یہ میری منگیتر تھی ـــــ" سیتا کی سوالیہ نظروں سے نظریں ملا کر اس نے ذرا جھینپتے ہوئے جواب دیا۔
وہ کتنا کم عمر اور جوشیلا تھا!
وہ اس کا ہم سن تھا۔ وہ اس کی زبان، اس کا جوش، اس کا جذبہ سمجھ سکتی تھی۔
"تھی ـــ کیا مطلب؟ اب نہیں ہے؟" سیتا نے تبسم کے ساتھ پوچھا۔
"اس کا انحصار تازہ ترین سیاسی صورتِ حال پر ہے۔"
"اگر تم کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے سمجھاؤ کس طرح ـــ؟!"
قہوہ کی پیالی کو اداسی سے دیکھتے ہوئے اس نے بتایا ـــ "یہ لڑکی سنہالی بدھسٹ ہے ـــ کیونکہ وہ خود تامل ہندو گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے لڑکی کے ماں باپ اس شادی کے خلاف ہیں۔ لڑکی بالکل غیر سیاسی ہے۔ مگر وہ اسے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کا، لڑکی کا باپ یو۔ این۔ پی کا لیڈر بھی ہے اور اس کا سارا فیوڈل خاندان بے انتہا دولت مند، بے انتہا رِی ایکشنری اور بے انتہا مذہب پرست ہے۔
"پچھلے ہفتے میں اس سے لڑ بیٹھا ـــ میں مصر تھا کہ کسی دوسرے شہر جا کر سول میرج کر لیں اور اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے مدراس چلے جائیں، مگر وہ اس چیز کے لئے تیار نہیں ـــ ڈرپوک گلہری کہیں کی بجائے کیوں میں اپنی داستان سنا کر بور کر رہا ہوں تمہیں ـــ"
"مجھے اپنے متعلق اور بتاؤ ـــ" سیتا نے اس کے لئے قہوے کی دوسری پیالی بناتے ہوئے کہا۔
"تم یہاں نیٹو لوگوں سے ملیں؟"
"سوائے جے ستوریہ کے اور تو کسی سے نہیں ملی۔ اور ایک ڈچ برگر لڑکی کا گانا سنا ـــ"
"یعنی مسٹر جے ستوریہ کے علاوہ میں پہلا خالص نیٹو ہوں جس سے آپ کی مڈبھیڑ ہوئی؟ ـــ ڈچ برگر یہاں کے اینگلو انڈین ہیں ـــ اتنے دنوں اور کیا کیا ـــ؟"
"بس سارا وقت نوارا ایلیا میں گذر گیا۔"
پھر تو تم صحیح معنوں میں غیر ملکی سیاح ہو! تمہیں مسٹر جے ستوریہ نے اپنے ڈنر میں مدعو کیا تھا؟"
"ہاں تمہیں کیسے معلوم؟"
"شاید تم کو اس کا اندازہ نہیں کہ کولمبو چھوٹا سا شہر ہے اور تم نے اس میں کافی کھلبلی مچا رکھی ہے۔ میری ایک رفیق کار نے اپنے اخبار کے سوشل کالم میں تمہارا ذکر بھی کیا تھا ـــ ماؤنٹ لیوینیا میں ٹھہری ہوئی دلفریب ہندوستانی خاتون جو بے انتہا خوبصورت ساریاں باندھتی ہیں۔ وہ تمہارا انٹرویو بھی کرنا چاہتی

تھی مگر تم کسی صورت دستیاب نہ ہو سکیں !"

گڈ گاڈ !"

رام نے نظر بھر کر اُسے دیکھا "تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملیں ؟"

خدایا —— خدایا —— یہ بھی ——

"میرا مطلب ہے —— میں محض اتنا کہہ رہا ہوں کہ چند روز قبل تم سے ملاقات ہو جاتی تو میں تمہیں یہاں کی اصلی دھڑکتی ہوئی زندگی کی جھلک دکھلاتا، تمہیں عام گھرانوں میں مدعو کرتا ۔ اپنی بہنوں سے ملواتا"

"اور اپنی منگیتر سے نہیں !"

"وہ میرے گھر کب آتی ہے " وہ پھر غمگین ہو گیا " اور میں یہ تمنا کر رہا ہوں کہ وہ اپنا محل چھوڑ کر بہت تین کمروں کے فلیٹ میں آ رہے گی —— !! ستیا تم نے کینڈی کے فیوڈل طبقے کی اور یورپین پلانٹرز کی زندگی نہیں دیکھی —— برطانیہ کی حسین ترین کراؤن کالونی " واقعی ان لوگوں کے لئے جنت تھی ۔ اور اب بھی ہے ۔ تم تو مڈل کلاس ہونا ؟"

" ہاں بلکہ لوئر مڈل کلاس " ستیا نے جواب دیا ۔

" میری بے انتہا ارسٹوکریٹک دنیا ابھی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم ہندوستان کی کس فلائنگ جہاز کی کو کافی پلا رہے ہو —— !!"

ستیا ہنس پڑی ۔

" آج صبح کی خبریں تو بڑی پریشان کن ہیں ۔ شمال میں اتنا فساد ہوا " اسنے رام کے ہاتھ سے اخبار لے کر کہا ۔

میز کے برابر سے گذرتے ہوئے چند دوستوں کو دیکھ کر وہ مسکرایا ۔ اتنا بد شکل سیاہ فام شخص ۔ مگر اس کے چہرے میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ اس کے دانت بے حد خوبصورت تھے ۔ اور وہ ہنستا ہوا بڑا اچھا لگتا تھا ۔ ستیا اُسے بے دھیانی سے دیکھا کی —— "ہیں —— بتاؤ —— " اسنے سر نیہوڑا کر کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا —— " تمہارے یہاں اتنا جھگڑا کیوں ہوتا ہے ؟ ایک ملک کے باسی ہو کر آپس میں جھگڑتے ہو ۔"

" سب کچھ جانتے ہوئے اس قدر جہالت کا سوال شاید تم اس لئے کر رہی ہو کہ واقعی اب بہت بور ہو چکی ہو —— تمہارے لئے کافی اور منگوائی جائے —— بوائے " اُسنے آواز دی —— " تمہارے یہاں جھگڑا کیوں ہوتا تھا ؟ تم لوگ بھی ایک ملک کے باسی تھے ۔ تم اور ہم دونوں سرمایہ دار لوبرژوا سیاست کے شکار ہیں ۔"

اس کے لہجے کی تلخی نے سیتا کو یاد دلایا۔ ایک بار نیویارک میں جمیل کا تعارف ان کے بڑے بھائی کے ایک ہم وطن سے جب کرایا گیا تھا تو جمیل نے اسی تلخی کے ساتھ جواب دیا تھا "جی نہیں — میں اب بھی اُسی ملک کا آزاد شہری ہوں جسے آپ حضرات چند سال اُدھر جنت نشان کہتے تھے"

"تم تامل لوگوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مین لینڈ کی طرف دیکھتے ہیں — جس طرح سارے اوورسیز چینی مین لینڈ چائنا کی طرف دیکھتے ہیں —" سیتا نے اُس سے کہا۔

"میں نے دہلی کے اخباروں میں لنکا کے انڈین پرابلم کے متعلق سلسلہ وار مضمون لکھے تھے۔ تم کو ان کی کٹنگ بھیجوں گا — شام کو میرے گھر آکر کھانا کھاؤ —"

"ضرور رام! تمہیں پتہ ہے میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ دنیا بھر میں جہاں جہاں اوورسیز انڈین رہتے ہیں ان کو جاکر دیکھوں — ویسٹ انڈیز — ماریشس — افریقہ — فجی — ملایا — اور جانے کہاں کہاں — مدتوں سے اپنے وطن سے ہزاروں میل دور رہتے ہوئے ان کی زندگیاں کیسی ہوں گی۔ ان کی تہذیب۔ طرزِ زندگی۔ ان کی نفسیات۔ میرا مضمون سوشیولوجی ہے۔ اسکے علاوہ — میرے ناخن میں کیڑا بھی ہے!" اس نے دوبارہ گھڑی پر نظر ڈالی۔

"تمہیں کولمبو سے بھاگنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ تمہارے ایسے خوبصورت مہمان ہمارے یہاں روز روز کب آتے ہیں —"

"کیوں؟ ہمارے ہندوستانی فلم اسٹارز اور ڈانسرز تو یہاں اکثر آتے رہتے ہیں!" سیتا نے اس کی آواز کی بڑھتی ہوئی جذباتیت سے گھبرا کر بات مذاق میں ٹالنا چاہی۔

"تمہیں پتہ ہے — تم لنکا دیپ کے اُس کمرے میں جب داخل ہوئیں تو مجھے ایسا لگا جیسے کشمیر کی خوشگوار ہوا کا جھونکا کہیں سے آگیا"

"میں سندھی ہوں"

"ہاں۔ لیکن بالکل کشمیری معلوم ہوتی ہو!"

"سندھی بھی بدصورت نہیں ہوتے!"

وہ ہنسنے لگے۔ اس وقت — کولمبو کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے دو نوجوان۔ — ایک سیلونی "اوورسیز انڈین" تامل — ایک ہندوستان سے آئی ہوئی پاکستان کی سندھی شرنارتھی — بیک وقت کتنے مسرور اور کتنے اداس معلوم ہو رہے تھے — انہیں معلوم تھا کہ زمین اُن کی، آج کی نوجوان نسل کے قدموں کے نیچے سے سرک چکی ہے اور ساری دنیا کا مستقبل ان کی کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔

کیا اُن کے باپ یہ بات جانتے تھے کہ ان کی نسل کے سیاست دانوں کی بنائی ہوئی دنیا میں اُنکے بچوں کو کیا کچھ سہنا پڑے گا!

"چلو تمہیں کولمبو گھما دیا جائے" رام نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر ایر لائنز کا دفتر ۔"

"جہنم میں جائے تمہارا ایر لائنز کا دفتر۔ یہ لنچ ٹائم ہے۔ سارے دفتر تین بجے تک بند رہیں گے فکر مت کرو، تمہیں کل ہوائی جہاز میں بٹھا دیا جائے گا۔"

"غالباً تم اُس کا مداوا نہیں کرسکتیں کہ لوگ تم میں اوبلکے دلچسپی لیں، یہ دوسری بات ہے کہ حد تک تم بھی ان کا دل نہیں توڑنا چاہتیں ۔"

"تم نے کون جگہ اب تک نہیں دیکھی ۔؟" ٹیکسی کا دروازہ بند کرکے رام پوچھ رہا تھا۔

"کیلا نیا ٹمپل ۔" اسنے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مندر کی چڑھائی پر پہنچ کر چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے سیتا نے کہا "تمہارے یہاں کی سیاسی صورتِ حال جو کچھ بھی ہو مجھے تو پچھلے آٹھ دس دن سے برابر ایسا ہی لگ رہا ہے کہ میں جنوبی ہند میں ہوں وہی مناظر ہیں، اسی طرح کی کلچر ۔" وہ تھک کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ دُنیا میں اتنا رولا کیوں مچتا ہے ۔؟

"گائیڈ ۔ لیڈی ۔؟ فرسٹ کلاس گائیڈ ۔" ایک سنہالی نے اچانک کہیں سے نمودار ہو کر پوچھا۔

وہ سیڑھیوں پر سے اٹھی "تمہارے بدھسٹ مندروں میں اتنے ہندو دیوی دیوتاؤں کا دخل کیوں ہے؟" اُسنے عمارت کی طرف چلتے ہوئے سوال کیا۔ رام سر جھکائے خاموشی سے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔

"یہ ہندو دیوی دیوتا لوگ لنکا میں ہمارے بدھ دھرم کے محافظ ہیں ۔" گائیڈ نے بڑے وثوق سے بتایا۔

"لوسن لو بھئی ۔!" سیتا نے رام سے کہا اور اُسے ڈاکٹر لزلی مارش یاد آگیا۔

"پرتگالیوں کے آنے سے پہلے تک لنکا تہذیبی لحاظ سے بالکل ایک تھا۔ اور برطانوی تسلط سے قبل تامل سنہالی جھگڑے کا وجود بھی نہیں تھا۔" رام نے کہنا شروع کیا مگر پھر اکتا کر چپ ہو گیا۔ نارنجی کپڑوں میں ملبوس بڑے بڑے تاڑ کے پنکھے اٹھائے بھکشوؤں کی ایک ٹولی سامنے سے گذری۔

"تم مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے ۔؟"

"کچھ نہیں۔ تم ۔ سشیلو حبٹ ہونا ۔ تم ابھی جنوبی ہند کی بات کر رہی تھیں۔ تم ٹھیک

تھیں سنہالی طریقہ زندگی بنیادی طور پر ہندو طریقہ زندگی ہے۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بدھ ازم یا کم از کم لنکا کی بدھ ازم محض ہندو مت کا ایک ورژن ہے یا اُسے علیحدہ مذہب اور کلچر سمجھا جائے؟ سنہالی سماج کی بنیاد کاسٹ پر تھی۔ حالانکہ کاسٹ سسٹم بدھ ازم میں نہیں ہے۔ بہت سے سنہالی بدھسٹ ہندوؤں کے خداؤں کو پوجتے ہیں —— پھر قومی کلچر کیا ہے؟ خالص سنہالی قومی کلچر —— ؟ خالص ہندوستانی قومی کلچر؟ خالص پاکستانی قومی کلچر؟

"میں نے جے سوریہ کے ڈنر میں اس روز مین لینڈ سے آئے ہوئے چند ہندوستانی اور پاکستانی مہمانوں سے پوچھا تھا کہ کیا پاکستانی اسلام وہی ہے جو سعودی عرب یا مصر میں رائج ہے؟ اور کیا ہندوستان کے ہندو عوام کا کلچر وہی ہے جو اشوک کے زمانے میں تھا؟ جب میں جے سوریہ سے کہتا ہوں کہ تم لوگ تاریخ کے ارتقاء کو کس رخ سے دیکھ رہے ہو تو وہ فوراً ہم جلاوطنوں کی نفسیات پہ ایک تقریر شروع کر دیتا ہے۔"

"یہاں برطانوی دور کی نئی مڈل کلاس نے ملازمتیں، و سیاسی مراعات حاصل کرنے کے لئے ایجی ٹیشن کیا ہوگا —— اور مڈل کلاس کے مختلف نسلی اور مذہبی فرقوں کے مفاد آپس میں ٹکراتے تھے ——" ستیا نے پوچھا

"ہاں —— اب بدھسٹ کانگریس کا مطالبہ ہے کہ لنکا کی تاریخ از سرِ نو لکھی جائے —— ایشیا کے ہر نئے ملک میں لکھی جا رہی ہے —— مگر تاریخ کو کس زاویے سے انٹرپرٹ کیا جائے گا —— ؟"

مندر کی پہلو کی دیوار پہ دوسرے خداؤں کے ساتھ راون کے چھوٹے بھائی بھگوان دی بھی شن دانت باہر نکالے مسکرا رہے تھے۔ بھگوان دی بھی شن غریب چونکہ بھگوان ہونے کے باوجود راکھشس بھی تھے اس لئے ان کے دو دانت باہر نکلے ہوئے تھے —— "گھر کے بھیدی بھی بھاشے تھے ——" ستیا نے رام سے کہا۔ اور پھر اسے اس اردو محاورے کا مطلب سمجھایا۔

اندر ہال میں آرٹ اسکول کا ایک طالبِ علم فریسکوز کی نقل اتارنے میں مصروف تھا۔ رام کو اس سے باتیں کرتا چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

برابر کے کمرے میں گوتم بدھ کے بے تحاشا طویل لیٹے ہوئے مجسمے کے قدموں میں پجاریوں میں سے کسی ایک کا ننھا سا بچہ میلے سے کپڑے میں لپٹا میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اور اس کی ماں ٹھنڈے مرمریں فرش پر سجدے میں پڑی تھی۔

راہل —— راہل —— راہل ——

بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط سے قدم رکھتی کہ کہیں اس کے پیروں کی آہٹ سے بچہ جاگ نہ جائے وہ دوسرے کمرے میں گئی جہاں ایک اور سنہری گوتم بدھ حسب معمول کھلے ہوئے کنول پہ سکون سے بیٹھے تھے ۔ وہ ذرا کی ذرا آنکھیں بند کر کے مورتی کے سامنے مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی — چند لحظوں بعد اسنے آنکھیں کھولیں۔

سامنے عرفان کھڑا تھا۔

(۱۷)

اسنے خاموشی سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور دیوار کی تصویروں کو غور سے دیکھنے لگی۔

عرفان آگے بڑھا — سیتا — سنو — دیکھو — بات سنو — گوتم بدھ امن کے شہزادے تھے — میں ان کے سامنے جھک کر تم سے معافی مانگتا ہوں — سیتا مجھے معاف کر دو — مجھے معاف کر دو — سیتا —

وہ فریسکو زیر نظر رہی جائے رہی۔

سیتا — سن رہی ہو —؟ سیتا — سیتا — سیتا —

(۱۸)

"کل تو میں حضور قلب حاصل کرنے مہاتما بدھ کے مندر میں گیا تھا۔ مگر آج میری موڈ اتنی ڈرامائی نہیں ہے — لہٰذا آج شام کو چلو شہر کو سُرخ رنگ دیں —"

ماؤنٹ لیونیا کی بالکنی پر جھکے ہوئے عرفان نے تجویز کیا۔

"چلئے —" سیتا نے بشاشت سے جواب دیا۔

"شاں ہٹ جا کر چینی کیبرے دیکھیں گے — سارے نائٹ کلبوں میں جائیں گے۔"

"جائیں گے۔"

"سان تشیل جا کر ڈچ برگر لونڈیا سے اپنی فرمائش کے گانے سنیں گے۔"

"سنیں گے۔"

"ڈوم میں جا کر ہاشمی کو ہارمونیم بجاتے دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے —"

"مگر تمہیں تو اپنے جرنلسٹ دوست کے گھر جا کر ایلسیز اور اسٹیٹ لیس ہندوستانیوں کے مسائل کے تجزیے کی پروجیکٹ پر کام کرنا تھا۔"

"اوہ عرفان ——— واقعی ———!!" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"تم بھی کیسے کیسے بھانت بھانت کے لوگوں کو کہاں کہاں سے پک اپ کر لیتی ہو! کمال ہے!!"

عرفان کے لہجے میں کوئی طنز کوئی تلخی نہیں تھی۔ وہ ایک بے تکلف ساتھی کی طرح بات کر رہا تھا ——— جو حاسد، بدگمان، شکی، کم ظرف عاشق نہیں تھا بلکہ محض ایک پرانا دوست تھا ——— انسان کس طرح لحظہ بہ لحظہ مختلف ہوتا رہتا ہے۔

"ارے بھئی اپنے اس ہنومان کو فون تو کر دو کہ نہیں آ سکتیں اس کے ڈنر پہ۔"

"ہنومان کون؟"

"وہی تمہارا راما سوامی آیا سوامی کون ہے ———"

یہ واقعہ تھا کہ اس وقت تک وہ راما سوامی کو بالکل بھول چکی تھی۔ عرفان نے اسے کب کا واپس بلا لیا تھا۔ راما سوامی کی کم سنی، سیاسی، بھنیانی، تہذیبی یگانگت، ہر چیز اسکے دماغ سے کیلا نیا کے مندر ہی میں محو ہو گئی تھی ——— دنیا میں آدمی صرف ایک تھا ——— عرفان ——— عرفان ——— اول و آخر ——— عرفان ——— پرسوں شام جب عرفان نے اس کی توہین کی تھی اور اس کی روح اور اس کے دل و دماغ کے پرخچے اڑا دیئے تھے ——— کل رات ——— جب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ——— وہ خوفناک صبح جب اسے جے سوریہ کے دفتر میں بیٹھنا پڑا تھا ——— وہ اجاڑ دوپہر جب اسنے راما سوامی کے ساتھ سگرٹوں کے دھوئیں سے بھرے ہوئے تھوے خانے میں سیلون کی سیاست پہ باتیں کی تھیں ——— وہ سب یکسر اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ لحظہ ——— حال ——— لحظہ جو موجود ہے ——— جو تمہارے ہاتھ میں ہے ——— اسے تھامے رکھو ——— مضبوطی سے تھامے رکھو ——— کیونکہ دن اور رات تیزی سے سرکتے جا رہے ہیں ———

وقت عنقریب ختم ہونے والا ہے۔

(۱۹)

اس رات عرفان نے ٹل ہٹ سے لوٹتے ہوئے پہلی مرتبہ جمیل کا ذکر کیا۔ اسنے کہا کہ لڑائی والی رات اسنے بارہ بجے یہ بتلانے کے لئے فون کیا تھا کہ جمیل سے ملاقات تو ہوئی تھی مگر انکے ہاں کچھ اور لوگ آ گئے اسلئے کوئی بات نہ ہو سکی۔ لیکن کل شام کو تو وہ ضرور بالضرور جمیل سے مل رہا ہے۔

"میں آپ کی ان ملاقات کی کوششوں اور ملاقاتوں سے اتنی بور ہو چکی ہوں کہ اب مجھے قطعی کوئی پرواہ نہیں" ستیا نے بے دھیانی سے جواب دیا "میں اب جا رہی ہوں دلّی واپس ـــ"

لیکن اس کے دوسرے روز صبح ہی صبح اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"کیا ہے؟" وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ـــ اور جا کر دروازہ کھولا۔

"آ جائیں ـــ" عرفان چھینکتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"ارے۔ آپ کیسے ہیں ـــ؟" ستیا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں ـــ فکر نہ کرو ـــ ذرا سا حشر میرا نہیں ہوا ـــ دراصل کل رات بہت دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلنے کی وجہ سے زکام ہو گیا ـــ ہوا بہت تیز تھی۔"

"اچھا ـــ! تو آپ سمندر کے کنارے ٹہلے ـــ! کس کے ساتھ؟"

"بلو ـــ!" عرفان نے اسے غور سے دیکھا صوفے پر بیٹھ کر وہ خوشدلی سے ہنسا "تمہارے شوہر نامدار کے ساتھ ـــ" وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ "بھئی بہت لطف آیا ـــ تمہارے میاں سے بہت دوستی ہو گئی ہماری ـــ خوب چیز ہیں۔" وہ سگریٹ جلانے کے بعد خوب ہنسا۔

"بات تو بتلایئے ـــ" ستیا نے تکیوں کے سہارے اوندھے لیٹ کر سوال کیا۔

عرفان اسی طرح بشاشت سے ہنستا رہا "ارے بھئی تمہارے پران ناتھ کا جواب نہیں ـــ واللہ ـــ کل شام جب میں گال مینس پہنچا تو انہوں نے مجھے اوپر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بھائی حسبِ معمول بہت سخت ڈرنک تھے۔ نہ سلام نہ دعا چھوٹتے ہی انہوں نے مجھے پدماوت کا "سنگل دیپ کھنڈ" سنانا شروع کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ملک محمد جائسی کی روح آپ ہی میں حلول کر گئی ہے ـــ وہ بیت پڑھتے جاتے تھے اور تم کو یاد کر کر کے زار زار روتے تھے ـــ جب "سنگل دیپ کھنڈ" پڑھ چکے تو اپنی موجودہ بیوی کی تصویر دکھائی اور علامہ اقبال کے اسپین والے اشعار پڑھنے لگے ـــ"

موجودہ بیوی کے ذکر پر عرفان نے محسوس کیا کہ ستیا کے چہرے پر ایک ہلکا سا بادل گذر گیا اور اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی ـــ عرفان نے ذرا گڑبڑا کر کہا "ستیا ـــ تم ناشتہ کس وقت کرتی ہو ـــ؟"

"ناشتے کی فکر مت کیجیے ـــ بات بتلایئے ـــ"

"اچھا صاحب ـــ" اس نے حلق صاف کیا ـــ "اس کے بعد مجیب صاحب جو تھے ان کے اندر تلسی داس جی کی روح حلول کر گئی اور انہوں نے رامائن کی چوپائیاں دے دنادن پڑھنا شروع کر دیں ـــ اس شخص کو ان گنت چوپائیاں از بر ہیں ـــ واقعی تم نے کس کریک سے شادی کر لی تھی!"

ستیا کو یہ بات بہت ناگوار گذری ۔ "وہ بالکل کریک نہیں ہیں ۔ لٹریری آدمی ہیں — آپ
ں لوگ ان پدماوت اور رامائن کیا جانیں —"

"اوہو — خفا ہو گئیں، ارے بھئی تم حکم دو تو میں ساری مہابھارت، سارا کالیداس، سارا دیوانِ حافظ،
شکسپیر، سارا ایلیٹ جو چاہو سنا دوں —مگر اس فراڈ میں یقین کچھ نہیں رکھتا — تم عورتیں ان
ں کے چکر میں آ کر تو بے وقوف بنتی ہو — کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ زبردست شاعر اور افسانہ نگار لوگ
ن اور زندگی کے حسن کی تعریف میں ہزاروں صفحے سیاہ کرتے ہیں اور جانے کیا کیا زمین آسمان کے قلابے
یں گھر میں ۔۔ اپنی بیویوں سے ان کا سلوک کیسا ہوتا ہے؟ چلو — خیر — اچھا تو بھئی رامائن کے
پھر سنگلدیپ کانڈ پر لوٹ آئیے — اور اب کی دفعہ ساتھ ساتھ مجھے ڈانٹتے بھی گئے کہ میں بھی اتنی بی
اب کیوں نہیں پی رہا — پھر ایک ایک دوہا دس دس مرتبہ مجھ سے بھی پڑھواتے — کیا کمال کا آدمی
ہ — گریٹ ہیں — بہت بھلا آدمی ہے بے چارہ —"

عرفان اپنے اکساٹمنٹ میں اٹھ کر دریچے کے قریب چلا گیا ۔ وہ بے حد خوش تھا ۔

"ایک، دو، دو ہے تم بھی سنو گی —؟" اسنے پلٹ کر ستیا سے پوچھا ۔

"نہیں —"

"نہیں کیسے — سننا پڑیں گے — تم کو شکایت ہے کہ میں لٹریری نہیں — " اسنے ٹہل ٹہل کر حلق
کیا ۔ "کہتا ہے استاد کہ —

سنگلدیپ کتھا اب گاؤں
اد سو پدمن ہرن سناؤں!

سناؤں —؟"

"نہیں —"

"اجی تمہارے تو اچھے بھی سنیں گے ۔ جیسا تمہارے میاں نے میرا کونڈہ شریف کیا ہے میں تمہارا کونڈہ شریف
ماند کروں — تو سنو — بے چارے جمبل نے کس قدر رو رو کر سنایا —

راگھو جو ستیا سنگ لائی ✦ راون ہرلی کون سدھ پائی
یہ سنسار سپن کر لیکھا ✦ بچھڑ گئے جانو نہہ دیکھا

ہائے ہائے — اور سنو —

سنگلدیپ جو نا نہہ بنجا ہو ✦ یہی تھانوں سانکر سب ہو

ہاں — اس کا کچھ اندازہ تو مجھے بھی ہے —!"

ستیا کو بے ساختہ ہنسی آگئی ۔ وہ اپنے جوش میں ٹہلتا ٹہلتا پھر دریچے کے پاس چلا گیا اور اس کے نچلے پٹ پر کہنیاں ٹیک کر دوہے پر دوہا سناتا رہا۔ وہ واقعی اس قدر خوش تھا جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کر کے آیا ہو — ستیا نے اسے آج تک اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

"اور سنو کیا کہہ گیا ہے ظالم —

محمدؐ جیون جل بھرن رہٹ گھڑی کی ریت
گھڑی جو آئی جیون بھری ڈھری جنم کا بیت[1]

آں — چھپیں —"

"آپ پر بھی میرے پتی کی کرکیٹ کا اثر ہو گیا ہے —" اس نے عاجز آکر کہا — "اب اصل بات کی طرف آیئے —"

"اور سن لو — سن لو — پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی — ارے ہائے ہائے —" وہ اسی کی سنی ان سنی کر کے کہتا رہا ؎

پی کی جوت دیپ جو سوجھا + پر جو دیپ اندھیرا بوجھا
جو پی ناہیں استھر وسا + جگ اجار کا کیجے با

"کیا مطلب ؟" ستیا نے دریافت کیا۔

"کہتا ہے ملک محمدؐ کہ دل کی روشنی میں سنگار دیپ نظر آیا — اور اس تاریک دنیا میں بالکل اندھیرا تھا۔ جب محبوب ہی بس میں نہیں تو دنیا آباد ہو یا ویران — اور سنو —" وہ اچک کر لکھنے کی میز پر بیٹھ گیا ؎

محمدؐ چنگ پریم کی سن گگن ڈرائے + دھرتی برہن اور دھن ہیا جیہیں یہ آگ سمائے[2]

پھر اسے ستیا کو اس دوہے کا مطلب سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔

"آپ بھی بڑے گنواں نکلے —!" ستیا نے کہا۔

---

[1] اے محمدؐ! یہ زندگی گھڑی رہٹ کی مانند ہے جس میں پانی بھرتا ہے اور ڈھلتا رہتا ہے۔ گھڑی کا پانی بھرنا گویا زندگی ہے اور پانی کا ڈھلنا موت —

[2] اے محمدؐ! محبت کی چنگاری سے تو زمین اور آسمان تک ڈرتے ہیں — آفریں ہے محبت کرنے والے اور اس کے دل پر جس میں یہ آگ سماتی ہے۔

اسنے جھک کر تسلیم کی "ارے تم کو کیا پتہ ۔ میں بڑا زبردست چھپا رستم ہوں ۔ کیا سمجھتی ہو فلمی تمہارے ان ہی استاد ہیں؟"

"آپ دیوانے ہیں بالکل ۔۔۔!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"ستیا ۔۔۔"

"جی ۔۔۔؟"

اب وہ یک بارگی بے حد سنجیدہ ہو کر غور سے اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا پھر اسنے اپنا اضطراب چھپانے قلمدان میں رکھی ہوئی پنسلوں سے کھیلنا شروع کر دیا ۔۔۔ "ستیا ۔۔۔" اسنے دوبارہ کہا۔

"جی ۔۔۔؟ جمیل بھائی نے ۔۔۔ جمیل نے کیا کہا ۔۔۔" ستیا نے سانس روک کر پوچھا۔

"جمیل کو میں نے ساری بات سمجھائی ۔ آدھی رات کو جب ہم نے ان کو سمندر کی ٹھنڈی ہوا کھلائی دیر ہو چکی تھے ۔۔۔ میں نے ان سے کہا کہ تمہیں طلاق دے دیں ۔۔۔ کیونکہ ۔۔۔ کیونکہ ۔۔۔ کیونکہ ۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔ سچ تو یہ ہے حد کمبخت گھسا ہی پٹا ہی ہے نا ۔۔۔؟ مگر تم پاکستان آؤ گی ۔۔۔ یا آجاؤ گی ۔۔۔؟"

گھڑی کی ٹک ٹک تیز ہو گئی ۔ باہر سمندر کا شور یکلخت بڑھ گیا ۔ چند لمحوں کے کامل سکوت کے بعد نے کہا۔

"آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں ۔۔۔"

"میرا فرض کرنا نہ کرنا قطعاً میرا اپنا فعل ہے ۔۔۔ اور میں جہاں تک میرا خیال ہے اپنے فعل کا مختار ۔ آپ میرے سوال کا جواب دیجئے مہربانی فرما کے ۔۔۔"

"آپ یہاں سے تشریف لے جائیں ۔"

"کہاں ۔۔۔؟ کمرے سے باہر ۔۔۔؟ چلا جاؤں گا ۔ ایک دفعہ تم پہلے ہی نکال چکی ہو ۔۔۔ ویسے یہ سمجھ لو کہ میں بڑا کافی ڈھیٹ ۔۔۔ اور جانے یہ کیا مصیبت ہے کہ اب تم پر غصہ نہیں آرہا ۔۔۔ پیار ہے چلا جاتا ہے ۔۔۔ سنو ۔۔۔ اگلے مہینے میں پیرس پہنچ رہا ہوں ۔۔۔ تم ایک کام کرو ۔۔۔" اسنے نہایت نروس ہو کر پھر پنسلوں سے کھیلنا شروع کر دیا ۔۔۔ "تم یہ کرو کہ وہاں آجاؤ ۔۔۔"

وہ پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی "جو ہو گا دیکھا جائے گا ۔۔۔ اب جائیے ۔۔۔"

"اچھا ۔۔۔ ایک دوبارہ اور سن رکھو اور اس پر غور کرنا ۔۔۔" دروازے میں جا کر اس نے

محمدؐ مدھ جو پریم کا جیئے دیپ نیہہ راکھ!
سیس ندئی پتنگ جیوں تب لگ جائیے نہ پاکھ[1]

(۲۰)

— اور جب کام دیو شمبھو کی تسخیر کے لئے چلا تو سارے مقدس صحیفے بیکار ہو گئے۔ تزکیۂ نفس، صبر، سنیاس، فرض، معرفت، علم، بے نیازی سب میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خرد کتابوں میں جا چھپی۔ رتی کا پتی اپنا تیر کمان سنبھالے اس قارعین میں کس کو اپنا شکار بنانے جا رہا ہے؟ ساری کائنات محبت میں گرفتار ہو گئی۔ درخت جھک کر بیلوں پر چھا گئے — ندیاں سمندر سے جا ملیں — جل تھل ایک ہوئے — چرند اور پرند، دیوتا اور عفریت، انسان اور ناگ، لطیف ارواح اور غول بیابانی، مرگھٹ کے بھوت اور سادھو سنت سبھی اس کے طلسم میں مبتلا ہوئے۔

خردمند جو اب تک دنیا کو برہما کا سایہ سمجھتے تھے ساری دنیا اب ان کو عورت کے روپ میں نظر آنے لگی — اس عالم میں کام دیو شمبھو کے قریب پہنچا[2]

اور کالیداس نے لکھا ہے — کہ اس کے مدن کے بان پر جو آم کی کلیوں سے سجا تھا بہار نے شہد کی سیاہ مکھیاں اس طرح بٹھال دی تھیں گویا وہ خیال سے پیدا ہوئے خدا کے نام کے حروف تھے۔ ہلال کے ایسے پھول ناخنوں کے نشان کی مانند تھے — بسنت رت کے لپٹنے سے جنگل کے بدن پر پڑ گئے تھے — بہار نے تلک کا پھول لگا کر بھونروں کے سیاہ کاجل سے مزین ہو، اپنے ہونٹوں کو (جو آم کے بور تھے) صبح کے آفتاب کی سرخی سے سجایا — پیال کے درختوں سے گرتے زرگل سے ہرنوں کی آنکھیں دھندلا گئیں اور وہ جنگل کے پتوں پر کلیلیں بھرتے پھرتے — کوئل کی آواز خود محبت کی آواز بن گئی — کوئل کی آواز جو مغرور عورتوں کی سرد مہری کو توڑنے میں بڑی ماہر ہے — مدن کے حکم سے درخت ساکت، بھنورے خاموش، چڑیاں چپ چاپ ہرن سکوت میں کھو گئے — سارا جنگل ایسا دکھائی دینے لگا جیسے ایک بڑی تصویر ہو —

---

[1] اے محمدؐ! محبت کی شراب سے دل کا چراغ روشن کر۔ پروانے کی مانند جب تک سر نہ دے دیا جائے تب تک اسکے پاس کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔

[2] رامائن از تلسی داس۔

(۲۱)

پیرس میں سیتا اور عرفان کئی مہینے تک رہے۔ عرفان کے پاس بولوار سوشے پر ایک بڑا خوبصورت فلیٹ تھا۔ جسے سیتا نے اور بھی زیادہ نفاست سے سجایا۔ عرفان صبح کو دفتر چلا جاتا۔ سیتا بازار سے سودا خرید کر لاتی۔ کھانا تیار کرتی ــــــ عرفان کے کپڑوں پر استری کرتی۔ گھر کی صفائی، جھاڑ پونچھ کرتی۔ شام کو وہ کام سے لوٹتا تو جلدی سے اس کے گرم سلیپر اس کے صوفے کے نیچے آتشدان کے پاس رکھتی۔ سونے کے وقت سے بہت پہلے اس کے سلیپنگ سوٹ کو گرم پانی کی بوتل پر لپیٹ کر اس کے بستر پر رکھ دیتی۔ وہ ایسی مکمل اور سکون بخش اور آرام دہ ہاؤس وائف تھی کہ عرفان کو تعجب ہوتا تھا۔

وہ روزانہ صبح کو ڈاکیئے کا بڑی شدت سے انتظار کرتی تھی۔ شاید آج نیویارک سے اس کا طلاق نامہ آجائے ــــــ شاید ــــــ مگر دن گزرتے گئے اور کوئی طلاق نامہ نہ آیا۔ وہ کولمبو سے دلی واپس جا کر کسی سے نہیں ملی تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا کہ اسے پیرس میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ جا رہی ہے۔
وہ لوگ اب اس سے کچھ نہیں کہتے تھے نہ کسی قسم کے سوالات کرتے تھے۔ اس طرح کی باتوں کا وقت کب کا نکل چکا تھا۔ پیرس جانے سے ایک روز قبل اس نے کناٹ پلیس سے ملفیس اور ہما کو فون پر خدا حافظ کہا تھا۔

"اب کب تک آؤ گی ــــــ؟" ملفیس نے پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں میرا دل نہیں لگتا اور اگر ایک دفعہ یورپ پہنچ گئی تو وہاں سے نیویارک جانے میں آسانی رہے گی ــــــ راہل کو دیکھنے ــــــ"

"ٹھیک کہتی ہو ــــــ" ملفیس نے جواب دیا تھا ــــــ "مگر کبھی کبھار خط تو لکھ دیا کرنا۔"

"برابر لکھوں گی ــــــ"

ملفیس نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ پیرس کیوں جا رہی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ پیرس میں سیتا کا بغیر شادی کئے عرفان کے ساتھ رہنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ بائیں ساحل پر اس طرح کے ان گنت جوڑے برسوں سے رہتے آئے تھے اور ان کا قانونی طور پر بیاہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
چھٹی کے روز وہ سین کے کنارے ٹہلنے جاتے۔ کارتر لاطین میں آوارہ گردی کرتے۔ کسی قہوہ خانے میں سیاہ کافی پیتے ہوئے وہ سوچ میں ڈوب جاتی تو وہ اس سے پوچھتا ــــــ "کیا سوچ رہی ہو ــــــ؟"

"میں اب سوچنا ختم کر چکی ہوں۔ صرف محسوس کرتی ہوں۔" وہ سر اٹھا کر جواب دیتی۔
کسی پل کی منڈیر پر جھک کر باتیں کرتے کرتے وہ یکلخت خاموش ہو جاتی تو وہ اسے سگریٹ

جلا کر دیتا ــــ "لو سگریٹ پیو ــــ گئے دم ــــ مٹے غم۔"

ایک دن عرفان نے اس سے کہا "تم سے ماورا ایک اور تم ہو ــــ جب تم دفعتاً چپ ہو جاتی ہو میں پھر اکیلا رہ جاتا ہوں ــــ تم مجھ سے ہزاروں میل دور چلی جاتی ہو۔ تم بہت بلندی پر ہوتی ہو۔ میں تمہاری باتیں سمجھنا چاہتا ہوں۔ مگر ڈر لگتا ہے" کبھی کبھی وہ اپنی ان طویل خاموشیوں سے جھنجھلا کر خود کہتی ــــ "عرفان ــــ باتیں کرو۔"

"باتیں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ــــ" وہ جواب دیتا۔

خزاں کے موسم میں وہ دونوں اسپین گئے وہاں مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر چاندنی رات میں انہیں ایک پاکستانی طالب علم ملا جس نے بے حد پیاری آواز میں گٹار پر اقبال کی نظم سنائی۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات ۔ سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

اب مجھے اس کا مطلب سمجھاؤ۔ سیتا نے عرفان سے کہا

بہت دیر تک اشعار کی تشریح کرنے کے بعد عرفان نے جھنجھلا کر اس سے کہا ــــ تم اپنا کالیداس تلسی داس کرتی رہو، اقبال تمہارے بس کی بات نہیں۔"

ایک روز امریکہ سے ایک خط آیا۔ اسنے کھول کر پڑھا اور پھر خاموشی سے کپڑوں پر استری کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"سیتا" ــ عرفان نے کمرے میں داخل ہو کر اسے پکارا۔

"کیا ہے ــــ" اسنے مڑ کر کہا۔ اور استری کا سوئچ بند کر کے دریچے میں چلی گئی۔

؎ "آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں ۔ ہم سے وحشت کی نہ لیجے آپ نے!"

عرفان نے آتشدان کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف بانہیں پھیلا کر کہا۔

وہ اسی طرح دریچے سے باہر دیکھتی رہی۔

"سیتا کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ۔"

"کچھ نہیں عرفان ــــ" اسنے مڑ کر جواب دیا ــــ "ماں کا خط نیو یارک سے آیا ہے ــــ وہ لکھتی ہیں کہ اب وہ کس کس کے ناموں کے نکتے تبدیل کریں گی؟"

وہ خاموش رہا۔

"عرفان ــــ میرا خیال ہے ہم نے بہت سخت غلطی کی ہے۔ میں کب تک اس طرح تمہارے ساتھ رہتی رہوں گی؟"

"کیوں ؟" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا — "چندن مینوں میں گھبرا گئیں ؟ — گیری نا تی رو تملے نے تو شمبھو سے بیاہ کرنے کے لئے ایک ہزار برس تپسیا کی تھی — کمار سمبھو پڑھو

"مجھے نہیں چاہئے تمہارا کمار سمبھو وبھو —" اسنے جھنجلا کر کہا۔

"ہاہا — اب آیا تمہاری عقل میں ، میں نہ کہتا تھا کہ تمہارا سارا کالی داس والی داس ، شاعری ، ادب فلسفہ سب فراڈ ہے — زندگی کی تلخ حقیقتوں کے سامنے سب خرافات معلوم ہوتا ہے کہ نہیں ؟"

آخر اسنے ایک دن ڈرتے ڈرتے بلقیس کو خط لکھا۔ پیرس کے موسم کا ذکر کیا۔ فرخندہ باجی اور چھوٹی خالہ کی خیریت دریافت کی مگر یہ پوچھنے کی جرأت بہت نہ پڑی کہ بلقیس نے ان لوگوں کو اسکے متعلق کچھ لکھا ہے یا نہیں۔

بلقیس کا فوراً نہایت مفصل جواب آگیا۔ بڑا نارمل ، دوستانہ اور غیر شخصی سا خط تھا۔ جو کسی بچی کے تذکرے کے بجائے محض تھیٹر کی تازہ ترین خبروں سے پر تھا۔

— ایشا[1] کی آٹھویں سالانہ کانفرنس کا اس سال ڈاکٹر رادھا کرشنن نے افتتاح کیا۔ بہت سارے روسی ڈیلیگیٹ بھی آئے تھے گوپی ناتھ بھی ناچا۔

— اس مرتبہ نٹ راج نگری میں تم بہت یاد آئیں۔

— انڈین آرٹ تھیٹر نے "خیال میرزا" اسٹیج کیا ہے۔ اچھا خاصا ہے۔

— "نئی نوٹنکی" والے نوٹنکی کی طرز پر "مٹی کی گاڑی" پروڈیوس کر رہے ہیں۔ خاصہ دلچسپ تجربہ رہے گا — للتا کل تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔

— بمبئی کا لٹل بیلے گروپ میگھ دوت اسٹیج کرنے والا ہے — آہ کالیداس ! کالیداس !! [— شکنتلا" — "آگرہ بازار" — "مٹی کی گاڑی" — ہماچل پردیش کے فوک آرٹسٹ — خط بدلی سے ایک طرف پھینک کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

عرفان کے ساتھ رہتے ہوئے اسے یہ باتیں واقعی کسی دوسرے کرے کی خبریں معلوم ہو رہی تھیں۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔

"عرفان بتاؤ اب میں کیا کروں —؟" اسنے عاجز آکر سوال کیا۔

"پھر بلقیس کی خوشامد کرو اور کیا —؟" اسنے ذرا بے پروائی سے جواب دیا اور کوٹ پہن کر

---

[1] انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن۔

تر چلا گیا۔

چنانچہ دریچے کے سامنے بیٹھ کر سیتا نے بلقیس کو لکھنا شروع کیا ــــ

"میں جیتی سے کولمبو میں بات نہیں کر سکی۔ بات کرنا تو درکنار ان کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پائی۔ تم ٹھیک کہتی تھیں یہ جنگل لیطیخ کا تعاقب تھا۔ خدا کے لئے انہیں لکھو کہ مجھے جلد از جلد آزاد کر دیں۔ وہ مجھے کافی سزا دے چکے ہیں ــــ"

اور یکبارگی اس کے آنسو ٹپ ٹپ کاغذ پر گرنے لگے۔ وہ صفحے پر صفحہ لکھتی چلی گئی اور ایک لمبا سانس لے کر لفافہ بند کر دیا۔

اس خط کے جواب میں بلقیس نے لکھا۔

"تم کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ بلونت گارگی کا "سوہنی مہینوال" ماسکو میں چھ مہینے سے چل رہا ہے۔ پٹنے کے اپٹا والوں نے نال کٹورہ ڈرامہ "فیسٹیول میں اب کے سے اپنا ڈرامہ "پیر علی" دکھلایا اس کا ب ایکٹر تمہارا پرانا کلاس فیلو نکلا۔ تم کو اسنے سلام کہلوایا ہے۔

ــــ میرا ہالنی مارا آبجائی گجراتی میں نوہ تمثیلیں پیہ ڈیوس کر رہی ہیں۔

ــــ یونٹی تھیٹر والے فیروز شاہ کوٹلہ کے اوپن ایر تھیٹر میں" اورنگ زیب" اسٹیج کرنے والے ہیں۔

اور آغا حشر کی تجدید کے سلسلے میں تم یہ جان کر خوش ہوگی کہ دہلی پلے ہاؤس والے رستم و سہراب" پیش کر رہے ہیں۔

ایک شام سینما سے واپس آ کر وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہونے لگے تو کونسی ارژ نے ایک کیبل سیتا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ عرفان تالا کھول کر اندر جا چکا تھا۔ سیتا نے دہلیز پہ کھڑے کھڑے لفافہ چاک کیا۔ اس کے جائی کی طرف سے اطلاع آئی تھی ــــ "ڈیڈی گذر گئے ــــ"

جب عرفان کپڑے تبدیل کر کے سٹینگ روم میں آیا اس وقت وہ آتش دان کے سامنے دوہری ہوئی بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ لرز رہی تھی۔

"کیا بات ہے لٹل وومن ــــ؟" عرفان نے جھک کر اسکے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"کچھ نہیں ــــ" اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر عرفان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ اس نے

ـه CONCIERGE

کیپل عرفان کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"اوہ ۔۔۔ آئی ایم سوری ۔۔۔" کاغذ پر نظر ڈالنے کے بعد عرفان نے آہستہ سے کہا۔
"میں دلّی جا رہی ہوں ۔"
"اچھا ۔"
"میں ممی کے ساتھ کچھ عرصے رہوں گی ۔"
"ہاں ۔ ہاں ۔ ٹھیک ہے ۔ ضرور جاؤ ۔۔۔" عرفان نے رسانیت سے جواب دیا۔

رحمت منزل قرولباغ واپس پہنچ کر وہ کئی ہفتے گھر سے باہر نہیں نکلی ۔ بلقیس کے "ماڈرن تھیٹر گروپ" نے تعزیت کے لئے اس کے پاس آنا چاہا مگر اسے بلقیس اور شہزادہ کے ذریعے سب کو منع کروا دیا ۔ ایک مہینے میں وہ بالکل پیلی پڑ چکی تھی ۔
ایک دفعہ اس کی ماں نے کہا ۔" یہ تو نے اپنی کیا درشا بنالی ہے ۔ جا باہر گھوم آ ۔۔۔ کیا بیمار پڑے گی؟"
اس کی ماں نے اب تک اس سے پیرس یا عرفان کے متعلق ایک لفظ بات نہیں کی تھی ۔ اب وہ آ چکی تھی کہ ان کی لڑکی کی نجی زندگی بالکل خالصتاً اس کا ذاتی معاملہ تھا ۔
آخر ایک روز تیسرے پہر کو وہ تیار ہو کر جانکیہ پوری گئی ۔ بلقیس کے وہاں سب نے بڑی محبت سے اس کا استقبال کیا ۔ فرخندہ آپا جی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں ۔ اسی وقت نئی تمثیل کا اسکرپٹ لے کر کیلاش آن پہنچا ۔۔۔
چائے کے بعد اس نے باتوں میں ستیا کو مخاطب کیا ۔۔۔
"ستیا جی ۔۔۔ آپ کو پردجیش بابو بہت پوچھتے تھے ۔ دلّی آ کر جب بھی ہم لوگوں سے ملتے ہیں برابر آپ کا ذکر کرتے ہیں ۔۔۔ مگر آپ نے تو ہم سب سے روٹھ کر ولایت ہی کو اپنا دیس بنا لیا ہے ۔"
وہ بڑے اخلاق سے مسکرائی ۔" آج کل پردجیش بابو کہاں ہیں ؟"
"ان کی نمائش ہو رہی ہے ۔ اس کے لئے آئے ہوئے ہیں ۔"
"کہاں ٹھہرے ہیں ؟"
"وہیں ۔۔۔ اپنی پرانی جگہ ۔۔۔ بلقیس ۔۔۔ بھئی یہ للتا کا پارٹ دیکھ لو ۔۔۔" ستیا اٹھ کر لاؤنج میں چلی آئی ۔
"ابھی کہاں جا رہی ہو ۔۔۔ رات کو اسکریبل کھیلیں گے ۔۔۔" اسے جاتے دیکھ کر بلقیس نے ڈرائینگ روم

تیں سے آواز دی۔

"نہیں ممی۔ اب میں چلوں۔ ممی گھر پر بالکل اکیلی ہیں۔"

"تھوڑا اور ٹھہر جاؤ۔ رات کو تمہارے دولہا بھائی پہنچا آئیں گے۔" چھوٹی خالہ نے کہا۔

"آج ہم لوگ فرنچ ٹوسٹ بنائیں گے۔ تم تو بہت زیادہ فرنچ جان گئی ہو گی ـــ" بلقیس نے کیلاش سے گفتگو کرتے کرتے پھر کہا۔ مگر اب اس کی آواز میں صرف نیت تھی۔ ستیتا باہر آ گئی۔

وقت بہت تیزی سے گذرتا چلا گیا۔ شروع شروع میں عرفان اُسے پابندی سے ہر ہفتے خط لکھتا تھا پچھلے چند ماہ سے وہ بالکل خاموش تھا۔ ستیتا اب تک اُسے اَن گنت خط بھیج چکی تھی۔ مگر کسی کا جواب نہیں ملا تھا۔ عرفان نے آخری خط میں اُسے لکھا تھا کہ وہ دفتر کے کام سے جرمنی جا رہا ہے۔ مگر اس بات کو بھی عرصہ ہو چکا تھا۔

اب وہ اسی شدت سے عرفان کے خط کا انتظار کرتی جس طرح وہ اب تک جمیل کے طلاق نامے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اُس کی ماں کو کلیم کے معاوضے کے تھوڑے سے روپے مل گئے تھے۔ اور اس کا بھائی درگاپور سے اپنی آدھی تنخواہ بھیج دیتا تھا۔ اس امید پر کہ وہ بہت جلد عرفان کے پاس واپس چلی جائے گی۔ اُس نے ملازمت کی تلاش بھی نہیں کی۔ سارا دن وہ بسوتی میں ماں کے پاس بیٹھی رہتی۔ چھوٹی بہنیں شام کو کالج سے لوٹتیں تو اُن سے باتیں کرتی۔

زندگی تاریک تر ہوتی گئی۔

اس رات کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد آنگن کے نلکے پر ہاتھ دھوتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ کوئی اس کا دوست نہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں۔ اتنے بڑے عظیم الشان جگمگاتے ہوئے دارالسلطنت میں، شناساؤں کے اتنے بڑے ہجوم میں کوئی اُس کا ہمدرد نہیں ـــ کیوں نہیں ـــ؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا ـــ! پروجیشن نے ایک دفعہ اُس سے کہا تھا ـــ "ستیتا دیدی! تم ایسی عجیب و غریب لڑکی ہو کہ تم کو اس دنیا میں مسرت ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ جس طرح کی مسرت کی تمہیں تلاش ہے پروجیشن ـــ؟!

"ممی۔ میں ذرا باہر جا رہی ہوں ـــ" ہاتھ پونچھنے کے بعد اوور کوٹ پہن کر اُس نے گلی میں اترتے ہوئے کہا۔ اس کی ماں نے آنگن میں آ کر ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

نئی دہلی جانے والی بس تقریباً خالی تھی۔ وہ ایک کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب مجھے ایسا لگ رہا ہے، اُس نے اپنے دل میں کہا۔ جیسے رات کے اندھیرے بہت سی

کشتیاں گھاٹ سے لگ جائیں۔ اور مجھے معلوم نہ ہو کہ ان میں سے میری کشتی کون سی ہے ——
پر وجیشں کے جلسے قیام پر پہنچ کر اسنے کلرک سے پوچھا۔

"مسٹر چودہری ہیں ؟"

"کون سے مسٹر چودہری ؟"

"جو کلکتے سے آئے ہیں۔"

"وہ جو ایکٹر ہیں ؟"

"نہیں۔ جو آرٹسٹ ہیں۔"

"اوہ —جی ہاں۔ ادھر سے آیئے —"

جب وہ اندر چلی گئی تو کلرک نے سر کھجا کر دل میں کہا۔ عجب —سال ڈیڑھ سال ہوا مجھے یاد پڑتا ہے یہ اسی طرح رات کو آئی تھیں، تب کلکتے والے ایکٹر مسٹر چودہری کو پوچھتی تھیں۔ یہ سب کیا کھیلا ہے۔

پر وجیشں کمار چودہری کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا: "سیتا دیوی —" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر بڑے ڈرامائی انداز میں کہا — "مجھے معلوم تھا کہ ایک روز تم ضرور واپس آؤ گی — ایک روز ضرور میری روح کی پکار تم تک پہنچ جائے گی — تم ایک روز ضرور میرے پاس آؤ گی۔"

گوری کانسی سیتا سانولی رنگت کے پر وجیشں کمار چودہری کے بازوؤں میں اس طرح جا کر گری جس طرح گنگا کا شفاف پانی جمنا کے تاریک، غضبناک پانیوں سے جا کر ملتا ہے۔

اس کے بعد بہت جلد دہلی کے فنکاروں کے حلقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ شری پر وجیشں کمار چودہری کا "سندھی پیریڈ" شروع ہو چکا ہے۔

چھ مہینے اور نکل گئے۔ سیتا پر وجیشں کے ساتھ "اسپرنگ فیسٹول" کے لئے سرینگر گئی ہوئی تھی وہاں سے لوٹ کے اسکے ہمراہ کلکتے چلی گئی۔ آخر دسمبر میں، پر وجیشں کے جاپان جانے کے بعد وہ دہلی واپس آئی۔ آتے کے ساتھ ہی اس کی ماں نے اُسے دو لفافے دیئے۔ ایک پر روم کی مہر تھی۔ بہت مختصر خط تھا۔

"تازہ ترین خبریں جو تمہارے متعلق سنی ہیں صحیح ہیں ؟ —— عرفان !"

دوسرا لمبا لفافہ نیویارک سے آیا تھا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جمیل کا خط ـــ جمیل کے ہاتھ سے لکھا ہوا اس کا نام ـــ اُس کے ہاتھ لرزنے لگے ـــ شام ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں جا کر اس نے پڑھنا شروع کیا ـــ یہ خط بھی بہت مختصر تھا۔

ـــ راتل اچھی طرح ہے۔ میں تم کو طلاق دے رہا ہوں۔ تم اب آزاد ہو اور جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔ راتل کو میں اگلے سال دتی جامعہ ملیہ بھیج رہا ہوں تاکہ اپنے ملک میں ہے۔ اور ہندوستانی بنے۔ یہاں وہ ایک دم امریکن ہو گیا ہے، وہ دتی آ جائے تو تم فرخندہ بجیا کے ہاں جا کر اُس سے مل بھی سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ـــ فقط

جمیل ـــ

اُسے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وہیں کھڑکی کے پاس دری پر بیٹھ گئی۔ اور دیوار کے سہارے ٹک کر منو آن کی تصویر دیکھنے لگی جو ہتھیلی پر پہاڑ اٹھائے اڑے چلے جا رہے تھے۔

دوسرے روز اسنے عرفان کو اتنا ہی مختصر جواب لکھا ـــ میں بھائی کا انتظار کر رہی ہوں وہ یہاں آ جائے تو میں اسے لیبیا، موہنی کو اسکے ساتھ درگا پور بھیجکر فوراً تمہارے پاس پہنچوں گی۔ میرا انتظار کرو ـــ میں تمہیں ـــ اور صرف تمہیں چاہتی ہوں۔ اور انت سمے تک اسی طرح چاہوں گی ـــ

وقت نکلا جا رہا ہے۔ وقت سرپٹ بھاگا جا رہا ہے۔ اب مجھے زیادہ دیر نہیں لگانا چاہئے۔ اُس نے لفافہ بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

لیکن اب وقت کی کیا پرواہ ہے۔ اُسنے دوبارہ خود کو یاد دلایا ـــ اب وہ بہت جلد مسز عرفان بن جائے گی۔ وہ اب قانونی طور پر آزاد ہے۔ وہ عرفان سے شادی کرے گی جو انٹلکچوئل یا بوہیمین یا ناراض نوجوان نہیں ہے۔ بے حد سمجھدار، سیدھا سادا، SOLID آدمی ہے ـــ پھر وہ پاکستان چلی جائے گی۔ اور پاکستانی شہری کی حیثیت سے اپنے شہر کراچی واپس جائے گی جو اب اس کا نہیں لیکن پھر اُس کا ہو جائے گا ـــ شاید ـــ پھر وہ ان سب جگہوں پر دوبارہ جائے گی ـــ حیدر آباد ـــ سادہ بیلا ـــ سکھر ـــ ملتان ـــ ربنغ تد کا وہ ڈاک بنگلہ جہاں رات کی رانی مہکتی تھی۔

جمیل ـــ قمر ـــ دونوں نے اس کی روح کو مالا مال کرنے کے بجائے الٹا اُس کی روح کو گھائل کیا۔ پرجوش اپنی عظمت میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اُس کی روح کے قریب پھٹکا ہی نہیں ـــ لیکن عرفان ـــ عرفان ـــ

ستیا مرجنیدانی ـــ ستیا جمیل ـــ ستیا عرفان ـــ اور اب بہت جلد اُسکے پرانے دوست، ملقبیں

تھا ، للتا ، اس کے لئے غیر ملکی ہوں گے ۔ اس کی ماں ۔ اسکے بھائی بہن ۔ سارے ہندوستان میں بکھرے ہوئے اسکے لوگ ۔ سندھ مہاساگر اب جن کا نہیں ہے ۔ لیکن ستیا مرچندانی سندھو لیشی واپس جارہی ہے ۔ اسے بالآخر اپنا گھر مل گیا ہے ۔ عرفان کا خیال اس کے لئے ، ب ایسا تھا جیسے اماوس کی رات میں دفعتاً چاند نکل آئے ۔

دو ہفتے اُسے سفر کی تیاریوں میں لگ گئے ۔ جس روز وہ جلدی جلدی اپنی ساریاں استری کرکے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی اسکی ماں نے اس کے کمرے میں آکر پوچھا ۔

"۔۔۔ اب کہاں چلیں ؟"

"جی ۔۔۔ میں عرفان سے شادی کرنے جارہی ہوں ۔" اسنے سوٹ کیس بند کرکے سکون سے جواب دیا ۔

دوپہر کے وقت کناٹ پلیس میں ایرلائینز کے دفتر سے باہر نکل کر اسنے سوچا کہ سب دوستوں کو آخری بار خدا حافظ کہے ۔ کافی ہاؤس ابھی سنسان پڑا تھا ورنہ للت اور کیلاش کا گروپ عموماً شام کے وقت یا اتوار کی صبح کو وہیں مل جاتا تھا ۔

آٹو رکشا میں بیٹھ کر وہ سب سے پہلے نظام الدین ویسٹ گئی ۔ یہاں چاروں طرف دور دور تک نئی کوٹھیوں میں زیادہ تر متوسط طبقے کے پنجابی آباد تھے ۔ وہ پہلی مرتبہ للتا کے ہاں جارہی تھی ۔ بڑی دقت سے اُسے للتا کا چھوٹا سا گھر ملا ۔ وہ اندر آنگن میں سلیپنگ سوٹ پر شال اوڑھے دھوپ میں بیٹھی تھی ۔ اُس کا بچہ اسکول سے لوٹ کر آنگن میں ٹرائیکل چلاتا پھر رہا تھا ۔ اُس کا میاں ابھی دفتر سے واپس نہیں آیا تھا ۔ رسوئیا باورچی خانے میں کھانا بنا رہا تھا ۔ ستیا جاکر للتا کے پاس کھری چارپائی پر بیٹھ گئی ۔

"آج جمعدارنی اب تک نہیں آئی ۔ سارے گھر میں اتنا کوڑا پڑا ہے ۔۔۔" للتا نے مطمئن آواز میں اس سے کہا ۔ اُسے زکام ہو رہا تھا ۔ "اس طرف آجاؤ ، ابھی دھوپ وہاں سے سرک جائے گی ۔"

نئی ہندوستانی اسٹیج کی یہ بلند پایہ اداکارہ اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ کتنے سکون سے بیٹھی تھی ۔

وہ گھنٹہ بھر تک ستیا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی ۔ اُس نے بھی ستیا سے زیادہ سوالات نہیں کئے ۔ جب دھوپ آنگن پر سے اتر گئی تو اسنے کہا آؤ سامنے چل کر بیٹھیں ۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر آگئی جہاں منے سے لان پر دو مونڈھے ڈال کر للتا نے اُس سے بیٹھنے کو کہا ۔

"اب چلوں ۔" کچھ دیر بعد ستیا نے کہا ۔

"واہ کھانا کھا کر جانا ۔۔۔"

"جبھی دیر ہو جائے گی۔"

"اچھا موہن کا تو انتظار کر لو۔ابھی آتے ہوں گے۔"

"اچھا ــ"

سامنے چند قدم کے فاصلے پر نظام الدین اولیاء کے مقبرے کی دیوار پر دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ فضا میں بڑی سی بے چینی اور اداسی تھی۔ ستیا نے سراسیمہ ہو کر پہلو بدلا۔ للتا چپ چاپ بیٹھی سڑک کو دیکھتی رہی۔

نظام الدین اولیاء کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ فضا کا سناٹا گہرا ہو گیا۔

"للتا۔ اب میں چل ہی دوں۔ کیلاش پر دیپ کامران سب کو میرا سلام کہنا۔ اور کافی ہاؤس والے سارے گراؤنڈ کو ــ"

"اچھا ــ"

"ذکر آٹو رکشا لے آیا۔"

سڑک پر بگولے اڑ رہے تھے۔ وہ للتا کو خدا حافظ کہہ کر آٹو رکشا میں آبیٹھی۔ آٹو رکشا والے سردار جی کی لمبی سفید داڑھی جاڑے کی سرد ہوا میں لہرا رہی تھی۔

للتا اپنے چھوٹے سے پھاٹک پر جھکی دیر تک سڑک کو دیکھا کی۔

املتاس کے زرد پتے بگولے میں چکر کاٹ رہے تھے۔ دھوپ اب بہت ہلکی پڑ گئی تھی۔

"کہاں چلوں بی بی جی ــ؟" سردار جی نے باہر کی بڑی سڑک پر آکر پوچھا۔

بلقیس کے گھر میں اس وقت دھوبی کی آمد آمد تھی۔ چھوٹی خالہ پچھلے برآمدے میں سبزی والے سے آلو تلوا رہی تھیں۔ فرخندہ باجی کے بچے اسکول سے لوٹ کر حسبِ معمول پڑوس کے بچوں کے ساتھ پچھلے لان پر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بلقیس لاؤنج میں بید کی کرسیوں کے غلاف اتارنے میں مصروف تھی۔

"اس کمرے میں آجاؤ ــ میں ذرا یہ چادریں وادریں اتار لوں ــ" ستیا کو دیکھ کر اس نے سکون کے ساتھ کہا۔

تمام عمر رہا غمزہ و ناز کا شکار

ڈرائینگ روم کے میز پوش سمیٹ کر وہ فرخندہ باجی کے بیڈ روم میں آگئی۔

"ادھر والا دروازہ بند کر دو۔ بڑا سخت جھکڑ چل رہا ہے۔" اس نے ستیا سے کہا۔ پھر وہ جلدی جلدی سنگھار میز کی چیزیں ہٹا ہٹا کر فرش پر رکھنے لگی۔ ستیا جھاڑ پونچھ میں اس کی مدد کرتی گئی۔ بلقیس نے

فرخندہ باجی اور دولہا بھائی کی مسہریوں کے پلنگ پوش اتارے۔ رضائیاں صاف کیں۔ نیلے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہندوستان ٹائمز کے انبار پر سے دھول جھاڑی۔ دولہا بھائی کے کپڑے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ان کو سمیٹا۔

تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار

برابر کے کمرے میں چھوٹی خالہ نے ہیٹر جلالیا۔ اور شال میں سر سے پاؤں تک لپٹ کر پلنگ پر اکڑوں بیٹھ گئیں اور رلّی کاٹنے لگیں۔ باہر سے بچوں کے ہنسنے اور جھگڑنے کی آوازیں آرہی تھیں سردی اب زیادہ ہوگئی تھی۔ چانکیہ پوری کے ڈپلومیٹک انکلاو میں اعلیٰ افسروں کے سرکاری فلیٹ اور سفارت خانوں کی عمارات دور دور تک بے نیازی سے بکھری ہوئی تھیں۔ مسرور اور مطمئن انسان ان عمارتوں میں بستے تھے۔ دور اشوکا ہوٹل گرد و غبار کے دھندلکے میں لپٹا اپنی عظمت پر سربلند اور منجمد، سنگ سرخ کے اونچے عظیم الشان پہاڑ کی طرح ایستادہ تھا۔ باغوں میں موسم سرما کے پھول کھل چکے تھے۔

تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار۔

لاونج کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کبلا آتش آیا تھا۔ پردیپ کا فون آیا۔ کسی بچے نے ڈرائنگ روم میں چمن سے گلاس توڑا۔ بتول باجی نے یا مدد میں عصر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

چانکیہ پوری سے روانہ ہوکر ستیا شام پڑے کشن لین پہنچی۔ نیلی کوٹھی کے برآمدے میں کھڑی ہوئی دو تین لڑکیوں نے اسے نمستے کیا۔

گارڈن ہاؤس میں ہما اپنے بچے کو لے کر بیڈ روم میں جا چکی تھی۔ اس کا میاں لندن سے واپس آگیا تھا۔ اور وہ تین چار دن بعد اس کے ساتھ اپنی سسرال شولا پور جانے والی تھی۔

گارڈن ہاؤس کے باہر گھاس پر دو ننھے منے تبتی کتے کھیل رہے تھے ۔۔۔ "چنگ اور چاؤ" ۔۔۔ شہزادہ نے ان کو گود میں اٹھا کر ستیا سے ان کا تعارف کرایا: "یہ دونوں دلائی لامہ کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔"

"اچھا!؟"

"اقبال لے کر آیا ہے۔ سرحد سے وہ دلائی لامہ کے قافلے کے ساتھ ڈیوٹی پر تھا۔ پتہ ہے اقبال اب لفٹننٹ کرنل بننے والا ہے ۔۔۔!"

"ہاؤ ونڈرفل ۔۔۔"

اماں باہر نکل آئیں۔

"اری ستیا۔ بہت دنوں بعد دکھی ۔۔۔ کیسی ہے؟"

"اچھی ہوں اماں۔"

"شام ہوگئی ہے۔ سردی میں مت کھڑی رہ۔"

"اچھا اماں۔"

۔۔۔ اس سمے جب دونوں وقت ملتے ہیں، تب مہادیو جی اور پاروتی جی کیلاش سے اتر کر سارے میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی سرد شام کو اماں نے اُسے بتایا تھا۔

ہما اور شہزادہ سے رخصت ہو کر وہ رات گئے قرۃ العین باغ لوٹی۔ صبح سویرے وہ پیرس کے لئے پرواز کرنے والی تھی۔

(۲۲)

جنوری ۱۹۵۵ء کی اس تاریک سہ پہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جب ٹیکسی بولیوار سوشے کی ایک مانوس عمارت کے نیچے جا کر رکی سیتا کو ایسا لگا جیسے وہ صدیوں بعد اپنے گھر واپس آئی ہے۔ کیونکہ جہاں عرفان ہے وہاں گھر ہے۔ جتنی اس کا نوعمری کا رومان تھا۔ جو چند ماہ بعد ختم ہوگیا۔ قمر کے لاابالی پن نے اُسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ پرجیش چودھری سے اُسے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ شہرت اور عزت اور دولت اور مقبولیت ان چاروں چیزوں کی اس کے پاس فراوانی تھی۔ عورتیں اُس پر جان دیتی تھیں۔ مرد اُس پر رشک کرتے تھے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ ایسا بیکس سا معلوم ہوتا تھا۔ سیتا کو پہلی مرتبہ یہ محسوس کر کے شدید طمانیت ہوئی تھی کہ اب تک اس کو قابلِ رحم سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب وہ خود بھی کسی پر رحم کھا سکتی تھی۔ اُس رات پرجیش نے کونسٹی ٹیوشن ہاؤس میں سیتا سے کہا تھا ۔۔۔ سیتا دیبی! میں ساری عمر بے انتہا تنہا رہا ہوں۔ دنیا میری تصویروں کو سمجھ لیتی ہے مگر مجھے نہیں سمجھ پاتی۔ میرے دوست، میرے نقاد، میرے مداح کوئی بھی اصل پرجیش چودھری کو نہیں جانتا ۔۔۔ کوئی اس پرجیش چودھری کو نہیں جانتا جو ایک زمانے میں آدھی رات کو کلکتے کی سنسان گلیوں میں اپنی روح کی تلاش میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ اور اب شہرت اور عظمت کے سب سے اونچے سنگھاسن پر بیٹھا ہے۔ لیکن پھر بھی خوش نہیں۔ ان گنت حسین لڑکیاں میری زندگی میں آئیں سیتا دیبی ۔۔۔ لیکن میری روح کی گہرائیوں تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکی، سیتا کو معلوم تھا کہ پرجیش کمار چودھری زبردست گپ ہانک رہا ہے مگر پرجیش کے اس فراڈ پر تو اُسے ترس آگیا ۔۔۔ جب وہ بچوں کی طرح اُس سے کہتا مجھے تمہاری ضرورت ہے سیتا دیبی ۔۔۔ تو اُسکے اندر چھپی ہوئی ماں جاگ اٹھتی۔

مگر عرفان ۔۔۔ عرفان ۔۔۔

اینڈ۔ وہ قانونی طور پر مسز جمیل تھی۔ مگر اب لزیر کا نقاب تکیے سے آچکا ہے۔ خود کو مسز عرفان کہلانے کا حق اب کوئی اُس سے نہیں چھین سکتا۔ وہ جلد از جلد شادی کر لیں گے۔ عرفان اب اُس کا "عاشق" نہیں ہوگا — اس کا "شوہر" ہوگا۔ مجازی خدا — دیوتا — سب رشتوں سے اہم مقدس خوبصورت، پیارا رشتہ — اُس کا قانونی شوہر —

وہ تیزی سے زینہ طے کرکے اوپر آئی۔ اور اپنے فلیٹ کے دروازے پر جاکر زور زور سے گھنٹی بجانے لگی۔

دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک اجنبی عورت نے سر نکالا۔

"کون —؟"

"میں — مادام عرفان ہوں —"

"جی — ؟ مادام عرفان —؟" اجنبی نے جو غالباً ادھیڑ عمر کا فرانسیسی عورت تھی دروازے سے آدھے باہر نکل کر اُسے غور سے دیکھا۔ "آپ کو یقین ہے کہ آپ مادام عرفان ہیں؟"

"جی ہاں۔ کیوں —؟ — کیا مطلب!" غصے اور شرم اور خفت سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"مگر موسیو عرفان تو کل ہی صبح مادام عرفان کے ساتھ دو مہینہ کی رخصت پر کراچی گئے ہیں — اتنے عرصے کے لئے اپنا فلیٹ مجھے دے گئے ہیں — آیئے — مادام — اندر آجایئے —"

"مادام عرفان —؟" سینیلی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں اس طرح کہا جیسے کنویں کے اندر سے بول رہی ہو۔

"وہی مادام — جو پہلے مادموزیل مارسیل دوبیٹر تھیں۔ وہ موسیو عرفان کے دفتر میں کام کرتی تھیں — شادی پچھلے اتوار کو ہوئی تھی مادام — سابق مادموزیل دوبیٹر نارمنڈی کی ملکۂ حسن رہ چکی ہیں۔ بہت کم عمر ہیں۔ کوئی انیس سال کی ہوں گی —" رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بالکنی میں جاکر اس نے آسمان کو دیکھا۔ "کئی دن سے سورج نہیں نکلا۔ آج بڑی سردی ہے۔ جانے اب کے سال بہار کتنی دیر میں آئے گی۔ آیئے اندر آجایئے — یہاں ہوا بہت تیز ہے —"

تمام عمر رہا عمرہ دادا کا شکار

ابھی دن باقی ہے۔ پھر رات ہوگی۔ پھر صبح ہوگی۔ ایک اور دن — ایک اور رات — سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات۔

دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکتا ہے

تجھ کو پرکھتا ہے۔ یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ ۔ سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات۔
دن اور رات کا حساب — زندگی کوئی تمہاری ڈد کو مینٹری فلم ہے کر کے ساری زندگی ایک
نا کلوزیں سمیٹ دو۔ بلقیس نے ایک مرتبہ صولت سے کہا تھا۔
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ۔
ہوا کے جھونکے سے دروازہ زور سے بند ہو گیا۔

تری دلبری کا بھرم

عزیز احمد

(۱)

اندر گراؤنڈ میں دو پاکستانی طالب علم بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔
"ساتھی۔ تم نے کبھی یہ غور کیا ہے کہ اندر گراؤنڈ میں اگر کہیں دو آدمی یا مرد عورت ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آئیں تو سمجھو کہ انگریز نہیں۔ اجنبی ہیں۔"

انڈر گراؤنڈ کی ٹرین ہالبورن کے اسٹیشن پر رُکی۔ اندر جو لوگ آئے ان میں ایک جوڑا ایسا بھی تھا کہ ایک ادھیڑ پاکستانی مرد کالی ٹوپی میں اور اُس کے ساتھ کاک ٹیل ڈریس میں ایک انگریز عورت، جس کے ماتھے پر اور ہونٹوں کے دونوں جانب ہلکی ہلکی جھریاں نمودار ہو چلی تھیں، مگر جواب بھی بہت حسین لگتی تھی۔

دوسرے طالب علم نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ "ڈاکٹر جمشید علی خاں اور اُن کی میم صاحب۔ انہیں جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

انڈر گراؤنڈ کے باہر سے گارڈ کی آواز سنائی دی۔ دروازے خود بخود بند ہوئے، اور گاڑی چلی۔

"ساتھی۔ میں اس مرتبہ چھٹیوں میں فرانس گیا تھا۔ لیموژ سے پیرس آتے ہوئے گاڑی میں ایک بوڑھے فرانسیسی سپاہی کا ساتھ ہو گیا جو جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو بھئی میں محض نام کو برطانوی ہوں۔ دراصل میں پاکستانی ہوں۔ جو ایشیا کا ایک ملک ہے اور آزاد ہے اور میں انگریز ہرگز نہیں ہوں۔ مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ رنگ ڈھنگ کا ان فرانسیسیوں کو کوئی احساس نہیں ہوتا۔ خیر وہ یہی کہے گیا کہ تم انگریز ہو۔۔۔"

"چلو اچھا ہوا۔ تمہارا رنگ میرے مقابل زیادہ صاف ہے۔ آسمان سے چہرے پر ذرا سا گلٹ کرا کے آئے ہو۔"

"سنو تو سہی۔ اُس کے بعد اُس فرانسیسی سپاہی نے انگریزوں کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ میں انگریز تو بن ہی چکا تھا۔ مجھے خواہ مخواہ انگریزوں کی، اور انگلستان کی، یہاں تک کہ استغفراللہ یہاں کے موسم کی حمایت میں لڑنا پڑا۔ میں نے کہا تمہیں معلوم ہے انگلستان میں تم فرانسیسیوں کو کیا کہتے ہیں؟ فراگس مینڈک۔

کیونکہ مینڈک تمہاری خاص غذا ہے۔ اُس نے کہا، "تمہیں معلوم ہے کہ فرانس میں ہم لوگ کیا کہتے ہیں۔ یہ کہ انگلستان میں مویشی بہت ہیں۔ چراگاہوں میں، کھیتوں میں۔ اور یہی مویشی کپڑے پہن کے شہروں میں سڑکوں پہ چلتے پھرتے ہیں، ریلوں میں سفر کرتے ہیں۔ کبھی ایک، دوسرے سے بات نہیں کرتے۔ ان کو صرف دو لفظ آتے ہیں "تھینک یو" اور "پلیز" اور اگر بہت زیادہ عالم فاضل ہوئے تو ایک اپنے جزیرے کے موسم کا ذکر کرتا ہے اور دوسرا ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔"

اسٹوک وِل کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ بند دروازے خود بخود کھل گئے۔ قدموں کی چاپ سنائی دی اور یہ دونوں پاکستانی طالب علم ڈاکٹر جمشید علی خاں اور ان کی میم صاحب پر ایک بے تعلق سی نظر ڈال کے نیچے اتر گئے۔

(۲)

"میں جمشید علی خاں۔ ڈاکٹر خان۔ ڈاکٹر کان۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں۔ ایک اور طرح کے نیشن شناس ہمینگ وے کی طرح جس نے کلیمان جارو کے برف زار پر ایک چیتا مرا پڑا دیکھا۔ اس کے مقابلے میں میں نے شاید زندگی ——— یعنی جسم روح نہیں ——— اور موت کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ اس نے کلیمان جارو کے برف زار پر ایک چیتے کی لاش کا ذکر سنا جو معلوم نہیں کیسے بھٹکتا ہوا وہاں آ نکلا تھا۔ اور پھر میں سوچتا ہوں کہ وہ کون سی کشش تھی جو چیتے کو کھینچ کر ہمینگ وے کو افریقہ لے جاتی ہے، جہاں کی نیند موت کی نیند ہے۔ جہاں زندگی زندگی کو کھاتی ہے۔ صرف کاٹ نہیں کھاتی، کھا جاتی ہے جہاں گھنے جنگل اور دلدل ہیں۔ اور وہ کون سی کشش ہے جو مجھے یہاں لائی ہے۔ کرسٹل جو میرے پہلو میں بیٹھی ہے یہ لاہور میں بھی میرے ساتھ تھی۔ لیکن اس کا دِل یہیں کہیں اُن پھولوں میں دفن تھا جو مارچ کے مہینے میں کیو گارڈن میں کھلتے ہیں، یا اس چاندنی میں جو چار چار دن کی مسلسل بارش کے بعد چھٹتے ہوئے بادلوں میں سے فروری کی سخت رات میں جھانکتا ہے، یا پارکوں کے سبزہ زاروں میں، یا مکانوں کی اُن قطاروں میں جو ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہیں کہ ایک محلے اور دوسرے محلے میں کوئی فرق نہیں۔ یا تھیٹر، آپیرا، بیلے میں، اور رائل فیسٹیول ہال کی اٹھتی ابلتی ہوئی موسیقی میں۔ اس نے دس سال میرے ساتھ لاہور میں گذارے، اور اب میں اس کے ساتھ لندن اور دس سال گذار چکا . . . . ."

ان دو مویشیوں میں وہ جو بیدار تھی، اُس کا ذہن بھی انڈر گراؤنڈ کی ٹرین کے اس مدھم شور سے بالا بالا آہستہ آہستہ جگالی کر رہا تھا . . . .

"میں کرسٹل کان . . . . . (مسکراہٹ) . . . . . کرسٹل خان۔ عجیب نام۔ کیا معلوم تھا میں
ایک دن اس نام سے پکاری جاؤں گی . . . . . اُس دن جب میری دسویں سالگرہ تھی . . . . . امی میلہ
دیکھنے گئی تھی . . . . . اور میں کرسمس گئی۔ بجز اس کے کہ جب اسکول میں مس جیمس چشم نمائی کرتی تو زور سے
کرسٹل کہتی۔ کرسٹل براؤن۔ براؤن سے خان . . . . . کسے معلوم تھا۔ (تھکن کی مسکراہٹ) . . . . . میں لندن
کے نواح میں پیدا ہوئی۔ جہاں بہاریں لالے لہلہاتے تھے، خزاں میں پتے بکھرتے تھے، جاڑوں میں دھند چھا جاتی
تھی . . . . . اور میں گرم ملکوں، گرم آب و ہوا، دھوپ چلچلاتی ہوئی دھوپ کا خواب دیکھا کرتی تھی . . . . .
میرے بال لال ہیں، کیونکہ میں اسکاچ ہوں . . . . . اور بچپن میں اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں دیکھ کر میں
ترستی تھی کہ میرے بال کالے کیوں نہیں . . . . . مجھے کالے بالوں والے لڑکے پسند تھے . . . . . لندن کے
ذات والی لڑکیوں میں کھیلتی، اُن کے ساتھ پڑھتی۔ لیکن اس نواح، اس "سسریا" اس "سب ٹوپیا" میں میں
اَٹکی تھی . . . . . اور میرا ذہن دُور دُور پہنچتا تھا . . . . . مجھے یاد ہے . . . . . کونک پڑھ پڑھ کے چاند
کے غاروں تک . . . . . اور مریخ کی نہروں تک . . . . . اور ہمالیہ کی چوٹیوں تک . . . . . (مسکراہٹ)
میری ماں کو شہر والی لڑکیوں میں تھوڑا تھوڑا تعصب تھا۔ شاید مجھ میں بھی ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔ یہ کرو۔ یہ نہ کرو۔
راستہ چلتے میں اِدھر اُدھر نہ دیکھو . . . . . کسی نوجوان مرد سے اس وقت تک بات نہ کرو جب تک اُس
سے تمہارا باقاعدہ تعارف نہ کرایا جائے . . . . . صرف تین مقام ایسے ہیں جہاں کسی شریف انگریز لڑکی کا کسی نوجوان
سے تعارف ہوسکتا ہے۔ گھر۔ کلب یا ناچ ہال۔ گھر اور کلب میں تو خیر یہ تو عام تعارف کا معاملہ ہے۔ مگر
ناچ ہال میں ڈیڑھ شلنگ خرچ کرکے اپنی کسی سہیلی کے ساتھ جاؤ۔ تختہ پر چپکی بیٹھی رہو . . . . . تاوقتیکہ کوئی
آکے تم سے ناچنے کے لئے کہے۔ تم اس کی طرف نظر بھر کے دیکھو . . . . . اگر ٹھیک معلوم ہوتا ہے تو اٹھ کے
اس کے ساتھ ناچ لو . . . . . ناچ میں اُس سے الگ الگ رہو . . . . . وہ جو بات کرے، اس کا مختصر سا
جواب دو۔ بس زیادہ کہو کم . . . . . وہ جس معاملے میں جو رائے دے اس سے اتفاق کرو . . . . . وہ دوبارہ ناچنے
کی دعوت دے تو مسکرا کے اٹھو اور ناچو۔ اب شاید وہ تمہیں کافی یا شیری یا کچھ اور پلانا چاہے . . . . . اگر پسند
ہے یعنی اگر نوجوان پسند ہے، تو ہاں کہو نہیں تو نہیں . . . . . اب وہ تمہیں کھانے پر یا سینما چلنے یا تھیٹر چلنے
کو مدعو کرے گا . . . . . اب اگر تم ہوشیار ہو تو ٹرمپ کے پتے تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ بے وقوف ہو تو پٹ جاؤ گی۔
اِدھر اُدھر اُس کے ساتھ شوق سے جاؤ . . . . . وہ کمر میں ہاتھ ڈالے تو کوئی حرج نہیں . . . . . لیکن پہلی بار
ساتھ جاؤ تو صرف رخسار کا پیار کرنے دو، دوسری بار ہونٹوں کا ہلکا سا پیار، تیسری بار اچھا پیار . . . . . اور اسی
طرح اسی طرح مگر یاد رکھو اگر بے وقوف ہو تو پٹ جاؤ گی۔ کچھ بار ساتھ جانے کے بعد اور تمہاری تفریح کا

ملی ادا کرتے کرتے یا تو وہ تم سے اکتا جائے گا یا تم اس سے اکتا جاؤ گی۔ ..... پھر کسی اور ہیلی کے ساتھ ناچنے چل جاؤ۔ تا وقتیکہ کوئی اور آ کے تم سے ناچنے کے لئے کہے ..... اور ان میں سے ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو اکتائے گا نہیں، اور جس سے تم بھی نہیں اکتاؤ گی۔ اور تم اس کی عادی ہو جاؤ گی۔ محبت نام ہے بے تکلفی کے فقدان کا۔ اس کی کوئی اثباتی شکل نہیں ..... سخام۔ گھر کھاتا۔ فرنیچر، پوٹ شیلی ورثہ۔ بچے ..... (اور آخری بار مسکرا کے کرسٹل نے سگریٹ سلگایا)

انڈر گراؤنڈ کے اسٹیشن پر گاڑی ہوا رکی۔ لوگوں کے قدموں اور بوٹوں کی دھم دھم آوازوں اور دور سے دبی دبی ملکی ملکی سی موسیقی، جو کچھ مغربی بھی، کچھ مشرقی ذرا ذرا سی تاسیاں ڈاکٹر خان کے دماغ میں گونجنے لگی۔ اس نے اپنی انگریز بیوی سے آہستہ سے کہا۔

"یہ دعوت آٹھ بجے سے شروع ہے نا؟ ہم بہت جلدی تو نہیں پہنچ جائیں گے۔"

"کیا حرج ہے اسپتال کے قریب تھوڑی دیر ٹہل لیں گے۔ میں فرنیچر کی دوکانوں کی کھڑکیوں سے ذرا سامان دیکھ لوں گی ......"

ڈاکٹر خان نے کہا "مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے گویا کوئی اپنے ماضی سے ملاقات کرنے جا رہا ہے۔ بیس سال گزر گئے۔ میں اور تم دونوں یونیورسٹی کالج اسپتال میں پڑھتے تھے۔ معلوم نہیں پرانے ساتھیوں میں سے اور کون کون آئیں گے۔ اور وہ کہاں کہاں کیا کر رہے ہیں ..... اور کہاں کہاں سے آئیں گے۔"

وہ مسکرائی "ماضی سے ملاقات۔ یہ فقرہ مجھے پسند آیا"

ڈاکٹر خان نے اس کے دستانہ پوش ہاتھ کو آہستہ سے دبایا اور کہا "کرسٹل"

"کیا ہے جمشید"

"معلوم ہوتا ہے کہ اور سب کچھ اور ہر شخص ماضی ہی ماضی ہے۔ کوئی ملنے آتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ ماضی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔ صرف ہم ہیں جو حال میں رہتے ہیں۔ ہمارا ماضی اور مستقبل سب حال ہے"

اس نے اپنے دستانہ پوش ہاتھ سے جمشید کا ہاتھ آہستہ سے دبایا اور ٹرین کی کھڑکیوں پر جو اشتہار تھے دل ہی دل میں پڑھنے لگی "اون کا بدل اور کچھ نہیں" "پارک شائر بلڈنگ سوسائٹی چار فی صد۔ انکم ٹیکس معاف"

اور کرسٹل نے اپنے دل میں کہا "کیا بکواس ہے۔ یہ سب اشتہار یہ حال نہیں، تو اور کیا ہے بیس سال گذر گئے اور مشرق کی منطق اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی"

ٹوٹن ہم کورٹ روڈ کے اسٹیشن پر وہ باہر نکلے اور یہاں کے بین الاقوامی ہجوم میں تھوڑی دیر

گم ہو گئے۔

(۳)

"ڈاکٹر جمشید علی خاں . . . . جنہوں نے یونیورسٹی کالج اسپتال سے ۱۹۳۹ء میں ڈگری لی۔ ڈاکٹر مسز خان پیدائشی نام کرسٹل براؤن۔ . . . جنہوں نے یونیورسٹی کالج اسپتال سے ۱۹۳۹ء میں ڈگری لی۔ . . . ڈاکٹر جان گراہام جنہوں نے یونیورسٹی کالج اسپتال سے ۱۹۳۱ء میں ڈگری لی . . . . "

اسپتال کے کالج کا بوڑھا جمعدار ان پرانے طالب علموں کے ناموں کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا جو بیس سال کے بعد پھر جمع ہوئے تھے۔ دفعتاً ان کے کالج نے انہیں یاد کیا تھا۔ ماضی کا سلسلہ مستقبل سے ملانے کے لئے۔ جمشید اور کرسٹل نے میڈیکل ٹائمز میں اس دعوت کا اشتہار دیکھا تھا، اپنے لئے ٹکٹ منگوائے تھے۔ بیس سال میں سب پرانے ساتھی معلوم نہیں کہاں کہاں منتشر ہو گئے تھے۔ بعض نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اُن کو تو سب جانتے تھے۔ بعض سے لندن میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اور سب معلوم نہیں کیا کیا ہوئے . . . . .

اس دعوت میں شانوں پر جلی حروف میں ہر شخص کا نام لکھا تھا۔ بیس سال کے بعد ایک دوسرے کو پہچاننا بھی تو مشکل ہے۔

"کرسٹل"

"جان"

"تم بالکل نہیں بدلیں۔"

"نہ تم بدلے"

"ہلو۔ خان"

"ہلو۔ جان۔"

"اب بھی تم ویسی ہی خوبصورت لگتی ہو۔"

نقرئی قہقہہ۔ "شکریہ۔ جان۔ اب میں بوڑھی سی لڑکی لگتی ہوں۔ تم نے شادی کی؟"

"شادی۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ ہر ایک کے سر کے بال الگ رنگ کے ہیں۔"

"وہی پرانا جان۔ تم کبھی نہ بدلوگے۔"

"ہلو۔ فلپ۔"

"ہلو۔ ڈارلنگ"

شیری کے گلاسوں کے ساتھ آوازیں حل ہوگئیں۔ گویا اس سارے مجمع میں، ان انسانوں کی جو سب ل بعد ملے تھے، ایک ہی زبان تھی اور وہ زبان ایک فرد کی زبان تھی: نیم مذکر، نیم مونث جس کے الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے، محض سنسنی میں ملی جلی آوازیں آواز تھی۔

اور پھر یہ منفرد آواز، منتشر آوازوں میں تقسیم ہونے لگی۔

"جنگ کا زمانہ میں نے شمالی افریقہ میں گذارا۔ میڈیکل کور میں۔ جنرل آکن لک کے ساتھ آگے بڑھا۔ رومل نے پیچھے ڈھکیلا۔ پھر جنرل ویول کے ساتھ۔ پھر فیلڈ مارشل ویول کے ساتھ۔ یہ بایاں ہاتھ (ثابت قدمی کا قہقہہ) اپنی بایاں ہاتھ میں بن غازی میں چھوڑ آیا۔۔۔۔"

اسٹائن مائر۔ اشتائن ائر تھیں یہ جنہوں یہودی جس نے یہاں آکے پناہ لی تھی۔ ہم نے ہمیشہ مظلوموں کو پناہ دی تھی۔۔۔۔ سنا آسٹریلیا میں اس کا مطب خوب چل رہا ہے۔۔۔۔"

"گریس بغریب گریس۔۔۔۔ تیس سال کی تھی کہ اس کے دماغ میں دق کا پھوڑا نکل آیا۔ اور آپریشن ٹیبل پر چل بسی۔ خود اس کا ہاتھ آپریشن میں کس قدر صاف تھا۔۔۔۔ "

"ہلو۔ خان۔ کیا تم لاہور سے محض اس دعوت میں شریک ہونے آئے ہو۔۔۔۔ کیا کہا دس سال سے لندن میں ہو؟۔۔۔۔ اور مجھ سے اور میری سے ایک مرتبہ بھی ملنے نہ آئے۔ نہ ٹیلی فون کیا۔۔۔۔ ہلو کرسٹل۔ مجھ سے یہ نہ کہنا کہ خان نے تمہیں برقع پہننا شروع کردیا ہے۔ ہاں یہ تو بتاؤ اس کے حرم میں تم کس نمبر کی بیوی ہو۔ دوسری؟ تیسری؟۔۔۔۔ کبھی تم لوگوں سے ضرور ملاقات ہونی چاہئے۔۔۔۔ میری۔۔۔۔ میری۔۔۔۔ میم صاحب میری۔۔۔۔ ڈارلنگ ہم خان اور کرسٹل کو کب کھانے پر بلائیں۔۔۔۔ اگلے ہفتے کسی روز۔۔۔۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟"

"ڈِک۔ تم کبھی نہ بدلو گے۔"

اور یہ منتشر شیرازہ جو یکجا تھا، فرد واحد کی طرح شیری پیتا رہا مچھلی کے سموسے، نمکین بادام اور کاجو کھاتا رہا۔ گھنٹہ بھر کے بعد سب منتشر ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ ان میں سے کئی کئی اور سے مرتے دم تک پھر نہ مل پائیں۔ کیونکہ زندگی بہت بڑا جھلا پا ہے۔ اور دوسروں کی طرف جن سے غرض نہیں، واسطہ نہیں، زیادہ توجہ نہیں کرنے دیتی۔

(۴)

بالہم میں اپنے مکان کی خوابگاہ میں جب ڈاکٹر جمشید علی خاں اور کرسٹل واپس پہنچے تو رات کے

گیارہ بج چکے تھے۔ چند گھنٹے پہلے جو بھوت ماضی کے دھندلکے سے تھوڑی دیر کے لئے نمودار ہوئے تھے۔ ایک مفصل سے خواب کا سا اثر چھوڑ کے، پھر ماضی کے ذرا اور ہلکے سے دھندلکے میں روپوش ہونے لگے۔ بیس سال ہوں یا بیس منٹ، ماضی آخر ماضی ہے۔ کمان سے نکلا ہوا تیر۔ اور اگر کوئی حقیقت حال میں باقی تھی تو یہ کہ دونوں میاں بیوی۔ جمشید اور کرسٹل جو دنیا کے بعید کناروں کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے بیس سال ایک ساتھ گذارے تھے۔ صرف دو چیزیں ان کے درمیان مشترک تھیں، ایک تو ان کی جنسی کشش، جو انہیں ایک دوسرے کے قریب کھینچ لائی تھی۔ اور دوسرے ان کا پیشہ ڈاکٹری جس نے انہیں ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے دیا تھا۔ اثبات کی ان دو صورتوں کے مقابل نفی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نشانیاں تھیں۔ رنگ، نسل، تمدن، مذہب، اور اس مرکب سے پیدا ہونے والے اور بہت سے الجھاؤ۔ طبیعت "ہیبت" لاشعور سے کبھی کبھی نکل کے اپنی بھیانک شکل دکھلانے والی طبیعت، اور ایک اجنبیت جو کسی طرح ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔

اس بیس سال کے ہر بارہ مہینوں کے تیس دنوں کی طرح آج بھی حمام سے جمشید کے دانت صاف کرنے کی آواز آرہی تھی۔ اور کرسٹل اپنے بالوں میں آئینہ کے سامنے پن جمارہی تھی۔ کہ دفعتاً جمشید نے اس کے دونوں شانوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کے اس کے بالوں کو ... چوم لیا۔ اور کہا "کرسٹل"

"کیا۔ ڈارلنگ"

"تمہیں۔ مجھ سے محبت ہے؟"

"ہاں بے شک۔ کیوں جم..... آج کیا ... کے بعد ذرا رومانٹک موڈ میں ہو"

"نہیں۔ بوڑھی لڑکی یہ بات نہیں۔

"کبھی کبھی تھوڑے سے رومان میں ہرج بھی نہیں۔ دن بھر کے کام، اور تمہارے ناپسندیدہ مریضوں، اور دواؤں کی مہک اور جراثیم سے کشتیاں لڑنے کے بعد"

"ٹھیک ہے۔ ڈارلنگ"

اس نے لحاف اوڑھتے ہوئے پوچھا "کیا؟"

"یہی جو تم کہہ رہی تھیں۔ دن بھر کے کام، اور مریضوں اور جراثیم کے بعد پھر رات آتی ہے اور تمہارے سوا کوئی اور باقی نہیں رہتا"

"مجھے تم سے محبت ہے جم"

"میں بھی ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ڈارلنگ۔"

"یہ بیس سال ایسے بُرے نہیں گذرے۔ کیوں تمہیں افسوس تو نہیں؟"

"کس بات کا؟ جم۔"

"مجھ سے شادی کرنے کا۔"

"کیا خرافات۔ کیا مہمل باتیں کر رہے ہو۔ افسوس! نہیں جم۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ کبھی کبھی وہاں لاہور میں گرمیوں اور گندگی میں۔ اور وہاں کی سڑکوں پر جاہل مرد ہی نظر آتے ہیں عورتیں نہیں۔ وہاں بھی میں کبھی کبھی جان سے بیزار ہو جاتی تھی۔ مگر تب بھی مجھے تم سے شادی کرنے کا افسوس نہیں ہوا؟"

"یہ سچ ہے؟"

"یہ بالکل سچ ہے۔ اور میں یہ کبھی نہ بھولوں گی کہ تم میرے لئے اپنا وطن چھوڑ کے یہاں آئے۔"

"اور تم نے میرے لئے اپنا وطن چھوڑ کے اپنی زندگی کے ... دس سال لاہور کی تپتی ہوئی گرمیوں میں گذارے ......"

"نہیں نہیں۔ جم لاہور ایسا برا نہیں تھا۔ میں بتاؤں مجھے ... کی سردیاں بہت پسند تھیں۔ ایک چیز تھی جو مجھے البتہ شاق گذرتی تھی۔ جب میں کلب جاتی تھی......"

"مجھے ... ... برس ڈارلنگ کچے انگریزوں کی پکی میم صاحبوں کی نظر میں۔ اس نے کالے آدمی سے شادی کرلی ہے۔ اب یہ نچلے طبقے کی ہے۔"

"جم ڈارلنگ۔ چھوڑو اب یہ بھی بھول جائیں۔ تمہارا ملک آزاد ہو چکا۔ پکی میم صاحبیں اب لاہور کے مال پر نہیں رہتیں۔ کچھ بچاریاں کنسنگٹن میں ہیں کچھ بورن متھ میں اور زمانے کے ساتھ گذر جائیں گی۔"

"کرسمس ڈارلنگ۔ مجھے پکی میم صاحبوں سے کوئی شکایت نہیں۔"

کرسٹل نے اس کا ہاتھ دبایا۔ اور اپنے دوسرے ہاتھ کو اسکے بالوں پر پھیر کر "شب بخیر" کہا اور ... آہستہ سے ... اپنے بستر پر نیند کا انتظار کرنے لگی۔

ڈاکٹر جمشید کو نیند کا انتظار نہیں تھا۔ نیند اس کی آنکھوں میں یا تو کسی طرح نہ آتی تھی۔ آتی تھی تو مرگ ناگہانی کی طرح اچانک آتی تھی۔ غنودگی کے سکرات سے وہ ہمیشہ نا آشنا رہا۔ ... ... وہ سوچتا، تو لیٹے لیٹے گھنٹوں سوچتا۔ یہاں تک کہ دفعتاً نیند نازل ہو جاتی۔ اور یہ سلسلہ یکلخت منقطع ہو جاتا۔

(۵)

اُس کے مطب میں مریض جمع تھے۔ اور نرس کچھ مریضوں کو اُس کے پاس بھیج رہی تھی — اور کچھ مریضوں کو
[illegible]ل کے پاس۔ ایک عظیم الشان جنگ اور کشمکش تھی۔ انسانوں اور جراثیم کے درمیان انسان سے اور ز[illegible]
[illegible]ت کے درمیان۔ ایک طرح سے انسان اور فطرت کے درمیان۔ اور دو سپاہی تھے۔ دو سپاہی [illegible]
[illegible]رس۔ اور کچھ دوائیں۔ کچھ انجکشن۔ کچھ علم جو ابھی نامکمل ہے۔ کچھ تجربہ جو کبھی کبھی کام آجاتا ہے۔ کچھ سمجھ بوجھ اور
[illegible] بھٹکنے کی سی اندھیرے میں ٹٹول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

جمشید نے اور کرسس نے جراثیم کا مطالعہ شروع کیا۔ کرسٹل جراثیم سے کھیلتی رہی۔ اور جمشید انسانوں سے
سوچنے لگا۔ یہ جو جراثیم کا نشانہ بن بن کے اُس کے پاس آتے تھے۔ اِن کی بھی اُسی کی سی زندگی [illegible]
[illegible] جراثیم کے مقابل بہت زیادہ مرکب۔ بہت زیادہ اُلجھی ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مجھے وہ دن یاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور یہاں ناگہاں نیند نے خیال کا، یاد کا رشتہ منقطع کر دیا۔

(۶)

اور پھر صبح سے کچھ دیر پہلے، جب نیند اور آنتوں اور کھائی ہوئی غذا اور خطروں کے [illegible] مرکز [illegible]
[illegible]ے ورلے خواب [illegible] میں آتے ہیں۔ اور [illegible] جاگتا ہے، اور اس جاگ میں ایک طرح کی تھکا دٹ ہوتی
زندگی کو [illegible] جیسے نیند کو نشہ [illegible] اتار سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس حالت میں جاگ کے اندھیرے میں جمشید نے
ماضی کی پرچھائیوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔

[illegible] پرچھائیاں تھیں جو جیسے بن تصویروں کی طرح، اِدھر سے اُدھر حرکت کر رہی تھیں۔ اور ان میں
[illegible] ایسی تھیں جن کے ساتھ وہ وابستہ تھا۔ اور اس کی اپنی یا اپنے سے تعلقوں کی زندگیاں۔

ایک تو جیسمین تھی۔ یا جیسے وہ اپنے آپ کو کہا کرتی۔ یاسمین۔ یہی اس کا اصلی نام تھا۔ کیونکہ وہ پہلی
[illegible] عظیم میں مشرق اور مغرب کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ مراکو کے ایک امیر کے تخم سے ایک فرانسیسی عورت
[illegible]طن میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یاسمین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جسے اُس نے پہلی مرتبہ ایک آرٹسٹ دوست کے [illegible]
دیکھا۔ اُس کے بال [illegible] بھورے تھے، اور آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح بڑی تھیں، اور [illegible]
[illegible] گرمیوں [illegible] ہلکا سا سانولا پن آجاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو دنیا سے نرالے کپڑے پہنتی تھی جس [illegible]

یہ تھا کہ جس لڑکے کو جس قدر لوٹ سکو لوٹ لو۔ اس کی واحد تمنا یہی تھی کہ بمبئی جا کے ایکٹرس بن جائے۔ اور اس آرزو کو پورا کرنے میں اس کا عزم اتنا مستقیم تھا کہ وہ دل ہی دل میں اسی فکر میں لگی رہتی۔ کوئی اسے ڈانس یا بال لے جاتا۔ تو بجائے اسکے کہ وہ اس خاموشی سے لسٹ کی کنسرٹ کو سنے کہ اگر زمین پر کہیں سوئی گرے تو اس کی بھی آواز سنائی دے، وہ کھسر پھسر کرنے لگتی کہ میرے لئے بڑا ضروری ہو گیا ہے کہ میں ہدایت دی کرلوں اور تم مجھے بہت پسند ہو۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ اسے پھر کبھی البرٹ ہال نہ لے جاتا۔

وہ حضرموت کے دو طالب علموں کو فرانسیسی پڑھاتی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک نے اس سے الگ کہا "تم اس طرح اکیلے کب تک رہو گی۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ کسی ایسے بڑے سے جو تم سے دن رات فرانسیسی بولا کرے۔" اگر اسے یہ بات ان دونوں میں سے صرف ایک سے کہی ہوتی تو شاید اس کا کام بن جاتا۔ پھر وہ گھر کی منتظم کی حیثیت سے نہیں بدوست ان طالب علموں کے ساتھ رہنے کی تجویز نے ایک تثلیث کر کے پرے رکھا تھا۔ وہ انگریز کہا کرتی "ایک کے ساتھ رہنا خطرناک ہے تین کے ساتھ رہنا زیادہ محفوظ ہے۔" اس سارے عرصے میں اس کا ایک محض ایک نصب العین تھا کہ کسی طرح بمبئی جاکے سینما ایکٹرس بن جائے۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار وہ بمبئی پہنچ جائے تو پھر اس کی کامیابی یقینی ہے۔ کوئی لاکھ اسے سمجھاتا کہ تمہیں زبان نہیں آتی۔ بمبئی میں خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں۔ وہ زمانہ گیا جب ہندوستانی سینما میں اینگلو انڈین لڑکیاں ہیروئن بنا کرتی تھیں۔ اب ایک نیا طبقہ پیدا ہو چکا ہے لیکن یہ اپنے پکے ارادے سے کسی طرح باز نہیں آتی تھی۔ . . . . . . آخر انتظار کرتے کرتے اس نے ایک دن محسوس کیا کہ میں اور زیادہ انتظار کرتی رہوں گی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری جوانی ہی رخصت ہو جائے۔ اس نے ہمت کر کے آخری جوا کھیلا۔ اس نے اپنے بمبئی لاہور پٹنہ اور کلکتہ، دہلی کے دوستوں سے کہنے کے لئے چندہ مانگنا شروع کیا۔ اس نے اپنے کرایہ اور بمبئی میں چھ ماہ رہائش کا بجٹ تیار کیا۔ اور یہ چندہ دس پونڈ فی کس تھا۔ وہ ایک ایک کے کمرے پر پہنچی۔ تقریباً ہر دوست نے جس نے چندہ دیا تھا قیمت بھی وصول کر لی . . . اس نے یہ کہہ کر کہ "تم بڑے بڑے مطلبی ہو" چپ چاپ قیمت ادا کر دی . . . . . ایک آدھ صاحب نے قیمت تو وصول کر لی اور چندہ دینے کا نام نہ لیا . . . . . انہیں اس نے اپنے انداز میں سزا دی۔ کہنے لگی۔ "جانتے ہو اسی محلے میں کتنے حبشیوں سے میرے تعلقات رہ چکے ہیں۔ کم سے کم پانچ سے۔ تم مجھے ابھی تک معصوم سمجھتے تھے . . . . ." محض یہ ظاہر کرنے کو کہ یہ ستم کمینگی کی انتہا تھی۔ پھر وہ ایک مصری افسر کی معشوقہ بن گئی اور اس نے اتنے پیسے جمع کر لئے کہ بمبئی جا سکے۔ وہ پی اینڈ او کے اسی جہاز سے روانہ ہوئی جس سے جمشید لیپ جا رہا تھا۔ بمبئی پہنچ کے اس نے فلم سازی کے اسٹوڈیوں کی خاک چھاننا شروع کی۔ اور چھ ہفتے کے اندر اندر

میں مبتلا ہوئی اور مر گئی۔ . . . . . .

۵ جب یہ بھوت یاد کے تحت الشعور میں تہہ نشین ہو چکا تو ایک اور شکل نظروں کے سامنے ابھری جیسے روپہلا ستارہ، جیسے ہنستا گاتا چاند۔

"ملڈ، میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی مجھے کبھی اس کی جرأت ہی نہ ہو پائی۔ تم کچھ اس قدر حسین معلوم ہوتی تھیں۔ تم میں اس قدر زندگی تھی کہ مجھے ایک طرح کا خوف محسوس کرتا تھا گویا تم سے قریب ہوتے ہی خطرہ سا تھا۔ تمہارے چمکتے ہوئے سنہرے بال، تمہاری آنکھیں جو میرے وطن اسکاٹ لینڈ کی جھیلوں کی طرح نیلی تھیں، تمہارے پریشان ابرو، تمہارے سانچے میں ڈھلے ہوئے جوڑ بند . . . . نہیں ڈیر، تم سے ملاقات ہوئی ہے میں اور گرسٹل دوست تھے۔ اور پھر دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ اور تم گرسٹل کی بہن تھیں لیکن میں ایک طرح کی باطنی نظروں سے یا یہ تمہاری زندگی کو ٹکٹکی باندھے تکتا رہا تھا. اس بھرپور زندگی سے لبالب زندگی سے چھلکتی ہوئی زندگی کا کیا حشر ہوگا۔ یہ شاداب کرتا ہوا سیراب کرتا ہوا دریا کس رخ بہے گا۔ تمہارا مستقبل بہت ... اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ سورج جو تمہارے چہرے میں تمہاری شفاف سفید جلد میں چمک رہا ہے کبھی غروب نہ ہوگا۔ تمہیں یاد ہے اب سے بائیس سال پہلے جب گرسٹل اور میں تمہارے ساتھ جھمبلز گئے تھے۔ تم گھوڑے کی سواری کے بریچز پہنے ہوئی تھیں۔ تمہارے ہاتھ میں چھوٹا سا چابک تھا۔ تمہارے ساتھ تمہارے دو چاہنے والے تھے۔ اور میں محسوس کرتا تھا کہ تمہاری شادی بڑی دیر سے ہوگی۔ تم نے کتنے انتظار کرتے زمانوں میں گزارے۔ اُن کی ان تھک کس قدر چاہتی تھی۔ اور مجھے اڈوانی پر ترس آتا تھا جو کلب کے دروازے پر تمہارے انتظار میں کھڑا رہتا جس نے کبھی تم سے برابری کا دعویٰ نہ کیا جس کی عاجزی اور حرمت انکسار کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پھر میں گرسٹل اور ہم چلے گئے۔ تمہیں یاد ہے کہ تقسیم کے سال جو بعد مری میں ایک دوکان پر کھڑی تم پشاوری چپل خرید رہی تھیں میں نے تمہیں نہیں پہچانا . . . . تمہاری صورت شناسا معلوم ہوئی۔ تمہارے بالوں پر اب بھی آفتاب چمک رہا تھا، مگر تمہارے چہرے پر ہلکی سی زردی چھا چکی تھی . . . . . تمہارے حسن میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ تم نے مجھے پہلے پہچان لیا اور پوچھا "تم ڈاکٹر خان تو نہیں ہو — یہاں ہزاروں خان ہیں۔ میرا مطلب ہے جمشید علی خاں۔

"پھر میں اور گرسٹل جب کراچی آئے تو تم سے ملنے آئے۔ تم بستر پر پڑی تھیں۔ تمہارے پھیپھڑوں پہ پلیورسی کا اثر تھا۔ میں اور گرسٹل تم سے باتیں کر رہے تھے۔ اپنے دفتر سے اڈوانی تھکا ماندہ آیا اور گویا اپنا حقِ شوہری جتانے تھوڑی دیر کے لئے تمہارے پہلو میں لیٹ گیا۔ سوائے ملکیت جتانے کے اُس نے

ہم سے زیادہ بات نہ کی۔ لیکن مجھے حیرت سی تھی۔ سٹینلی ڈی ویرا اور اڈوانی کی دوستی خوشگوار اور گہرے
کی دوڑ تھی۔ اور کچھ اجنبیت سیا۔۔۔۔۔ مگر معلوم ہوتا تھا سٹینلی کے ساتھ تو تم بھی کچھ ہار گئیں۔ کوئی
چیز تھی جو تمہارے اور اڈوانی کے درمیان شکست پا چکی تھی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی۔ اور گر رہی تھی۔ اور سنبھلے
نہیں سنبھلتی تھی۔ اب بھی وہ اسی طرح تمہارا چاہنے والا خادم تھا۔ اب بھی وہ پہلے آپ کو تنہا یا بے سہارا نہیں
سمجھتا تھا۔ اب بھی وہ تمہیں تخت پر بٹھائے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ اور اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے آ کے
تمہارے پاس بیٹھ گیا تو محض ہم لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ آسمان پر غضب اور زمین پر سب کچھ
ٹھیک ہے۔ اور پھر وہ اندر ہی اندر گھٹنوں میں اٹھتی ہے جو اپنے ساتھ ہزاروں ہزار شیشے باقی ہے اور اس کی تہ میں
آہستہ پھیپھڑوں پر چڑھ جاتی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ ٹی بی نے اندر سے کھانا شروع کیا۔ ہم لوگوں نے
لاہور میں تمہارے مرنے کی خبر سنی۔ کرسٹل دو روز تک بہت خاموش خاموش رہی۔ اور ایک روز ناشتہ
کرتے وقت اس نے پہلی بار کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ملیکہ انگلستان میں ہوتی تو شاید اتنی جلدی
نہ مرتی۔۔۔۔۔۔"

"تھوڑی دیر کے بعد کرسٹل نے جلدی سے کہا "یا شاید جلد انگلستان میں بھی جلد ہی مر جاتی۔
اسے بے اندازہ صحت اور طاقت ملی تھی مگر تھوڑے دنوں کے لئے۔ شاید وہ انگلستان میں بھی مر جاتی۔
کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم لوگ یہ جو کہتے ہو کہ جب تک انسان کا وقت نہیں آتا وہ نہیں مر سکتا۔
اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔"

"اور اُس شام کو میں نے کرسٹل سے کہا "ڈارلنگ۔ ہم اور تم انگلستان کیوں نہ چلے چلیں وہاں
ہم اور تم اگر اتنا نہ کما سکیں جتنا یہاں کماتے ہیں تو کیا حرج۔ وہاں تم خوش تو رہو گی۔" کرسٹل نے جلدی
سے جواب دیا "کیا بکواس۔ مجھے لاہور پسند ہے۔ میں یہاں خوش ہوں۔ یہاں ہماری پریکٹس اچھی خاصی
چل رہی ہے۔ اسے چھوڑ چھاڑ کے ہم لندن کیوں جائیں۔" جب وہ یہ کہہ رہی تھی اُس کی نظریں جھکی ہوئی
تھیں۔ وہ مجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے جھجک رہی تھی کہ میں اس کی آنکھوں میں اپنے وطن واپس جانے کی
تمنا پڑھ نہ لوں۔"

(۷)

دوسرے دن صبح کے نو بجے۔ روز ٹھیک نو بجے صبح کو ڈاکٹر جے۔ اے۔ خان اور ڈاکٹر کرسٹل خان
کے انفرادی وجود ختم ہو جاتے تھے۔ اتوار کے سوا ہر روز۔ اور ان دونوں کی جگہ کوئی اور دو مشینیں لے لیتیں۔

جو اپنے آپ اور اپنے مسائل یا ان سے بے نیاز دوسری دنیا میں محو ہو جائیں۔ مریضوں میں۔ دو آئینے تھے جن میں جراثیم کی مستقل تعریفیں، تصویریں اور علامتیں، لیبارٹری ٹیسٹ تھے۔ وہ حساس آلے تھے جو دل کی دھڑکنیں ناپتے۔ اور بہلا رہا شام تک رہتا۔

ڈاکٹر خان اور مسز خان نے سفید اوور آل پہنے۔ اور نرس نے باری باری سے ان مریضوں کو بھیجنا شروع کیا۔ جو تشویش لیے، نرس کے سہارے اپنے جسم اور کبھی کبھی اپنی روح کی مرمت کرانے آتے۔ اور شفا ایک آئینہ خانہ تھا۔

اس آئینہ خانے میں بیماری کا تعلق ذہن سے بھی تھا۔ جراثیم کے عقب میں روحیں تھیں۔ بیمار اور صحت مند، شکاری اور شکار، لیشاش اور بیزار۔

(۸)

"آئیے۔ آئیے۔ ماسٹر اقتدار الاولیا۔ کہئے آج صبح کیا حال ہے؟"

اور ماسٹر اقتدار الاولیا تشریف لاتے ہیں۔ یہ چاٹ گام میں ایک مدرسے میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ پچیس چھبیس سال کی عمر ہے۔ لندن یونیورسٹی کے انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن میں ایم۔ اے کر رہے ہیں۔ چھوٹی سی داڑھی ہے۔ یہاں بھی پنجوقتہ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں۔ ذبیحہ کے بغیر گوشت نہیں کھاتے نامحرموں کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے۔ پڑھنے کے سوا اور کسی کام سے سروکار نہیں لیکن ہمیشہ ایک طرح کی اعصابی کمزوری کے شکار رہتے ہیں۔ کچھ دروازے انہوں نے بند کر رکھے ہیں، جن پر کوئی بار بار دستک دیتا ہے، اور یہ ان کو کھولنے کا نام نہیں لیتے۔

"اچھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ اللہ کا شکر ہے۔ ادھر ایک ہفتے سے نیند اچھا آ رہا ہے۔ آپ جیسا بتاتا تھا۔ میں ترکاری زیادہ کھا رہا ہوں۔ رمضان میں روزے سے صحت اور اچھا ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے۔ مگر سر بہت درد کرتا ہے۔"

"یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ جب سر میں زیادہ درد ہو تو دو اسپرو گرم پانی کے ساتھ کھا لیا کیجئے۔ یہ اعصابی درد ہے۔ روز ایک گھنٹے کے قریب ٹہلا کیجئے۔ میں حیاتین ب کا ایک ٹونک لکھے دیتا ہوں۔ . . . . ."

اور ماسٹر اقتدار الاولیا نسخہ ہاتھ میں لئے باہر جاتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جو لندن کی سڑکوں کے کناروں پر کئی کئی منزلوں میں آباد ہے۔ ایک مبہم سا احساس ان کے دل میں ابھرتا ہے۔

"میں یہاں اجنبی ہوں۔ اجنبی ہوں۔ یہ سب اجنبی ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اور میں۔ یہ اور ہوں۔ میں انہیں اپنے کو حقیر نہیں سمجھنے دوں گا۔ میں ان سے کچھ سیکھنے آیا ہوں۔ یہ ملک اچھا ملک ہے، لیکن مجھے چاٹ گام میں کام کرنا ہے۔ مجھے لندن پسند ہے۔ مجھے چاٹ گام سے، مشرقی پاکستان سے، خوبدار بنگالی زبان سے، اپنی بنگالی منگیتر کی دھواں دھار زلفوں سے محبت ہے۔ مجھے مشرقی پاکستان کی برسات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہاں اکیلے میں، اپنے کمرے میں بند، جب میں کھڑکی کے باہر دن دن بھر پانی کی ہلکی ہلکی پھوار دیکھتا ہوں، اور سردی کی لہر ریڑھ کی ہڈی پر چڑھ جاتی ہے تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں اپنے سر کے درد کو کیا کروں۔ . . . . . اس سے میری پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے۔ میں اجنبی ہوں، یہ دنیا اجنبی ہے، اس لئے میرے سر میں درد ہوتا ہے . . . . ."

اور ماسٹر اقتدار الاولیا آہستہ آہستہ ڈاکٹر خان کے مطب سے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سب کون ہیں جو پتیوں اور پریوں کی طرح اپنے اپنے کام پر چلے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ راستے میں کوئی کسی کو ٹھہرا کے خیریت نہیں پوچھتا۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں۔ بسوں اور موٹروں کے مرکب شور کے سوا کوئی آواز نہیں۔ انسانوں کی بات چیت کی آواز کس قدر کم ہے . . . . . یہاں کیسا سکون ہے . . . . . ماسٹر اقتدار الاولیا ایک دکان کے سامنے ٹھہرتے ہیں۔ یہ بجلی کے سامان کی دوکان ہے۔ ریڈیو گرام۔ ٹیلی وژن۔ بجلی کے چولھے، ہر چیز قسطوں پر ملتی ہے۔ یہاں ہر ایک کو دوسرے پر کتنا اعتبار ہے۔ یہاں ہر معاملے کی ابتدا اعتبار سے ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں بے اعتباری سے۔ ہمارے ملکوں میں ہر شخص اس وقت تک مجرم ہے جب تک وہ خود آپ کو بے گناہ نہ ثابت کرے۔ آخر کیوں۔ غریبی؟ تعلیم کی کمی؟ ذمہ داری کے احساس کی کمی۔ مجھے واپس لوٹ کے چاٹ گام میں بہت کام کرنا ہے۔ مگر میں اکیلا کیا کروں گا —— اور میرے سر میں کس شدت کا درد ہو رہا ہے . . . . .

ماسٹر اقتدار الاولیا آگے بڑھتے ہیں اور ایک ڈانس اسکول کا سائن بورڈ پڑھتے ہیں ——
بالہم اسکول آف ڈانسنگ —— ماسٹر اقتدار الاولیا نے کبھی ڈانس نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض ہے بہرحال وہ بر رہے انہیں بذاتِ خود اس سے کوئی خاص سروکار نہیں۔ پھر بھی کوئی نہفتہ خواہش . . . . . گناہ . . . . . شاید نہیں۔ بہرحال دنیا میں اور بہت سے ضروری کام ہیں۔ اور وہ کالے بادلوں جیسی گھنی زلفوں والی لڑکی جو اسکے اور اپنے والدین کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ماسٹر اقتدار الاولیا ایک لمحے کے لئے اُن دو سنہرے بالوں والی لڑکیوں کو دیکھتے

تب جو سلیک پہنے، چُنگٹ گم چال ہوئی سامنے سے چلی آ رہی ہیں۔ اور پھر نظر پھیر لیتے ہیں۔

کوئی گناہ نہیں، ذوقِ دید و شوقِ نظر
جز اس کے لذتِ نظارگی گوارا نہ ہو

اور مارے شرافت ہمارا لاڈلا نیا اُس ہجوم میں گم ہو جاتے ہیں۔ جو انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی سیڑھیاں اتر رہا ہے

(۹)

"آئیے۔ تجلی صاحب۔ کیسے مزاج ہیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"دو چار روز سے بخار آ رہا ہے۔ معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کو ہمیشہ وقت بے وقت تکلیف دیتا رہتا ہوں۔ آپ ہمیشہ عنایت فرماتے رہتے ہیں۔"

جب کوچ پر لٹا کے ڈاکٹر خان اُس کی آنکھیں، دل کی رفتار، پیٹ کے نفخ وغیرہ کا معائنہ کر رہا تھا تجلی صاحب کی زبان چلتی جا رہی تھی۔

"نوازش العالی ہے۔ کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب، آپ بہت عنایت فرماتے ہیں۔ میں یعنی کہ آپ کا بہت مشکور ہوں۔ اس مغربی معاشرے میں مجھے تو مخالفت کرنے والے بہت نظر آتے .....

"کیوں۔ کیوں۔ تجلی صاحب۔ کیا ہوا"

"پہلے میں جس گھر میں تھا وہاں کی لینڈلیڈی بہت بیہودہ تھی تو کچھ صاحب میں اب ... تو ہوں۔ نہا رہا تھا۔ اُسی سے۔ یعنی ... بد قسمتی سے ... میں نہا رہا تھا۔ اتفاق سے ٹب ... بہت زیادہ بھر گیا تھا تو ذرا سا پانی فرش پر گر گیا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ فرش ... ذرا گندا ہو گیا۔ میں کپڑے بدل ہی چکا تھا کہ وہ بھیڑیئے کی مادہ کی طرح میرے کمرے میں گھس آئی اور گرجنے لگی کہ تم نے فرش گندا کیا ہے۔ اسے صاف کرو۔ میں نے اسے پہلے تو سمجھایا کہ یہ نوکروں کا کام ہے۔ میں نہیں کرتا۔ کہنے لگی یہاں نوکر نہیں ہوتے۔ یہ میں مانتا ہوں مگر انصاف کیجئے ڈاکٹر صاحب۔ میں سیوائل رو کا سلا ہوا پچاس گنی کا سوٹ پہن چکا تھا میری نائلون کی قمیص ہی تین پونڈ کی تھی۔ میں ان کپڑوں سے فرش صاف کرنے جاتا۔ بس مجھے غصہ آ گیا۔ اور میں نے کہہ دیا بے وقوف گائے۔"

ڈاکٹر خان نے مسکرا کے پوچھا "اور اس نے کیا کہا؟"

"اب میں کیا بتاؤں۔ اُس نے مجھے ایک دم سے اسکوئیکنگ پِگ کہہ دیا۔ یہ ایک طرح سے میری آواز پر طنز تھا۔ کیونکہ میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں بہت آہستہ آہستہ بولتا ہوں۔ مگر مجھے پِگ یعنی کتے

کہہ دیا۔ دیکھیے نا یہ نہ صرف میری بلکہ میرے آباؤ اجداد کی توہین تھی۔ میں نقشبندی سید ہوں۔ !
آپ ہی انصاف فرمایئے اس کی اس گستاخی کا سلسلہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ اس نے مذہب اسلام کی
توہین کر ڈالی۔ مجھے یکلخت غصہ آ گیا۔ میں نے پہلے تو اسے سیل کا ذکر کیا تھا۔ بے وقوف کائنے ہوئے مزر
ت ہے۔ غصہ کے عالم میں میں نے کہہ دیا۔ ڈرٹی بچ۔ گندی کتیا۔ یہ شاید مجھے نہ کہنا چاہئے تھا۔
بہرحال اب تو عیسائی مذہب اور اسلام کی لڑائی ٹھن گئی تھی . . . . "
" اور آپ اپنے کمرے میں سلطان صلاح الدین کی طرح جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔"
" ڈاکٹر صاحب۔ آپ تو مذاق فرماتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ جیسے اب میں نے ملائم لفظ استعمال کیا ہے
ویسے وہ خاموش ہو جائے گی۔ مگر اس نے اور زور سے چلا کے مجھے سور کہہ دیا۔ سور۔ ذرا خیال تو کیجئے۔ جس
کا کھانا تک حرام ہے۔ نہ یہ کہ سور کا لقب پانا . . . . . بس ڈاکٹر صاحب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ
میں کیا کروں۔ میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ میں نے وہیں اپنا سامان باندھنا شروع کر
دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ چڑیل یوں نہیں مانے گی۔ میں نے کامن ویلتھ ریلیشن آفس اور فارن آفس کو
لکھ دیا کہ یہ چڑیل اسلام اور مسلمانوں کی توہین کیا کرتی ہے۔ اگر آپ نے اسے جلد قید نہ کیا تو کرنل
ناصر اور دوسرے تمام اسلامی ملکوں کی حکومتیں انگلستان سے سیاسی تعلقات منقطع کر لیں گی۔ میں
نے ان خطوط کی نقلیں سعودی عرب اور تونس اور عراق کے سفارت خانوں کو بھی بھیج دیں۔ پھر وہاں سے
اپنے ایک دوست کے یہاں چلا آیا جو جموں کے رہنے والے تھے۔ اب آپ سے کیا بتاؤں یہ
سخت غلطی تھی۔"
" کیوں۔ کیوں۔ تجلی صاحب۔ وہاں کیا حادثہ پیش آیا؟"
" کچھ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ یہ سب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی غلطی ہے۔ وہ کشمیر کے معاملے میں گڑبڑ کر
گئے اور انجو صاحب جموں سے راولپنڈی۔ راولپنڈی سے کراچی۔ کراچی سے لندن آ گئے۔ دیکھیے
ڈاکٹر صاحب میری طبیعت کافی نفاست پسند ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ میں انجو صاحب کے کمرے
میں ان کا مہمان تھا۔ لیکن میں انہیں آدھا کرایہ دے دیتا تھا انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اتنا تلتے میں
ان میں اتنا تیل اوپر سے ڈالیں کہ روغن کے دھبے میرے سوٹ پر گریں۔ اب آپ خیال کیجئے میں
ہارڈی کے یہاں کا سلا ہوا پچیس گنی کا سوٹ، سفید کالر، سویڈ کے بوٹ پہنے آسٹن ریڈ کی
دکان سے لی ہوئی پچیس شلنگ کی ٹائی باندھے تھا۔ روغن کے دھبے میرے سارے کپڑوں پر
لگے۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میرے خیال میں انہوں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ وہ میرے کپڑوں

سے جلتے تھے۔ اب خیال فرمایئے یعنی کہ کم سے کم نقصان یہی ہوا کہ مجھے اپنا سوٹ ڈرائی کلینگ کے لئے بھیجنا پڑا۔ اس کا ساڑھے دس شلنگ کا بل تو میں نے انجو صاحب کو بھیج دیا۔ وہ بہت کھلے۔ میری طرف حجت کرتے ہوئے بڑھے کہ تم بڑے کمینے ہو۔ میرے خیال میں ان کی ایک انگلی میرے کوٹ کی آستین کو چھو گئی۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ ان کا ارادہ مجھے مارنے بلکہ ضرب شدید پہنچانے کا تھا۔ میں نے فوراً ۹۹۹ نمبر پر ٹیلی فون کرکے پولیس کو طلب کر لیا کہ یہ شخص مجھے پہلے تیل سے جلانے پھر زدوکوب کرکے مار ڈالنا چاہتا ہے..... مجھے غصہ اس بات پر ہے کہ پولیس کے افسر نے انہیں گرفتار نہیں کیا۔ بہر حال میں نے پولیس کے انسپکٹر جنرل کو تفصیلی اپیل لکھ بھیجی۔ اور ساتھ ہی میں نے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط لکھ بھیجا کہ آپ نے نہ صرف پاکستان کے ساتھ بلکہ ذاتی طور پر میرے ساتھ بہت سخت زیادتی کی ہے جس کی عدالتی چارہ جوئی کا حق میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا جواب لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے کیا دیا؟"

"مجھے چائے پر بلایا۔ اور بہت شفقت سے پیش آئے۔ اس لئے میں نے قانونی چارہ جوئی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد میں تیسری جگہ منتقل ہوا۔ . . ."

ڈاکٹر خان نے جلدی سے کجلی صاحب کی پیٹھ ٹھپک کر کہا "دیکھئے کجلی صاحب۔ باہر بہت سے مریض منتظر ہیں کسی وقت فرصت سے تشریف لایئے۔ آپ سے اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ اس وقت آپ کو بخار وغیرہ کچھ نہیں۔ صرف ذرا سی کمزوری ہے۔ کھانا خوب کھایئے۔ دیکھئے۔ یہ ایک ماہر نفسیات کا پتہ ہے۔ اس کے پاس آپ ضرور چلے جائیں۔ بُرا نہ مانیئے۔ آپ کو اصلی بیماری جو ہے وہ انفلوئنزا نہیں ایک طرح کا ذہنی مرض ہے۔ یہاں اس کا علاج کرا لیجئے۔ پھر ایسا موقع نہیں ملے گا۔ میں خود معمولی ڈاکٹر ہوں۔ دماغی امراض کا ماہر نہیں۔ لیکن ایک مشورہ ضرور دیتا ہوں، اس پر غور فرمایئے۔ اور یہ کہ یہاں آپ کا کوئی دشمن نہیں۔ کوئی آپ کو آزار نہیں پہنچانا چاہتا۔ آپ کا دشمن آپ کے اندر چھپا ہوا ہے۔ ابھی آپ کی عمر زیادہ نہیں۔ آپ طالب علم ہیں۔ اس کا موقع ہے کہ آپ اس دشمن پر قابو پا سکیں۔"

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔"

"خدا حافظ۔"

(۱۰)

"ہلو ڈاک" ایک کاگنی آواز نے داخل ہو کے کہا۔

" ہو گو کر۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
" یہ پچاس سال کی عمر کا ایک انگریز مزدور تھا جس کا پیشہ دیواروں پر کاغذ لگانا تھا۔ میں بیمار ہے سست ہے۔ کام پر نہیں جا سکتا۔ فلو "
نسخہ لکھتے لکھتے خان نے پوچھا " اور کیا خبریں ہیں؟"
" کچھ خبر نہیں جانتا۔ ڈاک۔ ناٹنگھم میں لڑائی کی خبر۔ ان اخباروں میں ہے۔ گورے لوگ کالے لوگ کو پسند نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں یہ بات ٹھیک نہیں۔ ڈاک۔ اپنا اپنا رنگ ہے۔ سب رنگ خدا کا بنایا ہے کوئی گورا ہے کوئی کالا ہے۔ مگر حبشی لوگ، سفید آدمی کی لڑکی کیوں لے جاتا ہے۔ لڑکی کیوں جاتا ہے۔ کالے کالے کا میل ہے۔ گورے گورے کا میل ہے ہندوستانی پاکستانی کی بات الگ ہے۔ وہ ہلکے رنگ کا ہے۔ ہمارے موافق ہے۔ اس لئے ہم تمہارے پاس علاج کے لئے آتا ہے۔ ہم کو کالا آدمی نہیں مانگتا۔"
" بعض حبشی ڈاکٹر بھی بہت قابل ہیں۔"
" ہوگا۔ ہم کو حبشی پر اعتبار نہیں . . . . ۔ ہاں تمہارے ڈاکٹر۔ یہاں کا لوگ جب رنگ والا آدمی دیکھتا ہے۔ کالا، بھلا، سانولا آدمی دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس کا عقل کم ہے۔ ہم کہتا ہے سب کو عقل ہے مگر گورا عورت خوبصورت ہے۔ کالا آدمی بدشکل ہے۔ ہماری گورا عورت کو کالا آدمی کیوں لے جاتا ہے۔ یہ ہم کو پسند نہیں۔"
" یہ تو عورت مرد کی اپنی اپنی پسند ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔"
" ہم ایک بات بتائے ڈاک۔ یہاں لندن میں بھی فساد ہوگا۔ آج کل میں ہوگا۔ ہم کو معلوم ہے۔ مگر ادھر نہیں ہوگا۔ کینسنگٹن میں ہوگا۔ اُدھر ویسٹ انڈیز سے حبشی لوگ بہت آگیا ہے۔ رات بھر سیٹی بجاتا ہے۔ سفید عورت سے پیشہ کراتا ہے۔ باتھ روم بہت گندہ کرتا ہے۔ بھڑکدار ٹائی لگاتا ہے۔ رات بھر کیلپسو گاتا ہے۔ سونے نہیں دیتا۔ سب ریلوے میں انڈر گراؤنڈ میں اچھی اچھی جگہ نوکر ہے۔ یہ ہم پر ظلم ہے۔ وہ ویسٹ انڈیز میں کیوں نہیں رہتا۔ اپنا عورت ساتھ کیوں نہیں لاتا۔"

(۱۱)

" سلام علیکم جی۔ ڈاکٹر صاحب۔"
" کیا حال ہے۔ خان صاحب"

"چنگا ہے۔ جی۔ فیکٹری میں ہاتھ جل گیا تھا۔ اُدھر کے ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ اپنے پاکستانی ڈاکٹر صاحب کو دکھاؤں گا۔ جی۔"

"کچھ نہیں۔ خاں صاحب۔ بالکل معمولی سا زخم ہے۔ یہی پٹی باندھے رکھئے۔"

"اچھا جی۔"

"فیکٹری کا کیا حال ہے۔"

"چنگا ہے جی۔ اللہ کا شکر ہے کوئی کوئی گورا افسر اچھا ہوتا ہے جی۔ مگر گورا مزدور لوگ کوئی اچھا ہوتا ہے کوئی خراب ہوتا ہے۔"

"کیوں گورے مزدور کیا کہتے ہیں۔"

"کوئی کہتا ہے جی تم کالا لوگ ادھر نوکری کرنے کیوں آیا۔ تم ہماری نوکری لے لیتا ہے۔ ہماری چھوکری لے جاتا ہے۔ ایک دم خراب آدمی ہے۔ کوئی بولتا ہے۔ نہیں جی۔ ہم تم انسان انسان سب برابر ہے۔ کوئی گورا ہے۔ کوئی کالا ہے۔ کوئی پیلا ہے۔ سب اللہ کا بندہ ہے۔"

"آپ فیکٹری میں خوش ہیں خاں صاحب۔"

"اللہ کی مہربانی ہے نو پونڈ ہفتہ تنخواہ ہے۔ دو پونڈ فلیٹ کا کرایہ ہے۔ دو ڈھائی پونڈ کھانے کا خرچہ ہے۔ باقی کا پیسہ کبھی ملتان گھر کو بھیج دیتا ہوں جی۔ کبھی چھوکری کو لے گیا تو پونڈ ڈیڑھ پونڈ خرچ ہو جاتا ہے حرام زادی بہت کھاتی ہے۔"

"آپ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"یہاں کی چھوکری سے شادی۔ استغفراللہ ڈاکٹر صاحب۔ توبہ۔ توبہ۔ ہنسی مذاق کے لئے اچھا ہے۔ کھیل کے واسطے موافق ہے۔ جورو اپنے وطن کی ٹھیک ہے۔"

"سنا ہے لندن میں بھی فساد ہونے والے ہیں۔"

"ہونے دو جی اللہ مالک ہے۔ ہم بھی کوئی بزدل کا تخم نہیں ہے دس پانچ کو مار کے مرے گا۔ انگریز لوگ ہمارے ملک پر ڈیڑھ سو سال حکومت کیا۔ نوکری کیا۔ اب ہم غریب آدمی نوکری کرنے پیٹ پالنے آتا ہے تو کیوں چڑتا ہے۔ وہ کیا ہمارے ملک میں ہمارا چھوکری نہیں لے جاتا تھا۔ نہیں لے جاتا تھا تو پھر یہ سب اینگلو انڈین کیسا پیدا ہوا۔ ہم بھی برابر اس کا چھوکری لے جائے گا۔"

"مگر زیادہ تر تعصب تو پاکستانیوں سے نہیں بلکہ ویسٹ انڈین اور حبشی لوگوں سے ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ ویسٹ انڈین حبشی لوگ ذرا جاستی کالا ہے۔ پھر رات بھر کیا کیلیپسو بجاتا ہے۔

راستہ چلتا ہے تو شور کرتا ہے۔ گاتا ہے سیٹی بجاتا ہے۔ لڑکی لوگ راجی ہو مت راجی ہو۔ چھیڑتا ہے۔ ہم بولے گا لڑکی نہیں راجی ہے تو کبھی مت چھیڑو۔ اللہ کا دیا لڑکی لوگ ادھر بہت ہے۔ پھر لڑکی لوگ سے پنڈی کا پیٹنا کراتا ہے۔ بھاڑ کھاتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ خان صاحب سب جلشی ایسے نہیں ہوتے۔"

"بالکل ہی ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر جی۔ مگر ایک گندا آدمی سب کو بدنام کرتا ہے۔"

اتنے میں نرس نے دوسرے مریض کو اندر بھیجا۔

(۱۳)

یہ ایک بیس سال کی لڑکی تھی۔ ذرا بھرے بھرے سے ہونٹ جن پر لپ اسٹک محض برائے نام تھی۔ گہرے ذرا سکرٹ اور اس پر موہیر اور نا ملان کا کوٹ پہنے تھی۔ بالوں کا رنگ سرخی مائل تھا اور بال پونی ٹیل کے انداز میں پیچھے کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔

"آپ مس میبل اشمول ہیں؟"

"جی۔"

"شکایت کیا ہے؟"

"راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

"کیوں۔ اس لئے کہ امتحان قریب ہے؟"

"شاید۔ معلوم نہیں۔"

"اور تو آپ کو کوئی فکر نہیں۔ بوائے فرینڈ کی وجہ سے تو کوئی فکر یا پریشانی نہیں؟"

"کوئی خاص نہیں۔"

معائنہ کرکے ڈاکٹر نے کہا "میرے خیال میں محض امتحان کی فکر اور تھکن ہے۔ آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟"

"اسلامی تاریخ۔"

"یہ ذرا عجیب سا شغل ہے نا آپ کے لئے۔"

"میرے والد بہت عرصہ تک مشہور و معروف بنگال لانسرز میں افسر رہے۔ میرا بچپن پشاور میں گذرا۔"

" اور ان کو سیکھ کے آپ کیا کریں گی ؟"

اسنے ہنس کے کہا " معلوم نہیں ۔"

ڈاکٹر نے کہا " نیند نہ آنے کے معاملے کی طرف واپس آتے ہوئے کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا بوائے فرینڈ کس قوم کا ہے ۔ پاکستانی ؟"

" میں بہت پاکستانی لڑکوں کو جانتی ہوں ۔ مگر میرا بوائے فرینڈ انگریز ہے ۔"

" ٹھیک ۔ میں نے اس خیال سے پوچھا تھا کہ جو لڑکیاں ایشیا کے مضامین پڑھتی ہیں اکثر اس وجہ سے کہ اُن ملکوں کے لڑکوں سے ان کی دوستیاں ہوتی ہیں ۔"

" شاید ۔ میرے پاکستانی دوست بہت سے لڑکے ہیں ۔ یا تھے ۔ مجھ میں کسی طرح کا رنگ کا تعصب نہیں ۔"

" مگر آپ کے والدین کو ؟"

" ان کو ذرا ذرا تعصب ضرور تھا خصوصاً میری والدہ کو ۔ وہ بڑی پکی کو یکر ہیں ۔ جانتی ہیں کہ یہ بُری بات ہے ۔ مگر مجبور ہیں ۔ اُن کو ضرور ذرا ذرا تعصب ہے ۔ مجھے نہیں ۔ البتہ ایک بات ہے ڈاکٹر صاحب ۔ معاف کیجیے گا ۔ میں جتنے پاکستانی لڑکوں کے ساتھ ادھر اُدھر گئی ہوں ۔ میں نے اُن سب کو ضرورت سے زیادہ چالاک پایا ۔ سب ایک ہی چیز چاہتے ہیں جنس ۔ اور جنس کے پیچھے جو عورت ہوتی ہے اُسکے انسان ہونے کا انہیں احساس نہیں ۔"

" یہ سن کے مجھے افسوس ہوا ۔ مِس الیٹول ۔ ہاں کہے جایئے ۔ شاید اس سے مجھے تشخیص میں مدد ملے ۔"

" میں معافی چاہتی ہوں ۔ میرا مطلب ہے . . . . . میں ، فرض کیجئے کہ کوئی لڑکی ایک پاکستانی طالب علم سے ملتی ہے ۔ اپنے والدین کی ناراضی کی پرواہ کئے بغیر ، اپنی ساتھ والیوں کی انگشت نمائی کا لحاظ کئے بغیر اسکے ساتھ ناچنے ، یا کھانا کھانے یا سینما دیکھنے جاتی ہے ۔ تو اس پر اعتبار کرتی ہے نا ؟ اور ایک حد تک قربانی کرتی ہے نا ؟ اب اس کا دوست محض اس فکر میں لگا ہوا ہے کہ اُسے کسی ترکیب سے اپنے کمرے لے جائے ۔ اُس کے کپڑے اتارے ۔ اُسے بے قابو کردے ۔ اور اپنا مطلب نکالے ۔ اور پھر اسے اس سے غرض نہیں کہ بے چاری لڑکی کا کیا حشر ہوتا ہے ۔ اُس کا حمل رہ جائے ۔ وہ مرجائے ۔ کچھ ہو جائے ۔ پاکستانی دوست پھر کسی اور لڑکی کی تاک میں لگے ہوئے ہیں ۔"

" یہ سنکر مجھے بہت دکھ ہوا مس الیٹول ۔ مگر آپ تو ٹھیک ہیں نا ؟"

میبل نے ہنس کے کہا " میں ٹھیک ہوں ۔ ڈاکٹر ۔ خدا کا شکر ہے میں اتنی بیوقوف یا سادہ لوح

نہیں۔ اور اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔ مجھے کوئی نہ پھانس سکا، نہ آفت میں ڈال سکا۔ نہ میں کسی کے چکر میں آئی۔"

"یہ تو اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے مس انشمول یہ سنکر مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ لیکن پھر نیند نہ آنے کے مسئلے کے سلسلے میں میں آپ سے صاف صاف پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کو کسی پاکستانی لڑکے سے محبت ہے؟ یہی بات ہے نا؟"

اسنے اپنے ہونٹ کھینچ لئے۔ اور بڑی مشکل سے اُسنے اپنے آنسو ضبط کئے۔

"آپ اس طرح جرح کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں آپ کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مس انشمول تاکہ آپ خود اپنے مرض کی تشخیص کر سکیں جو کسی ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کے لئے کوئی خواب آور دوا تجویز کر سکتا ہوں۔ مگر اصل علاج آپ کو خود کرنا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"چونکہ آپ کو اُس پاکستانی لڑکے سے نفرت ہو گئی ہے جس نے آپ سے دغا بازی کی۔ آپ کو اب اسلامی تاریخ اور اس میں امتحان دینا سب بیکار معلوم ہو رہا ہے۔ ساتھ ساتھ آپ کا ضمیر کہہ رہا ہے کہ ان زبانوں اور اس لڑکے کے تمدن سے نفرت تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ ایک طرح کی کشمکش ہے جس میں آپ کا ذہن مبتلا ہے۔ اور آپ نے سوچا کہ اس سے بچ نکلنے کی یہی صورت ہے کہ اب کے ایک انگریز بوائے فرینڈ سے دوستی کر لوں۔ اور اپنے پرانے پاکستانی دوست کو بھول جاؤں۔"

"شاید۔ شاید۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں کیا چاہتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ کیا کروں۔"

"بس یہ کہ زیادہ فکر نہ کیجئے۔ آپ اپنا علاج جو کر رہی ہیں۔ وہ ایسا بُرا نہیں۔ یہ انگریز لڑکا۔ آپ کو پسند تو ہے نا؟"

"پسند ہے۔ مگر مجھے اس سے محبت نہیں۔"

"وہ ہو جائے گی۔ آج نہیں کل سہی۔ اس سے نہیں کسی اور سے۔ اور آپ اپنا زخم بھول جائیں گی۔ اور اس عرصے میں میں بہ حیثیت ڈاکٹر اس کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا کہ آپ کے لئے خواب آور دوا تجویز کروں اور یہ مشورہ دوں کہ ہر ہفتے کی شام ناچ کو جایا کیجئے۔ اور جب ذرا بھی سورج نکلے، باہر دھوپ میں پھر لیا کیجئے۔ اور جم کے محنت کیجئے۔ آپ امتحان میں کامیاب ہو جائیں گی۔"

"شکریہ۔ ڈاکٹر۔ آپ بہت مہربان ہیں۔"

(۱۳)

"کیا ہوا کہیں نوکری ملی؟"

"جی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ ایک دو جگہ اُمید ہے۔"

"اچھا۔"

"ایک ہوٹل کے مالک نے جمعرات کو بلایا ہے۔"

"رہتے کہاں ہو؟"

"سالویشن آرمی کے ہوسٹل میں تو تین ہفتے سے زیادہ رہ نہیں سکا۔ اس کے بعد جس طرح بنا پڑا کبھی اخبار لپیٹ کے فٹ پاتھ پہ پڑ رہتا ہوں۔ کبھی پانی وغیرہ برستا ہو تو رات بھر چلتا رہتا ہوں۔ یا کہیں سایہ پا کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اگر جیب میں کچھ پیسے ہوئے تو ایک پیالی گرم چائے اور گرم گرم چپس نٹ کھا لیتا ہوں۔"

"یہی حالت رہی تو تم زندہ کیسے بچو گے؟"

"جیسی اللہ کی مرضی۔"

"آخر پاکستان سے یہاں آنا کیا ضرور تھا۔ وہاں تمہیں پیٹ بھرکے روٹی تو مل جاتی تھی۔"

"خیر، غلطی ہو گئی۔"

"تو واپس کیوں نہیں چلے جاتے۔ نادار لوگوں کو سرکاری طور پہ واپس بھیج دیا جاتا ہے۔"

"اب تو ڈاکٹر صاحب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ یا تو یہیں نوکری تلاش کر کے رہوں گا۔ یا فاقے کر کر کے مر جاؤں گا۔"

"آج کل یہاں خود بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔"

"ایک بے روزگار اور سہی۔"

"اچھا۔ یہ تین پونڈ لو۔ یہ دوا لو۔ جب پیسے ختم ہو جائیں تو پھر آ کے کچھ لے جانا۔"

"میرا بال بال آپ کے احسان سے بندھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ یقین مانئے جب مجھے نوکری مل جائے گی۔ آپ کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔"

"پیسے ادا کرنے کی فکر نہ کرو۔ خدا کرے تمہیں نوکری مل جائے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ ڈاکٹر صاحب۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔"

یہ کہہ کے سلامت اللہ ڈاکٹر خان کے کمرے سے باہر نکلا۔ اُسنے پھٹے پرانے گرم کوٹ کے کالر کو گلے کے اطراف بوسیدہ مفلر پر لپیٹ لیا۔ پتلون پر کریز کا نام و نشان نہ تھا۔ اور میل کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے؛ مگر داڑھی مونچھ صفائی سے گھٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں ذرا ذرا سی سرخی تھی۔ اور کبھی کبھی کھانسی کا دورہ پڑتا تھا۔ اور اسکے باوجود ایک غیر معمولی عزم، غیر معمولی ہمت تھی، جو اُسے لئے لئے پھرتی تھی۔ اور زندہ رکھتی تھی۔

اُس نے سب سے پہلے تمباکو فروش کی دوکان کا رخ کیا۔ اور ڈاکٹر خان نے جو تین پونڈ دیئے تھے ان میں سے ایک پونڈ نرط ادا کے بیس بیس سگریٹوں کی پانچ ڈبیاں اور دیا سلائی کی ایک ڈبی خریدی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسنے سگریٹ سلگایا۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اسنے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اور معلوم ہونے لگا کہ ساری دنیا کی نعمتیں اسے مل گئیں۔ ایک چھوٹی سی چائے کی دوکان کا رخ کرکے اُسنے گرم چائے کی دو پیالیاں پیئیں۔ اور اس سردی میں اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ پھر اس نے دو سینڈوچ خریدے اور اچھی طرح چبائے بغیر انہیں نگل گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اُسنے اپنے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ پاکستان میں ایک دفتر میں کلرک تھا۔ اور اُسے اپنے افسروں کی دماغ داری کی تاب نہ تھی۔ اس میں خود کسی طرح کی فرعونیت نہ تھی۔ لیکن دوسروں کی فرعونیت اُس سے برداشت نہ ہوسکتی تھی۔ اس نے دوسروں سے اور اپنے بعض دوستوں سے سُنا تھا کہ انگلستان میں نوکری آسانی سے مل جاتی ہے بڑے مزے میں گذر ہوتا ہے۔ پھر ہر چیز صاف ستھری ہے۔ لڑکیوں کی افراط ہے اور وہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں پر جان دیتی ہیں۔ بس آدمی کسی ترکیب سے انگلستان پہنچ جائے تو پھر اس کی چین لکھتا ہے۔

چنانچہ اسنے نوکری چھوڑ دی۔ اس کے پاس کل ڈیڑھ ہزار روپے تھے۔ اُسنے جہاز کا کرایہ ادا کیا۔ ابتک وہ دوسروں کو برتر دیکھتا آیا تھا اور اُن کی ہمسری کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے جہاز کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ کیا۔ اُسے کانٹے چھری سے اچھی طرح کھانا نہیں آتا تھا۔ اطالوی کھانوں میں روغن زیتون اور آرٹی چوک اُسے پسند نہیں تھے مگر وہ سب کے برابر ڈٹ کے کھانا کھاتا۔ اس کے پاس ٹک کے کپڑے نہ تھے، لیکن وہ جہاز کے لاؤنج میں دندناتے بیٹھتا اور برازیل کے سفیر کی لڑکی سے باتیں کرنے اور اُس کے ساتھ ناچنے کی کوشش کرتا۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ کثرت سے سگریٹ پیتا۔ اور ایک احساس ہمسری کے ساتھ حسین نوجوان جوڑوں کو ناچتے دیکھتا۔ جہاز کے عرشے پر دوسروں کے ساتھ کھڑا ہوکے محسوس کرتا کہ نیلا آسمان اور نیلا سمندر اور سب کی طرح اس کی بھی ملکیت ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انگلستان پہنچا۔

اُس کی جیب میں صرف بیس پونڈ باقی تھے، جو بیس دن میں ختم ہو گئے۔ اسنے یہاں پہنچنے کے بعد ایک دن بھی غفلت نہ برتی تھی۔ اسنے دفتروں کے چکر لگائے، اور محسوس کیا کہ یہاں عورتیں کلرکی کرتی ہیں۔ اور مرد جو کلرک ہیں بڑے مخلص ہیں۔ اُسے کچھ کچھ یہ احساس بھی ہوا کہ اس شریف قوم کے افسر بھی بے حد شریف ہیں۔ مگر یہاں بھی کلرکوں کو افسروں پر غصہ آتا ہے، کیونکہ انسان کی کچھ یہی فطرت ہے۔ اسنے دیکھا کہ دفتروں میں دال گلنی مشکل ہے، اسنے اخبار کے اشتہاروں کے جواب دیئے۔ مگر زیادہ تر تو یہ ہوا کہ اُسکی درخواستوں کے جواب ہی نہ آئے۔ یا آئے تو نفی میں۔ کہیں کہیں اسنے حقارت کا ایک نیا پہلو محسوس کیا، اور اُسے اپنے سانولے رنگ کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا۔ کہیں کہیں اُسنے غیر معمولی مہربانی اور شرافت کا سلوک دیکھا۔ مگر چونکہ اسکا حاصل بھی نفی ہی تھا، اس کا احساسِ کمتری بڑھتا ہی گیا۔

اس کے بعد اُسنے ہوٹلوں، ریستورانوں میں نوکری کی کوشش شروع کی۔ یہ کہ بلا سے اُسے کہیں رکابیاں دھونے، فرش صاف کرنے کی نوکری ہی مل جائے۔ اور یہ بھی نہ ملی۔ اُسے احساس ہوا کہ اگر وہ مزدور گھر میں پیدا ہوا ہوتا تو مزدوری کے قابل ہوتا۔ اُسکے مقابلے میں ویسٹ انڈیز کے حبشیوں اور پاکستان کے جاہل مزدوروں کو فیکٹریوں میں نوکریاں مل جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ کم سے کم دیکھنے میں جفاکش تو معلوم ہوتے تھے، اور سلامت اللہ میں نچلے متوسط طبقے کی نزاکت تھی۔ وہ بیچارا پردہ نشین ماں کا بیٹا، اور پردہ نشین بہنوں کا بھائی تھا۔

ایک دن ایسا آیا کہ اس کے پاس کھانے کو پیسے نہ تھے عمر میں پہلی مرتبہ اُسے معلوم ہوا کہ بھوک کسے کہتے ہیں۔ پہلے تو اسنے سوچا کہ میں اس طرف خیال ہی نہ کروں گا۔ وہ سالویشن آرمی کے غریب گھر میں رہتا تھا، جہاں صبح کو ناشتے میں بغیر مکھن ایک توس اور ایک پیالی چائے مل جاتی تھی۔ اسنے سوچا کہ میں چوبیس گھنٹے اسی قدر کھانے پر گذار دوں گا۔ وہ کروٹ بدل کے لیٹ گیا۔ مگر اُس کی آنتوں کی طلب بھی کہ چین نہ لینے دیتی تھی۔ وہ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری سگریٹ ختم ہو گیا۔ رات کے تین بجے تھے۔ سناٹا تھا، سردی تھی۔ اور اگر سڑک پر سے کوئی موٹر گذرتی تو معلوم ہوتا کہ دماغ کے اندر سے گذر رہی ہے۔ دماغ کو چیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ پھر اسنے ایک اور طلب محسوس کی۔ بھوک سے کہیں زیادہ شدید۔ یہ سگریٹ کی طلب تھی۔ یہ طلب بڑھتی گئی تڑپ بن گئی۔ صبح کو ابر چھایا ہوا تھا۔ دھند تھی۔ پانی برس رہا تھا۔ اُسنے اپنے آپ سے، لندن سے، ساری دنیا سے سگریٹوں سے ایسی سخت نفرت محسوس کی کہ جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ گلاس بھر کے ڈگڈگا کے پانی پیا۔ اس کی جیب میں ہمیشہ سیفٹی ریزر پڑا رہتا تھا، جس سے اُس نے صفائی سے داڑھی بنائی۔ اور پھر سالویشن آرمی کے اور بھوکوں

کی طرح ناشتے پر پل پڑا۔ جو اس کا دوپہر اور رات کا کھانا بھی تھا۔ دن بھر سگریٹ کی طلب بڑھتی گئی۔ سڑکیں تھیں کہ اُسے معلوم نہیں کہاں سے کہاں لئے جا رہی تھیں۔ ایک ندی تھی جس میں وہ بہتا چلا جاتا تھا۔ جہاں کوئی ملازمت کی ایجنسی نظر آئی، وہاں وہ اُسے تنکے کا سہارا سمجھ کے ٹھہر جاتا۔ اپنا نام رجسٹر کراتا۔ اور آگے چل دیتا۔ بھوک کے دوسرے دن اس کے قدم خود بخود ریستورانوں کے سامنے رک جاتے۔ وہ کئی کئی منٹ تک شیشوں کے اندر رکھے ہوئے کیک، مٹھائیاں، سینڈوچ، گوشت کے ٹکڑے، بھنے ہوئے مرغ دیکھتا۔ اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ اور کبھی کبھی پھر پلٹ کے دیکھتا۔ اور پھر سڑکیں اسے لندن کی ایک رگ سے دوسری رگ میں بہائے جاتیں۔

اور انسانوں کے اس بہتے ہوئے سیلاب میں درد بھی تھا، اور نور بھی تھا۔ وہ کسی اخبار فروش کے پاس دیوار کی ٹیک لگائے کھڑا ہو جاتا؛ اور سیلاب سے الگ ہو کے اس کی رفتار دیکھتا تو جو بیوں روشنیوں کے نور، سردی اور کہر میں بہتا چلا جاتا حسین چہروں پر سُرخ ہونٹوں کی لپک، زرد بال، سنہرے بال، کالے بال۔ لہراتے ہوئے بال، ترشے ہوئے بال، سفید کلائیاں، نازک سیاہ اور سفید دستانوں میں ڈھکی ہوئی کلائیاں، آغوشوں میں لپٹے ہوئے جسم، تنے ہوئے جسم، بل کھاتے ہوئے جسم، متفکر چہرے، حیران چہرے، زرد چہرے، لاپرواہ چہرے، شیشہ خانے، لوہے کی سلاخیں، شہتیر، اور ایک عظیم بھنور جس میں گہرائی نہ تھی، طول ہی طول تھا جس میں ساری کائنات بہی چلی جاتی تھی اور اس کا خلاصہ بھوک تھا۔

اس کی آنکھیں بھوک اور سردی سے بند ہوئی جاتی تھیں، اُسنے اوورکوٹ کا کالر اپنے گلے کے اطراف لپیٹ رکھا تھا کہ کسی نے آہستہ سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ یہ ہاتھ نرم تھا۔ اُن ہاتھوں کی طرح جن کی کلائیاں نازک سفید و سیاہ دستانوں میں چھپی ہوتی تھیں۔ اُسنے محسوس کیا کہ کوئی لاعری حسین ہاتھ ہے، جو اُسے زندگی سے موت کی طرف لے جانے آیا ہے۔ اُسنے آنکھیں کھولیں۔ اُس کے قریب جو عورت کھڑی تھی۔ وہ جوان نہ تھی۔ اُس کی عمر کوئی ساٹھ سال کی ہو گی۔ سر کے بال سفید تھے، چہرے پہ جھریاں تھیں، ہونٹوں پر لپ اسٹک نہ تھی۔ لیکن وہ خوش وضع لباس پہنے تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ اُسے وہ کچھ عرصہ سے اس طرح ناطاقتی کے عالم میں دیوار کے سہارے کھڑا دیکھ رہی تھی۔ اُسنے اُس کے پیٹ کی بھوک کا کچھ عجیب طریقے سے اندازہ لگایا تھا۔ گویا انسانوں کے درد کو وہ اُن کے چہروں پہ پہچان لیتی تھی۔ اسنے اس کا بازو پکڑ کے آہستہ سے کہا: "بیٹے۔ مجھے بھوک لگی ہے یہاں قریب میں کوئی ریستوراں ہے؟"

سلامت اللہ نے بازو چھڑا کے بھاگنا چاہا مگر اس میں اس کی بھی طاقت نہ تھی۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ

کب ن جا رہا تھا۔ اور یہ بڑھیا اُسے کہاں لئے جا رہی تھی۔ اس کے لاشعور نے محسوس کیا کہ نا تابن گدرشیشوں

ہ اُس پار جو کھانے کی چیزیں رکھی تھیں؛ وہ حقیقۃً بن گئی ہیں۔ اُن کی خوشبو تیز اور لذیذ ہو گئی ہے۔

یا ریستوراں میں داخل ہوتے ہی اس کا شکم سیر ہو گیا اور بھوک باقی نہیں رہی۔

بوڑھی خاتون نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کیا کھاؤ گے۔ وہ اسے اس طرح لے آئی تھی گویا

سے صدیوں سے جانتی تھی۔ اُس نے گرم گرم سوپ پیا۔ اور وہ ساری سردی جو اس کی گردن اور اس کے

پھیپھڑوں میں جمع تھی۔ ذرا پگھلی۔ اور اُسے کھانسی کا دورہ پڑا۔

دوسرے لوگ جو قریب کے میزوں پر کھانا کھا رہے تھے، انہوں نے اس کی طرف اور بوڑھی خاتون

کی طرف دیکھا۔ اور پھر کھانے میں اور باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اور سلامت اللہ کا جی چاہا کہ وہ یا تو وہاں سے

اُٹھ کے بھاگ جائے یا چلا چلا کے کہے "میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔"

بوڑھی خاتون مسکرا رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کی مسکراہٹ تھی۔ ماں کی مسکراہٹ۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔

"میں مسز ہاربنجر ہوں۔ کونیکر ہوں۔ سوشل ورکر ہوں۔ تم کہاں کے ہو؟ ہندوستانی ہو؟ پاکستانی ہو؟ کیا

کرتے ہو؟ نوکری نہیں ملی؟"

جب وہ سیر ہو کے کھا چکا تو اُس کی زبان کھلی اور اُسے کھانسی کا دوسرا دورہ پڑا۔ مسز ہاربنجر نے کہا

"نوجوان آدمی۔ یہ کھانسی خطرناک ہے۔ میرے ایک دوست ہیں ڈاکٹر جمشید علی خاں وہ بھی تمہاری طرح

پاکستانی ہیں . . . . ."

اور مسز ہاربنجر نے اُسے نیشنل سیفٹی اور بے روزگاری کے بونس اور اسی قسم کی دوسری ضروری معلومات

سے آگاہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں زبردستی ایک پونڈ کا نوٹ پکڑا دیا (یہ پہلی خیرات تھی جو اُس نے قبول کی۔) وہ کھانا

کھاتے ہی رونا چاہتا تھا۔ اب سڑک پر نکل کے اس نے زار و قطار رونا شروع کیا۔

مسز ہاربنجر نے اُس کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ اُسے ڈاکٹر جمشید علی خاں کے پتے کا کارڈ دیا اور

خود اُس بہتے ہوئے ہجوم میں غائب ہو گئی جس میں اب درد کم تھا اور نور زیادہ۔

اِدھر وہ نظروں سے اوجھل ہوئی اُدھر جلدی سے سلامت اللہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پونڈ کا

نوٹ نکالا اور ٹب کو فروشی کی دکان سے سگریٹ کے دو پیکٹ خریدے۔ اور پہلا سگریٹ سلگایا۔ تین دن

کے بعد۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا کی نعمتیں اُسے مل گئیں۔

۱۴

کرسٹل نے اپنی مریضہ کو آہستہ سے ہاتھ پکڑ کے اُٹھایا۔

"کوئی خاص بات نہیں مس نوائی۔ میں آپ کے لئے نسوانی ہارمونس کی کچھ گولیاں تجویز کرتی ہوں۔ اور وٹامن بی۔ خون کی کسی قدر کمی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس ملک کی آب و ہوا میں چلنا پھرنا کسی قدر ورزش، اور اچھی طرح کھانا کھانا ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حمیرہ نوائی نے اپنا دوپٹہ برابر کیا، شلوار ٹھیک کی اور پیر کا کے جوتے پہنے ۔ اور کہا " جی۔ ڈاکٹر۔"

کرسٹل نے کہا۔ " اور آپ کو ہمیشہ خوش رہنا چاہئے۔ آپ کا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟"

حمیرہ ذرا لجائی ہوئی بدشکل سی ہنسی ہنسی۔ " جی۔ نہیں۔ ڈاکٹر۔"

اور پھر کہنے لگی " ہمارے ملک کے لڑکے زیادہ تر انگریز لڑکیوں کے ساتھ پھرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی طبقے کی کیوں نہ ہوں " اور اپنے دل میں کہنے لگی " ہمیں کوئی نہیں پوچھتا ۔"

کرسٹل نے کہا " نہیں۔ نہیں مس نوائی یہ بات نہیں۔ مجھے پاکستانی لڑکیاں بہت پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ آپ لوگوں کے کالے کالے بال، اور کالی کالی آنکھیں، اور متناسب خدوخال اور گھنی بھنویں، اور نازک نازک جسم بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مگر محض نزاکت ٹھیک نہیں جسم میں طاقت بھی ہونی چاہئے۔ دیکھنا عورت کو بھی زندگی کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "

" جی ڈاکٹر۔" حمیرہ نے نسخہ ہاتھ میں لیا۔ کوٹ پہنا اور باہر نکل آئی۔

واٹرلو پر انڈر گراؤنڈ سے نکل کے اس نے پل کا رخ کیا۔ واٹرلو برج پر ریلوں کے چلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آج سردی کافی تھی، مگر ہوا نہیں چل رہی تھی، اور سورج نے بادلوں سے تھوڑی دیر کے لئے سر نکالا تھا۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں واٹرلو پر اتر گئی۔ کیوں یونیورسٹی تک سیدھی نہ گئی۔ کیوں اس کے دل میں ٹیمز، پل، بہتے پانی کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کیوں اس نے سوچا کہ اس کو پیدل پار کر کے چیرنگ کراس تک پہنچنا چاہیے۔ یہ پل کسی اور پل کی مثال تھا، جسے وہ پار کرنا چاہتی تھی؟ یہ ندی کوئی رکاوٹ تھی جو اس کے راستے میں حائل تھی، جسے وہ عبور کرنا چاہتی تھی؟ اور اس رکاوٹ کے اس پار کیا تھا۔ ایک شوہر؟ شاید بچے؟ گھر؟ خانہ داری؟ مگر کب؟ کب؟ اور اسی لئے یونیورسٹی تک پہنچنا اہم نہ تھا۔ پہنچ گئی تو پہنچ گئی۔ لیکن اگر راستے میں گھر مل گیا تو کیا کہنا۔ کوئی گھر۔ کہیں بھی۔ کراچی۔ راولپنڈی۔ ڈھاکہ۔ کہیں بھی۔ مگر گھر میں دروازے ہوتے ہیں، جو بند ہو جاتے ہیں اور بلاؤں کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ گھر پر چھت ہوتی ہے۔ چولھا ہوتا ہے۔ گھر سے مفر نہیں۔ مگر گھر کہاں ہے؟

○ لاہور میں وہ ماڈل ٹاؤن میں رہتی تھی۔ اور وہاں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھی۔

جب وہ سائیکل پر سوار، سیدھے لہراتی سڑکوں سے گذرتی تو نگاہیں چاروں طرف سے معلوم ہوتا تھا اُسے کھا جائیں گی۔ اپنوں کی نگاہیں اور غیروں کی نگاہیں۔ آنکھیں ہی آنکھیں۔ تانگوں پر تانگہ ہنکانے والوں کی نگاہیں۔ رجو اتنے زور سے کہ وہ سر سے لے اپنے گھوڑے کو پیار بھری ہوائی گالی دیتے۔ صاف وردی والے بیروں کی نگاہیں۔ موٹروں میں بیٹھے رئیسوں کی سہری سی نگاہیں، کالج کے لونڈوں کی "سیٹی بجاتی" ہوئی گردن موڑ کر دیکھتی ہوئی نگاہیں! معلوم ہوتا تھا کہ اللہ میاں نے مردوں کی آنکھیں محض اسکو دیکھنے کے لئے بنائی تھیں۔ لاہور میں اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ اس کا رنگ سانولا ہے، پیشانی چھوٹی ہے، اوپر کے لب پر روئیں بہت ہیں۔ قد ذرا چھوٹا ہے، اور کمر اور سینے میں کوئی تناسب نہیں۔ اُس کے چاہنے والے بہت تھے اور یہ کافی تھا۔ اور سب چاہنے والے آہیں بھرا کرتے۔ بجز ان کے جن سے دوستی تھی، وہ زیادہ تر چالاک شکاری تھے جس احمق کی اُسے تلاش تھی کراہیں بھرے، پیچھے پیچھے پھرے اور شادی کرے، وہ ابھی ملنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے تعلیمی وظیفہ ملا اور وہ انگلستان آ گئی۔

یہاں آتے ہی اسے محسوس کیا کہ مقابلہ سخت ہے۔ آنکھیں اور سیٹیاں اور اشارے، اور گنگناتی ہوئی عشقیہ غزل تو ایک طرف۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ مرد اس کی طرف یا تو دیکھتے ہی نہیں، یا محض اس طرح نظر ڈالتے ہیں، جیسے کوئی بے جان سی قدِ آدم گڑیا کپڑے پہنے کسی دوکان کے شیشہ خانہ میں کھڑی ہو —— پاکستانی لڑکے کسی نہ کسی گوری لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اِدھر سے اُدھر پھرتے ہیں۔ اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔

اس طرح تین سال گذریں گے۔ میری عمر ستائیس سال کی ہو جائے گی۔ وہاں مجھ سے شادی کون کریگا۔ مجھے سینے سے کون لگائے گا؟ میرے سر پر کون چھپر ڈالے گا، مجھے جیتی جاگتی گڑیا کون دے گا؟ .... میں کیا کروں گی . . . . .

"پیاری ٹیمز آہستہ آہستہ بہہ کر میں اپنا گیت ختم کر لوں" پریوں کی آواز نے یہ گیت گایا۔ لیکن پیاری ٹیمز کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ راوی کے پاس ہو تو ہو۔ وہ ایک موٹر جہانگیر کے مقبرے کی طرف سے، دو تانگوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی آ رہی ہے۔ موٹر میں دو مردوں کے ساتھ کون بیٹھی ہے! یہ تو حمیرہ نوازی ہے۔ اور دونوں مرد اُسے دونوں جانب سے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور تانگہ والا لبلبا کے "ایک عالم مبتلائے دردِ دل" گا رہا ہے۔ اور گھوڑے کو ایک موٹی سی گالی دے رہا ہے، اور ایک کھلے ہوئے چھکڑے میں کسی چک کی دیہاتنیں زرق برق لیکن میلے میلے کپڑے پہنے ایک دیہاتی گیت گاتی چلی آ رہی ہیں۔ . . . . .

مگر واٹرلو کے پل پر پھر ایک ریل گڑگڑاتی چلی آ رہی ہے، اور سامنے چیرنگ کراس ہے، جہاں سے یونیورسٹی کی بس جاتی ہے۔

(۱۵)

"جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ۔ ڈاکٹر خان اور ڈاکٹر کرسٹل خان۔ تمہارے بچ کا وقت آ گیا ہے۔ ہم جو زندگی ہیں، اور اس اجنبی ملک میں بھٹک آئے ہیں، تمہارے پاس بہت کم آتے ہیں۔ ہم جبھی آتے ہیں کہ سڑک کے نکڑ پر ہمیں دبے پاؤں موت کی چاپ سنائی دے۔ یا کوئی کالا پرندہ، گھنی ہوئی برف پر اپنا گذرتا ہوا سایہ ڈالے اور ہم ڈر جائیں۔ یا ہم جو زندگی ہیں یہ محسوس کریں کہ ہم تھک گئے ہیں اور اپنا ساتھ نہیں دے سکتے ...... مگر تم کو اپنے کام سے مطلب اور ہم کو اپنے کام سے اور ہمارا کام بہت کچھ ہے۔ اور ہم ہر جگہ ہیں۔ ہماری ہزاروں آنکھیں ہیں، جو نیون کی روشنیوں، اور دو کانوں کی جگمگاہٹ اور سنہرے بالوں میں الجھی ہوئی ہیں، ہمارے ہونٹ ہزاروں ہیں جن پر ہزاروں تبسم اور ہزاروں پیار ہیں۔ ہم ہزاروں دل ہیں، اور ہزاروں دلوں سے محروم ہیں۔ ہم ہزاروں آغوش ہیں، اور کئی ہزار آغوشوں سے محروم ہیں۔ ہم اثبات ہیں اور نفی ہیں۔ مہمل ہیں۔ ہم بدرنگ ہیں۔ ہم اجنبی ہیں۔ اور اپنے دلوں اور دماغوں کو یہاں بہلانے آئے ہیں۔ ہمارے دماغوں میں دو منزلہ بسیں چلتی ہیں، ہمارے دل میں ایک سُرنگ ہے جس کے اندر سے ہر چند سکنڈ کے بعد انڈر گراؤنڈ ریل نکلتی ہے۔ ہماری آنکھیں جیٹ طیارے ہیں، اور ہم سڑکوں کی روشن لکیروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ لکیریں نقطے ہیں۔ اور ہر نقطہ جسم ہے ...... اور ہر جسم میں جان ہے۔"

(۱۶)

"میں لوحِ محفوظ ہوں ...... میں ریسیونگ سٹ ہوں ...... جاذب ہوں ...... اور اس لئے حیران ہوں......

اور ایک آواز نے معمولی باتوں کے لہجے میں مجھ سے کہا، عبدالحق حامد بے انیسویں صدی میں کافی عرصہ تک بمبئی میں ترکی کے سفیر رہے، یہ تحقیق بڑی دلچسپ ہوگی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی شعور اور ان کی شاعری، غرض ان تمام باتوں کا اُن پر کچھ اثر ہوا یا نہیں ...... اور پھر وہی آواز کچھ آگے بڑھ گئی، غالب حالی۔ اقبال یہ تین شاعر جو تمہارے یہاں پیدا ہوئے۔ اس طرح کا ارتقا مسلسل تین پشتوں تک، انیسویں اور بیسویں صدی کی ترکی یا عرب یا ایرانی شاعری میں نہیں ملتا۔ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان میرے خیال

میں ضرورت سے زیادہ انکسار کرتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابل اپنے آپ کو اس قدر حقیر سمجھتے ہیں ..... میں ناحق کمال کا فخریہ قصیدہ ترکی میں پڑھ رہا ہوں جو آدھے سے زیادہ فارسی ہے۔

گدائے خاندانم بین یہ قول غالب استاد

خلیل اللہ ا خوان شفاعت میز بانم ذالنٰ

اور وہ آواز مسلی سے قبرص پہنچتی ہے جہاں آرچ بشپ میکیریوس اور ڈاکٹر کوچک کشتی لڑ رہے ہیں ..... اور میں قبرص کے ترکوں کے ساتھ جلوس میں شامل ہوں ..... چونکہ میرا مرکز محسوس اسلام ہے۔ اس لئے میں پاکستان کے سوا ہر جگہ کارہنے والا ہوں ..... میں الجزائر میں فرانسیسیوں سے لڑ رہا ہوں۔ اور عبدالرحمٰن کے ساتھ پو آتیئے کے میدان میں شارل مارتل سے لڑ رہا ہوں۔ چونکہ میں ساتھ ہوں اس لئے عبدالرحمٰن کو فتح اور شارل مارتل کو شکست ہوتی ہے۔ اور دنیا کی تاریخ بدل جاتی ہے۔ آکسفورڈ میں عربی پڑھائی جا رہی ہے۔ جہاں سینٹ پال ہے، وہاں در اصل جامع ازہر واقع ہے ..... اور پھر میں ٹھہر جاتا ہوں۔ یہ انگریز لڑکیاں، میلے کچیلے نقاب پہنے، بوسیدہ گلیوں میں رہ رہی ہیں، جہاں گلیوں کے دونوں طرف کھلی ہوئی موریوں میں غلاظت بہہ رہی ہے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ انارکلی بن گئی ہے۔ اور ٹیمز کی جگہ بوڑھی گنگا بہہ رہی ہے جس میں دھوبی کپڑے دھو رہی ہیں ..... اور میں بے بس ہوں ..... آسمان پر اسپوٹنک اور امریکہ کے سیٹلائٹ اڑ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ آپس میں ٹکرا کے ٹوٹ جائیں۔ خدا کرے میں چاند پر پہنچ جاؤں۔ عین عید کے دن۔ چاند کی پہلی تاریخ کو۔ خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا ..... اور میرے ساتھ ساتھ چاند پر ایک سنہری بالوں والی نیلی آنکھوں والی لڑکی ہے جو چاند پر بھی رات دن نقاب پہنے رہا کرے۔

"اور ایک آواز نے معمولی باتوں کے لہجے میں مجھ سے کہا ..... اس برٹش میوزیم میں اور کوئی واحد چیز اتنی اہم نہیں۔ یہ روزیٹا اسٹون ہے۔ ایک پتھر جو مصر میں آثار قدیمہ کے ماہرین کو ملا۔ اس پر مصری اور یونانی دونوں زبانوں میں ایک ہی کتبہ درج ہے۔ اور اس طرح مصر کے ماہر مصری حروف تہجی سے واقف ہو گئے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک دن ایک روزیٹا اسٹون موہن جو دڑو کے قریب بھی مل جائے گا، جس پر موہن جو دڑو کی نامعلوم زبان اور سنسکرت یا پالی یا شاید عبرانی یا عربی میں ایک کتبہ ہو اور اس سے موہن جو دڑو کی نامعلوم زبان اپنے سارے راز اگل دے گی۔ اور میں ایک نادر نسخے میں موہن جو دڑو کی پر اسرار رقاصہ کا راز معلوم کر دوں گا۔ جو اپنے کولہے پر ہاتھ رکھے صدیوں سے کھڑی ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے موٹے ہیں۔ اس کے بال دراوڑی ہیں، اس کی حبشیت سے مجھے دلچسپی نہیں۔ کاش اسکے بھی بال سنہرے ہوتے، یا لال یا خاکستری۔ چاہے جس رنگ کے ہوتے کالے نہ ہوتے اور گھونگھریالے ہرگز نہ ہوتے۔ کیونکہ یہ حبشیوں کی پہچان ہے، جو کمبخت زنجبار اور

شمالی لیبیا اور حضر موت اور عمان اور مکران کی راہ سے آ آ کے ہم را ننگ کالا کر گئے ..... اور سندھ کے ریگ زار تپتے ہیں۔ .....

"پھر ایک آواز نے کہا ..... "اجماع نے ہمیشہ طاقت کے سامنے سر جھکایا، مگر مسلم جمعیت کو منتشر نہ ہونے دیا ..... طاقت کے سامنے سر جھکایا۔ میں ہائیڈ پارک کے باہر ماربل آرچ کے قریب اتوار کے روز ایک صندوق پر کھڑا ہو کے چیخ چیخ کے ساری دنیائے اسلام کو یہ مژدۂ جانفزا سناؤں" یہ دستور زباں بندی ہے کیا تیری محفل میں"۔ ..... اس روز ڈاکٹر جمشید علی خاں بڑ رہے تھے۔ میرے پاس مانچسٹر کا ایک ملاح آیا۔ اُسے پھیپھڑے کا دق تھا۔ میں نے اُسے کھایا اور دق کے جرثومے کی تصویر دکھائی، جو اس کے قد سے کئی ہزار گنی بڑی تھی۔ اور اس مریض نے وہیں خدا کا شکر ادا کر کے کہا "اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔ یہ جانور ہمارے گھر میں نہیں رہتا"۔ ..... یہاں تو بات کرنے کو ..... میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا تو یہی کیوں نہ کہوں، ماربل آرچ کے پلیٹ فارم سے کہ تم کمبخت انگریزوں میں جمہوریت، جمہوریت سب ہے، مگر تم میں نسلی تعصب بے انتہا ہے اور ہم اللہ کے محبوب بندے نسلِ انسانِ کامل ہیں ..... کیونکہ ہم میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے۔

اور پھر اگر یک سرِ مو سے برتر پرم ..... چلئے وہ جادۂ تصوف آ گیا۔ طریقے آ گئے۔ طریقتیں آ گئیں ..... اس شاہراہِ معرفت یعنی کینسنگٹن ہائی اسٹریٹ پر بارکر کی دوکان میں تین شلنگ فی گز نائلان ملتا ہے، جو کراچی میں دس روپے گز بھی نہیں ملتا۔ جتنا چاہے عرفان ۔۔۔ میرا مطلب ہے نائلان خرید لیجئے۔ رہ گئے دل، قطب ابدال ..... تو امریکی ایٹمی بجر دوز جہاز میں بیٹھ کے قطبِ شمالی کی سیر کیجئے۔ یا اگر سلوک کی کوئی اور راہ پسند ہو تو بحرِ معرفت میں غوطہ زنی بھی ایسی ضروری نہیں ..... جس کا موقع ہم ایشیائیوں کو حاصل بھی نہیں۔ کیونکہ یہ محنت کی بات ہے۔ قلم اور روشنائی بننے کی بات ہے، محض لوحِ محفوظ بننے کی۔ اس لئے کسی ہوائی کمپنی مثلاً پین امریکن یا بی۔ او۔ اے۔ سی کا ٹکٹ لے کے قطبِ شمالی کے راستے، گویا حضورِ شہپرِ جبرئیل پر سوار ہیں، پرواز فرمائیے ..... اس میں صرف کرایہ ادا کرنا ہو گا۔ جو دراصل ہیٹ سن اور کیاس اگانے والے کسان ادا کریں گے لیکن ٹھاکے) یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے ..... (نعرہ) اس لئے انالحق ..... کیونکہ میں ..... میں غریب لوحِ محفوظ ہوں ..... ریسیونگ سٹ ہوں ..... جاذب ہوں۔

(۱۷)

اور میں نظر ہوں۔ وہ نظر جو ہمیشہ سے تشنہ ہے، ہمیشہ تشنہ رہے گی۔ جب مجھے اوروں کی

طرح پانچوں حواس عطا ہوئے، تو اس ایک حسِ بصر، نظر نے دوسروں پر پورا قابو پالیا۔ گویا میں نظر کے لئے زندہ ہوں۔ اس نظر نے مجھے کسی کام کا نہ رکھا۔ میں روپیہ پیسہ نہ کما سکا۔ امیر نہ بن سکا۔ سائنس فلسفہ سب کا محض حاشیہ تک ساتھ دے سکا۔ متن تک نہیں۔ کیونکہ متن میرے لئے محض ایک ہے۔ حسن اور اس کی فنون لطیفہ میں نمود۔

میرا ذہن میری نظر کا تابع ہے، میرے ہاتھ میری نظر کے تابع ہیں۔ اس لئے میں مصوری میں اپنا فنی مسلک بیان نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ نہ یہ اہم ہے۔ نہ کسی کو اس سے دلچسپی ہوگی لیکن اس کا خلاصہ وہی ایک لفظ ہے۔ نظر۔ نظر۔ نظر۔

کیونکہ ہمیشہ سے، ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک میری آنکھیں کسی کو ڈھونڈھتی رہیں۔ اُس عورت کو جو کامل ہے، اس کا حسن کامل ہے، اُسے میں نے کہیں نہیں پایا۔ اُس کی جھلک میں نے جگہ جگہ دیکھی۔ اُسے ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا میں یوں پرناس اور ہیلیس کی طرف آنکلا۔ کیونکہ یہاں اس کی صورت کی جھلک زیادہ دکھائی دیتی تھی۔

اور میری نظر کو یہی جگہ ہے کہ وہ کہیں ثابت و سالم نظر نہیں آتی۔ گویا اسکے ایک لاکھ ٹکڑے ہیں، ایک لاکھ روپ ہیں جو لاکھوں جسموں، رنگوں، اداؤں میں منتشر ہیں۔ اُسکے بال سیاہ ہیں، کہ بھورے کہ سنہرے کہ لال، اُس کی چوٹیاں اس کے سینے پر لہرا رہی ہیں، کہ اسکے بال ترشے ہوئے ہیں، اور ہیں تو کس طرح۔ اس کے خدوخال ہزار طرح کے ہیں، اسکے کئی رنگ ہیں کہیں اس کا قد دراز ہے، کہیں میانہ کہیں لوٹا سا۔ کہیں سیرا ہے اُس کی جھلک نظر آجاتی ہے، اور حسن کی موج کی طرح وہ ہجوم میں گم ہو جاتی ہے۔ کہیں اسکا حسن غمازِ اور تبسم سے جھلکتا ہے، اور اس کے لبوں کی لالی فضا میں بجلی کی طرح لپکتی ہے۔ کبھی رقص میں اسکی شانِ بندر ساگی میں فرق آجاتا ہے۔ آغوش میں وہ کلیم ہمدانی کی محبوبہ کی طرح آتی ہے جس کی الفت موج و کنار کی آمیزش ہے جو دمبدم ساتھ بھی ہے، اور گریزاں بھی۔ اور وصال کے عالم میں معلوم ہوتا ہے کہ اُسکے ساتھ گھڑیاں بیت گئیں اور بیدل کی محبوبہ کی طرح وہ کیا قیامت تھی کہ عمر بھر اس کے ساتھ قدح نوشی کرتا رہا۔ اور وہ آغوش میں رہی، اور آغوش میں نہ سما سکی۔ اور پھر نظر کہتی ہے۔ یہ وہ نہیں۔ اس میں اُس اصل محبوبہ کی محض ایک جھلک ہے محض ایک کیفیت، کچھ رنگ، کچھ روپ، مگر یہ تو کوئی اور ہے، کوئی ناقص اجنبی۔

اور اس طرح آنکھوں نے ایک کروڑ حسین چہروں کی جھلک دیکھی۔ کئی لاکھ زلفوں کو شکن در شکن دیکھا۔ کئی لاکھ سرخ ہونٹوں پر تبسم کی لہریں دیکھیں، ہزاروں کی سانس کا اتار چڑھاؤ محسوس کیا۔ ہزاروں کی نبض کی گرمی سے اپنا تن بدن جلتا پایا۔ کبھی کبھی ایک آدھ دل کی دھڑکن بھی سن لی۔ کبھی درد، رحم، رنج سے بھی

سا بھی پڑا۔ کبھی انانیت، افسوس، حسرت کا دکھ بھی دوسروں میں اور اپنے آپ میں محسوس کیا۔ مگر وہ جس کی تلاش تھی، ہمیشہ ایک جلوہ دکھا کے نظروں سے اوجھل ہوتی گئی۔ ا

اور پھر جب کوئی امید نہیں رہتی کہ وہ مل جائے گی۔ جب اس کے وجود سے اعتقاد اٹھ جاتا ہے تو دفعتاً پھر اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ موسمِ گرما کی صبا رفتار دھوپ میں ٹیمز کے کنارے سرخ فراک پہنے سرخ بٹوہ ہاتھ میں لئے قلوپطرہ کی سوزن کو دیکھ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی اجنبی ہے۔ اور چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ مگر وہ ان تصویروں کی طرح قدیم ہے جو اس "سوزن" پر نقش ہیں۔ اور یہ سوزن قلوپطرہ کی نہیں، یہ فرعون رامیسس کے لندہ کرائے ہوئے فتح کے مینار ہیں۔ وہ بھی صدیوں پہلے مصر میں رہتی تھی۔ وہ مجھکو اب بھی لندن کے گلی کوچوں میں ڈھونڈھ رہا ہوں۔ وہ جو میری نظر کی منظورِ نظر ہے وہ جو تفریق تھی اور شجرۃ الدر تھی۔ جو کبھی رام سی تھی۔ اور یعقوب کی راحیل تھی۔ اور افلاطون کی ڈیوٹی ما تھی۔ . . . ما وہ مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ اور میں اسے ہمیشہ ڈھونڈھتا رہوں گا۔ اور اسے کبھی نہ پاؤں گا۔ اور دوسروں کی طرح جو اسے ڈھونڈھتے رہے، خطوط اور رنگ کے ذہنی چھپانے میں تار رہوں گا۔ میں پرانے مصوروں پر ہنسوں گا جن کی تصویریں صورتوں کا محض عکس ہیں۔ نئیں مستقبل پرستوں سے زیادہ مستقبل پرست بن جاؤں گا۔ تاکہ کسی پر کسی طرح میری نظر کی مایوسی کا راز نہ ظاہر ہو۔ اور وہ جسکے جسم نے فنونِ لطیفہ کو خم، دائرے، خطوط، نقطے عطا کئے ہیں، اس کی مایوس تلاش کا راز چھپا رہے۔ اور اسی لئے میں خم، دائرے، خطوط اور نقطوں میں اپنے ذہن، اور دوسروں کے ذہنوں کو الجھائے رکھوں گا۔

جاڑے گذرے، بہار آئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر چند گھنٹوں کے لئے سنہری دھوپ نکلی۔ کیو گارڈنز میں سینکڑوں طرح کے پھول کھلے تھے، جھاڑیاں شگوفوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ایک ایک شگوفے، ایک ایک پھول کا قد الگ تھا، وضع الگ تھی، حسن الگ تھا۔ ہزاروں رنگ تھے جنہیں آنکھ دیکھتی ہے اور زبان اچھی طرح بیان نہیں کرسکتی۔ اور میں جو ساری دنیا کا حسن دیکھ چکا تھا، اب بھی اس ہمیشہ نظروں سے بچ کے نکل جانے والی محبوبہ کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ کیونکہ ہزاروں کے حسن و جمال میں ایک الگ الگ کیفیت تھی۔ میں اس باغ میں ہجومِ گل سے ہلاکِ شوق تھا۔ دل کی جیب بھر زمین خالی نہ تھی۔ مگر اس کی نشست جو ہمیشہ خالی تھی خالی ہی رہی۔ دائرے میں ہزاروں نقطے تھے جو ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اور مرکز کی جگہ خالی تھی۔

اور نظر تشنہ تھی۔

(۱۸)

لافیلیا کر پیا نجے ۔ دفتر کے کرمی گرلیست ۔ اس کا قد لانبا تھا، بدن چھریرا تھا، بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے، وہ خوبصورت نہ تھی، لیکن بری بھی نہ معلوم ہوتی تھی ۔ اس کے چہرے پر مایوس شوق کی اداسی تھی ۔ وہ اپنے ساتھی کے کاندھے پر سوار کھڑی تھی؛ اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ساتھی کے شانے کی گرد حائل تھا ۔ اور وہ آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھی ۔ اس کا ساتھی اس کا بوجھ سنبھالے تھا، جیسے وہ مزدور جسے بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اس کے ساتھی نے اس روز داڑھی نہیں بنائی تھی ۔ اس کی ٹھوڑی پر ہلکے ہلکے سنہرے بال کیڑوں کی طرح چمک رہے تھے ۔ اس کے ہونٹ سُرخ تھے، اور رنگ بے حد سفید تھا ۔ اُس کا قد اُس لڑکی سے چھوٹا تھا، وہ نیلی رنگ کی قمیص، اور پتلون پہنے ہوئے تھا ۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، اور وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے اُسے محبت سے نہ اقرار ہے نہ انکار ۔

ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کا مجسمہ بلند لاٹ پر ساکت و ثابت کھڑا تھا اور بڑی متانت سے اُن ساری بدتمیزیوں سے درگذر کر رہا تھا، جو پر پھڑپھڑاتے ہوئے کبوتروں سے سرزد ہو رہی تھیں ۔ پتھروں کے مردہ اور ہیبت ناک شیر غیر جانب دار سے ہو کر رہ گئے تھے ۔ بچے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے ۔ ٹیڈی لونڈے اپنی دوست لڑکیوں سے ٹھٹھول کر رہے تھے ۔ شام ہو چکی تھی نیشنل گیلری کے دروازے بند تھے بیر کینچھ کلارک کا حُسن دوست ذہن حُسنِ نسوانی کے جلوؤں کا تجزیہ کر رہا تھا ۔ اور لاہور کی یہ لڑکی، اس انگریز مصور کے شانے پر سر رکھے، آنسو بہائے بغیر آہستہ آہستہ رو رہی تھی ۔ اور وہ اپنے کالے بالوں میں سورج کی شعاعوں کو گوندھ رہی تھی ۔

لافیلیا کر پیا نجے ۔ دختر کے کرمی گر لیست ۔ مدعمری تواں بہ تمنا ..... تمنا ..... اور تمنا وہ شے ہے جسکے حصول میں زوال شامل ہے، جس کا وصال فراق ہے جس میں آغوشِ شوق، محبت کی موت ہے ۔

لیکن اس منزل سے ہو کے گذرنا اس کے لئے ضروری تھا ۔ موت کے سائے کی اس وادی سے ۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی، اس کے فن کی تکمیل ممکن نہ تھی ۔

اب سے دو سال پہلے وہ لاہور میں مصوری سیکھ رہی تھی ۔ اور یہ محض رنگ بھرنے کا شوق تھا ۔ جیسے معمے حل کئے جاتے ہیں ۔

اور زندگی اس متناسب، جچی تلی رفتار سے چل رہی تھی، جس رفتار سے وہ انارکلی، میکلوڈ روڈ اور مال پر چلا کرتی ہے کہ ایک دم سے ایک بھونچال سا آگیا، جو اُسے اس خلائے کائنات میں اٹھا لے گیا،

جہاں نہ دنیا ہے نہ راستے ہے۔ جہاں بے حد و بے پناہ مایوسی ہے اور تنہائی، کائنات کے خلا کا وہ بھیانک بحر جس
میں یہ پیکر پستانیہ محض چھوٹے چھوٹے سے جزیرے ہیں۔ لاموزمیوزم میں پہلی بار دو مہینے پیرتھ سے ملی۔ جو
معلوم نہیں کس طرح بار بار اس سے نکل کے بھٹکتا بھٹکتا، تصویریں بناتا اور بیچتا ہوا استنبول، طہران اور
کابل کے راستے یہاں آ نکلا تھا۔ تعارف کے چند لمحوں بعد ہی اس لڑکی نے ـــــ یہ جو ٹریفالگر اسکوائر
میں اُس کے شانوں پر سر رکھے رو رہی ہے ـــــ یہ محسوس کیا کہ اگر یہ اجنبی مجھے پیار کرے تو میں بُرا نہ
مانوں گی۔

نوزے پیرتھ نے کئی ہفتے اُسے محض آرٹ میں الجھائے رکھا، گویا اُسے جمیلہ سے ـــــ چلئے اس کا نام
جمیلہ رکھ دیں، کیونکہ یہ نام لاہور کے لڑکیوں میں بہت عام ہے ـــ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک سیلاب تھا
جو بہا چلا آتا تھا۔ اور یہ محض فن کے نظریوں اور تصورات اور شعر اور تخیل کا سیلاب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دفعتاً
آرپو، ابسن، اور موڈیلیانی نے ایک نئی زندگی اختیار کر لی، نیا روپ دھار لیا۔ جو محض روایت تھی، سنی
سنائی کہانی تھی۔ زندگی، عمل، خون بن گیا۔ اور مصوری کا فن جی اٹھا۔ اور جمیلہ گھنٹوں نوزے پیرتھ کی باتیں
سنتی رہتی اور اپنے بیک گراؤنڈ کو اس کے مشورے سے بناتی اور بگاڑتی رہی، اور اس طرح کئی ہفتے گذر گئے۔

پہلے اس کے ماموؤں کو شک ہوا، اور پھر اُس کے باپ کو۔ حالانکہ شک کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ڈھاکے
بھیج دی گئی۔

اُس شام کو ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کے خاموش مجسمہ سے اُس لڑکی کے دل نے کہا کہ اگر مجھے ڈھاکہ
نہ بھیجا جاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ میں جس حال میں تھی خوش تھی۔ مجھے اس کی آرزو، طلب، خواہش نہ تھی۔ میں اس کی
تنقید سنتی، اپنی تصویریں ٹھیک کرتی رہتی، اور ممکن ہے اس طرح رفتہ رفتہ مصور ہو جاتی۔ اس طلب سے
جو میرے دل میں تھی، اور اس سے جسے میں مبہم طور پر طلب کر رہی تھی۔ مگر جب مجھے ڈھاکہ بھیج دیا گیا تو مبہم
سی طلب فراق بن گئی۔ اور میں نے اُف تک نہ کی۔ اور چونکہ میں نے اُف تک نہ کی۔ درد بڑھتا ہی گیا اور
جب درد بہت بڑھ گیا تو میں بیمار ہو گئی۔

وہی پرانے قافیے۔ سِرِّ دلبراں۔ حدیثِ دیگراں۔ مگر نیشنل گیلری کے سائے میں یہ بھی بے محل نہیں۔
روایت یہ ہے کہ ایک تھا شاعر۔ اس کا نام تھا جلال الدین رومی۔ ایک تھی مثنوی۔ شکایت۔ حکایت۔
فراق۔ اشتیاق۔ وہی پرانے قافیے۔ یار۔ اسرار۔ چاک، پاک، افلاک، چالاک، ایک تھا بادشاہ
ایک تھی کنیز۔ ایک کنیز بیمار تھی۔

بادشاہ کو کنیز سے محبت تھی۔ اور کنیز کو بیماری سے عشق تھا۔ بادشاہ کو کنیز سے محبت تھی، جیسی

محبت اکثر ہوا کرتی ہے، اور کنیز کو بیماری سے اسی لئے الفت تھی کہ اس کے دوسرے سرے پر موت تھی۔ موت۔ فراغت، نجات، اس کشمکش، اس مایوسی، اس روز روز کی ہلاکت سے نجات۔ اور اس لئے سارے طبیب عاجز تھے۔ مگر ایک تھا طبیب۔ ایک تھا طبیب (مثلاً بوعلی سینا) اُسنے دروازے بند کرا دیئے "کس ندارد گوش در در دہلیزہا۔ تا بپرسم از کنیزک چیزہا"۔ اُس طبیب نے کنیز سے پوچھا کہ تو کہاں کہاں رہی۔ کس کس کے ہاتھ بکی اور طبیب کا ہاتھ اس کی نبض پر تھا۔ جب سمرقند (لاہور پشاور) کا نام آیا اس کی نبض کی رفتار تیز ہوگئی۔ اور پھر اُسنے زرگر کا ذکر کیا جس سے کنیز کو محبت تھی۔ بیماری سے زیادہ، موت سے زیادہ اس زرگر سے محبت تھی۔ اور زرگر (جو بار بادوس کا رہنے والا تھا) شاید یہ اچھی طرح جانتا نہ تھا۔

"ابھی جمیلہ کے پھیپھڑوں پر ہلکا ہی سا اثر ہے۔ دق کی شروعات ہے۔ جمیلہ کو علاج کے لئے یورپ بھیجدو۔ یہ پیسہ کس دن کام آئے گا۔"

اور وہ انگلستان آگئی۔

اور طبیب نے جس کا ہاتھ کنیزک کی نبض پر تھا۔ زرگر کو بلا بھیجا۔ کیونکہ صوفیوں کا قول ہے کہ جب تک عشق مجازی کا مرحلہ طے نہ ہو جائے عشقِ حقیقی کا مرحلہ نہیں آتا، جو بادشاہ کی محبت ہے۔ طبیب نے زرگر کو بلا بھیجا۔ کنیزک کے چہرے پر رونق آگئی، اس کے رخساروں پر سُرخی جھلکنے لگی۔ اُسے مرض سے نفرت ہوگئی۔ موت سے عشق نہ رہا۔ موت کے اس پار زرگر تھا۔ اور اسے زرگر سے عشق تھا۔ کیونکہ صوفی کہتے ہیں عشق مجازی نفس دوں کا عشق ہے۔ اور جب حواس سیر ہو چکے تو طبیب نے زرگر کو زہر دے دیا۔

اُس لڑکی نے جو خوزے پیریتھ کے شانے پر سر رکھے رو رہی تھی، اس کی آنکھیں خشک تھیں کیونکہ عشق اس کے دل میں مر چکا تھا۔ اس لئے کہ تمنا، آرزو، خواہش، طلب سب کو طبیب نے زہر دے دیا تھا۔ خوزے پیریتھ کا دل غیر جانب دار تھا۔ اُسے اصلی نظم سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں آرہا تھا۔

افیلیا پانچ۔

اور پھر فضائے لامحدود کے بھونچال کے بعد یہی عالم خاک و باد۔ یعنی کیچڑ اور آندھی کی دنیا۔ اور آرٹ یعنی اس کیچڑ اور دنیا میں اُس عشق کی تلاش جو خانہ بدوش ہے۔

ڈاکٹر جمشید علی خاں (طبیب کامل) نے کہا۔ ایک دن میں تم دونوں مصوروں کو ملاؤں گا خوزے پیریتھ

کو نہیں، جمیلہ تم کو، اور اس دوسرے آرٹسٹ کو جو کہتا ہے میں نظر بن نظر ہوں۔ اور معلوم ہے تمہارے لئے سنو کیا لکھوں گا؟ ایک شعر۔

خو حُسن کمال حُسن ہے یعنی حُسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق مال عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

پہلا مصرعہ اُن صاحب نظر صاحبزادے کے لئے ہے۔ اور دوسرا مصرعہ جمیلہ' دُختر کے کرمی گریسٹ' تمہارے لئے۔

(۱۹)

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ میبل دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری۔ ابھی تک سانس اچھی طرح سنبھلنے نہ پائی تھی۔ اُس نے کہا "ہلو"۔

آواز نے کہا "افضل"۔

ایک لمحے تک خاموش رہنے کے بعد' جواب دیئے بغیر' اسنے ٹیلی فون کے رسیور کو بند کر دینا چاہا۔ پھر کچھ ذرا درشت سے لہجے میں اس نے کہا "تمہیں کیا چاہئے۔ میں تم سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی"۔

ٹیلی فون نے کہا "نہیں۔ نہیں میبل۔ اتنی خفا نہیں ہونا چاہئے۔ میں تمہارا افضل ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تم اس قدر غصہ میں کیوں ہو"۔

"سنو افضل۔ اچھی طرح سنو۔ ہم دونوں کا تعلق بالکل ختم ہو چکا۔ اور میں تم سے باتیں نہیں کرنا چاہتی۔ اور نہ ملنا چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو"۔

"نہیں۔ میں کسی طرح تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے"۔

"محبت۔ محبت" اس نے ہسٹریائی لہجے میں عاجز آکے کہا "جب تمہاری زبان سے یہ لفظ نکلتا ہے میرا جی متلانے لگتا ہے۔ تمہاری محبت میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مساج۔ بستر۔ آج ایک کل دوسری... تم اپنا اور میرا وقت بیکار ضائع کر رہے ہو۔ میرا امتحان قریب ہے"۔

"سنو تو سہی۔ میبل"۔

"میں سن رہی ہوں"۔

"کچھ دن پہلے تم ہی کہتی تھیں کہ تم مجھے چاہتی ہو"۔

"کچھ دن پہلے میں احمق تھی، بے وقوف تھی۔ لیکن میں ایک بات بتاؤں۔ تمہاری طرح میں نے کبھی محبت اور بستر کو ہم معنی نہیں سمجھا۔ میرے خیال میں محبت کا تعلق ذہن اور ہمدردی، اور انسانیت اور دکھ درد میں شریک ہونے سے بھی ہے۔ اور تمہیں محض ایک چیز سے محبت ہے۔ محض ایک چیز سے اپنے نفسانی نفس سے۔"

"تم ناحق بگڑ رہی ہو میبل۔ ایک مرتبہ اور ملو۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔"

"ایک مرتبہ اور ملوں، کیوں کیا آج کل لڑکیوں کا خزانہ ختم ہو گیا۔ اور تم بہت سے باسی مال منگوانا چاہ رہے ہو۔ یا محض تبدیلی ذائقہ کے لئے؟"

"میبل تمہیں ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔"

"خدا حافظ۔ افضل۔ خاتمہ جیسا کہ ہونا تھا، ہو چکا۔ تمہارا راستہ اور ہے۔ میرا راستہ اور۔"

اس نے ٹیلی فون کا رسیور نیچے رکھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے میں آئی اور اپنے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر لیا۔

اس نے بلاذری کی فتوح البلدان کا انگریزی ترجمہ پڑھنا چاہا اور الفاظ اس کی نظروں کے سامنے ناچنے لگے۔ اس نے رنج اور غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور سوچنے لگی۔

شاید کوئی اپنے آپ سے گریز نہیں کر سکتا۔ لیکن گریز کئے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ اسے وہ زمانہ یاد آیا کہ وہ یونیورسٹی میں شرکت کا امتحان دے رہی تھی۔ اپنی ماں کے ساتھ سینٹ مارٹن ان دی فیلڈز کے کلیسا سے واپس آ رہی تھی۔ ابھی تک اس کے کان میں پادری کے لاطینی لہجے، اور مذہبی بھجن کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔ کہ اس کی ماں نے سڑک پار کرنے کے بعد کہا: "میبل میں بڑی گنہگار ہوں۔"

"کیوں؟ کیوں اماں؟ تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟ تم فرشتہ ہو۔ ڈیڈی کے مرنے کے بعد تم نے کتنی مصیبتیں اٹھا کے مجھے پالا۔"

"شکریہ میبل۔ لیکن میں بڑی گناہ گار ہوں۔"

کیا بات ہے۔ اماں! تم تو فرشتہ ہو۔"

"قطعاً نہیں۔ ابھی جب ہم گرجا میں بیٹھے تھے۔ تم نے دیکھا وہ حبشی آ کے میرے سیدھے ہاتھ پر بیٹھ گیا اور مجھے گھن معلوم ہونے لگی۔ میں جانتی ہوں یہ بڑی بری بات ہے۔ جب ہمارے آقا نے فلسطین میں انسانی روپ دھارا تو معلوم نہیں ان کی جلد کا رنگ کیسا تھا۔ میں بھی عیسائی ہوں۔ مجھ میں یہ نسلی اور رنگ کا تعصب کیوں ہے؟ یہ کیوں نہیں جاتا۔"

"اماں۔ تم فرشتہ ہو۔ تم ناحق اس طرح اپنا جی ہلکان کر رہی ہو۔ بعض لوگوں میں شاید فطرتاً ایسا تعصب ہوتا ہوگا۔ بعض کو نہیں ہوتا۔"

"نہیں یہ کوئی فطری تعصب نہیں۔ ہندوستان جانے سے پہلے مجھ میں کوئی نسلی تعصب نہیں تھا۔ وہاں جاکے میں بھی میم صاحب بن گئی۔ اور اب یہ احساس مٹائے نہیں مٹتا کہ میں ہندوستانیوں اور حبشیوں اور دوسروں سے انگریز ہونے کی وجہ سے برتر ہوں۔ میں بڑی گناہ گار ہوں۔"

"اماں اپنے آپ کو الزام نہ دو۔ تم میں اور لاکھوں خوبیاں ہیں۔"

اس کی ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کے مجسمے کو ذرا شرارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے میبل نے اپنی ماں سے کہا۔ "اماں میں ایک بات بتاؤں۔ شاید اس سے تم خوش ہو جاؤ گی۔"

"کیا؟"

"ابھی اپنے اس عظیم امیر البحر کی صورت دیکھ کے مجھے خیال آیا کہ اور قوموں میں بھی ایسے ہی ہیرو پیدا ہوئے ہیں۔ اور ہمارا کوئی ہیرو کسی سے افضل نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ہمارا کوئی ہیرو سو سال پہلے پیدا ہوا تو ہمیں اس سے اتنا ہی دور کا واسطہ ہے، جتنا کسی اور ہیرو سے جو کسی اور قوم میں پیدا ہوا ہو۔"

"لڑکی۔ یہ کچھ عجیب منطق ہے۔"

اپنی انگلی گھماتے میبل نے کہا: "اماں اگر میں اس امتحان میں پاس ہوگئی تو جانتی ہو میں یونیورسٹی میں کیا مضمون پڑھوں گی؟ انگلستان یا یورپ کی نہیں، بلکہ مشرقی تاریخ۔ کہیں کی! اس کی مجھے فکر نہیں۔ چین کی۔ ہندوستان کی۔ یا مشرقِ وسطیٰ کی۔"

"اور یہ پڑھ کے کیا کرو گی؟"

"ان ملکوں کا سفر کروں گی۔ وہاں کے لوگوں سے ملوں گی۔ ان کو سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ اماں۔ ایک اور بات بتاؤں۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتی۔ لیکن غالباً مجھ میں کسی طرح کا نسلی تعصب نہیں۔"

اور اس کی ماں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا: "میری لڑکی۔ مجھے یقین ہے تو کوئی ایسی بات نہ کرے گی جو نامناسب ہو۔ اور میں تیرے معاملات میں زیادہ دخل نہ دوں گی۔"

کچھ روز کے بعد میبل کی افضل سے ملاقات ہوئی۔

(۲۰)

ایک بین الاقوامی کلب کے چھوٹے سے بے تکلف رقص کے کمرے میں ناچ کے نکار ڈ بج رہے تھے۔ نئی جنوبی امریکی دھنیں۔ تورے رو..... تورے رو..... چاچا..... اور باجے کی آواز کے ساتھ پس منظر میں ہنسی مذاق، آہستہ آہستہ لیکن شگفتہ بات چیت کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں جن کو الگ الگ پہچاننا مشکل تھا۔ اور ساتھ ہی فرش پر ناچتے ہوئے جوتوں کی مدھم سی آواز۔

"ابے ناچ بے یہاں بیٹھا بیٹھا کیا کر رہا ہے۔"

"تو کیوں خاموش بیٹھا ہے تو کیوں نہیں ناچتا۔"

پہلے نے جواب دیا "میں چار روز سے مسلسل ناچ رہا ہوں۔ پرسوں ہمیر اسمتھ گیا تھا۔ کل سینٹ جونز کلب آج یہاں۔ تو ناچ۔ لڑکیاں تعریف کرتی ہیں خوب ناچتا ہے۔"

دوسرا ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کہا: "افضل تیرے پاس سگریٹ ہیں۔"

افضل نے سگریٹ نکالے۔ دیا سلائی جلی۔ افضل نے کہا: "رحمان اُدھر دیکھ وہ دو لڑکیاں جو ابھی آئی ہیں۔ لباس سے انگریز معلوم ہو رہی ہیں۔ جرمنی فرانس کی نہیں۔ وہ اُدھر والی جو ہے ذرا اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بندہ تو چلا۔"

رحمان نے سگریٹ کے کش پر کش لئے۔ اپنی انگلیوں کی نکوٹین کو دیکھا، اور رقص کے سُر پر آہستہ آہستہ پیر تھپتھپانے لگا۔

نو وارد لڑکیوں میں جو "اُدھر والی" تھی۔ اس کے پاس پہنچ کے افضل نے رقص کی دعوت میں سر خم کیا۔ اُس نے اوپر سے نیچے تک افضل کو ایک مرتبہ دیکھا، پھر مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک منٹ تک بلا کچھ کہے ہوئے دونوں ناچتے رہے۔ رقص نے ایک طرح کی جسمانی مفاہمت پیدا کر دی تھی اور دونوں کے قدم بڑی ہم آہنگی سے اٹھ رہے تھے۔ ایک منٹ تک دونوں ایک شانِ استغنا سے ناچتے رہے۔ گویا ناچ کے سوا ان کو ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

پھر افضل نے کہا: "آپ بہت اچھا ناچتی ہیں۔"

لڑکی مسکرائی۔ ذرا شوخ لہجے میں اس نے کہا: "آپ بھی ایسا بُرا نہیں ناچتے۔"

پھر چند لمحے کے رقص کے بعد افضل نے پوچھا: "میں نے آپ کو یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔"

بات کرتے میں معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کے عضو عضو میں ایک نئی جان، نئی حرکت انگڑائیاں لے رہی ہے۔

اس نے پھر مُسکرا کے جواب دیا "جی ہاں۔ میں پہلی بار آئی ہوں۔ آپ یہاں کے ممبر ہیں؟"

"جی ہاں"

"میں اپنی سہیلی کے ساتھ اس کی مہمان بن کے آئی ہوں"

"آپ یہاں ممبر کیوں نہیں بن جاتیں؟"

وہ ہنسی۔ اس کے سر کے سُرخ بال پیچھے پونی ٹیل کی چوٹی کی شکل میں لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ اس قدر گہری تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ ان کی کوئی تہہ ہی نہیں۔ اور اس کا ناچتا ہوا جسم زندہ اور جوان تھا۔

نیا کارڈ لگا۔ لڑکی نے سکوا کے تھینک یو کہا۔ اور اپنی سہیلی کے پاس جا بیٹھی۔

جب یہ ناچ شروع ہوا تو وہ کسی اور کے ساتھ ناچنے لگی۔ افضل نے آہستہ آہستہ ٹانگوں کی دھن پر اپنے پیر ٹپکنے لگا اور چھیڑنے کے لئے اس نے رحمان سے پوچھا "بتا تیرے دل کا کیا حال ہے؟ بیٹھا جا رہا ہے؟"

جوان کسی اور لڑکی سے ناچنے کے لئے اٹھا۔ جسے ہنسے مسکرا کے سر ہلا کے معافی چاہی "معاف کیجئے۔ میرے کاندھے میں درد ہے"

رحمان نے اصرار کیا "لیکن آپ کاندھے سے تو نہیں ناچیں گی۔ پیروں سے ناچیں گی"

اس جرمن لڑکی نے اپنی ساتھ والی جرمن لڑکی سے کہا "اِش گلاؤبے، اِش مُس تانتسن" معلوم ہوتا ہے ناچنا ہی پڑے گا" اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

افضل شرارت سے اس جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ رحمان اُسے فرش پر اِدھر سے اُدھر گھسیٹ رہا تھا۔ اور افضل نے اپنے دل میں کہا "اس حرام زادے کو نہ ناچنا کبھی آیا ہے نہ آئے گا"

افضل نے رحمان سے کہا "واہ بے کیا ناچ ناچا ہے۔ سارا فرش گھس گیا۔ اور جھپٹ کے پھر نو وارد لڑکی کے پاس جا پہنچا تاکہ قبل اس کے کہ کوئی اور اس سے ناچنے کے لئے کہے، اُس سے اِس ناچ کی فرمائش کرے۔

سُرخ بالوں والی لڑکی اپنے پونی ٹیل کو لہرا کے مسکراتی ہوئی اٹھی۔ اس کے شفاف چہرے پر اُس کی گہری نیلی آنکھیں اور ہونٹ جن پر بالکل ہلکی سی سُرخی تھی، اس قدر حسین معلوم ہو رہے تھے کہ افضل نے اپنے حُسن کے عادی حواسوں میں ایک نئی نرالی امنگ محسوس کی۔

لڑکی نے اس مرتبہ پوچھا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔"

"پشاور۔ پاکستان"

"اوہ۔ پشاور۔ ایک زمانے میں میرے والد بھی وہاں تھے۔"
"جی۔ میرا نام افضل ہے۔ اور آپ کا؟"
"میبل میبل ایشول۔"
"کتنا پیارا نام ہے۔ ایسی حسین لڑکی کا نام بھی پیارا ہونا چاہیے تھا۔"
ناچ میں ہنسی سے اس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ حسن کی زندہ موج در موج لہر۔
اور اس نے کہا: "آپ ہمیشہ اس طرح لڑکیوں کی خوشامد کرتے رہتے ہیں؟"
افضل نے کہا: "کبھی کبھی۔"
وہ پھر ہنسی۔ اس کا جسم اس کا حسن ہنسی میں لہرایا۔ اور ناچنے میں افضل نے اُسے قریب کر لیا۔
اور کہا: "میرے خیال میں آپ بہت حسین ہیں۔"
ذرا ہٹ کے ناچتے ہوئے اُس نے کہا: "مجھے یقین ہے آپ ہر لڑکی سے یہی کہتے ہیں۔"
افضل نے پھر کہا: "کبھی کبھی۔"
وہ ہنسی، اور دو ایک منٹ کی خاموشی کے بعد جس میں جسم ایک دوسرے کی ہم آہنگی کو سمجھ رہے تھے،
میبل نے پوچھا: "اس ملک میں آپ کتنے عرصے سے ہیں؟"
"یہ میرا تیسرا سال ہے۔ . . . ."
"آپ کیا کرتے ہیں؟ پڑھتے ہیں؟"
"سینٹ پیٹرک کالج میں۔ ریاضی۔"
"اوہ۔ اوہ . . . . . میں بتاؤں میں ہمیشہ ریاضی میں کمزور رہی۔"
افضل نے رقص میں اُسے ذرا سا کھینچ کے کہا: "میں پڑھا دیا کروں۔"
وہ پھر ذرا ہٹ گئی۔ اور کہنے لگی: "نہیں۔ نہیں۔ شکریہ۔ مجھے امید ہے کہ جی۔ سی۔ ای میں ریاضی کا آخری سوال جو مجھے کرنا تھا کر چکی۔ اب کبھی حساب۔ الجبرا۔ اقلیدس۔ ہندسہ کے کسی سوال کو ہاتھ نہ لگاؤں گی۔"
اور اس پر افضل نے پوچھا: "آپ کس کالج میں پڑھتی ہیں؟"
"ابھی تک تو کسی کالج میں نہیں۔ ابھی ابھی میں نے جی۔ سی۔ ای۔ اے لیول کا امتحان دیا ہے۔ امید ہے مجھے یونیورسٹی میں شریک ہونے کا وظیفہ مل جائے گا۔"
"وہاں آپ کیا پڑھیں گی؟"

"تاریخ۔"

"کون سی؟"

"معلوم نہیں۔ انگلستان کی۔ یورپ کی۔ یا شاید جاپان کی۔ مجھے دور دور کے ملکوں سے بہت دلچسپی ہے۔"

"میں بتاؤں۔ اسلامی تاریخ پڑھئے۔ اگر آپ کو دور دور کے ملکوں کا بہت شوق ہے۔ تو ہمارا ملک اب اتنا بڑا نہیں۔"

میبل نے کہا: "مجھے اپنے ملک کا حال بیان کیجئے۔"

اگلا ناچ فاکس ٹروٹ تھا۔ افضل نے اپنے دل میں کہا: "مچھلی چڑھ رہی ہے۔ مچھلی کانٹے کے آس پاس منڈلا رہی ہے پھنس ہی جائے گی۔ ایک اور سہی۔" اور پھر میبل سے کہا "آپ کافی پئیں گی۔ یا اور کچھ؟"

"میں انکار کے انداز میں جو در اصل اقرار ہے اسنے کہا "جی نہیں۔"

افضل نے کہا "کیوں؟ کیا عجیب بات ہے۔ ہر لڑکی شروع میں نہیں نہیں کہتی ہے۔"

میبل نے دوسری مرتبہ اسے اوپر سے نیچے تک اچھی طرح دیکھا۔ اس پٹھان لڑکے کا قد چھ فیٹ کے قریب تھا جسم سڈول اس کی بھی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں، بال گھنے ہوئے اور ذرا ذرا گھونگھر یلے، ناک اونچی، رنگ ہلکا سا لال۔ اور میبل کو یہ معلوم ہوا کہ دوسری لڑکیاں بھی اس کی طرح شروع میں نہیں نہیں کہتی ہیں۔ اور اسنے طنز سے مسکرا کے کہا "آپ بڑے تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔"

"بہت زیادہ نہیں۔ لیکن۔ پلیز۔ ایک پیالی کافی سے آپ کا ہاضمہ نہیں خراب ہوگا۔"

لڑکی نے اپنے صحت سے بھرپور شانے ہلائے۔ اور افضل کی طرف مسکرا کے دیکھا اور کہا "اچھا۔"

افضل نے پیٹھ کے پیچھے ہاتھ ملا کے رحمان کو اشارے سے کہا کہ وہیں بیٹھا رہو اور خود میبل کو بار کی طرف لے چلا۔

کافی میں شکر ڈالتے میں میبل نے کہا: "آپ بڑے تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بہت سی لڑکیوں کو جانتے ہیں؟"

"چند کو۔ لیکن کوئی آپ جیسی حسین نہیں۔"

میبل خوشی سے ہنسی اور اسکے سرخ بال لہرا کے چمک اٹھے۔

"خوشامدی۔ اسنے ہنس کے کافی کی پیالی اٹھائی۔

"کیا کہا آپ نے ؟" افضل نے مذاق میں پوچھا۔

"میں نے کہا خوشامدی مجھے یقین ہے آپ ہر لڑکی کی اسی طرح تعریف کرتے ہیں۔"

"میں ایک بات بتاؤں میبل ؟" افضل نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ "ہمارے مذہب والوں میں ایک قصہ مشہور ہے، شاید عیسائیوں میں بھی ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے ستارہ دیکھا، اور اس کو خدا سمجھا، پھر چاند دیکھا اور اس کو خدا سمجھا پھر سورج دیکھا اور سورج کو خدا سمجھا۔ سورج کو دیکھنے کے بعد تاروں اور چاند کی کوئی قدر نہ رہی۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ آپ شاعر بھی ہیں۔" میبل نے کہا، مگر خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

افضل نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ میں ہوں بچارا ریاضی کا طالب علم۔"

"بچارا۔ بچارا۔ ریاضی کا طالب علم۔"

اور پھر میبل کے دوسرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کے افضل نے کہا۔ "میبل تم مجھے بہت پسند ہو۔"

اس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ مگر حیرت سے سانس کھینچ کے کہا۔ "مگر آپ سے ابھی تو ملاقات ہوئی ہے۔"

افضل نے کہنہ مشق انداز میں کہا۔ "پہلی نظر میں محبت سہی۔" اور اس نے اس کے ہاتھ کو آہستہ سے دبایا۔

میبل نے اب بھی اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔

افضل نے کہا۔ "کل تمہیں فرصت ہے۔ میرے ساتھ سینما چلو گی۔ ایک بڑا اچھا فلم ہے "سانولی نقاب" دیکھنے چلو گی ؟"

میبل مسکرائی۔ لمحے بھر کے بعد اس نے اعتماد کے لہجے میں کہا۔ "اچھا۔"

اور اس نے تیسری مرتبہ نظر بھر کے افضل کو دیکھا۔ اور اپنے دل میں کہا۔ "اچھا خاصا لڑکا ہے۔ ایک چیز نئی ہے جیسے کہ برنگ۔ اور مجھے کوئی تعصب نہیں۔"

پھر اس نے کہا۔ "کافی کا شکریہ۔ اب مجھے جاکے اپنی سہیلی کو ڈھونڈنا ہے۔ ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ مجھے گھر جانا ہے۔"

"تو پھر کل سات بجے سینما۔ کہاں ملو گی ؟"

"ہاں کہاں ؟"

"پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن میں۔ بین الاقوامی گھڑی کے پاس۔"

"او کے"

"او کے ڈارک"

اور گھر واپس پہنچ کے جب وہ اپنی ماں کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اور شب بخیر کہہ کے اُسکے رخسار پر ہلکا سا بوسہ دیا تو اُس کی ماں مسز ایشمول نے پوچھا۔

"ناچ کیسا تھا"

"اچھا خاصا تھا۔ اماں"

"رہ بھی اُسنے کہا۔ اماں"

"کیا ہے میبل"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔ اماں"

"اب نہیں تو پھر کبھی۔ جب تمہارا جی چاہے تم بے جھجک جو کہنا ہے کہہ دینا"

"نہیں۔ اماں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی تھی۔ آج ناچ میں ایک پاکستانی لڑکے سے میری ملاقات ہوئی"

مسز ایشمول نے تکیہ سے اپنا خاکستری بالوں والا سر اٹھایا۔ اور خفیف سے اندیشہ ناک لہجے میں دُہرایا۔

"پاکستانی ؟"

"ہاں۔ اماں مجھے معلوم ہے آپ پسند نہیں کریں گی کہ میں کسی رنگ والے لڑکے سے ملوں۔ لیکن وہ ..... وہ میرے خیال میں، اچھا خاصا ہے۔ اور کل اسنے مجھے سینما جانے کی دعوت دی ہے۔"

مسز ایشمول کی سانس ذرا تیزی سے چل رہی تھی۔ میبل جھٹ سے دُور کھڑی ہو گئی۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد مسز ایشمول کے چہرے پر ایک طرح کا سکون آ گیا۔ اور اس نے کہا "مجھے دخل دینے کا کوئی حق نہیں میبل"

"میں سمجھتی ہوں ممی ڈارلنگ۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے"

"مجھے معلوم ہے میبل۔ آؤ ایک مرتبہ مجھے اور شب بخیر کہہ کے پیار کرو"

اور جب میبل اپنی ماں کو پیار کرنے لگی تو مسز ایشمول نے اُس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کے کہا "میری بچی تیری زندگی تیری زندگی ہے۔ مجھے یقین ہے تو کوئی ایسی بات نہ کرے گی جو نامناسب ہو۔ اور میں تیرے معاملات میں دخل نہ دوں گی"

(۲۱)

"ہلو گوئز" (کاکنی لہجہ)

"ہلو ڈک" (پٹھان لہجہ)

"پب میں ہمارے ساتھ بیئر پیئے گا خان؟"

"نہیں ڈک۔ ہمارے مذہب میں شراب دارو پینا حرام ہے۔ سور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ لڑکی لوگ بھی حرام ہے۔ مگر ہم بہت گناہ گار ہے۔"

"اچھا۔ تم کافی پیئے گا۔ ہم بیئر پیئے گا۔"

"یہ گل ٹھیک ہے۔"

پب میں گراموفون پر عامیانہ سا ریکارڈ بج رہا تھا۔ اور گلاسوں کی کھڑکھڑاہٹ اور ہنسی کی آواز آرہی تھی۔

ڈک نے پوچھا "خان! تم ابھی بولا۔ ہمارے مذہب میں لڑکی لوگ حرام ہے۔ مگر تم پاکستانی لوگ سب سے زیادہ سفید لڑکی ساتھ لے جاتا ہے؟ یہ کیا بات ہے؟"

"ہم مسلمان لوگ بہت گناہگار ہے۔"

"تمہارا دیس میں بھی بہت لڑکی لے جاتا ہے۔"

"ادھر دو تین چار شادی بنانے کی اجازت ہے۔ مگر دوسرا لڑکی ساتھ نہیں جاتا۔ فقط رنڈی لوگ آتا ہے۔"

ڈک کا پوپلا منہ ہنسی سے کھل گیا: "تین چار شادی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔"

"اپنا اپنا ملک کا رسم ہے۔"

"اسی واسطے تم لوگ ہمارے ملک کی لڑکی لے جاتا ہے اور ٹیڈی بوائے لوگ یہ پسند نہیں کرتا۔ ہم بولتا ہے کالے کالے کا میل ہے۔ اور گورے گورے کا میل ہے۔ جیسا امریکہ اور جنوبی افریقہ میں ہے۔"

"تمہارا لڑکی لوگ ساتھ جاتا ہے تو ہم کیا کرے گا؟"

"نہیں خان۔ ہم تم کو نہیں بولا۔ ہم تو حبشی لوگ کو بولا۔"

"بہت ٹیڈی بوائے لوگ ہم کو بھی کالا، نیگر، کلرڈ بولتا ہے۔ ہم اور حبشی لوگ بھائی بھائی

ہے۔"

"تم کیوں ناراض ہوتا ہے۔ ہم تو بولتا ہے یہ سب ہماری سرکار کی غلطی ہے۔ وہ نیگرو لوگ کو کیوں ادھر آنے دیتا ہے۔ کیوں نوکری دیتا ہے۔ ہمارا ملک کیوں افریقہ جاتا ہے اور نیگرو لوگ کا ناچ دیکھتا ہے۔ اُن سے ہاتھ ملاتا ہے۔"

"تم اپنی سرکار سے بولو"

"ہم تو اگلے الیکشن میں اُس کو رائے دے گا، جو کالے آدمی کا ادھر آنا بند کرے۔ ہم صاف بات بولتا ہے۔ ناٹنگ ہل کے جھگڑے میں پولیس، سرکار، اخبار سب کالے آدمی کی طرفداری کیا۔ سفید لڑکوں کو چار چار سال کی قید کی سزا دیا۔"

"تم ہم کو ادھر کالی پینٹ کو ملایا تھا۔ اب ہم سے اینٹھتا ہے۔"

"نہیں جان۔ ناراض مت ہو۔ تم ہمارا دوست ہے۔ ہم بس لاسٹ ہم ٹیلی وژن پر اُدھر ایک کھیل میں دیکھا تھا۔ گنگا دین تم ہم سے اچھا آدمی ہے۔"

(۲۲)

"گنگا دین تم مجھ سے بہتر انسان ہو۔ لیکن میں بتاؤں سلامت اللہ یہ قول کپلنگ کا ہے۔ اور وہ اسکا قائل تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اور یہ دونوں کبھی نہ ملیں گے۔ اس لئے کہ اُسکا عقیدہ تھا کہ یورپ برتر ہے اور ہمیشہ برتر رہے گا۔ اور ایشیا کمتر ہے اور ہمیشہ کمتر رہے گا۔ اس لئے تم جو یہ امیدیں لگا کے آئے تھے کہ یہاں تم سے برابری کا سلوک کیا جائے گا۔ یا جیسی کلرکی تمہیں کراچی میں مل گئی تھی یہاں بھی مل جائے گی تو یہ غلط ہے۔ یہاں اس وقت تک کسی ہندوستانی یا پاکستانی کو نوکری نہیں دیتے جب تک کہ یقین نہ ہو جائے کہ کوئی انگریز اس جگہ کے لئے نہ مل سکے گا۔ اور بہت کم کوئی ایسی نوکری دیتے ہیں جس میں قمیص کا کالر صاف رہ سکے۔ اس لئے سلامت اللہ یہ پلیٹیں دھونے کی نوکری جو تمہیں ملی ہے ایسی بُری نہیں۔ اسی پر جمے رہو۔ اور جھوٹی پلیٹیں دھونے سے لاکھ جی متلائے، اگر دو وقت روٹی کھانا ہے تو پلیٹیں دھوتے رہو۔"

"ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں جانتا ہوں۔ فاقہ اور بھوک، اور سردیوں میں کھلے آسمان کے نیچے راتیں گذارنے سے تو ہر چیز اچھی ہے۔"

"تمہاری کھانسی سے مجھے ذرا ذرا تشویش ہے۔ میرے خیال میں کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ"

سلامت اللہ یہ چیلسی ہسپتال کے نام چٹھی ہے۔ وہ تمہارے پھیپھڑوں کا ایکسرے لیں گے۔ اور تمہارے خون وغیرہ کا امتحان کریں گے۔ تم سگریٹ چھوڑتے نہیں، اور جب تک تم سگریٹ نہیں چھوڑو گے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا علاج کیسے ہو سکے گا۔"

ڈاکٹر جمشید علی خاں نے چٹھی اس کے ہاتھ میں دی۔

سلامت اللہ نے جیب سے تین پونڈ کے نوٹ نکال کے ڈاکٹر کی طرف بڑھائے۔

"یہ کیا ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب۔ میری بیکاری کے زمانے میں آپ وقتاً فوقتاً میری مالی مدد کرتے رہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ آہستہ آہستہ قسطوں میں جو آپ نے مجھے دیا ہے میں ادا کر دوں۔"

"کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو۔ جاؤ۔ اگر پیسے بہت ہو گئے ہیں تو اچھی غذا کھاؤ۔ دودھ۔ پنیر اور میوے کھاؤ۔ اور خوش رہا کرو۔ اُون کی بنیان ہمیشہ پہنے رہا کرو۔ اور گرم رہو.....۔"

اور سلامت اللہ کو کھانسی کا ایک اور دورہ پڑا جس میں شکریہ کے الفاظ دب گئے۔

(۲۳)

وسکی کے گلاس میں برف ملاتے ہوئے رحمان نے پوچھا "کیوں بے افضل، وہ میلی والا معاملہ کیسا رہا۔ کل تو اُسے سینما لے گیا تھا؟"

"ہاں آئی تھی۔" افضل نے اپنی جن اور لیموں کا ایک گھونٹ پی کے، پیروں کو ناچ کی دھن پر حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ یار۔ میں تو کہتا ہوں ان پڑھی لکھی لونڈیاؤں کو ساتھ لے کے پھرنے میں اکڑ ہی اکڑ ہے۔ بیکار وقت اور پیسہ ضائع ہوتا ہے۔"

"کتنے پیسے خرچ کئے؟"

"زیادہ نہیں۔ سوچا کہیں کھانا کھلانے لے جاؤں گا۔ تو ایک ڈیڑھ پونڈ نکل جائے گا، اس لئے لائنز میں آٹھ شلنگ میں ہیمبرگر کافی پر ٹرخایا۔ پھر وہاں سے سینما لے گیا۔ تین تین شلنگ وہ گئے۔ سینما میں میں نے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میری طرف سمٹ آئی۔ مگر میں نے زیادہ گرم کرنا چاہا تو کہنے لگی "اسٹاپ اِٹ۔"

"اور تو ڈر گیا؟"

"نہیں یار۔ میں نے خیال کیا کہ کہیں اٹھ کے چلی نہ جائے۔ سو چا چلو، جہاں سوئٹ لنگ لگے ہیں وہاں کچھ اور سہی۔ اس نے اُسے پرسوں چائے پر بلایا ہے۔"

"کہاں؟ ارے تو اتنا گھاگ شکاری ہے۔ یہ لونڈیا تجھے اتر بنا رہی ہے۔"

"نہیں بے، میبل مجھے پسند ہے۔ کیا کروں؟ دیکھ چائے کے وقت عشق لڑاتا ہوں۔ اگر پھنس گئی تو اچھا ہے۔ ورنہ میری جان۔ تم نہیں الا سہی۔ اور نہیں اکسہی۔"

"بندہ تو ہندو سند کا قائل نہیں۔ بس کھیل فرخ آبادی۔ ہمیر اسمتھ چل۔ وہاں کوئی نہ کوئی گھٹ ہی جائے گی۔ میڈم۔ ٹوٹی ہو دھوبن ہو نہیں کیا۔ کیا شادی کرنا ہے؟ بُری سہی۔ بُرے کام کے لئے بُری نہیں۔"

"ٹھیک ہے رحمان۔ چلو۔ ہمیر اسمتھ چلیں۔"

"یہ گلاس ختم کر لوں۔"

"ہیرس لیبٹ۔"

"ہیرس لیبٹ۔"

"یار رحمان۔ یہ پورا ہفتہ ٹھاٹھ ہی میں گذرا۔ ایک ذرا میبل کا معاملہ ٹھنڈا رہا تو کیا ہرج ہے۔ پیر کو ایڈنا کافی ہاؤس میں وہ اطالوی لڑکی ملی تھی، یاد ہے۔ رات کو اسے نچانے لے گیا۔ خوب نچایا۔ خاصی گرم تھی۔ اس کا نام سینا تھا۔ کالے بال، جسم گدرایا ہوا۔ تو نے دیکھا نہیں اس کو . . . . منگل کو تیرے ساتھ اس کلب گیا تھا: جہاں میبل سے ملاقات ہوئی۔ تو تو ادھر ملڈا کو ساتھ لے کے چلا گیا، میں اپنے گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحبزادی بھاری سوٹ کیس اٹھائے ہوئے انڈر گراؤنڈ کی ٹرین سے باہر اتر رہی ہیں۔ میں نے کہا "میں مدد کر دوں۔" پہلے نہیں کہا، پھر ہاں۔"

"کچھ معاملہ بنا؟"

"ہاں بدھ کے دن ڈیٹ بن گئی۔ ماڈل تھی۔ زور دار۔ بہت گرم۔ اُسے کمرے پر لایا۔ نینل کے لئے جم کیانٹی اور رُوفینو لایا تھا اُسے خوب پلائی۔ صبح کو لینڈ لیڈی خوب لڑی۔"

"صبح تک وہ ماڈل تیرے پاس رہی؟"

"تو پھر کیا تیرا ابا الو ہوں۔"

"جمعرات کو شفیع کے ساتھ لڑکی پکڑنے بیٹرسی پارک گیا۔ وہاں دو تین کالی چھوکریاں ملیں ضرور۔

مگر آئس کریم وغیرہ کھا کے چل دیں۔ ہم نے کہا جاؤ میری جان۔ اور کل کی شام میل کو سینما لے گیا۔ بڑی علمی باتیں کیں۔ یار کبھی کبھی کوئی ایسی چھوکری بھی چاہیئے۔ جو کسی مضمون پر کچھ بات چیت تو کرسکے۔ تو بتا۔ تو ہفتہ بھر کیا کرتا رہا؟"

"کچھ نہیں یار العفل ملڈا کے ساتھ جھک مارتا رہا۔"

"رحمان تو ہمیشہ سے ایک گرل فرینڈ کا قائل رہا ہے۔ یاروں کو تو جب تک کہ ہفتے میں دو تین بار ذائقہ نہ بدلے چین نہیں آتا۔"

"ابے چل شیخیاں مت بگھار۔"

"چل اپنی وسکی ختم کر۔ ہیمرا سمتھ پہنچتے پہنچتے نو بج جائیں گے۔"

(۲۴)

میل ہری برساتی پہن کے، سر پہ اسکارف باندھ کے نیچے اتری۔ اس کی ماں باورچی خانے میں رات کے لئے کھانا پکا رہی تھی اور گیس کے اسٹوو اور ابلتے ہوئے گوشت کی آواز کے ساتھ ساتھ، نشست کے کمرے سے ریڈیو پر ہلکے سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ اور میل نے بھی گنگنانا شروع کیا:

"صبح کو شکر، شام کو شکر، تیسرے پہر کو شکر۔"

"تم میرے لئے چھوٹی سی شکر بن جاؤ . . . . ."

مسز اسٹیول نے باورچی خانے سے پکارا۔

"میل۔"

"جی۔ اماں۔"

"تم باہر جارہی ہو؟"

"جی۔ اماں۔"

"کہاں؟"

میل نے اپنے سینے میں پہلی بار بغاوت امنڈتی سی محسوس کی۔ اور چاہا کہ وہ ڈانٹ کے ہسٹریائی لہجہ میں جواب دے "تمہیں اس سے کیا مطلب؟"

لیکن اچھی لڑکی کی طرح اس نے جواب دیا "میں اپنے ایک دوست کے ساتھ چائے پینے جارہی ہوں۔"

اپنے دانت بھینچ کے اُس نے سوچا "کرائسٹ۔ اب اماں نے اور جرح کی تو مجھے سچ مچ غصہ آجائے گا"

"کس دوست کے ساتھ ؟"

"وہ کہت چاہتی تھی:" اماں۔ اماں۔ اب میں بچہ نہیں رہی۔ میں سولہ سال کی ہوں۔ تم اس طرح میری جان کھاتی رہو گی تو مجھے سچ مچ غصہ آجائے گا"

لیکن اچھی لڑکی کی طرح اُس نے جواب دیا "افضل کے ساتھ"

ایک منٹ کے لئے سناٹا چھا گیا۔ دفعتاً اُس کی ماں باورچی خانے سے نکل آئی۔

"میبل۔ مجھے یہ دوستی پسند نہیں"

اور اب اچھی لڑکی کے دل میں بغاوت کا شرارہ بھڑک اٹھا۔

"لیکن اماں مجھے یہ دوستی پسند ہے"

"جو تیرا جی چاہے کر" اور مسز اشیوں باورچی خانے واپس چلی گئی۔

میبل ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر سے اچھی لڑکی نے سولہ سال کی باغی جوانی پر قابو پا لیا۔ باورچی خانے میں ماں کے پاس پہنچ کے اُس نے کہا "سنو اماں۔ تم افضل سے ملی ہو؟ نہیں ملیں۔ تم نے اُسے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا۔ تم صرف یہ جانتی ہو کہ وہ پاکستانی ہے۔ سفید نہیں ہے۔ اور یہ تمہارے لئے کافی ہے نفرت کے لئے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں اماں؟"

مسز اشیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن سولہ سال کی باغی لڑکی نے اچھی لڑکی حالات پر قابو پاتی جا رہی تھی۔ اور میبل نے ہونٹ بھینچ کے کہا "جس زمانے میں تم زندہ تھیں وہ زمانہ ختم ہو گیا جب کہ برطانوی سلطنت پر کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ اور ہم بچارے سفید لوگ۔ ساری دنیا کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے رہتے۔ اب سب لوگ برابر سمجھے جاتے ہیں۔ ہم دوسرے درجے کی طاقت ہیں۔ مجھے کسی سے تعصب نہیں....."

مسز اشیوں نے ڈانٹ کر کہا "میبل۔ مجھے لکچر دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو کہہ چکی جو تیرا جی چاہے کر۔ میں دخل نہ دوں گی"

(۲۵)

سلامت اللہ سے ہوٹل کے مالک نے اس روز صبح کو یہ کہا تھا کہ "تم ہسپتال کیوں نہیں چلے جاتے۔

یہ کھانسی ٹھیک نہیں ممکن ہے دق ہو۔ اور دق بہت متعدی ہے۔ تم پلیٹیں صاف کرتے ہو۔ میرے گاہکوں کو ممکن ہے اس کا پتہ چل جائے۔ ہر شخص بیماری اور موت سے ڈرتا ہے۔ میرا کاروبار مندا پڑ جائے گا۔"

اُسنے سلامت اللہ کو نوٹس نہیں دی تھی۔ صرف صلاح دی تھی۔ چشم زدن میں سلامت اللہ کے سامنے مستقبل کی دو صورتیں پھر گئیں۔ ایک تو یہ کہ اسپتال جائے۔ وہاں سے شاید اچھا ہو کے آئے اور پھر مہینوں کسی نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرے . . . . .

چند مہینے پہلے بیماری اور بھوک کے زمانے میں جب کہ دو دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے اس دوسری صورت کی خفیف سی ہیبت ناک شکل دیکھی تھی۔ اُسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ بھوک تھی کہ ایک عفریت کی طرح اُسے چپٹے ہوئے اور کوٹ میں لپٹائے بہائے لئے جا رہی تھی۔ پکاڈلی میں وہ ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف چلا گیا۔ یہاں سوان اینڈ ایڈگر کی سنگین دیوار اُسے بڑی مہیب معلوم ہوئی گویا یہ اسکے سر پہ گرنے والی ہے جس سے اس کا بھیجہ پاش پاش ہو جائے گا۔ اور دفعتاً اس نے پہلی مرتبہ ایک مجنونانہ خواہش محسوس کی۔ قبل اسکے یہ سنگین دیوار اس کے سر پہ آ گرے، وہ خود اپنا سر اس دیوار سے کیوں نہ دے مارے۔ جو مصیبت سر پہ ٹوٹنے والی ہے، سر ہی اس مصیبت پر ٹوٹ پڑے . . . . . اور اس نئے احساس سے اُسے اور بھی خوف معلوم ہوا۔ یہ کہ اُس کے بھوکے، بیمار، بدنصیب ذہن میں ایک مجنونانہ رجحان بھی کہیں چھپا ہوا ہے، جو اسے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔

چند روز بعد ایک پولیس انسپکٹر نے رات کے گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر خورشید علی خان کے مکان کی گھنٹی بجائی۔ اپنا تعارف کرایا اور کہا: "آپ ایک پاکستانی کو جانتے تھے جس کا نام سلامت اللہ تھا۔"

ڈاکٹر خورشید علی خان نے کہا۔ "ہاں میں اس کا معالج ہوں۔ کیا ہوا؟"

"آدھا گھنٹہ ہوا بیز واٹر کے اسٹیشن پر اُس نے ٹرین کے آگے گر کے خودکشی کرلی۔"

"مجھے یہ سُنکر بڑا صدمہ ہوا۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔"

"اس کے حالات کے متعلق آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"وہ کراچی میں کلرک تھا۔ یہاں نوکری ڈھونڈنے آیا۔ بہت دن بیکار رہا۔ اور اُسنے بڑی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھائیں۔ زیادہ چلتا ہوا نہ تھا۔ ورنہ کہیں نہ کہیں کچھ کر ہی لیتا۔ آخر اُسے ایک ہوٹل میں پلیٹیں صاف کرنے کی نوکری مل گئی۔"

"یہ مجھے معلوم ہے۔ اور کوئی بات آپ بتا سکتے ہیں؟ اس کی صحت کے متعلق؟"

"اُسے کھانسی بہت آتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اس کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ اُسے برونکائٹیس ہوگیا تھا۔ مجھے تعجب ہے اُسے نمونیا کیوں نہیں ہوا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اسے دق کی شروعات ہے۔ میں نے اسپتال بھیجا تھا۔ مگر پھر مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

"غالباً وہ اسپتال گیا ہی نہیں۔ ڈاکٹر اُسے کسی قسم کا کوئی ذہنی عارضہ تو نہیں تھا؟"

"مجھے علم نہیں۔ لیکن انسان کا مستقبل غیر محفوظ ہو تو ذہنی توازن کھو بیٹھنا عام بات ہے۔"

"اس کی خودکشی کی اور کوئی وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔"

"بیکاری کا ڈر۔ اس کے سوا تو شاید اور کچھ نہیں۔" ٥

(۲۶)

میبل جب پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن پہنچی تو افضل اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ چاروں طرف ملی جلی آوازوں کی وہ گونج تھی جسے غالب زندہ ہوتے تو آوازِ نقشِ پا کہہ ڈالتے۔ اُس کے سُرخ ہونٹ مسکرائے۔ افضل نے پتلون کی جیب سے ہاتھ نکالا اور "ہلو" کہہ کے ساتھ ہو لیا۔

میبل نے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں ہم لوگ؟"

"میرے کمرے کو۔ وہاں چائے پیئیں گے۔"

وہ یکلخت ٹھٹک گئی "میں معافی چاہتی ہوں۔ میں تمہارے کمرے نہیں آسکتی۔"

افضل نے کہا "کیوں؟ کیوں؟ کیا ہوا؟ اس میں کیا ہرج ہے؟"

"کوئی ہرج نہیں۔"

"پھر کیوں نہیں چلتیں؟ مجھ پر اعتبار نہیں؟"

میبل میں کچھ دیر کے لئے اپنی ماں کی سی سخت گیری آگئی۔ اور وہ کہنے لگی "افضل تم مجھے پسند ہو۔ اس لئے میں تمہارے ساتھ اِدھر اُدھر جاتی ہوں۔ مگر میں ابھی۔ صاف صاف کہے دیتی ہوں تاکہ تمہیں کوئی غلط فہمی نہ رہے کہ بندروں کا کھیل مجھے پسند نہیں۔"

افضل کے چہرے پر لمحے بھر کے لئے غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ آخر پٹھان تھا۔ پھر دفعتاً وہ مسکرانے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے سوچا تھا کہ میبل کو وہیں چھوڑ کے چلا جائے۔ پھر سوچا چلو آہستہ آہستہ ہی قدم اٹھانا سہی۔ لڑکی بُری نہیں۔

اور اسنے کہا " جیسے تمہاری مرضی ۔ کہاں چلنا چاہتی ہو؟"
"کہیں ۔ جہاں چائے کی ایک پیالی مل جائے ۔ اور بیٹھ کے چائے پینے کا موقع ملے ۔"
" رائل فیسٹول ہال کے ریستوراں چلیں؟ شہر بھر میں ایک ہی تو ریستوراں ہے جو ٹیمز کے کنارے ہے ۔"
" مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔"
افضل ٹکٹ خرید کے سیٹی بجانے لگا ۔ میبل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں حمائل کر کے پوچھا
" مجھ سے ناراض ہو؟"
" نہیں ۔ بالکل نہیں ۔"
" میں ایک بات بتاؤں؟"
" کیا؟"
" یاد ہے جب پہلے دن ہم بین الاقوامی کلب کے ناچ میں ملے تھے تو تم نے مشورہ دیا تھا کہ میں اسلامی تاریخ کیوں نہ پڑھوں ۔ میں پہلے ہی سے کچھ اسی قسم کا مضمون سوچ رہی تھی ۔ مجھے تم لوگوں سے دلچسپی ہے ۔ میں نے تصفیہ کر لیا ہے کہ میں کالج میں اسلامی تاریخ پڑھوں گی ۔ . . . . "
افضل نے جواب نہ دیا ۔ اتنی مکمل فتح کا اسنے خواب بھی نہ دیکھا تھا ۔ مگر یہ فتح ذرا خطرناک تھی ۔
وہ پھنسنا نہ چاہتا تھا ۔ لیکن اس لڑکی کا چھریرا سا جسم اور اس کے سرخ بال بڑے خوبصورت تھے ۔
وہ دفعتاً رک گیا اور اسنے کہا " میبل میرے کمرے کو چلو ۔"
میبل نے ذرا حیرت سے پوچھا " کیوں؟ کیا ہوا؟ میں کہہ چکی ہوں نہیں آؤں گی ۔"
افضل نے ضد کر کے کہا : " تمہیں آنا پڑے گا اور مجھ پر اعتبار کرنا پڑے گا ۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا ۔" اور اسنے اپنا ہاتھ چھڑا لیا جو میبل کے ہاتھ میں حمائل تھا ۔
میبل نے اپنی گہری نیلی آنکھوں سے اسے ذرا شک کی نظر سے دیکھا ۔ پھر افضل اسے ذرا اچھا ، قبول صورت معلوم ہوا ۔ اسنے سوچا " یہی نا کہ پیار کرنے کی کوشش کرے گا ۔ اس کے لئے تو میں تیار ہی تھی ۔ ٹیمز کے کنارے نہ سہی ۔ وہاں سہی ۔ زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا تو تھپڑ رسید کروں گی ۔ میری اماں تم مطمئن رہو ۔ تمہاری لڑکی کوئی ایسی بات نہ کرے گی جو نامناسب ہو ۔"
لیکن افضل نے اسے پیار کرنے یا ہاتھ لگانے کی کوشش تک نہ کی ۔ چائے بنائی ، پنیر اور بسکٹ اس کے سامنے رکھے ۔ اسلام اور پاکستان اور پشاور کے فضائل کا ذکر کرتا رہا ۔ اس نے قبائلیوں کی زندگی کے

قصے سنائے۔ اور اُس قبائلی سردار کا قصہ بھی سنایا جو ایک انگریز لڑکی کو اٹھا لے گیا تھا۔ مگر کسی نے اُس لڑکی کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ اُسنے کوہاٹ کی بنی ہوئی رائفلوں کا ذکر کیا۔ خوشحال خاں خٹک کی نظمیں ترجمہ کر کے سنائیں۔ اقبال اور حافظ شیرازی کا ذکر کیا۔ پھر عمر خیام اور علم ہیئت اور مسلمان ریاضی دانوں کا ذکر کرکے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بج رہے تھے۔ اور اسنے کہا۔

"کیوں میبل۔ میرے کمرے کو آ کے تم پچھتائیں تو نہیں؟"

"اچھا ہوا کہ میں آ گئی۔" میبل کے چہرے پر پہلی مرتبہ اعتماد کی رونق چھا گئی جس سے اسکی دوشیزہ سادگی کو چار چاند لگ گئے۔

پھر وہ کہنے لگی "اب مجھے جانا چاہئے۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"تمہیں دور جانا ہے؟"

"میں بالہم میں رہتی ہوں۔"

"میں تمہیں گھر پہنچا آؤں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جیسی تمہاری مرضی ہو۔"

"چلیں۔"

اور راستہ میں افضل نے پوچھا "تم نے اپنی اماں سے میرا ذکر کیا تھا۔ یہ کہ تم مجھ سے ملتی ہو؟"

"ظاہر ہے۔"

"انہوں نے کیا کہا؟"

"اس سے تمہیں کیا سروکار۔" اور بات ٹالنے کے لئے اسنے کہا "تمہیں بتاؤں اسلامی تاریخ کافی دلچسپ مضمون ہے۔ مجھے کچھ نہ کچھ عربی فارسی ترکی پڑھنا پڑے گی۔ بالکل نئی دنیا۔ مجھے ابھی سے یونیورسٹی کے کھلنے کا انتظار ہے۔ داخلہ مِل چکا ہے لیکن پہلے دن جب میں بجائے اسکول کے یونیورسٹی جاؤں گی کیسا انوکھا تجربہ ہوگا۔"

گھر کی چوکھٹ پر وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی۔ پھر ایک طرح کے نئے عزم سے اس نے کہا "ایک منٹ کے لئے ہمارے گھر میں نہ آؤ گے۔ اماں کو 'ہلو' کہنے کے لئے؟"

"بڑی خوشی سے" افضل نے کہا۔

اور اُسے ذرا حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کسی انگریز لڑکی نے اُسے اس طرح اپنے گھر نہ بلایا تھا۔ جرمنی میں یہ عام بات تھی۔ لیکن یہاں تو لڑکیاں کالوں یا اجنبیوں سے چاہے باہر مل لیں۔ اپنے گھر

کم بلاتی ہیں۔

میبل نے گھنٹی گھمائی۔ دروازہ کھولا۔ بیٹھک کے کمرے میں مسز ایشول بیٹھی ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی۔ میبل نے کہا۔ "اماں۔ یہ افضل ہے۔"

یہ لڑکی جو چند گھنٹے پہلے اپنی ماں سے لڑکے افضل سے ملنے گئی تھی۔ اب اتنی ہمت سے اُسے اپنے ساتھ لائی تھی مسز ایشول ذرا دست ٹپاسی گئی۔ اخلاق اور تعصب کی کش مکش چہرے پر لمحے بھر کے لئے جھلکی پھر تعصب ہار گیا۔ اور اسنے کہا۔ "کیسے ہو افضل۔ میبل نے مجھ سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ بیٹھو گے نہیں ؟"

"شکریہ۔"

"کیا پیو گے ؟ شراب تو تم لوگ نہیں پیتے ہو۔ لیموں یا سنترے کا عرق ؟"

"مجھے شراب سے کوئی پرہیز نہیں۔ میں ایسا پکا مسلمان نہیں۔"

مسز ایشول ہنسی: "کیا پیو گے ؟ وسکی ؟ یا جن ؟"

"جن۔ پلیز۔"

"آپ یہاں بیٹھیے اور افضل سے باتیں کیجئے اماں۔ میں جن اور لیموں کا عرق لئے آتی ہوں۔"

"تم یہاں کتنے عرصے سے ہو ؟"

"دو سال سے کچھ زیادہ۔"

"تمہیں انگلستان پسند ہے ؟"

"بہت۔ آپ کی قوم بڑی خلیق ہے مگر کسی قدر سرد۔"

مسز ایشول ہنسی: "سردی ہم لوگوں کی آپس کی راہ و رسم میں بھی ہے۔ یہ ہمارا قومی عیب ہے۔"

"آپ کی قوم میں اور ہزاروں خوبیاں ہیں۔"

جب وہ جا چکا تو مسز ایشول نے میبل سے کہا۔ "میں بتاؤں۔ یہ پاکستانی لڑکا مجھے ایسا بُرا نہیں لگا۔"

"اماں میں نے بالکل دروازے پر پہنچ کے سوچا کہ یا اِس پار یا اُس پار۔ ایک مرتبہ تمہیں اس سے ملا تو دوں۔ یا وہ تمہارے تعصب کو توڑے یا تمہارے تعصب کو دیکھ کے وہ مجھ سے ملنا چلنا چھوڑ دے۔ میں نے جُوا کھیلا۔ چلو اچھا ہوا۔"

"اچھا ہوا تو اُسے گھر لے آئی۔ اُسے دیکھ کے مجھے اطمینان ہو گیا۔" پھر میبل کو لپٹا کے اسنے کہا۔ "مجھے یقین ہے میری لڑکی . . . ."

اور میبل نے اُس کے ساتھ لفظ بہ لفظ دُہرا کے کہا" . . . . کوئی ایسی بات نہ کریگی جو نامناسب

ہو۔ اماں تم صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ دیکھ میلی ہمسایوں کی نظروں میں میری عزت تیری نیک چلنی سے وابستہ ہے۔ اگر تو بدنام ہوئی تو تیرے ساتھ میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

"میلی۔ تجھے آج کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ میں سولہ سال کی ہو گئی ہوں۔ اسکول چھوڑ چکی ہوں۔ کچھ دنوں میں یونیورسٹی جانے لگوں گی۔ اور میرے خیال میں میں اپنی زندگی کی مالک ہوں۔ ایک بات کا وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری نیک نامی جو تمہیں اتنی عزیز ہے اُس پر حرف نہ آنے دوں گی۔ بس اب خوش ہو گئیں۔"

"میں جو کہتی ہوں تیری بہتری کے لئے ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

اور پھر وہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے، اس کے بعد ہر ہفتے افضل سے ملتی رہی۔ قریب قریب آٹھ مہینے گذر گئے۔ افضل نے جمعرات کا دن اُس کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ باقی چھ شامیں اور لڑکیوں کے لئے تھیں جو ہر دوسرے تیسرے ہفتے بدلتی رہتیں۔ مگر میلی اُس کی مستقل گرل فرینڈ تھی۔ رحمان اُسے چھیڑتا "بھئی تجھے کیا ہو گیا ہے۔ پُرانا شطرنج باز ہو کے ایسا خطرناک داؤں کھیل رہا ہے۔ یہ لڑکی تجھے آخر میں گانٹھ کے شادی نہ کرے تو میرا نام بدل دینا۔ بڑے بیٹا ہماری ہنسی اڑایا کرتے تھے . . . . ."

"یار۔ میلی کے متعلق مذاق مت کر۔"

"کچھ معاملہ بنا یا نہیں؟ یا ابھی تک مکالمات افلاطون کا سلسلہ جاری ہے۔"

"اوپر ہی اوپر تک۔"

"ارے بے وقوف۔ ارے احمق چھوڑ اسکو نہیں تو پھنس جائے گا۔"

"میں ایسا بے وقوف نہیں۔ ہفتہ کی باقی چھ شامیں کس لئے ہیں۔ اصل عشق بازی کے لئے۔ جمعرات کو میلی کے ساتھ ذہنی تفریح سہی۔ چھ دن کی عشق بازی کے بعد ایک دن کی تفریح کیا بُری ہے۔"

اور پھر ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو لندن جیسے عظیم الشان شہر میں کم پیش آتا ہے۔ میلی نے اُسے ایک اور لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا۔

یہ ایک جرمن لڑکی تھی۔ اُوٹا۔ جو لندن میں یورپ کی اور ہزاروں لڑکیوں کی طرح انگریزی سیکھنے اور کسی گھرانے میں کام کاج کرنے آئی تھی۔ پہلے اُسنے انگریز بولنے فرینڈ تلاش کئے جو نہیں ملے جرمن ملے جن سے انگریزی بولنے کا موقعہ نہیں ملا۔ پھر وہ کسی ایسنا کانی گھر میں ایک اور جرمن سہیلی کے ساتھ دو تین بار گئی۔ کہ وہاں کسی سے ملاقات ہو۔ دو تین یونانی لڑکے ملے جنہوں نے سیدھی بستر کی دعوت دینی چاہی۔ پھر ایک نیگرو لڑکا ملا۔

"ایک کالا آدمی" اور وہ کا دنٹ گارڈن لے گیا۔ رائل فیسٹول ہال لے گیا۔ چھوٹی خرچ کرکے "مائی فیئر لیڈی" دکھالیا۔ اور اُسے انعام میں کچھ بوسے ملے۔ اُسنے شادی کرکے یوگنڈا لے جانا چاہا حیاں وہ موٹم بوٹو کے بیتی مردم خوار قبیلے کے سابق سردار کا سوتیلا بیٹا تھا۔ اُوٹا کو برطانوی پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ مگر اسنے انکار کر دیا۔ پھر اُسے ایک دو ہندوستانی ملے جنہوں نے ایک آدھ مرتبہ تھیئیٹر بھی دکھلادیا ہندوستانی ریستوراں میں کھانا بھی کھلا دیا۔ اور کھینچ تان کے بستر تک لے گئے۔ وہ ذرا ذرا بد کنے لگی تھی کہ افضل سے ملاقات ہوگئی۔ پھر وہی غزل شروع ہوگئی۔ تار بستر ہے، خار بستر ہے۔

ہفتہ کا دن تھا۔ میبل سے صرف جمعرات کو ملاقات ہوتی تھی۔ چونکہ میبل والا معاملہ محض افلاطونی تھا، اس لئے اس کا کمرے پہ آنا نہ آنا برابر تھا۔ اور یہ تو افضل کے سان دگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہفتے کے دن ساڑھے تین بجے اس کے کمرے میں آپہنچے گی۔ ٹیلی فون کئے بغیر، مگر واقعہ یہ تھا کہ میبل اور کچھ ساتھیوں نے اگلے دن یعنی اتوار کو ہرٹ فرڈشائر میں ایمبل کا پروگرام بنایا تھا۔ ہر لڑکی اپنے اپنے بوائے فرینڈ کو ٹہلنے کے لئے ساتھ لئے جارہی تھی اور میبل جو کسی کام سے اس طرف آئی تھی یہ سوچ کے کہ یا چلتے چلتے اُس سے خود ہی کیوں نہ کہدوں، آنازل ہوئی۔

لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کے افضل کے کمرے کے دروازہ تک پہنچی۔ پہلے سوچا کہ کھٹکھٹائے۔ پھر یہ سوچکر کہ خلافِ توقع اسکو دیکھ کر افضل کس قدر خوش ہوگا، اس نے اچانک دروازہ کھولا۔ وہاں مضمون ہی کچھ اور تھا۔ غالب کی غزل دوغزلہ بنی ہوئی تھی۔ بار اور تار اور خار کا قافیہ تھا۔ اور بستر کی ردیف۔

اُس نے جلدی سے "میں معافی چاہتی ہوں" کہا اور اس طرح سیڑھیوں سے اُتری گویا اُس کے قدم کسی میکانکی مشین کے زور سے حرکت کر رہے تھے۔ جب وہ بس پر سوار ہوچکی۔ تو معلوم ہوتا تھا اُسکی ٹانگوں میں دم نہیں رہا۔ وہ باہر دیکھنے لگی۔ اور منظر، سڑک، مکان، دکانیں، سواریاں سب سمجھ سے باہر معلوم ہو رہے تھے۔

جب منظر، مکان، دکانیں، سواریاں ذرا ذرا سمجھ میں آنے لگے تو اسنے دیکھا ٹانگوں میں پھر سے جان پڑ رہی ہے جسم کا کانپنا بند ہوگیا۔ اور اسنے بس میں بیٹھے بیٹھے اطمینان کی سانس لی: "کرائسٹ۔ میری خوش قسمتی تھی کہ میں بال بال بچ گئی۔ اماں تم جو کہتی تھیں ٹھیک تھا۔ میں سترہ سال کی ہوں اور بیوقوف ہوں۔ مجھے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں۔ اور میں نے محض اسکے لئے اسلامی تاریخ پڑھنا شروع کی۔ عربی شروع کی۔ فارسی شروع کی . . . . . کتنے تعجب کی بات ہے . . . . . اور پھر اسنے فیصلہ کیا۔ میں نے جو شروع

کیا ہے۔ اسے جاری رکھوں گی۔ اب مضمون بدلنے کا وقت بھی تو نہیں رہا۔"

افضل نے دروازے کو کھلتے دیکھا تھا۔ اور میلی کو دیکھا تھا۔ ذرا سٹ پٹایا۔ جمعرات کی ذہنی عشق بازی ختم ختم سہی۔ آٹھ مہینے تو گذر چکے تھے۔ اور آخری امتحان قریب تھا۔ کم سے کم جمعرات کو پڑھ ہی لیا کروں گا۔

دیگر دختکے کر کی گریسیت، دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری۔ نیلی نون نے اپنا نام بتایا "افضل" اور کہا "مجھے تم سے عشق ہے ...... تم اُس قدر غصہ میں کیوں ہو؟ .... تم کس طرح تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔"

دیگر دختر کے کر ی گریسیت سپاٹ لہجے میں جواب دیتی رہی ..... "ہم دونوں کا تعلق بالکل ختم ہو چکا ... تمہاری محبت میں اچھی طرح جانتی ہوں ... آج ایک کل دوسری ..... خدا حافظ۔ تمہارا راستہ اور ہے۔ میرا راستہ اور۔"

اور ڈاکٹر جمشید علی خاں سے دیگر دختر کے کر ی گریسیت کہنے لگی "آپ اس طرح جرح کیوں کر رہے ہیں۔ مجھے شکنجے میں کیوں کس رہے ہیں؟"

ڈاکٹر جمشید علی خاں نے جواب دیا "میں آپ کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مس الیشول۔ تاکہ آپ خود اپنے مرض کی تشخیص کر سکیں جو کسی ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔"

(۲۷)

رات کے گیارہ بجے کرسٹل نے ٹیلی وژن بند کیا۔ اپنے اور ڈاکٹر جمشید کے لئے نائٹ کیپ کا ایک ایک گلاس لے آئی۔

"جم۔"

"کیا کرس؟"

"میں سوچ رہی ہوں۔"

"کیا؟"

"تمہیں یاد ہے آٹھ مہینے پہلے جب ہم یونیورسٹی کالج ہاسپٹل کے ری یونین میں گئے تھے۔"

"ہاں۔ کرسٹل۔ اُس کے دوسرے روز بعض بڑے دلچسپ مریض آئے تھے۔"

"کچھ کے جسم بیمار تھے۔ کچھ کی روحیں۔"

"میرے خیال میں سب کی روحیں، کچھ نہ کچھ بیمار ہوتی ہیں۔"

"ٹرس۔ یہ تو ذرا قنوطیت کی بات ہے۔"

"جم۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا ہم تم سچ مچ اصلی ہیں۔"

"معلوم نہیں۔"

"اور ہم نے باہم بیس سال گذار دیئے۔"

"ساڑھے بیس سال۔" (وقفہ)

"جم۔"

"ٹرس۔"

"کسی نے کہا تھا کہ میں اور تم کبھی نہ مل پائیں گے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان یورال اور قفقاز اور باسفورس حائل ہے۔"

"کسی نے ذرا مبالغہ سے کہا تھا۔ یورال چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ پہاڑ نہیں، جن کے دونوں طرف ایک ہی ملک ہے۔ اور قفقاز کے قریب نوح نبی کا سفینہ آ ٹھہرا تھا، جو ہمارا بھی نبی ہے اور تمہارا بھی۔ اور باسفورس کے دونوں جانب ایک ہی شہر آباد ہے۔"

"اور انہوں نے کہا تھا ہمارے تمہارے درمیان رنگ کے اور نسل کے اور مذہب کے سمندر حائل ہیں۔"

"جو ہم اپنی واحد عمر میں اس پار سے اس پار عبور کرتے رہے۔ لیکن ہماری کشتی نے کہا جو کچھ ہے کشتی ہی کشتی ہے، سمندر کہیں نہیں۔"

"تم مرد تھے۔ پانچ پیغمبر تھے، پانچ مذہب تھے۔ تخیل تھے، رنگ تھے، مجھ سے زیادہ قدیم تھے۔"

"تم عورت تھیں۔ ہنر تھیں۔ بار بردار تھیں۔ میرے مقابل اس دنیا اور اس میں کھانے پینے رہنے کی مزدوری سے زیادہ واقف تھیں۔ مجھ سے زیادہ کم عمر تھیں۔ سفید تھیں، حسین تھیں۔"

"تم وہ ہو جو میں نہیں ہوں۔"

"اور تم وہ ہو جسے میں ہمیشہ تلاش کرتا رہا۔"

"تم فلسفہ، مذہب، تخیل؟"

"تم ہنر، ہندسہ اور تمدن ہو۔"

"جم۔"

"کریس"
"کیا ہم محض مہمل بکواس کر رہے ہیں؟"
"مجھے یقین نہیں۔ اب کسی بات کا یقین نہیں رہا۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ اب زندگی پر نہ میرا اختیار ہے نہ تمہارا۔"
"نہیں جم ہم نے ہمیشہ زندگی کو تسخیر کیا ہے۔"
"یہ تمہارا مغربی حوصلہ ہے۔"
"وہ تمہاری مشرقی قنوطیت تھی"
"جم۔"
"کریس۔"
"ایک بات ہے جسے کہتے ہوئے۔۔۔ مجھے شرم آتی ہے۔"
"کیا کریس؟"
"ہم ساری عمر اس کی احتیاط کیوں کرتے رہے کہ کوئی بچہ نہ ہونے پائے۔ ہم کس چیز سے ڈرتے تھے؟"
"اس مشرق اور مغرب، اور زندگی سے اور گھر کی ناکامی کے خوف سے۔"
"مگر ہمارا گھر ایسا ناکام نہیں رہا۔"
"ایسا ناکام تو نہیں رہا۔"
"جم۔ مجھے ایک بچہ چاہئے۔ چھوٹا سا، منا سا، میرا اپنا بچہ۔ میرا جسم ایک بچے کے لئے ترس رہا ہے۔"
"کریس۔"
"جم۔"
"ہم دونوں کو اپنا بچہ چاہئے۔"
"جو ہنر، اور اعتقاد اور تخیل ہو۔"
"جو ہنر، اور اعتماد اور پرواز ہو۔"
"جو قدیم ہو۔"
"جو جدید ہو۔"
پھر دونوں نے کہا: "اسکے لئے ہم استانبول میں باسفورس کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔"

(بی۔ بی۔ سی کی اجازت سے)

دھارا

ابوالفضل صدیقی

(۱)

سنگھ بابو کے باپ ایک متوسط حیثیت کے زمیندار رہ گئے تھے جنہوں نے ایک بڑے رقبہ کا گاؤں جو اُن کی ملکیت تھا وراثت کی تقسیم سے کٹ چھٹ کر اُن کے حصہ میں اُن کے دادا کی بہت بڑی چوڑی آبائی زمینداری میں سے پہنچا تھا جس کے ساتھ ایک قدیم زمیندار گھرانے کی روایات پوری پوری پہنچی تھیں مگر سنگھ بابو کے باپ نے اپنے اس چھوٹے سے اقتصادی ڈھانچے میں ایسے سلیقہ سے رنگ آمیزی کر کے رکھ رکھاؤ کا نقشہ بنایا تھا کہ اپنی اس گاؤں جوگی حیثیت سے ہم حیثیتوں کی نظروں میں نہ سمانے پاتے تھے اگرچہ نام بڑا اور درشن تھوڑے اور بڑا نام جوں جوں دن گذرتے ہیں درشنوں کو تھوڑا ہی کرتا رہتا ہے اور پھر ڈھکو تو پاؤں نکلیں اور پاؤں ڈھکو تو سر کھلے کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب بڑے نام والا آدمی سر سے پاؤں تک بالکل ننگا ہو جایا کرتا ہے اور نام ہی نام رہ جایا کرتا ہے مگر اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ بڑے آدمی کہلاتے تھے اور نہ صرف کہلاتے بلکہ سمجھے بھی جاتے اور شاید تھے بھی بڑے ہی آدمی۔

پھر گونڈے کے جتنے بڑے رقبہ پر سنگھ بابو کے دادا ہی نے اولاد میں روز افزوں اضافہ دیکھ کر خود کاشت سیر قائم کرنا شروع کر دی تھی اور پھر دو تین پشت سے برابر بنجر توڑ کر اور بن کٹوا کر رقبہ میں اضافہ ہی کرتے چلے آ رہے تھے اور اس کے ساتھ بیگار اور اتصال کے ذرائع ان کے اور اُن کے آسامیوں اور کھیت مزدوروں کے درمیان اپنے آپ پیدا ہوتے چلے آ رہے تھے جس کی آخری منزل سنگھ بابو کا سائنٹیفک فارم، وصولی سود اور اضافہ مزدوری تھی اور اب وہ زمانہ کی ترقی کے مطابق گھر کو چلا رہے تھے۔

یوں تو سنگھ بابو چوہان نگر کے ساکن تھے جو پکے گونڈے سے چار پانچ میل کے فاصلہ پختہ سڑک کے کنارے بغیر نوٹیفائڈ ایریا کا ایک قصبہ اور کاغذات سرکاری میں بڑے رقبہ کے ایک گاؤں کی حیثیت میں تھا اور مردم شماری کے لحاظ سے ضلع کے بعض چھوٹے باقاعدہ قصبوں سے بڑا تھا جن میں نوٹیفائڈ ایریا وغیرہ تھا لیکن سنگھ بابو کے باپ دادا اپنے رسوخ کے زور سے آج تک اس کو جنگلی قسم کی بلا سے بچا کر اس کی دیہاتیت کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ چوہان نگر کے اندر خیر اب تو گھر گھر کی ٹھکرائیت تھی ورنہ دولت

سے دیہہ تقسیم اور بٹوارہ ہونے سے پہلے جب یہ چوہانوں کا خاندان مشترک تھا اُس دور میں ان کے جد امجد کی شخصی حکومت سی تھی اور اب بھی اس خاندان کی چند اونچی حویلیوں کے علاوہ چوہان نگر کی بقیہ کل آبادی خدمتی قوموں کی تھی۔ مگر سنگرام بابو کا جی یہاں کبھی نہ لگا وہ بچپن سے اپنے باپ کے ساتھ چمر گوٹھے جایا کرتے اور جتنے دنوں بڑے ٹھاکر جی انتظام خود کاشت اور وصولی لگان کے سلسلہ میں اپنے آبائی ڈیرہ میں ٹھہرا کرتے سنگرام بابو ان کے ساتھ رہتے اور بستی کے چماروں کے بچوں کے ساتھ گھل مل کر کھیلا کرتے اور بارہ چودہ برس کی عمر سے جب وہ اسکول ہی میں تھے انھیں شکار کا شوق ہو گیا تھا اور جب تک وہ اسکول میں رہے تو اسکول کی اور پھر کالج کی چھٹیوں کے زمانے میں سیدھے چمر گوٹھے آ دھمکتے اور پوری چھٹیاں وہیں اودھم مچاتے حتیٰ کہ بڑی تعطیلوں میں بھی سب ملا کر دس پانچ روز ہی چوہان نگر میں دکھائی دیتے اور بڑے ٹھاکر جی نے بچپن سے ہی اُن کا یہ رجحان دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ خاندان کے اور نوجوانوں کی طرح اُن کے بیٹے کے دل میں پڑھ لکھ کر کھانے وار بننے کا شوق نہیں ہے۔ اور یہ اپنے باپ دادا کے قدم پر چلے گا اور اسی کے مطابق ہائی اسکول کا امتحان پاس کرا کر انھوں نے اس کی طبیعت کے مطابق کانپور کے زرعی کالج میں تعلیم کے لئے بھیج دیا اور زمینداری کی سیاست اور خود کاشت کے فن سے تو وہ اپنی اسکول ہی کی زندگی میں آشنا ہو گئے تھے بلکہ سچ پوچھئے تو بچپن ہی سے جب وہ چماروں کے بچوں میں کھیلا کرتے تھے اُن کے جگری دوست چتر پال اور بدری جبڑی میں اُن کی ٹھکرائت کے جھنڈے گاڑ دیتے تھے اور ایک پردہ سا تو اُن کے اور اُن کے بچپن کے دو خاص بے تکلف ساتھیوں دھارا اور چینو پا کے درمیان اُسی زمانے سے حائل ہونا شروع ہو گیا تھا جب وہ مکتب چھوڑ کر اسکول میں داخل ہوئے اور یہ دونوں چرائی (گلہ بانی) کرتے کرتے بچھڑ رہے بن بن کر اُن کی سیر خود کاشت کے کھیتوں میں مزدوری کرنے لگے۔

(۳)

اور اب نیا دھوبی آیا کھیدڑ کلپ چڑھایا! راجکمار بشیشر سنگھ زراعتی کالج سے پانچ سال بعد جو سنگرام بابو کا لقب اختیار کر کے پلٹے اور دو لمبی چوڑی چھیالہ اسکیمیں ساتھ لاتے اور ذرا سائنٹفک طرز سے جو ملا رعن کے دُم دار جراثیم اپنے اندر کلچر کر کے آئے۔ اُن کیڑوں سے ذرا مختلف صورت کے جو انہیں اپنے باپ دادا سے توریث میں پہنچے تھے تو ایک دفعہ پورے علاقہ کی نظریں اُن کی جانب اُٹھ گئیں۔ اُن کے یہاں سیر اور خود کاشت کے نام سے کھیتی تو ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی تھی لیکن فارمنگ اور کلٹی ویشن نہیں بلکہ خود کاشت جس کے ذریعہ پیداوار کم اور حکومت زیادہ ہوتی رہی تھی۔ اور اپنا نیا عمل دخل بٹھاتے ہی پہلے تو باپ دادا کی ریت کے خلاف انھوں نے بقایا لگان پر تین آنہ روپیہ کا سود عائد کیا

جبکہ اُس پرانے راجپوت گھر میں سود کا پیسہ گئو ماس تھا اور ہمیشہ مسلمانوں سے بھی زیادہ حرام سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس میں بنئے پن کی بو آتی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اُس سود کی وصولی میں سنگھ بابو نے بڑی آسانی رکھی یعنی ہر لگان دار کاشتکار اپنی رقم لگان کا سود بجائے نقد کے ان کے فارم پر مزدوری کر کے فصل کے فصل کام کرنے کی صورت میں ادا کرنے پر مجبور تھا اور اس طرح مقروض کا قرض کبھی کم ہوتا نہ تھا اور صرف ہاتھ کی محنت سے قرضہ بیباق ہو جایا کرتا اور سنگھ بابو کا کام بغیر نقد مزدوری ادا کئے چلتا رہتا پھر ایک بڑی رعایت یہ کی کہ شرح مزدوری میں اپنے باپ کے زمانے سے بیس فی صدی اضافہ کر دیا۔

اُنھوں نے آتے ہی لینڈ اکوزیشن ایکٹ کے ذریعہ اپنی آبائی سیر خود کاشت کے رقبہ کے تمام دخیلکار موروثی کاشتکاروں کو بیدخل کر کے اُن کی آراضیات قانونی طور پر اپنے فارم میں شامل کر لیں۔ آبائی سیر اور خود کاشت کے مقبوضے پچاسے، ساٹھے بیسے، پچیسے نام کے بڑے بڑے کھیت اور بیسیوں سینکڑوں بیگھہ دخیلکاروں اور موروثی کاشتکاروں کی زمینیں ہڑپ کر کے پانچ پانچ دس دس ایکڑ کے خوبصورت چوکور قطعوں میں یکسانیت کے ساتھ تقسیم ہو گئیں، سیر خود کاشت دخیلکاری موروثی کے گنج شہیدوں کو کٹیلے تار کے جنگلے میں گھیر کر میکینیکل فارم کا نام دے دیا گیا گاؤں کے کاشت علاقہ کی ہیئت ہی بدل گئی پرانے طرز کے "پشتینی ڈیرہ" کو نیم تسخ کر کے کچی پکی کوٹھی میں تبدیل کر دیا گیا اور چمرگونٹے کی خارجی ہیئت ایسی بدل گئی کہ گاؤں کے باتوں کو دیکھ کر کوئی پہچان بھی نہ سکتا تھا مگر اس کے بعد اس سماجی کایا پلٹ کے ساتھ گاؤں کی سیاست میں سنگھ بابو کو کچھ طوفان کے آثار نظر آتے لیکن خیریت گذر گئی کیونکہ اس اٹھتے ہوئے طوفان کے ہراول ایک کانگریسی لیڈر تھے جو بیدخل شدہ کاشتکاروں کی رہنمائی کر کے سنگھ بابو کے خلاف باقاعدہ ایجیٹیشن کی شکل پیدا کرنا چاہتے تھے مگر سنگھ بابو بھی کچی گولیوں کے کھیلے نہ تھے بروقت خبر لے لی، اُدھر حکام ضلع سے نیتا جی کی دم کھچوائی اِدھر اپنے آپ دانا ڈالا اور نیتا جی حکام ضلع کے داؤ میں کیا آتے مگر اس زریں دام میں پھنس کر انہوں نے اپنے آپ کو کاشتکاروں کی نسبت سنگھ بابو سے قریب تر پایا اور چپکے ہو رہے اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ میدان چھوڑ کر سرک گئے نیتا جی کا تاتب دھارا یہ رسی اُن کے ہاتھ میں دینے کے بعد اس طرح توڑ کر بھاگ جانے پر بل کھا کر رہ گیا اور سنگھ بابو کا فارم بن گیا۔

اور آج نئی چیز بن گیا ورنہ چمرگونٹے میں دھارا بھی کوئی نئی چیز نہ تھا یہیں کا رہنے والا چماری گاؤں کا پلا بڑھا، دو تین پشت کا بسنے والا سنگھ بابو کے ساتھ کا کھیلا اور سچ پوچھو تو یہ دیا کی پیٹ سنگھ بابو

خود ہی کانپور سے ساتھ باندھ لائے تھے ورنہ وہ تو مدتوں کا گاؤں چھوڑ چکا تھا، محنت مزدوری کرنے شہر چلا گیا تھا اور چھٹے چھ ماہے ہولی دیوالی ادھر اُدھر سال میں دس پانچ دن کے لئے "گونتریا" داخل (مہمان کی طرح) گاؤں میں نظر آتا۔ اگرچہ اس کے باپ دادا اسی ڈیوڑھی پر پل مرے اور خود دھارا نے بھی بچپن سے ٹکا روز اور ایک روٹی میں سنگھ بابو کے باپ کی سیر خود کاشت کے کھیتوں میں مزدوری شروع کر دی تھی مگر جب وہ جوان ہو کر بھی دو آنہ یومیہ اور دو روٹی سے زیادہ ترقی نہ کر سکا تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے سمجھانے کے باوجود شہر بھاگ گیا، اور جب سنگھ بابو کانپور میں پڑھتے ہی تھے تو ایک روز بڑے ٹھاٹ سے سائیکل رکشہ میں ایک روئی کے مل کے پاس سے گذرے اور پھاٹک کے قریب گڑ چنے کی دکان پر انہوں نے ایک پریشان حال مزدور کو جس کی پسلی در دی سے ہانپ ہانپ کر پنّی کے اندر سے جلدی جلدی گڑ کھاتے دیکھا۔ بچپن کے بیتے ہوئے نقوش سامنے آگئے ان کا بچپن کا دوست دھارا گڑ کھا کھا کر روئی کا روواں حلق سے صاف کر رہا تھا اور سانس ٹھیک کر رہا تھا۔ انہوں نے رکشہ رکوا لی اور بڑی بے تکلفی سے آواز دی "ارے دھارا! تم یہاں؟" اور دھارا موٹر کے اندر سے اپنا نام اس لہجہ میں سن کر چونک پڑا، پہچان کر قریب گیا، سلام کیا۔ "اب تم یہاں مزدوری کرتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے زمین نہیں تمہارے پاس وہاں گاؤں میں۔ اور ابھی چھٹیوں میں شکار کو گیا تھا تو چتریا نے بتایا کہ تم شہر چلے گئے ہو بلکہ بھاگ گئے ہو۔ ہیں! مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہو" سنگھ بابو نے مربیانہ تیوروں کے ساتھ بچپن کے بے تکلف خلوص کا پہلو لیتے ہوئے کہا اور دھارا اور قریب کو آ گیا اور سنگھ بابو نے منہ کھڑکی سے باہر نکال لیا "ہاں راج بابو، ہیں گاؤں میں زمین بہت تھوڑی ہے۔ گجر (گذر) ناہیں ہوت (نہیں ہوتی) پیٹ لے لئے بھاگنا ہے" دھارا نے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور اس کا یہ انداز دیکھ کر گویا سنگھ بابو کا کلیجہ منہ کو آ گیا انھوں نے اور زیادہ مربیانہ انداز میں کہا "خیر اور بھوگ لو تھوڑے دن، پھر میں ہوں گا اور تم --- چھ چھ چھ، اوہ! اور ایسے تو تم ہانپ ہانپ کر مر جاؤ گے دھارا! اور دیکھو بابا! چھ چھ چھ، خیر! تم ہو گے اور زمین ہی زمین دیکھنا۔ ایشور چاہے۔ کوئی دن کی بات ہے۔"

اور دھارا نے مشکور سی نگاہوں سے اور بھی زیادہ سانس درست کرتے ہوئے کہا "ہاں راج بابو! یہ روئی کا کام بڑا پاجی ہے اس میں ذرا سانس چلنے لگتی ہے۔ اب یہ ہے کہ پیسے اچھے پڑ رہتے ہیں اور کام سے"

"ہوں دھارا دیکھو ہم اپنے آدمیوں کو بھولا نہیں کرتے اور تمہارے باپ دادا تو ہمارے ہی نمک

کھا کر مر گئے اور تم اتنے بڑے ہوئے۔" اور مسکرا کر کہا "دیکھو دھارا میں نے تمہیں اتنے دنوں بعد
چلتے موٹر میں سے پہچان لیا!" اور مِل کی گھنٹی پر دھارا چونکا اور سنگھ بابو نے شوفر کو اشارہ کیا اور
چل دئیے۔ اس کے بعد بھی انہیں کبھی کبھی دھارا نظر پڑتا رہا۔

اور عنفوان شباب کے نئے شوق اور آئندہ نئی زندگی کے دل خوش کن تخیل میں جب وہ اپنی جا
ئیداد کا کام جدید طرز سے اپنے ہاتھ میں لیں گے اور اُن کے سامنے تو بڑی لمبی چوڑی سائنٹیفک
اسکیم تھی۔ اور جب کبھی کانپور کے اندر دھارا مِلا، انہوں نے ہمیشہ اپنی آنے والی زندگی کی روشن
اُمید دل اور پروگراموں میں اُس کو شامل کرنے اور اپنے ساتھ کانپور سے مستقل طور پر چھپرگو لیجا کر
اُسے گویا مختار کل بنانے کا اعادہ کیا۔ بچپن کا حق دوستی نبھانے کا مربیانہ خلوص ظاہر کیا، اور گرم جوشی
کے ساتھ ہر مرتبہ وعدہ کی تجدید کی۔ اور ایک روز تو انھوں نے دھارا کو عجیب رنگ میں دیکھا، تو
ذرا خوش سے ہوئے، اور اور بھی زیادہ خوش ہوئے جب اُس نے انھیں شوفر کی برابر والی سیٹ پر
دور سے پہچان کر ہاتھ دیکر ٹیکسی روک لی۔ سنگھ بابو کے پانچ چھ کالج کے دوست اُن کے ساتھ تھے اور سب
کے سب ٹیکسی پر سیر کو نکلے تھے۔ دھارا مزدوروں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک گولک لئے
چندہ کرتا پھر رہا تھا۔ اُس نے سنگھ بابو کے قریب آکر مجملاً وہ مطالبات بیان کرنا شروع کئے جن کے
سلسلے میں اس مِل کے خلاف جس میں وہ کام کرتا تھا اور اس مِل کے علاوہ اور کئی ملوں کے مقابلہ
پر ایجی ٹیشن کرانا چاہتا تھا اور جس کے اخراجات کے لئے وہ چندہ کرتا پھر رہا تھا۔ سنگھ بابو نے اُسے
مسکرا کر کچھ کہنے سے روک دیا، اپنے ساتھیوں کے درمیان شان ریاست اور فیاضی دکھانے
کا انہیں اِس سے بہتر موقع نہ تھا۔ انھوں نے مخصوص مربیانہ پہلو لیتے ہوئے ایک ذرا جاگیردارانہ استغنا
کے ساتھ کہا۔ "وہ سب سُن لی تمہاری اور اخباروں میں — ہوں، پھر مجھے تو تمہاری شکل ہی کافی
ہے مطالبات اور ایجی ٹیشن ہڑتال سے مجھے کیا غرض دھارا۔ بتاؤ کیا دوں؟" اور پھر داد طلب نظروں
سے ساتھیوں کو مڑ کر دیکھا اور جو کچھ دھارا نے جواب دیا وہ سُنا بھی نہیں اور ساتھیوں سے بولے "ہمارا
اپنا چمار، پشتینی نمکخوار" اور یہ کہہ کر انھوں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر ایک ایک اور پانچ
پانچ روپیہ کے نوٹ بڑھاتے اور دھارا نے مسکرا کر گولک بڑھائی اور سنگھ بابو نے ایک قہقہہ لگایا اور
کہا "اول یہ تو اِس میں گھسیں گے بھی نہیں مجھ سے یہ لو، تم ٹھونستے رہنا اور پھر اپنے ساتھیوں کی
جانب متوجہ ہو کر فخریہ کہا "یہ یہاں چلا آیا ہے۔ چھپرکار میں اُس کے باپ دادا سات پشت میری
ڈیوڑھی پر پل کر مر گئے"۔

اور اُن کے اشارے پر ٹیکسی چل دی اور پھر چند ہی روز بعد انھوں نے دھارا کو عجیب صورت میں دیکھا۔ مزدوروں کے ایک بڑے لمبے جلوس کے آگے آگے ہڑتال کا نعرہ مارتا اور انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ تمام ملوں کے مزدوروں نے مہینہ بھر سے ہڑتال کر دی ہے اور دیکھا کہ جلوس کی قیادت اُن کے دوست اور رعایا دھارا کے ہاتھ میں ہی ہے انھیں ایک گونہ خوشی اور شخصیت سی محسوس ہوئی۔ انھوں نے ٹیکسی آہستہ کرالی اور دھارا کو بلانا چاہا مگر اُس نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور ہاتھ بڑی بڑی قطاروں کے آگے آگے نکلا چلا گیا اور پھر چند ہی روز بعد انھوں نے دھارا کو عجیب سی صورت میں اُسی مل کے قریب تھوڑی سی جماعت کے ساتھ دیکھا۔ سر پھٹا ہوا، خون میں لت پت اکھڑا یا پھٹے ہوتے بہت۔ سے پولیس کے بڑوں کے درمیان کشاں کشاں جا رہی تو اُن کا اُسی وقت چاہا کہ روک کر پوچھیں مگر خلاف احتیاط سمجھ کر نکلے چلے گئے

اور اس کے بعد انھیں بہت دنوں تک دھارا نظر نہ آیا اور پھر انھوں نے اخبارات میں دیکھ سا کہ آخر انچاس روز بعد مزدوروں نے اپنے مطالبات منوا کر ہڑتال چھوڑ دی اور کام پر آگئے اور یہ بھی پڑھا کہ ۱۹۳۸ء کا بلکہ اس ربع صدی کا مزدوروں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اور جب اس کے بعد ایک روز دھارا انھیں نظر پڑا تو انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ مشفقانہ اور پُرخلوص انداز سے بات کی اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اُس میں ایک مخصوص قسم کی شان سی پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ پچھلے حالات دریافت کیے اور پھر اپنے مخصوص جاگیردارانہ وعدہ بخشش و کرم کا اعادہ سا کیا اور یہ بھی کہ یہ اُن کا آخری سال ہے اور ۱۹۴۰ء تک وہ تعلیم سے فارغ ہو کر گھر پہنچ جائیں گے۔

اور اُس کے بعد بھی دھارا انھیں کبھی کبھی نظر پڑتا رہا اور ۱۹۳۹ء کا اختتام قریب آتا رہا اور پھر ۱۹۴۰ء کا شروع اور اپریل ۱۹۴۰ء تک سنگھ بابو امتحانات سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد دھارا فوراً اُن کے پیچھے پیچھے نیا زراعتی سال شروع ہونے سے قبل جیٹھ ہی میں جمرگوسنے پہنچ گیا تاکہ نئی آراضی ٹھیک ٹھیک وقت پر سنگھ بابو اُسے دے سکیں اور اساڑھ کی پہلی بھرن پر وہ اپنا ہل بیل کھڑا کر دے۔ مگر اُس نے تو وہاں اور ہی رنگ پھیلا دیکھا اور سنگھ بابو اُس کے پہنچنے سے تین ماہ پیشتر پہنچ چکے تھے۔ جدید قانون قبضہ آراضی کا جنوری سے نفاذ ہو چکا تھا۔ وزارت کی کرسیاں سنے نوکر چھوڑ کر جیلوں میں چلے گئے تھے اور سنگھ بابو کے ہاتھ میں علاوہ پرانے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی تلوار کے جدید قانون قبضہ آراضی یوپی کی دفعہ ۱۷۱ بیدخلی کاشت کا نیا خنجر دیے گئے تھے جس کو اُن کے بوڑھے مختار عام اور مقدم نے چھ مہینہ میں بڑے زور سے اپنے زراعتی کارج بلٹ آقا کی نئی

اسکیم کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور سنگر بابو نے پہنچتے ہی پرانی لینڈ ایکوزیشن کی تلوار پکڑ لی جس کی دھار نو تعمیر اشتمالیت جدید قانون قبضہ آراضی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے حربے سے کہیں زیادہ تیز تھی اور ان کے پیچھے پیچھے اسی جولائی سے ان کی اسکیم ابتدائی جامہ پہن گئی۔

اور دھاراراج نے گاؤں میں پہنچتے ہی جائزہ لیا کہ سنگر بابو زمین دینے کی بجائے الٹی لے رہے ہیں اور صدیوں کی بنی ہوئی زمینیں اپنی قانونی اور لوہے کی مشین سے پھیر پھیر اپنے گرد لپیٹ رہے ہیں۔ پہلے تو ان کی اپنی بھوک دیکھ کر دھاراراج کی ہمت ان سے ان کا کانپور کا اسکیم وعدہ یاد دلانے کی نہ پڑی۔ مگر کانپور میں رہ کر اور مل میں مزدوری کر کے اس میں ذرا دنیا کی سی آگئی تھی اور لاکھ چھپا ہی اور رہا تھا مگر تھا تو ان کے ساتھ کا کھیلا۔ جب ایک روز ذرا جھجکا تو انہوں نے بڑی شفقت سے اپنے جدید آلات کے گودام کی جانب اشارہ کیا اور بڑی مشفقانہ ہدایت کے ساتھ کہ "بس اک ذرا کی ذرا اصلی کھرپی لے کر فیلڈ مین کے پاس تک چلے جایا کرو اور سکال رکھ دی۔ حاضری بھر جایا کرے گی اور شام کو مزدوری "ہری" ہو جایا کرے گی" اور دھاراراج بابو کی اس چپقلش پر دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گیا۔ اور وہ سمجھ تو گاؤں میں پہنچتے ہی گیا تھا کہ سنگر بابو زمین بانٹنے نہیں آئے ہیں ملکی۔ اخیر سے فیصلہ کیا ہے اور بڑی یہ اور دور دور تک بانٹ کر سارے گاؤں کی پیداوار ہتھیانے۔ اور کچھ دنوں بعد جب فارم کے مزید پھیلاؤ میں عدالت سے اس کو بھی اپنی چار بیگھ موروثی آراضی کی بیدخلی کا نوٹس ملا تو "آؤ پیر اٹھا کر گٹھ کو بھی لے جاؤ" وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گیا۔ اگرچہ کانپور کی کمائی کے مقابلے میں اس آراضی کے چھوٹے سے ٹکڑے کی کوئی خاص قیمت نہ تھی اور اس کی پیداوار سال چھ مہینے پیچھے ہولی دیوالی جب وہ تہوار منانے گاؤں آیا کرتا تو اس کی دس بارہ دن کی پوری مٹھائی سے زیادہ نہ ہوتی تھی مگر جب اس کی نظر گاؤں کے اندر ان بڑے بڑے خاندانوں کی جانب گئی جن کے پاس موروثی کاشت کے اتنے کافی رقبے تھے جو برسوں سے ان کے کفیل تھے اور اب جن کی بیدخلیوں کے بعد ان خاندانوں جملہ افراد کے ہاتھوں میں سنگر بابو کی کھرپی بیلچے کے بینٹ (دستہ) کے سوا کچھ نہ رہا تھا اور صبح و شام ۲ روپیہ اور دوروٹی کی بھیک جھولیوں میں پڑ جاتی تھی تو اس کے خون میں جھاگ اٹھنے لگے اور وہ پیچ و تاب کھاتا زخمی سانپ کی طرح بل سے کھانے لگا ——— اور نوٹس بیدخلی کاشت تو عدالت سے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کے مطابق سنگر بابو کی صرف ایک فارم قائم کر دینے کی درخواست پر گورنمنٹ ایڈیڈ پلان کے مطابق سب کو ایک ہی مضمون کے جیسے مشین سے کٹے ہوتے جاتے کے ایک برابر کے ٹکڑے اسکیم کے پھیلاؤ کے مطابق بھیجے گئے۔ دیگرے چلے آتے تھے جس میں بڑے ٹھاکر جی کی طرح پاس جا کر رونے پیٹنے داد فریاد کرنے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ اور نہ عدالت ہی میں جواب دعویٰ عذرداری کی گنجائش تھی۔ طرفین کی بھٹیوں میں لوہا گرم تھا کہ شہر کے

ایک پرانے نیتاجی لیڈری کا ہتھوڑا نہائی لیکر دوڑ پڑے اور وہ دھارا اور اُس کے جوشیلے چھٹیلے نوجوان
کا خام مواد پکا ہوا طیار دیکھ کر ہی جو آئے تھے مگر سنگھ بابو بھی پرانی سیاست کے پروردہ اور نئی پالیسی کی
کے ساختہ پرداختہ تھے، فارم کے قیام کی اسکیم میں ایک معقول رقم پہلے ہی سے علیحدہ کئے بیٹھے
تھے جس کا ایک حصہ عدالت کی "متفرقات" کی خرید میں خرچ کر چکے تھے بوڑھے نیتاجی کو بھی خوب
جانتے تھے اور جانتے تھے کہ شیر تو بھاگ کر آدم خوری پر اُتر آیا ہے " بھیڑیا پہیر گاری پہ" اور رقم متفرقات
کی پہلی قسط پر نیتاجی کا حلق بند ہوا اور دوسری رقم پر تو وہ اپنی پرانی کے علاوہ اُن کے بیٹے کی پڑھی پڑھائی
اکابیت لگے اور ساتھیوں سے ۔ ۔ ۔ "کے ساتھ ہی الاپنے لگے اور تیسری قسط پر تو
فارم کی تکمیل کر کے مصیبت زدہ گاؤں ہی کو بھول گئے بلکہ کچھ ترک وطن ہی کر گئے۔ اور لیڈری کا کاروبار
اور اپنی میلی ٹوپی لنگوٹی بیٹے کو سونپ کر بقیہ عمر ۔ ۔ ۔ بیٹے پر اس جہنم کے لئے تیر کرنے
کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دھارا نیتاجی کے اس طرح چھوڑ کر بھاگ جانے پر تو بہت گھبرایا اور اس کے
پاؤں بھی اکھڑ گئے کانپور ۔ گیا اور ابھی ۔ دوسری ۔ کی قیادت کا دم بھرنے لگا۔ اس کا جی
اپنے ان ساتھیوں کو سنگھ بابو کے رحم وکرم پر چھوڑ کر چلے جانے کو نہ چاہا جنہوں نے اس کی آواز پہ آواز
اٹھائی تھی، اور نیتاجی کی قیادت میں اس کے کندھے کا سہارا لیکر میدان میں آئے تھے۔

اور اب جو سنگھ بابو اپنی گھٹی میں پڑی زمینداری کی سیاست پر انگریزی کلچر کالج کی تعلیم وتربیت سے
ملمع کر کے جیسے کچھ شراب دو آتشہ بنے واپس پہنچے تو جم گئے ۔ ۔ جلوں میں اور قیامت در قیامت بے نظر
آئے۔ ہر پرانے نظام کو ترمیم و تنسیخ کر کے گاؤں کو درہم برہم سے کرتے ہوئے گویا "ادھم سا جوتتے"
ہوتے، مگر جیسے اپنے داؤں پر آپ ہی مار کھا گئے۔ کانپور ہی سے سب کچھ لاتے اور وہیں سے دھارا
لی بلا بھی خود ہی بچپن کی ۔ ۔ اور طفلانہ سرفروشی میں سرپا ہو لئے۔ پھر بھی اُن کی وضع داری، شرافت
خاندانی دھارا کی تمام سرکشیوں کے باوجود انھیں دھارا کو تباہ و برباد کر کے گاؤں بدر کر دینے سے مانع
تھیں اور سچ پوچھئے اُن کے دل میں تو کسی کھونٹے دھارا کا REGARD جذبہ سے کم نہ تھا، جس
کا موقع موقع پر اُن کی باتوں سے اظہار ہوتا رہا، جس کا اندازہ کر کے اور خاص طور پر اپنی پس غیبت
میں سنگھ بابو کے منہ کی کہی ہوئی بات دوسروں کی زبانی سُن کر محجوب سا ہو جاتا اور کسی کسی وقت اس
کے ردِ عمل میں فطری جذبات اُٹھتے جن پر وہ جھنجھلا سا اُٹھتا جیسے وہ سنگھ بابو کی محبت میں گرفتار ہو کر
دنیا بھر کی حق تلفی کر رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ فارم کے قیام اور اپنی ناکامیابی کے بعد وہ اسی سنگھ بابو کا
سامنا بچاتے رہنا اور اپنے اور بیگانگی کی پرورش کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ سمجھتا کہ ان کے سامنے

نہ بڑے۔ مگر سنگھ بابو نہ معلوم کیوں، شاید بچپن کی محبت سے مجبور ہو کر کبھی پس غیبت میں بھی دھارا کی شکایت کا ایک حرف زبان پہ نہ لاتے اور نہ کردوں میں اُس کا ذکر گاؤں کے اندر تمیز رکھتے اور اس کی شاید بظاہر وجہ یہ تھی کہ سنگھ بابو کھرے "راجپوت بچہ" تھے جن کی تربیت اور خمیر میں اندرونی بغض و کینہ پروری کا پتہ نہ تھا اور محبت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ انہیں اپنے بچپن کے دوست دھارا کی سرکشیوں کا خوب اندازہ تھا مگر "جب وہ ایک مرتبہ کسی کو اچھا کہہ چکے تو پھر بُرا کسی مُنہ سے کہیں" اُن کی خاندانی وضعداری کے منافی تھا اور دھارا کی سرکشیاں اور سنگھ بابو کا مربیانہ جذبہ سرپرستی دونوں میں عجیب مثبت منفی کشمکش تھی اور جیسے سنگھ بابو ایک ہاتھ سے تالی بجاتے پڑے تھے اور دل کا حال خدا جانے زبان پر لانا تو درکنار وہ چڑیا کی جاسوسی میں سب سے کم اثر اُن اطلاعات کا لیتے جو وہ آئے دن دھارا کی سرکشیوں کے متعلق اُن کے کان میں خوبصورتی کے ساتھ ڈالتا رہتا جسے وہ اِس کان سُنتے اور اُس کان اُڑاتے رہتے۔ گویا وہ دھارا کے مُنہ نہ لگنا چاہتے تھے جیسے اُنھیں کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں لطف آتا۔ اور چڑیا اُن کی اِن نفسیات کو بجز اِس کے اور کیا سمجھ پاتا کہ بچپن کی محبت سے مجبور ہیں یا طبعاً اپنے باپ سے زیادہ شریف النفس واقع ہوئے ہیں، ورنہ اُس کے پندار میں تو اُن کے مقابلہ پہ دھارا تو کیا کسی بڑے سے بڑے کی بھی کوئی ہستی نہ تھی اور بڑے ٹھاکر جی کے زمانے میں تو کسی بھی "جتنے ور خاندان والے دخلیکار" کاشتکار کی بھی مجال نہ تھی ذرا سانس بھر سکے۔

(۳)

شکار کا شوق انہیں وراثت میں ملا تھا اور دیہاتی زندگی اور پھر سائنٹیفک فارمنگ اور اب تو اُن کے سال کے آٹھ مہینے چمر گونٹے میں گذرتے۔ فارمنگ اور شکار دونوں شوق معاشی مشغلہ بن کر اُن کے اندر زندگی کے اہم جز کی صورت میں ودیعت سے ہو کر رہ گئے تھے اور سائنٹیفک فارمنگ میں تو ایک باب بہت کچھ شکار ہی سے متعلق ہوتا ہے اور اب اُن کے بچپن کا شکار کا شوق اور نوجوانی کا مشغلہ زراعت دونوں مل کر ایک دوسرے کے حق میں ایک اور ایک گیارہ بن گئے تھے۔ اُن کے دیہاتی اور شہری دوست شکار کے مخصوص سیزن میں پارٹیاں بنا بنا کر اُن کے یہاں آتے اور چمر گونٹے میں ہفتوں دن بھر شکار اور رات بھر تاش، پچیسی، شطرنج لگانا بجانا اور شعر و شاعری کے ہنگامے گرم رہتے۔ محکمۂ مال اور زراعت کے چھوٹے بڑے اہل کاروں کی آئے دن کی مہمان داریاں ہوتیں۔ نئے نئے زراعتی تجربوں کی اسکیمیں بنتی رہتیں نت نئے قانونوں کے توڑ اور بچاؤ پر بحثیں چلتیں اور سنگھ بابو نوجوان تھا، اور نوجوان بھی غم دوراں اور غم جاناں ہر غم سے بے غم۔ فکر معاش سے یقینی استغناء کا احساس، پھر بیدار مغز خود مختار، یہاں تک کہ ٹھاکر بچہ ہو کر صحیح معنی میں مجرد آزادی ہو چکی

تھی مگر ابھی گونے رونے (رخصتی) کی مہورت نہ آئی تھی اور سارن کی ساری توجہ اور فرصت فارمنگ اور شوٹنگ
پر مرکوز تھی بڑے ٹھاکر جی کا سُرگباش ہو چکا تھا اور گھر پر صرف بوڑھی ٹھکرائن حویلی کی منتظم، اور رسنگ بابو
خود پورے پورے فارمر اور سچے اسپورٹس مین، جیسے کھیل کود میں تن بدن کا ہوش نہ رہے گویا اُس کی
بندوق اُس کی محبوبہ بھی اور نئے نئے زرعی تجربات حاصل زندگی شغلے جن میں وہ کار ہائے نمایاں دکھا
کر سر بلند ہوتا اور زندگی کو ہر زاویہ سے مطمئن محسوس کرتا اور اب پہلی اسکیم میں کامیابی ہونے کے بعد
دوسری اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اگرچہ ان چند سالوں میں وہ اپنے بچپن کے دوست
دھارا کے ہاتھوں تھوڑا بہت پریشان رہا تھا۔ اُسنے شرح مزدوری ویسے ہی باپ کے زمانے سے سوائی
کر دی تھی مگر دھارا نے پانی کو بہانہ بنا کر سب گاؤں کے مزدوروں کو بھڑکایا اور بدرجہ مجبوری یا شاید دھارا
کے جانے میں اُنہیں درست دوئی کرنی پڑی تھی اُنھوں نے نئی اسکیم کے پہلے قدم میں گاؤں کے ذرائع آبپاشی
اپنے ہاتھ میں تھام رکھے تھے جو ایک دن کے ساتھ سے رہتے تھے اور کچھ تو نئی ذاتی لگائی ہوئی ٹیوب ویل کی
بلند نالیوں کے ذریعہ کچی کھوتیوں اور پرانے کنوؤں اور تالابوں تک پانی کا راستہ روک کر اور کہیں کہیں سختی
کے ساتھ قانونی ذرائع سے کاشت کاروں کو اپنے ٹیوب ویل سے پانی لینے پر مجبور کر دیا تھا اور شرح آبپاشی
من مانی رکھی تھی جس پر دھارا نے آواز اُٹھائی مگر مِل کے مزدور کی طرح یہاں کھیت کے مزدور اور کسان
کی اتنی مجال تو نہیں تھی کہ ایک دم ہڑتال کر سکے اور پھر دنیا میں باقی رہ جاتے۔ لہٰذا ہر اعتبار سے پانی خریدنے
پر مجبور تھے۔ اِن تمام مطالبات کو دھارا نے چند بار سنگ بابو کے سامنے رکھا اور شروع شروع میں تو اُنھوں
نے آئندہ فصل سے مطالبات مان لینے کا وعدہ کر کے ایک آدھ سال ٹالا لیکن پھر بجائے سختی کے تھوڑی
بہت ترمیم وتنسیخ کے بعد بڑی حد تک منظور کر لیا۔ مگر کم بخت دھارا کو پھر بھی چین نہ پڑا اور اُسنے بیگار اور
سائر کے خلاف آواز اُٹھا دی۔ اور اُن کے نمک حلال معتمد چترپا نے اُنھیں سب کچھ بتا دیا تھا اور گھڑی گھڑی
کا حال سُنا کر دھارا کے پلتے ہوئے فتنہ سے ہمیشہ متنبہ کرتا رہتا تھا اور وہ اُنہیں سب کچھ بتا چکا تھا کہ یہاں
قریب قریب گاؤں بھر کے ہر مزدور اور کاشت کار کو دھارا ورغلاتا ہے اور وہ کوئی نہ کوئی مطالبہ پیش
کر دیتے ہیں۔ چترپا نے اُن کے کان میں یہ بھی ڈال دیا تھا کہ اس سال کاتکی کے میلہ میں جو کسان جمع ہوئے
تھے اُس میں دھارا چمر گونٹے اور آس پاس کے سب سے زیادہ جوان لے کر شریک ہوا تھا اور اُسنے سب زمینداروں
کے خلاف زہر اُگلا تھا۔ مگر چترپا کیا کرے کہ رسنگ بابو تو کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے اور دھارا کا فتنہ گاؤں
کے اندر پنپتا رہا اور وہ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر سرکشیاں دکھاتا رہا، ورنہ چترپا جانتا تھا کہ اتنی سرکشی تو بڑی چیز ہے
اگر یہ گاؤں چھوڑ آس پاس علاقہ بھر میں کوئی بڑا جودھا جوان سنگ بابو کے باپ کے زمانہ میں ذرا سینہ تان کر بھی

چلتا تو مٹی میں ملا دیا جاتا۔ اور چیتریا کو کبھی کبھی سنگھ بابو کی حد سے بڑھی ہوئی ڈھیل گراں گذرتی اور خود اُن کے حق میں زہر ثابت ہونے کا اندیشہ ہوتا مگر اُس کے ہاتھ میں بجز خفیہ طریقہ پر اطلاعات پہنچا دینے کے اور تھا ہی کیا۔ ادھر سنگھ بابو کا کام بھی نرم گرم نکلا چلا جا رہا تھا خواہ مخواہ بیچ کے منہ کیوں لگتے!

اور پہلی اسکیم کامیاب ہونے کے بعد دوسری کی داغ بیل کا وقت آ گیا تھا جس کے سرکاری کاغذات مرتب ہو چکے تھے اور عملی جامہ پہنانے کی ابتدائی تیاریاں ہو رہی تھیں جس کے سلسلہ میں محکمۂ جنگلات کا ایک عہدہ دار آج کل چمر گونٹے آیا تھا اور یہ مسٹر پربت سنگھ محکمۂ جنگلات کے اعلیٰ عہدہ دار تھے جو سنگھ بابو کی اسکیم کے سلسلہ میں کتھے کا جنگل لگانے کے لئے چمر گونٹے کے ایک بڑے کاشتہ رقبہ پر ساتھ دیکھنے آئے تھے اور ایک مرتبہ پھر لینڈ ایکوزیشن کی تلوار پرتی یا ڈھو دھر کر اپنے پلان کے مطابق سنگھ بابو کو میدان میں اُترنا تھا۔ کتھا فیکٹری کیلئے جنگل لگانے اور لکڑی وغیرہ خام مال فراہم کرنے کے منصوبے جو انہیں اُن کے اندر کالج سے اپنے محبوب کلاس فیلو راجنکور چودھری عشرت نواز خاں سے منتقل ہوتے تھے جس کے سلسلہ میں وہ اپنے ضلع کے اندر ایک یورپین فرم کی لگائی ہوئی کتھا فیکٹری سے ایک معقول رقم ایڈوانس لے چکے تھے اور گورنمنٹ سے مزید امداد کے خواہاں تھے اور چونکہ مسٹر پربت سنگھ ہماتی ہیں اور وہ کے اندر چودھری کی اسکیم بڑی کامیاب رہی تھی اور اتفاق سے مسٹر پربت سنگھ بھی شکار کے شوقین نکلے اور چودھری بھی شوقین تھا اور پھر مسٹر پربت سنگھ اور چودھری دونوں کے علیحدہ دوستانہ تعلقات تھے ہی، لہٰذا سنگھ بابو نے پہلے ہی سے اسکیم بنا لی تھی اور سب کچھ طے کر لیا تھا لہٰذا پربت سنگھ کے قیام کے زمانہ میں تعین وقت کر کے چودھری کو بڑے شوق سے ساتھ مدعو کیا۔ اور اس دعوت کے سلسلہ میں چودھری ادھر سے روہیل کھنڈ آیا ہوا تھا۔ اور ان دونوں موقر مہمانوں کی آمد کی خوشی میں سنگھ بابو نے اپنی مخصوص شکاری چکڑی شہر اور دیہات سے مدعو کر کے جمع کر لی تھی اور چودھری تو سنگھ بابو کے یہاں آج پہلی مرتبہ آیا تھا۔ چودھری اس کا پیارا کلاس فیلو، روم فیلو اور کالج کا مخصوص ہم مشرب ایک جان دو قالب دوست جس کو یاد کر کے محبت کا دریا اس کے سینہ میں ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ یوں تو ان چار پانچ سالوں میں پیچھے چھ ماہ سے لکھنؤ کی نمائش اور میرٹھ کی نوچندیوں میں دونوں کی ملاقات ہوتی رہی تھی مگر اُس کے گھر چودھری آج ہی پہلی مرتبہ آیا تھا اور پھر مسٹر پربت سنگھ جنگلات کا بڑا افسر مہمان تھا۔ دونوں سنگھ بابو کے ٹھاٹ سامان دیکھ کر بڑے مرعوب ہوئے اور سنگھ بابو اور اس کی مہینہ دو مہینے پیچھے جمع ہونے والی پوری چکڑی، سب کے سب ان دونوں دور کے آئے ہوئے موقر مہمانوں کی آمد کی خوشی میں میزبان سے بن کر اپنے ان دونوں مہمانوں کی خاطر تواضع میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھے جو چمر گونٹے کو اپنی قابلیت اور تجربہ کے زور سے سونے کی کان بنانے آئے تھے۔

مسٹر پربت سنگھ یوں تو محکمہ جنگلات کے اونچے عہدہ دار کی حیثیت سے سنگھ بابو کی کھیتی کے جنگل کی اسکیم کے سلسلے میں اپنا سرکاری دورہ کرنے یہاں آئے تھے، مگر اِس چوکڑی میں بالکل یہاں تھے۔ شکار کا شکار کھیل رہے تھے اور ڈیوٹی کی ڈیوٹی کر رہے تھے اور ڈیوٹی تو برائے نام تھی۔ وہ تو خود بھی اسی تحصیل کے جنگلی ٹوں میں سے نکلے ضلع الموڑہ کے ساکن تھے اور پشت پر عظیم خاندانی روایات کا پورا ہمالیہ کھڑا تھا۔ ایک قدیم پہاڑی راجپوت خاندان کے چشم و چراغ، جو میدان میں بسنے والے راجپوتوں کو اپنے برابر خیال نہ کرتا تھا اور ہمالیہ کی تلی سے راس کماری کی نوک تک کل نجابت اپنے دس صدی پیشتر سمیٹ کر لمبی ناک کے ساتھ کمایوں کی محفوظ پہاڑیوں میں جا بیٹھا تھا اور آج تک راجپوتی نجابت صرف اُسی کی خاندانی میراث تھی کیونکہ پٹھانوں کی آمد پر سارے ہندوستان نے اطاعت قبول کر لی تھی اور صرف انہیں کے جد امجد اپنی جاگیروں پر لات مار کر اور غلامی پر جلاوطنی کو ترجیح دے کر پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔ جہاں پٹھان فاتحین کی فوجیں نہ پہنچ سکتی تھیں اور مسٹر پربت سنگھ اپنی ان روایات پہ بڑا نازاں تھا کہ پٹھانوں کے بعد اور سب فاتحین بڑی بڑی جاگیروں کے عطیہ کے پیام اور منصب کے لالچ اُن تک پہنچاتے رہتے، مگر اُنھوں نے اطاعت قبول نہ کی اور پہاڑی جنگلوں میں پڑے رہے اور انگریزوں کے زمانہ تک کسی فاتح کا سایہ بھی ان تک نہ پہنچ سکا۔

اور راجکنور چودھری عشرت نواز خاں سرجو اور گنگا کی پوتر لہروں کے دامن کی ہواؤں کے پلے اودھ کے ایک مشہور ضلع کے مسلمان راجپوت خاندان کے فرزند تھے اور صحیح معنوں میں "سپوت"! آپ کے باپ اور دادا صرف دو ہی بزرگوں نے اُس صدی کے اخیر سے اس صدی کے بیچ تک کروڑوں روپیہ کی مالیتی زمینداری کو رنڈی بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، قمار بازی ...... وغیرہ وغیرہ بازیوں میں چڑھا کر چودھری کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا چھوڑا تھا۔ مگر چودھری نے اعلیٰ زراعتی تعلیم حاصل کی اور اس مثل کو غلط ثابت کر دیا کہ "بگڑے دلیا کے گھوڑے گور تک نہیں سنبھلتے" کالج میں اُن کا اختیاری مضمون (BOTANY) تھا اور باغبانی میں ماہر خاص ہو کر آئے اور کالج سے اپنی بچی بچائی زمینداری کے کسانوں کے حق میں کلنٹے بوتے ہوئے آئے" اور آم امرود کے باغ نصب کرنے کی بجائے کھمبر کا جنگل لگایا اور قریب کی کھنڈ کی فیکٹری سے سپلائی کا معاہدہ کیا جس میں پانچ چھ سال کے اندر ہی انہوں نے اتنی حیثیت بنا لی کہ مرے باپ دادا کا نام چلا سکیں اور سائن دونے علاوہ بقیہ اور کوئی نبانہ تھا گویا بقیہ سب گھر والے تھے۔ سنگھ بابو کے اپنے ضلع اور قرب و جوار کے اضلاع کے ہم چشم پشینی دوست صاحبزادے لال اور راجکنور قسم کے روہیل کھنڈی رئیس زادے جن سے سنگھ بابو اور جو سنگھ بابو سے سال میں چار چھ مرتبہ شادی بیاہ، شکار، نمائش، میلوں ٹھیلوں میں ملتے رہتے تھے، اور عاریت خرید و فروخت مویشی، مشینری اور اجناس میں نامہ و پیام چلتے رہتے تھے اور ان سلسلوں میں

الٹ پلٹ اور مشورے ہوتے رہتے تھے۔ سائٹ وغیرہ کے ضابطہ کے کام پر سنگھ بابو اور مسٹر پربت سنگھ نے نقشے پر نشان لگا کر اور دورے آراضی کے چکوروں پر نگاہ ڈال کر کاغذات مرتب کر دیتے تھے اور پیمائش اور کھتونیاں وغیرہ گاؤں کا کام سب مراحل سنگھ بابو نے پہلے ہی سے مکمل کرا دیتے تھے، جس کے مطابق مسٹر پربت سنگھ نے رپورٹ مرتب کر دی اور اب دس بارہ روز سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ بڑی مکمل چوکڑی جمع تھی، راجپوتی تواضع دیہاتی مہمان نوازی کا سنگھ بابو بڑے جوش کے ساتھ بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے رزم و بزم پورے زور پر تھی۔ شکار اور شراب، ضیافتیں، دعا کے نعرے، ہوتی ودڑ دھوپ، جشن جمشید ہی کا رنگ تھا! اور ایک صبح جب سنگھ بابو بستر سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چودھری نے اسے جھنجھوڑ دیا اور اس کے اوپر سے لحاف اور فردوں کی تہیں کھسوٹنا شروع کر دیں۔ یا وحشت تیرا ہی آسرا ہے! خیر تو ہے صبح ہی صبح! سنگھ بابو نے چودھری کا انداز پہچان کر آنکھیں ملتے ہوئے منہ کھول، اور چودھری سامنے کھڑا کھل کھلا رہا تھا۔

"کیوں بے نامردے، اوں، اور یہ ہم نے تو آج دیکھا! ایں! سویرے ہی سویرے تو بھول سے گوبر تھپوایا کرتا ہے، ؟" چودھری نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور سنگھ بابو نے جمائی لیکر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا "ہوں اوں، اماں بڑے میں، وہ ہماری چڑیا کی لونڈیا سیوتی دیکھلی ہوگی تم نے" اور پھر ایک انگڑائی لیکر کھلنڈرے سے انداز میں سلسلۂ کلام جاری رکھا "ہاں وہ سویرے ہی آجاتی ہے کام پہ گوبر کوڑا صفائی کرنے کرانے"

"وہ کیا نام ہے سیوتی! —— اوہو سیوتی! بھئی تمہاری سیوتی تو سیوتی ہی ہے" چودھری نے کہا اور سنگھ بابو نے ایک قہقہہ سا مارا اور بات آئی گئی کرتے ہوئے کہا "ہاں وہ بے چاری چڑیا کی لونڈیا سیوتیا" آبے گدھے منہ تو دیکھو احمق تمام خدائی کے! دانت کھول رہے ہیں، اپنی حماقت پر آپ خندہ فرما رہے ہیں، وہ بیچاری چڑیا کی لونڈیا! کہ کا فرتنالہ؟ اور تم ٹھاکر بچے اب تک زندہ ہو بے غیرت! اور وہ گوبر کوڑا کرتی ہے! کیسے بھولے انداز میں فرما رہے ہیں ٹھاکر جی جیسے منہ پر آنکھیں نہیں ہیں اندھا تمام خدائی کا"

اور سنگھ بابو نے چودھری کی بات کو بالکل اس طرح جس طرح وہ ہمیشہ سے اس کی مذاقیہ باتوں اور ہرزہ گوئیوں کو لیا کرتے تھے ہنستے ہوئے کہا "کیوں کیسی ہے؟"

اور پھر اس طرح جیسے کسی بچے کی طفلانہ پسند پر مسکراتے ہیں اس کی جانب دیکھ کر مسکراتا رہا اور چودھری نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "کیسی ہے! ؟ ہوں نالائق مجھ سے پوچھ رہا ہے! ویسے تو

جاکی بنتے ہو، معلوم ہوتا ہے نرے باتونی ہو یار! دنیا بھر کی لفاظی میں میدان جیتتے ہو۔۔۔
تمہاری ٹھکرائن!"
ں تو پھر کیسی ہے، سچ بتاؤ تمہیں پسند آئی ہماری چڑیا؟ مجھ دیہاتی گوبر کا اسلوب کھرا کھرا
ں ہیں، تم کر گھوڑے پر لیجاتی ہے، اُس کے جوہر بھی معلوم ہیں کچھ؟
ے یار وہ تو جوہری جوہر ہے!" چودھری نے کہا اور مخصوص انداز میں سنجیدگی کے ساتھ
لیے ہوتے سنگھ بابو نے اُس کے منہ سے بات لیکر کہا" اور ایک چڑیا ہی کیا، ایں جانب کے
چیز نظر پڑے گی ایسی ہی نظر پڑے گی۔ اول اور آپ نے وہاں ادھری اصطبل میں میری جیسی
ہیں دیکھی کیسی پری پیکر ہے اور پھر جس وقت دوگاما فہ، مٹی ہے تو پیٹھ پر پھر اکھوڑا رکھ دو
زبانی چابک جاتے!! اور ہاں تمہیں میری بھوری بھینس اور گوری گائے نظر نہیں پڑی؟ ایک
دو نہیں تین دھڑی دودھ لیتی ہیں۔ ایک چڑیا ہی کیا یار ان کے یہاں جو چیز دیکھو گے نمبر ایک
اور تم نے وہاں باڑے میں میری زنانہ جیٹ نہیں دیکھی ٹریکٹر کی لڑائی جتنا وزن لے جاتی ہے اکیلی
، پھرتی ہے اور تانگے میں جوت دو دوست تو جیپ کا مزہ آ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ کہاں تک
ؤں!! اور کیا کیا! اور ہاں میرے کتے روہیل کھنڈ چھوڑ نہاتے اودھ تک دکھا دو ایسے کتّے
کے پرخچے اُڑا دیں، سانبھر کو اُٹھا کر ٹھ دیں ہوں اور آں وہ ——"
اور چودھری نے بات کاٹتے ہوئے کہا "ابے چپ بھی رہ یار! ناہل تمام خدائی کا۔ ہم سمجھ گئے
لڑنا آتی ہیں اور کچھ نہیں، ہوں ویسے تو بڑے بنتے ہو تینوں ترلوک دکھائی پڑ جاتے ہیں ایک ایک
چھوڑ نے بیٹھے ہو اور گھوڑیں ایسی موندلی ہیں کہ پاؤں تلے کی دکھائی نہیں پڑتی!!!۔
"کیسی دکھائی نہیں پڑتی؟" سنگھ بابو نے اپنے اسی الھڑپن کے انداز میں کہا
کیسی بتاؤں! ایسی کہ ٹھاکر صاحب وہ جو ہیں تمہاری بڑی نکیلی ٹھکرائن رانی جنھیں تمہارے پتا جی
دل پر رکھ کر تمہارے سر منڈھ گئے ہیں اور جن کے گونے رونے کی تم اور تمہاری ماتا جی دونوں
سے گھڑیاں گن رہے ہو، سو دوست اُن کی چوکھٹ کتنی ہی اونچی ہو اور ناک کیسی ہی لمبی ہو مگر جو
رپا کی پاؤں کی ایڑی کے برابر بھی نکلیں ——" اور سنگھ بابو نے قہقہہ لگایا اور کھلنڈرے انداز میں
تو پھر میں کیا کروں"
"ابے کرتا کیا! خود نہیں تو سب کو بتاتے جان جاتے گا۔۔۔۔۔ اور میں تو یہ کرتا کہ اُن ٹھکرائن
اس گوبر پہ لگا تا اور اس چڑیا کو رانی بنا کر حویلی میں بھیجتا" چودھری نے تمسخر کے ساتھ کھسیانہ انداز

بناکر کہا اور سنگھ بابو نے قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی بستروں میں اِدھر اُدھر سب دوست ہنس پڑے اور چودھری اُسی انداز سے کہتا رہا" اماں ہنستے ہو، رونے کا مقام ہے واللہ اُسنے تو ہم سب راجپوتوں کی کلادی، ابھی بنئے بقال مات کردیتے، کہتے ٹھاکر کے گھر میں پیدا ہوتے اور چمریا پکار کر اپنی نامردی چھپاتے ہو! ارے بھی یہ نہیں جانتا کہ عورت مرد کی غذا ہے۔ پھر گھوڑے گھاس کی یاری کس نے فرمائی اور دونوں طرف بے دیوانی جوانی! توبہ توبہ۔ توبہ حرام!—— صاحبو ذرا اُٹھ کر دیکھو تو کیسی آگ سی بھڑکی ہوتی ہے اور اِس نامردے پر آنچ نہیں"

اور سنگھ بابو نے ذرا جھپک کر سنبھلتے ہوتے کہا" اور چودھری یہ تو بتاؤ ہماری چمریا تمہاری چودھراتن کے مقابلہ پر کیسی ہے؟"

"یہ کیا پوچھتا ہے ایں! اور ہم تو آج بدلنے کو تیار ہیں، کہیئے تو کل بھیجدیں تیرے گوبر کوڑے کی صفائی پر ایک چھوڑ ستر چودھراتن، کچھ ہم تیری طرح کوئی وہ اندھے دھندھے تو نہیں۔ ہیرے کنکر میں فرق نہ کریں" چودھری نے تمسخرانہ سنجیدگی سے کہا اور سنگھ بابو نے گردن اُٹھا کر اس کا چہرہ بغور دیکھا کہ صبح ہی صبح اُٹھ کر بھنگ لگا لیا کیا؟ اور پھر ذرا سنجیدگی سے ختم کرتی ہوتی سی بات کہی" چھوڑیار چودھری، بس رام رام کر ہمارے یہاں عایا کو بہن بیٹی سمجھتے چلے آتے ہیں"

"ارے رام رام نہیں تو پھر اور کیا کیا! ابھی اُدھر چڑھ گئے تو دیکھ کر بے اختیار مُنہ سے سبحان اللہ! نکلا ہی ہمارے۔ آں اور پھر تیرے اوپر لعنت اللہ"!

اور سنگھ بابو نے پھر بات کا رُخ بدلنا چاہا اور زیادہ سنجیدگی سے کہا" نہیں بھیا چودھری ہمارے پرکھوں سے گاؤں کی بہو بیٹی ماں بہن برابر رہی ہے" اور پھر اپنی اس اخلاقی روایت کی داد مسٹر پرپت سنگھ کی جانب دیکھ کر چاہی جو اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور ایک سگریٹ سلگاتے رنگ میں لپٹے مسکرا مسکرا کر اِن دونوں بے تکلف دوستوں کی چھوٹ دیکھ رہے تھے اُنہوں نے کہا" دیکھیے سنگھ بابو ہم اور آپ اِس وقت مادیت اور اصلیت کے دور میں ہیں، اور خُدا کے فضل سے اِس وقت ہم میں یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو تعلیم یافتہ نہ ہو یاد رکھئے کہ بہن بہن ہی ہوسکتی ہے اور بیٹی بیٹی ہی۔ اور کوئی چمریا دومڑیا تو درکنار ہر ٹھکراتن راجپوتنی بھی ہماری بہن بیٹی نہیں ہوسکتی اور بھی آجکل تو ہر چیز کا سائیکالوجیکل اور سائنٹیفک تجزیہ ہوچکا، اور وہ تو سگی ماں بہن بیٹی وغیرہ جیسے رشتوں میں انٹرکورس بیالوجیکل ریسرچ کے مطابق نسل انسانی کیلئے مضر اور قاطع ہے ورنہ آپ کی اِن اخلاقی قدروں پر بھی کبھی کی ضرب پڑ چکی ہوتی ۔۔۔۔۔۔ اور آج آپ تعلیم یافتہ ہو کر چماری کو بہن بنا رہے ہیں"

اور اُن کے مُنہ سے بات لیکر چودھری پھر بول پڑا۔ "جی ہاں ٹھاکر صاحب بارہ برس دلّی میں رہے بھاڑ جھونکا! پانچ برس کانپور اور پھر پانچ برس مکینیکل فارمنگ کے بعد بھلا نوک زبان تک رہنے والی مخلوق تدریں! دنیا بھر کی ہر عورت ماں بہن نانی نواسی وغیرہ' اور گاؤں کی چماری اب کیا کہوں خود پھر ایسی کافر! آپ کی شاید ہمشیرہ عزیزہ!؟ تو پھر جورو بھی کوئی غیر بنے گی!؟ ایں؟ اور پھر بابا اللہ نے آنکھیں دی ہیں ذرا کھول کر یہ تو دیکھو کہ چماری کے روپ میں ترکن کہ فرنگن..... اور یہ ماں بہن بنانے کے لائق ہے یا کچھ اور...... اور ماں بہن بنانے کو پورا گاؤں پڑا ہے سینکڑوں کالی کھتری ٹیڑھی سیدھی موجود ہیں چاہیں ماں بنا دو چاہیں نانی کہو مگر بندۂ خدا اس کافر ادا غارت گرِ ایمان و آگہی کو تو بہن کہہ کر اپنی بدذوقی اور مجبوری کا ثبوت مت دو"

"نہیں بھئی یا چودھری۔ نہ یہ آج تک ہمارے یہاں ہوا' اور رہوں' اس لئے وہ یہ بات ایسے ہو نہیں..... نہیں ہو سکتی"

"جی مانا' آج کیا بات کیسے نہیں ہو سکتی؟ کیا مطلب؟ زمانے یہاں جو آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے یہی سب ہوتا یوں چلا آ رہا ہے۔ برگتے کا جنگل اور فیکٹری کی اسکیم میکینیکل فارمنگ اور کیا کیا! اور یہ تو تمہاری UN-NATURAL APPROACH ہے اور انھوں نے مسٹر پریت سنگھ کی جانب دیکھا اور مسٹر پریت سنگھ نے کہا۔ لارڈ بائرن کہتا ہے:

"BUT WHO CAN VIEW THE RIPEN ROSE NOR SEEK TO WEAR IT!"

جی خیر وہ تو لارڈ بائرن تھا' ہمارا ملّا ہوتے ہوتے بھی کیسا رنگ تھا' ایسی ہی کوئی کھلی سیوتی دیکھ کر کھل اٹھا ؎

چہ باید بوئے گل خواہد کہ بیند
چو بیند روئے گل خواہد کہ چیند

"یہ لیجئے اب تو کچھ گنجائش ہی نہ رہی" "لو فارسی سے بھی تائید ہو گئی۔ پریت سنگھ نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا اور پھر ذرا سنجیدہ ہو کر سائنٹیفک انداز میں بولے بھلا آپ کے یہاں یہ روایاتی رشتہ داریاں نگھاری جاتیں اور ملوں فیکٹریوں میں کیا ہوتا ہے' ہر نوجوان مزدورن انگلیوں پر رکھی جاتی ہے' اور خیر یہ آپ کی چماری جیسی اول' یہ آں ایسی لونڈیا! یہ کہیں جا پہنچے تو تو خیر قیامت ہی آ جاتی ہے اور منیجر جنرل منیجر چھوڑ ڈائرکٹر اور جنرل ڈائرکٹر تک گھوڑ دوڑ ہو جاتی ہے۔ ویسے مسلّمہ امر ہے مل فیکٹری میں ہر جوان عورت کو ــــ خواہ کیسی ہی کالی بھتّی کیوں نہ ہو بس عورت ہو ــــ اوّل آں وہ تو'

کسی نہ کسی چھوٹے بڑے ایڈشن ممبر کے سر ہوتا ہی پڑتا ہے ...... اور اس میں آپ سے پوچھتا ہوں کل کو جو یہ کتھا فیکٹری سے جنگل کی اسکیم اور مال کی پلاتی کے سلسلہ میں یہیں کام پر جائیگی تو بھی موہنا کرنا سنگھ بابو منیجر کنٹرولر کیمسٹ ہوٹنیٹ وغیرہ جو آتے دن یہاں دورہ میں بنے رہیں گے آپ کی طرح اخلاق اندھے تو نہ ہوں گے ...... وہ تو بھی جیسا کہ انگریزی فارسی میں ابھی کہہ چکے ہیں : دیکھیں گے اور ریجھ ہوں بلکہ تو جہاں جائیگی مڑے گی! اور کیوں جاؤ ہمارے پہاڑ ہی میں دیکھ لو پرانی ٹریڈیشن چلی آتی ہے ہر دو مرا اپنی لونڈیا پہلے مہینہ فارغ ہونے ہی زمیندار پٹیل نمبردار کے گھر بھیجا جاتا ہے ہوں اور جب تک وہ رکھے اس کے ساتھ رہتی ہے اور پھر جب پھر سکھیا پٹواری وغیرہ سے گذرتی گذراتی چار چھ مہینے میں کہیں جا کر بکتی ہوتی ہے تو دھرم کے آدھے دام زمیندار کو چڑھا جاتا ہے کہیے ::

"ارے صاحب! دنیا جہاں کا سرشتہ ہے یہیں کا بابا آدم نرالا ہے" چودھری نے پربت سنگھ کے منہ سے بات لیکر ذرا جھٹکے سے کہا اور پھر ادھر اُدھر بستروں پر لیٹے، بیٹھے، رڑھکے رئیس زادوں کی جانب نظر گھما کر کہا "یہ باپ، بیٹی، بہن بھائی، نانی نواسی کی حماقتیں ہم نے ان روہیل کھنڈیوں میں ہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان رشتوں کے ناموں کی آڑ پکڑ کے اپنی کمزوری چھپاتے ہیں"۔ اور روہیل کھنڈی رئیس زادے کچھ چونکے سے مگر چودھری پوری لسانی کے ساتھ مسٹر پربت سنگھ کو مخاطب بناتے سب کو سناتا رہا۔

اور مسٹر پربت سنگھ اوں آں۔ اور ہمارے یہاں تو آپ کی پہلے! اس آں اور آنا بھی انتظار نہیں کرتے۔ پہلے ہی پکڑ ڈالتے ہیں، جہاں کوئی لونڈیا ذرا ناک نقشے سے درست اچھی ابھرتی نظر آتی۔ ہاں اور آپ کے واں تو خیر آدھی پر تی قیمت چڑھ ہونے میں آتی ہے اور ہمارے یہاں اگر بکتی بکاتی ہے تو سب کی سب رقم لگان کے سود میں سیاہ ہو جاتی ہے اور بھائی صاحب یہ روایتیں ابتک انھیں روہیل کھنڈیوں نامردوں میں ملیں گی" چودھری نے پھر ایک کڑی سی چٹکی لی۔ اور جیسے روہیل کھنڈ کے ساتوں ضلعوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اور چودھری کی چوٹ پر اور سب کے سب روہیل کھنڈی رئیس زادے اپنے اپنے بستروں میں اُچھل پڑے اور لال ناہر سنگھ راٹھور اور کنور نوبہار سنگھ تو مڑ ایک منہ بول پڑے "ارے چودھری صاحب بھلا ہم سب روہیل کھنڈیوں کو کیوں بدنام کرتے ہیں آپ۔ یہ ان چوہان نگر والوں کی کچھ پرانی آن چلی آتی ہے آجتک بدنام کنندہ نکونامے چند، ٹھیک کہتے ہیں آپ، نہ معلوم نامردے ہیں کہ کون جو کچھ بھی آپ کہیں حق بجانب۔ مگر اس میں شک بھی نہیں کہ پہلے

بہت سے خاندانوں میں کچھ یہی بات۔ مگر بھئی جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا ہماری طرف یہ پنچ فو میں صورت شکل سے بہت گری ہوتی ہوتی ہیں تو یہی روایت ٹھیک تھی چلو اور پہلے بھی اگر ان میں کوئی ذرا کمی بھی ہو جاتی جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا کہ ہم آجکل سب کچھ وہی کر رہے ہیں جو ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے اور پہلے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی غلطی نہیں کرتے تھے کہ ایسی غذا آلو جیسی آج سنگ بابو کے سامنے ہے اپنے اوپر حرام کر کے نہ چکھیں۔ ماں بہن بیٹی نانے کے لئے ہزاروں کالی بھجنگی کالی کھتری پڑی ہیں۔"

اور اُن کے منہ سے صاحبزادہ معشوق زماں خاں نے بات سنبھال کر کہا "اور اللہ رکھے اُن کی کیا تھی' اے صاحب! ہمارے جدامجد کی جن ابھی حضور نے نام لیا' اسے ہے خیر ایک ایک ہزار ہزار پلے بندھی رہتی تھیں، آپ ہاتھیوں چڑھے چڑھے پھر سنئے 'پیچھے پیچھے بیگماتیں، لونڈیاں باندھیوں کی ہزار پالکیاں ہوا دار چلتی تھیں' حکیم کہ بند میں بند شہ بندھے رہتے تھے سیکڑوں کشتے 'طلائیں معجونیں لئے" اور مسٹر پربت سنگھ اور چودھری دونوں صاحبزادہ معشوق زماں سے اس دوران میں متعارف ہو چکے تھے اور اُن کے کلاسیکل ڈانس اور "گرلی لگانے کا فن" دونوں کمالات جو انھوں نے وراثت اور روایات میں پائے تھے، چند روز کے قیام ہی میں بچشم خود دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے اُن کی جانب مسکرا کر دیکھا اور مسٹر پربت سنگھ نے کہا " ٹھیک فرماتے ہیں آپ معشوق میاں، لین پول لکھتا ہے کہ راجہ مان سنگھ کے پندرہ سو حرم تھیں" اور چودھری نے اُن کے کلام کو بالا کیا" اور ہمارے پیا جانِ عالم کے نامعلوم کتنی، رونگٹے رونگٹے پر ایک ایک' اور بغیر اُن کے پورا پورا انتظام نا ممکن تھا صاحب"! بالکل صحیح اور ہمارے اب بھی دو چار بڈھے آنکھوں دیکھے نکل آئیں گے۔

اور سب روہیل کھنڈی شہزادوں نے اپنے اٹھارویں صدی کے سردار آقا زادہ نواب زادہ مردان علی خاں صاحب بہادر روہیلہ کی جانب دیکھا جن کے جدامجد نے روہیل کھنڈ کے سات اضلاع کے ایک چھوٹے سے یونٹ کو وارن ہسٹنگز اور شجاع الدولہ جیسی طاقتوں سے ٹکراؤ کا اعلیٰ شعور دیا تھا اور بات چودھری سے ہو رہی تھی' تو ایک اودھ کا شہزادہ تھا جہاں کے تمدن کی اعلیٰ اقدار کو دلی کے تمدن کے ساتھ ملا کر ایک انفرادی روہیل کھنڈی کلچر نے جنم لیا تھا اور نواب زادہ مردان علی خاں کے نامور جدامجد حافظ رحمت خاں کی مورتی کی ہر سال دسہرے پر آجتک سب روہیل کھنڈی راجپوت پوجا کرتے ہی ہیں لہٰذا اس مرتبہ خاص طور پر نواب زادہ مردان علی خاں اپنی تاریخی سیادت کو چودھری کی وجہ سے اپنی اس

مخصوص پارٹی میں میز کر رہے تھے اور بت بنے ہوتے تھے اور اپنی خاندانی سیادت کا ان سب کے درمیان اظہار کیے بیٹھے تھے۔ ان کے متوجہ ہونے پر انھوں نے اپنے حلق سے ہونٹوں تک بھرے ہوئے پان اور پیک سے آزاد کرکے بولنے کیلئے، منہ خالی کرنے کو ادھر ادھر دیکھا اور جب کوئی خدمت گار نظر نہ آیا تو ذرا جھک کر برابر کے اسٹول سے اگالدان اٹھایا اور نہایت نفاست کے ساتھ خوشبو دار پیک تھوک کر گوہر افشانی کیلئے تیار ہوتے اور پھر "ہوں" نکال کر ڈیڑھ دو منٹ چپ سے جیسے قطعی و آخری محاکمہ کے لئے درست ہو کر سامعین کو متوجہ کیا اور پھر محققانہ انداز میں فرمایا "لالے صاحب کہاں پہنچے آپ حضرات بھی، واجد علی شاہی اور اکبری ادوار میں!! آج دیکھئے تازندہ مثال سامنے ہے ہمارے ہز ہائی نیس... بشیو کرن بہادر سنگھ آف .... کے تین سو سے اوپر رانیاں موجود ہیں اور یہ تو رہا آپ کے پنجاب کا، اور ہمارے روہیل کھنڈ میں چھوٹے بڑے دیہاتی رؤسا کی یہی صورت ہے جو کنور دیپال سنگھ نے بیان کی۔ اور پہلے تو ہمارے دیہات میں چھوٹی قومیں بستی ہیں اور خال خال کبھی کوئی.......... اور آں اگر کوئی کہیں قبول صورت دیہاتن ابھرتی ہے تو یہ لوگ بلا تکلف پکڑ بلاتے ہیں اور رہا ہم........ ہمارے قصباتی اور خاص طور پر شہری رؤسا کا معاملہ کچھ جدا ہے! تو بھئی ہم .... آں اُن لوگوں کا رجحان ذرا صنف نازک کی جانب، ہوں ——— آں ذرا کم ہی ہے اور چودھری صاحب وہ اوں، آپ کی اس غذا کی غذائیت زیادہ راس نہیں اٹھیں ——— اوں" اور انھوں نے صاحبزادہ معشوق زماں خاں کی جانب تصدیق طلب نظروں سے دیکھا اور صاحبزادہ صاحب نے نگاہیں اٹھائیں پھر بدستور جھکا کر مخصوص انداز میں ہاتھ چلاتے ہوئے گویا نس نس سے پھڑک کر اپنی ناک میں سے نغمہ چھوڑتی آواز میں بول پڑے " اور دو درگیوں جا دا سے حضت! یوں تو ہمارے سرکار خلد آشیانی ہز ہائی نیس مرحوم و مغفور کے خود حبے کہ آج سوا سو سے زیادہ بیگمات اللہ رکھے بیٹھی ہیں چوڑیاں پھوڑے، اللہ کی بندیاں حالانکہ اللہ بخشے حضت مرحوم کا ذوق مائل بہ ایرانی تھا مگر پھر بھی ——— اور نواب زادہ صاحب آپ نے پنجاب تک کی بتادی اور نہ بتائی تو یہ اپنے دکن کی! یہ ہمارے وزیر دکن مہاراج آج دیکھو آ دجا کے تاابجہانی کے نہ معلوم کتنی سیندور مانگ اجاڑے ...." اور اتنے میں چائے آگئی اور بات کٹ گئی اور نوکروں کی آمد پر سب چہرے یکدم ہموار ہوگئے اور صاحبزادہ لال، نواب زادہ راجکنور سب اپنے اپنے نسلی روپ کے لبادے چڑھا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چائے کی میز کی جانب متوجہ ہوگئے جس پر بجز ان کی اپنی اپنی مخصوص غذاؤں اور سب غذائیں سج رہی تھیں۔

اور یہ مجرکی گپ بھی قہقہوں میں اُڑ گئی، مگر جب شکار جاتے وقت مویشی خانہ میں سے گذرتے ہوئے سنگھ بابو نے اپنی چمریا کو گوبر کوٹنے سے دست و گریبان ہمہ تن مصروف بڑے غور سے عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ تمام دن چکڑی میں لگے شکار تو کھیلتے رہے مگر کچھ کھوئے کھوئے سے رہے جیسے آج اُن کے معصوم شعور میں کسی نامعلوم شئے کی تلاش اُبھرنا چاہتی ہے، وہ اپنے مبہم سے مفہوم کو دھندلے دھندلے خیالات کے نقوش کی شکل دینے سے قاصر ہیں یا جو کچھ اُبھرنا چاہتا ہے اسے بڑی کوشش سے وہ دبا لیتے ہیں جیسے وہ گھر پر کچھ بھول آئے ہیں اور کیا؟!! ـــــ اور کسی کسی وقت اُن کو اپنے شعور کے دھندلے دھندلے پردہ پر بجلی کی لہر کی طرح کسی حسین خدوخال کی جھلک سی نظر آتی اور وہ سر جھٹک کر جیسے اُنھیں معدوم کر دیتے۔ وہ شکار کھیلتے رہے، ماہرانہ انداز میں گھاس اور دلال کے اندر بڑھتے رہے، دائیں بائیں آگے پیچھے اُٹھتے پرندوں (اسنائپ) پر دنادن فیر کرتے رہے اور چاروں طرف فضا میں اُڑتے پرندے کٹ کٹ کر گرتے رہے مگر وہ کھوئے ہی کھوئے رہے ـــــ اور آج ہی شام کی ٹرین سے مہمانوں کی رخصت تھی اور شروع ہی سے انہیں SEE OFF کرنے کیلئے اسٹیشن جانے کا پروگرام بنا چکا تھا اور پھر چند ایک روز کیلئے جو پان نگر جاتا تھا مگر آج تو اُسے چمر گونٹے میں کتنے ہی ضروری کام یاد آگئے اور اُسے یاد آیا کہ وہ چند گھنٹے کے لیے بھی گاؤں نہ چھوڑ سکتا تھا اور تمام دن شکار کھیلتا پروگرام کے مطابق وہ مہمانوں کو لیکر اسٹیشن پہنچ گیا اور شام ہوتے ہوتے گھر پلٹ آیا اور اب راستے بھر تنہائی میں سیوتی کے نقوش زیادہ اُجاگر ہوتے رہے اور جیسے محویت میں پتہ بھی نہ چلا کہ کس وقت تند و تیز بیل اِسٹیشن سے گھر تک کا راستہ طے کر گئے۔

اور جس طرح شام کو شکار سے واپس پہنچکر ہر شکاری کے ذہن پر سوتے وقت تک تمام دن کی مہمات کے خدوخال اُبھرتے ہیں اِس طرح اِس وقت سنگھ بابو کے دماغ میں صبح کی گپ اور پھر چلتے وقت مویشی خانہ کے اندر سے گذرتے ہوئے نگاہ غلط انداز کے نقوش باریک خدوخال کے ساتھ آرہے تھے اور وہ جھنجھلا سے اُٹھے "ان نیچرل! ان اسپورٹس مین لائک!" اور اُسنے اپنے خیالات کو قاعدہ کے مطابق آج دن بھر کے شکار کے فنی تجزیہ کے جانب لیجانا چاہا، مگر وہ تو مویشی خانہ سے باہر نہ نکل سکے اور وہ پھر بڑے زور سے جھنجھلا اُٹھا " اور نہ یہ چودھری بھی بڑا کوئی وہ ہے مسخرا تمام خدائی کا! ـــــ ہوں بھلا بچپن سے لیکر آج تک کی ہزار بار کی دیکھی بھالی سیوتیا ہی آج اُس کے ہاتھ آگئی اور لگا مجھ سے مذاق کرنے بدمعاش، مجھے آج دِکھا رہا تھا! بھلا میں کیا دیکھتا ـــــ

حیرناک نقشہ رنگ ڈھنگ سے ذرا جھکتی ہوئی ہے " اور اُس کی آنکھوں کے سامنے سیوتیا کوند سی گئی " چلتی بھی ذرا الھڑپن سے ہے ' اِدھر سے اُدھر " اور اُسے سیوتیا مصروف اِدھر سے اُدھر مورنی کی سی چال چلتی ، ہنس کی سی گردن موڑتی نظر آئی " بے چاری غریب چھریا " وہ کچھ جھنجلا سا گیا ! NON-SENSE اور اُس نے گہری سانس لیکر جیسے اپنا سر کو جھٹکا اور زیر لب بڑبڑا کر ایک سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے ساتھ ایک اطمینان کا سانس چھوڑتے ہی جیسے سیوتیا اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

اور اُس کا خدمتگار اُس کے قریب آیا اور ذرا حیرت سے اوپر سے نیچے تک چند بار نگاہ ڈال کر نکل چلا گیا اور بوڑھے مقدم نے بہت آہستہ سے زیر لب کچھ کہتے ہوئے سنگھ بابو کی جانب دیکھا اور متوجہ ہو کر ان کے قریب کو آ گیا اور اُن کے گھٹنوں کے درمیان کھڑی بندوق اُٹھالی اور جیسے وہ چونک کر متوجہ ہوتے اور خندہ پیشانی سے مقدم کی جانب دیکھا اور مقدم نے اپنے مخصوص پیار کے لہجے میں لاڈ سا کرتے ہوئے کہا " راج بابو ، ہیں ! اتو اب اُٹھو ، سردی بڑھت ہے ' سارے دن کے تھکے ہارے گیلے کپڑے " ہوں " اور چائے " " ہاں تو پھر چائے ۔ تو ہوں منگا لو ایک پیالی ! " سنگھ بابو جیسے کچی نیند میں چائے کا نام سن کر بڑبڑائے۔

اور مقدم نے اُسی انداز میں ذرا جھٹکا سا دیتی ہوئی آواز میں کہا " ارے رے ! اور پھر ہاں بھلا بیٹھ کہاں گئے ! ؟ " اور اُن کی نشست پر حیرت کے انداز میں اشارہ کیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا " اور میرے راج دلارے سرکار کی بات تو جنگل میں چھوڑ آؤ کرو " بوڑھے مقدم نے یہ اندازہ کر کے کہ کبھی کبھی ہاتھ خالی جاتا ہے تو وہ ملول سے ہو جاتے ہیں کہا۔

نہیں مقدم نہیں اور آج تو میں نے سب سے زیادہ مار کی۔ سب کا سب شکار ان لوگوں کے ساتھ کر دیا ——— اور یہ کہتے ہی جیسے اُنھوں نے ماحول کو بدلا اور مقدم نے پھر حیرت کے ساتھ کہا ' تو پھر اُٹھو تو ، بیٹھ کہاں گئے بھلا دیکھو تو ! " اور انھیں احساس ہوا کہ خود فراموشی میں وہ کوڑا بھرنے کے ٹوکرے پر آکر بیٹھ گئے تھے جو صحن میں ایک جانب کو اوندھا ہوا تھا اور وہ اپنی اس عجیب اور غلیظ سی نشست پر مقدم اور ملازموں کے سامنے کچھ محجوب سے ہو کر جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اندر کو بڑھ گئے۔ ایک جھنجل کے ساتھ جیسے جھٹکے میں پہلو سے چمٹی ہوئی چیا ۔ ی وہیں اوندھے ہوئے ٹوکرے کی مخروطی تلی پر چھوڑتے ہوئے " اونہہ یہ چودھری بھی پورا بھانڈ ہے اور کچھ نہیں تو سویرے سویرے ہی مجھ سے مذاق کرنے کے لئے وہ لونڈیا سیوتیا ہی اُس کے ہاتھ لگ گئی "

اور کمرے آج کیسے سونے سونے ہیں ! " ہوں کئی روز بعد آج مہمان جو رخصت ہوتے ہیں "

اُس نے دل کو سمجھایا اور چائے کی میز کے قریب رکھے ہوئے ریڈیو کو کھولا اور پہلی ہی آواز پر یکدم بند کر دیا۔ چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ چوسا اور پھر دریچوں میں سے مغربی شفق کا نظارہ کرنے لگا اور آسمان کی مدور بلندیوں اور زمین کی پستیوں کے گول گول پیوند کی لکیریں اُسے نیلی لال سبز رنگوں میں سے ہوتی ہی اُبھرتے دیکھی۔ نیلی کے رنگ میں، نگی گارڈتے کی دوپہر اور سوم میں ڈوبی ادھوتر کی انگیا اور لال کھارو سے کے لہنگے میں لہراتی۔ اور جب دیکھتے ہی دیکھتے مشرق سے بڑھتے ہوئے سیاہی کے طوفان نے مغرب تک اپنی اندھیری ڈال دی تو انھوں نے بجلی کی سبزی مائل روشنی میں پاؤں تلے پھیلی ہوئی دری کی ایک ایک شکن دیکھی۔ جن کو تمام دن وہ جوتوں سے مسل مسل کر ڈالتے ہیں اور ہر صبح سیونیا نکالتی ہے اور تمام دن ہوا مشرقی و مغربی دریچوں سے باریک باریک گرد لا لا کر تمام کمرے میں فرنیچر، چوکھٹوں، گل دانوں پر آہستہ آہستہ چڑھاتی ہے اور صبح کو یکدم آ کر سیونیا جھاڑ لیتی ہے اور وہ اکثر صبح کو اُس کی چھاپ سے بیدار ہو کر اپنی خواب گاہ سے باہر آتے ہیں۔ صفائی کے لئے خالی کر کے اور سب اخیر صفائی یہاں سے وہاں تک بڑی ان دوق عمارت میں اُن کی خواب گاہ کی ہوتی ہے کیونکہ اکثر وہ دیر تک بستر میں پڑے رہتے ہیں اور وہ دوسری پیالی سونت گئے اور انھیں کمرے کی رنگین آرائشوں کو سیونیا صفائی کر کے دوبالا کرتی اِدھر سے اُدھر تیتری کی طرح تھرکتی نظر آنے لگی۔

"ہوں ذرا دیکھیں گے صبح کو ہم بھی! کاہے پر مرمٹا ہمارا یار چودھری" چودھرائن کو بدلے پر لگانے کو کہتا تھا" اور اُسے چودھری کا اندازِ بیان یاد کر کے بے اختیار ہنسی آگئی۔

(۴)

اور جب ساری بستی پر سناٹا چھا جاتا اور اکثر سنگھ بابو کے ملازم سو جاتے اور چوکیدار پہرے پر آ جاتے تو کبھی کبھی چتریا دبے پاؤں داخل ہوتا اور نشست گاہ کے دروازے پر جوتے اُتار کر آہستہ سے فرش سے گذرتا۔ خواب گاہ کے دروازہ پر ٹھٹکتا اور نہایت ہلکی آواز میں کھنکار کر آمد کی اطلاع اور داخلہ کی اجازت بجائے زبان کے حلق سے طلب کرتا جس پر بالعموم کتاب پڑھتے ہوئے سنگھ بابو "ہوں" کہتے اور ایک نظر کتاب سے ہٹا کر ملونے تیوروں سے چتریا کا استقبال سا کرتے اور پھر نظر کتاب پر رکھتے ہوئے ایک رسمی سا سوال کرتے "کہو چتری کیا خبریں ہیں تمہارے گاؤں کی" اور چتریا اپنی ناک میں سے نکلتی ہوئی منمناتی آواز میں اپنا نیوز بلیٹن شروع کر دیتا اور کتاب پڑھتے ہوئے سنگھ بابو کا بشرہ بھانپتا جاتا اور پتہ پتہ کی باتیں دُھرا کر انھیں متوجہ کرنے کی کوشش کرتا جاتا جن پر

کسی کسی وقت کتاب سے نظر ہٹا کر وہ اُس کی جانب دیکھتے جاتے اور کبھی کبھی ایک آدھ پتہ کی بات پہ مختصر سوال بھی کر لیتے اور پھر پڑھتے ہی پڑھتے "ہوں" "ہاں" کرتے رہتے اور وہ ایک سی۔ آئی۔ ڈی کے انداز میں اپنی معلومات اور تحقیق سناتا رہتا اور انٹیلیجنس انسپکٹر کی طرح خطرات سے آگاہی بہم پہنچاتا رہتا اور گفتگو کی رو میں ہر کاشت کار کے کھیت کی پیداوار صحیح صحیح من، سیر، چھٹانک کی کسر تک، گاؤں کے ہر چولہے کی روٹیوں کی گنتی اور ہر مرد کے پیٹ کے نوالوں کا شمار، ہر بھیڑ، بکری اور گائے کے دودھ کی ٹھیک ٹھیک تول تک بیان کر دیتا اور جب زبان کی پھسلن زیادہ بڑھتی تو گاؤں کی حاملہ عورتوں تک کے زمانہ تولید تک جا پہنچتی اور ہر ایک اہم سیاسی بات کے ارد گرد دھارا کی کسی نہ کسی سرگرمی کا ٹیپ کا بند لگا ہوتا جس کو سنگھ بابو اپنی فکر و استعداد کے مطابق سمجھ کر پتہ کی بات نکالتے جاتے۔

اور سنگھ بابو اور چتریا کی یہ خفیہ ملاقاتیں کوئی خفیہ چیز نہ تھیں بس ایسی ہی گھسی پٹی جیسی خفیہ پولیس کے پرانے عمال کی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں اور باوجود خفیہ ظاہر کرنے کے بھی چتریا اپنی اور سنگھ بابو کی اس مخصوص خلوت کی نہایت چابک دستی کے ساتھ گاؤں میں اشاعت کرتا رہتا اور اپنی اور سنگھ بابو کی قربت کا اظہار کر کے اپنی مکھیاگری اور پولیس کی قوت کو ایک اور ایک گیارہ بنانے کی کوشش کرتا رہتا اور داروغہ جی کے علاوہ خود کو سنگھ بابو کی ناک کا بھی بال ظاہر کرتا رہتا اور دھارا سنگھ بابو کے پاؤں تلے کا کانٹا ہی تھا مگر چتریا کے دل کی پھانس بھی! جو اُس کی پیہم کوششوں کے باوجود نہ تو داروغہ جی ہی کے نکالے نکلتی تھی اور نہ سنگھ بابو ہی اپنا راستہ صاف کرتے تھے جو اُس کا میدان خالی ہو جاتا۔ پانچ سال میں گاؤں کے اندر سے اُس کی ہیبت کم ہوتے ہوتے اب اثر زائل ہونے تک نوبت پہنچ چکی تھی ورنہ شروع شروع میں تو رعایا اور مزدور کاشت کار اُس کے نام سے تھرتھراتے تھے۔ جنتی کے فارم کے ملازموں تک کے پر جلتے تھے اور پرانا مقدم اور نمبردار تک اپنی اپنی جگہ پہ جھکتا تھا، اگرچہ چتریا کی پہنچائی ہوئی بہت سی چیزیں تو سنگھ بابو کی خواب گاہ میں رہ جاتیں لیکن کبھی کبھی بڑے پتہ کی باتیں مل جاتیں، جن سے سنگھ بابو کو فائدہ پہنچتا اور اُن کے انکشاف پر چتریا کی دو طرفہ دھاک بیٹھ جاتی اور جب کبھی کبھی جاڑوں کی لمبی راتوں میں کافی دیر ہو جاتی اور سنگھ بابو کتاب ہٹا کر تفریح میں جا پڑتے تو اُن کی گفتگو شکار کی گھاتوں میں سے گذرتی تعلقات کی سب سیڑھیاں اُتر کر چتریا کے بالکل دوش بدوش آ کھڑی ہوتی اور جیسے وہ آنکھ مچولی، لیلی گھوڑی، گلی ڈنڈے اور کبڈی کی دنیا میں جا پڑتے اور اس سلسلہ میں دھارا کا تذکرہ آ جاتا اور بالعموم یہیں سے بات ایک ہی جست میں فارم، سود، مزدوری، لگان، آبپاشی، بیگار وغیرہ کے موضوعات کا چکر لگانے لگتی اور یہاں پہنچ کر چتریا ایک ہوشیار چابک سوار کی

طرح سنگھ بابو پر جیسے سوار ہو کر دھارا کے خلاف اُنھیں حرکت میں لانا چاہتا۔ اور چتریا اس مسئلہ کو نہ سمجھ پاتا ہر چند غور کرتا کہ سنگھ بابو اس خصوص میں کیوں اپنی قانونی اور غیر قانونی طاقت استعمال نہیں کرنا چاہتے جبکہ انہیں یقین ہے کہ دھارا سرکش ہے، مغرور ہے، نہ خود بھینٹ بیگار دیتا ہے اور نہ اوروں کو دینے دیتا ہے اور اس کے لئے مستقل طور پر جد و جہد کرتا ہے۔ یوں تو بیگار سے چتریا کا گھر بھی مستثنیٰ تھا مگر چتریا گاؤں کا مکھیا تو تھا، بیگار دینا مگر گھاتیں اور باتیں کتنی بنا جایا کرتا اور وقت پر اطلاع دے کر کتنی چھوٹی بیل فارم پر اور کتنی مباحثیں گاؤں میں بجلتے رہنا اور کچھ دھارا پر ہی منحصر نہ تھا، چتریا گاؤں کے ہر پاجی اور سرکش کی اطلاع سنگھ بابو کو پہنچا دیا کرتا۔ مگر وہ کیا کرے اُن کے کان پر جوں نہ رینگتی، یہاں تک کے بعض اوقات تو اُسے ایسا شبہ پڑنے لگتا کہ سنگھ بابو دھارا سے دبتے ہیں اور شاید سنگھ بابو درحقیقت اپنے اس "ڈرنے" قسم کے جذبے کو اس طرف موڑے رہتے کہ دھارا اُن کے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ تھوڑا بہت کم آمیز ہے اور بچپن کا اکھڑ اور ہمیشہ کا پاجی ہے! اور وہ اُن سے ضرور دل کے اندر محبت کرتا ہوگا۔ محنتی ہے، غریب ہے اتنا وقت نہیں ملتا کہ اُن کے پاس آیا جایا کرے۔ اور سنگھ بابو کا ماتھا دھارا کے متعلق ہر اطلاع پاکر ٹھنک جاتا مگر اس خبر پر تو اُنھیں خلفشار پیدا ہو گیا کہ اُس کے اندر ایک باغیانہ شعور پیدا ہو رہا ہے اور چتریا نہایت صحیح اطلاعات وقتاً فوقتاً بہم پہنچا کر کبھی اُس کے سد باب کے طریقوں پر بھی اپنی فکر و استعداد کے مطابق روشنی ڈالتا مگر سنگھ بابو تو دھارا کو خوب سمجھتے تھے، چتریا تو اپنی طاقت کے مطابق ہی سد باب کی ترکیبیں بنا سکتا تھا اور سنگھ بابو باقاعدہ کوئی عملی کارروائی تو درکنار اُس سے بالمشافہ گفتگو کرکے درمیان کا سڑا گلا پردہ نہ پھاڑنا چاہتے تھے۔ ایک وقت تک تو وہ اپنے بچپن کی محبت کی آڑ میں اپنے دل کے خوف کو سمجھاتے رہے اور جب اُن کے مقابلہ پر دھارا کھلم کھلا آگیا تو وضعداری کے پردہ میں اپنا ڈر چھپاتے کام چلاتے رہے اور جب وہ اپنا دل ٹٹولتے تو اُن کا جی چاہتا کہ کاش اُن کے بچپن کا دوست، اُن کا پشتینی نمک خوار دھارا بھی اُن کے پاس چتریا کی طرح کبھی کبھی آیا کرے، دکھ درد کی کہا کرے، چتریا کی اکھیڑا کرے اور اپنی جمایا کرے۔ ہولی دیوالی انعام نذرانہ لیا دیا کرے۔ مگر اُس کو تو اور کاشت کاروں کی طرح اپنے پاؤں چل کر خریف ربیع لگان ادا کرنے بھی نہ آنا پڑتا تھا۔ اُس کی موروثی زمین کا ٹکڑا تو فارم میں آگیا تھا اور جب کبھی وہ کسی کام کے بہانے اُس کو بلاتے تو ہر مرتبہ اُس کے انداز میں نیا انقلاب سا پاتے، جیسے وہ خشک اور بیزار تر سا ہوتا اور اُسے اُن کی باتوں سے کوئی لگاؤ ہی نہ ہوتا اور چند باتوں کے بعد نہ وہی اُس سے گھل مل سکتے اور درمیان میں اُسے کوئی نہ کوئی کھری کھری پڑتی۔ جس سے سنگھ بابو کے دل کے علاوہ وقار کو بھی صدمہ پہنچتا ——— وہ خود ہی اُس سے پیچھا چھڑاتے اور وہ کام کا عذر کر کے چلا جاتا اور سنگھ بابو اُس کے

جانے کے بعد حاضرین کے سامنے اُس کی عدیم الفرصتی کا عذر نمایاں طور پر رکھ کر اپنے پرسٹیج کے زعم پہ پٹی چڑھاتے اور شاید دل میں بھی یہ کہنے کی کوشش کرتے کہ دھاآرا تو ہمیشہ کا کھرا اور زمانہ زدہ ہے اور جب اُس بچارے کو ضروری کام ہو تو ہمارے پاس کیسے بیٹھ سکتا ہے اور چتر پال کی کیا ہے۔ گھر سے خوش حال ہے، معاملہ دار، زمیندار کا اور سمجھدار ہے۔ اور سنگھ بابو کے پاس معافی ملتوی سیاسی چھوڑی ہوئی جاگیردارانہ سیاست کے پرانے ہتھیار تھے جن سے زمیندار بچوں کو اُن کے ماحول کی تربیت موقع بموقع پر اور وقت وقت پر مختلف صورتوں سے مسلح کرتی رہتی ہے اور پھر ڈھیل دے کر کھینچنے کا بھرپور وار جس کا نتیجہ بسا اوقات فوری انصاف (READYJUSTICE) کے نتیجے سے زیادہ کارگر ہوتا ہے ...... ورنہ نہ تو سنگھ بابو دھاآرا کے عاشق صادق تھے جو سب جفائیں برداشت کرتے چلے جاتے اور نہ اتنے احمق کہ اپنے دوست دشمن اور نفع نقصان میں تمیز نہ کر پاتے۔

اور دھارا جٹان سا نوجوان تھا جس پر نوجوانی بھرپور رشتوں کے ساتھ بھرپور سی چڑھی تھی اور کانپور ملز کی زندگی اور جیر گونٹے کی سیاست نے اُسے تپ تپ کر مجھا ہوا اور بجھ کر تپا ہوا فولاد بنا دیا تھا، دراز قد پیچ در پیچ اعصابی ریشوں میں بٹا ہوا جسم چال ڈھال میں تلوار کی لیک اور بجلی کی تڑپ، جو دوسروں کی مصیبت میں متحرک نظر آتی۔ نیورون میں شیر والے دم خم چاہتوں میں بیٹھ کر بھیڑ کی سی آنکھیں بن جانے، ذلیل شہرد کے گھر میں جسم پاکر اور سخت کوشی اور تلخ کامی کی گود میں پل کر بھی اُس کے جسم تو جسم آنکھوں سے زندگی کی تیز نیاں ذرا کم نہ ہوتی تھیں۔ وہ نوجوانی اور طاقت کا مجسمہ تھا، کام و محنت کا پرزہ تھا اور اب تو جیر گونٹے میں آزادی کا سوال بنا ہوا تھا اور جیسے سب کی تقدیر کے بھٹکے ہوئے ستاروں کی لگام تھام کر راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ اُس کے لہجہ میں شدر دالا گنگھ پایا دانت نکالتا انداز نہ تھا اُس کی چال راجپوتوں سے زیادہ متوالی تھی اُس کا سینہ اور مونڈھے پٹھانوں سے کم بلند و بالا نہ تھے وہ گردن اُٹھا کر چلتا تند گامی کے ساتھ قدم قدم پر جھنڈے سے گاڑتا ہوا اور باتوں میں اپنی بڑی بڑی ہونٹوں پر پڑی مونچھوں کے نیچے ہر وقت مسکراتا سا دکھائی دیتا۔ اُس کی کڑک پر ہوائیں گرہیں پڑ جاتیں اور اونی سی حرکات و سکنات میں زندگی مچلی سی پڑتی۔ اور زندگی کے اس طوفان کو دیکھ کر شروع شروع میں گاؤں کے بڑے بوڑھے اُسے ٹوکتے اور سنگھ بابو کے حالی موالی اُس کے اس "فرعونی" انداز پر چونک کر اُس کی گہرائی ناپنے کی کوشش کرتے اور کھٹکتے۔ اور چتر پال اُس کے دن دھاڑے کھلی بغاوت کی حد تک پہنچی ہوئی سرکشیوں پر سنگھ بابو کی توجہ مبذول کراتا مگر سنگھ بابو دل ہی دل میں اُس کا لوہا مانتے جاتے اور یہاں تک کہ اُس کی پوزیشن گاؤں کے اندر حزب مخالف جیسی بن کر رہ گئی

اِندر سنگھ بابو کی روایاتی تربیت کو بڑی حد تک تبدیل ہونا پڑا۔ انھوں نے نیتا جی کے بعد ایک نعرہ اُس کے سامنے بھی اُس کا منہ سینے کے لیے پھینکا اور پھر ایک اور تر کر کے پھینکا۔ مگر جب اُسے سونگھا بھی نہیں تو خاموش ہو گئے، وہ مزدور تھا اور مل کا بنا ہوا مزدور جو مینہ نہ برسے تو آق کی جانب منہ اُٹھا کر اندر مہاراج سے پرارتھنا کرنا بھی نہیں جانتا۔ اور اپنی موروثی زمین فارم میں ضم ہو جانے کے بعد اور تیری میری مٹی میں سر دھننے کی عادت ہو جانے کے بعد اُسے اپنے مضبوط بازوؤں ہی اپنے ان داتا بھگوان نظر آتے جن کی تقدیر کا پیمانہ جب وہ فیکٹری اور مل چھوڑ کر آیا تھا، ۲۰ روپیہ اور دو روٹی بس شام کے شام چھلک جایا کرتا تھا اور اُس نے اب اپنی پامردی اور سرفروشی سے اُسے سہ روپیہ اور چار روٹی ٹیک وسعت دے دی تھی، اندر سنگھ بابو کے ہر دخیل کار اور موروثی کی، اور شاید ہر گاؤں کے مزدور کی روزی تو آسمان پر تھی مگر دھرتی کی اور بیڑا پھری تھی اور وہ بھی اپنی زمین پر نہیں تیری میری دھرتی پر —— اور یہ راز دھرتا ہر جھنکار سے سرگرم روزنک بنا تا رہا تھا اور کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ روزی کہاں ہے۔

(۵)

ایک نہیں ہزار کلجگ آجائے مگر لچھمی تو کبھی آتی نہیں، لیکن کہتے ہیں کہ کل جگ میں چمار کے گھر میں پدمنی جنم لیتی ہے اور سیوتی اپنے باپ کے گھر میں کلجگ کی جیتی جاگتی نشانی تھی۔ جنگلی گلاب کی پتی جیسا رنگ، صباحت و ملاحت کا زندہ نمونہ، بھرے بھرے نازک خد و خال، بیضوی چہرہ پر اُبھرے ہوئے نقوش، کھڑی ستواں ناک، یاقوت کی تراشی ہوئی قاشیں سی دونوں ہونٹ جن پر سچے موتیوں کی لڑی سی دانتوں کی چھوٹیں بغیر ہی مسکرائے مسکراہٹیں تڑپتی رہتیں اور کشمیری سیب سے رخسار اور معریں پیشانی جس کے نیچے تلوار سی سنتی بھنویں اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں بغیر ہی لگائے خم دار کاجل کی لکیریں۔ اور بھڑکی ہوئی ہرنی جیسی بھوں اور مجموعی طور پر آفتاب سا دمکتا ہوا چہرہ اور یہ سب کچھ ایک بلوریں صراحی جیسی گردن پر رکھا ہوا جس کے دائیں بائیں اُٹھے ہوئے شانے جن کے ساتھ ہی شیپ کے تناسب اُبھرا ہوا سینہ جیسے مغل طرزِ تعمیر کی دو محرابوں کے سرے ملے ہوئے اور اُس کے پیچھے سیاہ ریشم کے دو لچھے، سر سے کمر تک گندھے جیسے پشتینی محنتوں کے سارے پیچ و خم اپنے کالے بلوں میں لپٹے ہوئے۔ گل رنگ بانہیں، جن کے گداز میں سخت کوششوں کی جلا شیشے کی طرح دکھتی۔ گول گول کلائیاں اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ اگر زور سے جھٹکا دیدے کھوٹیاں (لاکھ کی بنی ہوئی

چوڑیاں) سنت کر جا پڑیں، گدرایا ہوا جسم جس پر موزوں قامتی کبھری سی پڑتی۔ بیاکھ جیٹھ کی آندھیوں اور ساون بھادوں کی پھواروں کا پالا ہوا وجود۔ دھان کے انکھوے کی طرح شاداب اور جنگلی بانس کے کلّے کی طرح تند ——— اور پھر محشر خیز چال پھاگن چیت کی ہواؤں سے حرکت میں آتی ہوئی اور موسم بہار کے دیوتاؤں والا ناچ اپنے آپ سیکھی ہوئی اور سلامت روی اور یکسانیت کے ساتھ چلتی ہوئی جلترنگ بجانے چیتھلوں کی آواز کے زیر و بم سے بنا ہوا لہجہ جیسے صانع قدرت نے سب کچھ بنا کر اور نکھا کر اتار! اور یہ سب کچھ ایک چماری کے اندر بتیاب ٹاٹ باقی اور گاڑھے کھدّوے میں لپٹا ہوا مرمریں بدن ——— صبح سے شام تک۔ محنت اور پسینے پسینے اور محنت میں غوطہ لگا لگا کر اچھلتا ہوا اور اچھل اچھل کر غوطہ لگاتا ہوا اور ہر غوطہ پر ایک نیا نکھار پاتا ہوا بجز ہیٹ کے اپنے ہر عضو کی شکل سے بے خبر، پیشانی کے آئینہ پر ہیم پسینہ کی جلد سے بھی، اور سانس کی تیزی سے جلدی جلدی ابھرتے سینے کے زیر و بم کی طاقتوں سے بھی، اور مسلسل محنت سے جسم کے روز افزوں لوچ سے بھی انگڑائیوں میں دو آنکھیں تھیں جنھیں یہ سب کچھ دکھائی پڑتا تھا۔

اور آج تو سنگھ بابو اپنے ہوش میں رہتے سہتے تو انہوں نے بہت کچھ راہِ فرار ڈھونڈی، دماغ میں خاندانی روایات اور اخلاقی ماحول کے ٹھنڈے ٹھنڈے پھوڑوں اور دل میں عشق کے تیز نشتروں میں مجادلہ ہوتا رہا۔ یوں تو مشہور ہے کہ دنیا میں وہ کونسا درخت ہے جسے ہوا نہیں لگی اور وہ کونسا آدمی ہے جسے بابا آدم اور اماں حوّا کا رشتہ نہ معلوم ہو مگر سنگھ بابو پر تیز ہوا کے جھکڑ نہ لگے تھے اور جو کچھ لگی تھی وہ اپنی کالج اور کالج کے بعد فارم کی زندگی میں بڑی لطیف، بھینی بھینی مہک سی، اور اماں حوّا کے رشتے سے تو واقف ہی نہ تھے اور یہاں تو روایات کی سدِ سکندری حائل تھی جس کا پھلانگنا انہیں اپنے بوتے کا روگ نہ معلوم ہوتا تھا مگر بستر پر پہنچتے پہنچتے دل کی فتح اور دماغ کی شکست ہو گئی۔ اس چودھری کا برا ہو۔ کالج میں اس نے نہ معلوم کیا کیا سکھایا ——— خیر۔ اور آج یہ تو بالکل ہی نئی چڑھ گیا جو اس کے یہاں کبھی ہوتی ہی نہ تھی! اور وہ ایک نئے سرور میں کھو گیا۔

اور پھر رات گئے تک تو سنگھ بابو چتریا کا انتظار کرتے رہے، مگر کمبخت آج وہ بھی نہ آیا، اور خیر اچھا ہوا نہ آیا۔ آدھی رات تک تو اُن کے پاس چتریا کے سامنے اظہار حالِ دل کیلئے بھی الفاظ نہ تھے اور آج تو جیسے دن پڑی میں پانچوں سال کی دیکھی بھالی سیوتی یکدم اُن کے اوپر پھٹ پڑی تھی وہ ایک عجیب سرور میں کھوئے ہوتے تھے اور تمام رات صبح ہونے کے منتظر رہے ذرا ہوئیں تو کیسی ہے سیوتی جسے چودھری اتنا پسند کر گیا۔ اور دھندلی دھندلی صاف صاف آنکھوں ہی آنکھوں میں

ساری رات کٹ گئی، اور تصور کی رنگین فسوں کاری کہ جیسے سیوتی ہی سیوتی نظر آتی رہی یوں تو بالعموم دیر تک سونے کے عادی تھے اور خصوصاً جب ایک روز پیشتر شکار یا سواری کے تھکے ہوں تو خاص طور پر مگر آج وہ بستر سے بہت صبح اٹھ کر مویشی خانے میں پہنچ گئے اور ادھر سیوتی داخل ہوتی، بجلی سی لہرائی، گردن میں مستانہ وار خم، تلوار کی طرح ترچھی ترچھی چال، ہولے دامن کو کاٹتی سی نگاہیں نیچے کو جھکائے اپنے آپ سے بالکل بے خبر، اور اس نے تو شاید سنگھ بابو کو دیکھا بھی نہیں مگر انہوں نے تو آج اپنی آنکھ کے گوشے سے بھرپور دیکھا، جیسے اس کے اندر حلول ہو کر، اور وہ دیکھتے رہے اور وہ اپنے معمول کے مطابق مصروف ہو گئی۔ لکڑی کا پھاوڑا ہاتھ میں لے کر ایک ایک بیل بھینس گائے کے تلے سے گوبر سونتا۔ گھوڑی کے نیچے گڑھے میں سے پیشاب نکالا اور ایک ایک کر کے چاروں ٹاپیں ہٹا ہٹا کر کچلی ہوئی گھاس نکالی اور لید سونت کر اکٹھی کی اور جگہ جگہ پر اور لید کے تودے لگاتے پہلے لید کا ٹوکرا بھرا اور اٹھا کر بستی سے باہر کھاد کے ڈھیر پر کو لے گئی اور پھر پہلے بعد دیگرے گوبر کے ٹوکرے لیجاتی رہی، چند منٹ دم لیا اور پھر اہر کی سوٹی لکڑیوں کی جھاڑو سے تمام تھان اور اصطبل بڑھا لے اور اور کوڑے کا آخیر ٹوکرا لیکر چلی گئی۔ سنگھ بابو نے آج اپنی زراعتی عمر میں پہلی مرتبہ تھان اور اصطبل کی صفائی کو اتنی باریک بینی سے دیکھا اور صفائی کرنے والی کی ہر ہر حرکت انہیں خیرہ کرتی رہی اور بوجھ لیکر چلتے وقت تو چال کا انداز اجنتا کی کسی مورتی میں جان پڑ جانے کی زندہ تشکیل پیش کرتا رہا اور اُن کے خرمن صبر پر بجلیاں گراتا رہا۔ وہ مویشی خانہ کا آخیر ٹوکرا پھینک کر پلٹی اور ٹوکرا ایک جانب کو رکھ کر ٹنکی میں بھرے ہوئے پانی کی جانب متوجہ ہوئی اور شنغرف کے نقوش اک ذرا کی ذرا فرصت کے انداز میں بدلے۔ لال لال رخساروں اور مرمریں پیشانی پر پسینہ کی افشاں سی چمک اٹھی، عناب گوں انکھڑیوں میں محنت کی سرخی بھی اور لال ڈورے رہ گئے اور ٹنکی سے پانی لے کر اُس نے اپنے لتھڑے ہاتھ کہنیوں تک دھوئے جیسے کسی مغربی دوشیزہ نے چرمی دستانے اُتارے اور گوبر میں سے مکھن سے ہاتھ نکل آتے۔ ادہ! بلا کا تناسب ہے اِن گوبر جوڑنے والے ہاتھوں میں! انھیں اندازہ ہوا اور وہ اب فارغ سی ہو کر اُٹھی اور تمام مویشی خانہ کا پر اطمینان نظروں سے جائزہ لیکر چبوترے کی جانب دیکھا جس کی منڈیر پر کھڑے سنگھ بابو یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے اور گلابی آنکھڑیاں نرگسی سی ہو کر چار ہوئیں اور سنگھ بابو کے دل پر کٹاریاں سی چل گئیں۔ الحفیظ والاماں! چماری ہے کہ لاکھ رانیوں کی ایک رانی! اور اب وہ کوٹھی کے چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اپنا نیل میں رنگا کھدر کا گھسٹتا ہوا دوپٹہ سنبھالتی، جیسے کسی یونانی دیوی کا رنگین تخیل! یا اس بلند مکان کی ملکہ، اُس کے دل کی رانی، قیمتی ڈریس بال میں چماری کا بے داغ روپ لئے کوئی

فرنگن ترکن! ـــــ تاریخ کی کتابوں میں رانی سنجوگتا کا حلیہ لکھا ہے اُس کی زندہ تشکیل۔ اور اگر اُسے
ایک سفید ململ کی ہی ساڑھی پہنا کر سوسائٹی کی نادر دوشیزاؤں میں اُتارا جائے یا پردہ سیمیں کی اندرسبھا
میں بھیج دیا جائے تو ایک ایک ستارہ ماند پڑ جائے بڑے بڑے چاند گہنا جائیں" انھوں نے دل میں کہا
اور چبوترے کے کونے سے کھڑے ہو کر سیڑھی پر اور اوپر والی سیڑھی سے پورے صحن کے عرض میں اور
پھر اندر نشست کے کمرے تک ان کی نگاہیں تعاقب کرتی چلی گئیں اور وہ معمول کے مطابق نہایت
آزادی سے دیوانہ وار نشست گاہ میں پہنچی ایک نظر جائزہ لے کر مشغول ہو گئی۔ پہلے تصویروں سے
پھر دیواروں سے اور پھر فرنیچر سے گرد پونچھی پھر فرش پر جھاڑو لگائی اور برش پھیر کر دری کی ایک ایک
شکن نکالی اور سنگھ بابو ادھر کو آ گئے اور وہ اسی طرح دفتر کے کمرے میں پھر خوابگاہ کے کمرے میں بندھی
ٹکی حرکات کے ساتھ مشغول رہی۔ پھر برآمدہ میں آ کر جھاڑو لگائی اور برآمدہ جھاڑتی اور برآمدہ کے
سامنے والے پتلے چبوترے پر سے سب اندر کا کوڑا کھسکاتی صحن میں اتر آئی اور تمام صحن میں جھاڑو
لگائی اُس ٹوکرے کے قریب کو آئی جس پر کل شام بیخودی اور خود فراموشی میں شکار سے واپس آ کر سنگھ بابو
براجمان ہو گئے تھے۔ سب کوڑا ایک ہی دفعہ میں ٹوکرے کی کناروں سے بالشت بھر اونچا بھر لیا اور
کمر پر ہاتھ سا لگا کر ایک لمبا سانس لے کر لہرائی اور کل سراپے پر ابھریں اور اٹھکیلیاں کی نشانیاں
جھلک اٹھیں اور وہ سر پر دونوں ہاتھوں سے ٹوکرا سنبھالے چل پڑی اور اس ٹوکرے کے نیچے سنگھ بابو
نے وہ سب کچھ دیکھا جو آج تک نہ دیکھا تھا اور اپنے کمرے کی باریک گرد کی تہ بھی جو نہیں پاؤڈر کی
طرح ستم بالائے ستم میک اپ کر رہی تھی ـــــ اور آنکھوں کی کناروں پر شعلہ سے فراغت کی آب!
بالکل نئے انداز سے گھائل کرتی ہوئی اور کام ختم کرنے کے بعد چال کی فطری مختصر خبری۔۔۔۔ قدم
قدم پر ایک دنیا بنانی اک مثالی! اور وہ چلی گئی اور سنگھ بابو اضنا کے اس مجسمہ میں خود ہی جان ڈال
یکہ و تنہا اپنے خالی خولی مکان میں تا حدِ نگاہ تعاقب کرتے کھڑے رہ گئے۔

(٦)

چماروں کا گاؤں اور بست بسوہ ٹھاکر زمیندار، اگر سنگھ بابو کی بجائے اُن کا کوئی اور ہم عصر ہوتا تو
اس مسئلہ پر کوئی غور نہ کرتا اور پہلی نظر پڑتے ہی چٹ کر جاتا، مگر وہ تو اپنی خاندانی روایات کی زنجیروں میں
جکڑا ہوا تھا اور اُس کے دل میں تو بس گئی تھی مگر اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ آ سکتا تھا کہ کبھی ایسا
بھی ہو سکتا ہے اور پشت ہا پشت سے بیچ بیچ اُس کے یہاں چمر گونٹے کے موٹے تگڑے چمار اور

کالی گوری چڑیاں، بیل گائے بھینس گھوڑی کبھی ہانکی رہی تھیں اور وہ خود کو بھی اپنے آقا سے اس رشتہ کے علاوہ اور کسی رشتہ کے اہل نہ سمجھ سکتے تھے مگر آج خاندان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سُکھ بابو کا زاویہ نگاہ اور طریقہ خیال بدلا تھا اور وہ بھی چودھری کے اشارہ پر ۔ مذاق ہی مذاق میں سچ مچ!! اور چودھری کی شریعت میں تو گدھی کے دودھ سے لے کر گدھے کے انڈے تک ہر چیز حلال تھی ۔ اور وہ تو اپنی فکر واستعداد کے مطابق چلتی ہوئی معمولی سی بات کہہ کر مذاق کر گیا تھا اور بات سنجیدگی کی حد تک پہنچ کر مذاق ہی پہ ختم ہوگئی تھی مگر جیسے سکھ بابو کے اندر چنگاری جا پڑی تھی اور اُن کے منہ کو لہو جیسے لگ گیا ہوگیا سیونیا' جسے چودھری شکر کی گولی بنا کر اس کے منہ میں ڈال گیا تھا وہ دماغ سے چودھری کے اوپر لعنت بھیجتا اور دل سے اس کا شکر ادا کرتا ' ایسے فردوسی احساس سے آشنا کر دیا جیسے اُس کی بے خار گلزار زندگی میں ایک نیا رنگ بھر گیا ! شاید اس رنگ کی اُس کے گلستاں میں کمی بھی تھی مگر مطلب براری کے لئے ہنسیا ۔ فوراً کنار اُس کی بزدلی کا یہ عالم تھا کہ اس ضمن میں اس کے پاس حرف مدعا کے لئے سیونی تو بڑی چیز ہے چتریا کے سامنے بھی آواز نہ تھی ۔ بس سیونی کے جانے کے بعد وہ کچھ اور اضطراب اور کشمکش میں چبوترے پر ٹہلتا رہا اور پھر ٹہلتے ٹہلتے منجھ گیا کھویا کھویا سا ۔۔۔ چائے پی جیسے کسی اور کے منہ سے لمبے لمبے بے تکلے گھونٹوں میں اور جب طبیعت زیادہ گھبرائی تو ایک آدمی کو ساتھ لے کر نکل گیا ۔ خلافِ معمول بے سبب چاپ بغیر کسی ہدایت کے فارم کے قطعوں کا معائنہ سا کرتا رہا اور قریب دوپہر بجائے مکان پلٹنے کے جنگل میں گھس گیا مگر آج تیتر جیسا ہیجان زا شکار بھی اُس کا غم غلط نہ کر سکا ۔ وہ چلتا رہا ' شکاری کے روایتی انداز میں اور اُس کے کتے جھاڑیوں سے سونگھ سونگھ کر تیتر اٹھاتے رہے اور وہ اپنی جبلت کے مطابق اپنے اعصاب کے مخصوص فن کارانہ انداز میں شکار کھیلتا رہا لیکن آج اُس کے احساسات شکاری کی روح غائب تھی ' گویا وہ اپنے ہر شکار سے زیادہ خود ہی گھائل تھا ۔

اور دوپہر کے کھانے کا وقت جنگل میں غائب ۔ سہ پہر کا ناشتہ بھی وہیں ختم اور غروب سے ذرا پیشتر وہ مکان پلٹا ' تمام دن بھوکے رہنے پر بوڑھے مقدم کی مشفقانہ جھڑکیاں سی سیں ' تلی ہوئی ہری مرچ اور دو تین ولایتی بسکٹوں کے ساتھ دو پیالی چائے پی رات تک چپ چاپ لیٹا رہا ' رات کو انکار سا کرتے ہوئے ذرا دیر سے مقدم کے تھوڑے اصرار کے ساتھ کھانا کھایا اور بھنا تیتر اور خستہ پوریاں کچوریاں مٹی کے سے لقمہ بن کر حلق اُتریں ۔ بار بار بوڑھے مقدم نے طبیعت پوچھی اور جلد ہی بستر پہ جانے کی ہدایت کر کے دہکتی ہوئی انگیٹھی لگا دی اور جسم دبانے کے لئے حجام

کو بلایا۔

وہ بستر پہ دراز تھا، حجام اُس کی رگ رگ دبا رہا تھا اور پٹھا پٹھا ٹٹول رہا تھا لیکن اُس کا ہیجان ہے کہ دبتا تھا اور اُسے حجام کے نرم گداز ہاتھوں کی چھیڑ سے پریشان ہو کر کہنا "جاؤ اور حقہ بھر کے جاؤ" اور حجام جیسے آج اُن کے بدمزہ بدمزہ سے مزاج سے کچھ خائف سا چپکے سے حقہ رکھ کر چلا گیا۔ اُنھوں نے بار بار کش لئے اور آج تو جیسے اُن کی عظمت و طاقت اپنے ہی داؤں پر چاروں شانے چت تھی۔ وہ لیٹے ہوئے تھے اور اُنھوں نے سر سینے پر جھکاتے ہوئے ایک کروٹ بدلی اور دونوں کلائیوں میں دونوں کنپٹیاں مضبوط دبا کر لحاف میں مُنہ ڈھانک لیا اور وہ ایک سیدھا سادہ معبدا بچہ تھا۔ کالج کی تعلیم نے بڑی حد تک نسلی اکھڑپن بھی نکال کر جلا دی تھی۔ ذہنی اعتبار سے وہ فرسودہ روایات کی حقیقت خوب سمجھتا تھا تاہم باطنی خد و خال تو اُس کے خانگی ماحول سے بنے تھے اور شاید مجلسی مسائل میں اپنی صورت اپنے ہاتھوں مسخ کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور پھر یکدم ایک رات میں! بھلا کوئی ہزار سالہ روایات پر دس گھنٹے میں کیسے پانی پھیر دے مگر دل کا طوفان جیسی مکھی تو در کنار جھونسا لاکھی نکلتا ہے اور انھوں نے جیسے یکدم اپنی طاقت کا رُخ بدل کر حرکت میں لانا شروع کیا۔

اور اُن کی آنکھوں کے سامنے سیوتی گھوم رہی تھی، غلاظتوں میں لپٹی ہوئی اُن کے گھر کی تمام گندگی اپنی بُکنیوں کے زور سے باہر لے جاتی ہوئی اور یہاں تک کہ وہ اُس تک پہنچنے کیلئے ساری غلاظتوں میں غوطہ مارنے پر تل گئے۔ کاش وہ آج زمیندار نہ ہوتا اس گاؤں کا ذلیل چمار ہوتا تو کس قدر آسانی کے ساتھ سیوتی کو اپنی چماری بنا سکتا تھا اور آج اگر سیوتی کا جسم نیل کسوم میں رنگی گاڑھے کی دوہر اور ببول کے کس میں رنگی انگیا اور لال روئے کے لہنگے میں لپٹے ہونے کی بجائے پیرس فلور اور جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس ہوتا۔ اُس کی ناگن سی زلفوں میں کڑوے تیل کی جگہ ایٹ کنسن ہیر آئل کی خوش بودار مہک ہوتی اگر آج اُس کے پسینہ سے جنگلی گلاب کی بھینی خوشبو کے بجائے شاہینہ العنبر اور ایوننگ اِن پیرس کی لپٹیں اُڑتی ہوتیں اور وہ مس سیوتی ہوتی تو وہ کس قدر کامیابی کے ساتھ اُس سے اپنا رومان لڑا سکتا تھا اور نہ سہی مس سیوتی وہ راجکنواری سیوتی کنور بھی ہوتی تو بھی اُس کو اپنانے کے لئے اُس کے پاس کیسے یقینی ذرائع تھے لیکن افسوس نہ وہ یہ تھی اور نہ یہ وہ تھا اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روایات اور سماج کی سد سکندری دونوں کے درمیان حائل تھی جس کے آگے اس کی طاقت عاجز تھی ــــ مگر آج بھی تو اُس کے پاس ذرائع اِن دونوں سے زیادہ کارگر ہیں! اور کیوں نہیں وہ اُس کی اور اُس کا اہل

ہے اور جب اُس کے شعلے سے دہکتے رخساروں میں مسکراتے وقت ویسے ہی ننھے ننھے گڑھے ہونٹوں کے گوشوں کی قدرتی پھڑک کے ساتھ اُبھر کر غائب ہوتے ہیں جیسے سوسائٹی کی لڑکیاں بنا بنا کر بگاڑتی اور بگاڑ بگاڑ کر بناتی ہیں اور مسکراہٹوں کا اینگل اُن کے مطابق رکھتی ہیں۔ اُس کا میدہ شہاب جیسا رنگ ہو بہو ایسا ہے جیسا نرم نرم پفوں (PUFF) سے چہرہ پر رنگین روج اور ملیح پوڈر لگانے کے بعد بنتا ہے۔ اور اُس کے ہونٹوں پر تو جیسے لپ اسٹک ہی سی لگی ہے اور بھویں بغیر ہی تراش خراش کے اپنے آپ چڑھی کمان کی طرح کھنچی ہیں اور آنکھوں میں لال ڈورے اور کاجل کی لکیریں سی یوں ہی ہمہ وقت زیب و زینت رہتی ہیں اور اُس کے لہجہ اور دبی دبی ہنسی کا ترنم پردہ سیمیں کی نمائش سے اکتساب کئے بغیر ہی نغمہ ریزیاں کرتا ہے اور اُس کی ہنس کی طرح حرکت کرتی ہوئی گردن خود ہی اُس طرح مڑتی ہے جیسے کلبوں اور تماشوں میں موڑ موڑ کر دکھائی جاتی ہے اور پھر اُس کا سینہ بغیر انڈر ویر کی "بیسا کھیوں" کے تنداد پوی اور دھولاگری کی چوٹیوں کی طرح ایستادہ ہے اور پھر قدرت نے اُس کو چمار کے گھر میں جنم دے کر اور کوڑے کا ٹوکرا سر پر لاد کر اُسے منحوس گندا اور بدبو والا قرار دیا ہے تو پھر پھر گوستے لے بجز سنگھ بابو کے اور کون سا گبھرو جوان ہے جو اُس کا اہل ہو؟ اور وہ خود اُس کی اہل کیوں نہیں ہے جب اُس کا دل اُس پر اپنی ہستی تک قربان کر دینے پر تُلا ہوا ہے۔ تو یہ باپ دادا کی مُردہ ریت اور دقیانوسی روایات کیا چیز ہیں؟ "میں اُس کا ہوں اور وہ! وہ میری ہو گی" جیسے اس کے اندر والے نے بڑی پر استقامت آواز نکالی۔ اُس کو باپ دادا سے استحصال اور حکومت کے لئے الفاظ کا بڑا ذخیرہ ملا تھا تو کیا آج اُس کی پانچ سال کی کالج کی زندگی نے اِس مطلب کے لئے دو حرف بھی نہ دیئے تھے اور وہ اپنے نطق میں دو حرف اپنے مطلب کے ٹٹولتا رہا اور بستر میں کروٹیں بدلتا رہا اور اُون اور روئی کے پہلو میں زیر و زبر ہوتا رہا اور بوڑھا مقدم چپکے سے دو تین بار جھانک کر سمجھ گیا کہ راج بابو آج کچھ ماندے ہیں۔

کھڑ کھڑ کرنے لگا۔ تمام دن کا ہانپتا بھاؤ تھک گیا اور یہاں تک کہ خاموشی اور سکوت نے تمام بستی اور سارے جنگل کو یکساں دیہاتی رات کی کالی چادر میں لپیٹ دیا۔ بستی اور جنگل کی تمیز نہ رہی اور سنگھ بابو کو اپنی خواب گاہ کے دروازہ پر مخصوص چاپ سنائی دی اور پھر ذرا ٹھٹھک کر مخصوص متھار — "چتریا کی متھار" جیسے بجلی سے دماغ میں کوندا سا ہوا اور دل کا کونا کونا جگمگا اٹھا اندھیرے میں اُمید کی کرن! — چتریا اُس کا بچپن کا پیارا ساتھی! لیلی گھوڑی، آنکھ مچولی اور آتی پاتی میں اُس کے پکڑے جانے پر اپنے آپ چور بن جاتا اور گلی ڈنڈے میں اپنا داؤ اُسے دے دینا اور کبڈی میں ڈھال بن کر

آپ مرجاتا اور بیچ میں آکر اُسے زندہ رکھتا جیسے بچپن ہی میں سب ساتھیوں کے درمیان اُس کو ممیز کرکے اُس کی انفرادیت کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ اور بچپن کے خلوص و معصومیت کے ہی دور میں سب ساتھیوں کے اندر اُس کی سیادت کا شعور بیدار کرکے اُس کے اندر اور سب کے اندر ایک احساس تفوق اور برتری کی داغ بیل ڈالدی تھی جو اُس وقت سے پرورش پاکر انہیں راج کنور اشیر سنگھ اور اُن سب کو چیتریا، دھارا، پرکھوں نہیں سکھا، من سکھا، پتا، کھتلا جمار میں جوان کرتا رہا تھا۔

اور اُسنے آج ذرا معمول سے بڑھے ہوتے انداز میں جیسے ہاتھوں ہاتھ چیتریا کو لیا اور چیتریا باہر طبیعت ناساز ہونے کی کچھ سن گن پا چکا تھا، پہنچتے ہی ذرا ہمت کے ساتھ طبیعت پوچھی اور بڑی ہمدردی سے ہاتھ ٹٹولا اور کوئی قطعی جواب نہ پاکر بشرہ بھانپ کر پھر مزاج پرسی کی، پھر جب اُنہوں نے سب ٹھیک ٹھاک بتائی تو آج کے شکار کا حال پوچھا کیونکہ کبھی کبھی ہاتھ خالی جانے پر سنگھ بابو بہت زیادہ ملول ہوجایا کرتے تھے۔ اور جب سنگھ بابو نے کوئی خاص بات نہ بتائی تو دو تین منٹ خاموشی کے ساتھ اُن کا بشرہ پھر بھانپا اور اصرار کرکے اضمحلال کا سبب پوچھا جس کے آثار اُن کے چہرہ پر بھی نمایاں تھے اور باہر کچھ مقدم اور عوام سے بھی سُن کر آیا تھا اور گاؤں کی سیاست میں اُس کا آزمودہ مشیر، ہم معاملات میں اُس کا دست راست اور بے تنخواہ کا انٹلی جنس آمیز اور اُس کا بچپن کا دوست اور آج کا محرم راز دوست چیتریا خلوص کے ساتھ اُس سے اُس کی پریشانی کا سبب پوچھ رہا تھا اور وہ تو کل ہی سے خود اپنی پریشانی کا سبب بتانے کے لئے اُس کا منتظر تھا مگر اظہار کے لئے الفاظ اب بھی زبان کے پاس نہ تھے ——

اور چیتریا مجسم سوال جیسی خاموشی نے اُن کے دل میں نشتر کی نوک سی چبھودی، اور جیسے دو ایک ذہنی ترنگ سی لگا کر اُٹھ کے بیٹھ گیا اور فرد کی دبیز تہوں کے ساتھ اپنے اوپر کی اور بہت سی تہیں اُتار کر پھینک دیں اور وہ یکدم اٹھارہ بیس سال پیچھے جا پڑے، جیسے وہ کسی چڑیا کا گھونسلا بھانپ کر اور اور سب ساتھیوں سے چھپ کر اُس پر چھاپہ مارنے کی صلاح کیا کرتے تھے اور ایک کو دوسرا انڈے بچے چرانے کے لئے چڑھنے کو اپنی پیٹھ اور کندھے پیش کیا کرتا تھا، اور بالعموم چیتریا ہی کے کندھوں پر چڑھ کر سنگھ بابو گھونسلے میں ہاتھ ڈالا کرتے تھے۔

اور چیتریا سے سنگھ بابو نے اپنے دکھ درد کی کہی اور نہایت صاف صاف کہی، اور چیتریا تو بھونچکا سا رہ گیا، آج سنگھ بابو کہاں سے بولے!! وہ اُن کا مُنہ تکتا رہا اور وہ کہتے رہے اور یہ سنتا رہا۔ پچھلی تاریخ کے زریں ترین ورقوں کے پھاڑنے سے سرسراہٹ!۔ اور پھر سناٹے میں آگیا بہ مشکل اُس نے اس جوار بھاٹے کو دبایا۔ جس کی تحریک اُس کے اندر سنگھ بابو کے پہلے جملوں پر ہوئی تھی اور اس مقام

پر سنگھ بابو کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا پایا کہ جیسے پہلے تو اس کو سانپ سونگھ گیا اور پھر خود اُس
کو اپنے وجود میں زلزلہ سا محسوس ہوا اور وہ اپنے دوست آقا کا راز سُن کر سچ مچ کانپ اُٹھا اور یہ
اُسی کے اپنے دل ہی کا تو راز تھا جو آج سنگھ بابو کے منہ سے نکل نکل کر اُس کے کانوں میں پگھلے ہوئے
سیسہ کی طرح پڑ رہا تھا۔ اُن کا اپنا راز بن کر!! اور جیسے آج یہ راز اُس کا راز نہ رہا تھا اور ابھی تک
تو اُس کو اپنے راستے میں دریائے برہم پتر کے پھاٹ کی طرح دھارا ہی نظر آتا ہے اور اب تو جیسے اُس
کے اُس پار ہمالیہ پہاڑ کھڑا ہو گیا اٹل وجبروت!!

اور اب تک تو اُس کے باوجود اپنی پوسٹ اور سنگھ بابو سے اکتساب کی ہوئی تمام قوتوں
اور دھلکاری، اور وزن کشی کے نسخوں کی اقتصادی خوشحالیوں کے باوجود دھارا اُس کے اور سیوتی
کے درمیان کانٹا تھا اور بڑا نوکدار کانٹا کیونکہ شاید سیوتی تو دھارا کو پسند کرتی تھی اور اُس کی تمام تر
عزت اور مالی فراغت کے اوپر دھارا کے افلاس اور پریشانیوں کو ترجیح دیتی تھی مگر اُسے امید تھی
کہ ہر روز اُسے سنگھ بابو کی کل اسی طرح امید دی یا داروغہ جی کو کاؤنٹ دہیا اُس پاس کہیں کسی اور معاملہ
میں لمبی رقم دلوا دی اُس روز دھارا کو اپنے راستہ سے تنکے کی طرح اُٹھوا کر یا تو کالا پانی پھینک دے گا
یا سنٹرل جیل بھجوا دے گا۔ اور ایک مرتبہ جب اُس سے اور دھارا سے دو دو باتیں لاگ ڈانٹ
کی ہو چکیں تو اُس نے دھارا کو دھونس بھی دے دی تھی کہ بچہ تیرے نیچے کی ہی کھاؤ سنگھ بابو کی ایک ہی ٹکار میں
کالا پانی دکھائی پڑ جائے گا پہتے گھماتے اور جس دن داروغہ جی نے ایک دفعہ پھینک دیا اسی روز بڑے کم
جو ہرا چکے اور چکی کا پہیہ ہاتھ میں ہوگا۔ مگر دھارا تو پھر بھی اکڑتا رہا تھا اور ترچھا ترچھا کہتا چلا گیا تھا" بس
بس معلوم ہیں تیرے سنگھ بابو اور داروغہ جی دیکھا ہے!" اور اُسے دوڑ کر سب سے پہلے سنگھ بابو کے ہی
کان میں ڈالی تھی اور وہ جانتا تھا کہ ڈھیل دے رہے ہیں، باپ دادا کی طرح یہیں تو سنگھ بابو بیٹھے بٹھا کر اس
کا بیڑا پار بنا کر لاتے اور سب سے پہلے اسی سال کی سوروتی زمین نکل لی اور ساری کا پوری ہی نیتا ست ہی
کرکری کر دی

مگر آج تو سنگھ بابو کی ساری عظمتیں یکدم اُس کے اپنے اوپر آن پڑی تھیں۔ ع جن پہ تکیہ تھا وہی
پتے ہوا دینے لگے "یک نہ شد دو شد" اور دوسری بھی کیسی لاکھوں پر بھاری۔ اگر بندھیا چلکر کی چوٹی پر
رکھ دو تو ایک دفعہ کو جھک جائے اور چیتر پاپ سنگھ بابو کے الفاظ بغلی گھونسہ کی طرح نہیں تو بیکے گوے کی طرح
پڑے اور جب اُس نے اپنا مخصوص مدبرانہ سکوت پورا کر لیا تو ایک جھٹک ماری اور نہایت ہی
ناصحانہ بلکہ مربیانہ انداز میں اُن کی پچھلی خاندانی روایات کی عظمت کا حوالہ دیتے ہوئے ایسا خیال

دل میں لانے پر محتاط لفظوں میں چُن چُن کر نہایت شیریں اور پرتاثیر لہجہ میں بولتے ہوتے ملامت کی اور دیہاتی و مشرقی اخلاقیات اور روایات کا سبق یاد دلایا اور پھر خاص طور پر اُن کے جد امجد کا رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور رکھ رکھاؤ اور ماں، بہن، بیٹی کا رشتہ یاد دلایا لیکن سنگھ بابو کو تو آج بجز سیوتی کے اور کچھ یاد ہی نہ تھا اور ایسی چڑھی تھی کہ ہاں میں ہاں ملانے والی جماعت کا پیش امام چیتریا زیادہ کٹ حجتی کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا اور نہ سنگھ بابو ہی اس مسئلہ میں زیادہ بار سماعت برداشت کر سکتے تھے۔ بالآخر ہر پہلو سے احتیاط کے ساتھ ہلانے جلانے کے بعد "درویش بر جان درویش" اور سب اہم مسئلوں کی طرح اس مسئلہ میں بھی سنگھ بابو سے اُن کی مرضی کے مطابق ہاں میں ہاں ملانی پڑی اور "سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی" کا استادانہ وعدہ کر کے ہی اُٹھنا پڑا اور آج وہ سنگھ بابو کی خواب گاہ میں اپنی دنیا لٹا کر بگو کی طرح ناچتا سر اور لڑکھڑاتے پاؤں سنبھالتا اپنی چوپال میں پہنچا۔ شروع رات میں اُس کے خیالات میں گرہیں پڑتی رہیں اور پھر کھوپڑی کے اندر دماغ اُلجھے سوت کا گولہ سا بن کر رہ گیا۔ وہ سلجھانے کی کوشش کرتا رہا اور جیسے کھول کھول کر باندھتا اور باندھ باندھ کر کھولتا رہا کہ یکے بر دلیری یکے بر فریب، دھارا کو طاقت سے اور سنگھ بابو کو فریب سے اپنے راستے سے ہٹانے کا کوئی طریقہ نظر آجائے مگر اُس کا شعور زخمی تھا اور خیالات خستہ تر ہونے لگے جتنا سوچا اتنا ہی اُلجھا اور یہاں تک اُلجھن ہی پر صبر کر گیا اور جب کوئی راہ نہ پائی تو مجبوری کو شکر کا نام دے کر اور ایک پتھر سے دو چڑیاں نہ سہی ایک ہی کا سر کچلنے کا تہیہ کر کے ایک نتیجہ پر پہنچ کر مجبوراً مطمئن ہو گیا اور سیوتی کو دل سے نکال کر اور سنگھ بابو کے حق میں دست بردار ہو گیا اور اپنے پندار میں سنگھ بابو سے دھارا کا سر کچلوا کر اطمینان سے سو گیا اور اُسے تو اپنی دست برداری کے بعد اسی خیال سے اطمینان ہو گیا کہ خیر جلوا سے نہیں تو سیوتی ملے گی اس رہسیا دھارا کو بھی نہیں اور مزید اطمینان یہ ہوا کہ گاؤں کے اور معاملوں میں سنگھ بابو اب تک جتنی برداشت کرتے رہے ہیں اس معاملہ میں اس کے عشر عشیر بھی مداخلت برداشت نہ کریں گے۔ اور اس معاملہ سے تو اس کو بڑی بڑی امیدیں بندھ گئی تھیں ایک خاص چیز یہ تھی کہ چیتریا کو یقین تھا کہ دھارا اسی کی طرح سنگھ بابو کے حق میں دست برداری دے کر ہٹنے والا نہیں ہے اور اپنی سرکشی اور اکھڑ طینت کے ساتھ بھرپور مقابلہ پر آئے گا اور ظاہر ہے کہ اس کا اور سنگھ بابو کا مقابلہ خربوزہ اور چھری والا معاملہ ہے اور اب تک گاؤں کے سیاسی معاملوں میں تو وہ اس کی بیتے رہے ہیں اور ڈھیل دیتے چلے آ رہے ہیں لیکن اس معاملہ میں اگر اور کچھ نہیں تو دھارا کو بستی سے تو نکال ہی دینگے

اور کیا معلوم کہاں تک بڑے اور سنگھ بابو راجپوت رئیس ہیں، تابو یافتہ اور افسر دار، ادھر سرکار میں بھی رسوخ رکھتے ہیں ادھر یہ عالم ہے کہ علاقہ بھر کے قاتل ڈاکو ہمیشہ سے ان کے خاندان کے سامنے سر جھکاتے رہے ہیں اور آج تک آرزو کرتے ہیں کہ کبھی سنگھ بابو ان کو کوئی کام کرنے کا حکم دیں سو اگر دھارا زیادہ بر سر مقابلہ آیا تو کیا عجب کہ سنگھ بابو کی ٹھکرائت والی نس پھڑک اٹھے اور کسی کو ایک ادنیٰ سا اشارہ کر دیں تو دھارا کا پتہ کہیں مچھلیوں کے پیٹ میں یا گیدڑوں کے جبڑوں میں ملے۔ ادھر سنگھ بابو نے اپنے بچپن کے دوست جیت رام کے ان لفظوں کے تجزیہ میں رات کاٹی کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ اور اب تک قیام فارم، بیدخلی، سود، ادھیتے کے جنگل ٹیوب ویل وغیرہ کی چھوٹی بڑی الجھنوں کے سلسلہ میں انہیں جیت رام کے تدبر اور سیاسی جوڑ توڑ کے بڑے زریں تجربے ہو چکے تھے اور اس کی پچھلی کارگزاریوں کی رسیوں نظیریں یکے بعد دیگرے ان کی یاد میں تازہ ہوتی رہیں اور ان کی بعض بڑی بڑی اسکیموں کے کامیاب ہونے میں جن سے نہ صرف پورا گاؤں بلکہ دور دور تک پورے علاقہ کا بڑا حصہ متاثر ہوا تھا جو جو مرحلے جالیں جیت رام نے چلی تھیں ان کی تفاصیل دماغ میں آتی رہیں اور اس معاملہ میں بھی انہیں اس کی مدد اور فہم و فراست پر پورا پورا بھروسہ تھا لہٰذا وصل کی بھرپور امید لگا کر اخیر رات انہیں مہجور عاشق والی نیند آ ہی گئی

(۷)

سرد بوجھل رات کے پردہ کے سیاہ تانے بانے کو گرم دہکتی صبح کے تابناک سیلاب نے ٹکرا ٹکرا کر تار تار بکھیر دیا اور سنگھ بابو وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے بستر سے اٹھ کر اپنے شیریں خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے کل کی طرح آج پھر جلووں میں جا کھوئے اور آج تو کل سے بھی زیادہ نکھار تھا۔ ہر چیز پر اور خود ان کی اپنی نگاہیں بڑی رومانٹک سی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ کچھ چری چری سی پڑ رہی تھیں جیسے بچپن میں پہلی مرتبہ ہوائی بندوق ہاتھ میں لے کر فاختاؤں اور میناؤں پر نشانہ لینے کیلئے گھات کرتے وقت ہو جایا کرتی تھیں اور جیت رام کا وعدہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی" انہیں یاد آ رہا تھا اور وہ بڑے مطمئن تھے۔ ورنہ جیت رام کے آنے سے قبل وہ تو سد سکندری پھاندنے اور دیوار چین ڈھانے پر تلے ہوئے تھے لیکن جیت رام کے احساس دلانے پر روایات کچھ عزیز معلوم ہوئیں اور عزت کی بھی کوئی قیمت محسوس ہوئی جس پر پہلی ضرب تو انہوں نے اس وقت محسوس کی تھی جب وہ دل سے مجبور ہو کر جیت رام کے سامنے عریاں ہوئے اور اس سے بڑی قربانی اور سب چماروں کے سامنے پورے چمر ٹولے کے بچہ بچہ کے روبرو،

دور دور علاقہ بھر میں چھوٹے بڑے ہزاروں کاشتکاروں کی نظریں اور سینکڑوں ہم چشموں کی نگاہ
کے سامنے ننگے ہونے کو تیار رہتے۔ اور کیا کہنے سانپ بھی مرجاتے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

(۲) صبح کو چتریا کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ سنگھ بابو کی لاٹھی ٹوٹ جاتے اور سانپ بھی نہ مرے بلکے
مگر اس کی آستین کا سانپ تو مری جاتے اور شاید سنگھ بابو کی لاٹھی سے اس کی آستین کا سانپ مرنے کا
اس سے بہتر موقع نہ آیا تھا، وہ سیدھا دھارا کے پاس پہنچا، دھارا گاؤں کا بانکا تھا خارجی اور داخلی
ہر اعتبار سے بانکا ــ اور چتریا بھی بانکا کہلاتا تھا اگرچہ ظاہری و باطنی دونوں صورتوں سے وہ بانکے
سے زیادہ "بانکی" تھا، پستہ قد، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، مٹیالا مٹیالا سا رنگ اور دُھُوپ کی ماری نبیا
کی طرح پچکا ہوا چہرہ، بدن چور ــ اندر سے مضبوط اور باہر سے کمزور دکھائی پڑتا ہوا، چھوٹی چھوٹی
ذرا کنیر ڈی آنکھیں جن میں صبح شام دونوں وقت سرمہ لگایا جاتا اور سیاہی ہی سیاہی نظر پڑتی۔ ناریل سا سر
جس پر سخت آہنی تار سے بال پیچھے سے دونہائی اوپر تک باریک کٹے ہوتے اور بقیہ ایک تہائی
سامنے کو پیشانی پر چھجے کی صورت میں پڑے ہوتے اچھی طرح کڑوے تیل میں تربتر ـــــ جو بہہ بہہ کر
کنپٹیوں تک پہنچتا، اور ہاتھوں سے چہرہ پر مسل مسل کر مستقل چمک پیدا کرتا۔ کانوں میں سونے کی مُرکیاں اور
انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں چھلے کبھی کبھی چھٹے چھ ماہ سے ٹھوڑی پر دس پانچ بال نمودار ہو جاتے تو
کل چہرہ گھر چوا لیتا، مونچھوں پر نرم نرم چھدرے، چھدرے گچھے بال جیسے بازار سے ایک آنہ والی خرید کر
لگالی ہیں اور ان کے اُون میں بھی کیرا لگ گیا ہے ہاتھ میں بجائے لاٹھی کے برچھی، اظہار تکھیا گیری
میں لیسنس اسلحہ دھار دار سے مستثنیٰ ہونے کا آنریری سرٹیفکیٹ، تمام جسم پر مردکی سی سختی اور چال ڈھال
میں عورت کا سا لوچ اور نزاکت آواز میں عنوت غالب کا لہجہ اور گفتگو میں صنف نازک کے محاورے
ہر تذکرہ میں دو جملوں پیچھے ایک مرتبہ سنگھ بابو کا نام اور داروغہ جی کا لفظ تکیہ کلام سا اور اپنی تکھیا
اور گاؤں کی دزان کشتی کے ٹھیکہ کا بات بات پر حوالہ ـــــ تو پھر کیا ڈر تھا کہ چتریا نے بھی اپنے بانکپن
کا اعلان کر دیا تھا اور سمجھا نہ جاتا تو دھارا کے متوازی کہا تو جاتا ہی تھا، اور دھارا کا بانکپن بھی کب
مکمل ہوتا جو چتریا اس کا جواب نہ ہوتا، اور بانکوں بانکوں میں نوک جھونک اور کچھ نہ ہو تو زبانی ہی
چلتی رہنا بانکوں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے اور کچھ اپنے بانکپن کو رنگین بنانے کے لئے چتریا نے دھارا کی
ٹانگ ڈانٹ میں سیوتی سے آنکھ لڑائی تھی اور پھر ذرا دل بھی لگا لیا مشغلہ کے لئے جو دھارا اور سیوا
پر اور سب گاؤں پر، اور آس پاس دور دور لگنے سے سوگنا لگا ظاہر کر کے اپنے عشق و رومان کی
پبلسٹی کیا کرتا اور یوں تو مرد بچہ تھا لیکن سیوتی کے ساتھ عشق کا شدید تر اظہار عشق سے زیادہ شدید

کے ساتھ کرکے اپنے بانکپن کا بیر و بیگنڈا کرتا اور وہ خود ذرا دیر میں بیوتی سے ہاتھ دھو دھلا کر دھارا کو ہاتھ دھو بیٹھنے کا مژدہ جانفزا سنانے جا پہنچا۔ ساتھ ہی ساتھ معاملہ لو نگیں تر بنایا تاکہ اگر ہاتھ آجائے تو دھارا کی گردن بھی بیوتی کے ساتھ ساتھ سنگھ بابو کے شکنجے میں سے گئے ہاتھوں پکڑوا دے بلکہ مڑوا دے۔ اور چیتریا نے اپنی آنکھوں کے مخصوص قسم کے آڑھے ترچھے طنزیہ انداز سے شرارت کے ساتھ فاتحانہ تیوروں سے دھارا کی جانب دیکھا۔ کولہے مٹکاتا پہنچا اور ہاتھ نچا کر کہا "ایرے ری نہ تو کونہ مو کے سے چولہے میں جھونکو" اور پھر مٹک کر رہ گیا اور دھارا کے مستفسرانہ اشارہ پر کہا "راج بابو کی آنکھ چڑھ گئی وہ تیری بیوتی اودھر" اور بھنویں مٹکا کر اور گردن مٹکا کر "اب یے بھئے سنگھ کلموتے ہماری جان"

اور دھارا اُس کی آج بالکل نئی بات پر کچھ چونک سا پڑا اور وہ سنگھ بابو کو بجز اِس پہلو کے اور سب پہلوؤں سے اچھی طرح پہچانتا تھا اِس نئے انکشاف پر اُسے یقین نہ آیا اُس نے کہا "ایرے چیتر یا سنگھ بابو کو کا ہے کے لئے سنگ بیٹھت ہے ہو (ہم بھی) پہچانت ہیں سنگھ بابو کو معلوم ہے تو بڑا جانی کار ہے ہم تم نبٹیں گے"

"ارے سن رے اب تو ہم تیرے سامنے سے ہٹ گئے اب تو ہے اور سنگھ بابو — ہاتھی سے گنا لیو ہے سنبھل جا رے کلموتے"

"ارے چیتری سنگھ بہن تو تیری ٹھکرائن دیکھی ہی رہتی (سنگھ بابو کو ہر معاملہ میں ڈھال نا رے بنا ان کے یہاں سب کچھ بھتی رہوتی) سہے جیے رہی (نائے بھی ہے"

"ارے گنگا مائی (گنگا اٹھاتا ہوں) تو کل سکا رے (سویرے) دیکھ لئے باڑھا میں جتنی دیر بیوتیا گوبر گوڑا جھاڑ بڑ مار کرت ہے سنگھ بابو تیرے پیچھے بھئے رہیں اور کوئی دن مانت ہے اٹھائے لیں گے مار جھپٹا چیل کا سا ہماری نہ مانے کل آنکھ سے دیکھ لیجے"

"بس چیتری تمہاری جے (جے ہو) مکاریاں ہم بہت دیکھت رہے ساری عمر سنگھ بابو بچارے کو کا ہے کے لیے بیچ میں لگائے بات کرت ہے"

"دھارا کیسی بات کرت ہو چھوٹی گنگا کو ہماری پیٹھ ہے اور بڑی گنگا اور (طرف) ہمارو مونہہ — سنگھ بابو تو آجکل بیں پکڑ لیں گے"

"ارے چپ رہو — کیوں بکت (بکتے) ہو — بیکار میں بدنام کرت ہے (کرتا ہے) سنگھ بابو کو"

"سنگھ بابو، سنگھ بابو اَو بھیا دھارا ہم تو ہٹ گئے چھوڑ میدان، دیکھیں اَب تم کیسے بیر بکرماجیت ہو، ہاتھی میرٹھا کی ٹکر ہے تیری سنگھ بابو کی چھوٹ ہے۔"

اَور دھارا جیسے ایک کمر بائی جھٹکے سے ذرا ڈھیلا سا ہوا اور پھر تن گیا" ارے سنگھ بابو کی تو ہماری پانچ برس کی چھوٹ ہے اب جے کنھا کو جنگل نکالیں تو دیکھی جاتے گی —— ہم تو نبٹنے کیلئے آپ بیٹھیں ہیں کل نہیں آج سہی۔"

"بس دیکھ لی تمہاری سامتی —— دھارا اِن اپنے "بِنا مچھیا" (بغیر مونچھوں والے) لونڈوں کے سامنے باتیں مارو کرو —— چتری کے سامنے جے باتیں مت مارو کرو ——" اور پھر طنزیہ انداز کو اور تیز کر کے سلسلۂ کلام جاری رکھا" پھارم پر تم نے اَور تمہارے اِن بگلا بھگت گرو جی نے بہت اپاڑی، باپ دادا کی چار بیگھہ پکڑ پائے ٹھٹھے سے دے کے جھپٹے اور کنھا کو جنگل تو اجھے دور ہے لسارھ میں دیکھو وہ تو پہلے آج اس جھپٹ کو تو روک لے مٹی میں دکھائی دے گو (دکھلائی دے گا) اَو۔ کانپو رے پرلی اور اجڑھا سے تے جیسے مرھا (گھر) جہاں تیرا نال گڑا ہے" چتریا نے کہا اَور دھارا ہی کر چلا گیا۔ وہ سیوتی کی صورت شکل کی کمزوری سے خوب واقف تھا اَور اس معاملہ میں اس نے اپنے آپ کو سنگھ بابو سے بہت کمزور خیال کیا، اَور کمزور تو بڑی جلدی بدگمان ہو جاتا ہے اُس نے دو روز اپنی آنکھ سے سنگھ بابو کی محویت دیکھی اَور تیسرے روز آزمائش کے طور پر ہفتہ بھر کے لئے سیوتی کا جانا بند کرا کر اُس کی ماں کو کام بھیجنا شروع کیا اَور دو ہی روز میں شبہ یقین سے ہم آغوش ہو گیا اَور پیشتر اِس کے کہ یقین یقین سے ہم آغوش ہونے پائے سیوتی نے ہمیشہ کے لئے کوٹھی میں کام پر نہ جانے کا تہیہ کر لیا اَور ہفتہ ختم کے اندر تو وہ قیامت برپا ہوئی کہ دھارا سیوتی اَور اُس کے ماں باپ سب سنگھ بابو کے دل کے محرم ہو گئے۔

اَور چتریا نے آ کر دو لفظوں میں سیوتی کے بند ہونے سے دوسرے ہی روز سنگھ بابو کو رپورٹ شادی کہ وہ کوشش کر رہا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اَور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے مگر دھارا بھانپ گیا اَور چونکہ دھارا سیوتی کو چاہتا ہے اِس لئے اُس نے سیوتی کا آنا بند کرا کے اُس کی ماں کو کام پر بھیجا ہے۔ اَور اتنا سُنتے ہی وہ لاوا جو کئی روز سے سنگھ بابو کے سینہ میں آتشِ عشق کی صورت میں پک رہا تھا بھڑ بھڑا اُٹھا اَور اندر ہی اندر اُس کی رو اُس سیاسی آگ سے جا ملی جو پانچ سال سے اُن کے سینہ میں دھارا کی جانب سے دبی پڑی تھی۔ کڑوا کریلا اَور نیم چڑھا سیاسی اَور اقتصادی رقابت! سماجی و ذہنی رقابت! وہ آگیں مل کر اُنہیں شراب دو آتشہ سنائیتی رگ دپے میں ایک دوزخیں سنسناہٹ کارفرما ہو گئی۔

اُن کی روح میں شعلے سے بھڑک اُٹھے اور وہ آج اِس نئی آگ سے تو پہلی مرتبہ دوچار ہوتے تھے!
اور پھر چھر گونٹے کے ماحول میں، جس فضا کا وہ پشت ہا پشت سے عقاب و شاہین تھا اور جیسے اُس
کے جی میں آیا کہ اپنا بڑا انگل اُٹھا کر ایک ٹھاتیں میں فیصلہ کر دے۔ مگر سانپ بھی مر جاتے اور لاٹھی
بھی نہ ٹوٹے کی اُمید اُسے روکتی تھی۔ ورنہ ڈھیل دے کر مارنے کا تو یہاں کوئی بہانہ ہی نہ تھا اور
چتریا آنکھیں اب بھی اُمید دلا رہا تھا اور ادھر دھارا کو چڑھا رہا تھا۔ اور طرح طرح کے جملے پھینک کر اور
طنز کر کر کے سیوتی اور اس کے ماں باپ اور دھارا کو ڈرا رہا تھا۔

اور سنگھ بابو کا بچپن کا ساتھی، اُن کا پیارا ہمراز و ہمدرد بھی کچھ چتریا اور وہ آدھی آدھی رات
تک سر جوڑ کر اِس مسئلہ کو خوبصورتی کے ساتھ طے کرنے کی کوششیں کرتے۔ اور اب تک تو اُن کی
اپنی خاندانی روایات اِن سد سکندر ہی بیوتی تک پہنچنے میں حائل تھیں اور اب دھارا کی دیوار چین بھی
حائل ہو گئی اور وہ اِس گتھی کو سلجھانے میں دماغی جمناسٹکیں کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ سنگھ بابو کے
خنجروں اور تلواروں پر نئی سان دھری رہی نئی آگ بھڑک بھڑک کر اُن کے اندر اُبال کھاتی رہی اور یہاں
تک کہ اِسی پیچ و تاب میں پورا ہفتہ گزر گیا اور عشق و غصہ کا زور دا سنگھ بابو کو جوالا مکھی کی طرح پھاڑنے
پر آ گیا اور رقابت کا زہر اُن کی رگ رگ میں سانپ کی طرح بل کھانے لگا: مگر اُن کی عقل اور
چتریا کی اُمیدوں نے اُن کا دامن نہ چھوڑا تھا اگرچہ یہ ہفتہ پوری صدی سے بنتا تھا اور ایک صبح چتریا
کے مشورہ سے بنی ہوئی اسکیم کے مطابق اُنھوں نے وارغ بیل ڈالی اور برسبیل تذکرہ مویشی خانہ میں
کام کرتی ہوئی بڑھیا سے گویا یوں ہی ہفتہ بھر سے سیوتی کے نہ آنے کا سبب پوچھا۔

اور سنگھ بابو کے سوال پر کنوڑی بڑھیا کچھ اچھل سی پڑی حالانکہ وہ اِس سوال کا انتظار
کئی روز سے کر رہی تھی وہ ایک دوسرے کو جڑوں تک پہنچاتے ہوئے تھے اور جواب کے لئے ہر لمحہ
تیار تھے مگر بڑھیا کو یہ گمان نہ تھا کہ اُس سے یہ سوال بجائے مقدم تہنیت مالی موالی کے سنگھ بابو
بالمشافہ خود کریں گے اور اُسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دہی کرنی ہوگی۔ سنگھ بابو کی آواز اور
آواز سے زیادہ نوعیت سوال پر اُس کا دل دھک سے ہو گیا اور وہ بنی بنائی بات نہ بتا سکی اور نہ تو یہ
کہہ سکی کہ سیوتی کی کمر میں بوجھ اُٹھانے سے جھٹکا آ گیا ہے اور نہ بخار ہی بتا سکی اور نہ پاؤں میں
کانٹا لگ جانے ہی کا عذر لنگ پیش کر سکی۔ نگاہ تو چار کر ہی نہ سکتی تھی۔ نیچے سر جھکائے ہوئے ایک
گھونٹ سا نے کر کہنا ہی پڑا "سیوتی کا بیاہ ہے بیاکھ میں' ہوں' آں' اب ہم چار چھ مہینہ گھر
بٹھا کے کھلا یتیں راج بابو"

اور ایک جھٹکا سا " اچھا بیاہ کہاں ؟" سنگھ بابو کے مُنہ سے نکلا اور جیسے بڑھیا کی گردن موچ گئی اور پھر دھا۔ دھا۔ دھا کی مہمل سی آواز گرہ کھاتی زبان سے نکلی، جیسے یکدم لقوہ کا پہلا دورہ پڑ گیا اور سنگھ بابو نے اپنے مطلب کا لقمہ دے کر اُس کی گرہ کھولی " دھارا کے! اچھا دھارا کے ساتھ؟ خوب!" اور بڑھیا نے حلق میں سے جیسے رکی ہوئی سانس برآمد ہو گئی " ہاں، ہوں ،....... کچھ کہنے کی کوشش سی کی اور اُس کا کالا منیالا رنگ نیلا سا ہو گیا اور وہ مشکل میں پھنس گئی اور سنگھ بابو نے دوسرا لقمہ اُس سے زیادہ شیریں اور جیسے بالکل بے غرض سے انداز میں یوں ہی شغلِ گفتگو کے لئے دیا " مگر ڈوکری دھارا کو! دھارا کو کیسے کر دی گیا گاؤں کے گاؤں میں ؟ ؟ کیا تم چماروں میں بستی کے اندر بیاہت ہو جاتی ہے "

" ناہیں راج بابو بستی میں کہاں ؟ دھارا تو چھورا ہے اُس کا دادا بڑے ٹھاکر جی نے کال (قحط) میں بساؤ ' چھوٹی گنگا پار سے لائے اور جے ہمارے چمر گونٹے کا جمنیا (پیدائشی) ناہیں ہے اپنی ماں کے ساتھ آؤ باپ کے دھروٹے ہیں "

اور سنگھ بابو خوب جانتے تھے کہ منو سمرتیوں نے اس کو شودر قرار دے کر بھی اُس کے لئے ذلیل راستے ہیں اس کے اوپر برہمنوں اور راجپوتوں سے کم شدید سماجی پابندیاں عائد نہیں کیں انہوں نے گھونٹ لے کر پوچھا " اور تمہاری اور دھارا کی کڑی پیڑھی " ؟

اور جیسے چمریا کو اُن کے سوال نے ہی دھارا اور سیوتی کے بیاہ کے جواز کا سہارا دے دیا اور اُس نے سنبھلتی ہوئی آواز اور مضبوط سے لہجہ میں کہا " ہاں، راج بابو کڑی پیڑھی بارہ اور بارہ چوبیس پیڑھی دور ——— ہم ریداس، دھارا جاٹب اور بیاہت ہوت (ہوتی) ہے۔

" مگر ہم ٹھاکروں میں تو چاہیں ہزار پیڑھی دور ہوئے پھر بستی کے بستی بیاہ نت ناہیں ہوڈوکری اور کیا بامن ٹھاکر اور کیا چمار کسان بیاہت کی بات تو ایک ہے وہ بامن سالا کون سا ہوگا جو سیوتی اور دھارا کی بھونریاں ڈال دے گا " انہوں کچھ " پرکھی راج " کے سے تیوروں سے کہا۔

" بات ایسے ہوت ہے راج بابو کہ گاؤں کے دھسکر (سوانہ) باہر سر کرکے جھنڈے کے ساتھ پہلے سیوتی کی بھونریاں پڑیں (پڑے گئی) اور پھر گاؤں وھرے سے اِدھر کو ایک ہیریا سے دھارا کی بھونریاں پڑیں اور پھر اِس جھونز کی اور ہیریا کی بھونریاں آپس میں ڈال دیں اور بستی گاؤں بدل گئے اور جے رہے) تو بامن کی بات رہی اور پھر سب جانی کیا ٹھاکر کیا چمار میں چھاتی راکھت ہے اور ہم جے (یہی) سمجھ نیئں "

سب حرام کاری بامن کونسا ایسا حرامی ہے جو دھارا کو بیوتی باندھے گا' اُسے ہم دیکھنا چاہتے ہیں' دھرم ہے کہ کھیل؟ ایں۔" سنگھ بابو نے پھر کچھ پرکھتی راج پن سے کہا اور بوڑھی چمریا اُن کے بگڑے بگڑے تیور دیکھ کر تھرا گئی اور گھگھیاتی ہوئی آواز میں بولی "بھگیاں نے تمہاری سیوتیا کو بھیا ناہیں دوا اور اب دھارا تمہارے باپ دادا کی مانجھی (صفائی خدمتی) پہ کانج (قابض) ہونے کے تمہارا کام کرے گا بڑا محنتی لونڈا ہے" اور یہ کہتے ہوئے بڑھیا کے پیلے پیلے گوبر سے دانت عاجزی اور خوف سے کھل کر باہر کو آگئے اور سنگھ بابو کا جی متلا اُٹھا اور منہ نفرت سے پھر گیا۔ اور پھر دھارا کے تصور سے رونگٹے رونگٹے پر چنگاریاں چٹخ اُٹھیں۔

(۸)

اور پھر تو سنگھ بابو سا جکنورا بستر سنگھور ہے نہ سنگھ بابو نہ راج بابو' نہ زمیندار اور نہ امپورٹس میں وہ تو کچھ صفائی کے جمعدار اور کچھ داروغہ سے ہو کر رہ گئے اور ہفتہ کبھی گھر کی صفائی تو انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور جب دوسرا ہفتہ لگا تو صفائی کے متعلق اُن کے مطالبات اور جواب طلبیاں مکاں کے نوکروں کے توسل کی بھی مرہون منت نہ رہیں اور وہ بالمشافہ بڑھیا سے مطالبہ کرنے لگے اور بڑھیا نے تو نوکروں کے ٹوکنے ہی پر مویشی خانہ میں ہمیشہ سے زیادہ کام کرنا شروع کر دیا تھا جانوروں کے نیچے گوبر کھرچ کرتیائی اور پیال کا بستر بچھانا اور دو وقت صفائی شروع کر دی۔ مگر جوں جوں صفائی بڑھنے لگی سنگھ بابو کی نظروں میں گندگی بڑھتی گئی۔ "بڑھیا ٹھیک صفائی نہیں کر سکتی" انھوں نے کہا اور یہاں تک کہ بڑھیا سے صفائی کا کام لینے سے انکار کیا جس پر بوڑھا مقدم خود صفائی کی نگرانی میں ہمہ تن توجہ ہو گیا۔ پہلے بڑھیا سے جواب طلب کیا کہ جب اس کا کام سنگھ بابو کو پسند نہیں ہے تو وہ کیوں کرتی ہے۔ جس پر اُس نے عذر کیا کہ بیوتی کی شادی بیاکھ تک ہو جائے گی اور چار چھ مہینے گھر میں بٹھال کے کھلائیں گے اور یہ کہا کہ پہلے ہمیشہ سے وہ خود ہی کام کرتی رہی ہے' اِدھر دو سال سے وہ بھی جاڑوں جاڑوں سردی کے مارے اُس نے بیوتی کو کام پر بھیجنا شروع کر دیا تھا اور نہ معلوم کیوں سنگھ بابو کو اب اُس کا کام ناپسند ہونے لگا اور بھی جاڑوں میں اعتراض کیا اور برسات گرمی بھر جب صفائی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے پہلے کبھی اُس کے کام پہ کوئی اعتراض نہ کیا' بات معقول تھی' مگر اُس سے زیادہ معقول مطالبہ سنگھ بابو کا تھا کہ جب اُن کی آراسنی معافی خدمتی سے اس کا سارا گھر پلتا ہے تو جس سے اُن کا جی چاہے گا کام لیں گے اور یہ بھی کوئی بیگار تو نہیں اور بیگار میں بھی سب سے تگڑا جوان اور اچھا بیل گھر پیچھے پکڑا جاتا ہے۔ اور جب اُنہیں بیوتی ہی کا

دام پسند ہے اور وہ سارے گھر کو کھلاتے ہیں تو پھر کوئی عذر نہیں سن سکتے ۔

اور پھر مقدم نے صفائی کی نگرانی بذاتِ خود اور سب کاموں سے زیادہ توجہ دی مکان اور مویشی خانہ ایسا رہنے لگا کہ کہیں تنکا نظر آتا۔ ایک کیڑا مکھی نہ دکھائی پڑتی۔ مگر جب سنگھ بابو کی نظر میں گندگی بدستور رہی تو مقدم اور ملازم سمجھے کہ راج ہٹ قسم کی نسلی ٹھکراہٹ کے دورہ میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اگرچہ اُن کے کردار میں ساری عمر میں پہلی مرتبہ یہ جذبہ اُبھرا تھا، مگر چترپا اس سے خوب آشنا تھا دھارا سیوتی سیوتی کے ماں باپ خوب سمجھ رہے تھے اور چترپا سنگھ بابو کو پھر پورا تیار کر کے میدان میں اُتارنا چاہتا تھا۔ اُن کی آتشِ عشق کے ساتھ رقابت انتقام اور راج ہٹ سب آگیں بھڑکا کر انھیں "چو آتشہ" بنا کر، چاروں پہلو دیوانہ کر کے تاکہ جوالا مکھی پورے زور کے ساتھ پھٹ پڑے اور اُس کے دل کی بھڑاس دھارا اس متحرک آگ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کے دل کی گہرائیوں میں اب بھی کبھی کبھی اُمید کی جھلک سی پیدا ہو جاتی، اگرچہ اُس کے پورے ہونے کا کہیں دور دور بھی امکان نہ تھا تاہم وہ اِس کے لئے دونوں جانب میدان تیار کر رہا تھا کیونکہ اس معاملہ میں اس کے حق میں اُس کا ازلی دشمن دھارا اُس کے بچپن کے دوست اور آقا سنگھ بابو سے کچھ زیادہ خطرناک نہ تھا بلکہ پوزیشن کے مطابق سنگھ بابو جتنے بڑے آدمی تھے اتنے ہی بڑے دشمن تھے لہٰذا وہ کچھ ایسی باندھ رہا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے ۔۔۔۔۔۔۔

کیا عجب کہ اگر دھارا اچھی طرح ٹکرا کر فنا ہو تو سنگھ بابو کے سامنے سیوتی سے زیادہ سنگین مسائل آ جائیں۔ کون جانتا ہے کہ ردِ عمل میں کیا ہو، دھارا کا فنا ہونا یقینی ہے پھر اس کے بعد۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔۔ کیا معلوم نہ یہ رہیں نہ وہ اور اُس کے لئے میدان خالی رہ جائے اور ویسے وہ جس اقدام کی رائے سنگھ بابو کو دے رہا تھا وہ خیر چھپر کوٹنے میں تو ضرور ذرا نئی چیز تھی اور سنگھ بابو غریب ہی کیلئے گناہ اور عیب اور نہ اس دنیا میں کوئی نئی چیز نہ تھی اور چترپا نے آس پاس کے ہی ٹھاکر پٹھان جاٹ زمینداروں کی نظیریں سنا سنا کر سنگھ بابو کو سیوتی جورو سے زیادہ جائز حلال ثابت کر دی تھی اور باپ دادا کے یہاں تو کبھی کے ایسی ہوتی چلی آئی تھی۔ اور بیچارے سنگھ بابو ہی کے حق میں آج تک سیوتی ستی سیتا ہی ہوئی تھی اور اُنہیں کے یہاں باپ دادا کی نئی لکیر پٹ رہی تھی اور چترپا غریب کہیں اُس صبح کو موجود تو نہ تھا مگر چودھری، پربت سنگھ اور سب کے سب اور جو کچھ کہہ گئے تھے اُس کی بات اُنہیں کی بازگشت تھی اور پھر چترپا نے تو اپنی ماں سے لیکر گاؤں اور آس پاس کے دیہات کی ہر نئی پرانی بیاہی آئی ہوئی کے پول کھول کر سنگھ بابو کے سامنے رکھ دیے

ہے کہ بیاہ سے پہلے میکے میں کسی قابل ہونے سے پیشتر ایک ایک کتنی کتنی مرتبہ بیاہ جاتی ہے اور پھر خود ان "سیوتی کنواری" کی اماں کے تو درجن بھر واقعات! جو آج اپنی بیٹی کو پردہ میں بٹھاتے ہوئے تمھیں بالتفصیل سنائے اور پھر جو جو چمر گونٹے سے آج تک سر مہر کوری گئیں تھیں کیا وہ سسرال جا کر چماری ہی بن کر رہتی ہیں یا کسی محل کی رانی سیتی سیتا تو آج اگر ایک مرتبہ ایک جو چمر گونٹے کا زمیندار توڑ دے تو ایسی کونسی پرلو ہو جائیگی ایک دفعہ وہی نہی جو ساری دنیا میں ہوتا ہے اور نہ سہی وہ جو چمر گونٹے میں یا سنگھ بابو کے یہاں ہوتا چلا آیا ہے"!

اور بات تو چیتریا کی بہت معقول تھی مگر سنگھ بابو آٹھ آنہ بھر زمیندار تھے اور آٹھ آنہ بھر دکاندار چیتریا کے مشورہ پر اقدام سے پہلے اُنھوں نے نفع نقصان کی ترازو پر تول کر حساب لگایا تو روایات اور آن کا پلہ بھی برابر ہی رہا اور اُنھوں نے سیوتی کے باپ کے پاس چیتریا کی زبانی پیام بھیجا کہ سیوتی مستقل طور پر کام پر آیا کرے گی تو معافی خدمتی آدھی دوگنی کر دی جاتی ہے اور چیتریا نے پیام کے ساتھ یہ بھی سمجھایا کہ اتنا بڑا معافی عطیہ زمیندار اگر وہ درجن بھر دیہے کے لاٹ سے بیٹے بھی جنتا تو کبھی نصیب نہ ہو سکتا تھا جو اسے آج صرف ایک بیٹی کی بدولت مل رہا تھا اور بڈھے بڑھیا کی آنکھیں تو ایک دفعہ کو چکا چوند ہو گئی تھیں۔ مگر سیوتی تو سچ مچ سنی سیتا ہی نکلی اور نہ اسنے اپنے ماں باپ کے سوچنے کا انتظار کیا اور نہ چیتریا پیام بر کے چلے جانے کا ہی۔ بپھر گئی اور چیتریا کو جو کہیں سو کہیں اس کے نام سے ایک سے سینکڑوں سنگھ بابو تک کو سنا ڈالیں۔ سنگھ بابو کی گرانقدر پیش کش پر پوری بستی چونک پڑی اور اس سے زیادہ بھاری چمار کی ٹھوکر پر گاؤں اچھل سا پڑا اور جہاندیدہ مقدم اپنے نوجوان آقا کے متعلق عظیم عقیدہ رکھنے کے باوجود گومگو میں پڑ گیا اور اُسے شبہ ہونے لگا کہ سنگھ بابو کی بیرونی صفائی کی علت غائی میں کہیں اندرونی گندگی کی بُو تو نہیں ہے —— اُدھر چیتریا کی زبانی انکار اور پھر سیوتی کا طریقۂ انکار سُن کر سنگھ بابو بگولے کی طرح بھنا گئے اور دوسرے ہی روز حکم دے دیا کہ بڑھیا مکان کے اندر صفائی کے لئے نہ گھسنے پائے۔

اور دو روز سے صفائی نہ ہوئی تھی۔ اندر سے لیکر باہر تک سچ مچ غلاظتوں کا طوفان سا پھٹ پڑا تھا۔ کوٹھی میں انچ انچ بھر دھول چڑھی ہوئی تھی۔ مویشی خانہ میں لید، گوبر، گونٹے کرکٹ کے رکھے تھے پیشاب کا خمیر سا اُٹھ رہا تھا۔ جاڑا نہ ہوتا تو کیڑے رینج بجا جاتے، جانوروں میں وبا پھیل جاتی۔ مقدم عجیب چکنم میں گرفتار تھا حالی موالی سب گومگو میں تھے!۔

اور ان دو دن میں مقدم نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے آقا اور اس کے ندیم چیتریا کی نقل و

حرکت پر بھی کڑی نظر رکھی۔ ساتھ ہی ساتھ چمار کو سمجھا بجھا کر معاملہ دو براہ کرنا چاہا اور سنگھ بابو کی راجہٹ اور پھر جائز مطالبہ میں کسی کو کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی البتہ مقدم معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس راج ہٹ کے پس منظر میں کیا جذبہ کار فرما ہے۔ اور رات کو جب چیتریا اپنے مخصوص وقت پہ آیا تو مقدم نے نہایت احتیاط کے ساتھ پس پردہ کھڑے ہو کر سنو سے لے اور لونڈیا بھیجے کے انکار سے لیکر آراضی کی پیش کش اور چمار کی ٹھوکر اور سنگھ بابو کے رد عمل تک ہر چیز سنی جس کی وجہ آج بغیر صفائی ہوئے تیسرا روز تھا اور اس سب میں دھارا کا رول چیتریا کی کارگزاری اور بہتر دوانیاں حسن کی عشوہ طرازی اور عشق کی واردات بھی کچھ جہاندیدہ مقدم کی سمجھ میں آگیا۔ کچھ دیر سوچا اور پھر بھنا کر سیدھا چمار کے پاس چلا اور چیتریا کو وہیں سنگھ بابو کے پاس بیٹھا چھوڑ گیا۔

"کیوں؟ ہوں! اور اب یہ چمار چمریاں ہمارے راجکنور کو بگاڑ رہے ہیں!" وہ دل ہی دل میں بڑاتا سا غصہ میں بھرا سیوتی کے گھر میں پہنچ گیا اور وہ تینوں مقدم کی بے وقت آمد پر گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اور اسنے نہایت ہی فیصلہ کن اور پست و مضبوط لہجہ میں بغیر اس کی ایک بھی سنے ہوئے قطعی حکم سنا دیا کہ یا تو کل سے سیوتی کو کام پہ بھیجیں ورنہ کل ہی صبح تڑکے اُسے ننہال بھیج دیں تو پھر اس کے بعد وہ سنگھ بابو سے بڑھیا کے کام کی سفارش کر سکتے ہیں اور پھر نہایت ہی ضابطہ کے انداز میں پکڑتے ہوئے محاسبہ کیا کہ جب اسا ڑھ سے وہ معافی خدمتی جوت رہا ہے اور اس کے پیداوار کے دھان کا تک میں کاٹ کر سال بھر کھانے کے لئے گھر میں بھر لئے تو پیشگی تنخواہ پا کر اس کی اتنی جراءت کیسے ہوئی کہ آج مویشی خانہ اور مکان تین دن سے صاف نہیں کیا اور یہ سنگھ بابو تو خیر بڑی چیز ہیں کسی گرے پڑے کے ساتھ بھی کسی جودھا جوان کی آج یہ مجال ہے کہ پیشگی کھا کر کام پہ نہ جاتے۔ اور اگر سیوتی ان کا کھاتے گی تو آدھی رات جاتے گی۔ اور جب اسنے پھر وہی عذر کرنا چاہا تو ایک ہٹ غرا کے ساتھ مقدم نے اس کو روک دیا اور کہا کہ سب معلوم ہیں تیری یہ باتیں، بے ایمان کہیں کا سالے سات پشت کا کھایا اگلنا پڑے گا! ان کا نام ہے راج بابو! ان کی ہٹ سے تو ٹکر لے گا۔ اور وہ سالا نیرا دھارا وہ بھی معلوم ہے کتنے پانی میں ہے، نہ بارہیں پڑیا نہ گاؤں میں مرتیا!" وہ تو سنگھ بابو آج تک ڈھیل دیتے پڑے رہے جس روز بھی میں نے ایک آنکھ دکھا دی تو بھاگے کانپور کا ٹکٹ نہ کٹا ملے گا سالے کو کہیں یہیں گدھ گیدڑ پڑی لاش نوچتے ہوں گے۔ اور یہ گنڈے لونڈے جو اس کے ساتھ لگے ہیں ایک ایک دمچی ہو جائیں گے۔ اور تم بٹیا گیہوں کے ساتھ گھن پس جاؤ گے، یہ باپ دادا کا ٹکڑا چھن جائے گا اور گھر کھنڈ کے پھیک جائے گا" اور چمار کی زبان پھر گھگھیائی اور مقدم نے

غراہٹ نکالی اور نہایت ہی زہریلے تیوروں سے کہا "بس کہہ دیا ہم نے، تم سب سالے نمک حرام، اور یہ تمہاری لونڈیاں حرام خوریں، اب ہمارے راجکنوار کو بگاڑ دیں گی۔ جسے تم نے راجکنواری بنا کر گھر میں پردہ بٹھالا ہے، یہ ٹھکرائن چھر گوٹے میں نہیں پل سکتی، کل لونڈیا گاؤں میں نہ دیکھوں نہیں تو پکڑ کے صفائی کراؤں گا سالی سے، دیکھوں گا کیسی پردہ والی ٹھکرائن ہے........" اور ہمارے نے ان سے وعدہ کیا کہ کل نہیں تو اگلی کل صبح تڑکے وہ اسے چار چھ مہینے کے لئے ننہال بھیج دے گا اور پھر وہیں سے اس کا بیاہ ہو جائے گا۔ اور مقدم "خوبصورتی" کے ساتھ معاملہ طے کر کے چلا آیا۔ اور جب وہ برآمدہ کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو ہمارا رہا تھا۔ اتنے جتنی بات تو کچھ نہ کہا اور خون کا سا گھونٹ پی کر سیدھا چپکے سے اپنے رجوان آقا کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اور سنگھ بابو کے جتنی پلیٹ آیا اور انھوں نے ایک منٹ پہلے والے سلسلہ کلام میں کہا "مگر دیکھو بھئی جتنی، جب پکڑوانے کی ہی رائے رہی، تو پھر یہاں کیسے رکھیں گے، مفت میں وہ بھی شاید شور مچائے گی اور باہر دھاڑ، ادھر پکڑوا دیں، اور ادھر مہینہ بیس دن کے لئے چودھری صاحب کے یہاں چل دیں، ایسا ہی ہے تو میں دوسری گاڑی سے آپ چلوں، راستہ میں ہی کہیں مل جائیں گے۔ کیا؟ ہوں؟" اور بحالت کی گرم گرم تاریکی میں ان کے تصور میں اپنے بنی مون کے سے اپنے پیارے ہمراز چودھری کے یہاں کی رومانٹک مہمانداری کا سرور آ گیا جس کی پسند پر اس نے بیوی کا انتخاب کیا تھا کہ اتنے میں ایک گہری سانس لیکر مقدم آہستہ سے منکارا، اور انہوں نے گھبرا کر منہ کھولا۔ مقدم کو پتی سے گھرا یا کر بھونچکا سے رہ گئے، دو ہی تمنوں میں اپنی زبان سے اپنا کل راز، چار چھ دن پہلے دے دیا اور جیسے ایک جھٹکا سا کھا کر وہ سنبھلے "اُوہ اور مقدم پر تو کھلنی ہی تھی سب بات، آج نہیں تو کل، بھلا اونٹ کی چوری نیوڑے نیوڑے، اونہہ کیا بات ہے ابھی ظاہر ہو گئی خبر، اور مقدم، ایک نوکر ہی تو!" اور وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے جذبات پر اک آن میں قابو پا کر جیسے اس غیر متوقع صورت حال کے مقابلہ کو تیار ہو گئے۔ اور مقدم کی سب کچھ سننے کے لئے اور اس کان سن کر خاموشی سے اُس کان اڑانے کا مصمم ارادہ دل میں کر کے سنبھل گئے۔

اور بزرگ قسم کے ملازم نے اپنے محتاط قسم کے مشفقانہ دائرہ سے کسی قدر متجاوز ہو کر آج سنگھ بابو کو ان کی بیس سال کی ہوش کی عمر میں سب سے زیادہ کڑا اکڑا باپ دادا کی روایات کا حوالہ دیتے ہوئے پرانی اخلاقیات کا درس دیا جس کے اندر ان کی پرورش ہوئی تھی، ان کے جد نامدار کی کئی چشم دید حکایتیں اور بہت سی اپنے باپ سے سنی ہوئی روایتیں تمثیل میں سنائیں۔ ساتھ ہی ساتھ

گاؤں کی سیاست اور اس سے زیادہ ان کے فارم کے کاروبار پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ پھر سب سے اہم یہ تھا جب کریں کے جنگل کی اسکیم کے لئے ان کی یہ حرکت نہایت مہلک ثابت ہوگی۔ ورسب او ترغ پنچ سمجھائی کہ کتھے کے جنگل کے سلسلہ میں یوں ہی عام کاشتکاروں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور اساڑھ تک نیا سال لگتے لگتے کاشتکاروں سے اس قسم کا اندیشہ ہے کہ دیسے ہی منظم سازش کریں گے اور فارم والی سب خلیوں کے بھی زخم ان کے دیکھا دیکھی کھل گئے ہیں اور باسی کڑھی میں اُبال آنے کا اندیشہ ہے۔ اور سنگھ بابو کو مقدم کی سب باتیں جیسے ان کی آواز سننے سے پیشتر ہی سنائی پڑ گئی تھیں، اور ایک چپ سو کو ہرا تا ہے وہ سب سن کر چپ بیٹھے رہے اور حیز یا سکے درمیان وہ اسکیم بنی تھی، اس وقت سے ارادہ کئے ہوئے تھے اور انہیں نہ تو مقدم کی لمبی گفتگو میں کوئی بات نئی سنائی پڑی اور نہ گراں ہی گزری، انھیں اپنے کام سے کام، لوگ کچھ کہتے رہیں! مگر جس وقت طول اس کا طول دیتے دیتے مقدم نے رواج اور سماج کے علاوہ جیسے کچھ دھارا کی طاقت اور اثر کے پہلو سے بھی سیوتی پر دھارا کا حق مرفع ثابت کرنا چاہا تو ان کے رونگٹے رونگٹے پر دھار چنگاری بن کر چیخ اُٹھا، اور وہ تڑا تڑا کر بچھ رہ گئے "چپ رہو! مقدم ہوں!! تم مجھ کو ایک سڑے دو کوڑی کے پرا سے ڈراتے ہو! دفان ہو جاؤ میرے سامنے سے! جب سے اب تک سب نمک حرامی تم بھی سار کئے ہو! آیئگی اور آیئگی سیوتی، دھارا سالا کتنے پیچ میں ہے دیکھنا ہے، آج چھ کنٹے میں کیسی سنگھ چوہان کا بیٹا کہہ رہا ہے، سنگھ بابو گرج پڑے، مقدم نے لاڈ پیار کے انداز میں رد عمل فانہ ملتے ہوئے الفاظ منہ سے نکالنے کی کوشش کی مگر شاید آج برسوں سے لگام نہ دہ کھینچ لی تھی یا لگام ہی ایسی ڈھیلی تھی جس میں کھینچے تھمنے کی گنجائش نہ تھی اور اچھا خاصہ شائستہ گھوڑا منہ زوری پر آ گیا۔ "چپ رہو! ایک بہ تمہیں حد میں رہو اپنی قدر مت بھولو" اور اک ذرا سانس لی تو پھر مقدم نے کچھ بولنا چاہا مگر پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی آواز کلام موزوں کی شکل اختیار کرے سنگھ بابو گرج پڑے ——
"نمک حرام حرانٹ دور ہو جاؤ سامنے سے، اور سورج نکلنے سے پہلے کی تول پر پہنچ جاؤ، اور چھ مہینے پوری فصل بھر تمہاری ڈیوٹی وہیں رہے گی اسٹیشن پر۔ یاد رکھو ہولی پر بھی تمہاری منحوس صورت گاؤں میں نظر نہ آئے، بس ابھی! ——"

اور بڑے ٹھاکر جی (سنگھ بابو کے باپ) کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور بڑے راجہ جی (سنگھ بابو کے دادا) کی جھڑکیاں اور پھٹکاریں سنے ہوئے چچا تایا قسم کا برہمن اپنی عمر میں آج تیسری پشت میں جا کر اپنے راج بابو کی گالیاں سن کر مرعوب سا ہو گیا، اور وہ تو شاید نہ جاتا مگر آتنار کی شدت اور سنگھ بابو

کے بے ڈھب طور دیکھ کر عافیت اسی میں جانی اور صبح تڑکے بستر بغل میں دبا کر گنے کی توں کی نگرانی کے لئے ریلوے اسٹیشن پیچھر گونٹے سے دس میل دور چلا گیا جہاں فارم کا گنا ایک شوگر فیکٹری کے ایجنٹ کی معرفت فروخت ہوتا تھا اور روزانہ فارم سے ٹرالی اور چھکڑوں میں بھر بھر کر جایا کرتا تھا اور سنگھ بابو کا ایک معتمد آدمی پیڑن بھی مستقل وہاں نگرانی اور تول پر مامور رہتا تھا۔

(۹)

اور مقدم بے چارے اسی انجام سے دوچار ہو کر جس سے آجتک حضرت ناصح ہوتے رہے ہیں ناک کان سلامت سنے خدا کا شکر ادا کرنے لگے اور گنے کی توں پر صدا لگانے لگے کہ چلو خیریت گذری عزت گئی حرمت تو رہ گئی اور سنگھ بابو نے گالیاں دیں اور انہیں سے تیں، خیریت گذری کہ آدھی رات تھی اور نوکر چاکر حالی موالی نہ تھے جن کی نگاہوں میں اس وقار بڑے بھڈ کرتی جیسا تھا ورنہ ساری کرکری ہو جاتی، اور چنریا کے لئے میدان بالکل خالی ہو گیا۔ وہ سنگھ بابو سے ہمیشہ مشوروں میں مقدم کی کھیر پکار رہا تھا، اسے اندیشہ تھا کہ مقدم ہی ایسی ہستی ہے جو اس کی تجویزوں کے خلاف آواز اٹھاتے گا اور سنگھ بابو کو اس کے مشورہ کے مطابق اقدام کرنے سے باز رہنے کی کوشش کرے گا۔ آج سنگھ بابو نے سر سے سے مقدم کو گاؤں سے ہی اڑا دیا، چنریا کی مراد اس کی امید سے کہیں زیادہ بر آئی، آدھی صدی میں چھ مہینے کے لئے مقدم "گاؤں بدر" ہوا تھا، اور کیا ہی اچھے موقع پر۔

مگر مقدم تو بیچارہ راستہ تو ناپ گئے لیکن جاتے جاتے چمار کو راستہ بتاتے گئے تھے جس میں دھارا، بیوتی اور سیوتی کے ماں باپ چاروں کو بھی تمام رات غور کر کے تدبیر اور عافیت نظر آئی۔ ادھر دوسرے ہی روز باضابطہ طور پر نہ سہی، عملی طور پر "دستار مقدمی" چھ مہینے کے لئے چنریا کے سر، ٹھیکیدار، وزن کش، سنگھ بابو کے دوست وغیرہ وغیرہ کے سر آئی، مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے! اور قلمدان وزارت عظمیٰ سنبھالتے ہی میدان جنگ درپیش ہو گیا اور چنریا نے دوپہر تک من کن پائی کہ آج ہی رات میں بیوتی کے ماں باپ اسے ننہال بھجوانے کے بہانے دھارا کے ساتھ کہیں غائب کرا دیں گے، اور جیسے چنریا کی ٹھنڈی رگوں کا تار تار جھنجھنا اٹھا اور جو آگ سنگھ بابو کے اندر دو ہفتہ سے بھڑک رہی تھی وہ تو اس کے اندر نہ معلوم کب سے جل رہی تھی۔ بس یکدم پھوٹ پڑی، بیوتی سنگھ بابو تو جاتے، بھاڑ میں جاتے یا چولہے میں جاتے یا کہیں نہ جاتے مر جاتے مگر دھارا تو نہ جاتے! اور ابھی سنگھ بابو اور اس کی "بہ سنم می رسد" کے والے آخری پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں کم و بیش ہفتہ بھر کی دیر تھی اور وہ

تو بھی ابھی تک تھی سیوتی کے جھونپڑے سے سنگھ بابو کی کوٹھی تک کی بھی نہیں اور نہ جگر گوٹے سے چوہان نگر تک کی، وہ تو سیوتی کے جھونپڑے سے چودھری کے محل سرا تک بھی، روہیل کھنڈ سے اودھ تک کی دو چار دن کی نہیں ہفتہ دو ہفتہ کی نہیں، مہینہ دو مہینہ کی بھلا اُس کیلئے کتنے انتظامات اور پیش بندیاں درکار نہیں اور یہ ہفتہ تو سنگھ بابو نے ابھی بغیر لاٹھی ٹوٹے سانپ مارنے کے حساب میں رکھا تھا اور وہ تو سیوتی سے خیال رہے کہ پہلے تو بچارا بخشے "کو بنا رکھے تھے اور سیوتی کے باپ کو معافی خدمتی کی سب سے بڑی اور ادنیٰ ترین بخشش تھی۔ چمار کے ظرف کے مطابق، اور سیوتی کے خلاف یہ تو ... جن کی بھی کوئی قیمت نہ سمجھتے تھے اور یہ ہفتہ انہوں نے گویا سوچنے کے لیے رکھا تھا۔ چمار کی ذات کو ناپنے کے واسطے اُنھوں نے چیترپا کی زبانی دھارا کے پاس پیام بھجوایا کہ اُس کی جتنی اراضی فارم میں آگئی ہے وہ سب اور آتی اور جتنی ہی اور اُس کے نام عطیہ زمیندار کے ضمن میں معافی دوام نسلاً بعد نسلاً بطور نان کار کے لکھنے کو تیار ہیں بشرطیکہ وہ سیوتی کے خیال سے باز آجائے اور اُس پر تو وہ اُچھل کر جا پڑا اور دو کوڑی کا ننگا مزدور نان کار کے نام پر تو سیوتی سے باز آجانے کی تجویز سے بھی زیادہ چراغ پا ہوا اور اسی ترنگ میں اپنے بازو ٹھونک کر اپنا پیر زمین پر مترشح کر بیٹھا تھا کہ وہ سیوتی کو غائب کرنے والا ہے اور جس پر چیترپا نے تحقیقات کرکے پتہ نکال لیا تھا کہ آج ہی رات میں لے جائے گا اور اب چیترپا کو سیوتی کے باپ کے پاس اُس کی پرانی معافی خدمتی کے رقبہ کو دوگنا کر دینے کی بجائے چوگنا چگنا کر دینے کا لالچ لیکر جانا بھی بیکار معلوم ہوا تاہم وہ گیا اور پیشتر اس کے کہ سیوتی کا باپ کوئی جواب دے سیوتی بپھری بھری شیرنی کی طرح اُس کو لپٹ گئی۔ اور چیترپا نے سنگھ بابو کو آکر سب سنا دیا اور سنگھ بابو کو اس سودے میں اپنے لیے چوڑے رقبے بھی معلوم ہونے لگے جیسے اُن کے فارم کی، اُن کے گاؤں کی سب وسعتیں سمٹ سمٹا کر چماری کے ظرف کی تنگنائیوں میں سما گئیں۔ مگر زمین کی ملکیت کا شعور اور وہ بھی صدیوں پرانا، دماغ میں نمرودیت اور فرعونیت پیدا کرکے خدا کی تسخیر کے جہل مرکب میں گرفتار کرتا ہے اور وہ مطمئن تھے "یہ تو سیوتی تھی اپنے لمبے چوڑے رقبے اُن کے سامنے تھے اور گنتی یاد" اور یک ذلیل چمار کی ظرف کی گہرائی بھی معلوم، یہ ہفتہ نہیں تو اگلے ہفتہ کی سودے بازی میں بالآخر وہ سیوتی کی خوبصورتی اور دھارا کی مضبوطی خرید لیں گے مگر اس خبر پر تو وہ سب سٹی بھول گئے، دن دوپہر تارے نظر آگئے "آج ہی رات میں سیوتی غائب ہو جائے گی!" مگر دوسرے ہی لمحہ چیترپا نے انھیں سنبھالا، اور بدرجۂ مجبوری جب سیدھی انگلی گھی نہ نکلے تو اس کے بعد ٹیڑھی انگلیوں جو پروگرام کہیں ہفتہ بھر بعد اُن کے پیشِ نظر تھا وہ آج یکدم سامنے

آگیا اور چترپا کے یہ سمجھانے پر کہ یہ تو سب اتمامِ حجت تھی ورنہ سیوتی کو راضی سے حوالے کرنے کو
نہ اس کا باپ تیار تھا اور نہ دھارا ہی اور نہ سیوتی ہی حوالہ ہونے پر کسی بھاؤ راضی تھی۔ اور آج نہیں تو
کل انہیں یہ ہی کرنا تھا جو اس وقت درپیش ہے۔ لہٰذا آگر گزر رہے۔ ویسے یہ تھے کہ اس دوران تھوڑی بہت
اتمامِ حجت بھی ہو جاتی ادھر میدان بھی تیار کر لیتے۔ چودھری کو اطلاع دے کر جواب بھی لکھا لیتے اور کل
صورتِ حال سے مطلع کر کے کہیں ہفتہ بھر اُدھر بان سے پابدستے وگرے دست بدستے وگرے لاکر پہلی
ٹرین سے روانہ ہو جاتے . . . .

اور آج انہیں مشورہ کرتے تیسرا پہر ہو گیا۔ شام بڑھ رہی تھی اور جاڑوں کی شام سرپٹ دوڑتی
ہوئی اور معاملہ "ابھی" یا "ورنہ کبھی نہیں" ۔ اب کے وقت پہ آ لگا تھا۔ اگر ابھی نہیں پکڑی تو پھر تازیست سیوتی
کا سایہ بھی "اس گاؤں میں دکھائی نہ دے گا" یقینی امر تھا۔ سنگھ بابو کئے کو بیٹھے اور ٹھنڈے کھڑا کرتے،
خلقی طور پہ سیدھے اور شریف النفس اور پھر کالج اور کالج بھی زراعتی کالج کی تعلیم اور اس کے بعد زراعتی
کاروباری زندگی نے اُن پہ اور بھی زیادہ شکر پاشی اور برف باری کر دی تھی اور کالج کے بعد پانچ سال
کی ٹیکنیکل فارمنگ کی زندگی نے انہیں جیسے کچھ راجپوت سے جیا سا بنا دیا تھا۔ مگر تھے تو سب کر
ہی گھر یہاں پر بھی اپنے بنتے بن کی آڑ میں اپنی اصل پر بیٹھے اور کھینیٹ چوہان والی حکم دیا "سیوتی کو پکڑ لاؤ
یوں تو ایک آدھ ملازم چلا جاتا مگر کچھ سُن گن پائے ہوتے تھے لہٰذا بارہ کے بارہ جمع ہو کر بیٹھ
سکر گئے اور بوڑھے تہنیت (فارم کے مزدوروں کی نگرانی کرنے والا میٹ) کی قیادت میں گھر کے
اندر جا دھمکے چار چھریاں خوف کے سائے آواز بھی نہ نکال سکے اور بھیڑ کی طرح سیوتی پکڑ لی اور دن
دہاڑے بھیڑیے کی طرح گھسیٹ کر لے چلے اور جب ان بارہوں کا رسالہ فتح کر کے پلٹا اور گلی کے موڑ
پر پہنچا تو یکدم ایک سنگین سی دیوار سامنے پائی اور انہیں معلوم ہوا کہ راج ہٹ ہی نہیں ہوتا ہٹ بھی کوئی چیز
ہوتی ہے۔ چوری اور سینہ زوری! دھارا کی سرکردگی میں گاؤں کے بیس پچیس چھٹے پٹھوں کا غول آ کر
اس گیا۔ لڑکوں کے غول کو پختہ کار تہنیت نے مدِ مقابل دیکھ کر جیسے براہِ راست سنگھ بابو کے حلق سے
کسب آواز کی ہوئی ایک "غوں" اپنی کھچڑی مونچھوں کے گچھے میں سے نکالی مگر گیدڑوں کا غول تو اس
شیر کی بھبکی میں نہ آیا اور دوسری "وصوف" جیسے بڑے ٹھاکر جی کے گل مچھوں میں سے غتائی۔ مگر یہ
بھی مکھی کی طرح بھنبھنا کر جہاندیدہ تہنیت کے ہونٹوں پر رہ گئی اور سامنے سنگین دیوار حرکت میں
آ گئی اور جب دونوں جانب سے لاٹھیوں کے پھونکے جُڑ گئے تو بوڑھا تہنیت باپ کی سی شکل بنا کر جیسے
زمیندار اور کھیت مزدور کے درمیان میں آ گیا اور اپنی مونچھوں پر مربیانہ انداز میں نیچے کو ہاتھ پھیر پھیر

کہ اپنی لاٹھی نیچے کرتے ہزار سالہ سمجھوتہ کی تجدید سی کرنے لگا۔ ادھر کسی طرف سے چترپا بھی برآمد ہو پڑا اور اپنا کھیا گری کا عصا تھامے درمیان میں آ گیا اور شاہی برچھا بلند کرتے، اور پیشگی تنخواہ پا لینے کے بعد سنگھ بابو کے کام کو چھوڑ دینے کے متعلق قانونی مطالبہ سنانے لگا اور پھر اس سینہ زوری پر بحیثیت کھیا انہیں قائل معقول کرنے لگا۔ اور چترپا کے جواب میں دھارا کے اندر سے جیسے شیر بپھر پڑا اور پہلا لٹھ چترپا پر ہی پڑا اور پھر بیس کے بیسوں لٹھ چترپا پر جمع ہو گئے چٹ پٹ چٹا چٹ بجنے کی چٹان سونے کے بند سے آ ٹکرائی اور چترپا کا جملہ معترضہ تو چٹان کے پہلے ہی ریلے میں ٹوٹ گیا۔ اور اب لٹھ چلا اور خوب چلا۔ اور ایمانی بات یہ ہے کہ ٹھاکر کے دسوں نوکروں نے ایک گز خوب ڈٹ کر لی!۔ مگر اُجرت پر قاتل تو مل بھی جاتے مقتول مشکل سے ملا کرتا ہے۔ اور دھارا بیس تھا اور سنگھ بابو اُنیس[19] بھی نہیں ایک —— انجام وہی ہوا جو بیس کے مقابلہ پر ایک کا ہونا چاہیئے۔ میدان دھارا کے ہاتھ رہا مگر خالی!! سنگھ بابو کے حالی موالی زخمی ہو کر اور چترپا کا انجام دیکھ کر فرار تو ضرور ہو گئے تھے لیکن انجام اندیش ٹھنٹ کے اشارہ پر پہلا لٹھ بجتے ہی وہ دونوں جو سیوتی کو پکڑے ہوئے تھے پلٹ کر دوسری گلی سے سیوتی کو گھسیٹتے لے چلے گئے تھے اور اب گلی میں بجز چترپا کی سسکتی نعش کے اور کچھ نہ تھا اور اُسے مردہ چھوڑ کر دھارا بابِ عالی پر چڑھ دوڑا۔ اور جوں ہی مویشی خانہ کے پھاٹک میں دھارا کا رسالہ داخل ہوا۔ بھونچال سے آ گیا "اسپ گشتہ" اور "سگ بستہ" کام دینے کی بجائے اوچھل کر اور بھونک کر رہ گئے۔ گائے بھینسوں کا دودھ اور بیلوں کا خون خشک ہو گیا اور سب تعجب سے دیکھنے لگے کہ دھارا کو تو ٹھاکر جی اُن کے ساتھ جنگل سے رسی ڈال کر لائے تھے۔ آج یکدم اُس کی باگ ڈور کیسے کٹ گئی!! ....

سنگھ بابو کے اُن دونوں نوکروں نے جنہوں نے ابھی ابھی سیوتی کو لا کر جنس کے گودام میں بند کیا تھا چبوترے سے نیچے اتر کر باڈی گارڈ کی سی بہادری کے ساتھ سنگھ بابو کے نمک کی آخری ڈلی ادا کی اور صدیوں کی "ملہاری" کی ڈیوٹی آن کی آن میں انجام دے دی، تاریخ کے ورق دھندلے ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے، جغرافیہ قلابازیاں کھانے لگا۔ شودر کے پانچ ہزار سالہ ٹھنڈے خون کے پانچوں ہزار خوابیدہ جوش آج اُبل پڑے۔ گنگا جمنا کے سب پھاٹ سکڑ گئے اور برہم پتر کے تمام چڑھاؤ اُتر گئے۔ بحرِ ہند کا جوار بھاٹا اُلٹی گنگا بہاتا نندا دیوی کی چوٹی پر جا چڑھا۔ اور اب دھارا کے سر پھرے نوجوان چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور ایک اکیلے سنگھ بابو صحن میں تن تنہا اپنا ہائی ولاسٹی میگزین رائفل لیے تنے کھڑے تھے اور انہوں نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر دھارا کا تنا ہوا سینہ

اور ہتھیلی پہ دھرا سر دیکھا اور آج اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ تنازع للبقا کے منفی پہلو سے دوچار ہوئے،
انہیں تو ابتدائے آفرینش سے بہت سی زندگیاں ناعز کرکے ایک زندگی کو فربہ کرنے کے سب آداب
سکھائے گئے تھے اور آج نوبت یہ تھی کہ ناعز زندگیاں اپنی فربہی واپس لینے آئی تھیں۔ اور سنگھ بابو
کے اندر عشق کا سودا، دولت کا نشہ اور حکومت کا زور سب کچھ حفاظت خود اختیاری میں قلب ماہیت
ہو کر رائفل پر اتنت پہ جمع ہوگیا تھا۔ مگر آج ان کی بندوق انہیں کے کندھے پر تھی اور اس کی گرپ
(GRIP) عقل کے مضبوط پنجہ میں! ویسے بہت سے سینے چاندماری کے لئے تختہ کی طرح سامنے
تھے۔ اور اب تو ان میں کا آخیر آدمی بھی بلند نہیں بلکہ سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور پوری دیوار سامنے تھی،
اور سنگھ بابو نے آسمان کی جانب نال اٹھا کر انہیں خائف کرکے بھگانے کے لئے پہلا فیر کیا مگر ان کے
تو جیسے آواز ہی کان میں نہ گئی! اور پہلے چند گز کی بڑھتی ہوئی حرکت کے ساتھ ہی انہوں نے دوسرا فیر
ان کے سروں سے گز بھر نال اونچی کرکے کیا مگر بے سود! اور جب پٹھانوں کا جھنڈ اندھا دھند اپنے
اوپر ہی کو چلتا دیکھا تو تیسرا ایک اور "ٹھس ایں آں ں ں ..... " بین ان کی کنپٹیوں پر سے موت کا طمانچہ
سناتا! مگر جیسے آج ان کے کان سماعت سے بے بہرہ تھے اور گولی کی سنسناہٹ صدا بصحرا ہوگئی،
وہ اندھے بہرے اور گونگے بس ROBUT کی طرح پرا باندھے بڑھ رہے تھے۔ ہاتھی اور
شیر تو پچھاڑنے والی گولیوں کی تاثیر سے بے نیاز!! ہر حرکت پر ایک "غوں" نکالتے آگے ہی کو!
—— اور تیسرے فیر کی SHAM FIGHT کے بعد ان کی رائفل کی میگزین میں چوتھا اور
پانچواں کارتوس باقی تھا اور دھارا کی گنتی ایک دھارا سے "بیس دھاراؤں" تک تھی۔

سنگھ بابو کا ہاتھ شل ہوگیا اور عقل کا پنجہ شدید تر! آخیر دو کارتوسوں کی خارا شگاف گولیوں سے
بڑھتی ہوئی لہر کی دو دھاریں کاٹنے کے بعد سنگھ بابو کو اپنی زندگی کی دھار اکٹی نظر آئی تو رائفل نیچا
کرکے انہوں نے ادھر ادھر نظر کی مگر وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ شاید اپنے دائیں بائیں کی خلا سے مشورہ
کیا اور شاہ شطرنج کشت بچاتا ہوا ایک گھر پیچھے کو چلا! اور گھر کے پچھواڑے والا دروازہ کھول کر سنگھ بابو
رائفل تھامے فرار ہوگئے، بیوی حکومت دولت ہر چیز کو چھوڑ کر صرف جان لیکر! اور پانچ ہزار سال بعد
شکست کھا کر اسی جنگل میں پناہ لی جس میں سے دھارا کو تسخیر کرکے لائے تھے اور دھارا نے تاریخ کی
سادہ کتاب کے اول ورق پر پہلے نئے باب کا عنوان ڈالا۔ اور "دھارا" لکھا۔

(۱۰)

اور بان لے کر بھاگے خرگوش کا خونخوار گرے ہاؤنڈ جبڑے کھولے باغ کے کنجوں اور گنے

کے کھیتوں میں اوچھل اوچھل کر غزا اگر دج لگاتے بوکھلائے سے پھرتے رہتے اور گو ہائے رقبہ ہیں، ودھم سا مچا ہوا تھا اور سنگھ بابو اپنے فارم کے سب گھنے قطعہ کے بیچوں بیچ گنے کے ایک بڑے جھنڈ میں رم دیدہ خرگوش کی طرح دبکے ہوئے تھے، جہاں اچھے بھلے آدمی کا بھی دن دہاڑے دم گھٹے اور جب کوئی بوکھلایا ہوا چمار جیسے سونگھ سونگھ کر تلاش کرتا ہوا اُن کے کھس پاتیج گزادھر اُدھر گزرتا تو وہ بیچ بیچ اتاڑے خرگوش کی طرح جھنڈ میں گم ہو کر رہ جاتے اور جب تک وہ اس کی زد سے باہر نہ ہو جاتے سیف چڑھاتے بالکل مارنے مرنے پر تلے رہتے۔ عاجز بلی کی طرح جو پلنگ کی آنکھ نکال لیتی ہے اور دو گولی!۔ اور بس یا اب نہ معلوم کتنے شاید سارا جھرگوشا۔ کیونکہ گاؤں کے اندر مدد تو درکنار کسی نے بیچ بچاؤ تک نہ کیا ورنہ شاید یہ نوبت نہ پہنچی اور وہ جانتے تھے کہ گاؤں کا کیا رنگ ہے بہت سے تو کھیتے کے جنگل کے فکر فراد میں مبتلا ہیں اور سب کے سب میکینیکل فارم کے غم ددش میں ماتم کناں، اور باقی نان شبینہ کے چکر میں نالاں! ———

بس لے دے کے ایک چیتر یا بیچارہ پُرخلوص! سو اُس نے نوکروں سے بھی پہلی طرف حق نمک وحق دوستی نبھا دیا اور قربان ہو گیا۔ اور اُنہوں نے اپنی اِس پناہ گاہ میں بیٹھے بیٹھے اندازہ کر لیا کہ اُن کے مکان کے اندر سے سیوتی کے ساتھ کل اثاث بیت بھی گیا، اور آج قانون دھارا کے ہاتھ میں ہے اور اگر ہاتھ آ جائے تو اُن کی جان بھی باوجود ہائی ولائتی رائفل ہاتھ میں ہونے کے!! ———

اور اُنہوں نے غور کیا کہ اب اُن کے مکان پر شور ذرا کم ہے اور بستی میں ادھر جانب، یا وہ اور اُنہوں نے ہر شور کو خوب پہچانا اور وہیں دبکے دبکے سمت کا اندازہ لگا کر سمجھتے رہے کہ کون کون سے نوکر کا گھر لوٹا جا رہا ہے اور پھر اُنہیں چیتر یا کے گھر کی جانب سے لوٹ مار کی آوازیں سنائی دیں اور وہ سب کچھ اِس تاریک کنج میں بیٹھے اِس طرح سمجھ رہے تھے جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور لطف یہ کہ اِدھر جنگل میں اُن کی بھی تلاش بدستور جاری تھی گھڑی بھر کے لئے اِک ذرا سکون سا ہوا۔ اور پھر ایک مرتبہ جیسے بستی کے باہر چاروں طرف سے آندھیاں سنسنا پڑیں۔ وہ شکاری تھے اور شکاری کے حواس خمسہ یوں بھی ذکی الحس ہوتے ہیں اور اِس وقت رونگٹا رونگٹا کان بنا ہوا تھا اور بہت وقتِ نظر کے ساتھ ہر آواز کا تجزیہ کر رہا تھا اور پھر بڑے زور سے فارم کی ایکھوں کا پورا رقبہ کھڑا کھڑا اُٹھا اور وہ سمجھ گئے کہ اِرد گرد کے گاؤں کے کسان مزدور یلغار کر رہے ہیں اور بستی کے باہر اور اندر بڑے زور سے "کھیتے کا جنگل نہیں لگے گا" کا نعرہ گونجا اور وہ سمجھ گئے کہ کھیتے کے جنگل کی بارود میں سیوتی فلیتہ بن گئی اور یہاں تو اپنی جان کے لالے تھے اور کھیتے کا جنگل تو اُنہیں اُن

کے نعروں پر یاد آیا اور انھیں کیوں کھڑ کھڑا رہی ہیں؟ اور وہ خوب سمٹ کر دبک گئے - خیریت نہیں اور پھر اُنھوں نے اپنے فارم کے حدود پر نعرے سُنے "اپنی زمین پھر لیں گے" اور اُنھیں پتہ چلا کہ پانچ چھ سال کی سیلی ہوئی فارم کی بارود بھی سیوتی کے قلیتہ نے بھڑکا دی۔ اور پھر اُنھوں نے اپنے فارم کی حد پر اپنے فارم کا تار کا جنگلہ ٹوٹنے کی کھٹ پٹ سُنی اور اب رات ہو گئی تھی اور وہ بک بک سنتے اور پرانے زخمی کسان کی آواز پہچان رہے تھے -

سنگھ بابو سائنٹیفک قسم کا فارمر تھا اور اپنے قبضہ اور ملکیت کی حقیقت کو خوب پہچانتا تھا اور اُس کے انجام سے با خبر بھی تھا مگر اتنی جلدی نہیں لہٰذا کم سے کم اپنے جاگیردارانہ نظام کی عمر آدھی صدی تو سمجھتا تھا۔ مگر یہ سیوتی کا بھوت ایسے اژدھا کم بخت بھڑک رہا اور اس وقت تو اُسے کچھ بھی یاد نہ تھا سیوتی فارم، کتھے کا جنگل اس کی جان بادھتی اور اُسے آواز دل سے اندازہ کیا کہ چمر گونٹے اور ارد گرد کے مواضعات کے صرف چمار ہی نہیں کوری، نائی، دھنے، جولاہے، کنگی کہار سبھی اس جو میں چلے آ رہے ہیں ٹڈی دل کی طرح! جیسے آج اپنے پنچ پن اور غریبی میں وہ ایک دوسرے کے سگے بھائی ہیں اور چمر گونٹے والے بیدخل شدہ ذخیل کاروں اور موروثیوں کو اُن کی زمینیں واپس دلانے آ رہے ہیں اور خود اُس کی اپنی اراضیات سیر و خود کاشت کا رقبہ کھیت مزدوروں میں بانٹ کر برابر کرنے کو جمع ہو رہے ہیں -

فارم ہڑپ کر لیا، کتھے کے جنگل کی سائٹ ہڑپ کر لی، بستی ہڑپ کر لی اور تم تاریک رات نے سب کچھ ہڑپ کر لیا اور سنگھ بابو نے اندازہ کر لیا کہ فارم کی سب دروں کا جنگلہ توڑ دیا کتھے کے جنگل کی سائٹ پر سے کھنٹیاں اکھیڑ دیں، بستی کے اندر اس کا اور اس کے حالی موالیوں کا ہر مکان لوٹ لیا اور اس تم تاریک منجمد رات میں اب تک سیوتی بھڑک رہی ہے؛ جگہ جگہ آدمیوں کے کھانسنے اور مٹھارنے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ فاتح فوج کی پہلی رات کے انتظام کی طرح پہرہ ہے۔ ناکے ناکے پر آدمی لگے ہوئے تھے اور اب آس پاس کے گاؤں کے علاوہ دور دور سے دھاڑ کی پکار کی زنجیر کا تسلسل مل تھا اور آدھی رات تک وہ چار چار چھ چھ کوس تک جانی آوازیں سنتے رہے عظیم بغاوت! شدید ایجی ٹیشن! اُنھوں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سُن ہی جو لیا اور وہ تو سب کی سُن رہے تھے اور پہلے تو یہاں سے جان بیکر جا رہی ہر منٹ مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر یہ سارے جہان کی دشمنی کا تو اُن کے پاس جواب ہی نہ تھا اُن کے لئے تو چمر گونٹے کی یک جہتی ہی کافی سے زیادہ مہلک ہو سکتی تھی وہ پرانے زمیندار تھے اور اپنی زمینداری پر نازاں۔ مگر وہ قبضہ کی بھیڑ

جیسی بنیادوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور ساتھ ہی اس قبضۂ غاصبانہ کی اہمیت سے بھی واقف
تھے جو اس وقت یہ دیہاتی کر رہے تھے پہلے تو وہ اس کی قانونی صورت سے بھی واقف تھے۔
اس وقت باغی اور غاصب بظاہر قانون اپنے ہاتھ میں لے کر رہے تھے اور پھر اگر دوبارہ کسی طرح
قبضہ واپس بھی لے لیں تو اسے برقرار رکھنا ان بیچارے اکیلے کا کام نہ تھا اور پھر قانون علاج تو نہیں
ہو سکتا، اور آج تو سیوتی لینڈ ایکوزیشن، سود بقایا لگان، بیگار، رقم سودائی آبپاشی شرح مزدوری [illegible]
ملکیت خود اپنی جان سب کے سب ان کے اوپر ایک برابر کے تہمت تھے اور نہ جانے سیوتی کی آستین
نہ معلوم کتنی سپولیاں نکل کر سامنے آگئی تھیں۔ اور وہ سمجھ گئے کہ صبح آفتاب حشر طلوع کرے گی
اور زندہ رہنے کی کیا شکل تھی! اور رات خیریت سے کٹ جائے تو صبح کیا جواب تھا جب ایکھ
کے گھنے کھیت کا کونا کونا جگمگا اٹھے گا۔ تو پھر دو کھوپڑیاں اپنے خارا شگاف رائفل کی آخری گولیوں
سے پاش پاش کر کے انہیں خود پاش پاش ہو جانا پڑے گا اور ان کی ہڈیوں کے ساتھ ان کے قتل
کے امریکن فولادی بھی کیل کیل بکھر جائے گی! اور پھر کب ہو گا کچھ معلوم اور نہیں کہ [illegible]
محکمۂ مال کی دادرسی میں قبضہ تو کیا پولیس کو یہاں پر ان کے قتل کا ثبوت بھی فراہم نہ کر سکے گا! اور
شاید ان کی لاش بھی برآمد نہ کر سکے اور بجز اس کے کہ اس کے دوست عزیز لاٹ صاحب کو
تار دیدیں۔ پولیس کو مفت میں پریشان کریں اور یہاں سے تو قتل اور لوٹ کے مقدمہ کے گواہ ثبوت
میں ایک چڑیا کو بھی پیش نہ کر سکیں گے۔ نہ صرف رحیم گوٹھ سے چار چار چھ چھ کوس چاروں طرف سے
انہیں گواہ نہ ملے گا۔ البتہ پولیس لائن سے جوان آئیں گے اور سول لائن سے عہدہ دار اور اس کی
شکست کا قانونی انجام کر کے چلے جائیں گے اور اس کے ورثا کے نام فارم کی آراضی میں کاغذی
اندراج کر جائیں گے۔

مگر قبضہ کون لے گا اور کیسے برقرار رکھے گا اس ٹڈی دل کے مقابلہ پر، یہ دسترخوان کی
مکھیوں کی طرح اک ذرا بھنکیں اور پھر وہیں دار دیہ تو اگر خود بھی بچ کر نکل جاتے تو اب اس کے بس
کا روگ نہیں معلوم ہوتا، خیر نوکر تو کہیں اور سے بھی مل جائیں گے مگر روزانہ کا مزدور رحیم گوٹھ تو
درکنار آس پاس بھی نہ ملے گا اور پھر سب لوازمات — ؟!

اور کالی رات بھرپور ڈوب گئی اخیر شب کی اوس میں گنے کے سرسبز پتے زیادہ کنار دار
اور بوجھل ہو کر اوپر جھک گئے اور پوری مجرم پوشی کرنے لگے اور پھر جیسے اس کی بیکسی پر آنسو ٹپکانے
لگے اور آج ہزار سالہ زمینداری سے لیکر پنچایتی فارم تک اور اگلے پنچایتی کھیتی تک۔

ماضی حال مستقبل ہر چیز گنّے کے اس جھنڈ کے تلے سمٹ سمٹا کر جمع ہو گئی تھی جس میں وہ چوہے
کی طرح اپنی جان سمیٹے بیٹھے تھے۔ چندی چندی آنکھوں اور دبی دبی سانسوں میں دسمبر کی پہاڑی رات
آدھی سے زیادہ کٹ گئی اور رات کا مزاج بدلا، کہرے اور اس کی کیفیت بدلی، رُک رُک کر تیکھی
پچھوا ہوا کے تیر چلنا شروع ہوئے اور سنگھ بابو کو گنّے کے پتوں کا ہر کھٹکا ایک قاتل کی صورت سر
پر چڑھتا سنائی دینے لگا اور وہ صفدر ایک موٹی قمیص میں یخ بستہ رات اس سے زیادہ بھڑک کے
ساتھ گذار گئے جیسے دھڑیوں روئی اور ان میں لپٹ کر اپنی خواب گاہ کے اندر گذارا کرتے تھے۔
کائنات طلسم زمہریر بن گئی، مگر جیسے وہ تو سرسم سے بے نیاز تھے گویا برانڈی کا ایک بڑا پیگ لگا کے
ماحول سے بے حس۔ اور تمام شب گذری دھندے آسمان پہ صبح صادق کی نشانیاں نمودار ہوئیں، مکدر
فضائے بسیط میں نور کے آثار نظر آتے اور آسمان کی بلندیوں میں مشرق سے مغرب تک روشنی کا
ایک خط سا بنتا چلا گیا۔ انہوں نے بار بار اپنی گھڑی کے چمکتے ہوئے ہندسے پڑھے اور گھڑی تو انہوں
نے بارہ کے بعد ہی بار بار دیکھنا شروع کر دی تھی، جیسے سوئیوں کی حرکت اپنی رفتار کے ساتھ انہیں
موت کی منزل کی جانب لئے جا رہی ہے۔ اور موت بھی انچ انچ پر نہیں ملی میٹر کے ناپ پر
بھی نہیں ننھی منی سیکنڈ کی سوئی کی رفتار ان کے گرد گھومتی اور سیکنڈ کی سوئی کے ساٹھ کے ہندسے
پر ان کی آنکھ خود سے بند ہو جاتیں جب ناچتے ناچتے یہ منی سی سوئی ہوئی چمکدار دنیا میں ناچنے لگے
گی، جب آسمان سے زمین تک دنیا کا کونا کونا جگمگا اٹھے گا، جمر گونٹے کا چپہ چپہ بہک کر بھڑک
اٹھے گا۔ ایکھ کے کھیت کے گوشے گوشے میں روشنی ہو جائے گی اور اپنی نوعیت کی پہلی صبح
طلوع ہوگی ماگھ پوس کی اوس اور کہر کی سیاہیوں کا پردہ تار تار ہو جائے گا نورات کی تاریکی سے
سورج کی کرن ہر مجرم کو روز روشن کی طرح پیش کر دے گی۔

اور انہوں نے چھوٹی سوئی کی پیہم گردش سے گھبرا کر بار بار تنظرطے کر لینے کے حبیب عمل
پر کامنی نگاہ ڈالی اور پھر مڑی سوئیوں کو دیکھا جیسے اپنی مخصوص رفتار سے ان کی جانب بڑھتے ہوئے
زہریلے تیر کے دو پیکاں! چھ! اور بس سات اور پھر سات آٹھ کے درمیان! سب کچھ! انہوں
نے ایک گہرا سانس چھوڑا، برف آلود پچھوا ہوا کے جھونکوں سے بھی زیادہ سرد، اور بڑی احتیاط
سے اپنے منجمد پہلو کو ڈبکے ہی ڈبکے بدلا اور پھر بڑی ہمت کرکے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی ——
اور زمین سے لیکر آسمان تک سرد و نم مکدر فضا میں روشنی کے تیروں میں الجھے ہوئے کہر کے
کالے بھورے پردے زیر و زبر دیکھے اور بس! انہیں تابناک تیروں میں ایک پیکاں ان کی فضا کا

کا ہوگا اور اُنھوں نے خیال کیا یہ گنے کا جھنڈ اُن کی وقتی پناہ گاہ ہو سکتا تھا اور اُسے تو حق ادا کر دیا، جمِ گونتے نے پناہ نہ دی اُن کی کوٹھی کے چبوترے اور بلند دیواروں نے پناہ نہ دی، فیوڈ کوڑ نہ ڈھک سکے۔ ہائی ولاسٹی رائفل کے پہلو میں نہ تپ سکے اور اُسنے تو اپنے پھونس میں چھپا کر گھڑی دو گھڑی نہیں ساری رات پناہ دے دی! اور اب یہ زندگی کا قلعہ تو نہیں ہو سکتا۔ نیا دن اس ہرے پھونس کے قلعے کا بھی نقاب اُٹھائے گا اور یہاں سے تو نکلنا ہی ہے خواہ چوہے دان کے چوہے کی طرح گھسٹ کر یا پھر اپنے پاؤں" اور جب موت یقینی ٹھہری یہاں بیٹھے ہی بیٹھے مر کر کیوں رہ جاؤں، کیوں نہ چند ڈگیں بھر کر مروں؟؟ راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں چند آخیر ڈگیں! اور اُنھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ خاموشی سے سیفٹ چڑھائے رائفل تانے باہر آجائیں اور پہرہ داروں میں سے دو کو نشانہ بنا کر فرار ہونے کی کوشش کریں۔ حالانکہ اُنہیں فرار ہونے میں چار چار چھ چھ کوس دور کی سوجھ رہی تھی اور راہ دکھائی نہ دیتی تھی تاہم ہرچہ بادا باد بجز اس کے کوئی مفر بھی نہ تھا کہ آوازوں سے تمام رات چاروں طرف جس دشمن جان بائی علاقہ کا اُنھوں نے اندازہ کیا ہے اُسی میں سے فرار کے لئے کسی سمت کا انتخاب کریں۔ اُنھوں نے پھر گھڑی دیکھی اور گھبرا کر گہرا سانس لیا، لیٹ ہو رہا ہوں میں اور زندگی کی ٹرین چھوٹی جا رہی ہے، اپنا رائفل سنبھالا کچ زدہ، مردے سے زیادہ سرد، جس سے وہ دسیوں آدم خور شیر پچھاڑ چکے تھے آج اپنے قادر انداز مالک کی جان بچانے سے منکر تھا! ٹھنڈا لوہا اور دو ٹھنڈی گولوں کے بعد تو بالکل ہی مردہ، پھنکی سے بدتر!! اور وہ بغیر کسی پہلو پر غور کئے موت اور زیست کے دوراہے کی جانب بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک شیریں سی دردناک کپکپاتی نسائی آواز کہیں قریب ہی سے اُن کے کان میں پڑی اور وہ بحس وحرکت جیسے اس جھنڈ میں حلول کر گئے اور سانس روک کر جتنا دبک سکتے تھے دبک گئے۔ مگر آواز نامانوس تھی " جیا جیا سیو اب چلو جنگل جھاڑ دہو گئے گو " (بہن بہن اب چلو رفع حاجت سے فارغ ہو لئے) اور ڈرے ڈرے کانپتے لہجہ میں اُس کی بار بار تکرار ہوئی اور انھوں نے بڑی ذکی الحسی کے ساتھ کان لگایا جانی پہچانی بچپن سے آج تک کی ہزار بار کی سنی آواز! یہاں سے وہاں تک پوری کھیت کی منڈیر منڈیر پر پورب پچھم اور پچھم سے چلتے ہوئے آہستہ آہستہ کوئی عورت نکال رہی ہے اور مسلسل کھاتے جا رہی ہے اور برابر ادھر سے اُدھر آ جا رہی ہے کبھی اس سے ذرا دور ہو جاتی ہے اور پھر بالکل قریب سنائی دیتی ہے۔ جیا جیا اب چلو جنگل جھاڑ دہو گئے گو۔ اور سنگھ بابو کے دماغ میں یکایک روشنی ہو گئی اور یاد آگیا کہ یہ قطعہ ہر صبح عورتوں کی رفع حاجت

کے لئے گاؤں کے قدیم رواج کے مطابق مخصوص ہے اور عورتیں رفع حاجت کے لئے آنا شروع ہو
گئیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت گاؤں کے پرانے قاعدے کے مطابق اس کے اندر کوئی
مرد نہیں رہ سکتا مگر کیا آج کی صبح بھی اُنہی قاعدہ کی پابندی کریں گے کہ یہ قطعہ خالی کر جائیں، اور آواز
تو برابر اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر لپک رہی تھی اُن کی بچپن کے کھلائی "آیا" کی رونی کھرکھراتی
آواز چیتریا کی ماں جس کی گود میں وہ جھرگونٹے آکر تین چار سال کی عمر میں کھیلا کرتے تھے اور جو چیتریا کو
اُٹھا کر اُنہیں گود میں اُٹھایا کرتی تھی یہ آواز نکائی کھیت کی منڈیر منڈیر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر
پھر رہی تھی اور وہ آہستہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ بیٹھے ہی بیٹھے کھسکے اور بڑی سبک رفتاری سے
حتی الوسع پتوں کو کھٹکا پیدا کئے بغیر کیڑے کی طرح رینگ کر منڈیر تک پہنچ گئے اور منڈیر کے قریب
والے جھاڑ میں دبک گئے اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ وہ بالکل تنہا ہے اور تنہا پکار رہی [illegible]
میں اُنہیں کو پکار پکار کر تلاش کرتی پھرتی ہے۔ اور جوں ہی وہ اُن کے محاذ میں آئی اُنہوں نے آہستہ
سے کہا "پہچان لیا اور آہستہ سے کہا "آیا" اور رائفل تانے باہر آ گئے اور عورت نے اُن کے کان
کے قریب منہ لا کر اپنی کانپتی ہوئی آواز کو سنبھالتے ہوئے بتایا کہ چیتریا کو مرا سمجھ کر چھوڑ آئے تھے اور دو
گھنٹے تک نوکری کی گلی میں سے بھی اُٹھا کر نہ لایا۔ تمام رات اُس کا جواب بند رہا اور سسکتا رہا۔ صبح
ہوتے آنکھ ذرا کھلی تو اُسے بھیجا کہ خبر لے آ۔ چونکہ یہ عجب بدمعاش اس وقت عورتوں جنگل جھاڑنے
کے لئے خالی کر گئے بس ذرا دیر کے لئے تو آئی اور چیتریا کا یہ پیام سنا دیا کہ تھانہ میں جا کر رپٹ دیں
اُن کا مکان اُن کے سب نوکروں کے گھر اور چیتریا کا گھر لوٹ لیا۔ گھوڑی اور بیل مویشی خانے کھول
کر لے گئے اور تمام رات دور دور تک خبر پہنچا کر آدمی جمع کرنے کے لئے چڑھے چڑھے پھرتے رہے
اور فارم کے تار توڑ دیئے اور اپنی اپنی زمین پر قبضہ کر لیا۔ کتھے کے جنگل کی پیمائش کی کھنٹیاں اکھیڑ دیں
اور دھارا ساری رات گھوڑی پر گاؤں گاؤں بھاگا پھرا ہے۔ جھرگونٹے میں کوئی ایسا نہیں جو چیتریا
کو شفاخانہ پہنچا دے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے ہیں اور سر پھوڑ دیا ہے اور اُنہیں (سنگھ بابو)
کو جان سے مار ڈالنے کی صلاح کر چلے ہیں اور اس وقت موقع اچھا ہے وہ نکل جائیں اور سیدھے
تھانے جا کر رپٹ دیں۔ سب کچھ سُن کر اور بہت کچھ سمجھ کر سنگھ بابو ذرا تن کر کھڑے ہوئے اور اِدھر
اُدھر گردن موڑی جیسے مشورہ کے لئے کوئی تلاش ــــ چیتریا مقدم۔۔ مگر کتھے کے چلتے ستونوں
کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ انھوں نے تھانہ کی سمت دیکھا اور پانچ میل تک اُنہیں کتھے ہی کے بھوت
نظر آئے اور کتھے ہی کے بھوتوں کی رہنمائی میں اپنے اس بھوت سے وجود کو لے کر چل پڑنے

میں غنیمت جانتے۔ مگر وہ کھٹکے! اور مانا کہ یہ مخصوص قطعہ اس وقت ان کی تقدیر سے مردوں سے
خالی ہے اور عورتیں بھی ابھی زیادہ آنے نہیں پائی ہیں مگر آگے چل کر راستہ بھر پانچ میل تک لیے لیے
نہ معلوم کتنے تھلے مردوں سے بھرے ملیں گے اور دور دور تک میدان میں ہر مرد انہیں اپنے ٹھنڈے
خون کا پیاسا نظر آرہا تھا اور کچھ دور چلا تو یہ کمبخت کے بھوت کم بخت بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے اور
وہ کھلے میدان دھوپ میں دو دوسرے چمک جائیں گے اور مفرور ملزم کو وہاں تو اتنی بھی آڑ نہ ہوگی
جتنی رکنے کے جھنڈ میں تھی جس نے تمام رات قلعہ بن کر ان کو پناہ دی تھی۔ اور بڑھیا نے جلدی کرنے
کا تقاضہ کیا اور انہوں نے ایک گھونٹ سا لیکر بڑھیا کی طرف دیکھا اور پھر ذرا رکتی ہوئی آواز میں کہا
"آپا اپنی اوڑھنی مجھے اتار دو" اور بڑھیا ذرا جھجکی کچھ متعجب ہوئی اور پھر ان کے حفظ ماتقدم کو
سمجھ کر اوڑھنی اتار کر حوالہ کردی اور پھر کہا "جاؤ بس کھیت نکل جیو جنگلہ سامنے ہے ہم کو توڑ دو سے
راستہ! اور سنگھ بابو نے نہایت اہتمام کے ساتھ بیٹھ پر انفل ٹانگ اور سر سے پاؤں تک خوب اپنی طرح
اوڑھنی لی، جوتے اتار کے وہیں چھوڑے اور تھانے کی سمت کا رخ کیے اس حلیہ سے جیسے کوئی
عورت بیٹھ پر بچہ لادے چلی جا رہی ہے چل پڑے۔ اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ کہاں سے۔ اور کس وقت
وہ اپنے کھیلے تار کے فارم سے ہو دوسرے پار ہو گئے جس کے اندر بجز مخصوص کبوتر کے اور کہیں سے
نکلنا ممکن تھا۔ اور وہ قدم قدم آگے بڑھتے جا رہے تھے جان کے خطرے کے احساس سے رفتہ
رفتہ آزاد ہو کر مستقبل کا سد باب اور مفصلات سوال و تفتیش کی ترکیبیں سوچتے جا رہے تھے۔ اور
جیسے تو حصول ہی نا ممکن سا نظر آتا تھا۔ اور ...... اور جوں جوں تھانے کے قریب ہوتے
جا رہے تھے۔ رپورٹ اول کا مسودہ دماغ کے اندر مرتب کرنے کی جد و جہد کر رہے تھے جس کے
ذریعہ وہ اپنی گئی ہوئی آراضیات واپس لے سکیں۔ اپنے نوکروں کو پیٹنے والوں اپنے اوپر حملہ کرنے
والے مجرموں اور چند پاکے قاتلوں اور اپنے فارم کے غاصبوں کو سزا دلا سکیں۔ مگر رپورٹ اول کے
پہلے نمبر کے بعد دوسرے خانہ کی خانہ پری انہیں اپنے بس کا روگ نہ معلوم ہوتی تھی اور تیسرا
تو بالکل ہی خالی نظر آتا تھا۔ وہ مدعی تھے اور خیر یہاں تک تو مع ولدیت انہیں معلوم تھا مگر گواہ
کے خانہ پری کے لیے انہیں ایک نام بھی یاد نہ تھا۔ ساری دنیا تو مدعا علیہ تھی اور وہ تنہا البتہ تھے۔
عینی شاہد کہاں سے پیدا ہوتا۔

یکے از الف لیلہ

ضمیرالدین احمد

ایک اور رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور اب آرک لائٹ کی زد میں صرف گٹار بجانے والا رہ گیا تھا۔ پستہ قد۔ تنگ پیشانی۔ پھولی سی ناک۔ چوڑے شانے۔ پتلون گویا غلاف۔ ٹائی کی جگہ اسکارف۔ اور جیکٹ کی جگہ واسکٹ۔ وہ جھوم جھوم کر گٹار بجا رہا تھا۔ اور اس کی انگلیاں گٹار کے تاروں پر اس تیزی سے منڈلا رہی تھیں کہ ان پر نظر ٹکنا مشکل تھا۔ وہ گٹار بجاتے بجاتے کبھی آگے کی طرف آ جاتا اور کبھی پیچھے کی طرف چلا جاتا۔ کبھی اس کا سر گٹار پر اتنا جھک جاتا کہ اس کا چہرہ نظر نہ آتا اور کبھی ایسا معلوم پڑتا گویا وہ اپنے سر سے اپنی پشت کو چھونے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبھی اس کے ہونٹ بھینچ جاتے جیسے شدید جسمانی کرب یا لذت کی حالت میں ہو۔ اور کبھی اتنے کھل جاتے کہ اس کے سپید دانت نظر آنے لگتے۔ کبھی وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا گویا اس کا ذہن کہیں بہت دور چلا گیا ہے اور کبھی وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر یوں ہر طرف ایسے دیکھتا جیسے ہال کی نیم تاریک فضا میں کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

میں نے گلاس اٹھایا جس میں سوڈا ارکاہٹ وہسکی سے سرگوشی کر رہا تھا۔ اور ایک لمبا گھونٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا گویا اس وقت صرف دو حقیقتیں باقی رہ گئی ہیں۔ میرا معدہ اور گٹار کے تاروں سے ابلتے ہوئے سُر۔ میں نے سوچا۔ موسیقی سننے کی چیز ہے۔ اس لئے اسے آنکھیں بند کر کے سننا چاہئے۔ خاص کر جب موسیقی کا خالق میراثی زیادہ لگتا ہو اور موسیقار کم۔ عجب مسخری شکل ہے اس کی ویسے گٹار بُرا نہیں بجاتا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ابھی تک اسٹیج پر جھوم رہا تھا۔ میں نے پھر گلاس اٹھایا۔ سوڈے کی گنگناہٹ اب جسم پر چلی تھی۔ میں نے ایک اور لمبا گھونٹ لیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور نہ جانے کہاں سے گٹار کی موسیقی کو پیچھے دھکیلتا ہوا مجاز کا یہ مصرع میرے ذہن میں در آیا ـــ پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل ـ اور میں آپ ہی آپ مسکرا دیا ـــ کہاں مجاز اور کہاں سن سٹ سٹرپ! پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل۔ جمال نے اشاروں اشاروں میں وعدہ تو یہی کیا تھا کہ کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں لے چلے گا مگر یہ تو ہر پل آئین ہے جہاں فاطمہ اپنے فلیٹکلسو رقص کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اسے شہناز لالہ رخ کہہ سکتے ہیں مگر اس کا

کاشانہ تو نہیں اور پیٹر تو مجھے سٹبنا ز سیا ورٹ کے کاشانے چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولکر پیٹر اور جمال کی طرف دیکھا جو میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی نظریں اسٹیج پر لگی ہوئی تھیں۔ جہاں وہ میتا دور نما شخص ابھی تک اپنے گٹار کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ دونوں اندھیرے میں تھے مگر پھر بھی پیٹر کا چہرہ اور اس پر بے شمار بھورے۔ گول گول دھبے مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔

ٹپکل امریکن! لمبا تڑنگا تندرست۔ بے تکلف۔ ہنس مکھ اور چہرے پر یہ دھبے! جمال نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کرتا کیا ہے۔ شاید اس کا تعلق بھی ہالی وڈ سے ہو۔ ویسے زیادہ کلچرڈ نہیں معلوم ہوتا اور نہ زیادہ تعلیم یافتہ ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں سوائے سیکس کے اس نے شاید ہی کسی اور موضوع پر گفتگو کی ہو گی۔ عامیانہ مذاق اور گندے لطیفے! وہ لطیفہ تو بہت ہی گندہ تھا جو اس نے نلاور میں سنایا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ سامنے کی میز پر اس کا دوست۔ دوست کی بیوی اور دوست کی نوجوان خوبصورت بیٹی بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر میں کہتی: مارتا تو شاید وہ بگڑے والا نگڑا بھی اتنی ہی بلند آواز میں سناتا جتنا کہ اس نے بے بی ڈول والا حصہ سنایا تھا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ان تینوں نے پھر بھی پورا لطیفہ سن لیا تھا۔ کیونکہ اس کا دوست ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کی نظریں بیبیٹ پر جم کر رہ گئی تھیں اور ان کی بیٹی مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں شرم نہیں تھی۔ ایک قسم کی شہرت تھی۔ کیا عمر ہو گی اس کی؟ پندرہ سولہ برس لیکن پندرہ سولہ برس کی عمر میں ایسا لطیفہ سن کر اس شریر انداز سے مسکرانے کے کیا معنی! یا شاید تجربہ کار ہو۔ یہ امریکہ ہے۔ یہاں تجربے ذرا جلدی شروع ہو جاتے ہیں۔ اور پیٹر نے اس کے بارے میں کچھ کہا بھی تو تھا۔ ہاں! جمال سے شرط بدی تھی ——— آئی کین بیٹ۔ سٹی از گیم ——— اور جمال نے کیسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اس کی طرف۔ اور اس لڑکی کے باپ کو یہ دونوں اپنا دوست کہتے ہیں۔ یہ بھی حد ہو گئی۔ اور جب وہ تینوں نلاور میں داخل ہوئے تھے۔ اور انہوں نے پیٹر اور جمال کو دیکھا تھا۔ اور وہ ہماری میز کی طرف آئے تھے۔ اور ہم کھڑے ہو گئے تھے۔ اور جمال نے ان سے میرا تعارف کرایا تھا۔ اور پیٹر نے بہت دیر تک اپنے دوست کی بیوی سے شیک ہینڈ کیا تھا اور کسی بڑے مزے کی پارٹی کا ذکر ہوا تھا تو بیوی نے آہستہ سے آنکھ ماری تھی۔ اور جواب میں پیٹر نے بھی آنکھ ماری تھی۔ بات شاید الٹی ہو۔ پیٹر کی دوستی اس شخص سے نہیں بلکہ اس کی بیوی سے ہو۔ مگر مجھے ......

پر پل آئین کی سگرٹوں کے دھوئیں سے پُر فضا جگمگا اٹھی۔ گٹار بجانے والا اپنے کرتب دکھا چکا تھا اور روشنی کر دی گئی تھی۔ جمال اور پیٹر نے میری طرف دیکھا۔

"گڈ؟" پیٹر نے پوچھا۔

"ویری گڈ!" میں نے جواب دیا۔

ہمارے گلاس خالی ہو چکے تھے۔ جمال نے ویٹر کو اشارہ کیا اور تین اور پیگ آرڈر کر دیے۔ دو ایک گھونٹ پینے کے بعد جمال اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے چلا گیا اور چند منٹ بعد فاطمہ ہماری میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیانہ قد۔ گندمی رنگت۔ چھریرے بدن والی فاطمہ جس کے بال توڑنے کے انداز سے بندھے ہوئے تھے اور جس کے طور طریقوں میں شرم و حیا کا معصومیت کا ایک پہلو تھا —— یہ ہرگز تو نہیں ہو سکتی!

"آپ امریکن ہیں؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

وہ مسکرائی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دانت نظر آئے "نہیں۔"

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہے جمال بول پڑا۔ "نہیں۔ فاطمہ اسپین کی رہنے والی ہے اور مونسے گرنکو کی شاگرد ہے۔"

اور گفتگو جب ذرا چل نکلی تو مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ فاطمہ جپسی ہے۔ میرے ذہن نے بڑی مشکل سے اس حقیقت کو قبول کیا کیونکہ فاطمہ نہ تو چھری چاقو بیچ رہی تھی۔ اور نہ اس کے سر پر وہ ٹوپی تھی جس میں چاندی اور پیتل کے سکے ٹکے ہوتے ہیں۔ وہ انگریزی بول رہی تھی۔ اور بڑے اخلاق سے پیش آ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر کسی موقعہ پر جمال جو ہمارا دوست معلوم پڑتا ہے۔ فاطمہ کی بانہہ یا کلائی پکڑے تو کیا وہ چمکتے ہوئے لمبے پھل کا چاقو کھول کر اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے سکتی ہے۔ نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا۔

"ہلو۔"

فاطمہ کا ساتھی رقاص ہمارے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمال نے اس کے لئے اپنی کرسی خالی کر دی۔ اور اپنے لئے پاس والی میز سے جو خالی تھی ایک کرسی گھسیٹ لایا۔

"تھینک یو۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

فاطمہ نے اس کا ہم سب سے تعارف کرایا اور تعارف کے بعد اس کے لئے اس کی قومی شراب کا ایک چھوٹا سا گلاس منگایا گیا۔ ویٹر گلاس کے ساتھ ایک چھوٹا سا نمکدان بھی لایا۔ سازندے نے نمکدان میں سے تھوڑا سا نمک اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر چھڑکا۔ پھر گلاس کو حلق میں انڈیل کر چھڑکے ہوئے نمک کو چاٹ گیا۔

اس نے میری نگاہوں کے استعجاب کو ضرور سمجھ لیا ہوگا۔ کیونکہ وہ آپ ہی آپ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے سمجھانے لگا کہ اس کی یہ قومی شراب اتنی تیز ہوتی ہے کہ اسے پینے کے بعد منہ کا مزہ بدلنے کے لئے نمک چاٹا جاتا ہے۔

"تم بھی چکھ کے دیکھو۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"نہیں۔ بہت۔ بہت شکریہ۔" میں نے ایسے کہا گویا اس نے مجھے جہنم کی ایک جھلک دکھانے کی

پیش کش کی تھی۔

تیسرے رقص کا وقت ہونے والا تھا۔ اس لئے فاطمہ اور اس کا سازندہ اٹھ کر چلے گئے۔ بتیاں ایک ایک کر کے بجھنے لگیں۔ حاضرین کی نگاہیں پھر اسٹیج کی طرف اٹھنے لگیں۔

"کیا خیال ہے؟" ہیتھر نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟" میں نے کہا۔

"فاطمہ کے بارے میں۔"

"ناٹ بیڈ۔"

"ناٹ بیڈ" وہ زور سے ہنسا "شی از ویری پرٹی۔"

"مل جائے تو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لو۔" جمال نے کہا۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔"

"بگڑ رکھنے تو نہیں؟" ہیتھر نے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر کوئی خاص اچھے بھی نہیں لگتے۔"

"تم نے وعدہ خلافی کر کے اس کا موڈ خراب کر دیا۔" جمال نے ہیتھر سے بناوٹی شکایت کی۔

"از دیٹ سو؟" ہیتھر نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "گھبراؤ مت۔ ابھی رات بہت باقی ہے۔ پھر کوشش کریں گے۔"

ہیتھر نے وعدہ خلافی کی تھی۔ ے فلاور میں داخل ہونے سے قبل جمال نے اس سے اپوئنمنٹ پر لگے ہوئے ٹیلیفون پر بات کی تھی۔ وہ ٹیلی فون بوتھ کے اندر تھا۔ اور میں باہر۔ اس لئے میں اس کی گفتگو نہ سن سکا تھا۔ مگر گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے مجھے بتایا تھا اس کا "یار سو مع" "دو۔ ت ہیتھر تھوڑی دیر میں یہاں ہوگا اور پھر سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد ہیتھر ے فلاور میں تھا۔ اور جب جمال کھانا کھا چکا تھا۔ اور میں اور ہیتھر کافی پی چکے تھے۔ تو ہم تینوں نے پھر ٹیلی فون بوتھ کا رخ کیا تھا۔ بوتھ میں داخل ہو کر ہیتھر نے اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک پاکٹ ڈائری نکالی تھی جس کے ایک صفحے پر کئی ٹیلی فون نمبر درج تھے۔ اس نے ان میں سے ایک نمبر ملایا تھا۔ اور "ہلو" کہہ کر ایک منٹ چپ رہنے کے بعد بوتھ کا دروازہ کھول کر مجھے اور جمال کو بتایا تھا کہ "وہ کام سے گئی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے ایک اور نمبر ملایا تھا اور ذرا دیر بعد ہمیں مطلع کیا تھا کہ "اس کے یہاں آج مہمان آئے ہوتے ہیں۔" پھر ایک اور نمبر ملایا گیا تھا۔ اور اس دفعہ اسے نہ جانے کیا جواب ملا تھا کہ اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

ذرا دیر توقف کے بعد اس نے جو نمبر ملایا تھا: "ہلو ـــ میں بشیر ذوالفقل بول رہا ہوں ـــ جم تم نے تمہارا حوالہ دیا تھا ـــ ہاں ـــ آر یو شیور؟ ـــ بائی ـــ" اور ٹیلی فون بند کرتے ہوئے اس نے دانت بھینچ کر "بلڈی پِگ" کہا تھا۔

"بیڈ لک" جمال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی اس لئے میں بوتھ میں گھس گیا تھا۔

"سوری" اس نے ڈائری کا ایک اور صفحہ الٹتے ہوئے کہا تھا۔

"چلو چلیں۔"

"ویٹ اے منٹ!"

اور پھر اس نے سٹریٹ لیمپ کی روشنی میں جو بوتھ کے شیشوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی ایک اور نمبر پڑھا تھا۔

"ہاؤ اباؤٹ اے نگر۔ یو ڈونٹ مائینڈ۔ ڈو یو!"

اور میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا: "نہیں۔ اب چلو"

"ویری ینگ اینڈ ویری چیپ۔ اونلی فائیو ڈالرز۔"

اور جب میں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا تھا تو اس نے بوتھ سے نکلتے ہوئے جمال سے کہا تھا: "تمہارے دوست کو نیگرو پسند نہیں۔"

اناؤنسر فاطمہ کے تیسرے رقص کا اعلان کر رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا۔ اور کرسی کو تھوڑا سا پیچھے کھسکا کر اسٹیج پر فاطمہ کی آمد کا منتظر ہو گیا جو دو ایک بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں وہ بھی بجھا دی گئیں اور روشنی میں جلتے ہوئے اسٹیج پر پہلے سازندہ اور پھر فاطمہ نمودار ہوئی۔ اس بار وہ بغیر آستینوں کی گلابی پوشاک پہنے ہوئے تھی۔ جس کے سکرٹ پر ذرا ذرا سے فاصلے پر کالی پٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ چوڑی ایڑی کے کالے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ جس کے تسمے اس کے ٹخنوں کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ اور اس کے کانوں میں گلابی ٹاپس چمک رہے تھے۔ اس نے پرپل آئیں کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں جمال بیٹھا ہوا تھا پھر وہ دونوں بازو اٹھا کر ہاتھوں کو سر کے اوپر لے گئی۔ ایک بار آہستہ سے اپنے جوتوں کی ایڑیوں کو اسٹیج کے تختوں پر مارا۔ اور ناچنے لگی۔ جوں جوں اس کا رقص شباب پر آتا گیا۔ تختوں پر جوتوں کی ایڑیوں کی آواز بلند ہوتی گئی اور اس کی ہتھیلیوں میں چھپے ہوئے کستانیٹ کی پٹ۔ پٹ تیز ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ اس کی پوشاک کا وہ حصہ جو اس کے سینے اور اس کی کمر کے درمیانی حصے پر پھنسا ہوا تھا۔ بھیگ چلا۔ اور اس کا جوڑا کھل

گیا۔ اس کے بال اس کے کاندھوں پر لہرانے لگے۔ اس کے سکرٹ کے نچلے حصے نے گھیر کے گھومتے ہوئے پاٹ کی صورت اختیار کر لی۔ اور اس کے ہونٹ آدھے کھل کر ایک کیفیتِ بے خودی کے مظہر ہو گئے۔ اور یکایک مجھے اپنی زندگی میں ایک نامعلوم مگر بہت ہی بڑی کمی کا احساس ہوا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس احساس کا تجزیہ کر لوں فاطمہ کا رقص ختم ہو گیا۔ اور میں بھی دیگر حاضرین کے ساتھ ساتھ تالیاں بجا بجا کر اسے داد دینے لگا۔ جسے اس نے کئی بار سر کو اِدھر اُدھر ذرا سا جھکا کر قبول کیا۔

میں نے گلاس خالی کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ ریٹا ڈورمنا سازندہ پھر گٹار بجا رہا تھا۔ اس بار اس کی دھن دردانگیز تھی اور تخنوں کی مسلسل خاموشی بتا رہی تھی کہ اس دفعہ وہ آنچل کو دبالکل نہیں کر رہا تھا۔ اس کی دھن میرے کانوں کے راستے داخل ہو ہو کر میرے جسم کے ریشے ریشے میں سرایت کرتی رہی۔ اور میری بند آنکھوں کے سامنے سے ایک کے بعد ایک کئی مناظر گذرتے رہے۔ جھکے ہوئے بادل۔ گنگا کا کنارا۔ آموں کے باغ کھیل کا میدان۔ بچپن کے مناظر۔ بے فکری کے مناظر۔ آزادی کے مناظر۔

اور پھر چند گھنٹے قبل کا ایک منظر میری بند آنکھوں کے سامنے پھیل گیا۔ میں عمر کے مکان میں ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھ رہا ہوں۔ سہ پہر کے سورج کی روشنی کار خانوں کی چمنیوں۔ فلک بوس عمارتوں۔ والی سڑکوں اور بام کے بلند قامت درختوں پر پھیلی ہوئی ہے ذرا دیر کے لئے میری نظر یا اس جھیل پر ٹھہر جاتی ہیں جو لاس اینجلس کی گنجان آبادی اور اس پہاڑی کے درمیان جھل مل کر رہی ہے جس پر عمر کا مکان واقع ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اس کہرے کے باوجود جو ہر وقت اس پر چھایا رہتا ہے۔ لاس اینجلس یہاں سے کتنا خوبصورت لگتا ہے

اچانک موسیقی جو ماحول پر چھائی ہوئی خاموشی کا جزو بن چکی ہے ختم ہو جاتی ہے اور میں کھڑکی سے ہٹ کر اس طرف دیکھتا ہوں جہاں ریکارڈ پلیئر رکھا ہوا ہے۔ عمر سگریٹ سلگا کر ٹانگیں سیدھی کر رہا ہے۔ اس کے سامنے نیم فلم سکرپٹ کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔ اور جمال اپنی کرسی چھوڑ کر ریکارڈ پلیئر کے پاس پہنچ چکا ہے۔

"اب کیا لگاؤ گے؟" میں اس سے پوچھتا ہوں۔

قبل اس کے کہ جمال جواب دے۔ عمر بولتا ہے "والٹز"

"نہیں۔ ٹینگو۔ نتھنگ لائک ٹینگو!" جمال ریکارڈ پلیئر پر جھکتے ہوئے کہتا ہے۔

"کریزی فیلو!" عمر ہنستا ہے "بہت بج چکے ٹینگو۔ اب کچھ والٹز ہو جائیں"

میں کہتا ہوں "نہیں۔ چاچاچا"

اور عمر ہو ہو کر کے ہنسنے لگتا ہے "تم جمال سے بھی گئے گزرے ہو"

جمال چھ سات ریکارڈ چڑھا دیتا ہے " فلرٹ کرو " وہ مجھ سے کہتا ہے " اس میں تمہارے چاچا بھی شامل ہیں " اور اپنے مذاق پر خود ہی ہنسنے لگتا ہے۔

جمال اور عمر پھر اپنی فلم سکرپٹ میں الجھ جاتے ہیں اور میں ٹہل ٹہل کر سوچنے لگتا ہوں کہ اپنے مضمون کو کس طرح ختم کروں۔

یکایک جمال پوچھتا ہے " اردو میں کمانڈر انچیف کے لئے کون سا لفظ موزوں رہے گا ؟"

" میرے خیال میں سپہ سالار سے کام چل سکتا ہے " میں رک کر کہتا ہوں " مگر تمہاری کہانی ہالی ووڈ کے لئے ہے یا محبوب کے لئے ؟"

" فلرٹ کرو۔ ہالی ووڈ ہی کے لئے ہے مگر دو چار الفاظ اردو فارسی کے بھی استعمال کرنے ہیں "

اس کا جواب سنکر مجھے یاد آجاتا ہے کہ کل شام جمال نے مجھ سے اپنی کہانی کا ذکر کرتے وقت اس کا ایک بہت ہی مختصر سا خاکہ بھی سنایا تھا۔ ایک ظالم بادشاہ۔ ایک غریب مگر بہت ہی حسین دوشیزہ۔ اور اس کا ایک خوبرو نوجوان عاشق۔ بادشاہ لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ مگر لڑکی اسے گھاس نہیں ڈالتی اور آخر میں نوجوان اور دوشیزہ کا عشق فتح یاب ہوتا ہے اور بادشاہ بھاگ جاتا ہے یا مارا جاتا ہے۔

اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ برٹ لنکاسٹر نے کہانی میں بہت دلچسپی دکھائی ہے اور قوی امید ہے کہ وہ اسے قبول کرے گا۔ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا اور اس وقت پھر سوچنے لگتا ہوں کہ اس کہانی میں ایسی کونسی بات ہے جو برٹ لنکاسٹر اسے قبول کرنے کو تیار ہے۔ ہندوستانی اور امریکی فلموں میں اس قسم کی کہانیاں بہت ہوتی ہیں۔ یا شاید جمال کھینچ رہا ہو۔ مجھ پر رعب ڈالنے کے لئے۔ آدمی چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خود ہی کہہ رہا تھا کہ ہالی ووڈ کے چکر کاٹتے چار سال ہو گئے۔ گھر سے آیا تھا ڈاکٹری پڑھنے۔ اور یہاں آکر فلموں کے چکر میں پڑ گیا۔ خیر مجھے ان سب باتوں سے کیا مطلب۔ مجھ سے تو بہت خلوص سے ملا۔ نہ جان نہ پہچان اور پھر بھی خود ہی ملنے چلا آیا۔ نہ جانے اسے کیسے پتہ چل گیا کہ میں لاس اینجلس میں ہوں اور اسی نے لاس اینجلس ہیرالڈ سے میرے مضمون کا معاملہ طے کیا۔ ہزار الفاظ کے دو سو ڈالر۔ برا سودا نہیں۔

میں گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں۔ پانچ بج چکے ہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں اور جا کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں سگریٹ سلگا کر ٹائپ رائٹر پر چڑھے ہوئے کاغذ پر نظر ڈالتا ہوں اور آخری چار پانچ سطروں کو کئی بار پڑھ کر پھر ٹائپ کرنے لگتا ہوں۔

" بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں سیاسیات کے مسلمہ اصولوں اور عقائد کو فراموش کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ ایسے ہی حالات میرے ملک میں بھی رونما ہوئے ہیں۔ ان حالات کو

اصولوں اور عقائد کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ سیاسی تقسیم یا جس چیز کو کھوٹا بتلاتی ہیں وہ میرے وطنِ عزیز میں کھری ثابت ہوئی ہے اتنی کھری کہ مجھے ان تقسیم کاریوں کی صداقت پر شبہ ہونے لگا ہے —"

"شہرا!" مضمون ختم کر کے کرسی پر سے اچھلتے ہوئے کہتا ہوں۔

جمال اور عمر فلم سکرپٹ پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہیں۔

"ختم کر لیا؟" جمال پوچھتا ہے۔

"یس سر!" میں سینہ پھلا کر کہتا ہوں۔

"مگر میری بات یاد رکھی تھی؟" جمال کہتا ہے۔

"کونسی بات؟"

"خالی تعریفیں بھول ورنہ لاس اینجلس کا ہیرالڈ قبول نہیں کرے گا۔"

"لاس اینجلس ہیرالڈ تو کیا نیویارک ٹائمز بھی قبول کرے گا۔" میں سینہ اور پھلا لیتا ہوں۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ مدح سرائی کے نہیں دینگے یہ لوگ دو سو ڈالر۔"

"اور اگر کوئی خرابی ہوئی نہیں تو؟"

"ناممکن!"

"ہندوستانیوں کو تو ایسی بات ناممکن ہی لگے گی۔"

"پھر وہی ہندوستان پاکستان۔" عمر چلاتا ہے۔ "کوئی اور بات کرو۔"

سینٹا مونیکا بولوارڈ کے ایک ریسٹوران میں لنچ کھاتے وقت بات پیرس، ٹوکیو، اور ہمبرگ کے نائٹ کلبوں سے شروع ہو کر ہندوستان پاکستان تک پہنچ گئی تھی۔ ہم، میں اور جمال، عمر کے مہمان تھے۔ تھوڑی دیر قبل ہی جمال نے میرا عمر سے تعارف کرایا تھا اور عمر نے فوراً ہم کو لنچ کی دعوت دے دی تھی۔ کنگ کول میں کھانا آرڈر کرنے کے بعد کاکٹیل کے گھونٹ پیتے ہوئے بات لاس اینجلس کی نائٹ لائف کی طرف نکل گئی تھی۔ جمال کہہ رہا تھا کہ لاس اینجلس کی نائٹ لائف بڑی "کراری" ہے اور عمر کا خیال تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے نائٹ کلبوں کا مقابلہ پیرس اور ہمبرگ کے نائٹ کلب بھی نہیں کر سکتے۔ خاص کر اسکندریہ اور قاہرہ کے نائٹ کلب۔ مگر مجھے دونوں کی رائے سے اختلاف تھا۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ قاہرہ اور اسکندریہ کی روح ناصر نے نچوڑ لی۔ ناف اور سینے کے درمیان کا حصہ ڈھک دیا جائے تو بیلی ڈانسنگ کا لطف ہی کیا رہا! اور سچی بات تو یہ ہے کہ بیلی ڈانسنگ بہت ہی گھٹیا قسم کی نائٹ لائف مہیا کرتی ہے۔

میرے اس ریمارک پر جمال ہنسنے لگا تھا۔ "گویا نائٹ لائف اعلیٰ بھی ہو سکتی ہے!"

اور جب میں نے جمال کی ہنسی اور اس کے ریمارک کی پرواہ کئے بغیر پیرس، ٹوکیو اور ہمبرگ کے چند نائٹ کلبوں کی تفصیلات بیان کرنا شروع کی تھیں تو اعلیٰ اور ادنیٰ کی بحث کو فراموش کر کے جمال ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ اور جب میں نے اس امریکی لڑکی کا لحاظ کرتے ہوئے جو میرے سامنے بیٹھی ہوئی جوس پی رہی تھی۔ اور رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے کھسر پھسر کے انداز میں بتایا تھا کہ ہمبرگ میں کچھ نائٹ کلب ایسے بھی ہیں جہاں لڑکیاں بالکل ننگی ہو کر اسٹیج پر آتی ہیں اور پیرس میں چند کلب ایسے ہیں جہاں مرد اور عورتیں موڈرن کوک شاستر کا مظاہرہ کرتی ہیں اور ٹوکیو میں ایک نئے قسم کا کیبرے ہوتا ہے جسے سولو کیبرے کہتے ہیں جس میں تماشبین کو ایک کیبرے گرل کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں وہ لڑکی اپنے فن کا مظاہرہ کچھ اس انداز سے کرتی ہے کہ ——— تو جمال کے منہ سے صرف "سیج" نکلا تھا۔ اور عمر جو ملتانی مٹی کا بنا ہوا معلوم پڑتا ہے۔ ہنسنے لگا تھا۔

بنگ مین۔" اسنے اپنی بیالیس پچاس سال پرانی آواز میں کہا تھا۔

اور جمال بولا تھا۔ "یار ٹوکیو چلنا چاہیئے۔"

اور پھر گفتگو مرد اور عورت کے تعلقات کے درمیان میں بھٹک گئی تھی جہاں امریکہ کی وہ لڑکیاں تھیں جو کوک کی ایک بوتل پر دیٹ کرتی ہیں جہاں لندن کی وہ عورتیں تھیں جنکو پکچر دکھا کر یا کھانا کھلا کر اگر انکے ساتھ عشق جتایا جائے تو وہ گڈ نائٹ کہتے وقت اپنے ساتھی کی طرف ایسے دیکھتی ہیں گویا وہ مریخ یا مشتری سے آن ٹپکا ہے۔ جہاں جرمنی کی وہ عورتیں تھیں جو اپنے مرد ساتھیوں میں مردانگی کا غرور پیدا کر دیتی ہیں جہاں اسکینڈ نیویا کی وہ عورتیں تھیں۔ جو سیاہ رنگت پر ایسے ہی مرمٹتی ہیں جیسے آج سے بیس پچیس برس پہلے کے ہندوستانی طالب علم انگلینڈ کی سپید فام گھٹیا ٹائپ کی لڑکیوں پر مرمٹ کر ان سے شادیاں رچایا کرتے تھے جہاں بالی کی وہ لڑکیاں تھیں جنہوں نے پانچ دس برس قبل تک سینہ ڈھانکنا نہیں سیکھا تھا۔ اور جہاں جاپان کی وہ عورتیں تھیں جو نائٹ کلبوں میں پیرس کی عورتوں کو مات کرتی ہیں اور گھروں میں ہندوستان کی دھرم پتنیوں کو۔

اور پھر گفتگو کے گھوڑے کمیونزم کے میدان میں دوڑنے لگے تھے۔ عمر کو کمیونزم کے اس پہلو سے مطلب تھا کہ ایک کمیونسٹ ملک نے نہر سویز پر حملے کے وقت مصر کا ساتھ دیا تھا۔ مگر جمال کو کمیونزم میں کئی اور خوبیاں بھی نظر آتیں۔ روس کی ساری مادی ترقی۔ اور وہ بھی اتنے قلیل عرصے میں۔ صرف کمیونزم کی بدولت ہوئی تھی۔

"لیکن"۔ اسنے کہا تھا۔ "میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میرا ملک کمیونسٹ ہو جائے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"کیوں"۔ اسنے سوچتے ہوئے کہا تھا۔ "کئی جواب ہیں تمہارے سوال کے۔ کمیونسٹ سوسائٹی میں آرٹ کا

خاص کر ادب کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ روس کی مثال لو۔ پشکن۔ گورکی۔ ٹالسٹائی۔ دستووسکی۔ ترجنیف چیخوف۔ اور اب کیا ہے۔ بہت سے اسٹالن پرائز۔ لینن پرائز۔ یہ پرائز اور وہ پرائز حاصل کرنے والے ناول۔ یوں سمجھ لو کہ جس ناول یا کتاب کو پرائز مل گیا وہ یقیناً پڑھنے کے قابل نہیں۔"

"مگر آج بھی روسی ادیبوں میں روسی ادبی روایت کا پتہ ملتا ہے۔" میں نے کہا تھا۔ "فدلیف ہی کو لے لو۔"

"ہاں! فدلیف ہی کو لے لو۔ اس میں روسی روایت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مگر بس جھلکیاں۔ وہ اگر آج سے ساٹھ ستر سال پہلے پیدا ہوا ہوتا تو شاید اس کا نام بھی ٹالسٹائی۔ گورکی اور چیخوف کے ساتھ لیا جا سکتا۔ کمیونزم ادبی تخلیق کے سوتے خشک کر دیتا ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ فدلیف کا انجام کیا ہوا؟"

وہ ایک لمحے کیلئے رک گیا تھا تاکہ معلوم کر سکے کہ میں فدلیف کے انجام سے واقف ہوں یا نہیں۔ میں اسکے انجام سے واقف تھا مگر چپ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جمال کو فدلیف کے انجام سنانے کے احساس سے محروم کر دوں جو وہ فدلیف کا انجام سنا کر یقیناً محسوس کریگا۔

"اسنے بیوی کا نگریس کے بعد خودکشی کر لی تھی۔ وہ تین دن ایک کمرے میں بند رہا۔ نشے میں دھت ——— اور پھر اپنے گولی مار لی۔"

"مگر انسان اور قومیں ادب اور آرٹ پر زندہ نہیں رہتی۔ تم خود کہتے ہو کہ روس نے بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ وہاں کے عوام یقیناً مطمئن ہوں گے۔ ادب اور آرٹ نہیں تو نہ سہی۔"

جمال ہنسا تھا۔ طنزیہ ہنسی۔ "میں بھی بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں۔ تمہارے ذہن میں آزادئ اظہار کا، فرد کی آزادی کا سوال نہیں اٹھتا۔ تم یہ نہیں سوچتے کہ کمیونزم شخصیتوں کو۔ انسانی شخصیتوں کی بنیادوں کو مسخ کر دیتا ہے اور پھر سسٹم انسانوں کو۔ ان کی شخصیت کی بنیادوں کو مسخ کر دیتا ہے۔ خواہ وہ کمیونزم ہو یا فاشزم۔ برا ہے۔ اور میں کسی ایسے سسٹم کو اپنے ملک کے لئے قبول کرنے کو تیار نہیں۔"

"اور اس سسٹم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ جو دوسری قوموں کو غلام بنا کر خود کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

جمال نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا جو کہہ رہی تھیں کہ ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے۔ اور پھر اسے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش میں گفتگو کشمیر کے خارزار میں الجھ گئی تھی۔ جمال پنڈت نہرو کے گن گانے لگا تھا ——— پنڈت جی جو کچھ کر رہے ہیں کشمیر اور کشمیریوں کی بھلائی کے لئے کر رہے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھلائی کے لئے۔ اگر کشمیر پاکستان میں چلا گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر نہیں۔ اور جب میں نے حق خود ارادیت۔ شیخ عبداللہ کی نظربندی وغیرہ کا ذکر کیا تھا تو وہ بگڑ کر بولا تھا کہ تم لوگوں کو ہمارا ذرا بھی خیال نہیں۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ ہندی مسلمان نیست و نابود ہو جائے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ تو ایک قسم کی دھمکی ہوئی کہ اگر پاکستان نے کشمیر کے

عوام کو ہندوستان کی غلامی سے چھڑا دیا تو ہم ہندوستان کے مسلمانوں کو چن چن کر مار ڈالیں گے۔ یہ دھمکی پنڈت نہرو کی اختراع ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ مانتے ہیں کہ جب ہند کشمیر کا بدلہ لینے کے لئے ہندی مسلمانوں کو قتل کر دینگے۔ تو یا تو وہ بے بس ہوں گے یا کچھ کرنا پسند نہ کریں گے۔ میں نے کہا تھا: میں تو یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ اگر ہندوستان کے ایک ایک مسلمان کی جان خطرے میں پڑتی ہے تب بھی کشمیر کو پنڈت نہرو کی آمریت سے آزادی دلانا پاکستان کا فرض ہے۔"

میرا جملہ سنکر جمال آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ "تم پنڈت نہرو پر آمریت کا الزام لگاتے ہو؟" اسنے متعجب ہو کر پوچھا تھا اور میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا: "ہاں بالکل اسی قسم کی آمریت کا جیسی فرانس نے الجزائر میں روا رکھی ہے۔" میرا خیال تھا کہ الجزائر کا نام سنکر عمر بھی کشمیر کے بارے میں کچھ کہے گا۔ مگر اسنے صرف یہ پوچھا تھا کہ ہم لوگ کافی پئیں گے کہ نہیں۔

آور اسوقت پھر وہی ہندوستان پاکستان کا نعرہ لگا کر وہ گفتگو کو سنگلاخ زمینوں کی طرف مڑنے سے روک لیتا ہے۔

یکایک یہ منظر سرخ۔ ہرے۔ نیلے۔ پیلے دھبوں میں بدل گیا۔ جمال اور ہیٹر کھسر پھسر کر رہے تھے میں نے آنکھیں کھولکر انکی طرف دیکھا۔ وہ اس طرف دیکھ رہے تھے۔ جدھر بار تھی اور بار کے بعد دروازہ تھا پورلی آہن میں اب مکمل اندھیرا نہیں تھا۔ چند بتیاں جلا دی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بتی دروازے کے پاس والی تھی۔ اس بتی کی روشنی میں مجھے دو عورتیں نظر آئیں جو پورلی آہن میں داخل ہو چکی تھیں۔ مگر داخل ہونے کے بعد ٹھٹھک سی گئی تھیں۔ گویا سوچ رہی ہوں کہ آگے بڑھیں یا نہیں۔ دونوں خوبصورت تھیں مگر ایک کی خوبصورتی میں کسی جنسی بھوک کے خواب کی تعبیر تھی اور دوسری کی خوبصورتی میں ایک قسم کی ٹھنڈک۔ دونوں منک اوڑھے ہوئے تھیں۔

جمال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہیٹر سے کچھ پوچھا اور ہیٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر یہ منک!"

"مانگے کے ہوں گے۔ ان سے کاروبار میں مدد ملتی ہے۔"

پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بارمین سے کچھ پوچھا۔ اور لمحہ بھر بعد وہ دونوں ہماری میز کے پاس سے گذرتی ہوئی آگے چلی گئیں۔ میں اگر گردن موڑ کر دیکھتا تو مجھے پتہ چل جاتا کہ وہ جا کر کس میز پر بیٹھی ہیں مگر میں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہسکی نے میرے پپوٹوں کو اتنا بوجھل کر دیا تھا کہ میری آنکھیں گویا خود بخود بند ہو گئیں۔ میرا سر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ اور گٹار کی اداس موسیقی کسی دور دراز مقام سے میرے کانوں میں داخل ہوتی رہی۔ میرا ذہن نیم خوابی کی حالت میں تھا۔ میں نے اپنی میز پر سے کسی کے اٹھنے کی آواز سنی۔ ہیٹر کو میں نے تقریباً

اسکاچ آرڈر کرتے سنا۔ میز پر گلاسوں کے رکھنے کی آواز سنی۔ اور پھر اپنی میز پر سے کسی کے اٹھنے کی آواز سنی مگر میرے ذہن پر ان آوازوں کا کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ یہاں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ پہلے پیٹر اور پھر جمال یا پہلے جمال اور پھر پیٹر اٹھ کر کہاں، کدھر، کیوں چلے گئے ہیں۔ اور جب گٹار کی موسیقی بند ہو گئی۔ تب بھی میں ٹانگیں پھیلائے، کرسی کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔

یکایک کسی نے میرے کندھے کو جھنجھوڑا۔

"کیا سو گئے تھے؟" پیٹر کی آواز تھی۔ جو پیچھے سے آ رہی تھی۔

"نہیں۔" میں نے آنکھیں کھول کر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "جہاں تو۔"

پیٹر کا ہاتھ میرے بازو پر تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ ان دو عورتوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جنہیں ذرا دیر قبل میں نے یہاں آ کر داخل ہوتے دیکھا تھا۔

"کم اینڈ جوائن اس۔" اس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

مجھے "یو آئی جوائن یو" والی حرکت ہمیشہ سے ناپسند ہے۔ اس لئے میں نے قدرے توقف کیا۔

"کم آن۔" اس نے جنسی بھوک کے خواب کی تعبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خاتون تم سے ملنے کے لئے بے حد مشتاق ہیں۔"

اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اس نے غیر انگریزی لہجے میں کہا۔ اور میں "بالکل نہیں" بڑبڑاتا ہوا اس گروپ میں شامل ہو گیا۔

"تم ہندوستانی ہو؟" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا "اب پاکستانی ہوں۔"

"آپ ہندوستانی نہیں ہیں۔ آپ پاکستانی ہیں۔"

میں چونک پڑا۔ وہ اردو بول رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی۔

"میں دفتر جاتا ہوں۔" اس نے مجھ پر اپنی اردو دانی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی۔

"جاتا نہیں جاتی ہوں۔" میں نے اصلاح کی۔

وہ ہنسی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ آگے کو جھک آئی تھی۔ اور اس گفتگو سے تعلق بے خبر نظر آتی تھی جو پیٹر اس کی دوست سے کر رہا تھا۔ کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ جیسے گوشت کو دیکھ کر کتے کی چمکتی ہیں۔ اس وقت اگر اس کے منہ کے کونوں سے رال ٹپکتی نظر آتی تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا۔

"میری دوست سے ملو۔" اسنے میری نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ "وائیونٹ میں وائیوٹ امیٹرنگ۔ بھرے بھرے جسم کی مس وائیولٹ دینرنگ نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو پیٹر کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔" ہی از ندیم۔"

اس نے میرا تعارف کرایا۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

"اور میں میترین ہوں۔ میترین توئن۔" اسنے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"کوئی خاص بات ہے میرے چہرے میں۔" میں نے اس کی تیز نگاہوں سے قدرے کتراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر سے ہٹائے بغیر کہا۔ "تم سانولے ہو۔ تمہارے بال کالے ہیں تمہارے دانت بہت سپید ہیں۔ اور . . . . ." وہ رک گئی۔

"اور؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور ۔۔۔ تم حسین ہو۔"

"تھینک یو۔" میں نے ایسے کہا گویا اس کی بات کا مذاق اڑا رہا ہوں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم حسین ہو۔" اسنے سنجیدگی سے کہا۔

"ویل ڈن ندیم۔" پیٹر نے تالی بجا کر کہا۔ اور ہماری میز کا ماحول اچانک بازارِ حسن کے ماحول میں بدل گیا۔

"یہ تمہارا دوست ہے؟" اسنے پیٹر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

میں جھجکا: "ہاں۔"

ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ہم سب چپ ہو گئے۔ موٹی چمڑی والا پیٹر بھی۔ پھر اسنے کہا کہ وہ حجام کا پتہ لگانے جا رہا ہے اور اٹھ کر چلا گیا۔

"دیہاتی!" میترین نے زیرِ لب کہا۔ "یہ سب کے سب دیہاتی ہوتے ہیں۔"

"کون؟"

"امریکن۔ انہیں تہذیب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔"

"اور تم؟"

"ہم دونوں جرمن ہیں" اسنے اپنی دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"تھے" اس کی کم گو دوست نے کہا جو اکتائی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔

"اور اب؟"

"اب امریکن ہیں۔"

میرین نے موضوع بدل دیا "تم موسیقی کے شوقین معلوم پڑتے ہو۔"

"نہیں تو۔"

"یہاں بیٹھنے کے بعد جس چیز نے سب سے پہلے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی وہ تم تھے۔ تم جس انداز سے آنکھیں بند کئے گم سم رہے تھے اس سے پتہ چلتا تھا کہ تمہیں موسیقی سے کافی لگاؤ ہے۔"

"تم نے سمجھنے میں غلطی کی" میں نے ہنستے ہوئے کہا "میری آنکھیں تھکن کی وجہ سے بند ہو گئی تھیں"

میں نے ہاتھ بڑھا کر پاس والی میز پر سے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھیں بند تھیں لیکن پھر بھی تم ہمہ تن توجہ نظر آ رہے تھے۔ نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہیں ضرور موسیقی سے لگاؤ ہے۔"

"ہے۔ مگر بس اتنا کہ اچھی موسیقی مجھ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتی ہے"

"تم بمبئی کے رہنے والے ہو؟" اسنے پھر موضوع بدل دیا۔

"نہیں۔ میں پاکستانی ہوں"

"بمبئی پاکستان میں نہیں؟"

"نہیں۔ بمبئی ہندوستان میں ہے۔"

"اور کلکتہ؟"

"وہ بھی ہندوستان میں ہے۔"

"اور لاہور؟"

"لاہور پاکستان میں ہے۔"

"میں لاہور جا چکی ہوں"

"اچھا۔ کب؟"

"بہت دن ہوئے جب میں چھوٹی سی تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ گئی تھی۔ انہیں گھومنے پھرنے اور شکار کا بہت شوق تھا۔

"تمہیں تمہیں اردو بولنی آتی ہے۔"

وہ ہنسی: "نہیں۔ مجھے اردو بولنا نہیں آتی۔ مجھے چند جملے ماما نے سکھا دیئے تھے۔"

"تمہاری ماں نے!"

وہ پھر ہنسی: "ماں نے نہیں۔ ماما نے۔ وہ پارسی تھا اور بمبئی کا رہنے والا تھا۔"

اس کی دوست نے کرسی کھسکا کر اپنا رخ اسٹیج کی طرف کیا تو میری من نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی کرسی اس کی کرسی کے پاس کر لوں تاکہ جب رقص شروع ہو تو میری پیٹھ اسٹیج کی طرف نہ ہو۔

رقص شروع ہو گیا تو میں نے اس سے کہا: "تمہاری دوست مجھے بہت ہی بد اخلاق سمجھتی ہو گی۔"

"کیوں!"

"کیونکہ اس عرصے میں میں نے اس سے ایک بات بھی نہیں کی۔"

"اور نہ مجھ سے۔ مگر باتیں تو میں کر رہی ہوں۔" پھر اس نے وائیولٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم وائیولٹ کو نہیں جانتے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔"

جواب میں وائیولٹ ہماری طرف گردن موڑ کر مسکرائی۔

"تمہیں معلوم ہے ہم اچانک بچھڑ گئے تھے اور اچانک ہی مل بھی گئے۔ لڑائی کے بعد۔ برلن کے ایک تھیئٹر میں۔ میں کئی سال بعد تھیئٹر گئی تھی۔ اور وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ اس کھیل میں وائیولٹ بھی کام کر رہی ہے۔" پھر اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر اس نے کہا: "وائیولٹ بڑی اچھی ایکٹرس ہے۔ ہالی ووڈ میں کام کرتی ہے۔ تم نے مارلن برانڈو کا وہ پکچر دیکھا ہے جس میں وہ نپولین بنا ہے؟"

"ڈیزری!"

"ہاں۔ ڈیزری۔ اس میں اس نے ملکہ کا پارٹ کیا ہے۔ یاد ہے جس سے آخر میں نپولین شادی کر لیتا ہے۔ اس کا شوہر یہاں کے ملٹن میں کام کرتا ہے اور اس کا ایک لڑکا ہے . . . . ."

"مگر تعارف کراتے وقت تو تم نے مس کہا تھا۔"

"ہالی ووڈ کی مس۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

اور میں سوچنے لگا کہ یہ عورت کتنی باتیں کرتی ہے مگر ایک موضوع پر جم کر بات نہیں کرتی۔ کبھی ہندوستان اور شکار کا ذکر ہے۔ تو کبھی اپنی دوست سے اچانک ملنے کا۔ کبھی موسیقی پر بات کر رہی ہے تو کبھی امریکنوں کی بدتہذیبی پر۔ اور اچانک مجھے وہ مختصر سی گفتگو یاد آ گئی۔ جو جاک اور پیٹر نے ان دو عورتوں کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر کی تھی۔ کہیں کھینچ تو نہیں رہی۔ یہ شکار کے قصے اور یہ ہالی ووڈ کی باتیں۔ یہ سب مجھے الو بنانے کے

ہے تو نہیں۔
میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ فاطمہ کو رقص کرتے دیکھ رہی تھی۔ اور اس انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ یقین نہ آتا تھا کہ ابھی۔ چند لمحات قبل۔ اس سارے ماحول سے بے خبر ہو کر وہ صرف مجھ سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔
میں نے گلاس اٹھایا تو اسنے نظریں اسٹیج پر سے ہٹائیں۔
"یہ آدمی بہت اچھا گٹار بجاتا ہے۔"
"تمہیں موسیقی سے کافی شغف معلوم پڑتا ہے۔"
"ہاں کبھی میں خود وائلن بجایا کرتی تھی۔"
"اور اب؟"
"اب بھی بجاتی ہوں۔ مگر بہت کم۔"
دو گھونٹ پی کر میں نے سگریٹ سلگائی تو اسنے اچانک پوچھا "تم بوشں کو جانتے ہو؟"
"کون بوش؟"
"بوش۔ ہندوستان کا بہت بڑا لیڈر تھا۔ سبھاش چندر ا بوس!"
"اوہ! بوس۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔"
"میں بھی اسے جانتی تھی۔ میری کئی دفعہ اس سے ملاقات ہوئی۔ جب وہ برلن میں تھا....."
میں چکرا گیا۔ بڑی دلچسپ عورت ہے۔ جو کچھ یہ کہہ رہی ہے یہ سب جھوٹ تو نہیں ہو سکتا۔
وہ کہہ رہی تھی "..... ان دنوں میں نوجوان تھی۔"
"یو آر سٹل ینگ۔ اینڈ ویری بیوٹی فل۔"
وہ رک گئی۔ اسنے غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ کھل اٹھا "تھینک یو۔ میں ان دنوں بالکل نوجوان تھی۔ اور کبھی کبھی ماما سے ملنے اس کے دفتر جایا کرتی تھی۔ وہاں کئی ہندوستانی ہوتے تھے۔ وہ سب بوش کے ساتھ کام کرتے تھے۔ بوش کا کمرہ الگ تھا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھار میری اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرا کرتا تھا میری پیشانی کو چومتا تھا اور کبھی کبھی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا کرتا تھا۔ اور تمہیں معلوم ہے ــــ" اسنے اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے کہا "ایک مرتبہ ماما نے مجھے ایک خط لے کر بوش کے پاس بھیجا۔ اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اور جب میں خط دے کر واپس جانے لگی تو اس نے سینے سے لگا کر مجھے پیار کیا۔ میں بڑی مشکل سے اپنا پیچھا چھڑا کر بھاگی۔ اور ایک دفعہ تو میں نے اسے ـــــ" وہ رک گئی۔

میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ تمہارا بہت بڑا لیڈر تھا۔ تم سب لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہو۔ مجھے معلوم ہے۔ اور پھر اب وہ زندہ بھی نہیں۔ مرے ہوئے آدمی کی برائی نہیں کرنی چاہئے۔ ویسے میں اس کی برائی نہیں کر رہی۔ وہ بھی انسان تھا۔ اور ہر انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ بلکہ ان باتوں کو کمزوری نہیں کہا جا سکتا۔ ہم سب لوگ صبح باتھ روم جاتے ہیں۔ ہماری شادیاں ہوتی ہیں۔ ہم بچے پیدا کرتے ہیں۔"

"مگر ——" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم جو قصہ سنا رہی تھیں اس کا کیا ہوا ——" میں اس وقت فلسفہ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے لہجے میں راز داریت آچلی تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ اسی لہجے میں گفتگو کرتی ہوئی پہلے ذہنی طور سے میرے قریب آجائے۔

اس نے جھجکتے ہوئے کہا ——"وہ اچھی بات نہیں۔"

"پھر بھی۔"

وہ شرما گئی۔

"مگر تم کیوں شرما رہی ہو۔"

"کیونکہ میں نے اس کے کمرے میں بغیر اس کی اجازت کے جھانکا تھا۔"

"ہوں۔ اور یہ آما کون تھا؟"

"میرا دوست تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ مجھے حسین مرد بہت پسند ہیں۔ وہ بھی مجھے بہت پسند کرتا تھا۔ مگر اتنا شریف تھا کہ اس نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہ کی اور نہ کبھی۔ تم مشرقی لوگ بھی عجیب ہوتے ہو۔"

"مگر مشرقی لوگ غیر فطری تو نہیں ہوتے۔"

"تم سمجھے نہیں۔ آما غیر فطری نہیں تھا لیکن فطری کمزوریوں سے بالاتر ضرور تھا۔ تمہیں بتاؤ ایسے لوگ کتنے ہوں گے جنہیں معلوم ہو کہ ایک جذباتی لڑکی انہیں پسند کرتی ہے۔ ان سے بے تکلف ہے۔ حسین مرد اس کی کمزوری ہیں اور جو پھر بھی اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں —— اور سچ تو یہ ہے۔" اس نے پھر راز دارانہ لہجہ اختیار کر لیا۔ "کہ کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ وہ میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے مجھے اپنی آغوش میں بھینچ کر میری ہڈیاں توڑ ڈالے۔ میرے اندر کبھی کبھی ایک آگ سی بھڑک اٹھتی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس وقت اگر آما ذرا سا اشارہ بھی کرتا تو میں پکے پھل کی طرح اس کی گود میں گر پڑتی۔ آخر مجھے کرٹ سے بچھڑے کئی ماہ گذر چکے تھے۔"

یکایک تالیوں کا شور بلند ہوا۔ فاطمہ کا لیک اور رقص ختم ہو چکا تھا۔ وائیولٹ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیٹس گو" اسنے میرین سے کہا۔

میرین بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور میں اس سے یہ نہ پوچھ سکا کہ کرٹ کون تھا اور ماما کا کیا حشر ہوا۔ دو چار رسمی جملے کہہ کر پہلے وائیولٹ نے اور پھر میرین نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر وائیولٹ دروازے کیطرف بڑھی مگر میرین وہیں کھڑی رہی جہاں کھڑی تھی۔ گویا کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور میرے دل میں امید کے جگنو رقص کر رہے تھے۔ وقت کم تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کروں یا نہ کروں۔ مگر اسنے خود ہی کہا۔ "تم ہمارے ساتھ چلوگے؟"

"ضرور" میں نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں وائیولٹ واپس آ گئی۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟"

"ندیم ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔"

وائیولٹ نے میرین کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ناپسندیدگی، غصہ اور "میں جانتی تھی" کا امتزاج تھا۔ مگر اس نے کہا کچھ بھی نہیں۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مگر مجھے جمال اور پیٹر نہیں نظر آئے۔ لہٰذا میں میرین اور وائیولٹ کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن ابھی دروازہ چند قدم دور تھا کہ پیچھے سے "ہے" کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ جمال اور پیٹر میزوں اور کرسیوں سے بچتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں رک گیا۔

"کدھر چلے؟" جمال نے پوچھا۔

"ان کے ساتھ" میں نے میرین اور وائیولٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت اچھے!" اسنے دونوں عورتوں کا سر سے پیر تک جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"سوری"

"نیور مائنڈ! اگر جلدی فرصت مل جائے تو دیا وِنتیو آ جانا۔ یہاں سے تھوڑی دور ہے۔"

"آل رائٹ"

اور میں، میرین اور وائیولٹ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

میں دیا وِنتیو میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ جمال میرے پہنچنے سے پہلے جا چکا تھا۔ پیٹر نے مجھے بتایا تھا کہ پہلی آمین

سے وہ، جمال اور فاطمہ سیدھے ویا ڈینیٹو آئے تھے اور جمال کچھ دیر رک کر فاطمہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔

"کہاں؟"

"فاطمہ کو اس کے گھر چھوڑنے۔"

"پھر تو شاید وہ یہاں واپس آئے۔"

پیٹر ہنسا تھا۔ "اس کا کوئی امکان نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے فاطمہ کو گھر چھوڑنے میں کئی گھنٹے لگیں گے۔"

میں اور پیٹر ویا آمیز کافی کے تلخ گھونٹ پیتے رہے تھے۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے کئی بار مجھے "اس جرمن عورت" کے بارے میں ٹٹولا تھا۔ مگر میں ہر بار ٹال گیا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر ٹیلی فون کرنے چلا گیا تھا۔ اور واپس آکر اسنے اعلان کیا تھا۔

"تو میں بھی چلا۔"

"کدھر؟"

اور جواب میں اس نے آنکھ مار کر کہا تھا۔ "کیرولین۔"

"کون کیرولین؟"

"اتنی جلدی بھول گئے۔ ہے نلاّ ور میں ملے تھے اس سے۔"

میں نے سوچا۔ میرا شبہ درست تھا۔

اور چلتے ہوئے اسنے کہا تھا "میرا خیال ہے کہ تمہاری جرمن دوست اب نہیں آئے گی۔"

میرا خیال بھی یہی تھا۔ اس نے وعدہ نہیں کیا تھا مگر نہ جانے کیوں شروع شروع میں مجھے یقین سا تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ جب وہ مجھے ٹیکسی تک چھوڑنے آئی تھی تو اس نے پوچھا تھا "تم اب کہاں جاؤ گے؟"

"ویا ڈینیٹو۔"

"شاید میں بھی آؤں وہاں۔ ہوسکے تو میرا انتظار کرنا۔"

میں نے کافی انتظار کیا تھا۔ اور اب —— میں نے گھڑی دیکھی —— بارہ بج رہے تھے۔ اب کیا آئے گی۔ میں نے سوچا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ویا ڈینیٹو میں اب بہت تھوڑے سے لوگ رہ گئے تھے۔ وہ بٹینک اور ہالی وڈ کے وہ نئے ایکٹر جن سے تھوڑی دیر قبل ریسٹوران بھرا ہوا تھا ایک ایک کرکے جا چکے تھے اور اب میرے پاس والی میز پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص بیس منٹ میں بجتے ہوئے اٹیلین میمبو کے ریکارڈ پر اپنے پیر سے تال دے رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک مرد اور ایک عورت محو گفتگو تھے۔ انہوں نے کہنیاں میز پر ٹیک رکھی تھیں۔ ان کے سر آگے کو جھکے ہوئے تھے اور ریسٹوراں کی نیم تاریک فضا میں ان کے منہ ایک دوسرے سے ملے

نظر آ رہے تھے۔ اور میں بلاوجہ ایک اور کافی آرڈر کر کے بڑے بڑے شیشوں میں سے چمکتی ہوئی سڑک پر پھسلتی ہوئی کاروں کو دیکھ رہا تھا۔ تھکن کا احساس رینگ رینگ کر میری ٹانگوں سے میرے سر کی طرف بڑھ رہا تھا اور میرے معدے کو آہستہ آہستہ کھرچ رہا تھا جو شام اپنے وعدے سے کر آئی تھی اس کا انجام تنہائی، تھکن اور ــــ

مگر نہیں۔ باہر ایک سپید فورڈ آ کر رکی۔ اور میں قریب قریب کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر وہ آ ہی گئی۔ لیکن یہ تو کوئی اور تھا جو کار کا دروازہ بند کر کے آہستہ آہستہ دیا دمینیو کی طرف آ رہا تھا۔

وہ جس کار پہ مجھے پیرا لیمن سے لے گئی تھی وہ بھی فورڈ تھی اور اس کا رنگ بھی سپید تھا۔ وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور میرے پاس وائیولٹ۔ اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہی کہا تھا۔ "یہ جگہ اچھی نہیں کسی بہتر جگہ چلیں۔" مگر وائیولٹ نے گھر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور باوجود میرین کے اور میرے اصرار کے اس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا تھا۔ اور عاجز آ کر میرین نے مجھ سے کہا تھا کہ "پہلے وائیولٹ کو اس کے گھر چھوڑ دیں پھر کسی جگہ چلیں گے۔" وائیولٹ میرین کی بات سنکر ایسے خاموش ہو گئی تھی گویا اسے اس پروگرام سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس پر کوئی اعتراض۔ اور پھر میرین نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی تھی۔ کون۔ کیا۔ کہاں اور کیوں قسم کے سوالات۔ اور جب میں نے اسے بتایا تھا کہ "میں کل صبح سان فرانسسکو جا رہا ہوں۔" تو اس نے تقریباً سٹیرنگ وہیل چھوڑ کر کہا تھا "لو۔" اور پھر وائیولٹ نے ـــــ شاید محض اخلاقاً ـــــ مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے لاس اینجلیس میں کیا کیا دیکھا۔ اور جب میں اسے بتا رہا تھا کہ آج صبح میں ٹوئنٹیتھ سینچوری فاکس کے سٹوڈیوز گیا تھا جہاں "ملو اینجل" کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو اس نے پوچھا تھا کہ وہاں میں نے مای برٹ کو دیکھا تھا۔ اور جب میں نے "ہاں" کہا تھا تو میرین بول پڑی تھی۔ "ڈونٹ یو تھنک شی از ویری پرٹی۔" اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں وائیولٹ نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ "خاک بھی نہیں بس جنسی اپیل ہے اس میں اور کچھ بھی نہیں۔"

وائیولٹ کا جملہ سنکر میرین نے ونڈ سکرین پر اپنی نظریں جما دی تھیں۔ اور پھر ہالی ووڈ ڈرائیو پر واقع وائیولٹ کا گھر آ گیا تھا جہاں اس نے ہمیں برانڈی پیش کی تھی۔ اور جب میں نے اسے قبول کرنے میں یہ کہہ کر پس و پیش کیا تھا کہ میں بہت پی چکا ہوں۔ تو میرین نے کہا تھا ــــ "جھوٹے۔ تم ذرا بھی ڈرنک نہیں لگ رہے۔" برانڈی ختم کر کے میں نے دو تین بار گھڑی دیکھی تھی اور آہستہ سے میرین سے کہا تھا کہ "اب چلنا چاہیئے۔ وائیولٹ کو نیند آ رہی ہو گی۔" میری بات سنکر ایک شریر مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی اور اس نے صوفے کی پشت پر سے اپنا منک اٹھاتے ہوئے وائیولٹ سے کہا تھا۔ "ڈارلنگ تم اب سو۔ ہم چلتے ہیں۔" مگر وائیولٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ مجھ سے انتہائی اخلاق سے کہا تھا کہ کیا میں ایک منٹ اور ٹھہر سکتا ہوں مجھے ایک منٹ اور ٹھہرا کر وہ میرین کو پاس والے کمرے میں لے گئی تھی۔ جو شاید سونے کا کمرہ تھا۔ دو تین منٹ بعد کمرے کا دروازہ

کھلا تھا اور وائیولٹ اور میرین ۔ دونوں مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی باہر آئی تھیں "مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر میرین کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کے سر میں شدید درد ہے۔ شاید اس نے زیادہ پی لی۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی ــــ" وائیولٹ نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا تھا اور جواب میں میں نے میرین کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ تو قالین کے ڈیزائن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن جب میں نے وائیولٹ سے ہاتھ ملانے کے بعد اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا تو اس نے کہا تھا "ٹھہرو" اور پھر اس نے وائیولٹ سے کہا تھا "تم فون کر کے ٹیکسی منگا دو" اور جب ٹیکسی آ گئی تھی تو اس نے وائیولٹ سے کہا تھا "میں ندیم کو ٹیکسی تک چھوڑ آؤں" وائیولٹ چپ رہی تھی اور میرین میرے ساتھ زینہ اتر کر پیومنٹ پر آ گئی تھی۔ اور "گڈ نائٹ" کہنے سے پہلے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا "شاید میں بھی دیا وینٹیو آؤں، ہو سکے تو میرا انتظار کرنا"

میں دیا وینٹیو میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک کر ناامید ہو گیا تھا کہ پھر سامنے ایک سپید فورڈ آ کر رکی۔ اور چند لمحوں بعد میرین میرے سامنے کھڑی تھی۔

"ہیر آئی ایم" پھر میرا بازو پکڑ کر اس نے کہا "چلو چلیں"

"کہاں؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چلو تو"

اور جب وہ کار سٹارٹ کر چکی تو اس نے ایک لمبا اطمینان کا سانس لیا۔

"خودکشی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"

میں چونک پڑا ۔ یہ پارہ خصلت عورت کیسی باتیں کرتی ہے! میں نے سوچا۔

"خودکشی کے بارے میں؟"

"ہاں۔ خودکشی کے بارے میں" وہ آہستہ سے ہنسی "میرا مطلب ہے۔ فرد کو خودکشی کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے یا نہیں"

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا"

"جانتے ہو میری رائے کیا ہے۔ سوسائٹی اگر فرد کو وہ تمام آزادیاں نہیں دلوا سکتی جن کے تحفظ کا وہ دعویٰ کرتی ہے تو پھر اسے کوئی حق نہیں کہ وہ فرد کو خودکشی کرنے سے روکے"

"مگر" میں نے اس کی نظر بچا کر اسکے قریب کھسکتے ہوئے کہا "تمہیں اس وقت خودکشی کا خیال کیسے آیا؟"

"اور قریب آجاؤ" اسنے ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اور میں جھینپ گیا "ہاں۔ ہاں اور قریب آجاؤ" اسکے لہجے میں نہ طنز تھا نہ تمسخر میں کھسک کر اس کے اور قریب آگیا۔

"مجھے خودکشی کا خیال کیسے آیا۔ وائیولٹ کے ایک جملے سے۔ جب میں اپنی سمجھ میں اسے یہ یقین دلا کر چلنے لگی کہ میں سیدھی گھر جاؤں گی تو اسنے کہا۔ تم خودکشی کرنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔"

"اس کا مطلب تھا کہ اگر تم میرے ساتھ چند گھنٹے گذاروگی تو تمہارا یہ فعل خودکشی کرنے کے برابر ہوگا؟ یا یہ کہ میں تمہیں کھا جاؤں گا؟"

وہ کھلے ہی گلے میں ہنسی۔ "تم وائیولٹ کو نہیں جانتے۔ وہ بڑی سویٹ ہے اور میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ میں جب ڈرنک کرتی ہوں تو ٹھیک سے ڈرائیو نہیں کر سکتی۔ ایک آدھ بار ایکسیڈنٹ بھی کر چکی ہوں۔ اس کا اشارہ ایسی بات کی طرف رہا ہوگا۔" اس کے منہ سے شراب کی بو ضرور آ رہی تھی مگر وہ ڈرائیو بالکل ٹھیک کر رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ یہ عورت کامیاب دروغ گو نہیں ہو سکتی۔

یکایک وہ بہت سنجیدہ ہو گئی۔ "اور اگر میں دراصل خودکشی کرنا چاہوں۔ یہ تو کار سامنے سے آ رہی ہے اس سے اپنی کار ٹکرا کر مر جانا چاہوں تو وائیولٹ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ ایسے بول رہی تھی جیسے محو خود کلامی ہو۔ "وائیولٹ اگر مجھے وہ نہیں دلوا سکتی جو میرا فطری حق ہے تو اسے یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ مجھے خودکشی کرنے سے روکے۔"

"کونسا فطری حق؟"

"کوئی بھی حق۔ پیٹ بھرنے کا۔ بدن ڈھکنے کا۔"

"کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟" میں نے گفتگو کو سنجیدگی کی اس بلند سطح سے نیچے کھینچتے ہوئے کہا جہاں وہ اسے لے گئی تھی۔ اور اسنے میرا اشارہ پا لیا۔

"مجھے تو نہیں لگی۔ مگر تم ضرور بھوکے ہو۔" اسنے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک تنز بر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ "چلو تو، چلتے ہیں۔ وہاں کھانا تو نہیں ملتا مگر آڈررز اور سنیکس بہت اچھے ملتے ہیں۔ ابھی کافی رات باقی ہے۔ کھانا کہیں اور کھائیں گے۔"

"ایک شرط پر!"

"کیا؟"

"تم وہاں خودکشی نہیں کر بیٹھو گی۔"

وہ ٹھٹھا مار کر ہنسی۔ مگر فوراً ہی پھر سنجیدہ ہو گئی۔

"تم نہیں جانتے کہ میں ایک بار دراصل خودکشی کر چکی ہوں۔"

"سچ! مگر کیوں؟" میری حیرت ساری کی ساری حقیقی نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ حال میں کچھ پُرلطف

وقت گذارنا چاہتا تھا اور وہ مجھے گھسیٹ کر اپنے ماضی میں لئے جارہی تھی۔ بھلا اس کے ماضی سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی! مگر موقعہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مجھے تھوڑی بہت دلچسپی کا اظہار تو کرنا ہی تھا۔

"انسان خودکشی کیوں کرتا ہے۔ یا اپنے آپ سے چھٹکارا پانے کے لئے یا حالات اور ماحول سے۔ میں نے حالات اور ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے یہ اقدام کیا تھا۔ یہ دیکھو ۔۔۔" اس نے لائٹ جلائی اور پھر ایک ہاتھ سٹینگ ٹیبل پر سے ہٹا کر اس کی مدد سے اپنے دائیں کلے کو اس زور سے کھینچا کر اس سمت کے سارے عقبی دانت نظر آنے لگے۔ وہ سب کے سب نقلی تھے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ "میں اپنی جان تو نہ لے سکی مگر بہت سے دانت توڑ بیٹھی۔ اور ۔۔۔" پھر اس نے اسی ہاتھ سے اپنے گھیرے دار سکرٹ کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی دائیں ران کا کافی حصہ نظر آنے لگا اور گھٹنے سے سات آٹھ انچ اوپر زخم کے ایک چوڑے سے نشان پر جو نائلن کے موزے میں سے صاف نظر آرہا تھا انگلی رکھ کر بولی: "یہ بھی اسی اقدام کی نشانی ہے۔" وہ اگر اپنی ران کو پھر سکرٹ سے نہ ڈھک لیتی تو میں کچھ دیر اور اس ابھرے ہوئے زخم کو دیکھتا رہتا۔

"مگر تم نے خودکشی کیوں کی تھی؟ کرٹ کے غم میں؟"

"کرٹ۔ تمہیں اس کا نام کیسے معلوم!"

"تم ہی نے ذکر کیا تھا۔ بریل آہین میں۔"

"اوہ!"

"مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ کرٹ کون تھا؟"

میرا شوہر تھا۔ میرا حبشی شوہر۔ اس کی رنگت بھی تمہاری طرح سانولی تھی۔ اس کے بال بھی کالے تھے۔ اور وہ وائلن بہت اچھا بجاتا تھا۔ وہ میرے باپ کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ میں نے اس سے چھپ کر شادی کی تھی۔ کیونکہ نہ میرے باپ اس شادی کی اجازت دیتے اور نہ حکومت۔ مگر ان دنوں جرمنی میں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر حکومت کو پتہ چل گیا اور مجھے خود کرٹ کو مجبور کرنا پڑا کہ وہ روپوش ہو جائے۔ میں نے اسے منشن روانہ کر دیا جہاں میری ماں رہتی تھیں۔ مگر جس دن وہ منشن پہنچا اسی دن میری ماں کو گرفتار کر کے کنسنٹریشن کیمپ میں ڈال دیا گیا اور ان کے ساتھ کرٹ کو بھی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میری ماں نے میرے باپ کو چھوڑ کر ایک غیر جرمن سے شادی کر لی تھی۔ رومانیہ کے ایک مسلمان سے۔ وہ چاہتیں تو ملک چھوڑ کر بھاگ جاتیں مگر وہ کہا کرتی تھیں کہ میں جرمنی کے باہر نہیں رہ سکتی۔ وہ جرمنی میں رہیں اور جرمنی میں مریں۔ آج ان کی برسی ہے۔"

"اور کرشن؟"

"پھر اس کا پتہ نہیں چلا۔ شاید مر گیا۔"

"اور تم نے اس کے غم میں خودکشی کرنے کی کوشش کی؟"

"نہیں۔ میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کنسنٹریشن کیمپ میں کی تھی۔ کرشن کے روپوش ہونے کے چند ماہ بعد مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔"

اس نے اچانک بریک لگا کر کار کو ایک ریستوراں کے سامنے روک لیا جس کے دروازے کے اوپر نشان چِپی کا بورڈ لگا ہوا تھا

"آؤ ذرا دیر کے لئے یہاں کچھ تک لیں" اس نے انجن بند کرتے ہوئے کہا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"معمولی سی جگہ ہے" اس نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "مگر مجھے بہت پسند ہے۔ یہاں کا زیادہ تر سٹاف جپسی ہے اور کچھ ہنگیرین ہیں۔"

ریستوراں میں تھوڑے سے لوگ تھے۔ ان میں سے چند بار کے سامنے سٹولوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ کھانے کی میزوں پر۔ ریستوراں کے بیچوں بیچ کھڑا ایک شخص وائلن بجا رہا تھا اور اس کے عقب میں ایک شخص پیانو بجا رہا تھا۔ میرتین کو دیکھ کر وائلن اور پیانو بجانے والوں نے گردن کے خم سے اس کا استقبال کیا۔ اور ایک نوجوان نے جو بار کے پیچھے کھڑا تھا کہا "ویلکم"

"یہ جم ہے" روتانا نے اپنا بٹوہ بار کے کونٹر پر رکھ کر ایک سٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا "ہنگری کا باشندہ ہے۔ وہاں طالب علم تھا۔ ۱۹۵۶ء کے فسادات میں اس کے باپ اور ماں مارے گئے اور یہ بھاگ کر یہاں آ گیا۔ بہت سویٹ لڑکا ہے۔"

"تھینک یو۔"

"اور یہ ندیم ہے۔ ہندوستان سے آیا ہے۔"

"پاکستان سے۔"

"سوری۔ پاکستان سے۔"

"تم لوگ کچھ پیو گے" جم نے مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔

"یس۔ سٹنگر فوری پلیز۔ اینڈ واٹ اباؤٹ یو؟" میرتین نے کہا۔

"سکاچ اینڈ سوڈا" میں نے جم سے کہا۔

میرتین کے سامنے سٹنگر کا اور میرے سامنے وسکی کا گلاس رکھ کر جم نے مجھ سے پوچھا "تمہارا وزیر اعلیٰ

نہرو ہے ؟"

"نہیں۔ نہرو ہندوستان کا وزیراعلیٰ ہے اور پاکستان کا دشمن۔ ہمارا پریذیڈنٹ جنرل محمد ایوب خان ہے۔"

"ہاں۔ ہاں" جم نے ایسے کہا گویا اسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ "میں نے پچھلے سال اخباروں میں اس کے فوٹو دیکھے تھے۔ بہت ہینڈسم شخص ہے۔"

"ہاں۔ بہت ہینڈسم اور بہت گریٹ۔"

"یہ بھی بہت ہینڈسم ہے۔" میرین نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے اپنا منہ اسکے کان کے پاس لے جا کر کہا "تھینک یو ہنی۔" اور اس نے اسی بے تکلفی کا مظاہرہ اپنے بغیر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا دیا۔

وائلن بجانے والا وہ دھن ختم کر کے جو وہ بجا رہا تھا۔ میرین کے پاس آیا اور ایک بار پھر گردن جھکا کر اسنے دریافت کیا کہ کیا "لیڈی" کوئی خاص دھن سننا پسند کریں گی۔ میرین نے اسے کسی جرمن دھن کا نام بتایا۔ اور گلاس ہاتھ میں لے کر بار کی طرف پیٹھ کر لی۔

"یہ شخص" اس نے وائلن بجانے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جرمن ہے اور جبتی ۔ یہ کرٹ کو جانتا تھا۔"

اس نے وائلن کے تاروں کو چھیڑا اور آہستہ آہستہ ایک انتہائی دردناک نغمہ تمل جبتی کی بوجھل فضا میں پھیلنے لگا اور جب وہ فرمائش پوری کر چکا تو میرین نے مجھ سے کہا۔ "ہی میڈ اٹ ایکسٹرا سیڈ ٹو نائٹ۔" اور جب وائلن والا دوبارہ اس کے پاس آیا تو میرین نے مجھ سے پوچھا "تمہیں ڈانس کرنا آتا ہے ؟"

"تھوڑا سا۔"

"سلو والٹز کر سکتے ہو ؟"

"سیکھا تو تھا۔"

"اے سلو والٹز پلیز" اسنے وائلن بجانے والے سے کہا اپنی ڈرنک ختم کر کے وہ سٹول سے اتر آئی۔ اسنے اپنا منک اتار کر سٹول پر رکھ دیا۔ اور جب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر فلور کی طرف چلی تو یکایک لڑکھڑا سی گئی۔

"آر یو آل رائٹ" میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم اے لٹل ڈرنک۔ سوئیٹ ہارٹ۔"

اس کی چال کی لغزش اور اس کی آنکھوں کے نشیلے پن نے اس کے بیان کی تصدیق کی۔ میں خوش ہوا۔ [illegible] بھی تو گیا تھا۔

وہ ڈانس نہیں کر رہی تھی، تیر رہی تھی۔ کبھی آنکھیں بند کر کے کھو جاتی اور کبھی آنکھیں کھول کر ان کا نشہ میری آنکھوں میں انڈیل دیتی۔ رقص کے دوران میں میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں اس کی آنکھیں تھیں جو بڑی نہیں تھیں مگر جن میں بلا کی کشش تھی۔ جب وہ انہیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتی تو ایسا معلوم پڑتا کہ گویا ان میں ڈھیلے نہیں مقناطیس کے ٹکڑے ہیں۔ اس کی ناک لمبی تھی اور نتھنے تنگ جنہیں دیکھ کر شبہ ہوتا کہ کسی بھی لمحے ان میں سے آگ نکلنے لگے گی۔ اس کا دہانہ چھوٹا تھا جس کے گوشوں کی لکیریں رخساروں پر دور تک کھنچی ہوئی تھیں۔ اس کی جلد شفاف تھی اور اس کے بال بھورے تھے۔ جو اسکے بائیں رخسار کے تقریباً نصف حصے کو ڈھکے ہوئے تھے۔ اس کا قد پستہ تھا وہ نیچے گلے کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی جس میں سے اسکے سینے کا نشیب و فراز نظر آ رہا تھا۔ اس کا گھیر دار سکرٹ بمشکل اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تمہارے ملک کے ڈانس بہت اعلیٰ قسم کے ہوتے ہیں"

"ہاں۔ مگر وہ تمہارے ڈانسوں سے مختلف ہوتے ہیں"

"کیسے؟"

"تکنیک کے اعتبار سے۔ اور ان میں آرٹ زیادہ ہوتا ہے اور جنس کم"

"پاپا بھی اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ آخر تم مشرقی لوگ جنس کو اتنا برا۔ اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہو۔ جنس کا نفرت سے نہیں محبت سے تعلق ہے۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ بغیر جنس کے انسان کی زندگی کتنی مکروہ ہو سکتی ہے"

"مگر جنس انسان کی درندگی کی نمائندگی بھی تو کرتی ہے" میں نے یہ بات محض بات کو آگے بڑھانے کی خاطر کہا ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ جنس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاؤں۔

"انسانی فطرت کے بہت سے عناصر درندگی کی ترغیب دیتے ہیں بھوک مٹانے کے لئے انسان مستقل درندگی کا ثبوت دیتا ہے"

"کبھی کبھی جنسی بھوک مٹانے کے لئے بھی انسان درندہ بن جاتا ہے"

"ٹھیک ہے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لئے کبھی کبھی انسان انسان کو کھا جاتا ہے۔ مگر سب انسان نہ آدم خور ہوتے ہیں اور نہ درندے۔ میں ان لوگوں کا ذکر کر رہی ہوں جن کی زندگی میں جنس بہار بن کر آتی ہے اور پھول کھلا کر جاتی ہے"

موسیقی ختم ہو گئی تو میرین نے والٹز کی ایک اور دھن کی درخواست کی اور دوبارہ ڈانس شروع کرتے ہوئے اسنے مجھ سے پوچھا "تم نے کوئی انسانی درندہ دیکھا ہے؟"

"دیسا جس کا تم ابھی ذکر کر رہی تھیں؟"

"ہاں۔"

"نہیں۔"

"میں نے دیکھا ہے۔ بہت قریب سے۔ اچھی طرح سے۔"

"کون تھا وہ؟"

"اس کنسنٹریشن کیمپ کا کمانڈنٹ جس میں مجھے ڈالا گیا تھا۔"

"بہت ظالم تھا وہ؟"

"بہت۔"

وہ خاموش ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اسنے جھرجھری سی لی۔ میں بھی خاموش رہا۔ والٹز کی ذہنی فضا میں تحلیل ہوتی رہی۔ ہم رقص کرتے رہے۔

"ایک رات مجھے کیمپ سے اس کے گھر لے جایا گیا۔" اس کی آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ "وہ ایک دومنزلہ مکان میں رہتا تھا۔ بڑے ٹھاٹ باٹ سے۔ مجھے جس کمرے میں لے جایا گیا وہ دوسری منزل پر تھا۔ وہاں انواع واقسام کی شرابیں ایک میز پر سجی ہوئی تھیں۔ اسکے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی مگر وہ مدہوش نہیں تھا۔ اسنے مجھے شراب پیش کی جو میں نے جھجکتے ہوئے قبول کی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج کی رات میں اس کی مہمان ہوں اور اگر میرا رویہ ٹھیک رہا تو میں کیمپ کی بجائے زیادہ تر وقت اس کے مکان میں گذار سکوں گی۔ میں اس سے کئی سوال پوچھنا چاہتی تھی مگر میں اتنی سہمی ہوئی تھی کہ ایک بھی نہ پوچھ سکی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگا دیا گیا اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھانے کی میز پر لے گیا۔ 'تم نے ایسا کھانا عرصے سے نہیں کھایا ہوگا۔' اس نے فخریہ کہا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کھانے میں ایسی بہت سی چیزیں شامل تھیں جو ان دنوں جرمنی میں بالکل نہیں ملتی تھیں۔ مگر پھر بھی نوالے میرے حلق میں پھنستے رہے۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو اسنے کہا۔ 'آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔' اور پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک کمرے میں لے گیا جس میں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ 'تم چاہو تو یہاں کچھ دیر آرام کرسکتی ہو۔' اسنے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ 'شکریہ۔ مگر میں تھکی ہوئی بالکل نہیں ہوں۔' 'مگر میں ہوں۔ کیا خیال ہے آؤ ہم دونوں تھوڑی دیر آرام کرلیں۔' 'نہیں، شکریہ۔' یکایک اس کا لہجہ کرخت ہو گیا۔ 'اور اگر میں حکم دوں۔' میں خاموش رہی۔ 'جواب دو۔' اسنے ڈانٹ کر پوچھا۔ میں پھر بھی چپ رہی تو اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ 'ڈرو مت میری جان۔ میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔' میں نے خود کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی تو اس نے زبردستی اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر چسپاں

کر دیئے۔ یکایک میری کھوئی ہوئی ہمت واپس آگئی۔ میں نے اس کا منہ نوچ لیا۔ اس کے سینے پر مکوں کی بارش کر ڈالی اور اس زور سے اس کے ہاتھ کو کاٹا کہ اس لمبے تڑنگے آدمی کی چیخ نکل گئی۔ اور اسنے میرے رخسار پہ اس زور سے تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں چکرا کر اس بستر پہ گر پڑی جس پہ وہ چاہتا تھا کہ میں آرام کروں اور جب میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنا جیکٹ اتار کر ایک خونخوار درندے کی طرح بستر کی طرف آرہا ہے۔ اسکے بعد ـــ"

"اس کے بعد تم نے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چھلانگ لگادی"

اس نے عورت نے میری طرف دیکھا شاید وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کہیں میں اسے جھوٹا تو نہیں سمجھ رہا ہوں۔

"نہیں" اسنے آہستہ سے کہا۔ "اس کے بعد کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اسنے اپنا سر میرے کاندھے پر لگا دیا۔ بہت ظالم تھا وہ۔ اس نے میرے وجود کو اس بری طرح سے زخمی کیا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ ہر رات جو مجھے اس کے ساتھ گذارنی پڑتی تھی جہنم کی رات ہوتی تھی۔ اسے ہر رات اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ایک نئے انداز۔ ایک نئے اسلوب کی ضرورت پڑتی تھی۔ اور ہر رات مجھ پر نئے ستم ڈھائے جاتے تھے۔ میری مدافعت اس آگ کو جو شاید اس کے اندر ہمہ وقت جلتی رہتی تھی اور بھڑکاتی تھی اور وہ میرے جسم پہ قابو پانے کے لئے وہ سب کچھ کرتا تھا جو انسانی جسم کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ مجھے مارتا تھا میرے ہاتھ پیر باندھ دیتا تھا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا تھا۔ میرے بال پلنگ کی پٹی سے اس بری طرح کس کر باندھ دیتا تھا کہ میں سر کو ذرا سی جنبش تک نہ دے سکتی تھی۔ اور کبھی کبھی یہی حال میری ٹانگوں کا کرتا تھا اور میں گھنٹوں بے بس و لاچار اس کی خواہشات کا شکار بنی پڑی رہتی تھی۔ میرے آنسو خشک ہو جاتے تھے۔ میرا حلق خشک ہو جاتا تھا۔ میرے بدن کا ریشہ ریشہ دکھنے لگتا تھا۔ اور ایک آنچ میری تمام ہستی کو جھلسا کرتی تھی۔ آخر ایک رات اسے یہ یقین دلا کر کہ اب میں مزید مزاحمت نہیں کروں گی میں نے موقعہ پا کر دوسری منزل کے اس کمرے سے چھلانگ لگادی۔ مگر میں بہت سخت جان ہوں۔ پھر بھی بچ گئی۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے پوچھا ـــ "پھر؟"

"پھر اسنے میرا سر گھٹوا دیا۔ پھر بھوک تھی۔ پھر عذاب تھا۔ اور ایک موہوم سی امید کہ شاید کسی دن یہ عذاب ختم ہو جائے۔"

"اور آخر وہ عذاب ختم ہو گیا۔"

"ہاں۔ وہ عذاب ختم ہو گیا۔ ہٹلر جنگ ہار گیا۔ اور مجھے کنسنٹریشن کیمپ سے رہائی مل گئی۔ مگر کیسی رہائی۔ ایک تندرست۔ خوبصورت لڑکی کیمپ میں داخل ہوئی تھی۔ اور ایک لاغر۔ نیم مردہ عورت کیمپ سے رہا ہوئی۔ جس کا باپ مر چکا تھا جس کی ماں مر چکی تھی۔ جس کا شوہر مر چکا تھا جس کے سارے دوست نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ جو اپنے وطن میں اجنبی تھی۔ اپنے وطن میں اجنبی ہونا بھی کتنا روح فرسا ہوتا ہے!"

اتفاق سے اسی وقت وائلنز کی دوسری دھن ختم ہو گئی اور وطن میں اجنبی ہونے کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کئے بغیر ہی میریَن کا بازو پکڑے بار کی طرف آ گیا۔

"کچھ اور پیو گے؟" تم نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے میریَن کی طرف دیکھا جو سٹول پر بیٹھ چکی تھی۔ "اگر یہ دو ایک پیگ اور پی لے تو اچھا ہی ہے" میں نے سوچا۔ "ہاں۔ وسکی اور سوڈا میرے لئے اور میریَن کے لئے ایک اور سٹنگر؟"

قبل اس کے کہ میریَن کچھ کہے ایک شخص نے جو میریَن کے پاس والے سٹول پر بیٹھا ہوا تھا اس سے کہا۔

"مے آئی بائی یو اے ڈرنک؟"

میریَن نہ صرف خاموش رہی بلکہ اسنے اس شخص کی طرف دیکھا تک نہیں جس کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دھت ہے۔

اسنے پھر میریَن کی طرف جھک کر کہا "ہنی۔ مے آئی؟"

اور دوسرے لمحے میریَن کا ہاتھ اس زور سے اس شخص کے منہ پر پڑا کہ آس پاس کے سب لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

میں نے میریَن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

تم نے ہاتھ کے اشارے سے ایک ویٹر کو بلا کر اس سے کچھ کہا اور ویٹر اس شخص کا بازو پکڑ کر اسے نائٹ کلب کے باہر چھوڑ آیا۔

"بڑا خراب ہے تمہارا غصہ!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیہاتی کہیں کا!" وہ سٹنگر کا پورا گلاس ایک سانس میں ختم کر گئی۔ "آؤ چلیں۔"

میں نے بھی اس کی تقلید کی اور ہم دونوں باہر آ گئے۔

ہم لوگ جتنی دیر لو آر میں بیٹھے رہے رو آنا مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتی رہی اور کئی بار اسنے گفتگو کے دوران میں میرا ہاتھ بھی دبایا۔ اس لئے جب لو آر سے باہر آنے کے بعد اسنے کہا "چلو تمہیں لاس اینجلس کی سیر کرا دوں" تو مجھے تعجب ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب وہ مجھے اپنے گھر لے جائے گی۔

"مگر اس وقت کیا خاک سیر ہو گی۔"

"کیوں نہیں۔ کیا تم اپنے ہوٹل جانا چاہتے ہو؟"

"نہیں، نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مگر اس وقت دو بج رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔"

"میرا خیال تھا کہ کچھ وقت تمہارے گھر گذارا جاتا۔"

اسنے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔ اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"مگر تم جانتے ہو میں گھر جا کر کیا کروں گی؟"

"کیا؟"

"سو جاؤں گی۔"

"تمہیں نیند آ رہی ہے؟"

"ہاں۔ بہت زور کی۔ اور آج میں نے شراب بھی بہت پی لی ہے۔"

وہ شریر مسکراہٹ ابھی تک اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

"پھر تو کیا کہتے ہو۔" اسنے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"پہلے لاس اینجلیس کی سیر۔"

وہ مجھے لاس اینجلیس کے نشیب و فراز دکھاتی رہی اور مقامات پہچنواتی رہی۔ یہ مشہور چینی تھیٹر ہاؤس ہے۔ یہ بل ایر ہے۔ یہاں سیسل۔ بی۔ ڈیمل رہتا ہے۔ یہاں ویلنٹینو رہا کرتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے ویلنٹینو کیسے مرا؟"

"نہیں۔"

"بہت سے قصے مشہور ہیں۔ مگر ـــــ تم نے لیڈی ان بلیک کا ذکر سنا ہوگا۔"

"ہاں۔"

"اسی نے مارا تھا اسے۔"

"مارا تھا۔"

"ہاں۔ کاٹ کے۔"

"کاٹ کے؟"

"ہاں۔ مارے جلن کے۔ اور اسی سے اس کی موت واقع ہوئی۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"مجھے مارلین ڈیٹریخ نے بتایا تھا۔"

"تم جانتی ہو اسے؟"

"اچھی طرح سے۔ ان دنوں لاس ویگاس میں ہے۔ یہاں ہوتی تو تمہیں ملاتی اس سے ــــ اور یہ تمہارے ہاں کے ایک سوامی کا آشرم ہے۔" اسنے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ "آؤ ذرا دیر کے لئے یہاں چلیں۔"

سرسبز آشرم پر ٹھٹھری ہوئی چاندنی کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

"یہاں ہر مذہب کے لئے ایک پتھر نصب ہے۔" اسنے آشرم کے اگلے حصے میں ایک قوس کی صورت میں نصب کی گئی سپید پتھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم ہندو ہو؟"

"نہیں مسلمان۔"

"یہ تمہارا پتھر ہے۔" اسنے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا جس پر چاند تارا کھدا ہوا تھا۔

میں نے جھک کر کھدے ہوئے چاند تارے کو دیکھا اور پھر ہم ایک تنگ راستے سے ہو کر جس پر بیلوں کی چھت پڑی ہوئی تھی آشرم کے پچھلے حصے میں آ گئے جس میں ایک مصنوعی جھیل گہری نیند سو رہی تھی۔ جھیل کا پانی چاند کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں بطخوں کا ایک جوڑا اپنے پروں میں اپنی گردیں چھپائے سو رہا تھا۔ جھیل کے دوسری طرف ایک ٹیلے پر بے شمار رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔

"بڑی خوبصورت جگہ ہے یہ۔" میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے منظر میں کھو کر کہا۔

"بے حد خوبصورت۔ میں یہاں اکثر آتی ہوں۔ جب تنہائی اور اداسی اور اکتاہٹ کا مجھ پر حملہ ہوتا ہے تو یہاں مجھے سکون ملتا ہے۔"

"مگر اس وقت تو تم تنہا نہیں۔" میں نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اسنے آہستہ سے کہا اور اپنا سر میرے کاندھے پر ٹیک دیا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا بدن ڈھیلا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو اس کے ہونٹ خود بخود تھوڑے سے کھل گئے اور میں نے ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور پھر یکا یک اس کا ڈھیلا بدن گویا تن گیا۔ اسنے اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں سے نوچ لیا اور مجھ سے جدا ہو گئی۔

"آؤ چلیں۔" اسنے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا اور جا کر کار میں بیٹھ گیا۔
میرتن بہت دیر تک خاموشی سے کار چلاتی رہی۔
"ناراض ہو گئیں؟"
"نہیں" اس کی آواز میں ناراضگی کا ذرا سا عنصر بھی نہیں تھا۔
"پھر بات کیوں نہیں کرتیں!"
وہ چند لمحے میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر یکایک اس نے کار روک دی۔
"تم کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو؟"
"تم کیا کرو گی جان کر!"
"میں چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہارے ہوٹل چھوڑ آؤں۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے اور میں گھر جا کر سونا چاہتی ہوں"
"مگر مجھے تو قطعاً نیند نہیں آ رہی"
"تو تم جاگتے رہو"
"مگر میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ جاگیں اور یہ رت جگا تمہارے گھر ہو"
"تم بہت ضدی ہو" اس کے لہجے میں اپنائیت اور پیار کی لٹک تھی۔
"میں تمہیں گھر لئے چلتی ہوں" اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا "مگر ایک شرط پر"
"وہ کیا؟"
"وہ یہ کہ تم میری نیند میں مخل نہیں ہو گے۔"
"ہرگز نہیں بس گھنٹے دو گھنٹے بعد تم سو جانا"
اس نے بریک پر پیر رکھا "تو یہیں اتارے دیتی ہوں تمہیں"
"اچھا بابا تم جاتے ہی سو جانا اور مجھے تاشوں کی ایک گڈی دے دینا۔ میں پیشنس کھیلوں گا"
جواب میں اس نے آہستہ سے میرا کان کھینچا۔
میرتن کا اپارٹمنٹ ایک دو منزلہ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر تھا۔ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی ہر چیز پر سلیقے کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور وہاں کی ہر چیز ذوق کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ لمبے زیادہ اور چوڑے کم ڈرائنگ روم کے ایک سرے پر ایک چمکتی ہوئی بادامی رنگ کی لکھنے کی میز بچھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے دیوار پر ایک

کوٹ آف آرمز لٹک رہا تھا جس پر سنہری حروف میں فونٹین بلو لکھا ہوا تھا۔ میز کے پاس ایک بک شیلف رکھی ہوئی تھی جس میں پندرہ بیس کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک "گونکورز کی ڈائری" تھی اور دوسری "نیورمبرگ ٹرائلز"۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک فاختئی رنگ کا صوفہ سیٹ بچھا ہوا تھا۔ اور فرش اسی رنگ کے ایک دبیز قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا "گرنڈگ" ریڈیو گرام رکھا ہوا تھا۔ اور ایک چھوٹا سا فانوس چھت سے لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر کریم کے رنگ کا روغن تھا۔ صوفے کے پیچھے والی دیوار پر ایک روغنی تصویر آویزاں تھی جس میں ایک مرد اور ایک عورت مکمل برہنگی کی حالت میں ایک دوسرے سے بغل گیر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

"معلوم ہے وائیولٹ جب بھی اس تصویر کو دیکھتی ہے تو کیا کہتی ہے؟" اسنے میری نگاہوں کا تصویر تک تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا؟"

"دے آر سٹل ایٹ اِٹ!"

پھر میری آن نے جھک کر ریڈیو گرام کھولا اور ایک ریکارڈ لگا دیا۔

"یہ تو ستار ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مگر یہ تمہارے ملک کے ایک آدمی نے بجایا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔"

"روی شنکر ہوگا۔"

"شاید یہی نام ہے اس کا۔ میں اس ریکارڈ کو اکثر بجاتی ہوں۔ اس کی موسیقی مجھے مجھ سے دور لے جاتی ہے۔"

"یہی وقت ہے اس راگ کے بجانے کا۔ اسے بھیرویں کہتے ہیں۔"

ستار کی نرم موسیقی پچھلے پہر کی فضا میں تحلیل ہوتی رہی اور وہ مجھے اپنا "چھوٹا سا گھر" دکھاتی رہی۔ ڈرائینگ روم کے اس حصے سے ملحق جس میں لکھنے کی میز بچھی ہوئی تھی کھانے کا کمرہ تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان جالی کا سپید پردہ پڑا ہوا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کے اوپر بھی ریشمی جالی کے لیس لگے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کھانے کے چھوٹے سے کمرے کے بیچوں بیچ ایک گول میز بچھی ہوئی تھی جس کے گرد چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سائڈ بورڈ پر ایک پلاسٹر آف پیرس کی وینس رکھی ہوئی تھی۔

"کچھ پیوگے؟" اسنے سائڈ بورڈ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے تمہارے پاس؟"

"ریڈ وائن۔"

"لاؤ۔"

اسنے ایک تراشیدہ گلاس اور ایک بوتل نکالی اور گلاس کو سرخ شراب سے بھر دیا۔

"اور تم؟"

"نہیں۔ میں بہت پی چکی ہوں۔ دراصل میں شراب بہت کم پیتی ہوں۔"

"تو پھر آج زیادہ کیوں پی لی نہیں؟"

"آج میری ماں کی برسی ہے۔" اسنے ایک چسکی لی۔

"تب یا تھا تم نے۔"

"اور یہ میرے سونے کا کمرہ ہے۔" اسنے ڈرائینگ روم کا وہ حصہ عبور کر کے جس میں صوفہ بچھا ہوا تھا ایک چوکور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

کمرے کے بیچ میں ایک بہت بڑا اور بہت خوبصورت پرانی وضع کا پلنگ بچھا ہوا تھا جس کے پائنتی ایک سنہری ساٹن کا لحاف تہہ کیا رکھا ہوا تھا۔ سارے فرش پر ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ پلنگ کے دونوں طرف دو چھوٹی چھوٹی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔

اس نے ان میں سے ایک کی دراز کھول کر سگریٹ کا ایک پیکیٹ کھولا۔

"یہ جرمن سگریٹ ہے۔" اسنے مجھے ایک سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ شراب۔" اسنے میرے ہاتھ میں جو گلاس تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی جرمن ہے۔ میرے پاس زیادہ تر چیزیں جرمنی کی ہیں۔"

"تمہیں بہت محبت ہے اپنے ملک سے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر تم جرمنی کیوں نہیں چلی جاتیں۔"

"جرمنی کیوں نہیں چلی جاتی۔" اسنے آہستہ سے میرا سوال دہرایا۔ ایک لمحے خاموش رہی اور پھر بولی۔ "دراصل میں سٹیٹ لیس پرسن ہوں۔"

"مگر تم تو امریکی شہری ہو۔"

"ہاں۔ مگر میں اپنے کو سٹیٹ لیس ہی تصور کرتی ہوں۔"

یہ کہہ اسنے سگریٹ کا پیکیٹ دراز میں واپس رکھا اور میری نظر ایک بڑی سی بغیر جلی موم بتی پر پڑی۔ جو دراز کے ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی۔

میں پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے لگا تو اسنے کہا۔ "یہاں نہیں۔ تم جا کر صوفے پر بیٹھو۔ میں

کپڑے بدلوں گی ۔"

میں جاکر ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور سرخ شراب کے گھونٹ پی پی کر میرین کا لباس شب خوابی پہن کر سونے کے کمرے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا میرے کان بھیرویں کی اداس موسیقی سنتے رہے ۔۔۔ میری آنکھیں سامنے دیوار پر لگی اس رنگین تصویر کو دیکھتی رہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت مکمل برہنگی کی حالت میں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ اور میرا نشے سے بوجھل ذہن یہ سوچتا رہا کہ جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور جو کچھ میرے کان سن رہے ہیں ان میں کسی قسم کی بھی مطابقت نہیں ۔ میں نے اٹھ کر ریڈیو گرام بند کر دیا۔

" موسیقی کیوں بند ہو گئی ۔ ناریم ؟" سونے کے کمرے سے میرین کی بوجھل آواز آئی ۔

" اس قسم کی موسیقی کے لئے یہ ماحول سازگار نہیں ۔"

" میرا خیال تھا تمہیں موسیقی سے لگاؤ ہے ۔"

" اس قسم کی موسیقی سے نہیں ۔ کم از کم اس وقت تو نہیں ۔"

" اس وقت تم کس قسم کی موسیقی سننا پسند کرو گے ؟"

آواز قریب سے آئی تھی ۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا ۔ میرین شب خوابی کا لباس پہنے سونے کے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی ۔ ٹھٹھکی ہوئی ۔ گویا سوچ رہی ہو کہ آگے بڑھے یا نہیں ۔ وہ نائلن کی ہلکی نیلی بے بی ڈول پہنے ہوئے تھی اور اسکے اوپر اسی رنگ کا نائلن کا گون پہنے ہوئے تھی ۔ گون اور بے بی ڈول میں سے اس کا سرخ بدن جھلک رہا تھا ۔

باقی شراب ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے میں کھڑا ہو گیا ۔

" بتاؤں اس وقت میں کس قسم کی موسیقی سننا پسند کروں گا ۔" میں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھ کر کہا ۔

" بتاؤ ۔"

" وہ موسیقی جو تمہارے جسم سے پھوٹ کر تمہارے شب خوابی کے مہین لباس میں سے چھن رہی ہے ۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کے چہرے پر تردد کے آثار نمایاں ہو گئے ۔ مگر اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی ہے ۔ محض میری آتش شوق کو بھڑکانے کے لئے ۔ وہ اچانک سڑک پر کار روک لینا ۔ مجھ سے وعدہ لینا کہ میں اس کی نیند میں مخل نہیں ہوں گا ۔ اور یہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر تردد کا اظہار کرنا ۔ یہ سب ایکٹنگ تھا مگر کامیاب ایکٹنگ ۔

" آؤ ۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں

صوفے پر بیٹھ گئے۔

"تم اپنا وعدہ بھول رہے ہو" اسنے کمزور سی آواز میں کہا۔

"کونسا وعدہ؟" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کہ تم میری نیند میں مخل نہیں ہو گے۔"

"میں کب مخل ہو رہا ہوں تمہاری نیند میں۔ میں تو تمہیں سلانے کا انتظام کر رہا ہوں۔"

"شریر کہیں کے۔" اسنے آہستہ سے میرا کان کھینچتے ہوئے کہا

"یہ کہہ کر اس کے پاس آ گیا۔

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میں تمہیں خوابوں کی دنیا میں لے جاؤں گا جہاں نہ اداسی ہو گی۔ نہ اکتاہٹ اور نہ تنہائی۔"

"نہ اداسی۔ نہ اکتاہٹ، نہ تنہائی" اسنے میرے الفاظ دہرائے۔

"ہاں" میں نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا

"پھر زندگی میں کیا رہ جائے گا۔"

"کیوں۔ کیا زندگی نام ہے اداسی۔ اکتاہٹ اور تنہائی کا" میں نے اپنے بازو کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مگر تم نہیں سمجھ سکو گے۔"

"کیوں؟" میں نے اسکے چہرے کو اپنے چہرے کے سامنے جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ تم نے اداسی۔ اکتاہٹ اور تنہائی کا مستقل عذاب نہیں سہا ہے۔"

اب اس کا چہرہ بالکل میرے چہرے کے سامنے تھا۔ اور اس کے بدن کا بالائی حصہ میری گود میں جھکا ہوا تھا۔ باتیں بہت ہو چکیں۔ میرے دھندلائے ہوئے ذہن نے کہا۔ اور میں نے ایک ہاتھ اس کے سر کے نیچے رکھ کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر جما دیئے۔ میری تین نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سارا بدن ایک اٹھتی ہوئی لہر کی طرح میرے بدن سے ٹکرانے پر تل گیا ہے۔ میں اسکے اوپر اور جھک گیا اور میرے چہرے کا بوجھ اسکے چہرے پر بڑھ گیا۔ اس کا سر ڈھلک کر پیچھے کو ہو گیا۔ اس کی سانسوں میں لو چلنے لگی اور اسپر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"ندیم!"

یہ چار حرف جو اس نے آہستہ سے۔ کراہ کر ادا کئے تھے میرے خون میں حلول ہو کر میرے سارے وجود میں سنسنانے لگے۔ میں نے اسے گود میں بٹھا کر اس زور سے سینے سے لگایا کہ مجھے خود اپنی پسلیاں ٹوٹتی

ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"ندیم!" یہ چار حرف اسنے پھر کراہ کر ادا کئے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس کی آواز ڈوب رہی تھی اور اب ابھر رہی تھی۔

"یس! ڈارلنگ!" میں نے اپنی پسلیوں کے ٹوٹنے کی فکر کئے بغیر اسے اپنے سینے میں سمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو۔" اس کا ڈھلکا ہوا سر ذرا سا اوپر اٹھ آیا تھا اور اس کا ڈھیلا بدن سخت ہو چلا تھا۔

"کیوں؟" میں نے اس کے ملائم۔ تہ دار بالوں میں اپنا چہرہ گم کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ ندیم!" اب اس کی آواز پاتال سے ابھر کر سطح پر آگئی تھی۔ اور اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ کس گیا تھا "میں درخواست کرتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔" اس کی آواز میں وحشت کا شائبہ تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اسکے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سر کو حتی المقدور میرے سر سے دور ہٹے گئی تھی۔ اور اس کوشش میں اس کے بدن کا بالائی حصہ کمان کی طرح تن گیا تھا۔ اگر میرے دونوں ہاتھ اس کی کمر کا حلقہ نہ کئے ہوتے تو وہ کب کی فرش پر گر پڑی ہوتی۔ وہ وحشت جس کا صرف شائبہ اس کی آواز میں تھا اس کی آنکھوں میں دیوانوں کی طرح رقصاں تھی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور سیاہ نظر آنے لگے تھے۔ اسکے نتھنے پھیل گئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ ابھی آگ برسانے لگیں گے۔

میں نے اس کی درخواست کی پرواہ کئے بغیر اپنی وحشت کی لگام چھوڑ دی اور ایک ہاتھ اس کی گردن کے گرد ڈال کر اس کے سر کو اس زور سے اپنی طرف کھینچا کہ ہمارے چہرے ٹکرا گئے۔ اور میرے ہونٹ پھر اسکے ہونٹوں سے جا ملے۔

"خدا کے لئے ندیم!" اسنے بڑی مشکل سے اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں کے دباؤ سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"مگر کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مجھے تو وہ مجسم خواہش نظر آ رہی تھی۔

حیرت نے میرے ذہن کو میرے مقصد سے ہٹایا تو اس کے جسم پر میرے ہاتھوں کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑ گئی اور وہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی۔

"اب تم جاؤ۔" وہ ہانپ رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے" اس نے ان بالوں کو جو اسکے چہرے پر آ گئے تھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ روزانا ایک قدم پیچھے ہٹی۔ مگر میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور دوسرے لمحے اس کا بدن پھر میرے بازوؤں کی گرفت - انتہائی سخت گرفت میں تھا۔

"خدا کے لئے ندیم!" اس کی آواز میں التجا تھی۔ اور اسکے چہرے پر دہشت کے پہرے تنے ہوئے تھے۔

"ہرگز نہیں" اب میں بھی ہانپ رہا تھا۔ مگر میری آواز میں ارادے کی پختگی تھی۔

"یو کانٹ سویٹ ہارٹ۔ آئی کانٹ!" اس نے خود کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بکواس کی پرواہ کئے بغیر میں نے اسے گود میں اٹھا کر سونے کے کمرے میں لے جانے کی کوشش کی۔ اس نے بہت ہاتھ پیر چلائے مگر میری گرفت سے نہ نکل سکی۔ پھر یکایک اس نے میری گردن پر اس زور سے کاٹا کہ میری چیخ نکل گئی اور وہ میری گرفت سے آزاد ہو گئی۔

"تم چلے جاؤ۔ ابھی۔ اسی وقت" اب اس کی آواز میں نفرت تھی۔ غصہ تھا۔ حقارت تھی۔ لہٰذا آگ تھی۔ "ورنہ ......" وہ ابھی تک ہانپ رہی تھی۔

"ورنہ ؟" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ"

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا"

"تو پھر میں پولیس کو فون کرتی ہوں" اس نے سونے کے کمرے کا رخ کرتے ہوئے کہا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔

قبل اس کے کہ وہ سونے کے کمرے میں داخل ہو۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پولیس کو فون کرو گی۔ میں نے سوچا یہ محض دھمکی ہے۔ "کم آن ڈونٹ بی سلی!"

جواب میں اس نے ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور چلائی "آئی ٹولڈ یو۔ آئی کانٹ" اسکی آواز کمرے میں ایسے گونجی جیسے رات کے وقت قبرستان میں کسی کریہہ الصورت پرندے کی آواز گونجے۔

"[illegible] گیٹ آؤٹ"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور غور سے اسکے چہرے کی طرف دیکھا ایک دوسری میری ین میرے سامنے کھڑی تھی۔ جیسے ابھی ابھی کسی پاگل خانے سے چھوٹ کر آئی ہو۔

"آل رائٹ!" میں نے آہستہ سے کہا اور مڑ کر اس دروازے کی طرف چلا جس سے کچھ دیر قبل اُس اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا لیکن میرے دروازے تک پہنچنے سے قبل وہ وہاں موجود تھی۔ اس نے تیزی سے چٹخنی کھولی اور دروازے کو نیم وا کر کے کھڑی ہو گئی۔

"گڈ نائٹ!" میں نے دروازے میں سے گذرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

جواب میں اس نے اس زور سے دروازے کو بند کیا کہ ڈرائنگ روم میں لٹکی ہوئی وہ روغنی تصویر جس میں ایک مرد اور ایک عورت مکمل برہنگی کی حالت میں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ یقیناً اپنی جگہ سے ہل گئی ہو گی۔

پھر جیسے کوئی بے سدھ بے سست ہو کر دروازے سے ٹک گیا۔ اور چند لمحوں بعد میرے کانوں میں سسکیوں کی آواز آئی۔ یا شاید یہ میرا واہمہ رہا ہو۔ یہ سسکیوں کی آواز!

"پاگل!" میں نے زیر لب کہا۔ اور گردن کے اُس حصے کو سہلاتا ہوا جہاں میرتن نے کاٹا تھا۔ سڑک پر آگیا۔

ہماری کتابیں

سیاہ سورج سفید سائے

خواجہ احمد عبّاس

(۱)

دنیا کے سب سے بڑے شہر کی روشنیاں ایک گہرے دھند کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
ایسا لگتا تھا کہ جنوری کی اُس شام کو جب ٹمپریچر صفر سے نیچے آچکا تھا دھوئیں کا ایک عالمگیر بادل مستقل ٹھہر کر زمین و آسمان پر چھا گیا ہے اور اب کبھی دنیا میں روشنی نہیں ہوگی۔ کبھی برف نہیں پگھلے گی، کبھی پھول نہیں کھلیں گے، کبھی بہار نہیں آئے گی۔

یہ دھواں پانی برسانے والے بادلوں کی طرح سمندر سے نہیں اٹھا تھا، یہ دھواں آسمان سے نہیں اترا تھا۔ یہ دھواں قدرت نے نہیں انسان نے تخلیق کیا تھا۔ مگر یہ اُن چولھوں کی آگ کا دھواں نہیں تھا جن پر عورتیں گرم گرم روٹیاں سینک کر اپنے بچوں کو کھلاتی ہیں۔ یہ دھواں ان الاؤوں کی آگ سے نہیں اٹھا تھا جن کے گرد کھیتوں اور جنگلوں میں، پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر اور سمندر کے کنارے محنت کش انسان ـــ کسان اور چرواہے اور لکڑہارے اور ماہی گیر ـــ اکٹھے ہو کر ہاتھ تاپتے ہیں اور ایک دوسرے کو پرانی داستانیں اور درد بھرے لوک گیت سنا کر جاڑے کی لمبی لمبی راتیں گزارتے ہیں۔
یہ دھواں اٹھا تھا ان کارخانوں کی چمنیوں سے جہاں کپڑا بُنا جا رہا تھا۔ مگر یہ کپڑا دنیا کے ان کروڑوں انسانوں کے لئے نہیں تھا جو غربت کے مارے اس سردی کے موسم میں بھی ادھ ننگے گھومنے پر مجبور ہیں۔ یہ دھواں اٹھا تھا موٹروں کے ان کارخانوں سے جہاں ہزاروں موٹریں تیار ہو رہی تھیں جن کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یہ دھواں اٹھا تھا ان کھلیانوں سے جہاں لاکھوں ٹن گیہوں کو جان بوجھ کر آگ لگا دی گئی تھی تا کہ اناج کی منڈیوں کا بھاؤ نہ گرنے پائے چاہے دنیا کی آبادی کا چوتھائی حصہ کال کے مارے مر جائے۔ یہ دھواں اٹھا تھا اُن پوشیدہ کارخانوں سے جہاں ایٹم بم ڈھالے جا رہے تھے۔ جہاں زہریلی گیسیں بنائی جا رہی تھیں۔ جہاں جنگ کے منحوس ہتھیار تیار کئے جا رہے تھے، جہاں موت کو جنم دیا جا رہا تھا۔
یہ دھواں اٹھا تھا زمین سے آسمان کی طرف جانے کے لئے۔ مگر سردی سے ٹھٹھرے ہوئے آسمان نے اس زہریلے دھوئیں کو اپنی آغوش میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب زہر کا یہ بادل زمین اور آسمان

کے درمیان معلق تھا۔ ایک طرف اگر اس میں آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستارے گم ہو گئے تھے تو دوسری طرف زمین کی تمام روشنیاں بھی اس میں کھو گئی تھیں۔

نیو یارک کی آئیڈل وائلڈ ایرپورٹ دھند اور کہرے کی اس برفیلی چادر میں لپٹی ہوئی سردی کے مارے کپکپا رہی تھی، جب ریڈار کی مدد سے ہوائی جہاز رن وے پر اترا۔ یہ ہوائی جہاز ایک گرم ملک سے آیا تھا اور اس لئے ایرکنڈیشنڈ پلین کا دروازہ کھولنے سے پہلے ایر ہوسٹس نے بجلی کے بلب کی طرح اپنی پیٹنٹ مسکراہٹ چمکاتے ہوئے مسافروں کو آگاہ کیا کہ باہر کا ٹمپریچر صفر کے قریب ہے اور یہ سنتے ہی ہر ایک مسافر اوور کوٹ اور مفلر اور شالیں اور دستانے سمیٹنے اور لپٹنے لگا۔ لیکن وہ چھوٹی سی داڑھی والا لمبے قد کا نوجوان جو سفید گھنگھریالے بالوں والا سوٹ پہنے سر سے پیچھے کی سیٹ پر کیلا اور خاموش بیٹھا تھا دروازہ کھلتے ہی بے پروائی سے اٹھا اور باہر جاتے ہوئے اپنے کوٹ کا کالر بھی اوپر نہیں کیا۔

نیچے اترتے ہی سب مسافر دھند میں کھو سے گئے اور دھند کے دھندلے دھبوں میں سے ایک دوسرے کو آواز دے کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ لمبے قد کے نوجوان نے جو اب بھی ننگے سر اور سوتی کوٹ پتلون میں ملبوس تھا، کہا "اچھا ہوا کہ میں یہاں اس وقت آیا ہوں جب میں نہیں ہوں۔ ورنہ اس زہریلے دھوئیں میں تو میرا دم گھٹ جاتا ۔۔۔"

"کیا کہا تم نے" ایک دوسرے مسافر نے اس سے پوچھا۔

اندھیرے میں سے نوجوان کی آواز آئی "میں نے کہا اچھا ہوا میں نہیں ہوں"

"تم کیا نہیں ہو؟"

"بس میں نہیں ہوں۔ مگر ہوں۔"

اور پھر ان کی آوازیں بھی دھند میں کھو گئیں ۔۔۔ اور پھر آخر کار جب ایرپورٹ کی بلڈنگ میں سب مسافر داخل ہوئے تو وہ دونوں چندھیانے والی تیز روشنی میں ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔

جہاں مسافروں کے ویزا اور پاسپورٹ چیک کئے جا رہے تھے وہاں خفیہ پولیس کے ایک سفید پوش انسپکٹر نے ایک پاسپورٹ آفیسر کے کان میں کہا کہ آج کالی رنگت والے مسافروں سے ذرا ہوشیار رہے کیونکہ پولیس کو خبر ملی تھی کہ ان دنوں افریقہ کے کئی انقلابی بغیر ویزا کے آنے والے ہیں۔ چنانچہ جب ایک نیگرو مسافر نے اپنا پاسپورٹ پیش کیا تو اس سے پوچھا گیا "اے کالئے ۔۔۔ تمہارا ویزا کہاں ہے؟"

نیگرو نے جواب دیا "میرا نام کالیا نہیں ہے مسٹر ہیٹر آبراہم جیفرسن ہے۔ دوسرے یہ کہ میرا پاسپورٹ غور سے دیکھئے۔ میں امریکن ہوں اور مجھے اپنے وطن واپس آنے کے لئے ویزا کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ ۔ تم امریکن نیگرو ہو؟" پاسپورٹ آفیسر نے چھوٹی سی لال کتاب کو الٹتے پلٹتے اور اس پر مہر لگاتے ہوئے کہا ۔ "کالے لوگوں کو پہچاننے میں کبھی تو مشکل ہوتی ہے ۔ امریکن نیگرو اور افریقی نیگرو ہمیں ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔"

اور نیگرو مسافر نے اپنا پاسپورٹ سنبھالتے ہوئے جاتے جاتے جواب دیا۔ "تمہاری بدقسمتی ہے ہم لوگ نہ صرف ایک جیسے لگتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ایک ہی سمجھتے ہیں ۔"

"سنا تم نے ان کالوں کی اب یہ ہمت ہو گئی ہے؟" پاسپورٹ آفیسر نے پیچھے مڑ کر خفیہ پولیس والے سے کہا۔ اور اسی پل میں وہ لمبے قد کا نوجوان بھی بغیر پاسپورٹ دکھائے مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

(۲)

ایرپورٹ کے باہر دھند میں ٹیکسی کے میٹر کی بتی چمک رہی تھی ۔ لمبے قد کا نوجوان ٹیکسی کا دروازہ ٹٹول کر اس میں بیٹھ گیا۔

"کہاں چلوں" دھند کے اندھیرے میں سے ٹیکسی ڈرائیور کی آواز آئی ۔ موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز کے ساتھ ۔۔۔

"یو۔ این ۔ او۔"

ٹیکسی روانہ ہو گئی ۔ آہستہ آہستہ دھند میں راستہ ٹٹولتی ہوئی ۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بروک لین کے آئرش لہجے میں پوچھا ۔۔۔ "کیوں بڈی تمہارے ساتھ کوئی سامان نہیں ہے؟"

"نہیں" نوجوان نے جواب دیا۔ "اب مجھے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہے ۔"

ٹیکسی ڈرائیور اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ سو اس نے بات جاری رکھنے کے لئے کہا۔ "تو یہاں تمہارے دوست ہوں گے۔ یو۔ این ۔ او۔ میں؟"

"ہاں ۔ دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"بہت دور سے ۔ یوں سمجھو دوسری دنیا سے ۔"

"تو افریقہ سے آئے ہو ۔"

"یوں ہی سمجھو۔"

اب ٹیکسی دھند میں سے ہو کر ایک لمبی سرنگ میں سے گزر رہی تھی۔ ڈرائیور بولا "اس سال یہ بے وقت کی دھند بھی کتنی عجیب ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ساری دنیا اس سرنگ کی طرح اندھیری ہو گئی ہے۔ گویا ہم ایک اندھیرے سے دوسرے اندھیرے میں آ گئے ہیں۔ اور اس اندھیرے سے باہر نکلیں گے ایک اور اندھیرے میں۔"

پیچھے کی سیٹ سے ایک ٹھنڈی، دبی گہری ٹھنڈی سانس سنائی دی "ہاں بھائی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہے۔ اندھیرا بھی اور اندھیر بھی۔"

بروک لن کے بھاری آئرش لہجے میں ڈرائیور نے کہا "عجیب بات ہے۔ ہم تم ایک ہی موٹر میں ہیں۔ مگر میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ اور تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔" اور پھر چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد "میں پیٹرک ہنری اوکونر ہوں — آئرش نسل کا امریکن۔ بروک لن میں رہتا ہوں، تم کون ہو؟"

"انسان ہوں یا تھا۔"

"مطلب یہ ہے بھائی کہ تم اپنے لہجے سے امریکن یا یوروپین تو معلوم نہیں ہوتے۔ ہندوستانی ہو، چینی ہو، انڈونیشین ہو یا افریقی ہو؟"

"سب کچھ ہوں اور اب کچھ نہیں ہوں۔ مگر میرا وطن افریقہ ہی میں تھا۔"

"سمجھ گیا۔ تم بھی جلاوطن افریقی معلوم ہوتے ہو۔ ضرور یو۔ این۔ او میں اپنی کوئی فریاد لے کر آئے ہو گے۔"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"میں تمہاری طرف ہوں، بھائی، تم جو بھی ہو اور تمہاری جو بھی فریاد ہے۔ میرا دادا بھی انقلابی تھا۔ ڈونلڈ جان اوکونر — آئرلینڈ کی آزادی کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف کئی بار قید ہوا تھا۔ پھر برطانوی فوجیوں نے اسے گولی مار دی۔ اور میری دادی اپنے بچوں کو لے کر یہاں آ گئی۔ اور تب سے ہمارا خاندان یہاں امریکہ میں رہتا ہے۔ مگر ہم میں سے ہر ایک کے دل کا ایک ٹکڑا وہیں اپنے وطن آئرلینڈ میں پڑا ہے۔"

اور اب وہ سرنگ سے نکل کر کھلی سڑک پر نکل آئے تھے مگر چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

دور دھند کے گدلے اندھیرے سمندر میں دھیمی دھیمی میلی میلی روشنی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ڈرائیور نے کہا "آج اگر یہ دھند نہ ہوتی تو تم دیکھتے کہ رات کے وقت ہمارا نیویارک کتنا خوبصورت لگتا

ہے۔" مگر اس کے مسافر نے جو اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا جواب دیا ۔" اس وقت تو دنیا کی ساری خوبصورتی اس ٹھنڈے دھوئیں میں ڈوب چکی ہے۔"

کچھ دیر موٹر آہستہ آہستہ سڑک پر رینگتی رہی سینکڑوں دوسری موٹروں کے جلوس میں مسافر اور ڈرائیور دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہے۔

پھر ڈرائیور نے کہا "بھائی تم نے آج کی خبر پڑھی ؟"

مسافر نے کہا " پڑھی تو نہیں مگر میں جانتا ہوں آج کیا ہوا ہے ۔"

ڈرائیور نے کہا " کہتے ہیں وہ مارا گیا ـــ کیا نام تھا اس کا ؟ ان غیر ملکی ناموں میں ہمیشہ گڑبڑا جاتا ہوں ـــ ہاں خوب یاد آیا ۔ لومبا۔ نہیں ۔ لوممبا ۔ اور اس کا پہلا نام تھا پیٹرس ۔ جیسا میرا پہلا نام ہے ۔ پیٹرک ۔" اور پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد " بڑا ظلم ہوا ہے نا ؟"

پچھلی سیٹ سے آواز آئی " تم ٹھیک کہتے ہو بھائی ۔ بڑا ظلم ہوا ہے ۔"

" لکھا ہے وہ جیل سے بھاگ رہا تھا جب اُسے گولی ماری گئی ۔ مگر میں نہیں مانتا ۔ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں تھا ۔ سچا اور پکا انقلابی تھا ۔ جیسے میرا دادا تھا ۔ میرے دادا کو بھی جب گولی ماری گئی تو سامراجیوں نے یہی بہانہ کیا تھا کہ وہ جیل سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا ۔

مسافر نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ سو تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ڈرائیور نے کہا " کیوں بھائی خاموش کیوں ہو گئے ؟ کیا سوچ رہے ہو ؟"

" تمہارے دادا کے بارے میں سوچ رہا ہوں بھائی " مسافر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ۔

" یہ سوچ رہا ہوں کہ دنیا میں کب تک تمہارے دادا کو گولیاں ماری جائیں گی ؟"

اور پھر ڈرائیور نے یک لخت بریک لگایا ۔ کیونکہ دھند میں سے سڑک کے بیچوں بیچ دُھندلا دھندلا ایک ٹریفک کانسٹیبل کھڑا نظر آ رہا تھا ۔ جیسے آؤٹ آف فوکس تصویر ہو ۔ اور کانسٹیبل نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹریفک کو روک رکھا تھا ۔

" کیا ہوا " مسافر نے پوچھا ۔

" میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں " اور ڈرائیور ٹیکسی سے اتر کر کانسٹیبل کے پاس گیا اور اس سے کچھ پوچھ کر واپس آ گیا ۔

" SORRY BUDDY " اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا " یو ۔ این ۔ او ہیڈ کوارٹر تک کوئی گاڑی بغیر اسپیشل پاس کے نہیں جا سکتی ۔ یہ بندش آج ہی لگی ہے سنا ہے یو ۔ این ۔ او والوں کو بلوے

کا ڈر ہے۔ کہتے ہیں کالے لوگ دھاوا بولنے والے ہیں — اوہ بابے۔ ایسا ہوا تو پیٹرک ہنری اور کوئنز کے سب کھتے ہے مگر بھائی اب تمہیں یہاں اترنا ہوگا۔ آگے ٹیکسی نہیں جا سکتی۔"

اور اب مسافر نے کہا: "ٹھیک ہے میں اتر جاتا ہوں مگر میرے پاس تمہارا کرایہ دینے کو کچھ نہیں ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو اکثر ایسے گاہکوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ جو بس کا کرایہ دیئے بغیر بھاگنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسے یہ مسافر جس کی اسنے اب تک صورت بھی نہیں دیکھی تھی اُن بے ایمانوں میں سے نہیں لگتا تھا۔ سو اسنے کہا: "اوکے بڈی۔ جاؤ خوش رہو۔ مگر پیٹرک ہنری اور کوئنز کو یاد رکھنا۔"

اور مسافر نے ٹیکسی میں سے اترتے ہوئے کہا: "میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ تم بھی شاید مجھے نہ بھولو گے بڈی۔ نشانی اپنے پاس رکھو۔ میرے پاس اب یہی ایک چیز رہ گئی ہے۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی مگر بھاری چیز رکھ دی۔

"یہ کیا ہے بڈی؟" ڈرائیور نے بروک لین کے بھاری لہجے میں پوچھا۔

"یہ وہی گولی ہے جو پچاس برس ہوئے تمہارے دادا کے سینے میں پیوست کی گئی تھی۔"

ڈرائیور نے ٹیکسی میٹر کی روشنی میں دیکھا کہ واقعی یہ ایک فوجی رائفل میں سے فائر کی ہوئی گولی ہے جو کسی انسانی جسم سے ٹکرا کر ٹوٹ چکی ہے اور جس پر اب بھی کسی کا تازہ خون لگا ہوا ہے۔

"ہے بڈی — تم ہو کون؟" ڈرائیور بے تحاشا چلایا لیکن مسافر دھند میں کھویا جا چکا تھا۔

(۳)

دھند اب اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ مگر یو۔ این۔ او کی بلڈنگ میں اتنی کھڑکیاں تھیں اور ہر کھڑکی میں اتنی روشنی تھی کہ اب لگتا تھا کہ جیسے دھند کے کالے لقاب میں سے کسی بھیانک راکھشس کی ہزاروں آنکھیں جھانک رہی ہوں۔ اور وہ جو افریقہ کے "اندھیرے براعظم" کی سنہری دھوپ سے نئی دنیا کی اس اندھی اور اندھیری راجدھانی میں آیا تھا سوچنے لگا کہ قدیم مصر کے بادشاہوں نے تو بے شمار دولت خرچ کر کے اتنے اونچے اہرام بنائے تھے اپنے آپ کو دفنانے کے لئے، لیکن یو۔ این۔ او کے اس اونچے مینار کے تلے کس کا مقبرہ بنایا جائے گا؟ اور ایک پل کے لئے اسے یہ گمان گذرا کہ پتھر اور سیمنٹ کا یہ پہاڑ شاید خود اس کا اپنا سنگ مزار ہے لیکن فوراً ہی اسنے سوچا نہیں میرے لئے تو اُس گمنام گاؤں کے باہر دو فٹ گہری کچی قبر

ہی کافی ہے جس پر کسی نے ایک لکڑی کی صلیب تک کھڑی کرنے کی تکلیف نہیں گوارا کی۔ اور وہ جو مرتے دم تک عیسائیت میں اعتقاد رکھتا تھا سوچنے لگا کہ مسیح کو بھی تو کوئی مقبرہ نصیب نہیں ہوا تھا جس گڈھے میں اُس کی لاش کو پھینک دیا گیا تھا اس پر بھی تو کوئی صلیب نہیں لگائی گئی تھی۔ جو مصلوب ہوتے ہیں، سولی پر چڑھائے جاتے ہیں، ان کی بھی قبروں پر صلیب کی نشانی نہیں لگائی جاتی، شاید ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ان ہی خیالات میں گم وہ یو۔این۔ او بلڈنگ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دھند میں ایک پولیس کانسٹبل کا سفید دستانہ جھلملایا اور ایک کرخت آواز آئی "ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟"

"مجھے یو۔این۔ او میں جانا ہے" نوجوان مسافر نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔

"پاس ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں پاس تو نہیں ہے۔ لیکن میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"ہٹ جاؤ۔ ورنہ تمہاری زندگی اور موت کے سوال کا یہیں فیصلہ ہو جائے گا" یہ کہہ کر ہٹے کٹے کانسٹبل نے دبلے لمبے نوجوان کو ایک زور کا دھکا دیا اور وہ پتھریلے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ اور اسی وقت ایک لمبی چوڑی موٹر اپنی تیز روشنیوں سے دھند میں راستہ بناتی تیزی سے گزر گئی۔ یو۔ این۔ او بلڈنگ کی سمت میں۔ اور نوجوان نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا کہ اس موٹر پر جو جھنڈا لگا ہے وہ ان قاتلوں اور قصائیوں کا ہے جنہوں نے بلجیم کی بنی ہوئی تین گولیاں اس کی پسلیوں میں پیوست کر دی تھیں۔

فٹ پاتھ کے پتھر نوکیلے اور سخت تھے۔ نوجوان کا سر اُن پر زور سے ٹکرایا اور اسکو اپنے بدن میں پتھروں کی نوکیں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن خون نہیں نکلا کیونکہ جتنا خون نکلنا تھا وہ اسکے جسم سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔

"اٹھو" اندھیرے میں سے ایک نرم سی آواز آئی۔ ایسی ملائم جیسے کالا مخمل۔

نوجوان نے اٹھتے ہوئے سہارا لینے کے لئے ہاتھ سے ٹٹولا تو اس کی انگلیوں نے کسی عورت کے ٹخنوں کو چھوا۔ گھبرا کے اسنے ہاتھ کھینچ لیا اور "مجھے معاف کرنا بہن" کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہن؟" اندھیرے میں سے آواز آئی "تم نے مجھے بہن کہا!"

کھڑے ہو کر نوجوان نے دیکھا کہ دھند کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی ایک عورت کھڑی ہے جو شاید

جوان ہے لمبی سڈول ٹانگیں۔ اونچا اسکرٹ۔ کسا ہوا سینہ اور منہ میں سگریٹ جس کا جلتا ہوا نقطہ اندھیرے میں چمک رہا ہے۔ پھر اس عورت نے وہ سگریٹ پھینک دیا اور ایسی آواز میں جس میں تعجب سے زیادہ دکھ اور دکھ سے زیادہ درد کا احساس تھا، بولی۔

"تم نے سچ مچ مجھے بہن کہا۔"

"ہاں" مسافر نے جواب دیا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عورت کو بہن کہلانے پر اتنا اچنبھا کیوں ہے۔

اور پھر ایک کھلی کھلی سی ہنسی سنائی دی۔ جیسے اس عورت کو دفعتاً کوئی پرانا لطیفہ یاد آگیا ہو۔

"اس کمبخت دھند کا اندھیرا ہے نا، اس لئے تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں کالی ہوں کالی۔ مگر اس کمبخت ٹھنڈے دھند نے کالے گورے سب کو یکساں کر دیا ہے۔"

مسافر نے جواب دیا: "بہن۔ میں بھی کالا ہوں۔"

"تم بھی کالے ہو؟ ادھر شمال کے ہو یا جنوب کے؟"

"اس دیس کا رہنے والا نہیں ہوں ــــ میں وہاں سے آیا ہوں، جہاں سے تم لوگ آئے تھے۔"

"جہاں سے ہم لوگ آئے تھے؟" اس عورت نے دھیرے سے دہرایا اور اسے اپنے دل کے تہ خانے میں ننھی ننھی چاندی کی گھنٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے پھر کہا جیسے یہ کوئی منتر ہو۔

"جہاں سے ہم لوگ آئے تھے۔"

اور مسافر کے جواب میں سختی اور تلخی تھی "آئے نہیں تھے چرا کر لائے گئے تھے۔"

کچھ دیر وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے رہے دھند میں وہ دونوں خواب میں دیکھی ہوئی پرچھائیاں معلوم ہو رہے تھے اور اُن کے قدموں کی آواز بھی ایسی لگتی تھی جیسے دوسری دنیا سے آرہی ہو۔

وہ بولی: "خیریت ہوئی تم نے بتا دیا کہ تم کالے ـــ نہیں تو . . . . . ." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"نہیں تو کیا ہوتا؟ بہن؟"

"اس اندھیرے میں میں تمہیں سفید چمڑی والا سمجھ کر خراب کرنے کی کوشش کرتی تمہاری جیب خالی کرواتی اور اسکے بدلے میں اپنا روگ تمہیں دیتی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ کئی برس سے میرا یہی پیشہ ہے۔ جو روگ مجھے سفید چمڑی والوں نے دیا ہے وہ میں انھیں واپس دیتی رہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے ساری سفید قوم سے نفرت ہے؟"

"کیوں؟"

اور اب وہ دفعتاً برس پڑی "کیا کیوں کیوں کیوں کر رہے ہو؟ اگر تم سچ مچ کالے ہو تو کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ سفید چمڑی والوں سے نفرت کرنا ہم کالوں کے لئے قدرتی بات ہے؟"

"نہیں میں یہ نہیں مانتا ایبن۔ اگر میں یہ مانتا تو یہاں کبھی نہ آتا۔ اور مجھے یقین ہے تم بھی نہیں مانتیں۔ صرف کسی تلخ تجربے کی بنا پر غصے میں ایسا کہہ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ تم پر کیا گزری کہ تمہارا دل جو کبھی محبت سے بھرا ہوا تھا اب نفرت سے بھر گیا ہے؟"

وہ ایک روشنی کے کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ——— دور یو۔ این۔ او کی روشنیاں دھند کے اندھیرے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ وہ بولی "میں جوان نہیں ہوں مگر اپنے پیشے کی وجہ سے جوان نظر آنے کی کوشش کرتی ہوں۔ پورے اکتیس برس کی ہوں۔ مگر کبھی میں جوان تھی اور جنوب میں جیوجیا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتی تھی۔ ہم نیگروؤں کی الگ دنیا تھی۔ ہمارا اسکول علیحدہ تھا۔ ہمارا چرچ علیحدہ تھا۔ سفید چمڑی والوں کے ہاں ہم نوکری کرتے تھے لیکن اُن سے اور کوئی واسطہ ہمارا نہیں تھا۔ اُن کو ہم جھک کر ٹوپی اتار کر سلام کرتے تھے، سر اور میڈم کہتے تھے۔ اکثر ان کے مذاق اور فقرے بازی کا نشانہ بنتے تھے، کبھی کبھی ان کی گالیاں بھی کھاتے تھے۔ پھر بھی زندگی بُری نہیں تھی! میں اچھی تھی۔ میں اسکول میں ہمیشہ اول آتی تھی۔ چرچ کے کوائر میں میری آواز سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی میرے ہم عمر نیگرو لڑکے میرے پیچھے دیوانے تھے۔ مگر میں صرف ہنری کو پسند کرتی تھی۔ اور اُسی سے میں نے شادی کی۔ ہنری جو تمہاری طرح لمبا اور دبلا تھا اور بجلی کی طرح بیس بال کھیلتا تھا۔ اور جب وہ ہنستا تھا تو اسکے خوبصورت کالے چہرے پر اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ . . . . " اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔

"اور پھر؟"

"پھر کوریا میں جنگ شروع ہو گئی۔ اور ہمارے سفید چمڑی والے مالکوں نے طے کیا کہ نیگرو اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کے ساتھ گرجا میں عبادت کر سکیں۔ یا ایک ہی اسکول میں ان کے بچوں کے ساتھ

پڑھ سکیں یا ان کے ساتھ ٹرین کے ایک ہی ڈبے میں سفر کر سکیں۔ لیکن وہ اس قابل ضرور سمجھے گئے کہ گورے سپاہیوں کے ساتھ جنگ کی بھٹی میں جھونک دیئے جائیں۔ اور جب میں تیسرے مہینے پیٹ سے تھی۔ ہنری کو ہزاروں میل دور ایک اجنبی ملک میں اُن لوگوں سے لڑنے بھیجہ یا گیا جن سے اُس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اسنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ بڑے افسروں کے احکام کے مطابق ہم یہاں لڑ رہے ہیں۔

پھر میرے دن پورے ہو گئے اور میں ماں بن گئی اور میری گود میں ایک ننھا ہنری کھیلنے لگا۔ ابھی وہ دس دن کا ہی تھا کہ واشنگٹن سے میرے نام تار آیا۔ ہم افسوس کے ساتھ تمہیں اطلاع دیتے ہیں کہ تمہارا شوہر پرائیویٹ ہنری سپنسر تکلن کوریا کے فرنٹ پر بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سو میں اکیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔ اور واشنگٹن والے افسوس کا اظہار ہی کرتے رہے۔ ننھا ہنری جونیر پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گیا اور اسکے باپ کو کسی دور دراز ملک کی اجنبی مٹی میں گاڑ دیا گیا۔

اور واشنگٹن والے ہر روز ایسے ہی تار بھیج بھیج کر امریکن عورتوں کو بیوہ اور امریکن بچوں کو یتیم بناتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

مسافر نے کہا: " اور یہ مائیں اور بچے جو بیوہ اور یتیم ہو گئے۔ ان میں سفید چمڑی والے بھی تھے اور کالے بھی۔ کیوں یہ ٹھیک ہے نا؟"

" ٹھیک ہے: " وہ بولی: " لیکن آگے چل کر جو مجھ پر گذری وہ سفید چمڑی والی عورت پر کبھی نہ بیتی ہوگی کیا تمہارے پاس سب سننے کے لئے وقت ہے؟"

مسافر نے جواب دیا: " میرے پاس بہت وقت ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک وقت ہی وقت ہے۔ دراصل میرے پاس وقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ دولت نہیں ہے۔ گھر نہیں ہے یہاں تک کہ جان نہیں ہے۔ سو میں تمہیں صرف وقت ہی دے سکتا ہوں۔"

" تو سنو " وہ بولی۔ بیوہ ہو کر میں نے اپنی ساری زندگی اپنے ننھے کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دی۔ اس لئے کہ وہ میرا بیٹا ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ میرے پیارے شوہر کی پہلی اور آخری نشانی تھا۔ اس کو پالنے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہوٹلوں میں برتن مانجھے۔ گھروں میں جھاڑو دی، فرشیں دھوئیں، سنڈاس صاف کئے۔ میں نے لانڈری میں کپڑے دھوئے، دس دس گھنٹے استری کی، رات رات بھر مشین چلا کر سلائی کی۔ جب جا کر ہنری جونیر کو اسکول میں پڑھا پائی ۔ ۔ ۔ ۔ "

اپنے بچے کے تصور میں وہ تھوڑی دیر کھوئی رہی۔ پھر دھیمی محبت میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ کتنا اچھا تھا میرا بیٹا ہنری۔ کتنا خوبصورت۔ دیوتاؤں کے مجسمے جیسا سڈول جسم تھا اُس کا۔ یہ بڑی بڑی کالی

آنکھیں۔ اور لکھنے پڑھنے میں اتنا تیز کہ نو برس کی عمر ہی میں پانچویں درجے میں پہنچ گیا تھا۔ اسکول میں کھیل کود ہو، ڈرامہ ہو، تقریر کرنے کا مقابلہ ہو ہر ایک چیز میں وہ اول آتا تھا۔

اور پھر گورنمنٹ نے قانون پاس کر دیا کہ جنوب کی ریاستوں میں بھی نیگرو بچے گورے لوگوں کے اسکولوں میں ساتھ پڑھیں۔ ہمارے قصبے میں آٹھ سات بچے چنے گئے کہ سب سے پہلے گوروں کے اسکول میں داخلے کیلئے اپنے اکومیش کریں گے۔ جس دن ہنری کو اس اسکول میں داخلے کیلئے جانا تھا وہ کتنا خوش تھا۔ صبح سویرے اٹھا۔ اپنے کپڑوں پر خود استری کی۔ پھر جوتے پر پالش کیا۔ نہایا۔ بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کی۔ پھر رستے بھر میرے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ راستے بھر کہتا گیا۔ ماما۔ تم بالکل نہ گھبرانا۔ میں بہت جلد گورے بچوں سے دوستی کر لوں گا۔ اور تم دیکھنا میں اس اسکول میں بھی اول آؤں گا۔ پھر تم بہت خوش ہو گی نا۔ ماما۔

مگر جب ہم اسکول کے پاس پہنچے تو دیکھا سینکڑوں گورے لوگوں نے راستہ روک رکھا ہے اور ان کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں، ریوالور ہیں، کلہاڑے اور ڈنڈے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں میں ہم کالوں کے لئے نفرت ہے۔ اور اُن کی زبان پر ہمارے لئے دنیا بھر کی گالیاں ہیں . . . . . اور وہ گالیاں اتنی گندی تھیں کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے ہنری کے کان بند کر لئے۔ میں نے تو یہ حالت دیکھتے ہی کہا تھا۔ چلو بیٹا گھر واپس چلیں۔ لیکن وہاں بہت سے نوجوان نیگرو ایسے بھی تھے جو اپنی قوم کے قانونی حق کو منوانے پر تلے ہوئے تھے۔ اور نہ جانے کس وقت ہنری مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر ان سے جا ملا۔ اور اب وہ لوگ اسکول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور ان کے آگے آگے میرا ہنری تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں اس کی کتابیں تھیں۔ بائبل۔ اور امریکہ کی تاریخ۔ ... کی لکھی ہوئی شیکسپیئر کی کہانیاں۔ اور ایک کومک میگزین اور وہ کہہ رہا تھا۔ ماما جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو راکٹ میں بٹھا کر تمہیں چاند کی سیر کو لے جاؤں گا . . . . .

اُس کی آواز اب آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی اور اس کی زبان سے ایک ایک لفظ کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر نکل رہا تھا۔ اور اب ہنری کبھی چاند کی سیر کو نہیں جائے گا۔ اور کبھی امریکہ کی تاریخ نہیں پڑھے گا۔ شیکسپیئر کی کہانیوں کی کتاب جو اسے ابراہیم لنکن کے بارے میں تقریر کرنے پر ملی تھی ایک گورے گنڈے نے چھین کر پرزہ پرزہ کر ڈالی۔ اور اس کی بائبل جس میں اس نے گلاب کا ایک بڑا پھول دبا کر نشانی کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ اب ایک جلا ہوا سوراخ ہے۔ کیونکہ جب گوروں کی رائفلوں سے گولیاں برسیں تو میرے ہنری کے پاس اپنی حفاظت کے لئے اس بائبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور سو اُس نے اسی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ یہ بائبل جو میرے بچے کی جان بچانے کے لئے

ڈھال نہ بن سکی اب بھی میرے پاس ہے اور اس صفحے پر جہاں احکام خداوندی درج ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تو کسی کی جان نہیں لے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہیں میرے معصوم ہنری کے خون کا دھبہ لگا ہوا ہے۔ اور یہ خون کا دھبہ اس بائبل ہی پر نہیں ہے، امریکہ کی تاریخ پر بھی ہے انگلستان کی کہانیوں پر بھی ہے اور اس خون کے دھبے کو کوئی نہیں دھو سکتا۔ وہ سامنے جو یو۔ این۔ او نام کی عالیشان لانڈری کھڑی ہے۔ جہاں دنیا بھر کے گندے کپڑے لاکر دھوئے جاتے ہیں۔ وہ بھی اس دھبے کو نہیں دھو سکتی۔ صرف میرے انتقام کی آگ اس دھبے کو دور کرسکتی ہے۔ اور یہ انتقام میں ہر گورے آدمی سے لیتی ہوں۔ جو میرے جسم کا خریدار بنتا ہے۔"

پھر وہ خاموش ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ ایک لمحے کے لئے دنیا خاموش ہو گئی ہے۔ پل پر سے بجلی کی ریل بغیر آواز کے گزر گئی۔ سڑک پر جانے والی موٹریں روشنی کے خاموش دھبوں کی طرح دھند میں تیرتی رہیں۔

نوجوان مسافر نے ٹٹول کر کالی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ہمدردی کی ایک دھیمی دھیمی رو ایک ہاتھ سے دوسرے میں بہتی رہی۔ اور پھر اس نے کہا "بہن۔ میں تمہارا درد سمجھتا ہوں لیکن اس انتقام کی آگ سے تمہارے بچے کے خون کا داغ نہیں مٹے گا۔ اس لئے کہ وہ داغ تو اس بائبل پر نہیں ہے۔ تمہارے دل پر ہے۔ میرے دل پر ہے۔ ہر اس انسان کے دل پر ہے جو سچے معنوں میں انسان ہے۔"

"تو اس کا علاج؟" عورت نے پوچھا۔

"مجھے یو۔ این۔ او کے دروازے تک پہنچا دو۔"

"تم کیا ہو، تمہاری کیا اہمیت ہے جو تم وہاں جا کر دنیا کی کایا پلٹ کر دو گے۔ بڑی بڑی تقریریں کرنے والے وہاں بہتیرے ہیں۔"

مسافر نے ایک ایک لفظ کو دہراتے ہوئے کہا، جیسے کسی بچے کو سبق پڑھا رہا ہو "میں۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں — اور — یہی میری — اہمیت — ہے۔"

عورت بولی "میں تمہاری باتیں نہیں سمجھتی۔ پر تم کوئی بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ نہ جانے تم سے باتیں کرکے مجھے ایک عجیب شانتی سی محسوس ہو رہی ہے۔ جیسے کسی نے میرے من میں بھرا ہوا زہر نکال دیا ہو۔ چلو میں تمہیں وہاں پہنچا دیتی ہوں۔"

اس بار کانسٹیبل نے انہیں روکا اور کہا "یو۔ این۔ او کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں

بلوے کا ڈر ہے۔"

مگر عورت نے بازاری لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا: "میں تو اُدھری رہتی ہوں انسپکٹر۔ بلیک مبیی کے بنڈی ھانے میں۔ تیرھویں سٹرٹ کے نکڑ پر۔ یو۔ این۔ او کے بالکل پچھواڑے۔"

"اچھا تو فقط تم جاسکتی ہو۔" کانسٹبل نے سیچتے ہوئے کہا: "لیکن یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"یہ تو میرا گاہک ہے، انسپکٹر۔ اور وہ بھی آج رات کو ایک غریب کالا ہی ملا ہے۔" اور پھر اپنی آواز میں پیشہ ورانہ مٹھاس گھول کر وہ بولی: "میرا دھندا مت خراب کرو، انسپکٹر، پلیز۔"

اور سو انہیں یو۔ این۔ او کی طرف جانے کی اجازت مل گئی۔

اندر جانے سے پہلے اُس نوجوان مسافر نے عورت سے کہا: "اس زہریلی دھند میں ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اگر روشنی میں کبھی ملیں گے تو پہچان بھی نہ پائیں گے۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے سے تعارف کی ضرورت نہیں۔ ایک دوسرے کا نام نشان جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا شکریہ بھی نہیں ادا کروں گا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں نہیں ہوں اور تم ہو۔"

"میں ایک جاہل سیدھی سادی عورت ہوں۔" اُس نے کہا: "تمہارا یہ سب فلسفہ نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے کوئی نشانی دو تاکہ میں تمہیں یاد رکھ سکوں۔"

"تو یہ لو۔" اور اُس نے ٹٹول کر عورت کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا دھات کا ٹکڑا رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ وہی گولی ہے جو بائبل کے صفحوں کو اور گلاب کی پنکھڑیوں کو چیرتی ہوئی تمہارے بیٹے کو لگی تھی۔ اسی گولی سے کل مجھے قتل کیا گیا ہے۔"

اور یہ کہہ کر وہ دھند میں غائب ہوگیا۔ شاید یو۔ این۔ او کی بلڈنگ کے اندر چلا گیا۔

کالی عورت دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ اُس گولی کو اپنی انگلیوں سے چھوتی رہی۔ پھر اس نے بڑے پیار سے گولی کو اپنے گال سے لگایا، کیونکہ اس میں لگے ہوئے خون میں سے اسے اپنی چھاتیوں سے نکلے ہوئے دودھ کی مہک آرہی تھی۔

پھر وہ وہاں سے مڑی اور چلی گئی لیکن یہ وہ راستہ نہیں تھا جو بلیک مبیی رنڈی خانے کو جاتا ہے۔

(۴)

دروازے پر چپراسی پاس چیک کئے جارہے تھے۔ دربان نے پوچھا: "ڈیلی گیٹ؟"

نوجوان مسافر نے جواب دیا "ہونا تو چاہئے تھا مگر ہوں نہیں۔ میری جگہ کوئی اور بیٹھا ہوا ہے۔"

"تو آپ اُس دروازے سے جائیے ادھر سے صرف ڈیلی گیٹ جا سکتے ہیں۔"

دوسرے دروازے پر اُس سے سوال کیا گیا "پریس؟ کیا آپ کورسپونڈنٹ ہیں؟"

اور وہ جو کبھی ایک انقلابی اخبار نکالتا تھا بولا "ہاں! یہی سمجھئے۔ مجھے یہاں کی خبر بہت دور تک بھیجنی ہے۔"

"تو آپ پہلے پریس روم میں جا کر پریس کارڈ حاصل کیجئے تب ہی آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

پریس روم خالی تھا میزوں پر ٹیبل لیمپ جل رہے تھے مگر ان کی روشنی میں رپورٹ لکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹائپ رائیٹر بیکار پڑے تھے۔ ہر ایش ٹرے میں مختلف (BRANDS) کے سگرٹوں کی لاشیں پانی میں پڑی گل رہی تھیں۔ امریکن "کیمل" اور روسی "ترد زکا" ایک ہی ایش ٹرے میں پڑے تھے مگر دونوں بجھے ہوئے تھے۔ ایک لمبی میز پر دنیا بھر کے اخبار جو اسی دن ہوائی ڈاک سے وصول ہوئے تھے پھیلے ہوئے تھے

"لندن کا ٹائمز"

"نیویارک کا ٹائمز"

"موسکو کا پراودا"

"ٹوکیو کا جاپان ٹائمز"

"پکنگ کا نیو چائنا ڈیلی"

"قاہرہ کا الجمہوریہ"

"بمبئی کا ٹائمز آف انڈیا"

"برما کا رنگون ٹائمز"

"سیلون کا آبزرور"

اور ان میں سے ہر ایک کے پہلے صفحے پر بڑے بڑے کالے ٹائپ میں ایک ہی خبر تھی۔ ایک آدمی کی موت کی خبر اور اس خبر کے ساتھ ہر ایک پرچے میں مرنے والے کی تصویر تھی۔ اور نوجوان مسافر جو میز پر پڑے ہوئے اخباروں کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ ہر جگہ وہی ایک تصویر دیکھ کر ٹھٹھر سا گیا۔ کیونکہ وہ خود اس کی تصویر تھی۔

اُس نے زیر لب بڑبڑا کر اپنے آپ سے کہا "میں نہیں ہوں مگر میں یہاں ہوں میں ہر جگہ ہوں۔"

اور اسی وقت ایک آواز پریس روم کے سناٹے میں گونجی۔

"آج ہمیں تشدد سے سرجھکا لینا چاہئے" یہ ہندوستان کے ڈیلی گیٹ کی آواز تھی جو یو۔ این۔ او کے بڑے ہال سے ریلے ہو کر لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دے رہی تھی۔

پھر کسی نے میز پر زور سے ہاتھ ٹیک کر کہا۔ "جن سامراجیوں نے یہ قتل کرایا ہے وہ آج یہیں اور جواب دیں" یہ سوویٹ ڈیلی گیٹ کی آواز تھی۔

"کیا ہمارے براعظم میں ہر ملک کو سامراج سے آزاد ہونے کے لئے خون کی ندیاں بہانی پڑیں گی۔ کیا ہماری قوم کو اپنے سپوتوں کی قربانی دینی پڑے گی؟" یہ افریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک کے ڈیلی گیٹ کی آواز تھی۔

"ہمیں اس قتل کی خبر سنکر واقعی ازحد دکھ اور صدمہ ہوا ہے۔" یہ امریکہ کے ڈیلی گیٹ کی آواز تھی۔

اور نوجوان مسافر نے مسکرا کر سوچا" وہ کم عقل سمجھتے تھے کہ میری آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گی۔"

لاؤڈ اسپیکر پہ آوازیں آتی رہیں اور پریس روم کے سناٹے میں گونجتی رہیں۔ مگر اب مسافر کو دفعتاً یہ احساس ہوا کہ کمرے میں وہ اکیلا نہیں ہے۔ دور کونے میں ایک میز پہ سر رکھے کوئی سو رہا ہے۔ وہ اسکے قریب گیا تو دیکھا کہ ایک سانولے رنگ کا نوجوان جو شاید نشے میں مدہوش ہے کیونکہ میز پر ایک گلاس رکھا ہے جس میں وسکی کے صرف چند قطرے باقی ہیں۔ اور میز کے نیچے وسکی کی ایک بوتل رکھی ہے جو تقریباً خالی ہے۔

لاؤڈ اسپیکر پر کسی ڈیلی گیٹ کی آواز گرجی" ان تین گولیوں کی گونج ساری دنیا میں سنائی دے گی ــــ اور اس دھماکے سے بہروں کے کان کھل جانے چاہئیں سوتوں کو جاگ جانا چاہئے۔"

سانولے رنگ کا نوجوان شاید یہی آواز سنکر چونک پڑا۔ نشے سے چور نظروں سے اس نے کچھ دیر اس کالے اجنبی کی طرف گھورا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر کی طرف مڑ کر دیکھا۔ جواب انگریز ڈیلی گیٹ کی شکل میں اعلان کر رہا تھا "ہمیں اس موت کا ازحد اور دلی افسوس ہوا ہے۔ ہمیں کانگو میں امن قائم کرنے کے لئے پوری کوشش کرنی چاہئے۔ اور دونوں طرف سے جو تشدد ہو رہا ہے اُسے روکنا چاہئے۔"

"دونوں طرف سے؟" کالے لمبے نوجوان نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ دہرایا۔ "ایک طرف نے گولیاں چلائیں۔ دوسری طرف نے اپنے جسم سے اُن گولیوں کو روکا۔ تشدد دونوں طرف سے ہوا ہے قصور دونوں کا ہے۔"

اور اب ایک اور ڈیلی گیٹ کہہ رہا تھا: "ہمیں کانگو میں امن قائم کرنے کے لئے فوراً ایک ریزولیوشن پاس کرنا چاہئے۔"

"بند کرو یہ بکواس" چلاتا ہوا سانولا نوجوان نشے میں لڑکھڑاتا ہوا ڈائس پر تک گیا۔ اس کا سوئچ دبا کر بند کر دیا اور چلایا "ریزولیوشن۔ تقریریں۔ بیانات۔ ہمدردی۔ الفاظ۔ دھواں۔ سب بکواس۔ ریاکاری۔ نامردی۔۔۔" پھر وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔

اب پریس روم میں مکمل سناٹا تھا۔ صرف دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک تھی اور وہ دونوں تھے۔ صرف وقت، فضا اور دو انسان۔ ایک کالا، ایک سانولا۔

"تم کون ہو؟" سانولے نوجوان نے قریب جا کر پوچھا۔ نشے سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں: "تم کون ہو؟ کب سے ہو؟ کیوں ہو؟"

کالے نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "میں نہیں ہوں۔ کل تک میں تھا۔ آج میں نہیں ہوں۔۔۔"

"تم نہیں ہو؟ بڑے مزے میں ہو بھائی۔ آج کل جو نہیں ہیں وہی خیریت سے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے تم ہوتے تو تمہیں بھی تین گولیاں مار دی جاتیں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں جانتے۔ اگر جانتے تو تم یہاں نہ آتے۔ یہ جگہ جو دنیا کی امیدوں کا مقبرہ ہے جہاں ہر روز امن اور آزادی کو بڑے اہتمام کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔"

"پھر بھی تم یہاں آئے ہو ـــ پھر بھی تم یہاں ہو؟" اور یہ کہہ کر کالے نے مسکرا کے سانولے کی طرف دیکھا۔

اور سانولے نے وہسکی کے آخری قطرے زہر کی طرح گلے میں انڈیل کر جواب دیا: "میری بات اور ہے۔ میں ہندوستانی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں میں بھولا ہوں۔ بے وقوف ہوں۔ الّو ہوں۔ اس کے علاوہ میں نشے میں ہوں۔ اور نشہ مجھ میں ہے۔ سو میں الّو ہوں ـــ الّو کی دُم فاختہ ہوں۔ وہ فاختہ نہیں جو امن کے نیلے جھنڈوں پر اُڑتی ہے۔ یہ ایک دوسری چڑیا ہے۔ جسے ہم پر قینچ کر کے پنجرے سے باہر نکال دیتے ہیں اور کہتے ہیں اُڑ ری فاختہ اُڑ۔ مگر اس کے پر تو کٹے ہوئے اور بے جان ہوتے ہیں۔ سو وہ بے چاری اڑ نہیں پاتی صرف پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی بلی یا کتا۔ کوئی بھیانک بل ڈاگ ـــ یا کوئی عقاب ایک پنجے میں تیر اور دوسرے میں پھول لئے آتا ہے ـــ اور

یک جھپکنے میں ہی فاختہ کا نوالا بنا لیتا ہے۔ . . . .

"کیا سمجھے؟ کچھ نہیں سمجھے نا؟ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ میں خود بھی کچھ نہیں سمجھا — دراصل اس میں سمجھنے کی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم ہندوستانی سمجھ بوجھ سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے بارے ہی میں ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے — 'سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے' خود ہمیں درد گردہ بھی ہو تو ہم علاج کے لئے جورن کی ایک ٹکیہ کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن آرکٹک کے کسی اسکیمو کو دانت کا درد ہو جائے تو ہم ساری دنیا کے اور سر ہاتھ میں اپنے دانت توڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں — ہمہ بانیت کے علاوہ ہماری دوسری خصوصیت خوش فہمی ہے۔ کوئی بھیڑیا بھی بھیڑ کی کھال اوڑھ کر آ جائے تو ہم اُسے پچکارتے پچکارتے نہ صرف گود میں لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں — بلکہ "بھیڑیا زندہ باد" کے نعروں سے اس کا سواگت کرتے ہیں۔ ہم ہی ہیں جنہیں ہر کالے بادل میں روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ جادو اور روحانی قوتوں میں ہمارا اعتقاد اتنا پکا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک منتر پھونکنے سے توپیں پھول اگلنے لگیں، ہر ایٹم بم رس بھرے اناس میں تبدیل ہو جائے گا۔ دہاڑتا ہوا ہر شیر ممیاتی ہوئی بکری بن جائے گا۔ سو ہم ہندوستانیوں کا تو روحانی ہیڈ کوارٹر ہے یو۔ این۔ او کا یہ جادو گھر۔ اب سمجھے کہ میں یہاں کیوں ہوں۔ اور کیا کر رہا ہوں۔"

"سمجھ گیا" کالے لمبے نوجوان نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اور کیونکہ تم یہاں ہو۔ اس لئے میں یہاں ہوں۔ ورنہ میں بھی یہاں نہ ہوتا۔ دراصل میں اور تم دونوں ایک ہی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ میں نہیں ہوں اور تم ہو —"

"نہیں سمجھا، کچھ نہیں سمجھا — نشہ اترتا جا رہا ہے نا؟ اس لئے چلو ایک وسکی کی بوتل اور کھینچ لائیں۔ آج شراب پینا میرے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ مجھے بہت کچھ بھلانا ہے۔ یہ بھلانا ہے کہ کہیں تین گولیاں چلی ہیں۔ کہیں کسی کا قتل ہو گیا ہے۔ اور جس کا قتل ہو گیا ہے وہ ایک آدمی نہیں تھا، ایک قوم تھا، ایک برِ اعظم تھا، ایک اصول تھا، ایک نظریۂ حیات تھا۔ تین گولیاں چلیں اور وہ ختم ہو گیا' — وہ سب ختم ہو گیا۔ تین گولیاں — تین گولیاں! اور ان تینوں گولیوں کے دھماکے میرے کان میں گونج رہے ہیں۔ آج سے نہیں، بیالیس برس سے — سمجھے تم میرے بھائی۔ بیالیس برس سے'۔ حالانکہ میری عمر صرف اکتالیس برس اور چند مہینے کی ہے . . . . ."

(۵)

اور کالے لمبے نوجوان کی آنکھوں میں اپنے سانولے ساتھی کے لئے اتنی ہمدردی تھی، پیار تھا،

اتنا لگاؤ اور اپنا پن تھا کہ اس سے باتیں کرتے ہندوستانی کو یہی محسوس ہوا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو . . . . .

"تم نے ہمارا ملک ہندوستان نہیں دیکھا نا؟ سچ پوچھو تو کوئی خاص بات نہیں ہے خصوصاً شمال کے جس علاقے کا میں رہنے والا ہوں سینکڑوں میل تک سپاٹ میدان، نہ سرسبز پہاڑیاں نہ جھیلیں نہ جنگل۔ بس کھیت ہی کھیت۔ لیکن بہار کے موسم میں ان کھیتوں میں جب سرسوں کے پھول کھلتے ہیں تو ہمارا سارا علاقہ بسنتی رنگ کا ایک طلسمی قالین بن جاتا ہے جو قدرت نے زمین پر بچھا دیا ہے۔ اور پھر ایک دن آتا ہے جب بہار کے اس موسم کا سواگت کرنے کے لئے سارا دیہات ہی بسنتی رنگ میں رنگا جاتا ہے اور ہر تن میں سرسوں کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔

"بیالیس برس ہوئے اسی تہوار کا دن تھا جب میرے باپ نے میری ماں سے میلے میں چلنے کو کہا۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ صرف اُس کے بارے میں سنا ہے کہ چھ فٹ کا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ دھوپ میں سنولایا ہوا چہرہ تھا۔ بڑی بھاری آواز تھی۔ اور جب وہ ہنستا تھا تو معلوم ہوتا تھا زلزلہ آ رہا ہے۔ ہاں۔ تو میرے باپ نے میری ماں سے میلے میں چلنے کو کہا۔ اور یہ سن کر وہ خوش ہو گئی اور جلدی جلدی اس نے میلے میں جانے کے لئے سرسوں کے پھولوں کے رنگ کا زرد جوڑا پہن لیا۔ میری دادی نے منع بھی کیا کہ "بہو کو ساتواں مہینہ ہے اسے باہر نہ لے جا۔" لیکن میرے باپ نے ہنس کر ٹال دیا۔ "ماں تمہاری بہو کو میلہ دکھانے ہی تو لے جا رہا ہوں۔ کہیں لام پر گولیوں کی بوچھاڑ میں تو نہیں لے جا رہا۔"

"میرا باپ کسی زمانے میں کھیتی کرتا تھا۔ باپ دادا کے زمانے سے اپنی زمین تھی لیکن دھیرے دھیرے یہ زمین ساہوکار کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ اور پھر میرے بابا انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر جرمنوں کے خلاف لڑنے لام پر چلے گئے تھے اور سنا ہے کہ وہاں بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑے تھے۔ کئی بار زخمی بھی ہوئے تھے اور اس کے بدلے میں انہیں بہت سے میڈل انعام میں ملے تھے۔ اور صوبیدار کا عہدہ بھی ملا تھا۔ مگر واپسی پر انہوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور چھوٹی سی زمین لے کر اس پر پھر سے کاشت کرنے لگے تھے۔ لیکن اب وہ باہر جاتے وقت اپنا فوجی کوٹ ضرور پہن لیتے تھے۔ وہ کوٹ جس میں اُن کے زخموں کے لہو کے دھبے لگے ہوئے تھے اور جس کی داہنی جیب پر تین تانبے کے تمغے جگمگاتے تھے۔ ہاں تو لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے بابا اپنی بیوی کو لے کر جب میلے میں پہنچے تو اپنے میڈل لگے ہوئے کوٹ اور طرہ دار خاکی پگڑی میں بہت ہی شاندار لگ رہے تھے۔ میں وہاں موجود نہیں تھا مگر شاید تھا بھی . . . . . کیونکہ گو میں اس دنیا میں ابھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن اپنی ماں کے پیٹ میں

پیدا ہو چکا تھا .....

"میرے بابا اپنی بیوی کو سمجھاتے رہے اور انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس باغ کے باہر جہاں ۱۰ میل دور رہا تھا فوجی لاریاں سفید رینگ سپاہیوں کو لالا کر اتار رہی ہیں۔

"میرے بابا اور ماں سبیل کی دکانوں پر ٹھنڈی لسی پیتے رہے اور چٹ پٹے پکوڑے کھاتے رہے اور انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک لال منہ کا انگریز افسر فوجیوں کو رائفلوں میں گولیاں بھرنے کا آرڈر دے رہا ہے۔

"اور پھر میرے بابا نے اپنے ہونے والے بچے کے لئے چاندی کا ایک جھنجھنا خریدا اور ایک لال سبز رنگ کی گیند خریدی اور اسکے چوسنے کے لئے چسنی خریدی اور یہ سب سامان میری ماں کے آنچل میں ڈال دیا۔ میری ماں نے خوشی کے مارے شرما کر نگاہیں جھکالیں...... اور اسی وقت کئی سو سامراجی فوجیوں نے اور ان کے لال منہ والے گورے افسروں نے میلے میں آئے ہوئے سارے مجمع کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور باہر نکلنے کے ہر راستے کو روک کر کھڑے ہوگئے۔

"اور پھر میرے بابا اور ماں بچوں کے کپڑوں کی دکان پر رک گئے اور ماں نے کہا" میں تو اپنی بچی کے لئے لال ریشم کا فراک لوں گی" اور بابا نے کہا" بچی نہیں ہوگی اور وہ لال ریشم کا فراک نہیں پہنے گا۔ فوجی جوان جیسی خاکی قمیص پہنے گا.......

"اور میری ماں شرما کر دھیرے سے کہتی رہی۔ بچی ہوگی.....

"اور میرے بابا دہاڑ کر کہتے رہے۔ بچہ ہوگا جی۔

"اور اسی لمحے میں گولیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ مگر میرے بابا سمجھے کہ بادل گرج رہے ہیں۔ انہوں نے دکان سے نکل کر آسمان کی طرف دیکھا...... اسی دم ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور ان کے سینے پر لگے ہوئے میڈل کو چیرتی ہوئی ان کے پھیپھڑوں میں اتر گئی ..... اور میں لا لڑکا میں اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس گولی کا تڑاخہ آج تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے

"جب میں بڑا ہوا تو میں نے اپنی ماں کی زبانی جلیانوالہ باغ کے قتل عام میں اپنے بابا کی موت کی کہانی سنی۔ جب میں اسکول میں پڑھنے گیا تو میرے دماغ میں وہ گولی سنسناتی رہی۔ اور میں سوچتا رہا کہ میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ کیسے لوں۔

" پھر جب میں اسکول سے کالج میں گیا تو ایک دن لائبریری میں میں نے آئرلینڈ کے انقلاب کے شہیدوں کے بارے میں ایک کتاب پڑھی جس میں ڈونلڈ جان اوکونر کے کردار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ

ایک معمولی کسان تھا جس کی اپنی زمین بھی نہیں تھی۔ وہ ایک زمیندار کے آدمیوں کے کھیت میں کام کرتا
تھا اور رات کو انقلابی ہرکارے کا کام کرتا تھا۔ اسے جب گرفتار کیا گیا تو پولیس کو یقین تھا کہ اسے
مار پیٹ کر اس سے انقلابیوں کے نام اور پتے معلوم ہو جائیں گے۔ مگر ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آئرش
کسان کس فولاد کا بنا ہوا ہے۔ انہوں نے اسے کوڑے مارے۔ اس کو ٹکٹکی پر باندھ کر اسے ایذا پہنچائی۔
راتوں کو اسے سونے نہیں دیا۔ کال کوٹھری میں اکیلا بند رکھا۔ لیکن اس کی زبان نہ کھلی۔ اور پھر ایک دن
پولیس نے اس کی لاش کو اس کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جیل سے بھاگنے کی
کوشش کر رہا تھا جب ایک وارڈر کی گولی سے مارا گیا۔ یہ پچاس برس پہلے کا قصہ ہے لیکن آج او کونر
جیسے لوگ کہاں ہیں؟"

اور کالے لمبے نوجوان نے اپنے ہندوستانی ساتھی کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا: "او کونر ہر ملک
اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ ایک او کونر سے تو میں آج ہی ملا ہوں۔ ڈونلڈ جان او کونر کے پوتے سے
وہ نیو یارک میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ اور اپنے دادا کی طرح اب بھی انقلابی تحریک کا ساتھ دینے کو تیار ہے
مگر تم اپنی سناؤ۔ تم ہندوستانی ہو کر جو سنا ہے کرم یوگی ہوتے ہیں۔ عمل کے پجاری ہوتے ہیں، کیسے اتنے
نراش اور بے ہمت ہو گئے؟"

"تو سنو۔ میں نے پڑھ لکھ کر فیصلہ کیا تھا کہ میں ایک آزاد اخبار نویس کی حیثیت سے ایک ایسی دنیا کی
تشکیل کے لئے جدوجہد کروں گا جس میں کسی بچے کے باپ کو سینے پر گولی نہ کھانی ہوگی جس میں کسی بچے کی ماں
بیوہ نہ بنائی جائے گی۔ لیکن جب میرے دیش میں آزادی آئی تب بھی گولیوں کی منحوس آواز ہمارے کانوں
میں گونجتی رہی اور یہ گولیاں سامراج کے ہتھیاروں کے کارخانوں میں تیار ہوئی تھیں لیکن ان کو چلانے والے
ہم خود تھے جو ایک دوسرے پر فائر کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر لوٹ رہے تھے اور جلا رہے تھے
ایک دوسرے کی عورتوں کی بے عزتی کر رہے تھے۔ اور پھر تین گولیاں چلیں۔ اور ہم نے اپنے ہاتھوں
سے اپنے باپ کو مار ڈالا۔ آزادی کا گلا گھونٹ دیا اور ہمیشہ کے لئے اپنے ماتھے پر خون کا کلنک لگا لیا۔

انیس سو سینتالیس کے واقعات کے بعد مجھ سے اپنے وطن میں نہ رہا گیا۔ دنیا بھر میں مارا مارا پھرتا
رہا۔ کارسپانڈنٹ کی حیثیت سے میں کتنے ہی دوسرے دیشوں میں گیا۔ وہ دیش جو میرے ملک کی طرح
ابھی آزاد ہوئے تھے یا ہو رہے تھے۔ سو میں کوریا گیا۔ اور وہاں میں نے دیکھا کہ ہزاروں امریکی سپاہی۔
گورے اور کالے۔ اپنے دیش سے ہزاروں میل دور اس اجنبی ملک میں جنگ کر رہے ہیں تاکہ ایشیا کے نئے
آزاد ملک ڈالر کی سلطنت سے باہر نہ جا سکیں ـــــ اور وہاں ایک دن جب میں ایک اور ہندوستانی

کارسپانڈنٹ وجے شنکر کے ساتھ فرنٹ سے لوٹ رہا تھا ہماری جیپ کے نیچے ایک سرنگ پھٹی۔ یہ سرنگ امریکہ میں ڈیٹرائٹ کے قریب ایک فولاد کے کارخانے میں بنائی گئی تھی۔ اور امریکی سپاہیوں نے اسے جنوب مغربی ایشیا کی اس خوبصورت اور سرسبز وشاداب سرزمین میں بویا تھا۔ جیسے دھان کا بیج بویا جاتا ہے۔ اور پھر "غلطی" سے یہ سرنگ ہماری جیپ کے نیچے پھٹ پڑی تھی اور میرا پیارا دوست جو بیس سالہ وجے شنکر جو کیرالا کی ایسی ہی خوبصورت سرزمین کا رہنے والا تھا جس کی صرف چھ مہینے ہوئے شادی ہوئی تھی، اور جو اپنی زندگی میں پہلی جنگ کو رپورٹ کرنے آیا تھا۔ جو ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور جو اُس وقت بھی جب موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی ملیالم کے ماہی گیروں کا ایک گیت گا رہا تھا اور اس کے معنی مجھے بتاتا جا رہا تھا۔

یہ میرا جال —
یہ میرا سنہری جال —
بہت دور تک میں اسے پھینکوں گا۔
یہ جال بے تھک سمندر کی تہہ تک جائے گا۔
اور لال پیلی ہری مچھلیوں کو سمیٹ کرلے آئے گا۔
مگر کہاں ہے وہ جل پری —
وہ میری جل پری —
جو ناریل کے پیڑ کی طرح اونچی ہے۔
اور جس کا بدن مچھلی کی طرح چکنا اور . . . . .

مگر اسکے آگے یہ گیت کیا کہتا ہے یہ میں آج تک نہ معلوم کرسکا کیونکہ شنکر یہیں تک گا پایا تھا کہ وہ منحوس دھماکہ ہوا اور پھر ہماری جیپ نہیں تھی، صرف لوہے کے چند جلتے ہوئے ٹکڑے دھان کے کھیت میں پڑے تھے۔ کوٹالم کا رہنے والا وجے شنکر نہیں تھا اور ہمارا کوریَن ڈرائیور رمبنگ سان نہیں تھا جلے ہوئے گوشت کے چند گمنام لوتھڑے خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ مگر تقدیر کے کسی شعبدے سے میں صرف زخمی اور بے ہوش ہوا تھا۔

"اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں پڑا تھا اور میرے برابر کے بیڈ پر ایک نوجوان امریکن نیگرو بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ صرف ایک لفظ بار بار دہرا رہا تھا "نو۔ نو۔ نو۔ نو" کبھی وہ گڑگڑا کر کہتا تھا " نو۔ نو۔ نو" جیسے اپنی جان کی بھیک مانگ رہا ہو۔ کبھی چلّا کر کہتا تھا " نو۔ نو۔ نو"

جیسے کسی بڑی طاقت کو للکار رہا ہو۔ کبھی صرف سیدھے سادے انداز میں دھیرے سے کہتا تھا: نو۔ نو۔ نو ـــ" جیسے کسی پارٹی میں کیک کا دوسرا ٹکڑا لینے سے انکار کر رہا ہو"

میں نے اپنے بیڈ کی دوسری طرف والے پڑوسی سے پوچھا۔ اس نیگرو جوان کو کیا ہو گیا ہے جو یہ بے ہوشی میں بھی نو۔ نو۔ نو۔ بڑبڑا رہا ہے۔ جس سے میں نے سوال کیا تھا وہ ایک لال منہ کا ہٹا کٹا ادھیڑ عمر کا سارجنٹ تھا جو بقول خود اس کے "سٹلس کے" "جنگی مرض" کا علاج کرانے داخل ہوا تھا۔ وہ بولا: "یہ نیگرو ملیٹری کا ورڈ ہے۔ ایک دم بزدل۔ فرنٹ پر جب اس کی پلاٹون کو حملے کا حکم دیا گیا تو یہ دم دبا کے بھاگ رہا تھا۔ کہتا تھا آخر ہم کیوں کوریا والوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ وہ تو خیریت ہوئی اسکے سارجنٹ نے وقت پر سن لیا۔ ورنہ ساری پلاٹون باغی ہو جاتی . . . . ."

"اور پھر کیا ہوا؟" میں نے اس لال منہ والے سارجنٹ سے پوچھا۔ اور وہ اپنے منہ میں سے چیونگ گم تھوکتے ہوئے بولا: "ہونا کیا۔ یونہی نو۔ نو۔ نو بک رہا تھا۔ جب اسکے سارجنٹ نے فوجی قانون کے مطابق اسے گولی مار دی۔ ایسے باغیوں کو نہ جانے کیوں یہ ڈاکٹر بچانے کی کوشش کرتے ہیں؟"

اور یہ کہہ کر وہ بڑے انہاک سے پھر اپنا میگزین پڑھنے لگا جس کے اوپر ایک حسین جو تھائی ننگی عورت سر پر نکل سام والا چینی جیسا اونچا ہیٹ پہنے سمندر کے کنارے کھڑی ریت کے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا لال اور نیلا امریکن جھنڈا لگا رہی تھی۔ اور میں نے پھر نیگرو کی طرف دیکھا جس کے بے ہوش منہ سے اب "نو" کی آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اور کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف کروٹ لے کر سنا تو وہ بڑی نرمی سے بڑبڑا رہا تھا: ڈارلنگ میں بہت خوش ہوں کہ تم ماں بننے والی ہو۔ لڑکا ہو تو اس کا نام ہنری رکھنا۔ میرے نام پر۔ اور اگر لڑکی ہو . . . . ."

"اور پھر اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ خاموش بے جان۔ ایک ڈاکٹر نے چلتے چلتے اس کی نبض ٹٹولی پھر وارڈ بوائے کو اشارہ کیا۔ اور چند منٹ میں وہ اس کی لاش کو ایک ٹرالی پر ڈال کر لے گئے۔ اور کسی نے اتنا بھی نہ کیا کہ اس کی بیوی کو اطلاع دے دیتا کہ اس کے شوہر کی آخری خواہش تھی کہ ان کے لڑکے کا نام ہنری رکھا جائے۔"

"فکر نہ کرو میرے بھائی اس کی بیوی کو اپنے شوہر کی آخری خواہش معلوم تھی۔ اپنے بیٹے کا نام اس نے ہنری ہی رکھا تھا۔"

"تھا؟ تو اب کہاں ہے ہنری جونیر؟"

"اب وہ نہیں ہے۔ ایک گولی . . . . ."

ایک گولی نہیں سینکڑوں گولیاں لاکھوں گولیاں ہنری جونیر جیسے بچوں کے سروں پر منڈلا رہی ہیں۔ گولیاں اور

گولے اور راکٹ اور ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور زہریلی گیس کے بم اور پلیگ اور ٹائی فس کے جراثیم کے بم میں تو دنیا کا کونا کونا چھان آیا ہوں۔ الجیریا میں میں نے فرانسیسی تہذیب کے علمبرداروں کو عرب قوم پرستوں کے ننگے جسم میں بجلی کے کرنٹ دوڑا کر ان کو ادھ موا کرتے دیکھا ہے۔

میں نے اُن معصوم الجیرین لڑکیوں کی لاشوں کو دیکھا ہے جنہوں نے خودکشی کرلی۔ کیونکہ ان کے پیٹ میں ناسوروں کی طرح فرانسیسی بچے پل رہے تھے۔"

"کیا تم نے فرانس میں ژاں پال سارتر اور آندرے مارلو اور دوسرے فرانسیسی دانشوروں کو اس بربریت کے خلاف احتجاج کرتے نہیں دیکھا؟"

مگر ہندوستانی بولے ہی چلا جا رہا تھا۔ جیسے وہ یہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہو۔ جیسے اس کے لئے اور کوئی چارہ ہی نہ ہو۔

"میں نے ہٹلر کی روح کو جنوبی افریقہ میں کارفرما دیکھا ہے۔" میں نے امریکہ کے جنوب کی ریاستوں میں 'کلوکلس کلان' کی کارروائیاں دیکھی ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک نیگرو بچے کو گولی لگی ہے جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ گورے بچوں کے ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھنا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں نے وہ کچھ دیکھا ہے جو کسی انسان کی آنکھوں کو نہ دکھائی دینا چاہئے۔"

"میں یہ سب جانتا ہوں" میرے بھائی۔ اس نیگرو بچے کی ماں سے میں آج ہی ملا ہوں۔"

"اور پھر افریقہ کی قومیں آزاد ہونی شروع ہوئیں۔ میں افریقہ کے کتنے ہی ملکوں کے جشنِ آزادی میں شریک ہوا۔ ان کے بارے میں لمبے لمبے آرٹیکل لکھے اور بار بار اپنے اخبار میں اعلان کیا۔ ایک نیا افریقہ جنم لے رہا ہے۔ ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔ مگر وہ سب جھوٹ تھا۔ اصلیت کچھ اور ہی تھی۔ آزادی کے چمکتے ہوئے ماسک کے پیچھے غلامی کا وہی بھیانک اور کریہہ چہرہ تھا۔ اس نئی دنیا میں بھی طاقت ہی کا راج تھا۔ ہتھیاروں کی طاقت بندوقوں اور ٹینکوں اور بم بار ہوائی جہازوں کی طاقت۔ اور کل اس طاقت کا آخری اور قطعی مظاہرہ ہو گیا

تین گولیاں چلیں۔

اور ...... اور .....

اور اب نشے میں مدہوش ہندوستانی نوجوان سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔

"اور ..... اور کیا ہے؟" کالے اجنبی نے بڑی ملائمت بڑے پیار سے پوچھا۔

تین گولیاں چلیں ــــ اور جلیانوالہ باغ میں میرا باپ پھر قتل کر دیا گیا ــــ

تین گولیاں چلیں ــــ اور ہمارے باپو پھر شہید کر دیئے گئے ــــ تین گولیاں چلیں۔ اور الجیریا کی جمیلہ

جن کو دنیا کے انسانوں کی متفقہ آواز نے پھانسی سے بچا لیا تھا۔ آخرکار وہ قتل کر دی گئی۔ اور سیکو اور وینزیٹی
پہ الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیئے گئے۔ اور پال روبسن کی کالے مخمل جیسی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ اور ساری دنیا
پر منحوس اندھیری زہریلی دھند چھا گئی۔ اب کبھی دنیا میں روشنی نہیں ہو گی۔ کبھی برف نہیں پگھلے گی۔ کبھی
پھول نہیں کھلیں گے، کبھی بہار نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ انسان جس کے دم سے زندگی تھی اور روشنی تھی اور
بہار تھی — کل خود انسان مر گیا ہے۔"

اور پھر وہ تھک کر خاموش ہو گیا۔ پریس روم میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ اب صرف دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی
ٹک ٹک تھی اور وہ دونوں تھے۔ صرف وقت تھا۔ اور دو انسان تھے ایک کالا اور ایک سانولا۔

ہندوستانی نوجوان نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "میرے نیگرو جرنلسٹ دوست پال
اپنا پریس کارڈ یہاں پھینک کر گھر چلا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے اب وہ اس قبرستان کی رپورٹ لینے پھر کبھی نہیں
آئے گا۔ اور میں — میں دو بوتلیں وسکی کی پی چکا ہوں۔ یہ سب کچھ بھلانے کے لئے — مگر نہیں بھلا سکتا۔
کل میں بھی ہندوستان واپس چلا جاؤں گا۔ وہاں کسی کروڑپتی سیاستداں کی تقریریں لکھا کروں گا، یا جوتوں
کے اشتہار بنایا کروں گا یا کسی فلم اسٹار کے حسن کی شان میں قصیدے لکھا کروں گا۔ اب یہاں میرا کوئی کام نہیں
ہے۔ تماشہ ختم ہو گیا ہے۔"

"تماشہ ختم نہیں ہوا میرے دوست تماشہ شروع ہو رہا ہے۔ دنیا پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہی ہے۔"

"مگر یہ پردہ اٹھائے گا کون؟"

"تم!"

"میں؟ کیسے؟"

"مجھے اندر اسمبلی ہال تک پہنچا دو۔"

"تم کو تو میں پال کے پریس کارڈ پر لے جا سکتا ہوں لیکن وہاں تم کرو گے کیا؟ کیا تم پتھر کو پگھلا
سکتے ہو؟ کیا تم اندھوں کو آنکھیں دے سکتے ہو؟ کیا تم بہروں کے کان کھول سکتے ہو؟"

"ہاں۔"

"ایسی کون سی طلسمی طاقت ہے تمہارے پاس؟"

"میں نہیں ہوں۔ اور یہی میری سب سے بڑی طاقت ہے۔ چلو — اب دیر ہو رہی ہے۔"

"چلو مگر تمہیں مجھے سہارا دینا پڑے گا۔" ہندوستانی نوجوان نے اپنے کالے ساتھی کا بازو پکڑ کر اٹھتے ہوئے
کہا: "نشے سے میرے پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔"

وہ پاس دکھا کر اسمبلی ہال میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ کالے لمبے اجنبی نے اپنے ہندوستانی دوست کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بھاری سی چیز رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ وہی گولی ہے جو علیانوالہ باغ میں تمہارے بابا کو لگی تھی — بیالیس برس سے تم اسی کو تلاش کر رہے تھے نا؟"

(۶)

اور اب کالے لمبے نوجوان نے دیکھا کہ ایک لمبے ہال کی چار دیواروں میں ساری دنیا تھی۔

یورپ۔

ایشیا۔

افریقہ۔

امریکہ۔

آسٹریلیا۔

کالے۔

گورے۔

سانولے۔

اشتراکی۔

سرمایہ دار۔

غیر جانب دار۔

دوست۔

دشمن۔

مغربی یورپ کا ایک ڈیلی گیٹ کہہ رہا تھا "جذباتیات سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ ہمیں کانگو سے مفصل رپورٹ آنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ ہوائی الزامات پر یقین نہ کرنا چاہئے۔ یہ قتل کیسے ہوا اور کس نے کیا۔ یہ تو صرف ایک ہی آدمی کی گواہی سے ثابت ہو سکتا تھا — وہ جس کا قتل ہوا ہے!"

عین اس وقت دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک کالا لمبا سا نوجوان خاموشی سے پریس گیلری میں کھڑا ہو گیا۔

اور اس کا وہاں موجود ہونا تھا کہ . . . . .

یو۔ این۔ او کے سیکریٹری جنرل کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر پڑا۔ اور اس کی تقریر کا ڈرافٹ جو سامنے پڑا تھا۔ اس پر پانی پھر گیا۔

برٹش ڈیلی گیٹ کی بائیں آنکھ سے مونوکل کا شیشہ میز پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

فرانسیسی ڈیلی گیٹ کے منہ سے سونے کا لمبا سگریٹ ہولڈر گر گیا۔ اور اس کے بڑھیا سوٹ پر راکھ بکھر گئی۔

امریکن ڈیلی گیٹ کچھ کہنے ہی والا تھا مگر اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

بلجیم کے ڈیلی گیٹ کی گھگی بندھ گئی اور اس کے نقلی دانت گھبراہٹ کے مارے جبڑے سے باہر نکل پڑے۔

سوویٹ ڈیلی گیٹ کی لال پنسل کی تیز نوک سامنے رکھے ہوئے کاغذ کے پیڈ میں پیوست ہو گئی۔

ہندوستانی ڈیلی گیٹ جواب تک [illegible] میں اور برطانوی قانونی جملوں میں تقریر کرتا رہا تھا۔ ایک دم اپنی ہندوستانی بھاشا میں چلا پڑا۔ " وہ دیکھو "

افریقہ کے ملکوں کے جتنے ڈیلی گیٹ خاموش اور مایوس بیٹھے تھے۔ دفعتاً ان کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی۔ جیسے اُن کے سامنے آسمانی معجزہ ہوا ہو۔

مگر ایک کالے رنگ کا ڈیلی گیٹ (جس کے سامنے میز پر "کانگو" کے نام کی تختی رکھی ہوئی تھی) ایسا بھی تھا جو ڈر کے مارے کانپتا ہوا بلجیم کے ڈیلی گیٹ کی کرسی کے پیچھے چھپ گیا۔

اور اس وقت سننے والوں نے سنا کہ پریس گیلری میں کھڑا ہوا کالا نوجوان کہہ رہا ہے — دوستو اور . . . . . اگر میں کل یہاں آتا تو کہتا دوستو اور دشمنو۔ لیکن کل میں تھا اور آج میں نہیں ہوں۔ اور جو نہیں ہے اس کا کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ سنا ہے آپ کو میرے قتل کا ثبوت چاہئے۔ ثبوت میرے پاس تین تھے — تین گولیاں — جو بلجیم کی بنی ہوئی تھیں۔ گو ان گولیوں کو چلانے والے ہاتھ گورے بھی تھے اور کالے بھی۔ یہی تین گولیاں میں آپ کے سامنے پیش کرنے یہاں آیا تھا۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ جن تین گولیوں سے مجھے قتل کیا گیا ہے۔ میں نے انہیں دنیا میں تقسیم کر دیا ہے۔

اور پھر وہ کالا لمبا ہیولہ غائب ہو گیا۔ اور سب نے سوچا کہ یہ ہمارا وہم تھا۔ بھلا یو۔ این۔ او کی بلڈنگ

میں جہاں تین تین پہرے لگے رہتے ہیں، کوئی بھوت کس طرح داخل ہو سکتا ہے۔ صرف ایک ہندوستانی نوجوان تھا جو قسمیں کھاتا تھا کہ اسنے کالے لمبے نوجوان کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اس سے باتیں بھی کی ہیں، اُسے اپنے ساتھ اندر بھی لایا ہے لیکن ایک شرابی مدہوش کا رسپانڈنٹ کا کون اعتبار کرتا ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگلی صبح کو جس وقت آئڈل وائلڈ ایر پورٹ سے ایک ہوائی جہاز افریقہ کے لئے روانہ ہو رہا تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ تین دن سے جما ہوا ٹھنڈا دھواں آہستہ آہستہ ایر پورٹ پر سے اٹھتا جا رہا ہے اور جب وہ ہوائی جہاز رن وے سے اڑ کر نیو یارک کے شہر پر سے گزرا تو مسافروں نے دیکھا کہ نیچے یو۔ این۔ او کے مینار کی چوٹی دھند کے نقاب میں سے دھیرے دھیرے سر نکال رہی ہے۔

اور ریڈیو پر موسم کی رپورٹ سنانے والے اناؤنسر نے کہا کہ نیو یارک پر سے دھند پورے ہونے کے پورے امکانات ہیں کیونکہ گرم ہوا کا ایک زبردست جھونکا جو افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا سے چلا تھا وہ ہندوستان اور جنوب مغربی ایشیا پر سے ہوتا ہوا انڈونیشیا اور جاپان پر سے گذرتا ہوا امریکہ تک آن پہنچا ہے اور گرم ہوا کے اس جھونکے سے دھند کا ٹھنڈا دھواں پگھلتا اور بکھرتا جا رہا ہے۔ اور اب سورج اندھیرے کی قید سے نکلنے ہی والا ہے۔ . . . . .

قاضی عبدالستار

پنڈت آنند سہائے تعلقدار لکڑاواں کے مرتے ہی شیخ سردار علی نے مختاری کے چونچلوں کو سلام کیا اور کمر کھولدی۔ نئے رئیس پنڈت درگا سہائے نے جھوٹ موٹ کی تلو چپّو بھی کی لیکن شیخ جی (وہ لکڑاواں میں اسی نام سے بجتے تھے) اپنے ٹانگن پر سوار ہو کر مان پور آہی گئے۔ شروع شروع میں شیخ کو مان پور میں ایسا لگا جیسے صبح سورج کی مشعل لئے شام کو ڈھونڈھا کرتی ہے اور شام اپنی آرتی میں ستارے جلائے صبح کی راہ تکا کرتی ہے۔ مگر جیت کے آتے آتے انہوں نے کاشتکاروں سے اپنی سیر نکال لی اور چار جوڑ بیل خرید کر کھیتی شروع کر دی۔ پہلا پانی پڑتے ہی بستی سے ملے ہوئے پچاس بیگھے کے پلاٹ پر کنواں کھود کر قلمی باغ کی طرح بھی ڈال دی لیکن وقت اب بھی کاٹے نہ کٹتا۔ آخر کار انہوں نے اپنی مشین کو طاق پر رکھا اور بستی کے بڑے بوڑھوں میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ کسی کو تعویذ لکھ دیتے کسی کو سرمے منجن کا نسخہ بتاتے کسی کے پھوڑے پھنسی میں اپنے ہاتھ سے پولٹس باندھتے کسی کا خط لکھتے کسی کا مقدمہ لڑاتے غرض پانچ چھ ہزار کی بستی اور وہ بھی مسلمان بستی میں ان کا وقت بے لگا کر اٹھنے لگا۔ "شبرات" کا چاند دیکھ کر وہ اپنی بیٹھک میں تخت پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ چھوٹے خاں اور جلاہوں کے چودھری منیر بخش دو چار بڑے بوڑھوں کے ساتھ آ گئے۔ شیخ نے ان کو پلنگوں پر بٹھایا۔ اور منظور کو آواز دی وہ سیاہ لنگوٹ باندھے موٹے موٹے ہاتھ پیروں پہ تازی تازی مٹی ملے دندناتا ہوا آیا اور بھونچکوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ شیخ نے بیٹے کا یہ حلیہ جو دیکھا تو حقے کی چلم کی طرح جل گئے۔ کڑک کر پوچھا

"یہ کیا؟" منظور نے ممنا کر جواب دیا کہ مدی چچا سے کشتی لڑ رہا تھا۔ "مدی سے جو بڑے بڑے پہلوانوں سے لنگوٹ چھین چکا ہے؟" شیخ معلوم نہیں کیا کیا سوچ ڈالتے کہ چھوٹے خاں نے چونکا دیا۔

"شیخ جی.... بستی کی ساری برادریوں کے چودھریوں نے ایک بات طے کی ہے۔"

"میں بغیر سنے مانے لیتا ہوں۔" شیخ بولے۔

"ماننے کی بات نہیں شیخ جی کرنے کی ہے۔"

"معلوم بھی تو ہو۔"

"بات یہ ہے کہ ہماری مسجد ہے بہت چھوٹی اور بستی کے نمازی تو آپ جانتے ہی ہیں پانچ چھ ہزار کی

بستی کے نمازی ہیں . . . . . سمائیں تو کہاں سے سمائیں . . . . . جہاں تک پیسے کا معاملہ ہے تو اگر روپیہ گھر
سے لے لیا تو بوری بھر ہو جائے گا . . . . . ہاں زمین کی بات ٹیڑھی ہے۔ آپ نے تینتیس برس پنڈتوں کی خدمت
کی ہے ان سے کہیے کہ مسجد کے سامنے والی ٹکڑی دے دیں۔ رہی نذر نذرانے کی بات تو دس بیس باڑھ لے
لیں ——"

چھوٹے خاں نے تو ایک سانس میں سب اگل دیا لیکن شیخ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ منظور چلم بھر کر لایا۔
حقے پر رکھ دی۔ گٹا دبا کر مہتال باپ کے لبوں تک پہونچائی۔ تھوڑی دیر تک نگاہ کے اٹھنے کا انتظار کیا پھر
شیخ کو مراقبے میں مستغرق پا کر دبے پاؤں چلا گیا۔ قصائیوں کے چودھری قاسم نے سینے پر پھیلی ہوئی داڑھی پر ہاتھ
پھیرا کھنکار کر گفتگو کا پھیر بہت پھیلا پھیلا کر گویا ہوئے۔
"اس بستی کی بھی کوئی انتہا ہے کہ مسلمانوں کی دس بکھریاں ہیں اور تین سو لڑکے ہیں ہماری ہجار ڈیڑھ ہجار
بکھریاں ہیں اور ایک مسجد وہ بھی . . . . . ڈیڑھ ہاتھ کی۔" انہوں نے اپنے لمبے چوڑے بالشت سے پلنگ کی
پٹی ناپ کر بتائی۔ اب میر بخش کے لئے بولنا سنت تھا کیونکہ وہ سنت کے بڑے رسیا تھے۔
"مان پور سے گنگرا واں والوں کو کبھی رمضان کے لئے نکالا جانہیں کرنا پڑا۔ بخر بخیر اتنا تک ہم گنج گھر بیٹھے
رہتے آئے ہیں۔ نمری چار پیسے کی ٹپی چاہے دیر سے پہونچے چاہے سویرے لیکن ان کے پندرہ آنے کی کوڑی
کوڑی چکانے کے ہدلی چھوٹی ہے۔"
تھوڑی دیر کے بعد شیخ نے گردن اٹھائی بے نور آنکھوں سے سب کے چہروں پر لکھی ہوئی ایک سی عبارت پڑھی
اور دبی مری آواز میں بولے۔
"کل صبح گنگرا واں جاؤں گا۔"

صبح کو جب شیخ قرآن مجید کی تلاوت کر کے اٹھے تو منظور کی چارپائی خالی تھی۔ ورنہ وہ الٹی سیدھی ٹکریں
مار کر بڑی دیر تک پڑا اینڈتا رہتا تھا۔ رجب کی ماں سے پوچھا اس نے تازی روٹی میں گود گود کر گھی بھرتے ہوئے
جواب دیا کہ بھیا بڑی دیر سے باہر گئے ہیں۔ شیخ باہر آئے تو ٹانگن غائب تھا۔ کوٹھری کھولی تو ساز رکھا تھا۔ ہاں
لگام غائب تھی۔ شیخ دھک سے رہ گئے۔ صحن میں ٹہلتے رہے اور سورۂ یٰسین پڑھتے رہے۔ شیخ ٹانگن کی شرارت
جانتے تھے۔ ادھر سوار کی پٹری بگڑی ادھر اسے پھینکا۔ شیخ حسن کی سواری کی جوار میں دھوم تھی ان تک کو یہ
ٹانگن پٹخنیاں کھلا چکا تھا۔ اس کی اسی ادا پر تو شیخ ریجھے ہوئے تھے۔ ورنہ انہوں نے کبھی ایک جانور پر دو برس
سواری نہیں کی۔ وہ سوچتے سوچتے باہر نکل آئے۔ آج انہوں نے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا کہ منظور کی پیٹھ ٹھونک کر

ڈالیں۔ ماں کی موت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پونڈے کو دلار میں چوپٹ کر لیا جائے۔ وہ اپنے غصے کو ابلاتی رہے
تے کہ تاپوں کی آواز آئی۔ منظور ماہر شہسوار کی طرح گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر تصویر بنا بیٹھا تھا۔ ٹانگن دھول کی طرح
ان کے پاس سے نکل گیا۔ وہ کوٹھری میں پہونچے۔ ٹانگن پسینے میں شرابور بینیے کی طرح کھڑا ہانپ رہا تھا۔ وہ
پاؤں پٹختے اندر پہونچے۔ منظور رجب کی ماں کے کولھے سے کولھا جوڑے گھی میں ڈوبی روٹیاں کھا رہا تھا۔ انہوں
نے اُسے چیخ کر پکارا اور صحن میں پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے کرتے کے دامن سے اپنا منہ پونچھا اور آکر
بے نیازی سے بیٹھ گیا۔

" اٹھائیسواں پارہ سناؤ۔"

شیخ کی دہاڑ سنکر منظور نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بس"۔ پھر ریکارڈ بجنے لگا۔ شیخ نے زیر زبر کی غلطی کا بہانہ ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن کچھ بس نہ چلا۔ پارہ ختم کر کے منظور اٹھا۔ اور دو دھار سے دو کٹورے دودھ نکال کر پانی کی طرح چڑھا گیا۔ شیخ اس کے بدن کی حیرت انگیز اٹھان دیکھتے رہے اور اپنا غصہ بلاتے رہے مگر وہ کسی طرح آپی نہ چکتا تھا۔ مجبوراً باہر چلے گئے۔ اب دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ اور لُو چلنے لگی تھی۔ کھلیان میں تھوڑا گیہوں پڑا تھا۔ شیخ اٹھوانے چلے گئے۔ گیہوں تو پڑا رہا البتہ شیخ اٹھوا کر لائے گئے۔ لُو کے ایک ہی تھپیڑے میں جل کر سیاہ ہو گئے تھے۔

شیخ کے جنازے پر سارا مان پور رو دیا تھا۔ منظور تو اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ منظور کو اس خوشی کا بھی انکشاف ہوا تھا کہ اب وہ ساری رات مدّی چچا سے کشتی لڑ سکتا ہے اور سارا دن ٹانگن پر سواری کر سکتا ہے۔ مڈل اسکول کا بھاری بستہ جو منظور کی بیل کی سی گردن پر گاڑی کے جوئے کی طرح رکھا تھا پرانے سامان کی کوٹھری میں دفن ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں کی ہیل ٹانگن کی گردن میں گنگنانے لگی۔ لگام میں ریشم کی ڈوریاں جھک اٹھیں۔ اکھاڑے کو وسیع کر کے اس کی مٹی کو ملائم کیا گیا اور مدّی چچا سے منظور کے دو دو گھنٹے داؤں ہونے لگے۔ ٹانگن پر دس دس میل کے چکر لگنے لگے۔ مان پور کے اتر اور پچھم میں دور دور تک پاسیوں کے گاؤں تھے جو سب آپس میں عزیز دار ہونے کے باوجود لڑتے رہتے تھے۔ ان لڑائیوں کا سبب شکایت سے زیادہ قوت کا اظہار تھا۔ تاہم یہ وقت پڑنے پر غیر پاسی کے مقابلے میں ایک ہو جاتے تھے۔ ان میں سب سے مضبوط سب سے اہم اور سب سے وسیع گھرانا جیپورہ کے راج دین کا تھا جس کے درجنوں بھائی دس بیٹے اور اتنی ہی بیٹیاں تھیں۔ ان سب کی شادی بیاہ نے دور دور تک اس کا اثر پھیلا دیا تھا۔ راج دین لکراوان کا نوکر تھا۔ لیکن جب شیخ گھر بیٹھے تو راج دین شیخ کی جائیداد کا منتظم ہو گیا۔ راج دین کا چھوٹا لڑکا رام دین منظور کا ہمجولی تھا اور منظور کو "منجور" بھیا کے بجائے مُجو بھیا

کہتا تھا۔ مجو بھیا کا یہ مخفف رام دین نے اپنی آسانی کے لئے کیا تھا جو دھیرے دھیرے مان پور کی زبان پہ چڑھ گیا۔ شیخ کے مرنے کے بعد راج دین نے جائیداد کے چھوٹے موٹے کام رام دین کے سپرد کر دیئے۔ اس کا بہت بڑا سبب منظور کی شخصیت کی وہ دلکشی تھی جس نے رام دین کے علاوہ جوار کے بہت سے معزز گھرانوں کے نوخیز لڑکوں کو فریفتہ کر کے اپنی رکاب میں شامل کر لیا تھا۔ مان پور ستیا پور اور سرندی کی سرحد پر تھا اور تین تھانوں میں تقسیم تھا۔ اس نزاکت سے فائدہ اٹھا کر جرم کے جائے وقوع میں ذرا سی تبدیلی کر کے ہر تھانے دار اپنا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ پولیس والوں کی زبان میں مان پور بنجر بھی تھا۔ روایت تھی کہ فلاں کے باپ نے ڈھکے کے دادا نے سو روپے قرض لے کر پولیس کو کسی زمانے میں رشوت دی تھی۔

مان پور کی مفلسی کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی جس کی بنا پر پولیس یہاں کے واقعات میں دلچسپی بہت کم لیتی تھی۔ مان پور کے دو تھانے گنگرا والے کے تعلقے میں تھے۔ اور گنگرا والے کے مختار عام شیخ منصور علی کا وطن مان پور تھا۔ شیخ کی مزاعات نے پولیس کو اخلاقی طور پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مان پور کی طرف سے آنکھیں بند کرے۔ ان حالات نے مان پور کی نفسیات بگاڑ دی تھی۔ جس لڑکے کے ذقن پر سلوٹ ہوتے وہ کسی نہ کسی استاد کا شاگرد ہو کر بدن بناتا۔ کسی نہ کسی اکھاڑے میں شامل ہو کر بانا گھماتا۔ گلے میں کالا تاگا اور ڈنڈ پر لال تعویذ باندھ کر ساتھ ہاتھ کی لاٹھی بغل میں دابتا اور بے پیے جھوم جھوم کر گشت کیا کرتا۔ جب تک باپ چچا روٹی دیے جاتے دیتے پھر وہ دو دو تین تین ضلعوں سے بھاگے ہوئے بدمعاشوں سے یارانہ بڑھاتا۔ کبھی ضرورتاً اور کبھی تفریحاً ڈکیتی تک میں شامل ہو جاتا۔ جب معاملہ شیخ کے ہاتھ سے نکل جاتا تو تھانے میں کمر بندھوا کر جیل چلا جاتا۔ چھوٹ کر آتا تو سلطانا کے قصے سناتا اور دل کو دہلا دینے والے قہقہے لگاتا۔ یہ سب دیکھتے ہی دیکھتے شیخ کے بال سفید ہونے لگے۔ اسی لئے جس دن منظور نے استاد متے کے اکھاڑے میں لکڑی سیکھنے کی اجازت مانگی اس دن شیخ نے پہلی بار دلارے منظور کو ڈانٹا۔ قرآن مجید کا سبق لمبا کر دیا۔ آموختہ دوبارہ سنا۔ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر منشی لال بخش کو سختی کرنے کی تاکید کی۔ اس فضا میں منظور کا بدن ککڑی کی بیل کی طرح پھیلتا گیا۔ اس کی چھٹیا چیونٹیوں کے دل کی طرح بڑھتی گئی۔ منظور کے بجائے مجو بھیا کے نام سے وہ مشہور ہوتا گیا۔ اور نومولود باغ اور کھیتوں کی آپ ہی آپ نگرانی ہوتی رہی۔

صنیوت کا زمانہ تھا۔ گیہوں بونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ستاروں کی چھاؤں میں کھڑے ہوئے مجو بھیا بیلوں کو جھڑے کے آٹے کی لونیاں کھلوا رہے تھے اور چکی پر گاتی ہوئی پسنہاریوں کے گیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہرواہے نے ٹانگن کی بیماری کی خبر دی۔ مجو بھیا کی چہیتی۔ یہ خبر سنتے ہی دوڑ پڑے۔

چار چار کوس کے دھاوے مارے۔ چودھری کے سیانوں کی بھیڑ لگا دی۔ مگر ٹانگن مر گیا۔ یاروں نے تالاب کے کنارے گڑھا کھود کر اس کی لاش دبا دی۔ چھوٹے خاں کے بیٹے ننھو خاں نے ہانک لگائی۔

"فکر نہ کرو مجو بھیا اگلے سال اللہ نے چاہا تو اس کا عرس کریں گے۔"

مگر ننھو خاں کی اس آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ مجو بھیا کو سوگوار دیکھ کر کھمڑیوں کے چودھری کا بیٹا ملکتی اپنا لنگوٹ باندھتا ہوا آیا اور مجو بھیا کے چوڑے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم گھوڑا پسند کر لو مجو بھیا۔"

"ہاں اور تم گھر کے آنگن سے مٹھور کھود کر روپیہ گن دینا..... کیوں نا؟"

"اور جو مٹھور ہی کھود دیں مجو بھیا تو؟"

یہ کہہ کر اس نے ان کو اکھاڑے کی منڈیر پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"مسجد کے پاس جو دس بیگھے کا کھیت ہے۔"

"ہے۔"

"اس میں کیاں کھود کے آلو بوائے دو..... فصل ہے ابھی۔"

"اول تو کنواں کھودنے میں دو کرڈ لگنی ہے..... پھر بھا بسیارہ؟"

"کیا یار مجو بھیا باتیں کرتے ہو..... ہم تم تو جیسے مٹی کے مادھو ہیں۔"

اور سارا اکھاڑہ اپنے یاروں کو پکارتا ہوا کھیت میں اتر پڑا۔ مگدر ہلانے اور ڈنٹر پیل لگانے کے بجائے سب کے سب پھاوڑے اور کدال لے کر جٹ گئے۔ شام ہوتے ہوتے پانی نکال لیا۔ دوسرے دن درجنو بیریاں کھود کر کھیت کو روندھ دیا۔ تیسرے دن کیاریاں پڑنے لگیں۔ ملکتی کے باپ نے کہا بھی کہ دس بیگھے آلو سنبھالنا تماشہ نہیں ہے لیکن لونڈوں نے ایک نہ سنی۔ آلو کا کھیت مجو بھیا کی بیٹھک بن گیا۔ جو آتا چلم کا ایک دم لگاتا ایک بیڑی سلگاتا اور سو پچاس ڈول پانی کھینچ کر کھیت میں بہا دیتا۔ لبوے دو لبوے کی نکائی کر دیتا۔ ملکتی کا باپ بفاتی جس نے فنِ کاشتکاری کے سائے میں آنکھ کھولی تھی اور داڑھی سفید کی تھی۔ اس کھیت کا نگہبان تھا۔ وہ بوڑھے فنکار کی طرح نکتے نکالتا اور سارے پور کی ساری جوان اور توی ہیکل آبادی اپنا پسینہ بہاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھاگن کا مہینہ آ گیا۔ دن سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ کھیت کے سرہانے کھڑے ہو کر مجو بھیا نے دو سیر جلیبیوں پر نذر دی۔ اور یاروں نے دو دو جلیبیاں منہ میں رکھ کر کھرپیاں سنبھال لیں اور پاؤ پاؤ بھر کا آلو کھودنے لگے۔ مجو بھیا سڑک کے کنارے والی منڈیر پر کھٹیا ڈالے بیٹھے تھے۔ خیالوں کی چاندی کا خیمہ گڑا ہی رہے تھے کہ کنگراؤں کے مختار عام ہاتھی جیسے مشکی گھوڑے کی لگام کھینچ کر کھڑے ہو گئے۔ مجو بھیا نے دعا سلام

کو بہانہ بنا کر ان کو گھوڑا دیکھنے کے لئے اتار لیا۔ بکس نے کھرپی کھٹیا پر رکھ کر گھوڑے کو گھورا۔

"مختار صاحب کتنے میں خریدا؟"

"کیا؟" مختار عام نے لونڈے کو گھور کر دیکھا۔

"گھوڑا۔"

"گودی بھر کے لگا ہے بچو۔"

"مگر گن تو لیا ہوگا۔"

"ہاں چھ سو کا ہے۔" اور بکس کو اس طرح دیکھا گویا لہر رہے ہوں کر سن لیا۔

"بس۔ . . . . بڑے سستے ہوتے ہیں گھوڑے اپن نے تو جانا تھا کہ ہجار دو ہجار کا ہوگا۔"

"تو باندھ لو دو چار۔"

"رسید لکھو گے . . . . . منگاؤں کاگذ۔"

"اچھا بچو . . . . . منگاؤ . . . . . تم بھی کیا یاد کرو گے ___ مگر سوا چھ سو لوں گا۔"

"ہم تو مختار صاحب ساڑھے چھ سو تک دے مرتے . . . . . مگر اب تو تم بات ہی ہار گئے۔"

بکس تیر کی طرح گھر گیا۔ ماں کے ازار بند سے کنجی کھولی وہ ہاں ہاں کرتی رہی۔ اور اس نے کوٹھری سے بانس کی پٹاری نکال کر آلو کی گاڑیوں والا روپیہ گننا شروع کر دیا۔ پھر چھوٹے خان کو ساتھ لے کر پہونچا اور بات کی بات میں پہاڑ ایسا گھوڑا کھینچ کر سنسان کوٹھری میں پہونچا دیا۔ جس کے دونوں طرف دروازوں کے بجائے ٹٹیاں لگی تھیں۔ مجو بھیا کو اس وقت ہوش آیا جب گھوڑے اور بیپارے کا چکتا دا کر کے کوئی دو ہزار روپیہ ان کے باپ کی صندوقچی میں جھنجھنا رہا تھا۔ وہ باہر کمرے کے تخت کی کثیف جاجم پر بیٹھے تھے۔ کونے پر رکھی ہوئی لالٹین کی زرد روشنی میں ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دو ہزار روپے کا ڈھیر لگا تھا۔ چاندی کا یہ ڈھیر نور کے سپتلے کی طرح ان کی قلب ماہیت کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک سچے مرید کی طرح اس کے ارشادات کو اپنے دل کی گرہ میں باندھ لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی بجائے اکھاڑے پر جانے کے انہوں نے اپنے باپ کے وقت کے بچے کھچے ہر واہے طلب کئے۔ ان کو ٹھنڈی آواز میں جواب دیا۔ اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے لمبے چوڑے ہاتھ پیر والے دس نوکر بھرتی کئے۔ ان کو سفید قمیصیں، دھوتیاں، لال انگوچھے اور چمرودھے جوتے پہنائے اور شام کو بکس سے ترکاریاں بونے کے فن پر تبادلۂ خیالات کیا۔ چھوٹے خاں نے سمجھایا کہ نوکر ایک گاؤں کے ہوتے تو اچھا تھا۔ پھر اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا کہ نوکر غریب گھروں کے ہوں تاکہ داب سہہ سکیں۔ لیکن مجو بھیا نے اپنی فہرست پر نظر ثانی نہ کی۔ اور جوار کے اہم ترین گاؤں کے اہم ترین گھرانوں کے نوجوان اور سرکش پاسی چماروں کا دستہ برقرار رہا۔ مجو بھیا ان کے ساتھ ڈنڈ پیل

رنگاتے بھیگتے ہوئے چنے کھاتے ان کے غموں میں آنسو بہاتے ان کی خوشیوں میں قہقہے لگاتے دن گذر رہے تھے۔ کھیت چاندی اگلنے لگے۔ دو دروازوں کی مختصر سی کوٹھری وسیع ہو کر اصطبل بن گئی۔ اور اس میں تین رنگوں کے گھوڑے ہنہنانے لگے۔ نوکروں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ شیخ منصور علی کے آبائی مکان کی مشرقی دیوار ڈھا دی گئی۔ اور کٹھل کے باغ کی دائی تک سارا رقبہ گھیر لیا گیا۔ اس میں نئے کمرے بنے، دالان کھڑے ہوئے پھر سارا مردانہ سفید قلعی کے براق کپڑے پہن کر اترانے لگا۔ کوٹھریوں اور کمروں میں بھرا ہوا مردہ فرنیچر رام لکھن بڑھئی کے علاج میں دے دیا گیا جس نے سیروں اسپرٹ اور چیرہ پلا کر اسے زندہ کر دیا اور مان پور کے سب سے بڑے آدمی کا سب سے بڑا مکان دور سے نظر آنے لگا۔

الوداع کے دن حافظ چھنگا نے بڑی کوشش کی لیکن جمعہ پڑھانے کے لئے مسجد تک نہ آسکے۔ انصاریوں کے چودھری منیر بخش نے چھوٹے خان کے کان میں گھس سے کچھ کہا اور اٹھ کر بیچ کے در میں بیٹھے ہوئے مجو بھیا کو ان کے کرتے کی جیبی ہوئی آستین پکڑ کر اٹھا لیا اور منبر پر کھڑا کر دیا۔ مجا قصائی نے لپک کر اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اپنی پگڑی اتاری اور مجو بھیا کے کامدار پلے پر لپیٹ دی۔ مجو بھیا نے طاق پر رکھی ہوئی کتاب اٹھائی اور ٹھنڈی آواز میں خطبہ شروع کر دیا۔ گویا شیخ کو آموختہ سنا رہے ہیں۔ پھر مان پور کی کچی عید گاہ کے صحن میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بغیر ڈاڑھی کے نوجوان مجو بھیا کی امامت میں صف آرا ہو گیا۔ چھوٹے خاں نے جب گرج کر تکبیر کہی تو ان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے حافظ چھنگا کی بیمار آنکھیں چھلک پڑیں۔ مجو بھیا نے مان پور اور اس کے جوار کے مسلمانوں کا احترام کیا۔ اور نوجوان درگا سہائے کو چیک دے کر مسجد کے سامنے کی ساری زمین اپنی نجی ضرورت کے لئے خرید لی۔ رجسٹری ہوتے ہی اپنی جیب سے مسجد میں پیوند کاری کی طرح ڈال دی۔ درگا سہائے نے یہ خبر جو سنی تو آگ ہو گئے پچاس آدمیوں کو چاروں بندوقیں دے کر مان پور پر چڑھ آئے۔ مجو بھیا کو سن گن مل چکی تھی۔ ایک ہی للکار میں سارا جوان مان پور ڈھالے باندھ کر کیل کانٹے سے لیس ہو کر دوڑ پڑا اور مجو بھیا کے "دوارے" ان گنت رانوں کی مچھلیاں اور گرم نگاہوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ بوڑھے بوڑھے آدمی چپ سادھے بے قرار قدموں سے ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ گنگا داس راج کے سامنے پہلی بار مان پور نے سر اٹھایا تھا۔ تجربے کار ہندوؤں نے بستی کے ڈانڈے پر نیم دائرہ بنا کر ہاتھی کو روک لیا۔ بل کھاتے درگا سہائے کو رتی رتی حال بتا کر قانونی اونچ نیچ سمجھائی۔ ان کی چھاتی کے شعلے تو کم ہو گئے لیکن آگ لگی رہی۔ شیخ سرور علی مختار عام کے مرنے کے بعد پہلی بار درگا سہائے مان پور آئے تھے۔ بڑی ہچر مچر کے بعد ہاتھی مجو بھیا کے چبوترے پر لگا دیا گیا۔ سپاہیوں کی باہوں پر رکھی ہوئی سیڑھی کے سب ڈنڈوں پر پاؤں رکھ کر درگا سہائے اتر آئے۔ مجو بھیا نے سلام کر کے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ میں ہاتھ

بڑے دالان میں آئے۔ ان کو آرام کرسی پر بٹھا کر نئے سیٹ میں برف کا شربت پلوایا۔ لکھنؤ سے خریدی ہوئی نئی سنک کی مہنال پیش کی۔ آم کے بور کٹھل کی فصل اور گیہوں کے بھاؤ پر باتیں کیں۔ ہاتھی پر چڑھتے ہوئے دنگا سبھا نے مجمع کے چھپکے پر سرکشی کی ایک سی عبارت پڑھ لی۔ اور مستر دد ہوکر چاروں بندوقوں کو عقب میں لئے ہوئے چلے گئے۔ جب سڑک کی موڑ کے اندھیارے میں ہاتھی کھوگیا تب مان پور کے بوڑھے چہروں پر بحالی آئی۔ اور جوانوں کے سینے اور پھول گئے۔ دھیرے دھیرے بستی کے چوپالوں کی عدالتیں مجو بھیا کے دالانوں میں ضم ہوگئیں۔ یہاں پٹواری کے کاغذات سے لے کر دیور بھاوجوں کے تعلقات تک درست ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مان پور کے بنیوں کی بہیوں کے بھتن سوکھنے لگے۔ دس دس روپے پر دس دس دن میں دو دو روپے سود ادا کرنے والے گودی بھر بھر کر روپیے جاتے اور کوڑی کوڑی بھوڑ کر ادا کرتے مگر مجو بھیا کی تیوری پر بل نہ آتا۔ بہتوں نے تو مار بھی لیا۔ لیکن کچہری عدالت کا تو کیا ذکر مجو بھیا نے منہ سے کچی بات بھی نہ کہی۔ مان پوران کو دل سے زیادہ نگاہ سچا سمجھتا تھا۔ گھر میں جب بیارہ بنایا جاتا اور عورتوں کے ریوڑ اتوار کے دن آنگن میں چھپا بچیوں کی طرح کلیلیں کرتے تو وہ کمرے میں لیٹے گڑیاں گنا کرتے۔ سنسانی دوپہروں میں جب ڈھور ڈنگر تک اپنے تھانوں پر یا درختوں کے سایوں میں جگالی بھول کر آنکھیں میچ لیتے تو ان کے ہاہا ہو ہو کرتے مکان میں رجب کی اماں کی سسک سجل پوتیاں نو اسیں لچھے توڑے بجایا کرتیں۔ پاس پڑوس کی بانکی ترچھی مانگی بیاہی عورتیں کھلے ڈھکے بے نیاز مجو بھیا کو دودھ پیتا سمجھ کر ٹھٹھے لگایا کرتیں۔ چھیڑ چھاڑ کرکے وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ رجب کی اماں گالیوں کا آموختہ سنانے بیٹھ جاتیں۔ مگر مجو بھیا مورتی کی طرح بیٹھے رہتے۔ جواں جہان مجو بھیا آنگن میں دھمر دھمر کرتے آتے تب بھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ عورتیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کرتیں۔ گھٹنوں کی اندھوریوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے پنڈوں کا برادہ چھڑکتی رہتیں۔ کوئی بڑا لحاظ کرتی تو پاس پڑا ہوا موٹا موٹا دوپٹہ اٹھا کر ہیٹیوں سے گوندھے ہوئے سر پر ڈال لیتی بہت سی تو اس کی بھی زحمت نہ کرتیں۔ کالے خاں کی گوری دولہن موٹی موٹی لال لال برتوں پر نگلنے کے لئے آ نیا ملدی لینے آئی۔ رجب کی اماں ابھی ڈبے ٹٹول رہی تھیں کہ بھیا آگئے۔ وہ اٹھی اور راستہ روک کر کندھوں تک اپنی کرتی الٹ دی اور برہمیں دکھلا دیں۔ بھیا کنواریوں کی طرح آنکھیں جھکائے کھڑے اس کی شکایت سنتے رہے اور چلے گئے۔ سڑک کے کنارے جوان عورتوں کو گھاس چھیلتے دیکھ کر وہ سایہ چھوڑ دیتے اور چلچلاتی دھوپ میں بھنتے چلے آتے، اپنے باغ میں عورتوں کو اٹھکیلیاں کرتے دیکھ کر دور ہی سے واپس چلے آتے۔ یہ سب کچھ تھا مگر حاجی میٹھے کی دولہن للی کو دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکن بگڑ جاتی۔ ہانفہ میسر سنسانے لگتے اور وہ اس جادو کو اپنے سر سے اتار پھینکنے کے لئے لنگوٹ باندھ کر ہزار پانچ سو ڈنڈیں نکال دیتے۔ گھوڑا کھینچ کر دس پانچ میل کا چکر لگا ڈالتے پھر بھی چین نہ آتا تو چار چھ بالٹیاں سر پر انڈیل لیتے۔

حاجی میٹھے گھوڑے بیل کے تو حکیم تھے ہی۔ حج کے بعد معلوم نہیں کس سادھو نے کونسی بوٹی بتادی کہ وہ برص کا علاج بھی کرنے لگے۔ پہلے پہل تو لوگوں نے مشغول جانا لیکن منّا دھوبی کے بھلے چنگے ہوتے ہی قادر کبڑیئے نے آنکھیں جھپکائیں اور ایک دن مسجد سے نکلتے ہی حاجی کو پکڑ لیا۔ اٹھارہ بیس سال کی جوان جہان للّی نے اپنا پیٹ اور کمر کھول کر حاجی میٹھے کو دھبے دکھلا دیئے۔ جواب میں حاجی نے قادر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"چالیس دن لگیں گے۔"

اور قادر کی آنکھوں میں تشکر مسکرانے لگا۔ ابھی بیس بائیس دن بھی نہ گذرے تھے کہ للّی کے گال کا داغ بجھنے لگا۔ جیت کی ٹیبتی دوپہر تھی۔ للّی کھانا کھا کر کوٹھری میں گئی کہ لیپ لگا کر لیٹ رہے۔ مگر ٹین کا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ باہر آئی تو باپ خراٹے لے رہا تھا۔ ماں پڑوس میں گئی تھی۔ مجبوراً ڈبہ پکڑے پکڑے حاجی کے گھر چلی گئی۔ برو ٹھے میں پیڑھی پر حاجی میٹھے حقہ پی رہے تھے۔ چارخانے کے تہبند سے نکلی ہوئی بانس کی پنڈلیوں پر چیونٹوں کی طرح والے کالے بال لے ہوئے تھے کالی داڑھی سینے کی ہڈیوں پر چھائی ہوئی تھی۔ حقہ پینے میں ان کا پیٹ لہار کی دھونکنی کا منہ چڑا رہا تھا۔ املی کے ببول جیسی آنکھیں اٹھا کر انہوں نے للّی کو دیکھا۔ بائیں گال کو غور سے دیکھا لیکن دھبہ نظر نہ آیا۔ سرخ گالوں پر لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے چھپتی ہوئی بغیر کاجل کے کالی کالی آنکھیں دیکھ کر وہ مسکرا گئے۔ حاجی کی نظر تھک گئی لیکن پھر اٹھ کر للّی کے کولھوں پر پھسلتی ہوئی کرتی سے لٹک گئی۔ حاجی میٹھے کے وجود کے اندر چھپا ہوا مرد آج کلثوم کی موت کے بعد پہلی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ حاجی نے خشک ہوتے ہوئے گلے کو دھوئیں سے ایک بار تر کر کے حقہ ہٹا دیا۔

"وہاں تروا ہے میں دوا کا مرودا دھرا ہے۔"

حاجی نے آہستہ سے کہا اور کالے لہنگے کی گوٹ سے بیزار سفید پنڈلیوں کا رقص دیکھنے لگے۔

"ملا نا ہیں۔"

"نا ہیں۔"

حاجی اپنے مرتعش وجود کو گھسیٹتے ہوئے۔ تروا ہے کے پیچھے والے کمرے میں گھس گئے۔ مرودا اٹھا کر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"لے۔"

زندگی میں پہلی بار للّی کو انجانا میٹھا میٹھا خوف محسوس ہوا۔ لیکن وہ چلی گئی۔ جیسے وہ مرچوں سے لال آلو کھانے کے لئے چوہے سے کٹا ہوا منہ کھول رہی ہو۔ حاجی نے کالی کالی دوا سے بھری ہوئی انگلی اس کے بائیں گال کے پھول پر لگادی۔ لگاتے رہے۔ وہ کھڑی رہی جیسے نٹ رسی پر کھڑا ہو۔ پھر حاجی نے اس کی کرتی

کا دامن بائیں ہاتھ کی چٹکی سے پکڑ لیا۔ اور للی کو ایسا لگا جیسے لال لال سلاخیں اس کی کمر سے چھو گئی ہوں۔ وہ چھلاوے کی طرح تڑپ کر کونے میں کھڑی ہو گئی۔

"دوا ڈبے میں دھر دیو۔"

"للی۔"

حاجی کی آواز کے ارتعاش نے خود ان کو چونکا دیا۔ للی نے وحشی آنکھیں اٹھا کر ان کو دیکھا۔

"تمہاری چھوٹی بہن کی گود میں چار لڑکے ہیں ...... اور تمہارے ابھی ہاتھ تک پیلے نہیں ہوئے۔ ..... تم بڑی پیاری ہو ...... لیکن کون باپ اپنے آٹھ برس کے بیٹے سے تم کو بیاہے گا ..... تم کو جو ملے گا ..... وہ بیچارہ ہوگا ... تو بڈھا میں بھی نہیں ہوں للی .... پھر کوڑھ کی دوا چالیس دن کی نہیں ہوتی ...... چالیس برس کی بھی نہیں ہوتی ...... عمر بھر کی ہوتی ہے۔ ..... عمر بھر کی ..... مان پور میں کون مائی کا لال ہے ..... جو عمر بھر کا پھوڑا اپنے ہاتھ سے اپنے کلیجے پر باندھے گا .. میرے لڑکے ہیں ... نہ بالے ... نہ گوش روٹی جڑتی۔ بولو ہے اور نہ جینا جیا تا ہوں۔" بولیں۔ حاجی بڑھتے ہوئے چلے گئے۔ دوا والی انگلی تہبند میں پونچھ لی۔ پھر للی نے محسوس کیا کہ حاجی کی داڑھی کے کالے کالے بال اس کے گریبان میں گر رہے ہیں۔

پھر ایک جمعہ کو قادر نے للی کو پانچ کپڑے اور سات برتن دے کر حاجی میٹھے کے ساتھ رخصت کر دیا۔ شادی کے بعد جو للی باہر نکلی تو مان پور چونک پڑا۔ لوہے کی بالٹی پر سونے کی قلعی ہو گئی تھی۔ سارنگی کے تاروں کی طرح کسا ہوا انگ انگ بجنے لگا تھا۔ جب بیٹی لوکیوں کا جھبوا سر پر رکھ کر جب وہ شرماتی ہوئی بازار میں پہونچی تو دور دور تک دلوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ کسی کو یقین نہ آتا کہ یہ قادر بھوبھا کی وہی لونڈیا للی ہے جس کے ہاتھ کی چلم پیتے ابکائیاں آتی تھیں۔ للی کے مہندی لگے ہاتھ اس وقت تک ناچتے رہے جب تک جھوا دیکھنے والوں کی چھاتیوں کی طرح خالی نہ ہو گیا۔ حاجی میٹھے چونک پڑے۔ ایک دن للی نے حاجی کے سر سے جھوا اتروایا تو اس میں سے مارکین کا ٹکڑا گر پڑا۔

"یہ کاہے حاجی۔"

"تیری شلوار کے لئے لایا ہوں ..... لہنگا کرتی بڑا ننگا پہناوا ہے۔"

"ہوں۔"

للی نے کپڑا اٹھایا اور پاؤں پٹختی ہوئی گئی۔ کپڑا چولہے میں جھونک دیا۔

"میاں جی .... میں بیاہ کے آئی ہوں نہ بیچ کریا ہوں نہ لونڈی۔"

حاجی اپنی چیاں سی آنکھیں جھپکاتے رہے۔ اس دن کے بعد حاجی نے للی سے کبھی نہ پوچھا کہ کل تو نے بھوئوں کے گھونسے کیوں مارا تھا یا مکبس کے ساتھ تروا ہے میں بیٹی دو گھنٹے تک کیا باتیں چیلتی رہی۔ حاجی بازار اور نماز کے علاوہ کسی بات کو اپنی توجہ کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔

یوں تو سارا جوان مان پور مدینے لڑکوں کی طرح اس کے بدن کو گھورا کرتا لیکن تراب کی آنکھیں جب اس کی کرتی کے فراز پر پڑتیں تو اس کی جان میں بھنگرے لگ جاتے۔ معلوم نہیں کیوں للی کو اس کی ننگی نظروں کوئی ذلیل منصوبہ بنتی ہوئی نظر آتیں۔ اس تصور کے آتے ہی اس کی فطری شعلہ مزاجی پر تیلی کی دھار گر پڑتی۔ اور وہ حاجی کی کسی بات کسی حرکت کو بہانہ بنا کر ان کے ایسے ایسے ملبعان کرتی کہ وہ بے چارے کھونٹے سے تسبیح اٹھا کر مسجد چلے جاتے یا کھرپی لے کر اپنے کھیت میں جا بیٹھتے۔ مگر اس کی آگ نہ بجھتی اور وہ دوپٹے کی بے نیازی سے بے نیاز پاؤں تخی ہوئی تانیں تائیں مجو بھیا کے پاس پہونچ جاتی۔ مجو بھیا چاہے ڈنڈیں لگا رہے ہوں۔ چاہے کھانا کھا رہے ہوں چاہے نئے مبیارے کا مسئلہ لئے بیٹھے ہوں چاہے لگام ہاتھ میں لے کر رکاب میں پاؤں ڈال چکے ہوں۔ للی کو دیکھ کر بد مزاج ماں کے سفید بچے کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کی ہر بات کی تائید کرتے اور نظریں جھکائے جھکائے حاجی مینٹھے کو ڈانٹنے کا وعدہ کر لیتے۔ اور اپنی صندی نگاہوں کو ہاتھ پکڑ پکڑ للی کی کرتی سے جھانکتی ہوئی کمر سے کھینچ لاتے۔

بقرعید کا مہینہ ڈوب رہا تھا۔ پہلے پالی کے دن تھے۔ حاجی مینٹھے خربوزوں کا جھوا اٹھوا کر جمعہ کی وجہ سے جلدی چلے گئے۔ للی کیان کے حجالے میں باہوں کے خنجر دھو رہی تھی۔ آستینوں کے نیام الٹے پڑے تھے، کانوں میں جھولتے ہوئے بڑے بڑے جھمکے برا کراب وہ منہ دھونے لگی تھی۔ کہ اس کی منار کہ مرغیاں زور زور سے کڑکڑانے لگیں۔ وہ چونک پڑی کہ کہیں منگلو قصائی کی بجھیاں تو نہیں گھس آئی ہیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کے پٹ کھلے تھے اس کی دہلیز پر کتا لیٹا ہوا تھا۔ آنگن میں بورے پر پھیلے ہوئے لال لال مرچے چمک رہے تھے۔ اس کے چبوترے کے برابر منگلو قصائی کے دروازے کے اوٹ پر تراب بیٹھا ہوا تھا۔ للی نے اُسے دیکھتے ہوئے پا کر آنکھیں جھکا لیں اور ہاتھ سست پڑ گئے۔ لانبا آدمی اوٹے پر بیٹھا ہوا تھا مگر معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑا ہو۔ ویسی ایسے ہاتھ پاؤں . . . . . دیوار کی طرح چوڑا چکلا تراب جب سڑک پر راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا تو للی کو گردن اٹھا کر اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھنا پڑتا۔ تراب کو وہ کنوارپن میں بھی دیکھ چکی تھی۔ محرم میں ماتم کرتے ہوئے، ہولی میں نقل بناتے ہوئے عیدگاہ کے کنوئیں پر وضو بناتے ہوئے۔ لیکن اب تو اُسے دیکھتے ہی للی کا خون کھولنے لگتا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ وہی تراب ہے جسے بھیکم پور کے گدی گدیوں کی ناک کہتے ہیں جس کے ہاتھ پیروں کی باڑھ دیکھ کر گدیوں نے ایک بھینس وقف کر دی تھی کہ تراب دودھ پیئے اور محنت لگائے۔ یہ وہی

تراب تھا جس نے ڈھول دھمکے بجائے باسی کی دلہن اٹھا کر اپنے گھر میں ڈال لی تھی۔ اور میلوں تک پھیلے ہوئے
پاسیوں کے گاؤں ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے تھے۔ یہ وہی تراب تھا جس نے منگو ایسے سرکش قصائی کی چاند سی دلہن
پر چھاپا مار لیا تھا۔ کہنے کو تو منگو اب بھی کہتا تھا کہ تراب سے اس کی بیوی کی جتنی اس کی خود کی یاری ہے لیکن
مال پور والے جانتے تھے کہ تراب چندہ کے ساتھ کوٹھری کے دروازے بند کر کے نماز نہیں پڑھتا ہے۔ تلی
میٹھی ہوئی نہ جانے کب تک یہی الم غلم سوچا کرتی کہ چھپروں کی طرح بڑے بڑے بوند پڑنے لگے۔ اس نے گردن
اٹھا کر بھونرا ایسا سیاہ بادل دیکھا اور نسخنی میں پھنسی ہوئی بالوں کی لٹ درست کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ پھر
اپنے نئے لہنگے اور رنگی ہوئی کرتی کے خیال سے خربوزوں کا جھوا اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور ڈھمکتی ہوئی چلی۔ دو
چار ہی قدم گئی تھی کہ حاجی کے چادرے پر نظر پڑی۔ مجبوراً رک گئی۔ چادرے کا اڑوا بٹ کر سر پر رکھا
اور جھونک دے کر جھوے کو اسپر دھر لیا۔ دو خربوزے گر بھی پڑے مگر وہ بھیگتی ہوئی اور بھاگتی ہوئی چلی ہی
گئی۔ بوجھ کی وجہ سے کھیت کی خندق پار کرنا مشکل تھا اس لئے چکر کاٹ کر وہ منگو قصائی کے دروازے
سے نکلی۔ تراب کی بھوری آنکھیں اپنی کرتی پر جمی دیکھ کر اسنے دوپٹہ درست کرنے کی کوشش کی لیکن بھیگی ہوئی
زمین پر بھاری جھوے کو ایک ہاتھ سے سنبھالنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"خربوزے بکاؤ ہیں۔"

جیسے شیرے کے ڈھول پختہ سڑک پر لڑھک رہے ہوں۔

وہ بغیر جواب دیئے تیز تیز قدموں سے نکلی جا رہی تھی کہ ایک فقرہ جوتے کی طرح اس کے منہ پر
اور پڑا۔

"اور یہ کرتی والے۔"

وہ جھنجھنا اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ جھوا پھینک کر اس مرے کا منہ نوچ لے۔ لیکن کسی نے اس کے جھمکے
کے پاس منہ لا کر آہستہ سے کہا کہ تلی یہ تجو طاق ہے بکس . . . . . یہ تراب ہے تراب۔ اس نے زندگی میں
پہلی بار یہ گندا فقرہ سنا تھا۔ حاجی میٹھے حاجی تو تھے ہی لیکن وہ مال پور کی سب سے بڑی برادری کے چودھری کے
بھائی بھی تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ موقع بے موقع بگڑ کر حاجی کو بیاسے کی کوٹھری میں بند بھی کر دیتے ہے۔
لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ حاجی سے اس تضحیک آمیز موضوع پر گفتگو کرتا یا تلی سے اشارتاً کنایتاً بھی ذکر کرتا
اس فضا میں پلی ہوئی تلی تراب کے فقرے کو جھیل نہیں پائی۔ جب پہلی بار اس نے تراب کی جلتی ہوئی نظریں
اپنے بدن کے نازک خطوط پر محسوس کی تھیں۔ تبھی اس نے باتوں باتوں میں بکس سے ذکر کیا تھا لیکن بکس
کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ بکس مال پور کا سب سے نیڑا اور لڑاکا جوان جس کے

بدن میں آگ بھری ہے جس کا غصہ برساتی نالے کی طرح چڑھا رہتا وہ ایسی بات پر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیسے بیٹھا رہا۔ وہ سوچتی رہی اور چولہے پر چڑھی ہانڈی کی طرح کھولتی رہی۔ ایک بار اس کی نظر چھینکے پر دھری مٹھائی کی طرف اٹھ بھی گئی لیکن آج بھوک کہاں تھی۔ وہ چارپائی توڑتی رہی۔ حاجی نماز پڑھ کر آئے اور حقہ تازہ کر کے بازار کو چلے بھی گئے مگر وہ چارپائی توڑتی رہی۔

"حاجی چچا.... ہوت"

للّی دلارے پاسی کی آواز سنکر بجلی کی طرح اٹھی ہاتھ چارپائی کے کھوسے پر سے جھٹکتے ہوئے دوپٹے پر خود بخود پڑ گیا۔ لیکن اس نے اسے چھوڑ کر چھوڑ دیا۔ اور بڑے لاڈ سے بولی۔

"کون دلارے"

"ہاں چچی...."

"چلے آؤ"

رام دین دلارے کا چھوٹا بھائی مجو بھیا کا نوکر تھا اور مجو بھیا للّی کا کچھ ایسا احترام کرتے کہ دلارے بھی رام دین کی طرح للّی کے چہا نے منہ پر آنکھیں نہ گاڑ پاتا۔ ویسے دل اس کا بھی للّی کو دیکھ کر دھڑک اٹھتا تھا۔ آج للّی کی آواز میں گڑ کی مٹھاس پا کر وہ بھونچکا ہو گیا۔ پھر اپنی گولے دار لاٹھی دروازے کے کواڑ سے ٹکا کر مٹیالے جوتے بھیگے آنگن پر بوٹے بوٹے دھرتا ہوا چھپر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

"تم تو ایسا منہ لٹکائے کھڑے رہو جیسے دولہن بھگا کی نائیں تمری اٹھالئے گئی"

دلارے نے چھاتی کھجلا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"چچی تم سے یا امید نائیں رہے..... مل اب تم ہوں جوتے مارے لگیو"

"جب تک ترا آپ جیت ہیں جب تک جوتے مارے والی بات ہے یا.... کہ دلارے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کے کہدیو.... کہ نائیں ہے"

"ہے.... چچی..... گلے گلے پانی مان ہے"

"کیسے آئے ہو"

"آپن کا..... تنی ادرک چاہی ہے"

"ہاں ہے کا ہے نائیں"

اور کونے میں دھری تاند کی بھیگی بالو میں ہاتھ ڈال کر للّی نے ادرک کی گانٹھیں نکال لیں اور دلارے کے ہاتھ میں پکڑا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ دلارے جس کی نگاہوں کی گرفت اس کے بدن پر سخت ہو گئی تھی ادرک پکڑ کر

چونک پڑا۔ للی نے بالشت بھرے جت ہاتھ اپنے داہنے گھٹنے پر باندھ لئے

"دلارے اب کی جمبی نائیں کھیلو"

"جنتی کھاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منن جمبی میں"

"تو کھیلو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا کہاں کی کھیلو"

"تم بھی جہاں کی بتاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں کی آن دی جائیں"

دلارے مزے میں آ گیا تھا۔ للی کے مسکراتے ہونٹ اور بولتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر تو بھیا کا سایہ اس کے سر سے غائب ہو گیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر ضرورت سے زیادہ جھک کر للی کے لپٹے پر اوکی انگلیاں جھاڑ دیں۔ للی کے گھٹنے پر ہاتھ پڑتے ہی دلارے کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی نے برف کی استری کر دی۔ اور پسینے میں ڈوبی ہوئی للی کی خوشبو اس کی ناک میں آئی۔

"مکھن والے درخت کی جمبی لاؤ دلارے تو ہم بات کریں گے بھیا بڑا مزہ ہے"

دلارے نے سیدھے ہو کر جیب کی کرتی سے نکلتی ہوئی کمر کی دھار دیکھی اور ہاتھ کے گر پیچھے میں اندر کی گانٹھیں سنبھالیں۔

"لائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی لائیں"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑا۔ ابھی وہ آدھے آنگن ہی میں تھا کہ للی نے کہا

"کہیں تراب تمہیں دولہن نہ اٹھائے جائے"

دلارے نے گھوم کر للی کو دیکھا ایک منٹ کے لئے ٹھٹھکا اور دھم دھم پاؤں رکھتا چلا گیا۔

مان پور میں داخل ہونے والی سڑک کے دونوں طرف ایک قطار میں سب سے پہلے قصائیوں کے مکانات تھے۔ جہاں سے گزرتے ہوئے ادھوں کے بیل دبک دبک ٹھٹھکتے تھے۔ آخری مکان منگلو کا تھا۔ منگلو اور حاجی میٹھے کے مکان کی دیوار مشترک تھی۔ اس دیوار میں دروازہ بھی تھا۔ جسے للی عموماً بند رکھتی لیکن منگلو کی بیوی چندہ یوں تو سارے مان پور کی سڑکیں کچی کرتی تھی۔ لیکن للی کے پاس جانے کے لئے وہ ہمیشہ دروازہ کھلواتی تھی۔ منگلو اور حاجی میٹھے کے مکانوں کے سامنے کچھیانے کے کھیت تھے۔ ان کھیتوں نے ہی تراب اور چندہ کی محبت کو جنم بھی دیا تھا اور ان کا راز بھی فاش کیا تھا۔ تراب رات کے اندھیرے میں انہیں کھیتوں کو روندتا ہوا چندہ کی چاندنی لوٹنے جایا کرتا تھا۔ صبح جب حاجی میٹھے پھوٹی ہوئی لوکیوں کو دیکھتے تو نوکر پر بخار اتارتے۔ نوکر نے بڑے جتن سے تراب کو پکڑا لیکن تراب کو ہاتھ لگانا تو درکنار الاہنا دینا بھی مصیبت بن سکتا تھا۔ نوکر بے چارہ چپ ہو رہا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حاجی بھی چپ ہو رہے مگر قصائیوں کے ساتھ ساتھ کبڑیئے بھی تراب

کے وجود کی دکھن محسوس کرنے لگے تھے۔ آج صبح میٹھا پانی برسا تھا۔ للی کا سارا چھپر تالاب بن گیا تھا۔ پانی تھم چکا تھا لیکن وہ کونڈا لیے پانی اُلیچ رہی تھی۔ کہ چندہ نے دروازہ بھڑبھڑایا۔ وہ بربراتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا اور مڑ گئی۔ بیچ آنگن میں اُسے "چھن چھن" کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ہاتھ سے چندہ نے اپنی شلوار کے پائنچے پنڈلیوں تک اٹھائے ہوئے تھے جس پر کڑھے ہوئے ہرے ہرے پھول اس کی گندمی پنڈلیوں پر پڑے اچھے لگ رہے تھے۔ پھر اس کی نظر اس کی نئی جھانجھوں پر پڑی اب تو وہ ٹھٹھک گئی۔ چندہ اپنے بھاری بدن کو سنبھالے ہوئے بڑے ٹھسّے سے اس کے برابر آ گئی۔ اور للی نے اپنے دل میں کہا "تو تراب نے جھانجھیں بنوا ہی دیں بے چاری کو"

"چندی میکے سے آئی ہے"

للی نے اس کی لبریا چندی کو دیکھ کر پوچھا۔

"اور نا ہیں تو منگو بنوائے دیہیں"

"اری رومال میں کا ہے"

"پھلیندے"

اور چندہ نے رومال کھول کر ڈلیا میں الٹ دیا۔ للی نے کونڈا رکھ کر کھڑی ہوئی چارپائی بچھا دی۔ چندہ نے کاجل لگی آنکھیں مٹکا کر اسے دیکھا اور بیٹھ گئی۔

پھلیندے تو سکھن والے پیڑ کے ہوت ہیں . . . . ای تو سب جمنی ہیں . . . . جے نیر کے پاس خوب بجیت ہیں . . . . تمرے لئے تو تراب لائے ہو ہیں . . . . ہم ہوں منگوا ہے اب کی"

"میرے لئے کاہے لاتے . . . . لاتے تو منگو کے لئے لاتے . . . . پھر تراب کوئی جمیندار ہیں . . . . اوپیڑ تو تجو بھیا کے رسے لیسین کا ہے"

"پیڑ تو لیسین کا مزدورہے پی جمنی تراب کی ہیں"

"ہو ہیں بھائی . . . . ہم کا کرے کا . . . . ہم تو مول کی کھلائے کا ہے"

للی نے مسکرا کر جمنی کی ڈلیا اٹھا کر کٹھیا پر رکھ دی۔ اور اپنے ہونٹوں پر مغرور مسکراہٹ کی سرخی لگالی۔ چندہ بڑی بے چینی سے سورج ڈوبنے کا انتظار کرتی رہی۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی اس نے منگو کو کھلا کر اپنا پاپ کاٹ لیا۔ پھر منگو کا پلنگ اٹھا کر چبوترے پر ڈال آئی۔ منگو چھپر کے نیچے بیٹھا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ اور گنی کرتا رہا جب دری تکیہ رکھ کر کوٹھری میں پھر گئی تو منگو بلی کی طرح دبے پاؤں دروازے تک رینگ گیا۔ چندہ کو ننھے آئینے میں اپنا منہ دیکھتے ہوئے پاکر وہ بے قرار ہو گیا۔ اور بھیڑیئے کی طرح جھپٹ کر اسنے پیچھے سے اس کی چوٹیا پکڑ لی۔ اور

دھم دھم دو مُکے اس کی پیٹھ پر جھاڑ دیئے۔ پھر اس کو ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ چندہ تھوڑی دیر تک دونوں ہاتھ پیٹھ پر رکھے ہوئے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے خلا کو گھورتی رہی پھر ہمت کرتی ہوئی نکلی اندر باہری دروازے میں کنڈی لگا کر اپنے پلنگ پر پڑی رہی۔ ابھی عشا کی نماز نہیں ہوئی تھی۔ لیکن انتظار کرتے کرتے چندہ کی جان پر آ بنی تھی۔ خدا خدا کر کے دھماکا ہوا اور آدمی بھر اونچی دیوار پھاند کر تراب آ ہی گیا۔ چندہ کے پلنگ پر بیٹھتے ہی پٹی جھک گئی۔

"سب خیر ہے؟"

اس نے اپنا پستول تکیے کے پاس رکھ کر چندہ کے گورے سیاہ سے گالوں کو دبوچ لیا۔

"تم بڑے بے ایمان ہو۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"کاہے؟" بھوری بھوری مونچھوں کے نیچے پیلے پیلے دانت چمک اٹھے۔

"تمرے کوئی کھلینڈے کا بر ولہے۔"

"ہے۔"

"او تم آج تک نائیں کھلایو ..... تمرے بدرا میں چھپائیں نائیں ہے۔"

"پرسال ای فصل ماں تم کہاں مل رہو ..... اب پیٹ بھر کے کھایو .... پیٹ بھرکے بائیو۔"

"یوں پیسے سب تھوڑے بیچے ڈارت ہیں ..... ہم پیٹ بھر کے جر در کھیب۔"

"ارے اد کا کوئی چھوئی نایں سکت ہے۔"

چندہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن تراب سے مجبور ہو گئی۔ چندہ کے جی کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

"یہ پڑوسن تمری بڑی جالم ہے۔"

تراب نے چندہ کی جھانجھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم بلاوجہ پیچھے پڑے ہو اُد کے ..... اوکے کوڑھ ہے ... نہیں تو حاجی میٹھے کے پلے کا ہے بندھتی کوئی جوان جہان نہ جڑ جاتا۔"

"اب نائیں چندہ ..... اب نائیں ہے او کے کوڑھ ..... اور چندہ تم اگر ساتھ دے جاؤ تو میں ای کا مان توڑ کے رکھ دیوں۔"

"تو کا میں کوئی باہر ہوں۔"

اور یہ رات للی پر بڑی بھاری گذری۔ حاجی میٹھے عشا کی نماز کے بعد آنگن میں ٹہل ٹہل کر تسبیح پڑھتے رہے۔ پھر اپنی چارپائی پر کوسے گھڑے کا پانی بہا کر لیٹ رہے اور خراٹوں میں ڈوب گئے۔ مگر للی تڑپتی رہی۔ تراب کا

نقرہ بھری کے موسل کی طرح اس کی چھاتی پر چلتا رہا اور وہ تڑپتی رہی۔ ابھی اندھیرا تھا کہ فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اس نے اپنی چارپائی پر آدھے لٹک کر حاجی کو جھنجھوڑا جو کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ چھپر کی الگنی سے کرتا، طاق سے دتون اٹھا کر ٹوپی دیتے ہوئے نکل گئے۔ کڑکڑاتی ہوئی مرغیوں کے جھوٹے کی سل اٹھاتے ہوئے ایک خیال نے للی کے ذہن میں چٹکی لی اور وہ بڑی تمکنت سے چارپائی کے سرہانے سے دوپٹہ اٹھاتی ہوئی باہری دروازے پر آ گئی۔ صبح کا دودھیا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ خنک ہوا مٹی اور درختوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ وہ سدھائی ہوئی ہرنی کی طرح نرم پگڈنڈیوں پر اڑتی ہوئی مجو بھیا کے باغ میں آ گئی جس کی داتی پر کٹہل کا باغ تھا۔ اس میں درخت تو کم تھے لیکن رقبہ بہت تھا اور اس کی گھاس بھیکم پور والوں نے اپنے جانوروں کے لئے خرید لی تھی۔ اس کے پاس ہی مجو بھیا کی ادکھ کی پیڑی تھی۔ وہ اسی کھیت کی منیڈ پر آ کر بیٹھ رہی۔ اجالا اور بڑھنے لگا۔ اکا دکا آدمی کھیتوں میں آتے جاتے نظر آنے لگے۔ للی بھیکم پور کے گھروں پر نگاہ جمائے بیٹھی رہی جو گھروندوں کی طرح دھندھلے دھندھلے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھینسوں کا ایک غول طلوع ہوا۔ للی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بھینسیں ڈکراتی ہوئی گھنٹیاں بجاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھیں۔ جیسے موٹی عورتیں چہل قدمی کرتی ہوں۔ پھر یہ غول باغ میں داخل ہو گیا۔ اور ان کے پیچھے پیچھے آتا ہوا لڑکا ان کو ڈانٹ کر اپنے کندھے پر لاٹھی رکھے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔ للی آہستہ سے اٹھی اور گھات لگائی شیرنی کی طرح جھکی جھکی چلتی رہی باغ کی خندق کے پاس ہی سے اس نے بھینسوں کو کنکر مارنے شروع کئے۔ سب سے بڑی "مندراجی" بھینس کے آگے چلتے ہی سب کی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں۔ للی ان کو گھیرتی ہوئی مجو بھیا کی ادکھ میں لے آئی جب ساری کی ساری کوئی بیس بچیس بھینسیں کھیت میں بھر گئیں تب وہ مورنی کی طرح نپے تلے قدم رکھتی ہوئی اپنے کھیانے کی طرف ہو لی تھوڑی دور پر اس کو رام دین نظر آیا۔ جو دوسرے نوکروں کے ساتھ مجو بھیا کی ڈیوڑھی پر جا رہا تھا۔

"کون رام دین۔"

"ہاں . . . . . ارے ای تو بچی ہیں . . . . . کہاں سے سبیرے سبیرے۔"

"میں تو سنے رہوں کہ پیڈے بڑے نمک حلال ہوت ہیں۔ اور مجو بھیا تو تم پچھن پر جان چھڑکت ہیں۔"

"تو ہم کون نمک حرامی کے ڈارا۔"

رام دین نے کندھے سے لاٹھی اتار لی۔ اور بچی کے کڑے تیوروں کو بھانپنے لگا۔ دوسرے نوکر بھی تھم گئے۔

"یہ تو میں جانت ہوں کہ جان سب کا پیاری ہے . . . . . اور گدن کا سامنا پسینے بے چارے کریاتے تو راج دین کے گھرانے کی ناک کاہے کٹتی۔ مل اگر تم بھینسیں ہانک آؤ تو گدی کچھ توپ تو لگائے نلنے دیہیں . . .

اب بھیا بجرنگ تو بھینسیں ہانکے آوے تے رہے۔"

"کون بھینس ..... کہاں بھینس جی؟"

رام دین کی آواز میں گرمی آگئی اور نوکر بھی چوکنا ہوئے۔

"پیچھے گھومو ..... میں کہت ہوں پیچھے گھوم کے دیکھو ..... اری بھینسیا میں کوئی چیونٹی تو ہیں نا ہیں

کہ دکھائی نہ دیں۔"

رام دین نے آنکھوں پہ ہتھیلی کا چھجہ بنایا اور دوسرے ہی لمحے لاٹھی لے کر دوڑ پڑا۔

"آؤ ہو ..... ای کی بھینس کی۔"

اور للی ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی اپنے کھلیان کو پار کر کے دروازے پہ آگئی۔

رام دین جس کا جوان خون للی کی باتوں نے کھولا دیا تھا۔ جاتے ہی ہوتے بھینسوں پہ لاٹھی لے کر ٹوٹ پڑا۔
نوکروں میں سب پاسی تھے ..... راج پاسی بھینسیں جو کسی کر ڈکراتی ہوئی اپنے گاؤں کی طرف بھاگیں۔
تو انہوں نے گھیر کر مان پور کی سڑک پہ ڈال دیا۔ گدیوں کو خبر لگی تو وہ لاٹھیاں سونت سونت کر دوڑ
پڑے اور مان پور کے ناکے پہ بھینسیں روک لیں۔ رام دین کی گہہ سنکر اس کے چچا بھتیجوں کے ساتھ سارا راجپوتر
بڑھ پڑا۔ راجپوترہ کی گہار پہ مانک پور کا بھگتا جس کی بہن دلارے کو بیاہی تھی۔ اور جس کی تمپالی گدی کا نام سنتے
ٹھنکتی تھی۔ ایک ایک آدمی ٹوٹ کر چڑھ دوڑا۔ گدیوں نے تین ڈوری چلتے جو دیکھی تو مصالحت پہ اتر پڑے۔ مان پور
نے جو یہ گڑبڑ سنی تو استاد مدتی کے اکھاڑے والے پکتی اور لچھماں کی چھیا والے بانا گھماتے اور جھومتے نکل پڑے۔
بوڑھا راج دین جس کی آنکھوں کے سامنے تراب نے بھگتا کی بیوی اٹھا کر اس کی پشتوں کی کمائی ہوئی آبرو کا گلا گھونٹ
دیا تھا۔ بہت سنبھل کر آیا تھا۔ راج دین کیا جوار کے سارے پاسی نامی پاسی تراب کے لئے بارود کھوے بیٹھے تھے۔
لیکن ایک تو گدیوں کی طاقت کا اندازہ تھا پھر مان پور کا خوف تھا کہ یہ پانچ چھے ہزار کی بستی جس طرف ٹوٹ
پڑی وہاں کھلیان لگ جائے گا۔ لیکن آج راج دین دیکھ رہا تھا کہ بھگتا کے نام پہ لاٹھی اٹھانے والے پاسیوں کے
سامنے مان پور کی جھگڑالو ناک نہیں پھٹکے گی۔ اس نے آتے ہی آتے تراب کے باپ پیرا کو للکارا۔

"تاؤ ..... ہم بھینسیں پکڑا ہے ..... ہم ان کا کانجی ہاؤس مال بند کریا ..... تم وہاں سے
چھڑائے لیو ..... ہم سے اگر چھیننے کی بات کریو تو پھر فوجداری ہے ..... یو تم جانت ہو کہ فوجداری
فوجداری ہے۔ ای مال لدّو نائیں مٹت ہیں۔"

راج دین کی گرمی دیکھ کر تراب جو سڑک کے کنارے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا مینار کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"ای گدیاں کی بھینسیں ہیں راج دین۔"

"ہاں . . . . . اور پیسے لئے جات ہیں۔"

"تو پھر لئے جائیں۔"

"بابات ہے . . . . . تو سنبھل جاؤ۔"

راج دین نے کندھے پر پڑا ہوا چادرہ کھینچ کر سر پہ باندھنے کے لئے لے ہی گیا تھا۔ کہ مجو بھیا کا مشکی گھوڑا مجمع کو کائی کی طرح پھاڑتا ہوا راج دین کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ مجو بھیا سفید کرتا اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"کیا راج دین گڑبڑ کرتے ہو۔"

"کتا آپ سن چکے ہو۔"

"ہاں . . . . . گدیوں کے یہاں چارا نہیں ہو گا . . . . . تمہارا کھیت چرا لیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا کیا یہ لوگ اپنی بھینسیں مروا ڈالتے۔ راج دین۔"

"بھیا۔"

ادھر کے چراگوروں کے لئے چالیس آدمی نہیں مارے جاتے . . . . . لے جانے دے انکو بھینسیں۔"

"بہتر۔"

"کہیو۔"

"کٹھل کے باغ میں بھینسیں نہیں آئیں گی اب۔"

یہ کہہ کر انہوں نے گھوڑا موڑا جو ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

مان پور اور اس کے جوار کے ایک ایک دل میں مجو بھیا کی شرافت، لیاقت اور انسانیت کھونٹے کی طرح گڑ گئی۔ راج دین اور بھوکا بڑی دیر تک چھپر میں بیٹھے خاموشی سے چلم پیتے رہے۔ بشکار ان کی لاٹھی کی زد پہ آ کر نکل گیا تھا۔ للی نے یہ خبر سنی تو منہ لٹک گیا۔ محرم کی پہلی تاریخ تھی وہ پہننے کے لئے ہری کرتی رنگ رہی تھی۔ کرتی نچوڑ کر اس نے الگنی پر لٹکا دی۔ لیکن پھر اس سے اٹھا نہ گیا وہ چولھے کے پاس بیٹھی دست پنے سے زمین کھودتی رہی۔

مجو بھیا زمیندار کے پوت تھے۔ آج کا نقشہ دیکھ کر غرور سے ان کی چھاتی چار انگل اور بڑھ گئی تھی۔ تراب کے بات کرنے کا انداز ان کو کبھی اچھا نہ لگا۔ وہ واحد آدمی تھا جو ان کے دروازے کے سامنے سے سانڈ کی طرح جھومتا ہوا نکل جاتا۔ کبھی دو انگلی اٹھا کر سلام کا بھی روادار نہ ہوتا۔ پھر تراب کی بھینسیں اکثر ان کے بار میں

دندناتی ہوئی گھس پڑتیں۔ بظاہر تو وہ کوئی خاص توجہ نہ دیتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ گولیاں ان کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مجروح کرنے کے لئے سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں۔ پھر ہولی والے دن تو نراتب نے کھل کر نوکروں سے کہہ دیا تھا کہ بڑے سیٹھ کے بیٹے ہوں تو ہانک دیں۔ اگر نراتب کی بھینسیں۔ مجو بھیا خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ آج انہوں نے جو کچھ کیا تھا۔ اس میں ان کی حکمت عملی ہی کو دخل تھا۔ وہ جانتے تھے اگر فوجداری ہوگی تو میں ایک فریق بن جاؤں گا۔ اور قتل کے مقدمے میں فریق کے معنی ان کو اچھی طرح معلوم تھے اسی لئے وہ ٹال دے گئے۔ مگر ایک بات انہوں نے طے کرلی تھی۔ بھیکم پور اور سان پور کی سرحد پر ان کا ایک جو نار کا کھیت تھا جس کی مینڈ نراتب کے کھیت کو ان کے کھیت سے جدا کر رہی تھی۔ اسی مینڈ پر جامن کا درخت تھا جو اپنے مزے کی وجہ سے سارے علاقے میں مکھن والے جامن کے نام سے مشہور تھا۔ پٹواری کے کاغذات میں بھی مجو بھیا کے نام درج تھا لیکن جس دن سے مجو بھیا نے اپنا کھیت رام دین پاسی کو اس کی وفادارانہ خدمت کے صلے میں دیا تھا اس دن سے اس کے جامن نراتب نے سنبھال لئے تھے۔ جامن کوئی ایسی نعمت تھے جن کے لئے مجو بھیا کڑھتے لیکن یہ ان کی عزت اور حکومت کا سوال تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ بڈھے نراتب کے سامنے ان کے منھی بھر نوکر کیا کر لیں گے۔ آج پاسیوں کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دیکھ کر ان کو اپنے بھیگے ہوئے جامن کو سکھانے کی سوجھ گئی تھی۔ وہ اپنے باہری صحن میں گملوں کے گول دائرے میں آرام کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ آسمان پر کالے کالے جامنوں کے کھلیان سے بادل لدے کھڑے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ محرم کے سلسلے میں تعلقے سے آئے ہوئے کانسٹیبل کی خوراک حلوائی کو سمجھا کر وہ بیٹھے تھے۔ سارے نوکر اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔ رام دین ان کی پشت پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا کہ راج دین بھگا اور دلارے آ گئے۔ سبھوں نے جھک کر سلام کیا۔

"آؤ بھیتیا۔"

اور ان تینوں آدمیوں نے اپنے جوتے اتارے اور گول دائرے میں مجو بھیا کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"رام دین۔"

"ہاں بھیا۔"

جب وہ اٹھ کر ان کے سامنے آ گیا تو بڑے لاڈ سے جھڑکتے ہوئے مجو بھیا بولے۔

"ابے یہ تو تیرے باپ ہیں۔ ان کو تو بغیر میرے کہے بیڑی پلا دی ہوتی۔"

"باپ ہوں چاہے چچا ہوئیں ..... بیڑی کوئی بیڑن میں تھوڑے لگت ہیں جو ہم بیٹھے لٹا دا کریں۔ آپ جیسا حکم دیو اوکا پلائے دیں۔"

مجو بھیا نے مسکرا کر راج دین کو دیکھا۔

"بھیا تمہارا یہ لونڈا کنجوس ہے ..... بہت بڑا کنجوس ہے ..... تم ایسے دل والے باپ کا بیٹا کیسے ہے یہ۔"

راج دین نے فخریہ اپنے بیٹے کو دیکھا۔ دلارے اور بدھو بھی ہنس پڑے۔

"کہو بھگا سب خیریت ہے ..... تم کیسے آئے۔"

بھگا نے سوچتی ہوئی آنکھیں اٹھا کر راج دین کو دیکھا اور کھنکارا۔

"ای بھیا آئے ہیں ایک جرورت سے ..... ہم کا اپنے سنگ لائے ہیں۔"

راج دین نے بہت چبا چبا کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بولو۔"

"ای اپنا کمرہ پٹوائے رہے ہیں۔ کڑی او بال پڑگئی ہیں کم ..... تو لکڑی اگر کہوں لگاؤ دل ہوئے تو۔"

راج دین دروازے پر للی کو دیکھ کر چپ ہوگیا۔ کیونکہ بھیا نے گردن گھما کر جو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے وہ سبز ریشمی اوڑھنی کندھے پر ڈالے سبز کرتی کی بہار دکھلاتی سبز پڑا کے دار گوٹ کے لہنگے میں بھنور بناتی رانیوں کی طرح آ رہی تھی۔ گملوں کی شاخوں کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنے دونوں مرمریں ہاتھ کولہے پر رکھ لئے۔

"کا بھیا کچھ فیصلہ کرت ہیں۔"

اس نے بڑے ناز سے کہا لیکن بھیا کچھ بولے نہیں وہ چاہتے تھے کہ بات ختم کر کے یہ لوگ چلے جائیں تو للی کو غور سے دیکھوں۔

"فقیر نائیں ہے بھیا آج۔"

للی نے پہلی بار آج بھیا کو اتنی بے باکی سے اپنے سراپے کو گھورتے پایا تھا۔

"رجب کی اماں نے نہ ابھی ٹوپی رنگی نہ کلائی آئی۔"

بھیا نے اپنے خشخشے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ پھر راج دین کی طرف مخاطب ہوئے۔

"تو بھگا کو کڑیوں کے لئے لکڑی چاہئے۔"

"ہاں بھیا۔"

"ہے کہیں نگاہ میں۔"

"ہمری نگاہ کون ..... جہاں آپ حکم دیو وہاں نگاہ دوڑائی جائے۔"

"ارے راج دین۔"

"بھیا"

"پہاڑ ایسا پیڑ سامنے کھڑا ہے اور تم مارے مارے گھوم رہے ہو۔۔۔۔۔ تمہاری میرڈے کھیت میں وہ جامن جو کھڑا ہے۔۔۔۔ دھنیا سا کی دھنیاں ہیں ان میں۔"

"سانچ نہ کہت ہو بھیا۔"

"بھگا تم پیڑ کاٹ لیہو۔"

"کا مکھن والا پیڑ تم ان کا دیت ہو۔۔۔۔ بھگا کا تب لّی نے آنکھیں پھاڑ ڈالیں۔"

"ہاں۔۔۔ کیوں؟"

"کا ہے بہن آ بروٹی مال ملادت ہو۔۔۔۔ جون ہی سونا ایسی دلہین نہ بیاہے پاؤ اُو ترا ب تب اے پہاڑ ایسا پیڑ جہیز در چھین لئے جیسے۔۔۔۔ اب پیڑ دے کو ہے تو کری پہ رکھا کر جون ہاتھ پاؤں جوڑ کے بھلا کاٹ تو ہے۔" یہ کہہ کر لّی نے اپنی چنری ڈھلکا دی۔ زیر میں بیٹھے ہوئے ایک جمّت راج دین، بھگا، رحم دین اور دلارے سب کے کلیجے چھید کر وہ جاتے جاتے مڑی۔

"ہیں بھیا کے نے ٹوپی اور کلائی لاوت ہوں۔"

بڑی دیر تک سناٹا طاری رہا۔ مجو بھیا سمیت سب منہ جھلائے بیٹھے رہے۔ عصر کی اذان سنکر بھیا اٹھے ان کے اٹھتے ہی حاج دین کے ساتھ سب اٹھ پڑے۔ اور سلام کی رسم ادا کر کے نکل گئے۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی لیکن حاجی بازار سے واپس نہیں آئے تھے۔ لّی نے چاول رکھ کر لالٹین کی چمنی جوڑی اور جلا کر کوٹھری میں گھس گئی۔ بانس کے بنے ہوئے کپڑے رکھنے کے پٹارے کے ڈھکنے پر سے آئینہ اٹھا کر اس نے اپنی چاندی کی سائی سی مانگ پر ایک مطمئن نگاہ ڈالی اور کوٹھری بند کر دی۔ آگے آگے نوکر جھولا لئے آیا اس کے پیچھے حاجی تھے۔ انہوں نے ڈلیا ترازو کونے میں دھرا اور لوٹے میں پانی لے کر وضو بنانے لگے۔ لّی نے رنگی ہوئی ٹوپی اور کلائی اٹھائی تھی کہ اُسے یاد آ گیا۔

"بالامئو کی بزار ہے کل۔"

"ہاں۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔ آدھی رات سے گاڑی ہانکی جیہیں۔"

"آدھی رات سے؟"

"اوہنہ پچھلا پہرے سے ہانکی جیہیں۔ لیکن اٹھے کا تو آدھی رات سے پڑ بیہے۔" حاجی جھنجھلا گئے۔ "اور ای جو بادل لدے کھڑے ہیں۔"

حاجی نے اٹھ کر سیاہ آسمان کو دیکھا اور ٹوپی پہن لی اور آدھے آنگن میں جا کر بولے۔

"کٹھل بھی کہیں کچھ مصری ہتوڑے بھری گئی ہے۔"

"اچھا تو سنو ..... میں تنی لیک کے بھیا کا ٹوپی اور کلائی دے آؤں ..... تم اتنے وقت گھر

مال نماز پڑھلیو۔"

تلی کا حکم سنکر حاجی پلٹ آئے اور چٹائی ڈھونڈھنے لگے۔

مجو بھیا نوکروں کو رخصت کرکے اٹھے ہی تھے کہ چھوٹے خاں آگئے۔

"چچا مجھ کو آپ کا پیام مل گیا تھا۔"

"ہاں مجو خاں کو بھیجا تھا میں نے۔"

"اب آپ یہ بتایئے کہ محرم میں کتنا پیسہ صرف ہوتا ہے۔"

"بھائی پارسال تین سو چالیس لگے تھے۔"

"تو اس سال آپ چار سو پورے خرچ کیجئے ..... لیکن محرم کیجئے دھوم سے۔"

"ہونھ ..... تو صبح گھڑی بھر بیٹھ جاؤ ..... حساب بنا لیا جائے۔"

"آجایئے گا۔"

مجو بھیا چھوٹے خاں کو رخصت کرکے گھر کے آنگن میں پہونچے تو باورچی خانے کی طرف سے تلی آرہی تھی۔

"رجب کی اماں نائیں ہیں۔"

"نذر نیاز دلانے گئی ہوں گی ..... یہ کیا ہے۔"

تلی نے ہاتھ بڑھا کر مجو بھیا کے ہاتھ میں ٹوپی پکڑائی ہی تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بڑے بڑے بوندوں کا ریلا ٹوٹ پڑا۔ مجو بھیا دالان کی طرف لپکے مگر تلی نے جلدی جلدی آنگن میں جو کچھ پڑا تھا بین کر دالان میں کر دیا اور باورچی خانے کے در میں ٹنگی ہوئی لالٹین پر جھپٹی لیکن وہ اس کے پہونچنے سے پہلے ہی بھڑک کر رہ گئی۔ پیٹے پانی میں پورا آنگن پار کرکے وہ لالٹین دبائے ہوئی دالان میں آگئی جہاں اندھیرے میں مجو بھیا کھڑے تھے۔

"دیا سلائی کہاں ہے بھیا۔"

مکمل اندھیرے میں اس کی آواز کا شعلہ چمکا۔ اور مجو بھیا چونک پڑے اور بڑی مشکل سے بولے۔

"کمرے میں تخت پر۔"

کڑکڑا کے بجلی چمکی تو اپنی ریشمی چنری نچوڑتی ہوئی تلی نے دیکھا کہ مجو بھیا کے دیدے اس کے گریبان

پر چپک گئے ہیں۔ اس نے ٹٹول کر چنری تخت کے کونے پر رکھ دی اور کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"یہاں تو بھیا نہیں ہے۔"

مجو بھیا اپنی شہتیر ایسی ٹانگوں پر پہاڑ سا بدن گھسیٹتے ہوئے اٹھے۔ کمرے کی دہلیز سے نکلتے ہی جلتے توے پر ان کا ہاتھ پڑ گیا اور دل اچک کر حلق میں لٹک گیا۔ سنسان راتوں کے لمبے خوابوں کی جگمگاتی ہوئی زندہ تعبیر ان کے بازوؤں کی گرفت میں دھڑک رہی تھی۔ وہ اس لالچی بچے کی طرح ساکت کھڑے رہے۔ جو مٹھائی کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ ابھی وہ اپنے ہاتھوں میں بھری ہوئی آرزوؤں کی دولت ایک نظر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ شانوں سے ان کے ہاتھ تراش لئے گئے۔ پھر انہوں نے بجلی کی روشنی میں دیکھا للّی آنگن میں چھپ چھپ کرتی بھیگی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ وہ لٹے ہوئے درخت کی طرح تخت پر بیٹھ گئے۔ پانی بند ہو گیا۔ کسی نوکر نے لالٹین جلائی۔ رجب کی ماں نے دالان صاف کر کے تخت پر دسترخوان بچھایا۔ کھانا لگایا۔ پھر اٹھا لیا۔ نوکر نے بستر لگایا۔ مچھر دان لگا کر کھڑا رہا پھر چلا گیا۔ باہر پہرے کا سپاہی مستعدی سے "جاگتے رہو۔ جاگتے رہو" کے نعرے لگاتا رہا لیکن مجو بھیا نے تخت چھوڑ کر نہ دیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ کرس رہے تھے۔ للّی جو چولہے پر کھڑی ہو کر اپنے شوہر کے ملکھان کرتی ہے جس کی شعلہ مزاجی کے سامنے بڑے بڑے فقرے بازوں کی زبانیں کوا اچک لے جاتا ہے وہ للّی جو فتنہ نہ کھڑا کر دے وہ تھوڑا ہے۔ لیکن مجو خاں اور استاد مدی کیا سوچیں گے۔ رام نرین اور لونڈے میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ میں مان پور کی مسجد کا امام... جس کے سامنے جوان جوان عورتیں کرتے دوپٹے سے بے نیاز بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کو دودھ پلایا کرتی ہیں۔ اور اپنے شوہروں کے قصے بیان کیا کرتی ہیں۔ میرا کیا ہوگا۔ عورتیں مجھ سے پردہ کرنے لگیں گی۔ مرد میرے نام پر تھوکیں گے..... اور لونڈے رنگے رسیار پر تالیاں بجائیں گے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھے۔ کیچڑ سے بھرے آنگن میں کامدار مخملی جوتا پہنے وہ ٹہلتے رہے۔ ٹہلتے رہے۔ لیکن للّی جو کچھ کہے گی صبح کہے گی۔ پھر صبح اس سے معافی مانگی جا سکتی ہے۔ منایا جا سکتا ہے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ پھر خیال آیا کہ آج تو حاجی میٹھے بالا مؤ کی بازار کٹھل لے کر جائیں گے۔ ترپال مانگنے آئے تھے شام کو..... وہ کچھ مطمئن ہو کر سوچتے رہے اور رات گذرنے کا انتظار کرتے رہے۔

للّی جب گھر پہونچی تو چولہا بجھ چکا تھا۔ وہ حاجی سے بولے بغیر ان کے ساتھ کرنے کے لئے روٹیاں پکاتی رہی۔ پھر موٹی موٹی روٹیاں گھی لگا کر ڈبے میں بند کر دیں۔ مٹی کے پیالے میں سوکھی سوکھی ترکاری رکھ کر اس نے حاجی کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے پلنگ پر گر کر مر گئی۔ حاجی اور ان کے ساجھے دار دوسرے چھپر میں بیٹھے حساب کتاب کر رہے تھے اور دوسرے دن کے بازار پر قیاس آرائی بھی ہو رہی تھی۔

حاجی نے جب اس کو جھنجھوڑ کر جگایا تو اس نے آسمان پر نگاہ ڈالی جو اسکے بالوں کی طرح کالا تھا۔
اس نے حاجی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"آسمان کا حال دیکھ رہے ہو حاجی۔"

"ہاں..... مال سودا ہوئے چکا ہے..... بسنگی سب تیار ہیں..... چھتری ترپال سب انتظام ہے۔ اور دیکھو کوئی گھڑی بھر رات ہے اب۔ ہم ادھر سے رے زینب بہن کا پکا رو دیا۔ اوئی آ کے لیٹ رہیں۔"

"تو دروازہ نہ بند کریں۔"

"نائیں..... دروازہ ضرور بند کرو..... مگر تنی چیتے سونیو۔"

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر آکر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ حاجی نے بقر عیدی کے گھر پر ہانک لگائی۔ تین چار آوازوں کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ حاجی نے تکرار کر کے اس سے زینب کو گھر بھیجنے کی تاکید کی۔ اور ہر بار اس نے مینیری بھر کا سر ہلا کر حامی بھر لی۔ لیکن دروازہ بند کرتے ہی اپنے پلنگ پر لڑھک لیا۔

للی کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن نیند نہ آئی۔ کبھی تراب کی موذی مسکراہٹ اس کی چھٹیا پر جو تا مسل کر چلی جاتی اور کبھی مجو بھیا کی باہوں کے شیریں لمس سے خیالوں میں چاندنی چھٹک جاتی۔ ابھی وہ پوری طرح مسرور بھی نہ ہو پاتی کہ مجو بھیا کی شراتی ہوئی آنکھیں اس سے کہتیں کہ چچی اکبری کی طرح میں نے تجھے چھیڑنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ ورنہ تو یقین جان کر میں تجھ کو چچی ہی سمجھتا ہوں۔ خیال کے اس سنپولے کے دل پر رینگتے ہی وہ زور سے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیتی۔

دروازے پر تھپکی ہوئی۔

اس نے آہستہ سے کنڈی کھول کر دروازہ جو کھولا تو دست پنہ کی سی موٹی موٹی انگلیاں اس کی گردن میں گم گئیں۔ تراب نے بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کیا۔ داہنے ہاتھ سے للی کی گردن دبوچے ہوئے منگو کے گھر والے دروازے کی زنجیر کھول کر داخل ہو گیا۔

وہ غیں غیں کرتی رہی۔ تراب نے مسکرا مسکرا کر پانی بھرنے والی رسی میں اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اسکے منہ میں انگوچھا ٹھونس کر ایک لات مار کر پلنگ پر گرا دیا۔ اور کوٹھری بند کر لی۔ للی دل ہی دل میں صبح ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔ لیکن جب تراب نے اسے گود میں بھر کر پھر اس کے پلنگ پر لا کر بٹھا اور آپ اس کے دروازے کی زنجیر کھول کر باہر نکل گیا۔ اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد فجر کی اذان

ہوئی۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر کسی نے دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر وہ اٹھی دروازہ کھولا تو مجو بھیا کھڑے تھے جس ہاتھ سے وہ کواڑ پکڑے تھی اس کی کلائی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے زخمی تھی۔ پھر مجو بھیا نے اس کی کرتی دیکھی جس میں لہریں جھول رہی تھیں۔

"یہ کیا ہوا"

"کیا ہوا آخر"

مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔ اور للی کی کلائی تھام لی۔ للی ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرح ان کے دیوار ایسے سینے پر ٹک کر رونے لگی۔

راج دین نے مجو بھیا کے یہاں سے آتے ہی چار چار کوس تک سارے گاؤں کو خبر بھیجدی تھی کہ دوسرے دن بازار کے وقت پہونچ جائیں۔ دس ہی بجے سے آدمی گرنا شروع ہونے لگے۔ کوئی بارہ بجے تک راجپورہ کے ایک ایک گھر میں کیڑے مکوڑوں کی طرح آدمی بجبجنے لگا۔ اس کے بعد راجپورہ کے سامنے والے باغ میں آدمیوں کا کھلیان لگ گیا۔ ابھی دو نہیں بجا تھا کہ رام دین اور دلارے کلہاڑیاں لے کر مکھن والے پیڑ پر پہونچ گئے۔ اس کی پیڑی پر کلہاڑی مار کر جنگ کا ڈھول بجا دیا۔ بھیکم پور کے چماروں نے جو سودا سلف لینے مان پور کے بازار جا رہے تھے۔ یہ رنگ دیکھا تو الٹے پیروں جا کر پیرا کے گھرانے کو خبر کر دی۔ پیرا اپنا ناریل لے کر چھپر سے نکلا تو آدمی سمٹنے لگے۔ کوئی چالیس پچاس آدمیوں کو عقب میں لئے تراب سے دیکھا کر دو لونڈے کلہاڑی لئے کھلواڑ کر رہے ہیں تو وہ مسکرا دیا لیکن پیرا کی بوڑھی آنکھیں منظم سازش کی تہ تک پہونچ گئیں اس نے ناریل پاس کے آدمی کو پکڑا دیا۔ اور نرمی سے بولا۔

"بھلا بھولا پیڑ کیوں کاٹے ڈالت ہو بھئی"

"روک پاؤ تو روک لو"

پیرا اس جملے کی دھار پہ کھڑ رہا تھا۔

کر رجپورہ کے باغ سے پاسیوں کی آندھی چلتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی مان پور کی طرف سے آدمیوں کے غول آتے نظر پڑے تو اس کی ڈھارس بندھی۔ ساتھ ہی بھیکم پور سے بھی آدمی سمٹنے لگے تھے۔ چھوٹے خاں نے آتے ہی پاسیوں کو ڈانٹا کہ روز تم لوگ کوئی نہ کوئی لبسنت بنایا کرتے ہو۔ پیڑ کس کا ہے۔ آواز آئی مجو بھیا کا ہے۔ مجو بھیا کا نام سنکر چھوٹے خاں کچھ دھیمے پڑے۔ پھر گدیوں کی طرف سے نعرہ بلند ہوا کہ جس کا کھیت ہے اس کا درخت ہے۔ اس قانونی بات چیت میں جتنا وقت لگا اتنے وقت میں مکھن والے جامن کے پورب اور پچھم میں دور دور تک آدمی ہی آدمی نظر آنے لگا۔ پورب میں پاسی پچھم میں گدی مان پور والے

کبھی ادھر کی جانب بھرتے کبھی اُدھر کی۔ سنجیدہ کوئی نہ تھا۔ سب تماشبین کرنے نکل پڑے تھے۔ ویسے ہاتھ کسی کا خالی نہیں تھا۔ بلمنے، پٹے، تلوار، بلم، کانٹے، لاٹھی ہر چیز دیکھنے کو مل سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے محرم میں کرتب دکھلانے آ گئے ہوں۔ مان پور کے مکھیا چھوٹے خاں نے آدمی بھیج کر مجو بھیا کو خبر کرا دی تھی۔ مجو بھیا نے اپنے سارے نوکروں کو پہلے ہی رام دین کی حمایت میں روانہ کر دیا تھا۔ خود نیا ڈوری دار جوتا پہنے صحن میں چکر کر رہے تھے۔ مگر بھیگی ہوئی زمین پر جوتے کی مدھم آواز کی وجہ سے انہیں ٹہلنے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ مبارک ڈھپالی نے آکر خبر دی کہ ہندو مسلمان میں گڑبڑ مچا ہے۔ چھوٹے خاں بلا دت ہیں۔ مجو بھیا نے کوئی موٹی سی گالی دے کر اسے دھتکار دیا اور بولے کہ اگر ہندو مسلمان کا نام لیا تو اتنے جوتے ماروں گا کہ بھیجہ نکل جائے گا۔ مبارک نے مجو بھیا کو بگڑتے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ کان دبا کر بھاگ لیا۔ مجو بھیا نے بڑے اطمینان سے اصطبل کھولا۔ سفید گھوڑے کو جسے وہ بجلی کہتے تھے۔ باہر نکالا۔ اپنے ہاتھ سے کاٹھی رکھی اور اوٹے پر کھڑے ہو کر سوار ہو گئے۔ اُسے "برغہ" چلاتے ہوئے موقعہ پر پہونچے پاسیوں کی کثرت دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ رام دین نے کلہاڑی رکھ کر الف ہوتے ہوئے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ رام دین جس نے مجو بھیا کے ساتھ ڈنڈے لگائی تھیں۔ مگدر ہلائے تھے، کھلیان اٹھائے تھے۔ اور گھوڑے خریدے تھے۔ مجو بھیا کاٹھی پر تن کر بیٹھے اور کڑک کر بولے۔

"چھوٹے چچا۔"

"ہاں بھیا۔"

انہوں نے بٹوے سے لونگ لے کر ڈوری گھسیٹ لی۔

"آپ فجو خاں، ملکس اور استاد مدی کو لے کر مان پور چلے جایئے۔ محرم ہے یہ ..... سیدھے چلے جایئے۔"

محرم کا نام آتے ہی چھوٹے خاں چونک پڑے۔ بٹوہ اپنے کرتے کی جیب میں گھسیڑ کر لونڈوں کو ڈانٹا جو اڑیل بیلوں کی طرح ایک قدم چل کر ٹھٹھک گئے۔ جب مان پور کا بچہ بچہ چمری کے کھیت تک پہونچ گیا تب مجو بھیا نے اپنا گھوڑا گ۔ یوں کی طرف موڑا جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"بیرا۔" مجو بھیا رکابوں پر کھڑے تھے۔

"کہیو۔"

"تمرے بھوئیں اور بیٹی دونوں ہیا شاید۔"

"ہیا۔"

ابھی ان کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ بھیڑ کو چیر کر تراب باہر نکلا اور لاٹھی اوپر کر دوڑا۔ مجو بھیا، بھوکا اور راج دین کے ہونٹوں پر ایک قسم کی زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ مجو بھیا نے اپنے ڈوری دار جوتے کی ایڑی بجلی کے پیٹ میں گاڑ دی اور رُخ بدل کر مان پور والوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ لاٹ ایسے تراب کی گولے دار لاٹھی اور مجو بھیا کے گھوڑے کا فاصلہ دانت پیستے ہوئے پاسیوں کے گھر یا اپنے ہاتھوں میں ناچتی گولے دار لاٹھیوں سے بھر گیا۔ دلاسے نے اپنی دھوتی سے دیسی پستول نکال لیا۔ اس کی کھردری بے ہنگم نال میں مٹیالے رنگ کا کارتوس لگا کرتا ناہی تھا کہ بھوکا اور راج دین کی سنگت میں کوئی دو درجن لاٹھیوں نے تراب کو اپنی باڑھ پر رکھ لیا۔ تراب کی ۔۔ دو گدی دوڑے لیکن ہزار بارہ سو پاسیوں کے سیلابی ریلے میں بہہ گئے۔ بہت سے گدی بھی مان پور والوں کی طرح ہاتھوں میں سودا سلف لئے بغل میں لاٹھی دبائے نکل آئے تھے۔ بہت ایسے بھی تھے جو زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر محض تفننِ طبع کے طور پر آ نکلے تھے۔ لیکن اتنی بات سمجھ گئی کر جنار کو چھوڑ کر سارے کے سارے گدی ان پاسیوں کے سامنے مطمئن تھے جن سے ابھی عہد، دو قبل وہ بھینسیں چھین کر ہانک لے گئے تھے۔ مجو بھیا کے تفرقوں اور تیوروں پر وہ چونکے ضرور تھے۔ لیکن مان پور کی آدھی جوان آبادی کو کھڑا دیکھ کر ان کی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔ آتش بازی کی چرخی کی طرح جب پاسیوں کی لاٹھیاں چوکھی مار کرنے لگیں اور مان پور والے بھیڑ لگائے کھڑے رہے جیسے محرم کے اکھاڑے میں تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ تو کسی چالاک گدی نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بھاگتے ہوؤں کو جیسے کمک مل گئی۔ انہوں نے گلے پھاڑ کر "اللہ اکبر" کی تکرار کی۔ راج دین اور بوڑھے بوڑھے پاسیوں کے ہاتھ سست ہو گئے اور انہوں نے بڑی حسرت سے مجو بھیا کو دیکھا۔ مان پور والوں میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے تراب کے ساتھ پانی پلائے تھے۔ تاڑی کے کچھڑ توڑے تھے۔ عورتوں کے بدن لوٹے تھے اور مار کھاتے ہوئے تراب کو دیکھ کر تازی کتوں کی طرح زنجیر تڑانے کی فکر میں تھے۔ دلوں میں آگ بھر دینے والی اس آواز کو سنتے ہی بے قرار ہو گئے۔ "اللہ اکبر" کی تکرار کرتے ہوئے لاٹھیاں سونت کر دوڑ پڑے۔ لیکن مجو بھیا نے زین میں لگے ہوئے چابک کو سر سے گھسیٹ کر بجلی کے ایڑ لگائی جو پھینپھناتا ہوا فجو خاں اور رکھس کی چھٹیا کا راستہ روک کر پاؤں پٹخنے لگا۔ پھر فجو خاں اور رکھس کے کئی جیالے ساتھیوں نے اپنے بازو اور سینے پر کوڑے کی جلتی ہوئی چوٹ محسوس کی۔ ساتھ ہی مجو بھیا، چھوٹے خاں اور دوسرے بڑے بوڑھوں کی گالیوں کی بوچھار تیروں کی طرح ان کے کلیجوں پر پڑی۔ اور وہ جہاں تھے وہیں مچل کر رہ گئے۔ اب میدان صاف ہو چکا تھا۔ بیرا، تراب، اور تراب کے بھتیجے کی لاش چھوڑ کر سارے گدی بھاگ نکلے۔ بھوکا اور رام دین نے لاٹھی کے گولوں سے تراب کی لاش بگاڑی پھر آدمیوں کو سمیٹ کر بھیکم پور پر ہلہ بول دیا۔ چیختی ہوئی عورتوں نے اپنے آپ کو روتے بچوں کو اٹھا کر کوٹھریوں میں دفن کر لیا۔ یا پڑوس کے پردے پر بھاگ نکلیں۔ تراب کے اندر

سے بند دروازے پر پہونچنے سے چھپر کا مٹھا بھر پھوس نوچ کر بھوکا نے انٹی سے دیا سلائی نکالی ہی تھی کہ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے پاسیوں کی کائی پھاڑ کر مجو بھیا کا بجلی تراب کے چھپر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"راج دین"

"بھیا"

"یہ کچھ نہیں ہو گا۔ تم گانوں کی کسی مرغی تک کو بھی نہیں چھیڑو گے۔ بس۔ پچاس آدمی روک کر تراب کے گھر کا پہرہ دو۔ سوتا باہر نکل گئی تو مقدمہ ہار جاؤ گے۔ میں تھانے خبر بھیجتا ہوں۔"

پھر سارے میں لال صافے پھیل گئے۔ مان پور تک میں طاعون سا پھیل گیا۔ چھوٹے سے بڑے تک سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ مجو بھیا کے نوکر اور مجو بھیا کے گھوڑے سڑکوں پر دوڑتے نظر آنے لگے اور بس۔ عشا کی اذان ہوتے ہوتے ہردوئی کا سپرنٹنڈنٹ پولیس آ گیا۔ مان پور کے مڈل اسکول میں تھانے داروں سے گفتگو کرنے کے بعد علاقے کی سب سے بڑی بستی کے سب سے بڑے آدمی کو طلب کیا۔ جامدانی کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامے پر لکھنو کا کڑھا ہوا پلہ دیئے۔ سچے کام کے جوتے کو آہستہ آہستہ چرمراتے ہوئے دیو قامت مجو بھیا ہال میں داخل ہوئے تو انگریز سپرنٹنڈنٹ نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔ گیس کی تیز روشنی میں ان کے دہکتے چہرے پر بڈھے انگریز کی نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ کپتان اور کپتان کی موجودگی میں ہندو تھانے دار نے ایک سے ایک ترچھے ٹیڑھے سوال کئے۔ لیکن مجو بھیا نے اس بلوے کو ہندو مسلم فساد نہ بننے دیا۔ گدیوں نے یہ تو دیکھا ہی تھا کہ اگر مجو بھیا بیچ میں نہ آ جاتے تو پاسی پورا کھیم پور پھونک دیتے۔ تاکہ تراب کا چھپر تک کھڑا تھا۔ پھر ان کو یہ یقین تھا کہ اگر مجو بھیا کا نام درمیان میں آ گیا تو مان پور سے مسلمان شہادت کا ملنا آسان نہ ہو گا۔ اس لئے گدیوں نے بہت سوچ سمجھ کر مجو بھیا کا نام نکالا تھا۔ پاسیوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجو بھیا کو اس کا علم تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے بیٹھے ہوئے جواب دے رہے تھے۔ انگریز کپتان اور ہندو تھانے دار دونوں ان کی سچائی کے معترف تھے۔ مرعوب تھے۔ مجو بھیا کے گھر سے آئی ہوئی چائے کی ایک پیالی پی کر جب کپتان جیپ پر بیٹھا تو اس نے مجو بھیا سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اپنے "بجلی" پر سوار ہو کر کپتان کی جیپ کے آگے آگے چلے۔ اور ان کی موجودگی میں تراب کے گھر سے بھکا پاسی کی بیوی سونا برآمد ہوئی جس کے وجود اور بیان نے نہ صرف مقدمے کی نوعیت بدل دی بلکہ مجو بھیا کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ ابھی کپتان سوتا کا بیان دیکھ رہا تھا کہ پٹواری لال پرشاد جھوا بھر کاغذات لے کر مجو بھیا کے پاس آ گئے اور مجو بھیا نے مکھن والے پیڑ کے اندراجات کپتان پولیس کو دکھلا دیئے۔ جن کو وہ اتنے غور سے دیکھ رہا تھا گویا واقعی سب کچھ سمجھ رہا ہو۔

مان پور کے ماڈل اسکول میں ساری رات گیسیں جلتی رہیں۔ زچگی ہوتا رہا صبح ہوتے ہوتے لاشیں اور
سات پاسیوں کا چالان روانہ ہو گیا۔ مجو بھیا جب گھر آئے تو بھیڑ بھی انتظار کر رہی تھی۔ اپنی اہمیت کا اندازہ کر
کے مسرور ہوتے ہوئے انہوں نے مختصر جوابات عنایت کئے۔ چھوٹے خاں کی قیادت میں مجمع منتشر ہو گیا۔ وہ شیروانی
اتارتے ہوئے اندر گئے تو باورچی خانے میں رجب کی اماں کے ساتھ تلی بھی چائے کے برتن درست کرنے لگی۔ تلی کے
رگ و ریشے کو سے ہاتھوں میں چائے کی کشتی دیکھ کر ان کی تھکن پر لگا کر اڑ گئی۔ جیسے دن بھر کے تھکے بیل گرا کی ہوئی کھا
کر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ تلی نے انڈوں کے حلوے کی پلیٹ اور تر تراتی ہوئی روغنی روٹیاں ان کے آگے رکھیں تو ان
کے ہونٹوں کو تلی کے ہونٹوں کی لذت یاد آ گئی۔ ان کی گردن نے شانوں سے نکل کر گھر کا جائزہ لیا۔ سامنے میں
سنسان تھا۔ باورچی خانے سے رجب کی اماں کی کھڑ پڑ کی آواز آ رہی تھی۔ مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی مہندی کی
کلائی پکڑ لی۔

"تراب کی لاش دیکھ لی تم نے؟"

"ہاں۔"

اسنے اپنی کلائی چھڑا کر کہا۔

تلی نے اپنے دروازے سے دیکھا حاجی میٹھے کھیت میں پانی لگا رہے تھے۔ نوکر ڈول کھینچ رہا تھا مرغیاں ٹاپے
کے اندر کڑکڑا رہی تھیں۔

"حاجی کھوں رہتے تو ہاتھ نائیں ٹوٹ جاتے۔"
بڑبڑا کر اسنے چھینکے سے روٹی کی ڈلیا اتار لی۔ ایک ہاتھ سے ٹاپے کی سل لٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور اطمینان
سے روٹی مل مل کر ان کو کھلاتی رہی۔ کنکھیوں سے ٹاپے کے پاس پڑے ہوئے انڈے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد
منگلو کی موٹی موٹی گالیوں کے ساتھ "گھمسے" سنائی دیئے۔ اس نے ڈلیا پھینک کر کنواری لڑکیوں کی طرح قلانچ
لگائی اور دروازے کی جھریوں پر آنکھیں رکھ دیں۔ مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں۔
لیکن وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی دروازے پر جھکی رہی۔ چندا کا دوپٹہ زمین پر پڑا تھا۔ الجھے بالوں کی لٹیں منہ پر جھول
رہی تھیں۔ آنکھوں سے بہہ کر موتے موٹے آنسو لال لال گالوں پر چمک رہے تھے۔

"تم ہوں اُو کے باہ اس کے ساتھ کیسے ہیں بندھوئے کے چلی جاؤ۔"
منگلو نے کٹک کر کہا اور دھم دھم گھونسے مارنے لگا۔ تلی نے جھن سے زنجیر کھولی اور گڑاپ اندر چلی
گئی۔

"تو کا مارڈلیہو تم ای کا . . . . . چھوڑ دو۔"

منگو کے ہاتھ سے چندہ کی کلائی چھڑا کر وہ اسے لیتے ہوئے اپنے گھر چلی آئی۔ پیتل کے لوٹے میں پانی بھر کر چندہ کا منہ ہاتھ دھلایا۔ پھر مرادآبادی گلاس میں گڑ کا شربت بنا کر اسے پلایا۔ للّی نے اپنے دل کی جھولی میں خوشیوں کی اشرفیوں کی ایسی چھنچھناہٹ سنی کہ انگ انگ ناچ اٹھا۔ "موت زندگی اللہ کے گھر سے ملتی ہے . . . . . رو دھو کر اپنا آپ جلاتی ہو . . . . . مٹی خراب کرتی ہو۔"

للّی نے چھوٹے جان کی بہو کی پیاری پیاری باتوں کی نقل کی۔ پھر چندہ کے سوکھے بالوں کی چوٹی گوندھنے لگی۔

"آج بھیا پوچھ رہے تھے کہ کا نواب کی منگو کی دولہن سے بھی کچھ جان پہچان رہے۔"

چندہ نے چونک کر اپنے بال چھڑا لیے۔ لال لال آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"مجو بھیا پوچھت رہیں۔"

"ہاں . . . . . معلوم نا ہیں ان کا کیسے سن گن مل گئی۔"

"تم کا کہیو۔"

"میں کہوں . . . . . اللہ اللہ کر و بھیا . . . . . دیوار سے تو دیوار ملی ہے میرے گھر کی . . . . . دال تک بگھاری گئی تو میں کا معلوم . . . . . اتنا لاٹ ایسا آدمی آتا تو پڑے پڑے رہتے۔"

"پھیر۔"

"پھر کا . . . . . چپ سادھ لی . . . . . مگر ہے ان کا شک . . . . ."

محرم بھر حکام پڑے رہے۔ ان کے ناشتے کے انڈوں سے لے کر گھوڑوں کی گھاس تک مجو بھیا کے نوکر مہیا کرتے رہے۔ تھانیدار سکسینہ تو ان کا مرید ہو گیا۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ کر کے اس نے مجو بھیا کو بندوق کا لائسنس دلا دیا۔ ادھر مجو بھیا نے مقدمے کی ایسی پیروی کی کہ ایک ایک آدمی سشن سے چھوٹ گیا۔ ٹھیک ہولی کے دن مجو بھیا لکھنؤ سے دونالی بندوق خرید کر لائے۔ رات میں پاسیوں نے مجو بھیا کے دوارے پر جشن کیا۔ رات بھر کڑاھیاں چڑھی رہیں۔ رات بھر رنڈیاں ناچتی رہیں۔ للّی نے اسی رات مسجد میں طاق بھر سے اور میلاد شریف کیا۔ مجو بھیا شامیانے کے نیچے گاؤ لگائے الوان اوڑھے سگریٹ پیتے رہے، ناچ دیکھتے رہے۔ وہ شرمیلے مجو بھیا جو جوان عورتوں کا راستہ چھوڑ دیتے۔ بات کرتے تو لڑکیوں کی طرح آنکھیں نہ اٹھاتے ہزار بارہ سو پاسیوں کے دیو استھان پر بیٹھے ہوئے خرانٹ عیاش کی طرح ناچ دیکھتے رہے۔ رام دین اپنے چکّی کے پاٹ ایسے سینے پر کارتوسوں کی پیٹی کا تمغہ لگائے ان کے گاؤ کے پیچھے بیٹھا رہا۔

مجو بھیا کے مکان سے گزرتی ہوئی سڑک پہ تھوڑی دور چل کر بائیں طرف مڈل اسکول تھا۔ جس کی جھنجھری دار چہار دیواری گوٹ کی طرح سڑک پر رکھی تھی۔ اس کے سامنے سڑک کے دوسری طرف اسکول کی فیلڈ تھی جسے لوگ میدان کہتے۔ یہاں بستی بھر کے چوپایا جانور چرا کرتے۔ لڑکے گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے۔ کبھی کبھی پتنگ کے "پیچ" بھی منعقد ہو جاتے۔ اس کے اطراف پٹھانوں، کبڑیوں اور جلاہوں کے ملے جلے مکان تھے۔ نئی لڑکی کی پکائی ہوئی روٹی کی طرح ٹیڑھی میڑھی دیواروں پر بوڑھی عورتوں کے بالوں کی طرح منڈھے چھپر جھولا کرتے۔ بڑھی کھوسٹ دیواروں سے جھانکتے سوراخوں سے رِستے ہوئے کالے نابدان رنگریزوں کی ناک پر رومال رکھ دیتے۔ کبھی کبھی نہیں، بلکہ اکثر یہ کالی غلاظت سودے سلف سے لدے پھندے بوڑھے بوڑھے آدمیوں کو اسکول کے لڑکوں کی قواعد کرا لی رہتی۔ عورتیں اپنی دہلیز کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر بچوں کے لئے مستراس بنا دیتیں۔ جن چبوترے کے چھپر میں کالو درزی کی مشین رکھی تھی وہاں سے جلیبی جان کے گھر تک دونوں طرف دوکانیں ہی دوکانیں ملتیں۔ جلیبی جان کے مکان کے سامنے سڑک کے دائیں طرف لمبے چوڑے میدان میں گویا سے لے کر ہاتھی کی قبر کے سائز تک کے ان گنت چبوترے ملتے جن پر ہفتے میں دو دن دوکان دار اپنی دوکانیں سجاتے۔ اس کے آگے سکلیوں اور ڈوم پاسیوں کی بستی فقیر کی گدڑی کی طرح پڑی سوکھتی رہتی جس پر بدصورت عورتوں، دریدہ غلیظ بچوں کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف مڑ کر دیکھنے سے مان پور کی مسجد کا گنبد نظر آتا جس کا صحن مجو بھیا نے پکا کرایا تھا۔ مسجد کے پاس ہی پرائمری اسکول کی جھکی جھکی سی عمارت دکھائی پڑتی۔ جیسے کوئی لڑکا میلے کپڑے پہنے ٹاٹ پر بیٹھا نقشہ بنا رہا ہو۔ پرائمری اسکول کے سامنے آبادی ہے اور پیچھے کھیت۔ اس کے لمبے چوڑے رقبے کو بانسوں کا سرسبز احاطہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے کمروں میں مختلف لوگ مختلف قسم کے کام کرتے۔ دن میں لڑکے پڑھتے ہیں، شام میں اگر کھیت کھلیان کا جھگڑا نہ ہوا تو "لکی لکورا" کھیلتے۔ نوخیز لڑکے اور لڑکیاں ان کے اندھیارے کمروں میں "نمبر دار" اور "ترجھون" کی نوٹنکی میں دیکھی ہوئی لیلیٰ مجنوں کی کہانی دہراتے۔ اغوا کی ہوئی عورتیں اس کے کمروں سے بھی برآمد ہوئیں۔ جب جتنی لال چرسیے اور مچھو تل کلوار نقل نکالنے میں بے ایمانی کرنے لگتے تو مجبوراً یہاں بھی دو چار دن جوا کھیل لیا جاتا۔ یہاں سے تیر کی طرح سیدھا گیارہ چھ سات گھروں کو پار کر کے چھوٹے خاں کے گھر کے پاس ٹھٹک جاتا۔ چھوٹے خاں کے چبوترے سے چپکے چھپر میں مان پور کا مکتب تھا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو نابینا مولوی صاحب قرآن مجید پڑھانے کے بہانے دن بھر بیٹھے اونگھا کرتے اور محلے سے آئی ہوئی روکھی سوکھی روٹی کھا کر جانوروں کی طرح ڈکارتے رہتے اور اس خدا کا شکر ادا کرتے جس نے ان کو مولوی صاحب بنا دیا۔ چھپر کے سامنے پختہ کنواں تھا جس کی جگت سے ملا ہوا حوض ڈھلتی ہوئی پنڈلیوں اور کلائیوں سے جگمگایا کرتا۔ یہ کنواں محلے کے بنجر علاقے میں سرسبز نخلستان کی طرح قہقہوں سے کھنکتا رہتا، سرگوشیوں سے گنگنایا کرتا۔

بقاتی جلاہے کی لڑکی گھونٹ سے چلوؤں میں پانی لے کر منہ دھو رہی تھی کہ فجو خاں نے اپنے بردٹھے کی آڑ سے کنکری ماری
اس نے بھیگی ہوئی آنکھیں سکیڑ کر پہلے فجو خاں کی جھانکتی ہوئی دھوتی دیکھی پھر ارد گرد کا مطالعہ کر کے اطمینان سے منہ
دھونے لگی۔ فجو خاں اس بردٹھے میں کھڑے رہے جس کے ایک کونے میں بکری کے کھونٹے کے پاس مینگنیاں پڑی
سلگ رہی تھیں۔ جیسے عود دان میں عود مہکتا ہو۔ پھر فجو خاں آہستہ سے دروازہ کھول کر باورچی خانے میں بوڑھی
اماں کو بجھڑے کا آٹا گوندھتے ہوئے دیکھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ بانس کی ڈھکن دار ڈلیا میں کنٹھے چونے میں لت پت
نٹی کی کلھیاں رکھی تھیں۔ انہوں نے ان کو نکال کر نیچے کا پرت دیکھا لیکن ایک بھی پیسہ نہ پا کر پلنگ کے نیچے
سے ٹین کا صندوق گھسیٹ لیا۔ ڈھکنا ان کے ہاتھ میں ہی تھا کہ پیچھے سے ان کی دولہن کلثوم نے ان کا ہاتھ
پکڑ لیا۔

"اللہ قسم ایک پیسہ نہیں ہے اس میں۔"

فجو خاں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تو دیکھ لینے دو ..... پریشانی کا ہے کی ہے۔"

بکس میں ہاتھ ڈالتے ہی وہ لپٹ گئی۔ فجو خاں نے اسے کمر سے اٹھا کر اتنے زور سے چارپائی پر دے مارا کہ وہ چیخ
پڑی۔ چیخ کی آواز سنکر چھوٹے خاں نے ہانک لگائی۔

"فجو ..... اے اے فجوا۔"

فجو نے باپ کی آواز جو سنی تو کلثوم کے کالے کالے گالوں کو ہاتھ میں لے کر مکار آنکھوں سے خوشامد
کرنے لگا۔

"سنا نہیں تو نے۔"

جلدی سے باہر نکل کر چوروں کی طرح وہ باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اسکول چھوڑا ..... کھیت کھلیان چھوڑا ..... اب بھیا کے یہاں اٹھنا بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ گھر
میں کوئی خزانہ گڑا ہے کہ میں کھود کھود کر دوزخ بھرتا رہوں۔ دس مرتبہ کہا کہ بھیا سے کہہ کر بزار کا ٹھیکہ
لے لے۔

"نیلام کے دن تو آویں ..... کہ ٹھیکہ کوئی کھٹیلا ہے ..... جب جی چاہے لے آؤں۔"

"سنتی ہو تم فجو کی اماں ..... باتیں دیکھو سالا کیسا بارہ ہزار کی کرتا ہے ....."

چھوٹے خاں تقریر رٹ چکے تھے ابھی انہوں نے ابتدا ہی کی تھی مگر فجو خاں بردٹھے میں غڑاپ سے الوپ
ہو گیا۔ کنویں کی جگت خالی پا کر وہ آگے بڑھ گیا۔ بشیر اپنے بھائی کی پرچوں کی دوکان پہ بیٹھ کر پڑیاں باندھتے

شعر کہتے اور کوئی خوش رو گاہک آجاتا تو گنگنا کر اُنھیں سنا بھی دیتے۔ جلیبی بھان کے چبوترے کے ایک مونڈھے پر بشیر کا بھی نام لکھا تھا۔ فجو خاں نے پہلے سوچا کر بشیر سے کچھ پوچھیں پھر خیال آیا کہ یہ خود ہی ایک آدھ بیڑی کے بنڈل پر دن بھر بیڑیاں لپیٹا کرتا ہے۔ اس کے پاس کیا ہوگا۔ تو تملی اپنے بسلطے کی چادر پر بیٹھے طلسم ہوشربا کے انداز میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ سامعین انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے سن رہے تھے۔ جیسے تراویح کی جارہی ہو۔ دوکان کے پیچھے نین ٹانگ کے تخت پر میلے کچیلے اُٹنگے پائجامے اور تہبند برسوں کے پرانے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ منو نے پتہ پھینک کر صدا دی۔

"اینٹ کی بیگم حکم کے تکے پہ چل گئی خانصاحب۔"

فجو خاں نے مسکرا کر اس کا جواب دیا اور کھمبوں اکائے ہوئے جھمروں دھے توتے کو گھسیٹتا بڑھ گیا۔ چنی لال ہر بیچ کے چھپر میں بیٹھا منگلو کوڑیاں ملا رہا تھا۔ اس نے فجو خاں کو دیکھ کر سلام کیا اور کوڑیاں پھینک دیں۔ مگر فجو خاں اڑے چلے گئے۔ منگلو قصائی کے دروازے پر ٹھمرتی کا کالا کالا لڑکا پیتل کی تھالی میں چنے کی دال کی ٹکیاں لئے کھڑا تھا۔ جنہیں تلا کرنے کا دامن اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبائے شلوار نے ازار بند میں باندھے ہوئے پیسوں کی گرہ کھول رہی تھی۔ فجو خاں کی نظر اس کے پیٹ پر جم گئی۔ پھر کھمبوں کا طواف کرتی ہوئی تلی کے آنگن میں داخل ہو گئی۔

"کا چلے آوے۔۔۔۔۔ چچا؟"

"آؤ۔۔۔۔۔ آؤ۔"

تلی نے روٹی کو توے پر ڈال کر اپنے گھٹنے لہنگے میں چھپا لئے۔ گھائیں کی روٹی کو گھماتے ہوئے بولی۔

"کیسے آئے گیو اتنے دخت ہ۔"

تلی کے لہجے کی ٹھنڈک سے وہ کھٹک گیا۔ لیکن ہونٹوں پر آئی ہوئی اگل ہی دی۔

"آج ایک اٹھنی دے دیو۔۔۔۔۔ کل بارہ آنے لے لیو۔"

"کا نمنی پیڑے مانگن ہیں۔"

"یہی سمجھ لیو۔"

"پیسے تو بھائی اتنے وخت ہیں نائیں۔۔۔۔۔ کہو تو ترکیب ایک بتلائے دیں۔"

"بتاؤ۔" وہ بہت دور سے بولا۔

"چندا کل ایک گئی بھبائن میں۔"

"گئی۔۔۔۔۔ اور چندا رہ۔"

"ارے ہاں.... تراب کے ری ہو بینے ایک آدھ پڑی۔"

"ہوں..... تبھی منگو جی لال چرپتے کے یہاں بیٹھے تھے ...... میں کہوں کہ میناڈ کی کو زکام کب سے ہوا۔"

"امینٹھ لیو دو ایک روپیہ تم ہو۔"

"ہے اتنے وقت اکیلی ۔"

"اتنے وخت روٹی پانی کے وخت کون سگا بیٹھا ہو ہے ..... منگو ہوئے تو ہوئے۔"

"منگو تو کوڑی پھینک رہے ہیں .....ادھر سے چلے جائیں۔"

"چلے جاؤ۔"

فجو خاں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ چھپر میں چارپائی پر بیٹھی چندہ ٹپی کھا رہی تھی۔ چونک کر کھڑی ہوگئی سرہانے سے چادر اٹھا کر اوڑھنے لگی۔

"فجو بھیا نے بھیجا ہے تم سے بات کرنے کو ...... دروازہ بند ہے باہری۔"

فجو خاں نے کھنکار کر کہا اور اس کے بھاری بدن کے نشیب و فراز کو گھورنے لگا۔ وہ جب کھڑی رہی تو فجو خاں نے خود جا کر اپنا اطمینان کر لیا۔ اور اس کے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور بڑے متفکرانہ انداز میں بولے۔

"تراب نے ایک گڈی سے کہا تھا کہ پستول تمہارے پاس ہے ...... اب وہ گڈی بھیا کے پاس آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر چندہ نے پستول نہ دیا تو پولیس کو خبر کر دی جائے گی۔ پولیس خود برآمد کرائے گی۔"

"چاہے جیسی قسم لے لیو...... میں نائیں جانت ہوں پستول۔"

"دیکھو پولیس کو پہلے ہی سے سن گن ہے مگر بھیا نے پانوں نہ ٹیکا کیونکہ تم اگر پولیس کے ہاتھ پڑ جاتیں تو معلوم نہیں کیا حشر ہو گیا ہوتا تمہارا اس لئے۔"

"تراب نے گنی بھی نہیں چھوڑیں۔"

"گنی۔"

"ہاں ہاں گنی.... جب کل ہمن کرا آئی ہیں ہر دوئی سے تب ہی کہہ رہا ہوں آج۔"

اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ فجو خاں نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ لیا اور گردن کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیسے بنیا گولک ٹٹولتا ہے۔

جلیبی جان کی صورت تو ایسی تھی جیسے بھینس کی ران پر چاقو سے آنکھیں گود دی جائیں۔ ناک کی لکیر کھینچ کر دو نقطے رکھ دیئے جائیں۔ مگر خدا نے گلا ایسا نور کا دیا تھا کہ بڑی بڑی اکھاڑے دار طوائفیں بے سُری ہو جاتیں۔ مان پور کے جوانوں کو پنڈت درگا سہائے کی شادی یاد تھی۔ کلکرا دان کی کوٹھی کے سامنے شامیانے میں لکھنؤ اور فیض آباد کی طوائفوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جب جلیبی جان اپنے سازندوں کے ساتھ پہونچیں تو محفل تو خیر محفل تھی طوائفیں تک منہ پھیر پھیر کر ہنسنے لگیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی بدصورت ہیجڑے نے پیشوا زپہن لی ہو۔ طبلے پر رام دلارے کی تھاپ پڑتے ہی جلیبی جان نے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر جو تان لگائی تو محفل سانس لینے لگی۔ ساز تو دیئے گئے۔ جلیبی جان نے بیٹھے بیٹھے بالصیب اثنا کی وہ غزل چھیڑی جس میں اس کے نصیب کی ساری کا فرما جرائی دھڑک اٹھی ہے۔

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی"

تو بوڑھے بوڑھے رئیس جن کے سینوں اپ فارس کے دیوان دفن تھے ایک ہاتھ سے آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگے۔ دوسرے ہاتھ سے جیبیں خالی کرنے لگے۔ رتلامؤ کے جواہر سنگھ کے پاس جب کچھ نہ رہا تو کانوں کے دُر اتار کر پھینک دیئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جلیبی جان اور ان کے سازندے برسوں اس مجرے کی روٹی کھاتے رہے۔ منی جان کے جوان ہوتے ہی جلیبی جان نے گھنگرو اتار کر اس کو پہنا دیئے۔ اور آپ چولہا پھونکنے لگیں۔ منی جان اور ننھی جان دونوں بے سُری تھیں۔ گانا ان کے پیشے کا بہانہ تھا۔ صورت شکل میں بھی آدمی کا بچہ تھیں مگر جوان تھیں۔ جوانی اور رنڈی کی جوانی۔ مان پور کے سارے بے فکرے چوپٹی اٹھنی کا بندوبست کر کے رنگی جنگی ٹھور کا ایسی گول مٹول طوائفوں میں بیٹھ کر ڈرامنس بول لیتے۔ مجو خاں اور بکس مان پور کے دوسرے ہنگاموں کی طرح یہاں بھی پیش پیش رہتے۔ چندہ سے چاندی کے چھنچھناتے ہوئے چار روپے لے کر مجو خاں سیدھے بکس کے یہاں پہونچے۔ اور اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنی جیب پر رکھ لیا۔ بکس نے یہ خزانہ جو دیکھا تو جلدی جلدی ہاتھ پاؤں دھو کر جامدانی کی قمیص میں چاندی کے زنجیر دار بٹن لگائے اور لاٹھی لے کر مجو خاں کے ساتھ ہو لیا۔ جلیبی جان کی چھوٹی بیٹی ننھی جان پر صاد تھے ہو کر جب یہ لوگ باہر نکل آئے تو مجو خاں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر خالص مہاجنی انداز میں بجایا۔ روپے کی شیریں کپکپاتی آواز کیطرح بکس کے اعصاب بھی جھنجھنا اٹھے وہ اب تک سوچ رہا تھا کہ آخر مجو خاں کو چار روپے ملے کہاں سے۔

"یار بکس اگر تقاریر سے یاری ہو جائے تو ایک کے چار بن سکتے ہیں۔۔۔۔ اور کل پھر"

"یار مجو بھیا کے کھیت میں آ لو بو کر تو ہم بھر پائے جب دیکھو بیا ٹھینا دیا کرت ہیں کہ جون ہاتھن سے بھیا کے کھیت سے سونا نکالے ہو انہیں ہاتھوں سے اپنے یہاں کچھ کر کے دکھاؤ۔۔۔۔ اور یہ بہانہ لے کے بیٹھ

پینے کا بھی ٹکا نہیں دیت میں بیٹے کے ایک ٹھکانہ بھیا کا رہ گیا ہے۔ . . . . باقی تو سب خیر صلّا ہے۔"

"یار کہیں سے ایک روپیہ بناؤ . . . . . تو چار بازی کھیل لی جوئیں۔"

"بھیا کسن پائے تو کھال اتار ڈالی جیبیں۔"

"یہ بات تو ہے۔"

"اچھا آج چھوڑ دو . . . . . شاید کل تک کوئی بندوبست ہوئے جائے۔"

دوسرے ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کی طرح تراب کا نام بھی چٹخارے دار کہانی کہنے والوں کی زبان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ لیکن جندہ کے نام کو پَر لگ گئے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر گائے کے گوشت کی جھوی سر پر رکھ کر جب وہ گھروں میں جاتی تو نگاہیں چونک چونک کر اس کے جسم کے خطوط میں وہ کہانی ڈھونڈھنے لگتیں جس پر جوار کے سب سے نامی آدمی کا نام لکھا تھا۔ منگلو بھجڑے کی روٹی اور اوجھڑی کا سالن دے کر اس کی گداز پیٹھ پر اتنے گھونسے مارتا کہ اس کے پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی تو وہ جھیل ہی رہی تھی لیکن فجو خاں کے ملکوٹوں کی ٹیس سی وہ بے قرار ہو گئی۔ بیچ کی دیوار پھاند کر جب للی کی آواز اس کے آنگن میں آ کر کڑکڑانے لگاتی تو وہ دانت پیس کر رہ جاتی اور اسے یقین ہو جاتا کہ ان حرافہ نے بھی نے چتول والی بات داغی ہے۔ اسی بدمعاش نے فجو خاں کو گئی کی چھپنا چھپن سنائی ہے۔ منگلو دوکان بڑھا کر آیا تو اس نے کھال میں نمک بھر کر رکھ دیا اور چھوٹی سے بھیجے اور گردے نکال کر نئی بنی ہوئی ڈلیا میں رکھتے وقت اسنے طے کر لیا کہ اگر جوتے ہی کھانا ہیں تو فجو خاں اور پولیس کے سپاہیوں کے کیوں کھائے جائیں۔ بھیا کے کھائے جائیں جن کی ایڑی کے نیچے للی کی ہٹیا بھی دھری ہے۔

اساڑھ بھرنے لگا تھا۔ مگر پوس کی طرح آسمان ننگا پڑا تھا۔ بادلوں کے پیرہن موسم کے پٹارے میں تہہ کئے رکھے تھے۔ سفید دیواروں سے گھرے ہوئے صحن میں دو سیاہ شہتیروں پر ایک آڑا شہتیر جڑا ہوا تھا جیسے فٹ بال کی فیلڈ سے ایک "گول" اکھاڑ کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ آڑے شہتیر میں لمبا سا پنکھا جھول رہا تھا۔ مجو بھیا کی مسہری کے نیچے پڑے ہوئے جوتوں سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر آدمی بھر اونچا اسٹول رکھا تھا۔ اس پر ایک چمار کا لڑکا مشین کی طرح نصب پنکھے کی ڈوری لئے جھوم رہا تھا مگر مجو بھیا کروٹیں بدلے جا رہے تھے۔ بے آب و گیاہ میدان میں سبزے کی جستجو کرتے آہو کی مانند۔ نیند معلوم نہیں کتنی دور نکل گئی تھی۔ مجو بھیا ایک ایک خواب ایک ایک خیال دل کے نہاں خانے سے نکال لائے۔ لیکن جلتی ہوئی پلکوں میں صلح نہ ہوئی۔ پھر مرغے بولنے لگے۔ اذانیں ہونے لگیں۔ استاد مدّی

آ گئے۔ اکھاڑے میں پٹھے زور کرنے لگے۔ نوکر اصطبل میں جھاڑو دینے لگے۔ سائیس گھوڑوں کے کھریرے کرنے لگے۔
لیکن مجو بھیا سنبھل کی روئی کے تکیوں پر پڑے رہے۔ پھر استاد مدی نے کنکھیوں سے مجو بھیا کی مسہری دیکھ کر پورن کو نیم کی مسواک توڑنے کا اشارہ کیا۔ پورن نے لاٹھی سے مار کر مسواک توڑی۔ لنگوٹ میں لگے ہوئے چاقو سے اسے صاف کیا اپنے ملتے ہوئے بدن پر انگوچھا ڈال کر مجو بھیا کے پائینتی کھڑا ہو گیا۔ دیر کے بعد مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر مسواک لے لی۔

"زور نہیں کروں گا...... رام دین کو بلواؤ.... لکراوال جاویں گا۔"

پورن مڑ گیا۔ مجو بھیا مسواک کو دانتوں میں دبا کر اٹھے۔ تہبند کی گرہ درست کرتے ہوئے۔ دوسرے مکان کے اس بڑے سے کمرے میں گھس گئے جو غسل خانے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ منواں پاسی نے شیخ مرحوم کے وقت کا سوٹ کیس کھول کر چوڑی دار پائجامہ اور کڑھا ہوا کرتا نکالا۔ ازاربند ڈالنے کے لئے چھانکر کی لکڑی کو صاف کر کے رکھا۔ شیروانی میں چاندی کے بٹن لگا کر گردین نے ناشتے کے تیار ہونے کی اطلاع دی لیکن بھیا نے نفی میں سر ہلا کر رام دین کے ہاتھ سے جوتا لے لیا جو بڑی دیر سے اپنے انگوچھے سے چمکا رہا تھا۔
رام دین اپنے کندھے سے بندوق لگائے کنپٹی پر بہتا ہوا تیل انگلیوں سے پونچھ رہا تھا۔ بھیا کو آتا دیکھ کر اس نے بندوق کے فیتے کو گردن میں پہن لیا۔ بجلی کو چمکتی ہوئی کاٹھی پہنا کر سائیس لے آیا تھا جسے لپک کر ایک رکاب پکڑ لی۔ اور مجو بھیا سوار ہو گئے۔ مان پور سے لکراؤں کی کوٹھی تک ان گنت سلاموں کو سر کی جنبش سے قبول کرتے ہوئے مجو بھیا نے پورٹیکو میں سینے تک لگام کھینچ کر بجلی کو روکا۔ جب تک رام دین اپنے گھوڑے سے اترے۔ لکراؤں کے سپاہی نے چھل بل دکھلاتے ہوئے بجلی کی لگام پکڑ لی۔ مجو بھیا اس کی گردن تھپتھپا کر اتر آئے۔ کسی خدمت گار نے لپک کر چق اٹھا دی۔ پنڈت درگا سہائے بھاری تخت کی مسند پر گاؤ لگائے چاندی کی گڑگڑی پی رہے تھے۔ جھاگ ایسی سفید دھوتی ان کے کولھوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ گردن کی سنہری زنجیر ان کے ننگے پیٹ کے رقبے کو چھو رہی تھی۔ مجو بھیا کے سلام کا مسکرا کر جواب دیا اور اپنے پاس ہی تخت پر بٹھا لیا۔ خدمت گار پائیدان پر جوتے اتار کر قالین پر پولے پولے قدم رکھتا آیا اور مجو بھیا کی پشت پر کھڑے ہو کر پنکھا ہلانے لگا۔ چھت گیری سے طلوع ہوتے ہوئے فانوس کے نقش و نگار دیکھتے ہوئے مجو بھیا کو درگا سہائے نے مسکرا کر دیکھا۔

"کیسے نکل پڑے صبح صبح۔"

"آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔"

"ٹھنڈائی نہیں آئی۔"

درگا سہائے نے خدمت گار کو دیکھ کر جھڑکی دی۔

"آ رہی ہے۔"

اس نے آہستہ سے کہا اور پنکھا تیز کر دیا۔

"تحصیل جا رہے تھے۔"

"جی..... نہیں..... سنا تھا کوئی جوڑ حیدر سے گھوڑا منگوایا ہے آپ نے۔"

درگا سہائے نے پہلو بدل کر تفخر سے گردن ہلائی۔

"منگوایا ہے۔"

"ایسی دھوم مچی ہے علاقے میں کہ سن سن کر نیند اڑ گئی۔"

پنڈت کی پشت کے دروازے کا پردہ ہٹا کر ایک کالا کالا لڑکا ہاتھوں میں کڑے پہنے آیا اور دو پلیٹوں میں پکوان اور دو گلاسوں میں ٹھنڈائی تخت پر رکھ کر تھالی ہلاتا چلا گیا۔ درگا سہائے نے ایک پلیٹ اور ایک گلاس جو بھیا کے سامنے کر کے ٹھنڈائی کا ایک گھونٹ لیا۔

"تو گھوڑا دیکھنے آئے ہو تم..... میں کہوں کہ دن میں چاند کیسے نکل آیا..... کسی سے کہو گھوڑا نکالے۔"

آدمی مجسم تسلیم ہو کر پنکھا صوفے پر رکھتا ہوا چلا گیا۔

پھر پورٹیکو کے فرش پر ٹاپوں کی آواز آئی۔ جو بھیا اپنی بے قراری چھپائے بغیر گلاس رکھ کر اٹھ پڑے۔ سپاہیوں کے ہجوم میں گھوڑا کھڑا تھا۔ سفید گھوڑا..... تصویروں کا گھوڑا..... کہانیوں کا گھوڑا..... خوابوں کا گھوڑا..... جب وہ ہنہنا کر گردن اٹھاتا تو معلوم ہوتا طاؤس ناچ رہا ہے۔ لمبی گردن کو سوار کو چھپالے۔ جو بھیا خوابناک آنکھوں سے اس کی شان دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔ پھر درگا سہائے جو بھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے۔ مغرور مسکرائے۔ جیسے شکاری اپنے شکار کو پھنستا ہوا دیکھ کر مسکرائے۔

"وہاں دیکھ رہے ہو جو..... چائے کی پیالی میں پانی دیدو تو پی جائے۔"

"گھوڑا نہیں ہے پنڈت جی..... پری ہے۔"

"ہوں..... تو پسند آیا..... اڑا پاؤ تو اڑا کر دیکھو۔"

"ضرور اڑاؤں گا..... ضرور اڑاؤں گا۔"

ایک سپاہی نے لگام بڑھا دی۔ دوسرے نے رکاب تھام لی۔ جو بھیا کو لے کر گھوڑا بجلی کی طرح نکل

گیا۔ درگا سہانے گاؤ سے پشت لگائے گڑگڑی پیتے رہے۔ فرش کے قالین کے پھول چنتے رہے جب مجو بھیا اندر آگئے تب انہوں نے نگاہ اٹھائی۔

"چال میں کیسا ہے ؟"

"جادو..... ٹونا"

مجو بھیا کی شیروانی پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خدمت گار ان کی پشت پر کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ آرام کرسی پر دراز تھے۔

"آیا کتنے میں ہے پنڈت جی"

مجو بھیا نے بڑی حسرت سے ان کا منہ دیکھ کر پوچھا۔

"گھڑی بھر رو پے میں۔"

بڑی تمکنت سے پنڈت جی نے یہ الفاظ ادا کئے۔ پھر دانتوں میں منہال دبالی۔

"پھر بھی کچھ تعداد بھی تو ہوگی۔"

مجو بھیا گڑگڑائے۔

دیر کے بعد پنڈت جی نے منہال نکالی۔ اٹھ کر بیٹھے۔ منہ پر آئے ہوئے جملے کی دھار دیکھی اور مسکرائے۔

"پٹواری کے کاغذات میں جو تمہاری جائیداد ہے نا اس سے زیادہ ہے تعداد..... تینتیس سو روپیہ پورے تینتیس سو۔"

مجو بھیا جیسے گڑگڑی کا انگارہ اچھل کر گر پڑا ہو۔ ان کی دونوں بھوئیں اچک کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ رنگ اڑ گیا۔

"ایک فصل میں ایک کھیت کا لہسن تینتیس سو کا بیچتا ہوں پنڈت جی" کہتے کہتے ان کی آواز بھرا کر ڈوب گئی۔

"ہوں..... کلوا مراؤ چونسٹھ سو کا بیچتا ہے۔"

مجو بھیا کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خدمت گار نے پنکھا روک لیا۔

"تو کلوا مراؤ سے جوڑ ملایا ہے آپ نے میرا۔"

"نہیں..... وہ میری رعایا کا بیٹا ہے اور تم نوکر کے۔"

پنڈت جی کے لہجے میں وہی ٹھنڈک تھی۔ وہی زہر تھا۔

"دیکھا جائے گا پنڈت جی۔"

تجو بھیا دروازے کی طرف مڑ گئے۔ باہر نکلتے نکلتے انہوں نے سنا۔

"توپ لگوا دینا . . . . . نو دولت کہیں کا۔"

رام دین کو شہسواری کے جتنے کرتب یاد تھے ان سب کا اس نے آموختہ پڑھ لیا لیکن تجلی کی گرد بھی نہ ملی۔ جب وہ مرکان پہونچا تو سائیس اس کو تھاما رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا لگا کر اٹھا لیا گیا۔ رات کا کھانا لگا کر اٹھا لیا گیا۔ عشا کی نماز کے بعد بھیا کمرے سے نکلے۔ پنکھے کے نیچے لگی ہوئی مسہری پر لیٹتے ہوئے نگاہ کی۔ سارے نوکر قطار باندھے کھڑے تھے۔

"جاؤ تم لوگ۔"

سب بے آواز قدموں سے سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔

پھر صبح ہوئی۔ للی چلتی ہوئی آئی۔ لیکن کمرے کے بند دروازے پر بیٹھے ہوئے پاسی نے کہہ دیا کہ بھیا کا حکم ہے کہ کوئی نہ آنے پاوے۔ وہ چلی گئی۔ دوپہر کو بوڑھا راج دین بتا و لمبی مونچھیں چڑھائے ہوئے آیا۔ دالان میں تھم کھڑا کیا۔ جوتے اتارے۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر ان کی مسہری کے پائنتی بیٹھ گیا۔ مگر نگاہ نہ اٹھی۔ وہ بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

مغرب کی نماز کے وقت جب گردین نے لیمپ جلا کر رکھا۔ دروازے کھول دیئے تو اس کو اور پنکھا کھینچتے ہوئے رام رتن دونوں کو راج دین نے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ کھسک کر مسہری کے تکیے کے پاس آ گیا۔

"حکم ہو . . . . . تو لکراواں کا گھوڑا کھول کر گھر کے تھان پر باندھ دیا جائے۔"

"گھوڑا چاندی کا نہیں ہوتا جسے سنار گھلا کر دوسرا بنا دے۔ اور پتہ نہ چلے کہ یہ مان پور کا ہے یا لکراواں کا۔"

"اس کا بھی بندوبست ہے مالک۔"

"کیا۔"

"حاجی میٹھے۔"

"ہوں۔"

بڑی دیر تک سناٹا رہا۔ پھر بڑی دیر تک راج دین سرگوشیاں کرتا رہا۔ عشا کی اذان کے وقت وہ باہر نکلا اور کسی نوکر کو حکم دیا کہ للی کو ساتھ لے کر آئے۔ پھر جب بھیا راج دین اور للی کمرے کے باہر نکلے تو پہرہ

پیٹنے کا تھا۔ دو نوکر تلی کو کھینچے گئے۔

منگلو کی دھوتی میں بندھے کپڑوں کی گٹھری رکھ کر رجب دھوبن چلی گئی۔ تو چندہ نے وہ شلوار نکالی جس کے پائنچے پر سرے پھول کڑھے تھے وہ قمیص نکالی جس کے دامن پر لال لال گلدستے تھے۔ پھر بالوں سے صاف کئے ہوئے بتاشے طوق اور چھا نجھیں پہن کر وہ کپڑے لئے کوٹھری میں چلی گئی۔ چھپر کے طاق میں دھرے ہوئے ٹین کے آئینے میں آنکھوں کا کاجل برابر کیا۔ ناچتے ہوئے طاق میں گہنے اور بھیا رکھ کر تابے کی رکابی بند کی۔ اور گھر میں تالا ڈال دیا۔ چھنک چھنک کی آواز سنکر رجب کی اماں نے چپاتی پکاتے ہوئے ہاتھ روک لئے۔

"منگلو کی دولہن ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ"

"کا بولو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھیا ہیں"

"ہاں"

رجب کی اماں نے آٹے میں ڈوبی ہوئی ربے کی کھنکنی سے کمرے کی طرف اشارہ کیا وہ طباق آٹے کی لگن کے پاس رکھ کر دھڑ دھڑ کرتے ہوئے کلیجے کو سنبھالے رک گئی۔ پھر من من بھر کے پاؤں اٹھاتی دالان کی طرف چلی۔ مجو بھیا کھیت سے آئے تھے۔ چوڑی دار پائجامہ اتار کر تہمد پہن چکے تھے۔ کرتا اتارتے ہوئے دیکھا تو دالان کے در میں چندہ کھڑی شرمارہی تھی۔

"کیا ہے۔"

انہوں نے اپنی روایتی گرجدار آواز میں کہہ تو دیا۔ لیکن ذہن کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تراب کی معشوقہ کے جسم کی آن دیکھنے کی حسرت نے ان کو ڈس لیا۔ جب وہ کمرے کی دہلیز پر آ گئی تو مجو بھیا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"چلی آؤ۔"

تراب کی موت کے بعد ان گنت نگاہوں کے عرفان کی دولت سے چندہ نے اس تھرتھراتی ہوئی آواز میں چھپے ہوئے معنی دیکھ لئے۔ مجو بھیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تراب سے نکلے ہوئے قد کے تراب سے کہیں تندرست اور وجیہہ مجو بھیا دیو کی طرح تخت پر بیٹھے تھے ان کے پاؤں نیچے فرش پر رکھے تھے۔ چندہ نے ہارتے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤں چلا اور اپنا سر مجو بھیا کے موٹے موٹے پیروں پر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔

"ارے ارے"

مجو بھیا نے گھبرا کر اس کا سر اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ تو وہ پھیل کر چندہ کے گالوں پر آ گئے۔ سر اٹھا تو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں سے کاجل پھیل گیا تھا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ سینے کے فراز پر جھلاراطوق

رکھا تھا۔ سرخی مائل کلائیاں ان کے گھٹنے پہ تھیں۔

"منہ سے بولو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوا۔"

"مورے پاس پستول نائیں ہے تراب کا۔ دولت نائیں ہے تراب کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس تراب کی بد نامی میرے سر پہ ہے۔"

اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

"تم میری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر پولیس تھانے نہ بھیجو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لّلی کا تو میں سے عداوت ہے۔ اگر تراب ان کا موری کوٹھری میں اٹھانے لے گئے تو میں کیسے بچانے لیتوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہیں ناگذین ہوں تو مجرم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دن مورے پاس آئیں کہ دوا کے لئے تین روپے دے دیو۔"

"دوا کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاہے کی دوا۔"

"وہی جو ادکا مرض ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوڑھ۔"

"مرض تو نہیں ہے اسکو اب۔"

"بھیا ہر تیسرے دن جب محلہ بھر سو چکلک ہے تو دوا منت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو میں ان کا روپے دے دیوں ۔ ۔ ۔ اب اس دن سے مورے پاس تراب کی گنتی جیج ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک گنی میں بھنائے ضرور ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری ملنے کی سب میرے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منگلو سے چرائی ہیں۔ منگلو سے نہ چراؤں تو جوئے میں ہار نہ جائیں۔"

جندہ کی کلائیاں گھٹنے پر رکھی رہیں۔

جندہ کے جانے کے بعد مجو بھیا جو لّلی کے دستر خوان سے سیر ہو چکے تھے۔ لّلی کے تصور سے مکدر ہو گئے۔ ان کے کان میں کسی نے کہا کہ جندہ صحیح کہتی ہے۔ لّلی کا مرض گیا نہیں ہے۔ یہ مرض جاتا ہی نہیں ہے اور یہ مرض اڑکر لگتا ہے مجو بھیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اڑکر لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ اور گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کھانا ٹھنڈا ہوئے رہا ہے۔"

رجب کی اماں نے گلاس میں پانی بھر کر کہا۔ مجو بھیا دستر خوان پر بیٹھ تو گئے لیکن کھانا نہ کھایا گیا۔ کتنی جھوٹی ہے یہ لّلی کہتی تھی اس کو مرض کبھی تھا ہی نہیں۔ قادر بھی یہی کہتے تھے۔ حاجی مٹھے بھی یہی کہتے تھے۔ وہ تو ٹھیک ہے ان سب کو یہی کہنا چاہئے۔ وہ یہ سوچتے رہے پھر اٹھ کر باہر گئے۔ نوکر کو بلا کر راج دین کو ساتھ لانے کا حکم دیا اور اسے تاکید کی کہ دوا جلد از جلد حاصل کرلی جائے۔ اور راج دین سیدھا لّلی کے یہاں پہنچ گیا۔

ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ دالان میں کھانا لگ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں جلتی ہوئی ڈبیا کی روشنی میں مجّو بھیا نے دیکھا کہ للّی آنچل میں چھپائے کوئی چیز لئے آ رہی ہے۔ وہ کمرے میں کھڑے رہے۔ للّی نے باورچی خانے کی دہلیز ہی پر ایک سینی میں اپنی گود خالی کی۔ اور کمرے میں چلی آئی۔ دالان میں جلتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ للّی کے آتے ہی کمرہ جگمگا اٹھا۔ عہدِ فراموشی کا گریزاں دامن مجّو بھیا کے ہاتھ سے نکل گیا۔ للّی کے بدن سے ان کے دونوں بازو بکھر گئے۔ ڈیوڑھی میں للّی کے غروب ہو جانے کے بعد جب مجّو بھیا نے گوشت کے پیالے میں نوالہ ڈبویا تو رجّب کی اماں نے ایک چینی کی پلیٹ ان کے آگے بڑھا دی۔

"للّی بڑے لائی رہیں"

چینی کی سرخی پلیٹ میں دہی میں ڈوبے سفید سفید بڑے رکھے تھے۔ مجّو بھیا کا ہاتھ ان پر منڈلا کر رہ گیا۔ ان کو معلوم ہوا جیسے کسی سانولی لڑکی کے بدن پر برص کے دھبّے پڑے ہوں۔ انہوں نے پلیٹ سامنے سے ہٹا دی۔ ذہن سے اس گھناؤنے تصور کو جھٹک کر انہوں نے بڑے خلوص سے نوالہ منہ میں رکھا مگر منہ کا مزہ بدمزہ ہو چکا تھا۔

ککراواں کی کوٹھی کا پہرے دار گلے میں بندوق پہنے ٹہلتا رہا اور آنکھ سے کاجل اڑائے جانے والے فنکار گھوڑا نکال لے گئے۔ جے پور کے کٹھار میں جمار کی رانی سے راج دین نے وہ ابال اتار لئے جن پر درگا سہائے آف ککراواں کی معزز انگلیاں مٹ ملگی کرتی تھیں۔ رام دین اور دلارے نے بیلوں کے سینگ رنگنے والی سیاہی سے "نقرہ" جانور کو "ابلق" بنا دیا۔ راج دین اس پر چڑھ کر رانی داتا دھنک پور اپنی بڑی بیٹی کی سسرال پہونچا۔ وہاں "ابلق" کو "مشکی" بنا کر داماد کو سوار کرایا اور خود دس بارہ ٹٹو بنائے کر اسکے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ضلع ہردوئی کے رام نگر میں اتر پڑا۔ رام نگر کے سکھیا۔ پاسیوں کی ناک اور اپنے سمدھی کے سامنے حاجی میٹھے کی دواؤں کے پشتارے کے ساتھ ساری کہانی بھی رکھ دی۔ ترکیب استعمال کا نسخہ سمجھا کر آندھی کی طرح رجب پورہ آیا اور حالات کی نبض ٹٹولنے لگا۔ یہاں ادھم مچا ہوا تھا۔ پنڈت درگا سہائے آف ککراواں کی تحریری رپورٹ کے موصول ہوتے ہی کئی تھانوں کی رپورٹ حرکت میں آگئی۔ دور دور تک جانوروں کی بازاریں کھنگال ڈالی گئیں۔ تھانے دار نے چائے کی میز پر مجّو بھیا سے کہا کہ پنڈت جی کو آپ ہی پر شک ہے۔ مجّو بھیا نے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کیا اور کہا۔ اصطبل تو آپ کے سامنے ہے۔ کوٹھریوں کے قفل اگر دیکھنا ہوں تو نوکر سے کنجی لے کر چلے جائیے دیکھ لیجئے۔

مغرب کی نماز کے بعد منگو کھانا کھا کر میلی دھوتی سے منہ پونچھتا ہوا چھپر کے طاق میں بیڑی ٹٹولنے

لگا۔ روپے پر ہاتھ پڑتے ہی اس کی کھنیں نکل آئیں۔ مڑ کر دیکھا تو چندرہ پتیلی کی تری میں روٹی رگڑ رگڑ کر کھا رہی تھی۔ چولھے کی گرمی اور چراغ کی روشنی میں اس کا چہرہ محرم کی روشن چوکی" کے سرخ گلاس کی طرح چمک رہا تھا۔ منگلو نے روپیہ اٹھا کر لنگی میں لگا لیا۔ چراغ سے بیڑی جلاتے ہوئے اسے ایک خیال نے بھڑ کی طرح کاٹ لیا" کہیں روپیہ کھوٹا تو نہیں ہے۔" اس نے بیڑی دانتوں میں دبالی۔ چراغ لئے ہوئے تیر کی طرح کوٹھری میں گھس گیا۔ جھینگے سنار کی طرح اس نے چاندی کو پرکھنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے کھنچے ہوئے ہونٹ پھیل گئے۔ روپیہ لنگی میں واپس چلا گیا۔ چندرہ کو روٹی کھاتا چھوڑ کر دروازے کو دھڑاک سے بند کرتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ چندرہ نے جلدی جلدی روٹی ختم کی اور سیدھی طاق پر پہونچی۔ پھر اس کی آنکھوں نے دیکھا کر چہ سیٔ کے یہاں بیٹھا ہوا منگلو کوڑی پھینک رہا ہے۔ اسنے مسکرا کر الگنی پر سے اپنا پھولدار جوڑا اٹھا لیا۔ اور کوٹھری میں چلی گئی۔ دیر تک چراغ کی روشنی میں اپنے جسم پر دھار رکھتی رہی۔ دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے چندرہ نے دیکھا کر للی اپنی دہلیز پر کھڑی تو تو کر کے کتے کو بلا رہی ہے۔ اس نے خنک ہوا کے جھونکے سے اپنا مہین چادر اتھین کر سر ڈھک لیا۔ اپنی جھانجوں کو چھُن چھُن کرتی للی کے سامنے سے گذر گئی" کہیں پانی برسا ہے" جلتے ہوئے دن کے بعد رات کی ٹھنڈی ہوا کی گدگدی پر اُسے خیال آیا۔ حسین موسم کی اس پروائی نے تر آب کی چوٹ چمکا دی۔ پرائمری اسکول کے سنسان علاقے کی طرف جاتے ہوئے جب وہ بھنگیوں کے جھونپڑوں کے سامنے سے گذری تو اسنے دیکھا کر سکرو مہتر دیوار سے ٹیک لگائے پڑا ہے۔ تاڑی کے گھڑے لٹے پڑے ہیں۔ تھوڑی دور پر بھنگیوں کے لڑکے ڈھولک اور لیزم بجا بجا کر ناچ رہے ہیں ان کے حلقے میں اکڑوں بیٹھا ہوا سکھبند کوئل کی طرح کوک رہا ہے۔ دیوار میں لگی ہوئی مشعل کی روشنی میں کوئل کی طرح کوکنے والا سکھبند کوئل ہی کی طرح چمک رہا ہے۔ اس نے چادر اکھینچ کر اپنا منہ اور چھپا لیا۔ میدان سے گذر کر جب وہ" چھوٹے اسکول" کی پشت پر پہونچی تو اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ جنا توں سے باغ تک سناٹے میں سناٹا تھا۔ بانس کی باڑھ میں شیشم کے پیڑ کے پاس ایک شگاف تھا۔ وہ خندق میں اتر کر آہستہ سے کپڑوں کو بچاتی ہوتی آڑی آڑی چلتی ہوئی" چھوٹے اسکول" کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ کنپٹی تک کھنچی ہوئی آنکھیں کھول کر اسنے چبوترے کو تاکا جسکے کونے پر تاڑ کا درخت سپاہی کیطرح کھڑا تھا۔ اسکی چھتری پر برسات کے چاندنی کی روشن مشعل جل رہی تھی۔ وہ پشت کے چبوترے کی سیڑھیوں پر ٹھٹک گئی۔ پھر اچھل پڑی۔ مجو بھیا نے پیچھے سے دبوچ لیا۔

"بڑی دیر کر دی تم نے۔"

"منگلو کی وجہ سے"

اور اس کا منہ بند ہو گیا۔ مجو بھیا اُسے اپنے کلیجے سے لگائے اس کمرے میں لے آئے جس کی کھڑکی

سے دور پر کھڑا ہوا گول پھاٹک نظر آتا تھا۔ لیکن سلاخوں کی کھڑکی سے آتی ہوئی چاندنی کی چادر میں مجو بھیا نے چندہ کی آنکھیں دیکھیں جب یہ آنکھیں جن میں موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ ابرو کی محراب میں لانبی لانبی پلکیں سجا رکھی تھیں۔ مجو بھیا نے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

ان طویل ملاقاتوں کی تیز روشنائی میں مجو بھیا کے دل پر بنی ہوئی تلی کی تصویر میلی ہو گئی۔ حاجی مٹھے کی دوائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ چاندی کی سفید جلد دھندھلی ہو گئی۔ گھوڑ "سمند" ہونے لگا۔ عید کے کپڑوں کی آرزو میں چاند رات کی طویل ساعتوں پر تھیلا۔ تب رانے بچے کی طرح مجو بھیا نے راج دین کو چاندی کے دو سو روپیوں کی گٹھڑی باندھ دی۔ کمال پور کے میلے میں راج دین نے لکڑ والوں کے گھوڑے کا جوڑ خرید لیا اور بارہ بنکی کے کسی گاؤں میں پڑ رہا۔ جب میلہ اجڑ گیا اور داگ ٹھنڈے ہو گئے تو اس نے بروہی کے جنگل میں خریدے ہوئے گھوڑے کو کھانا کر چھپنک دیا۔ کمی کا غازول پیدا لیپٹی ہوئی رسید پشلو کی اندرونی جیب میں رکھی۔ پھر جو پابند بے ہوئے لکڑ والوں کے گھوڑے پر مرتے سے خریدا تھا چار جامہ رکھ کر جو چڑھا تو مان پور کے وہاں پر دم لیا۔ مان پور کے جنگل میں آگ کی طرح خبر پھیل گئی۔ لکڑ والوں کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ مختار عام بازار کے نیلام کی گفتگو کے بہانے آئے۔ گھوڑا دیکھا۔ چاندی کے ایال کا چیتور جھڑ گیا تھا جلد مٹر و ہی ہو گئی تھی۔ بدن کھوٹ گیا تھا۔ مگر کنوتیوں کے وہی تیور تھے۔ پاؤں ٹیکنے میں وہی جلال تھا۔ مختار عام کی سوچتی ہوئی نگاہ دیکھ کر ہاتھی ایسے مجو بھیا کی چھاتی میں شیر کا دل کانپ گیا۔ مختار عام کے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک وہ آرام کرسی کی قبر میں پڑے رہے۔ پھر گھر کے سامنے میدان میں ٹہلنے لگے۔

دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی۔ فجو خاں چنی لال حرسیئے کے چھپر میں بیٹھے کھنجڑی پر ہولی سن رہے تھے کہ سامنے سے منگو نکلا۔ کسی منچلے نے ہنک لگائی۔ لیکن وہ راس خریدنے کا بہانہ بنا کر بچ کر چھوٹ گیا۔ گلیارے کے موڑ پر منگو کے مڑتے ہی فجو خاں نے بیڑی کو چلکی میں لے کر آخری دم لیا اور اٹھ پڑے۔ کسی نے ہاتھ تک پکڑ لیا۔ مگر وہ جھٹک کر چلے آئے۔ چندہ برو ٹھے میں سیٹھی مونج کی ڈلیا بن رہی تھی۔ فجو خاں کو دیکھ کر اس نے تیور چڑھا لئے۔ فجو خاں کھٹکے تو مگر چندہ کے گریبان میں دھرے ہوئے مٹھائی کے دونے پر ہاتھ ڈال دیا۔ چندہ نے ڈلیا اور سوجا ایک طرف پھینک خانصاحب کے سینے پر مضبوط ہاتھوں کا وہ دوہتڑ مارا کہ بھونچکے رہ گئے۔ چندہ طاق سے کھال ادھیڑنے والی چھری اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"جات ہو خانصاحب کہ پکاروں محلے کو۔"

فجو خاں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ جاتے جاتے ایک خونیں نگاہ ضرور ڈالی۔ چندہ کا صحت مند بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔ باہر نکل کر خانصاحب نے حواس درست کر کے نگاہ کی تو اپنے کھیت کے کونے میں تلی بیٹھی تھی۔

وہ بڑی دیر تک اس کے کونے سے کولھا لگائے بیٹھے رہے اور کلیجے کے پھپھولے پھوڑتے رہے۔

حاجی میٹھے جب نماز پڑھنے چلے گئے تو للّی نے قلعی دار سینی میں کرکری کرکری برفیوں کے پرت جمائے ان پر کٹھل کے کبابوں کا گلدستہ رکھا۔ لہنگے میں بھنور بناتی ہوئی سینی اٹھا کر چلی۔ مجّو بھیا کی ڈیوڑھی میں اس کا دل دھڑکنے لگا۔ آپ ہی آپ۔ مگر وہ چلی گئی۔ باورچی خانے میں ٹین کی ڈبیا جل رہی تھی۔ اس کی خاموش چاپ پر آٹے کی ڈلیا میں اینڈتے ہوئے چوہے خرگوش کی طرح غائب ہو گئے۔ اس نے سینی دہلیز پر رکھ دی۔ اور کمرے کی تیز روشنی کو دیکھتی ہوئی چلی۔ تیسرے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس میں قدم رکھتے ہی چندہ اپنی قمیص درست کرتی ہوئی مجّو بھیا کی گود سے اٹھ پڑی۔ للّی کو ایسا لگا جیسے سکرو مہترنے اپنی ڈلیا اس پر الٹ دی ہو۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن جیسے کسی نے پیروں میں کیلیں ٹھونک دی ہوں۔ وہ مجسمے کی طرح نصب ہو کر رہ گئی۔ اسی پلنگ پر اسی پھولدار بستر پر یہی مجّو بھیا مجھے چومتے چومتے نڈھال کر دیتے تھے۔ اور آج اسی پلنگ کے اسی پھولدار بستر پر "کلموہی" چندہ بیٹھی اس کی چھاتی پر مونگ دل رہی ہے۔

"کھڑی کیوں ہو؟"

مجّو بھیا ڈکارے۔ وہی مجّو بھیا جن کی سانسیں نہ سماتی تھیں۔ جو اسے دیکھ کر گھگھیانے لگتے تھے۔ وہی مجّو بھیا اسے دھتکار رہے تھے۔ چندہ اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر دوپٹہ اوڑھ رہی تھی۔ للّی نے اپنے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے کو سنبھالا۔ اور گویائی کی ساری قوت جمع کر کے آہستہ سے بولی۔

"میں جلانے رہی ہوں"

"ہاں ..... دفعان ہو جاؤ۔"

مجّو بھیا نے دوسرا جوتا مارا۔ اور کان تک کھینچی ہوئی کمان کی طرح صابر للّی دفعتاً ٹوٹ گئی۔

"تو آپ یہی دن کے لئے مارے گئے رہیں؟"

پلنگ سے اٹھتے ہوئے مجّو بھیا کے چہرے پر اپنے حملے کا ردِّ عمل دیکھے ہوئے بغیر وہ مڑ گئی۔

"للّی"

مجّو بھیا کی ڈہاڑ نے دالان ہی میں للّی کو ڈس لیا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ مجّو بھیا نے اپنا دھنی ایسا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور ایسے لہجے میں بولے جیسے داروغہ کسی عادی مجرم کو تاکید کر رہا ہو۔

"اگر یہ بات کسی کو معلوم ہو گئی تو اچھا نہیں ہو گا۔"

للّی نے آنکھیں اٹھا کر مجّو بھیا کو گھورا جن کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں

اٹل رہی تھیں

"بڑائی کے لئے ایک ستارہ کافی ہیں ..... لگا دوں گھوڑا۔"

مجو بھیا کے کان پر جیسے کسی لڑکے نے "چھچھوندر" داغ دی ہو۔ ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور للی کے پھول ایسے گال پر شبرات کا پٹاخہ چھوٹ گیا۔ للی کا داہنا کان سن سن کرنے لگا اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"دور ہو حرام زادی ..... بدمعاش ..... نہیں تو بوٹی بوٹی کٹوا کے پھنکوا دوں گا۔"

للی کے گورے گورے پیروں پر پنکھ لگ گئے۔ وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح ڈیوڑھی میں گھوم گئی۔ دروازے پر ایک آدمی ہانپتے ہوئے بیڑی کی رسی پکڑے کھڑا تھا۔ حاجی میٹھے اس کا تنفس دیکھ رہے تھے جیسے حکیم قارورہ دیکھ رہا ہو۔ للی اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ جب حاجی اندر آئے تو اس نے پیار سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کبابوں کا کٹورہ برہیوں کی ڈلیا میں رکھ کر پلنگ پر کھینچ دیا۔

"آؤ۔"

حاجی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"مورجی ماندہ ہے آج۔"

"اچھا۔"

حاجی نے کھانا کھایا۔ پھر ڈلیا چھینکے پر ٹانگ دی۔ گھڑونچی کے پاس بیٹھ کر وضو کیا اور عشا کے لئے چلے گئے۔
وہ آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ فجر کی اذان ہوگئی۔ مگر وہ جاگتی رہی۔

ساون کی دوپہر تھی۔ سورج سیاہ بادل کی دلائی اوڑھے بیچ آسمان میں دبکا تھا۔ ابروں کے گھنگھور جھپک رہے تھے۔ کچے مکانوں کی مٹی نمک کی طرح گھل گھل کر گلیاروں میں بہہ رہی تھی۔ جوان جسم کی خوشبو کی طرح بوجھل اور خنک پروائی دلوں کو گرما رہی تھی۔ مجو بھیا کے دالان میں یہاں سے وہاں تک جاجم بچھی تھی۔ ایک سرے پر مخملی قالین پڑا تھا۔ مجو بھیا اور ان کے کچھ زمیندار دوست گاؤ تکیوں سے لگے بچھو کے ڈنک کی طرح کٹیلی مونچھیں انگلیوں میں مروڑ مروڑ کر رقص دیکھ رہے تھے۔ سازندوں کے نیم دائرے کے سامنے ترکھون کی نوٹنکی کی گلاب جان سرخ ساری باندھے سرخ چولی پہنے ناچ رہی تھی۔ بجلی بھرے ہوئے بدن کا انگ انگ بول رہا تھا۔ ہنس رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ جس کے سامنے ایک گھٹنے پر بیٹھ کر کاجل لگی آنکھیں مٹکا مٹکا کر بھاؤ بتلاتی وہ نہال ہو کر اور زور زور سے اپنی مونچھیں مروڑنے لگتا۔ دل دھڑک رہے تھے ردے چل رہے تھے کہ تھانے کا سپاہی پنڈت پائیدان پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے جسم سے بھیگا ہوا پورا اتارا کندھے پر پڑے ہوئے رومال

سے منہ پونچھ کر مجو بھیا کو سلام کیا۔ رنگ خراب ہو گیا۔

"خیر ہے پنڈت۔"

مجو بھیا نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ گلاب جان گھنگھرو باندھے پاؤں کی ٹھوکر مار کر پہلے کھڑی ہو گئی پھر سلام کر کے سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ مجو بھیا کے دل میں پٹنے لگے تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ لکراواں کی ریاست اور دولت گھوڑے کو سانپ کے منہ کی چھچھوندر نہ بنا دے۔ انہوں نے احباب سے معذرت کی اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"میں بھیا اپنا احسان چکانے آیا ہوں۔"

مجو بھیا کا دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا کہ زبان بند ہو گئی۔

"لکراواں والے پہلے ہی سے چوکنا تھے۔ رہی سہی کسر آپ کے قصبے کی مسماۃ للّی نے پوری کر دی۔ اس نے آج تھانے آکر بیان دیا ہے کہ وہ گھوڑا جو آپ کملاپور سے لائے ہیں وہ لکراواں کا ہے۔ اس کے ایال قینچی سے کاٹ دیئے گئے ہیں اور رنگ خود اُس کی دواؤں سے بدلا گیا ہے اور وہ عدالت میں یہ بیان دینے پر تیار ہے۔"

"پھر؟"

مجو بھیا کو سانپ سونگھ گیا۔

"وہ تو بڑی خیریت ہوگئی۔ بڑے تھانیدار پیشی پر گئے ہیں چھوٹے تھانیدار اور عملہ راج گھاٹ کی ڈکیتی میں تحقیقات پر گیا ہوا ہے میں ہی لے دے کے ایک خواندہ سپاہی ہوں۔ اس لئے مسماۃ للّی کا سابقہ مجھ ہی سے پڑا۔

"ہوں . . . . . کون ہے یہاں؟"

"ہاں بھیا؟"

ایک نوکر بھیگی دھوتی باندھے اندر آیا۔

"پنڈت جی کو شربت پانی پلاؤ۔"

کرتے کی ایک جیب تو رنڈی پر نچھاور ہو چکی تھی۔ دوسری جیب میں ان کا ہاتھ سرسرانے لگا۔

"للّی کے ساتھ کون کون تھا پنڈت؟"

"مجو خاں اور بجّن۔"

مجو بھیا دھواں دھواں پھیر رہے تھے۔ گلاب جان کی بولتی ہوئی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شرابی دعوت میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ دوستوں کے ساتھ وہ پھیکے پھیکے قہقہے لگاتے رہے اور ہونٹوں کو مانگے کی مسکراہٹ پہناتے رہے۔ پانی کے تھمتے ہی گلاب جان اور دوستوں نے رسماً اجازت چاہی اور مجو بھیا نے ان کو سپاہیوں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ مغرب کی اذان نہیں ہوئی تھی لیکن اندھیرا پھیل گیا تھا۔ باہری چھپر میں راج دین، بھگا، دلارے، رام دین اور بہت سے آدمی بیٹھے چلمیں پی رہے تھے۔ اندھیرا گہراتے ہی گھوڑے کھینچے گئے۔ گاؤں کے گھوڑے پر راج دین بیٹھا مشکی پر دلارے اور "کلی" پر مجو بھیا۔ پانی برستا رہا لیکن یہ لوگ کلیارے کی اتھلی نہر میں چھپ چھپ کرتے چلتے رہے۔ انجولی کے جنگل میں چند رے درختوں کے جھنڈ کے پاس یہ لوگ اترے۔ مجو بھیا نے تھرتھراتے ہاتھوں سے کلی کی لمبی پتلی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اسے اس نگاہ سے دیکھا جیسے عاشق اپنی دولہن بنی ہوئی محبوبہ کو غیر کے ڈولے پر بٹھاتے وقت دیکھتا ہے۔ رات اور جنگل کے سناٹے میں چھتنار درختوں پر بوندوں کی ایسی ماتمی لے بج رہی تھی جیسے محرم کے باجے۔ پھر مجو بھیا نے اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور کنکھیوں سے راج دین کو دیکھا جس کے ہاتھ میں بجالی چمک رہی تھی۔ کلی کے عریاں بازو کی طرح چمک رہی تھی۔ ان کے قریب سے ہٹتے ہی راج دین کا بوڑھا ہاتھ اٹھا اور بجالی گھوڑے کے سینے میں تیر گئی۔ وہ گولی لگے ہوئے ہرن کی طرح اچھلا لیکن راج دین کے مشاق ہاتھوں کی مار نے اسے ڈھیر کر دیا۔ راج دین اور دلارے نے آناً فاناً اس کی کھال نکال کر ایک گٹھری میں باندھ لی۔ سر اور سم ایک گڈھے میں دفن کر دیئے۔ جب وہ انجولی کے جنگل میں دھوم مچاتے ہوئے بیتے کے پل سے گزرے تو راج دین نے گٹھری سمیت کھال جسم سے پانی میں پھینک دی۔ مجو بھیا کے چھپر میں جھانکروں کا الاؤ لگا۔ سب لوگ بدن سینکتے رہے۔ مجو بھیا بیٹھے بیٹھے پوری کیتلی کی چائے پی گئے۔ پانی ختم گیا تھا۔ پہرہ پڑنے لگا تھا۔ مجو بھیا دیکھ رہے تھے کہ وہ باہری کمرے میں لیٹے ہیں۔ جان کو پگھلا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے۔ پنکھے کو کھینچتے کھینچتے نوکر سو گیا ہے اور وہ پسینے میں ڈوبے کروٹیں بدل رہے ہیں کہ للی آ گئی۔ اسکو بھیگا ہوا دیکھ کر پنکھا کھینچنے لگی۔ کھینچتی رہی جب تک وہ اٹھ کر نہ بیٹھ گئے۔ جب تک اسنے ڈانٹ کر نوکر کو جگا نہ دیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ان کے سر دی لگ گئی ہے۔ رات کے دس بج چکے ہیں۔ رجب کی اماں اپنے بیٹے کے گھر گئی ہیں۔ نوکر سب منڈو میں۔ للی آئی اسی طرح لہراتی ہوئی۔ لہنگے میں بھنور بناتی ہوئی۔ انگیٹھی کی راکھ جھاڑ کر آگ بنا کر اس کے پاس رکھی اور گرم گرم چائے بنا کر اسے پلائی اور مزید حکم کی منتظر کھڑی ہے۔ پھر مجو بھیا نے دیکھا کہ نوکر دوپہر میں روٹی کھانے گئے ہیں۔ بٹیا پانی برس رہا ہے دالان تو دالان کمروں میں بوچھار سے ٹخنوں ٹخنوں پانی بھرا ہوا ہے۔ للی اپنے گورے گورے گھٹنوں تک بھیگا ہوا سرخ لہنگا چڑھائے تاشش لئے پانی الچ رہی ہے۔ آنکھوں سے تھکن ٹپک رہی ہے لیکن ہاتھ "کل" کی طرح چل رہے ہیں۔ پھر مجو بھیا نے

دیکھا ان کا "بجلی" بیمار ہے۔ وہ حاجی میٹھے سے لڑ لڑ کر نئی نئی دوائیں منگا رہی ہے خود بنا رہی ہے اور اپنے سامنے کھڑی پلوا رہی ہے۔ سارے نوکر تھک کر جا چکے ہیں۔ مگر للی اپنے حسین کولھوں پر پھول سے ہاتھ رکھے اس طرح گھوڑے کی کیفیت دیکھ رہی ہے جیسے یہ گھوڑا گھوڑا نہیں اس کا بیٹا ہے اس کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ للی پھر آگئی مٹکتی ہوئی چمکتی ہوئی للی۔ اور ناخوش ہوتے ہوئے بولی کہ بھیا کا پیاز سوکھ رہا ہے۔ نوکروں کے کہنے پر نہ جاؤ پانی لگواؤ۔ اور قلمی آم کے باغ کی فصل پہ چھبیس سو کی نہ بکنے دوں گی۔ ستائیس سو تو فلاں آدمی میرے سر مڑھے جا رہا تھا۔ کسی نوکر نے للی کو چھیڑنے کے لئے ہوائی چھوڑ دی کہ "بھیا" نئے کھیت میں گور دھنیا کو چرے جا رہے ہیں اور للی توے کی روٹی چھوڑ کر لہنگا پھڑکاتی ہوئی اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر نوکروں کو میٹھی آواز اور کھٹے لہجے میں ڈانٹنے لگی۔ گلاب جان کے لہنگے کے پھولوں کی طرح چمکدار آواز اور اس کے اندر چھپے ہوئے بدن کی طرح قاتل معانی نے تھوڑی دیر کے لئے مجو بھیا کو بے حس کر دیا۔ پھر جیسے کسی طرف سے چندرہ ایک جھانجھیں بجاتی ہوئی آئی۔ اور ان کی موٹی موٹی کلائیاں پکڑ لیں۔ ہتھیلی کے پیالوں سے ان کا چہرہ چھلک گیا۔ چندرہ ان کی پھنگی کی طرح موٹی موٹی انگلیاں سہلانے لگی۔ مجو بھیا اس کی آنکھیں دیکھتے رہے۔ چمکدار آنکھیں، جن میں سارے لکھنؤ کے گوٹے کی دوکانیں ہضم ہو گئی ہوں۔ گہری آنکھیں جن میں ککراواں کا ہاتھی تو خیر ایک طرف، تراب ایسا پانی دار آدمی اپنی ساری ہیکڑی سمیت ڈوب چکا ہو۔ چندرہ کے گریبان میں چھپی سونے کی پوٹلیاں جن پر تراب کی ہیبت اپنے نام کی لاٹھی کھینچے پہرہ دے رہی تھی۔ بڑی دیر تک ان کی چوڑی چوڑی ہتھیلیوں پہ پڑی رہی۔ چندرہ کے بدن کے وہ سارے "ہفت خواں" جن میں مان پور کی سورما نگاہیں تھک کر دم توڑ چکی تھیں۔ مجو بھیا کے بھاری بھرکم قدموں کے نشانوں کے چراغ جلائے ان کے قدموں میں دیوالی جلاتے رہے۔ مجو بھیا پر نشہ طاری ہونے لگا تھا۔ ان کے تصور نے چندرہ کے بدن سے ایک ایک قطرہ نچوڑ کر پی لیا تھا۔ چندرہ کے عریاں بازو ان کی گردن کو لپیٹے فضاؤں میں اڑنے لگے تھے کہ ککراواں کے تعلقدار پنڈت درگا سہائے کے نعرے نے ان کو ڈس لیا اور وہ ملبلا کر ہوش میں آگئے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ جھن چوکیدار کا صافہ ان کی کمر میں بندھا ہے سارے نوکر آنکھوں میں آنسو بھرے بھیگی بلی کی طرح دبکے کھڑے ہیں۔ اور جب وہ تعلقہ دار کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اپنی ڈیوڑھی سے نکلے تو مقتول تراب کے چھوٹے بھائی نے ان کے منہ پر پڑے ہوئے رومال کو الٹ دیا۔ پھر قہقہوں کا وہ زلزلہ آیا کہ ان کے اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے رسیاں تڑا کر نکل گئے۔ جب وہ مان پور کے گنج کے پاس پہونچے تو للی اپنی سبز چنری ڈھلکائے نظر آئی کولھوں پر کھنچے ہوئے لہنگے پر وہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اور ایسی خطرناک ہنسی ہنس رہی تھی جیسے ان کے ہونٹوں نے بھاگتے ہوئے ہرن کو گولی مار کر اپنے کلیجے سے لگا یا تھا۔ مجو بھیا نے تلملا کر پہلو بدلا ہی تھا کہ سامنے ہاتھی پر سوار درگا سہائے نظر آئے۔ مختار رام مشکی گھوڑے کی

رکابوں پر کھڑے تھے۔ ہاتھی کے پیچھے سپاہیوں کا پرا لاٹھیاں کا ندھوں پہ دھرے ٹھٹھول کر رہا تھا پھر انہوں نے دیکھا کہ بھری عدالت میں جج نے چوری کے جرم میں چھ مہینے کی سزا کا حکم پڑھ کر سنا دیا۔ اور چھ بلم ان کے کلیجے میں اتر گئے۔

"راج دین"

"بھیا"

"کیا دیر ہے"

"حاجی بیٹھے کی گاڑیاں بالامئو کی بزار کے لئے لد رہی ہیں . . . بانگ دو جائیں تب اٹھا جائے"

"رام دین"

"بھیا"

"بھور ہوتے ہی تم تھانے جاؤ اور کملا پور کی بازار سے خریدے ہوئے گھوڑے کی رسید دکھلا کر چوری کی رپٹ لکھا دو"

"بہت ٹھیک"

ہولناک سناٹے نے "جاگتے رہو" کی مدقوق آوازوں کو نگل لیا۔ آوارہ کتے بھونکتے بھونکتے تھک گئے تو دیواروں کے سایوں اور دو کانوں کے پٹوں کی آڑمیں پڑ کر سو گئے۔ وہ روشن ستارے جن کو مان پور والے دوسرے گاؤں والوں کی طرح "ہنی ہنا" کہتے تھے۔ پیپل کی پھنگی پر دیوں کی طرح جل اٹھے۔ جانوروں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی نحیف آوازیں کنمنانے لگیں۔ مارکین کے کفن کی طرح دھندلی دھندلی سپیدی اس مشرق پر پھیلنے لگی جو کئی صدیوں سے مرا پڑا تھا۔ جاگیرداری نظام کی بیمار قدروں کی طرح ستارے سونلانے لگے۔ ٹھنڈی ہواؤں کی پریاں اپنے پروں پر نئی صبح نئے دور کے پھولوں اور کارناموں کی خوشبو لے کر تجو بھیا کے آنگن میں اٹھکھیلیاں کرنے لگیں تو باہری دروازہ بالعت کی طرح بولا اور سب دم بخود ہو گئے۔ دھرم پال سپاہی کہہ رہا تھا۔

"حاجی میٹھے گئے"

راج دین نے جلتی ہوئی چلم کا آخری کش لگا کر چلم دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی۔ بتاور ایسی مونچھوں کو ہتھیلی سے برابر کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی بھگا دلارے رام دین اور تجو بھیا بھی کھڑے ہو گئے۔ آج تجو بھیا کا لشکر قدموں سے اٹھایا نہ جا رہا تھا۔ محرم کی ساتویں کو جب فتحو منیہار نے بیماری کا بہانہ کر کے عباسی علم اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور چھوٹے خاں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں تو تجو بھیا نے وہ آستینیں چڑھالی تھیں جن کے کلف دار ململ کو للی نے بڑے ریاض سے پائیدان کے ڈھکنے پہ چنیا تھا اور گلے میں ڈولچی ڈال کر عباسی علم

اٹھا لیا تھا۔ عملے کر چلتے ہوئے انہیں اپنی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب استاد مدتی نے گرج کر "علی کا شکر" کا نعرہ مارا تھا اور ہزاروں کے مجمع نے کلیجہ پھاڑ کر دلوں کو ہلا دینے والی آواز میں "یا حسین" کی تکرار کی تھی۔ لیکن آج مجو بھیا چلتے ہوئے ایسی اذیت محسوس کر رہے تھے جیسے دو عباسی علم دونوں ہاتھوں پر جھول رہے ہوں۔ وہ راج دین کے پیچھے اور دوسروں کے آگے چل رہے تھے۔ اونگھتے ہوئے کتے کی گردن اٹھا کر گرانے پھر ان کے براق کپڑوں کے کفن ایسے سفید جلوے میں منہ ڈھانپ کر رہ جاتے۔ تیز تر سے کی سیڑھیاں چڑھ کر ان کے موٹے موٹے ہاتھ لے آہستہ سے تھپکی دی۔ چارپائی چرچرائی۔ چھاگلیں گنگنائیں۔ شیشے کی چوڑیوں نے سرگوشی کی، اور کنڈی بجی اور دروازہ کھل گیا۔ مٹی کے تیل کی ڈبیا طاق میں جل رہی تھی۔ اس کی لال روشنی میں چندہ کھڑی تھی۔ کسیلی قمیص اور میلی شلوار پہنے چندہ نے دروازے سے ہٹ کر انگڑائی لی۔ تو اس کے جسم کے خطوط میں چراغ جل گئے۔ الجھے ہوئے کالے کالے بال کرنگ پڑے ہوئے تھے۔ لانبی لانبی آنکھیں نیند سے سینچی ہوئی تھیں۔ مجو بھیا نے اسے مخمور نگاہ سے دیکھا۔ دل کی آرزو لہو بن کر ہاتھوں میں دوڑنے لگی۔ لیکن ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو وقت کی نزاکت نے پکڑ لیا۔ رام دین دہلیز پر ہی کھڑا تھا۔ مجو بھیا کا اشارہ پا کر وہ اندر آ گیا دوسرے آدمی للی کے دروازے پر پہونچ گئے۔ چندہ کی نیم باز آنکھوں سے اپنی پیاسی آنکھوں کو بغلگیر کر کے مجو بھیا نے پوچھا۔

"منگلو کو گئے کتنی دیر ہوئی؟"

"حاجی کے ساتھ ہی وہ بھی گئے ہیں۔"

چندہ اور للی کے گھروں کی مشترکہ دیوار پر رام دین لاٹھی لگا کر چڑھ گیا۔ بلی کی طرح اتر کر اسنے دروازہ کھول دیا۔ مجو بھیا گردن جھکا کر بازو دستہ شانہ بچاتے ہوئے للی کے صحن میں آ گئے۔ رام دین پنجوں کے بل چلتا ہوا گیا اور للی کے دروازے کی زنجیر کھول دی۔ راج دین، بھوکا اور دلارے تینوں آ گئے۔ مجو بھیا نے اپنا مخملی جوتا دروازے پر چھوڑ دیا جس کو چندہ نے اٹھا لیا۔ چھپر میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک خالی چارپائی پر زمین کے رنگ کی سکڑی ہوئی دری پڑی تھی۔ سرہانے کثیف تکیہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے پلنگ پر للی لیٹی تھی۔ چت لیٹی ہوئی تھی۔ سیاہ لہنگے کی گوٹ سے چاندی کے گھٹنے جھانک رہے تھے۔ سنگ مرمر کی سڈول پنڈلیاں اندھیرے میں جھپک رہی تھیں جیسے "پنڈشانجے" جل رہے ہوں۔ خرّاٹے لیتی ہوئی للی کی کرتی میں وہ خربوزے دھڑک رہے تھے جن کی مٹھاس سے نزاب کی زبان ہمیشہ کے لئے بندھ گئی تھی۔ باہوں کے خنجر دونوں پٹیوں پر پڑے تھے۔ جیسے ان کے قبیضے مجو بھیا کی کلائی نے توڑ دئے ہوں۔ میلے تکیہ پر جھبڑے جھبڑے بالوں کا انبار رکھا تھا۔ جن کی لمس کی خاطر سان پور کے کتنے ہی شانے قلم ہو جانا گوارا کر سکتے تھے۔ مجو بھیا اس کے بے پناہ حسن کے طلسم میں اسیر کھڑے رہے

پھر ان کی گردن ہلی۔ شاید مچھر نے بائیں گال پر کاٹ لیا تھا۔ اور ان کی گردن ہلتے ہی رام دین کی انگلیاں سنگسی کی طرح اس کی گردن کی صراحی میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پھڑ پھڑائی مگر دلارے اس پر سوار ہو گیا۔ وہ ذبح کی ہوئی بیٹر کی طرح مٹی میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ رام دین نے اسے آلو کے بورے میں ٹھونس کر بھر دیا۔ رام دین نے بورے کو پیٹھ پر لاد لیا۔ دلارے نے تلی کا مکان اندر سے بند کیا۔ پھر چندرہ کے گھر میں کھلنے والی کھڑکی کو تلی کی طرف سے بند کر کے دیوار پھاند کر چندرہ کے گھر میں ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ سڑک پر بڑے بڑے بیلوں کا ادھا کھڑا تھا۔ بورا اس میں ڈال کر جاجم بچھا دی گئی۔ اور بیل چوک جھپٹنے لگے۔ ہاہاکار کرتے ہوئے جیتے کے اونچے پل پر ادھا روک لیا گیا۔ تو بھیا نے بجلی کو دوڑا کر ہر طرف سے اطمینان کر لیا پھر طلوع ہوتی ہوئی صبح کے مٹیالے اندھیرے میں بورا دھار میں چھوڑ دیا گیا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ تو بھیا کارتوسوں کی پیٹی ڈالے اور کندھے پر بندوق رکھے رکابوں پر کھڑے اچھلتے، شور کرتے ہوئے پانی کو تکتے رہے۔

ان پورے ایک دل میں خود رو پیڑ کی طرح یہ بات جم گئی کہ جوان تلی بوڑھے حاجی کے پوپلے منہ پر تھپڑ مار کر کسی داشتہ کے ساتھ نکل گئی ہے۔ معلوم نہیں کتنے آدمیوں نے اسے "منگلو" کے بازار میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کے ساتھ ہاتھ بھر کے گلاس میں لسی پیتے دیکھا تھا۔ اس واقعے نے دوسروں پر خیر جو کچھ اثر کیا ہو۔ لیکن منگلو نے جب جمعہ کے دن بال بنوائے اور چاندی کے تاروں کا ایک گچھا اس کی قمیص کے دامن میں گر پڑا تو چپ سادھ لی۔ عصر کی نماز کے پہلے ہی چندرہ نے کھانا پکا کر جھینکے کے سپرد کیا۔ دروازہ بند کر کے چارپائی کھڑی کی۔ اور ابٹن لگا لگا کر نہائی پھر اجلے کپڑے پہن کر دیر تک ٹین کی پشت کے آئینے میں کاجل لگی انگلی آنکھوں میں پھیرتی رہی۔ پھر جب چادر اٹھا کر چلی تو اس کے لال لال گالوں کو دیکھ کر منگلو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کہاں چلدیں اتنے سبیرے۔"

"بھیا کے یہاں۔"

وہ تو چلی گئی لیکن منگلو بڑی دیر تک کھٹیا پر لیٹا ہوا جلے ہوئے ناریل کو گڑگڑاتا رہا اور ذہن پر رینگتے ہوئے بچھوؤں کو پکڑ پکڑ کر مارتا رہا۔

ایک محبّت کی کہانی

غازی صلاح الدین

میں نے آخری دنوں میں تم سے کہا تھا کہ اب میں تمہیں یا تمہارے متعلق کبھی کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس لئے کہ جو باتیں لکھ دی جاتی ہیں وہ اپنی عصمت کھو دیتی ہیں۔ میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو صرف ہم دونوں کا اثاثہ ہیں اور اگر میں نے انہیں لکھ دیا تو وہ ہمارے قابو سے نکل کر عام لوگوں کی ملکیت بنیں گی اور اجنبی ہمارے اتنے قیمتی راز جان لیں گے۔

اور آج جب میں تمہارے متعلق لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے تم سے کہی ہوئی وہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ آج بھی میرا یہ خیال ہے کہ لکھے جانے والے لفظوں کو کبھی اپنی ذاتی گھر کی باتوں کا رازدار نہ بنانا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ جو باتیں ہم اپنی زندگیوں کی کہانیوں میں کہتے ہیں وہ اپنے وقت، اپنے مقام، لہجے اور کہنے والے کے مزاج کی گہری گرفت میں ہوتی ہیں۔ وہ صرف اسی وقت زندہ ہوتی ہیں اور لکھ دیئے جانے کے باوجود ان کی حیثیت بے جان پتھروں سے زیادہ نہیں رہتی۔ وہ پرائی ہو جاتی ہیں۔ موسم کے ساتھ ساتھ معنی بدلتی رہتی ہیں۔

میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ جو باتیں لکھ دی جاتی ہیں۔ وہ اپنی عصمت کھو دیتی ہیں۔

اور اسی لئے میں تمہارے متعلق لکھ رہا ہوں۔ تمہارے متعلق بھی اور اپنے متعلق بھی ـــ اس لئے کہ یہ باتیں اب میرے لئے ایسا بوجھ بن گئی کہ میں انہیں اٹھا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ جن جذبوں کا اظہار ہیں میں ان کی سر بازار تذلیل کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں سرِ عام رسوا دیکھنا چاہتا ہوں۔

تم جانتی ہو ثروت سلطانہ کہ میں اچھا داستان گو نہیں ہوں۔ مجھے کہانی سنانے کا وہ ڈھنگ نہیں آتا جس میں واقعات اسی تسلسل سے بیان کئے جاتے ہیں جس طرح وہ ہوئے ہوں۔ میرے یہاں ہمیشہ جذبات زیادہ اہمیت پاتے ہیں۔ اور جو کچھ گنی چنی کہانیاں میں نے لکھی ہیں ان میں شاعری کی سی جذباتی شدت تو ہے لیکن وہ کہانی پن نہیں جو پڑھنے والوں کو اس تجسس کا شکار بناتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کہانی میرے ان تصوراتی خاکوں سے مختلف ہے یہ میری اپنی زندگی کی کہانی ہے اور اس کے بے شمار واقعات کو میں نے اپنے قدموں کے نشانوں سے بنایا ہے۔ لیکن جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک دم بہت سے جذبے اور احساسات

تیز ہواؤں کی طرح چاروں طرف سے مجھ پر یلغار شروع کر دیتے ہیں پھر ترتیب میرے بس کی بات نہیں رہتی ـــ
یادیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ پہلے مجھے دیکھو ـــ ہر منظر کہتا ہے۔

یہ کہانی لکھتے ہوئے ایک اور دشواری میرے سامنے ہے۔ میں یہ کہانی شروع سے لکھوں گا اور پوری لکھوں گا لیکن مجھے اس کا انجام معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آخری صفحوں تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر کیا گذرے گی اور یہ کہانی ختم ہوتے ہوتے میرے پاس کیا چھوڑ جائے گی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ میں نہ صرف اس کہانی کے واضح حدود بتالوں بلکہ یہ بھی طے کرلوں کہ میرا اس کہانی کے ساتھ رویہ کیا رہے گا۔ جو کچھ ہوا ہے وہ کیوں ہوا ہے اور اس سلسلے میں میرا ردعمل کیا حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کہانی صرف تمہاری نہیں ہے ثروت ـــ یہ میری بھی ہے۔ شاید صرف میری ہے۔ تم تو صرف اسٹیج پر سے گذر گئیں اور گذرتے گذرتے تم نے میرے ہاتھ تھامے اور اپنے مکالمے بولے ـــ لیکن میں ـــ میں جو اکیلا ہوں یہاں کھڑا ہوں اور میرے سامنے حاضرین ہیں ـــ میں ان سے کیا کہوں گا ـــ؟

میں یہ کہانی کیسے شروع کروں ـــ؟

مجھے یاد نہیں میں نے تمہیں بتایا تھا یا نہیں مگر میں سلیم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص کسی نظریے پر بُری طرح یقین رکھتا ہو اور اس کی سچائی کو اپنی زندگی کے معنی بنا چکا ہو اور کافی عرصہ بعد اسے یہ معلوم ہو کہ جن باتوں پر اس کا اعتقاد تھا وہ جھوٹی ہیں تو وہ کیا کرے گا؟

یہ سوال ہمیشہ سے مجھے بہت تنگ کرتا رہا ہے۔ اس وقت سے جب میں خود اس کے شکنجے سے باہر تھا میں سوچا کرتا تھا کہ اگر کوئی اپنی تقریباً پوری زندگی کسی مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دے۔ اپنی ساری عزیز چیزیں قربان کر دے۔ اپنا سب کچھ کھو دے۔ اور پھر آخر میں اس پر یہ راز کھلے کہ سب فریب تھا تو وہ کیا محسوس کرے گا کس طرح اپنی شکست سے مصالحت کرے گا؟ میں چاہتا تھا کہ اس کشمکش پر کوئی ڈرامہ یا بھرپور افسانہ لکھا جائے۔ میں نے سلیم سے کہا تھا کہ فرض کرو ہم کسی پیغمبر کو اس کا مرکزی کردار بنائیں۔ وہ اسی طرح غریب مگر ایماندار والدین کا بیٹا ہو جس طرح پیغمبر ہوا کرتے تھے وہ اسی طرح مافوق الفطرت خصائل رکھتا ہو۔ وہ اسی طرح مثالی زندگی گذارے اور خاص عمر کے بعد اسے نبوت ملے۔ اس پر وحی اترے اور وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔ اسی طرح اسے کانٹوں پر گھسیٹا جائے اور اسی طرح وہ ہزار مظالم کے باوجود حق کے راستے سے نہ ہٹے حتیٰ کہ اس کے ماننے والوں میں اضافہ ہو جائے اور وہ اپنے مخالفین پر غالب آ جائیں۔ وہ اپنی ایک سلطنت بنالیں اور نئے مذہب کے احکامات نافذ کر دیں۔ اور تب ہمارے پیغمبر کو یہ اطلاع ملے کہ خدا تو دراصل کہیں نہیں تھا اور جن باتوں کی اس نے تبلیغ کی تھی وہ کسی شیطانی طاقت کا ہتھکنڈا تھیں تو وہ کیا کرے گا؟ خودکشی کرے گا؟

اپنے سارے ماننے والوں کو بت کرکے ان سے کہہ دے گا کہ سب فریب تھا اور اب وہ آزاد ہیں۔ یا کسی کو بتائے بغیر دھیلس اپنا کام کئے جائے گا کہ جیسے واقعی خدا ہو ___؟ اس کی اپنی ذہنی کیفیات کیا ہوں گی۔

اس موضوع سے کوئی یونانی المیہ ہی انصاف کر سکتا تھا میں نے بہرحال کوئی ڈرامہ یا کہانی نہیں لکھی۔ یہ شاید یہ خیال تھا کہ بدلی ہوئی شکل میں مجھے خود اس تک ہی آنا پڑے۔ کہانی کا مرکزی کردار بننا پڑے گا اور حالانکہ میرے اندر کی ساری چھوٹی بڑی باتوں کا راز دار میرا سب سے اچھا دوست سلیم ہوا کرتا تھا۔ اس کہانی میں میرے ساتھ تو اس کو ذرا سا بھی سہارا نہ ملا۔

اس لئے کہ سلیم تمہارا بھائی ہے، اور تم نے شروع سے یہ چاہا تھا کہ میں اسے تم دونوں کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ اس پابندی نے ان سوالوں کو میرے لئے بہت اہم بنا دیا تھا جو تمہاری محبت شروع سے کھڑے کر رہی تھی۔

میں کیا کروں ___؟ یہ ایک سوال ہے جو اپنے تئیں بظاہر بے ضرر لفظوں کے ساتھ ہر گھڑی میرا دامن تھامے رہتا ہے۔ یہی سوال اب بھی میرے سامنے ہے اور مجھے ڈر ہے کہ یہ کہانی ختم ہو جائے گی۔ اور میں شک کرتا رہوں گا تب بھی یہ سوال شرارت سے مسکراتے ہوئے میرے سامنے سینہ تانے کھڑا رہے گا۔

لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کہانیاں سوالوں سے نہیں بنتیں کہانیاں واقعات سے بنتی ہیں۔ سوال ذہن میں رہتے ہیں اور جذبات کے مہرے بدلتے ہیں مگر واقعات کی رو اسی طرح نکلنے والے سورج کی طرف سے ڈوبنے دن کی طرف بہتی رہتی ہے وہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے جس پر کبھی ایک فرد نے قابو نہیں پایا۔ وہ سب جس کے ہو چکنے کے بعد بھی اس پر یقین نہیں آتا۔

تم ملتی ہو ___ تم چھوٹ جاتی ہو۔

یوں بظاہر یہ کتنی مختصر سی کہانی ہے۔ میں نے تمہیں دیکھا۔ تمہارے متعلق سوچا۔ تم سے محبت کی۔ تم سے ملاقات ہوئی۔ ہر بات ایک پورا عہد ہے۔ ایک دور ہے۔ وقت کا ایک طویل وقفہ ہے۔ ناسمجھ مگر خوبصورت جذبات کی تصویروں کی ایک پوری نمائش گاہ ہے۔

ان سب کو سمیٹ کر مجھے تمہاری کہانی لکھنا ہے۔ تمہاری اور اپنی ___ ثروت سلطانہ اور اعظم سلطان کی ___ دو بہت چھوٹے بچوں کی کہانی جنہوں نے ناسمجھی میں اپنے آپ کو زخمی کیا۔

مجھے یاد نہیں میں نے پہلی بار تمہارا نام کب سنا تھا۔ شاید میری بہن ساجدہ نے بتایا تھا کہ تم اپنے کالج کی بہت اچھی لڑکیوں میں سے ہو اور وہاں کی سرگرمیوں میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہو۔ اس نے بتایا تھا

کہ تمہارا نام ثروت ہے اور تم سلیم کی بہن ہو لیکن اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو اور تمہیں شعر کہنے کا بھی خبط ہے۔ پھر یہ باتیں اسی طرح ہوئی تھیں جس طرح دوسری بہت سی لڑکیوں کے بارے میں ہوتی ہیں۔ میں اور ساجدہ شروع سے ایک دوسرے کے اچھے دوست رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھیوں کے بارے میں اسی تفصیل سے جانتی رہی ہے جس طرح میں اس کی سہیلیوں سے واقف رہا ہوں۔ اور تم تو اس کی قریبی سہیلی بھی نہیں تھیں۔ وہ تم سے سینئر تھی۔ اور پھر تمہارے کالج مختلف تھے۔

سلیم سے دوستی کے تعلقات کے باوجود میں تمہارے متعلق زیادہ نہ جان پایا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ سلیم کی تین چھوٹی بہنیں ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان میں جو بڑی ہے اس کا نام ثروت ہے اور پھر صفیہ اور محسنہ۔ اس سے زیادہ کچھ جاننے کی مجھے خواہش بھی نہ تھی۔ لڑکیوں سے میں ہمیشہ بہت الگ الگ رہا ہوں۔ اس اطلاع دینے کے باوجود کہ لڑکیاں مجھ میں تھوڑی بہت دلچسپی ضرور لیتی ہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن دو سال پہلے کی اس جولائی کی تاریخ مجھے بالکل یاد نہیں۔ میں اس سے پچھلی رات میلسی میں دن تک رہ کر واپس آیا تھا اور سلیم کے کمرے میں سلیم اور کمال مجھے میری قوت برداشت پر داد دے رہے تھے کہ میں نے تم جیسے شخص کے ساتھ جسے یونیورسٹی کا سب سے بڑا بور سمجھا جاتا تھا، تین دن اکیلے کیسے گزار لئے ــــ اور وہ بھی ساحلِ سمندر پر ــــ

میرے سر میں بہت ریت تھی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے سلیم سے کہا میں نہاؤں گا۔ صبح شاید میرے اپنے گھر پانی کی قلت ہو گئی تھی اور اس دن نہانا بہت ضروری تھا۔ سلیم نے اندر پردہ کرایا اور پچھلے دروازہ سے مجھے غسل خانے پہنچا دیا اور وہاں سے ــــ غسل خانے کے دروازہ کے جھنگلے سے میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا۔

تم کسی برتن میں صحن کے نل سے پانی لے رہی تھیں۔ تمہیں یقیناً اس بات کا احساس تھا کہ یہاں میں ہوں اور وہاں سے تمہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی لئے تمہارا دوپٹہ بڑے ڈھنگ سے تمہارے سر پر تھا اور تم نظریں نیچی کئے بہت سنبھل کر کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن میں نے تمہیں صرف اس لئے دیکھا تھا کہ تم نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تم ثروت ہو یا کوئی اور۔ اور یہ بھی میں تمہیں بتا دوں کہ تمہیں دیکھ کر میں زیادہ متاثر بھی نہ ہوا تھا۔

تم صرف چند لمحے وہاں رہیں اور جب میں سلیم کے کمرے میں واپس آیا تو میں یہ بھول چکا تھا کہ میں نے کسی کو دیکھا ہے۔

ان دنوں میں تمہارے گھر بہت باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ تقریباً ہر روز ہم ــــ میں، سلیم، کمال اور کبھی کبھی کمال کے بجائے ظریف ــــ میز پر پاؤں پھیلا کر بہت سنجیدہ موضوعات پر سنجیدگی سے بات کیا کرتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ہم سب میں بے پناہ زندگی تھی۔ خود میں بہت پر امید تھا۔ چھ سال ضائع کر چکنے کے بعد میں نے

نئے سرے سے آرٹس پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ سلیم کا تعلق عنیور کے ماہنامے سے بہت قریبی تھا۔ اور اس میں میں نے کچھ اچھی چیزیں بھی لکھی تھیں۔

ہم سب کو ۔۔۔ خاص طور پر مجھے اور سلیم کو ۔۔۔ اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ہم پر بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں ہم ہر بات، اپنے دل سے بہت قریب محسوس کرتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہم اپنے ماحول اور اپنی عمروں کے ٹکڑے میں شاید سب سے زیادہ باشعور ہیں۔ یونیورسٹی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہم نے سوائے کھیلوں کے ہر سرگرمی میں رہنمائی کی تھی۔ وہاں کے مختلف شعبوں کی تقریبات میں ہمیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آگے بٹھایا جاتا تھا۔ لوگ سچ مچ ہمیں بہت پڑھا لکھا مانتے تھے۔

میرے دوستوں کے سارے حلقے کو مجھ سے بہت امیدیں تھیں۔ یہ بات باقاعدہ فرض کر لی گئی کہ میں بہت اچھا ادیب بن جاؤں گا۔ اور اگر میں نے ذرا سی بھی محنت کی تو آرٹس کے سارے امتحانوں میں مجھے پوزیشن ملے گی۔ ۔۔۔ ساتھ ساتھ میں بہت لاابالی اور لاپرواہ مشہور تھا۔ میری کاہلی اور بے نیازی کے بارے میں تم نے بھی سنا ہوگا۔

تمہیں دوسری بار میں نے کافی دنوں بعد دیکھا مگر اس دوران کئی بار پہچانے بغیر تمہاری آواز سنی یا دو لفظی جملوں میں تم سے بات کی۔ جب کبھی سلیم کو فون کرتا تو اکثر تم تینوں بہنوں میں سے کوئی ہوتا۔ مختصر گفتگو ہوتی ۔۔۔ سلیم ہیں ۔۔۔ جی نہیں ۔۔۔ کہاں گئے ہیں ۔۔۔ ذکی بھائی کے ساتھ کہیں گئے ہیں ۔۔۔ جی اچھا ۔۔۔ کہہ دیجئے گا اعظم کا فون آیا تھا ۔۔۔ یا پھر ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ ذرا بلا دیجئے۔

اس کے علاوہ سلیم کے کمرے میں بیٹھ کر اکثر تم لوگوں کی آواز سنائی دیتی۔ امی کی آواز سب سے زیادہ آیا کرتی کبھی سلیم کا فون آتا تو تم میں سے کوئی دروازے کے قریب آکر کہتا ۔۔۔ بھائی جان ۔۔۔ نسیم کا فون ہے ۔۔۔ یا کسی اور کا ۔۔۔ یا کوئی اور بات ۔۔۔

تمہیں دوسری بار میں نے اس دن دیکھا جس دن سلیم وعدے کے مطابق گھر پر نہیں تھا۔ اور یہ کہہ گیا تھا کہ میں آؤں تو کمرہ کھول دیا جائے۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو تم نے برابر کے کمرے کے پردے سے ٹیڑھی کھڑکی میں سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور پھر مجھے بتایا کہ سلیم مجھ سے انتظار کرنے کو کہہ گیا ہے۔

شاید تمہیں نے آکر دروازہ کھولا ۔۔۔ ذرا سی دیر بعد آجائیے کی آواز مجھے سنائی دی۔ میں سلیم کے کمرے میں بیٹھ گیا اور ٹائم کا جو شمارہ میرے پاس تھا اس کے صفحے الٹتا رہا ۔۔۔ تمہاری کوئی سہیلی تمہارے گھر آئی ہوئی تھی اور تم اسے صحن میں لے آئی تھیں اور اس سے زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔

یہ بات سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا کہ تم مجھ پر ۔۔۔ افسانہ نگار اعظم پر رعب ڈالنا چاہ رہی ہو میرے

افسانے خواہ کیسے ہوتے ہوں اتنے رومانی اور اداس ضرور ہوتے ہیں کہ تم جیسی لڑکیاں گاہے گاہے میرے بارے میں سوچ لیا کریں۔ اور تمہیں تو لکھنے پڑھنے سے خاصا لگاؤ تھا۔

تم اپنی سہیلی سے کچھ اس قسم کی بات کہہ رہی تھیں کہ سوچو تو ـــــ یہ اتنی بڑی کائنات ہے اور اس کائنات میں یہ زمین ہے جو بہت چھوٹی ہے اور اس زمین پر بھی بہت سے ملک ہیں جن میں سے ایک پاکستان ہے ـــ اور اس میں ایک شہر کراچی ہے ـــــ اور کراچی میں لاکھوں لوگ ہیں اور ان میں سے ایک تم ہو ـــ آخر تمہاری حیثیت ہی کیا ہے ـ کتنی غیر اہم ہو تم ـــ!

میں تمہارے سنبھل سنبھل کر زور زور سے بولنے کے انداز پر اپنے آپ مسکرا دیا ـــــ یہ لڑکی ـــ میں نے سوچا ـــــ یہ مجھے جتا رہی ہے کہ میں بہت عقلمند ہوں۔

اس تسلی کے باوجود کہ تم مجھ میں موہوم سی دلچسپی لے رہی ہو میں کمرے میں کچھ بیٹھ کر اکتا گیا۔ میں نے اپنا قلم میز کے شیشے پر بجایا۔ تم دروازے کے قریب آئیں۔ میں نے کہا ـــ "دیکھیے ـــــ میں یہیں قریب ایک جگہ ہو آؤں ـــ جب تک شاید سلیم آ جائے۔"

میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور کمال کی طرف جانے کے خیال سے سیدھا سڑک کی سمت چلا ـــ سڑک پار کرنے سے پہلے مجھے ذرا رکنا پڑا اور یونہی میں نے پیچھے دیکھا۔

تم دروازہ ذرا سا کھولے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرے مڑتے ہی تم نے دروازہ بند کر دیا۔

یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ یوں ان سے کہانیاں نہیں بنتیں۔ میں خود انہیں اہمیت نہیں دیتا۔ اور پھر میں تو سرکتے پردوں اور کھڑکیوں میں سے جھانکتی آنکھوں کا عادی تھا۔ میری ناک ذرا سی ـ ورنہ درست ہے اور مجھے یاد ہے کہ کمال کے گھر جاتے ہوئے میں نے تمہارے بارے میں بے دھیان ہو کر سوچا۔

کمال گھر نہیں تھا اور گو سلیم کا انتظار کرنے کا موڈ نہ تھا۔ مجھے اسے وہ "ناگن" دینا تھا جو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں دوبارہ تمہارے گھر گیا۔ میں نے اسی طرح دستک دی۔ تم کھڑکی میں آئیں اور میں نے تمہیں بتایا کہ تم رسالہ لے لو ـــــ میں انتظار نہیں کروں گا۔

تم سلیم کے کمرے کے دروازے پر آئیں۔ تم نے پٹ ذرا سے کھولے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تمہیں رسالہ دے دیا۔ تم الگ کو کھڑی تھیں لیکن میں نے تمہیں دیکھا ـــــ تمہاری جھکی نظریں ـــــ تمہارا خوب صورت چہرہ ـــــ

مجھے تم اچھی لگیں۔

واپسی پر تمہارا چہرہ غیر ارادی طور پر ذہن میں دو تین بار آیا۔ یہ سوچ کر تسکین سی ہوئی کہ اتنی اچھی بالذات

لڑکی چھپ کر مجھے دیکھتی ہے۔ مگر تم میرے دل کی سرحد سے اس دن بھی دور تھیں۔ تم سلیم کی بہن تھیں اور دوستوں کی بہنوں کا مجھ میں اتنی دلچسپی لینا کوئی چونکا دینے والی بات نہ تھی۔

اس کے بعد تمہیں کچھ اسی طرح ایک دوبار اور دیکھا۔ اب جب میں یہ کہانی لکھ رہا ہوں میرے حافظے کے ہاتھ سے یاد کی کچھ ڈوریاں چھوٹ چکی ہیں۔ بہت سی باتیں میں بھولتا جا رہا ہوں ـــــ بھول چکا ہوں ـــــ ہاں ـــــ ایک بار تمہیں دیوانِ غالب اسی طرح دیا تھا۔ وہ دیوان تمہارا ہی تھا اور میں سلیم کے پاس سے اٹھا لایا تھا بی۔ اے میں نفسیات کے ساتھ اُردو تمہارا مضمون تھا۔ اور تمہیں کورس کی کتاب کی حیثیت سے اس کی ضرورت تھی۔

اس دیوانِ غالب پر تمہارا نام (ثروت سلطانہ۔ بی۔ اے۔ رفائنل) دیکھ کر میرے دل میں تمہارے ہونے کا احساس خاصا بڑھ گیا تھا لیکن تمہارا دھیان وہیں تک تھا جہاں تک دوسری اچھے جسموں والی خوبصورت لڑکیوں کی پہنچ تھی۔ سلیم کی بہن ہونے کے سبب میں نے تمہیں اپنے کسی جاگتے خواب میں بھی جگہ نہ دی تھی اور تم جانتی ہو کہ یہ تصور تک مشکل تھا کہ تم سے محبت کی جا سکتی ہے۔ تم اپنے خاندان، اپنے ابا، گھر اور دوسری کئی باتوں کی وجہ سے میرے لئے ناقابلِ حصول تھیں۔

اور میرے لئے تم میں یہی سب سے بڑی کشش تھی ـــــ تمہاری شانِ نارسائی۔

یہ کہانی دراصل ستمبر ۱۹۵۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس دن کراچی یونیورسٹی کی یونین کی افتتاحی تقریب تھی۔ اور ورائٹی پروگرام میں ایک ایکٹ کا وہ ڈرامہ بھی شامل تھا جسے میں نے ایک غیر ملکی کھیل سے اخذ کیا تھا۔ اس میں ہم سب مختلف حیثیتوں میں حصہ لے رہے تھے۔

تم اور تمہاری چھوٹی بہن محسنہ اور پرنس روڈ پر رہنے والے بہت سے تمہارے رشتہ دار اس شام یونیورسٹی آئے تھے۔ پہلے ترکس کے شعبہ میں یونین آفس کے سامنے اسٹیج بنا تھا اور چار بجے کے قریب جب شامیانوں میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں تو زور کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ سارا انتظام بگڑ گیا تھا اور مجبوراً کیمسٹری ہال میں فنکشن کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن وہ پروگرام بہرحال اس شام نہیں ہوا۔ کیمسٹری ہال میں بے شمار لڑکے گھس آئے۔ مزید نیچے شور مچاتے رہے۔ خوب ہوٹنگ ہوئی۔ وزیر تعلیم تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے انہیں بھی نہ سنا گیا۔ وہ ناراض ہو کر چلے گئے اور تقریب ملتوی کر دی گئی۔ انتظام بالکل بگڑ گیا۔ لڑکیوں کو ـــــ ان میں تم بھی شامل تھیں پھر میں نے اس وقت تک تمہیں نہیں دیکھا تھا ـــــ لگے، بھول بھلیوں والے راستے میں سے نکالا گیا۔

ہم سب ـــــ سلیم احسان کمال۔ ڈرامہ میں حصہ لینے والے دوسرے لڑکے اور تم ـــــ تمہاری رشتہ دار

لڑکیاں اور عمران صاحب ـــ کینٹین کے قریب والے بلاک میں جمع ہوئے۔ مجھے یاد ہے تم سب لڑکیاں یامنی کے شعبے کے چوڑے، نیم تاریک برآمدے میں کھڑی تھیں۔ تم نے اپنے برقعے اتار لئے تھے اور عمران صاحب تم میں سے کسی سے بات کرنے ہم سے الگ ہوکر بار بار اُدھر جاتے تھے۔

تمہاری رشتہ دار لڑکیوں میں مجھے فرزانہ کی موجودگی کا احساس ذرا زیادہ تھا۔ اب میرے ذہن میں عمران صاحب بھی ہیں۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ تم سے شدید محبت کرتے ہیں۔ چھوٹے سے ـــ کرتہ پاجامہ پہننے والے شاعر ـــ ان کے چہرے پر ایسا کرب جیسے وہ کسی درد کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

فرزانہ ـــ عمران صاحب کی بھانجی ـ ـ تمہارے باقی رشتہ داروں کی سب سے باغی لڑکی تھی۔ اس کے افسانے میں نے عمران صاحب کے رسالے میں پڑھے تھے۔ میں نے اسے صرف اس لئے چن کر دیکھا تھا کہ مجھے سلیم نے بتایا تھا کہ وہ میرے افسانے بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔

تم نے اس دن شوخ زرد رنگ کی قمیص پہنی تھی اور تمہیں پہچان لینے سے پہلے میں دیکھ رہا تھا کہ نیم تاریک برآمدے میں کھڑی لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک زرد قمیص بڑی نمایاں ہے۔ بہت بے چین ہے سب کو گھیرے کھڑی ہے الگ جانی ہے تو سب پیچھے ہیں۔

ہم سب بہت مایوس تھے اور یہ شاید تم میں سے کسی کا مشورہ تھا کہ کہیں بیٹھ کر وہ ڈرامہ دیکھ لیا جائے جو ہم کرنے والے تھے پھر ہم نے جیم خانہ ہال میں آ کے کرسیاں بچھا کر وہ ڈرامہ کیا تھا۔ ساری لڑکیاں ایک طرف ہوکر بیٹھ گئی تھیں۔ بہت سے دوسرے لڑکے بھی آ گئے تھے۔

وہ ڈرامہ چھوٹا سا اور دلچسپ تھا اور اسے سب نے پسند کیا تھا۔ کمال اور نسیم اس میں مرکزی کردار کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ سر جھکائے الگ بیٹھا تھا۔ فرزانہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اس کے باوجود میں موقعہ پاکر صرف تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ گول چہرے والی گورے گورے رنگ کی لڑکی ـــ اسے تو اپنانے کو جی چاہتا ہے۔

بہت سے لڑکوں کی آمد کی وجہ سے ڈرامہ کے بعد دوسرے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ کسی نے کوئی گیت گایا۔ ایک صاحب نے منہ سے گھنگھرو بجائے۔ نسیم نے لطیفے جوڑ کر بنایا ہوا ایک خاکہ سنایا۔

بارش رک چکی تھی اور نو بجے کے آس پاس جب ہم باہر نکلے تو سڑکیں بھیگی تھیں۔ اور جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ پہلے ہم لوگ سب ساتھ چلے تھے۔ بندر روڈ پر عمران صاحب اپنے گھر کی لڑکیوں کو لے کر پرنس روڈ کی طرف چلے گئے تھے اور صرف تم دونوں بہنیں اور سلیم، کمال اور میں بچے تھے۔ ہم سب بس کے لئے تاج محل سینما تک آئے تھے لیکن بسیں بھری ہوئی آرہی تھیں اور تاج محل کے قریب سے ہم نے وکٹوریہ کیا تھا۔

(اب کہانی شروع ہوتی ہے)

وکٹوریہ میں، میں اور کمال چھوٹی سیٹ پر بیٹھے۔ میرے سامنے، بائیں طرف محسنہ ——— پھر تم اور پھر سلیم۔ تمہارے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ محسنہ اپنا آدھا چہرہ چھپائے تھی۔ تمہارے قریب بیٹھتے ہی میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ تمہیں بھرپور نظروں سے اتنے قریب دیکھ لینا بڑا قیامت خیز ثابت ہوا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں بھی لمحاتی حادثوں سے یوں سر کے بل گر جاؤں گا ——— تمہیں دیکھ کر میرے ذہن میں دو مصرع آیا تھا ——— آگ دشمنی سی ہے مری آنکھوں کے آس پاس ——— تم واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ ساجدہ سے تمہاری جو تعریفیں سنی تھیں اس کے پس منظر میں کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے آدا گون کی کہانی والی کسی ہندوستانی فلم کا ہیرو کسی کو دیکھ کر اچانک کہہ اٹھے ——— یہ وہی ہے ——— یہ وہی ہے۔

تم نے خود مجھ سے گفتگو شروع کی۔ تم نے پوچھا میں ساجدہ کو کیوں نہیں لایا۔ تمہارے انداز میں بڑی بے تکلفی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے تم مجھے کافی دلچسپی سے دیکھ رہی ہو۔ میں نے تمہارے سوال کا جواب دیا۔ تمہارے چہرے کو غور سے دیکھ کر میرے اندر کوئی چیز تیز لہر کی طرح بہہ گئی۔

میں جانتا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے ——— میں جانتا تھا اور بے بس تھا۔

اس رات تم نے اپنی ہونے والی بھابی کا بھی ذکر کیا تھا۔ تمہارے سوتیلے بڑے بھائی کی شادی جلد ہونے والی تھی اور منگنی ابھی پچھلے ہی دنوں ہوئی تھی۔ تمہاری بھابی کو میں ایک بار دیکھ چکا تھا۔ جب ضمیر یونیورسٹی میں ٹینس کا کپتان تھا تو اسے مختلف کالجوں کے ٹینس کے مقابلوں کی نگرانی کرنا پڑی تھی۔ تمہاری بھابی نے لڑکیوں کے ایک کالج کی طرف سے ٹینس کھیلی تھی۔ اس وقت کورٹ میں لڑکیوں کے علاوہ صرف ہم تین لڑکے تھے ——— میں، ضمیر اور غیور ——— اور ان ساری لڑکیوں میں ہمیں تمہاری بھابی سب سے اچھی لگی تھی۔ غیور کو ہارڈی کے کسی ناول کی پراسرار صفات والی ایک لڑکی یاد آ رہی تھی۔ ہاتھ جھٹک کر اس کا "ہو بابا" کہنے کا انداز کچھ نرالا تھا۔ تمہاری گفتگو کا موضوع بنا رہا تھا اور اب تمہارے اپنے بھائی کی اس سے شادی ہونے والی تھی۔ وہ لوگ کافی دولت مند تھے اور ان کے خاندان کا شمار اونچی سوسائٹی کے صفِ اول کے خاندانوں میں تھا۔

بقول سلیم ——— اس شادی سے تمہارے ابا جان کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کلاس کا انہیں کتنا خیال تھا۔

بھیگی ہوئی رات میں وکٹوریہ کا وہ سفر میں کبھی نہ بھولوں گا لیکن جو کچھ یاد ہے وہ دو ایک باتیں ہیں۔ ایک دو بار سڑک اور عمارتوں کی طرف دیکھا تھا وہ مناظر ذہن میں ہیں اور تمہارا چہرہ ——— سورج جیسا ——— جگمگ جگمگ کرتا ——— مسکراتا ——— پھول جیسا کھلا ہوا۔

شاید کمال نے میرے کسی افسانے کا ذکر کیا تھا جو ایک غیر معروف رسالے میں چھپا تھا۔ اور جس کی کوئی کاپی میرے پاس نہیں تھی۔ وہ اسے ایک ریڈیو ڈرامے میں بدلنا چاہتا تھا۔ اس افسانے کے ذکر کے وقت تم نے مجھے غور سے دیکھا تھا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ تم نے تو میرے بہت سے افسانے پڑھے ہوں گے۔ مجھے اپنے افسانوں کی اچھی اچھی باتیں ـــ خوبصورت تب یاد آئے۔ تم ان سے متاثر ہوئی ہوں گی۔ ۔ ۔ تم نے کبھی یہ تو نہ سوچا تھا کہ یہ اداس اور ذہین نوجوان جسے تمہارا بھائی بے حد چاہتا ہے، یہ تمہارا ہے؟

میں گرومنڈر پہ اترا۔ جی چاہا ایک بار تمہیں غور سے دیکھ لوں۔ پھر خبر نہیں تم کبھی نظر بھی آؤ یا نہیں۔

رات کو سڑکوں پر پیدل چلنا میرا محبوب مشغلہ ہے لیکن اس رات تم سے رخصت ہوتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت تھک گیا ہوں۔ جی چاہا کہیں بیٹھ کر اپنا سر کسی چارے پہ ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لوں ـــ سڑک کے کنارے بنی ہوئی لوہے کی سرد ریلنگ پر اپنے ہاتھ رکھے میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ سر جھکا کر میں نے اس پہ اپنا ماتھا رکھ دیا۔

میں ساری رات جاگا اور جیسے کانٹوں پہ لوٹتا رہا۔ راتوں کو جاگنا میری ایک پرانی عادت ہے تم نے میرا وہ خاکہ پڑھا تھا جو میں نے اپنے رت جگوں پر لکھا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ جنہیں دن ٹھکرا دیتے ہیں انہیں راتیں پناہ دیتی ہیں۔ راتوں میں بڑا حسن ہوتا ہے۔ دن کو لوگ چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت کرتے ہیں نفع نقصان کی باتیں کرتے ہیں لیکن رات ان کے چہروں پر سے مکر اور بناوٹ کے نقاب اتار دیتی ہے۔ راتوں کو ان کے دل دھڑکتے ہیں اور وہ قربت کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ میں کہتا تھا کہ راتوں کو جاگنے کے لئے بڑے ڈسپلن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خود راتوں کو اپنا ٹیبل لیمپ گل کر کے اپنے دیوان پر دوسرے تکیہ کا سہارا لئے آنکھیں بند کئے پڑا رہتا تھا۔ اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہر طرف امن ہے اور ایک بہت اچھی، پربہار زندگی میری منتظر ہے۔

لیکن اس رات اپنی زندگی میں پہلی بار مجھے رات کی شیطانی قوتوں کا علم ہوا۔ اس رات کا کرب اور بے چینی میرے لئے بالکل نئی تھی۔

رات کے کوئی تین بجے میں تقریباً بے دم ہو کر اٹھا۔ میں نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ میری الماری میں اسی سال کی ایک ڈائری رکھی تھی جس میں میں نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ اسے نکال کر میں نے ـــ ستمبر کی تاریخ کے صفحہ پر انگریزی میں صرف دو جملے لکھے "یہ ایک ناکام مگر شدید تعلق کی ابتدا ہے ـــ" میں نے لکھا ـــ "جس کا مجھے انتظار تھا۔ اور جس سے میں ڈرتا تھا وہ ہو چکا ہے"

دوسرے دن جب کافی ہاؤس میں میں نے سلیم اور کمال کو بتایا کہ میں ساری رات جاگا ہوں تو وہ

سمجھے ڈرامہ کا نہ ہونا اس کا سبب تھا۔ سلیم ہمیشہ کی طرح سرپرست بن کر محبت سے ہمدردی کرنے لگا۔
ایسے تمام دنوں یہ عہد و پیمان ہوتے تھے کہ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ میں ڈرامے لکھوں گا تو سلیم انہیں ڈائرکٹ کرے گا۔ میں افسانے لکھوں گا تو سلیم نقاد بن کر لوگوں کو ان کی باریکیاں سمجھائے گا۔ ہر جگہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے۔ یہ بات طے تھی کہ سلیم میری سوانح لکھے گا اور ہم اکثر بچوں کی طرح اس بات پر جھگڑتے تھے کہ کیا میں اس لئے مشہور ہوں گا کہ میری سوانح سلیم نے لکھی ہے یا وہ اس لئے نام پائے گا کہ میری سوانح حیات کا مصنف ہے۔ وہ ہلکے پھلکے موڈ میں یہ بھی کہتا تھا کہ کیوں نہ وہ ابھی سے میری پوری زندگی کے حالات لکھ دے اور میں باقی زندگی اس کی تحریر کے مطابق زندہ رہ کر بڑا آدمی بن جاؤں۔
اور تب تم — ثروت سلطانہ — سلیم کی سب سے اچھی بہن — میری زندگی میں ناقابلِ یقین، ناقابلِ بیان، ناقابلِ تسخیر وحشت بن کر داخل ہوئیں۔ اب یہ ساری باتیں بہت دور کی اور عجیب لگتی ہیں اور کبھی کبھی تو خود مجھے شک ہوتا ہے کہ ایسا ہوا تھا لیکن یہ سچ ہے کہ اس رات کی اس چھوٹی سی ملاقات میں تم میرے پورے وجود پر محیط ہو گئیں۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں ریت پر کھڑا تھا کہ پیچھے سے کوئی تیز لہر آئی اور مجھے بہا لے گئی۔
میں نے سب سے پہلے ساجدہ کو اپنا رازدار بنایا — وہ خوب ہنسی — مجھے سمجھانے لگی کہ خاندانی وجوہات کی بنا پر باعزت طریقے پر میرے لئے تمہیں اپنانا ناممکن ہے۔

تمہارے اور سلیم کی طرح ہم دونوں بہن بھائی بھی ایک دوسرے کے اچھے ہمراز ہیں۔ تمہیں دیکھنے کے کچھ ہی دن بعد میں نے ساجدہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر بہت جلد اس نے کسی بہانے تم سے نہیں ملایا تو میں کوئی ہنگامہ برپا کر دوں گا۔ وہ میرا پاگل پن دیکھ کر ہنستی — میرے ضد کرنے، منتیں کرنے اور بے تاب ہو جانے پر فکرمند ہو جاتی۔
"وہ بہت اچھی لڑکی ہے — وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جس سے تم فلرٹ کر سکو —" اس نے کہا تھا۔
میں سنجیدہ باتیں بھی بڑے مزاحیہ انداز میں کیا کرتا ہوں۔ میں نے اسے سامنے بٹھا کر باقاعدہ تقریر کی۔ اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا تم سے ملنا اتنا ضروری کیوں ہے۔ محبت کے متعلق میرا جو نظریہ تھا۔ وہ تمام باتیں جن کی وجہ سے میں اپنے احباب میں "اتھارٹی" سمجھا جاتا تھا میں نے اسے سمجھائیں۔
وہ انہیں دنوں ایم۔ اے۔ پاس کر لینے کی خوشی میں اپنی سہیلیوں کو ایک پارٹی دے رہی تھی۔ اس کی جو بہت قریبی سہیلیاں ہیں ان سے میں دور بھاگتا ہوں۔ اور جب وہ سب جمع ہو جائیں تو

میرا گھر پر موجود ہونا محال تھا۔ پھر سب کی موجودگی میں تم سے بات ہی کیا ہو سکتی تھی۔ اسی لئے میں نے ساجدہ کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ تمہیں باقی سہیلیوں کے ساتھ نہ بلائے بلکہ تم اپنی دو ایک دوستوں کے ساتھ الگ مدعو کی جاؤ اور اس روز میں تم سے ملوں۔

سلیم کے کمرے میں سلیم سے باتیں کرتے ہوئے یہ سوچا کرکہ ایک دیوار کے پیچھے تم ہو مجھے بڑی نرم نرم سی کسک محسوس ہوتی جاتی۔ تمہارے چہرے کے نقوش سلیم کے چہرے سے ملتے ہیں۔ خاص طور پر ناک اور ہونٹ ـــــ اور میں اسے بڑے پیار سے دیکھا کرتا تھا۔ دیوار کے پیچھے سے امی یا تم میں سے کسی ایک یا مہمان عورتوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ اور میں کان آہٹ پہ لگائے چوکنا بیٹھا رہتا تھا کہ تمہاری آواز سنائی دے۔ لیکن میں ان دنوں تمہاری آواز پہچان بھی نہ پاتا تھا۔ فون پہ کئی بار انجانے میں تم سے سابقہ پڑا ہوگا۔ ہر بار میں دھڑکتے دل سے ریسیور اٹھاتا اور ٹھہر ٹھہر کر تمہارا نمبر ڈائل کرتا تو تم تینوں بہنوں میں سے کسی ایک کی آواز آتی ۔۔۔ "جی اچھا ـــــ کون صاحب بول رہے ہیں ـــــ بھائی جان تو گئے ہوئے ہیں ـــ وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران ایک دو بار مجھے یقین سا ہوا کہ دوسری طرف تم ہو لیکن میری بزدلی، احتیاط ـــــ مایوسی کے ڈر ـــــ میں نے کبھی کسی گفتگو کے آغاز کی کوشش نہ کی۔

ایک بار تمہیں دیکھا ـــــ اس رات میں دیر تک سلیم کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔ اور ہم بہت ذاتی اور جذباتی باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔ موضوع شادی تھا اور سلیم نے بتایا تھا کہ ایک بار تمہارے ابا جان اپنے کسی بہت امیر دوست کے سخت نامعقول لڑکے سے تمہاری شادی کر دینا چاہتے تھے اور ابھی بات طے نہیں ہوئی تھی جب اس نے امی سے پوچھا تھا کہ آیا انہوں نے تمہاری رائے معلوم کر لی ہے یا نہیں ـــــ اور امی نے کہا تھا ثروت سے کیا پوچھنا ـــــ اور تب سلیم نے (وہ اس وقت تخت پر بیٹھا تھا) ـــــ چیخ چیخ کر اور بے قابو ہو کر تخت پر مکے مار مار کر کہا تھا کہ ثروت کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے جوش میں نہ جانے کیا کیا کہا ـــ امی دہل گئیں۔

ظاہر ہے وہ شادی نہیں ہوئی۔

اور ان تمام باتوں کے بعد رات کے کوئی گیارہ بجے جب میں میز کے کنارے سے گھٹنا ٹکائے بیٹھا تھا تو تم سلیم کو پکارتے ہوئے دروازے کے سامنے آ گئیں۔

میں نے تمہیں ـــ تم نے مجھے دیکھا

تمہارے بال بے ترتیب تھے اور مجھے تم بہت اداس اور جرمی نظر آ رہی تھیں۔ جو باتیں ہو چکی تھیں ان کے پس منظر میں مجھے تم پر بے پناہ پیار اور رحم آیا۔ میں نے چاہا میں تمہاری حفاظت کروں اور تمہیں تمہارے گھر کی ساری آفتوں سے بچا کر اپنے پاس رکھوں۔

تھوڑی دیر بعد میں چلا آیا اور سارے راستے میرا جی بھاری رہا۔ کچھ ہی عرصے پہلے میری ایک بہن کی شادی کا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ اس کی جہاں منگنی ہوئی تھی وہاں وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور میں نے ہر چیز سے بے تعلق کے باوجود یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ شادی نہیں ہو سکتی ــــ یہ ایک الگ کہانی ہے ــــــــ لیکن تم نے جان لیا تھا کہ کس کس طرح ہم پر دباؤ ڈالا گیا۔ کتنے بزرگوں نے مار ڈالنے اور مر جانے کی دھمکیاں دیں ہماری امی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ آخر میں خود اس نے ہمت چھوڑ دی لیکن میں سینہ سپر رہا۔ وہ باتیں جن پہ ہم ایمان رکھتے ہیں، جن کی ہم تبلیغ کرتے ہیں ان پہ ہمیں عمل بھی تو کرنا چاہیے۔ اور مجھے وہ وقت یاد ہے جب گھر کے سارے بزرگ جمع تھے اور میں نے بپھر کر بے حیائی اور خود سری کی انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ اگر اللہ میاں بھی آ جائیں تو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ اس میں ہمارا بڑا نقصان تھا۔ شاید نا سمجھی بھی تھی لیکن میں نہیں مانا اور تم جانتی ہو اپنے گھر میں مجھے کیا درجہ حاصل ہے۔

اس رات تمہاری نہ ہو سکنے والی شادی کے ذکر نے ــــ مجھ میں بڑا احساس کمتری پیدا کیا۔ مجھے وہ منظر یاد ہے ــــ میں تمہارے گھر سے نہر روڈ عبور کر کے آ رہا ہوں میں لڑکیوں کے اسکول کے قریب ہوں۔ میری آنکھوں میں اس اداس لڑکی کی صورت ہے جسے میں نے لمحہ بھر کے لئے دیکھا اور میرے دل پر بڑا بوجھ ہے۔

میں ان دنوں بڑا ایذا پسند ہو گیا تھا۔ گھر آ کر میں نے اپنے آپ کو ایک جاگتے ہوئے خواب سے بہلایا۔ لیکن اسی خواب میں میں نے تمہیں کھو دیا۔ تمہارے لئے قربانی دی۔ ایسے تصورات سے میں اپنے آپ کو بہت تنگ کیا کرتا تھا اور جب اضطراب و بے چینی پوری یورش کے بعد میرے رخسار آنسوؤں سے نم چھوڑ جاتی تھی تو میں تھک ہار کر سو جاتا تھا۔

تمہارے متعلق سوچ سوچ کر اپنے آپ کو اور تمہارا ذکر کر کر کے میں نے ساجدہ کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ بے چاری میری مدد کرنے پر راضی تھی اور ایک دن اس نے بتایا کہ وہ تمہاری ایک اچھی سہیلی سے جو تمہارے ہی کالج میں پڑھتی ہے یہ کہہ چکی ہے کہ وہ تمہیں باقی سہیلیوں سے الگ بلانا چاہتی ہے۔

عمران صاحب کے بارے میں سب سے پہلے مجھے انہی دنوں ساجدہ کی زبانی معلوم ہوا اس نے بڑی تشویشناک لہجے میں بتایا کہ عمران صاحب تم سے شدید محبت کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک کردار دراصل

تم جو اور تمہارے کالج کے مشاعرے میں انہوں نے اتنی رومانی نظم پڑھی تھی کہ تمہاری پرنسپل کو اعتراض ہوا تھا اور انہوں نے بوہمن کی لڑکیوں کو ڈانٹا تھا کہ ایسا آوارہ شاعر لڑکیوں کے کالج میں کیوں بلایا گیا۔ یہ بات کہ عمران صاحب تم پر فریفتہ ہیں سب لڑکیوں کو معلوم تھی۔ اور ساجدہ کا خیال تھا کہ ان سے تمہاری رشتہ داری اور گھر میں آمد ورفت کی وجہ سے انہیں یقیناً مجھ سے بہتر مواقع حاصل تھے اور کون جانے ـــ ساجدہ نے ہی یہ خوف میرے دل میں ڈالا ــ کون جانے تم نے واقعی کبھی عمران صاحب میں دلچسپی لی ہو۔

میرا خود کبھی اس بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہا۔ عمران صاحب مختلف آدمی ہیں ــ مغرور اور خود غرض ــ کریہہ پوش، پرانی چیزوں کے دلدادہ ــ تم سے بالکل مختلف ـــ مجھ جیسے ــ ویسے اس بات کا مجھے یقین ہے کہ ان کی محبت نہایت جوشیلی (مکروہ ؟) ـــ ٹھوس چیزوں کو گھلا دینے والی محبت ہوگی۔

تم سے فون پر پہلی بار بات انہیں دنوں پہلی یا دوسری اکتوبر کو ہوئی۔ شام سلیم کو کسی پروگرام کی ریہرسل کے لئے ریڈیو اسٹیشن پہنچنا تھا اور میں وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مقررہ وقت تک وہ نہیں آیا تو میں نے تمہارے گھر فون کیا۔

تم نے فون اٹھایا اور بتایا کہ وہ گھر سے جا چکا ہے۔ میں نے پوچھا کتنی دیر ہوئی اور پھر یہ کہ اسے ریڈیو پہنچنا تھا وہ نہیں آیا ـــ ان ابتدائی جملوں کے بعد اچانک تم نے کہا۔

"آپ اعظم صاحب بول رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں ـــ" میں نے اپنے آپ کو تھام کر کہا۔

"میں ثروت بول رہی ہوں ـــــ سلام علیکم ـــ"

میں نے جواباً سلام کیا۔ تم نے یہ پوچھا کہ ساجدہ تمہیں علیحدہ کیوں مدعو کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا ـــــ ویسے اس نے اپنی بہت سی سہیلیوں کو ایک پارٹی تو دی تھی اور کچھ خاص لوگوں کو اس نے اس لئے چھوڑ دیا کہ انہیں وہ بعد میں بلائے گی۔

یہ بات جلد ختم ہوگئی اور جب مجھے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دینا چاہئے تھا میں خاموش رہا اور ریسیور تھامے رہا۔ تم بھی چپ رہیں۔ یہ وقفہ چھوٹا سا تھا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس طرح میں تم پر اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہوں۔

یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ آمنے سامنے بیٹھ کر کسی کی آنکھوں میں بغیر کچھ کہے دیکھتے رہا جائے۔

"ہیلو —— " پھر تمہاری آواز آئی۔

"جی ——"

"اچھا تو خدا حافظ ——"

"جی اچھا ——" میں نے رسیور رکھ دیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک پُرامید بے چینی ۔ ایک دھڑکا سا —— اب کیا ہوگا —— ؟ اب کیا ہوگا ——!

اس کے بعد کئی بار سلیم کو فون کرنے سے پہلے میں نے خاموش دعا مانگی کہ تم ملو۔ تم سے باتیں ہوں مگر سلیم کو ہر وقت —— ہر روز تو فون نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عام طور پہ تمہاری امی فون اٹھایا کرتیں —— تم ملتیں بھی تو تم سے کوئی بات نہ ہوتی۔

گیلانی صاحب اور ان کے پورے گروپ سے اکثر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ میں دلچسپی لیتے تھے اور خاص عقیدت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ تمہارے وہ سارے رشتہ دار جو پرنس روڈ پر رہتے تھے عجیب عجیب چکروں میں گرفتار رہتے —— وہ سب ہنگامہ خیز لوگ ہیں۔ ایک کے بارے میں نامناسب افواہیں ہیں۔ سب کے سب الجھے ہوئے —— دستو دلیسکی کے کرداروں کی طرح —— تمہارا اپنا گھر ان سے مختلف ہے۔ اس لئے بھی کہ تم زیادہ دولت مند ہو اور تمہارے ابا جان کو بڑے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان پر اپنا اثر قائم رکھنے کا شوق ہے۔

تمہارے ابا جان اس کہانی کے ایک اہم کردار ہیں گو انہیں کچھ معلوم نہیں اور انہوں نے براہ راست تمہارے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ وہ ساری دنیا کے لئے بہت ملنسار اور خلیق آدمی ہیں۔ لیکن اپنے گھر میں وہ بہت سخت ہیں۔ تمہاری امی سے ان کی کبھی نہیں بنی یہ باتیں ایسی ہیں کہ کوئی آسانی سے سمجھ نہیں سکتا۔ میں اور سلیم اکثر تمہارے ابا جان کا نفسیاتی تجزیہ کیا کرتے تھے۔ وہ خاصے مذہبی اور بلا کے با اصول ہیں۔ تمہارے گھریلو جھگڑوں کا مجھے اکثر علم رہتا تھا اور یہ بات میں کبھی نہیں بھولا کہ تمہارا اتنا اچھا، خوشحال خاندان منحوس ستاروں کی زد میں رہا ہے۔

تمہارے متعلق میں نے ساجدہ کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میرے خاموش رہنے اور یونیورسٹی کے ہنگاموں سے دور رہنے کی کوششوں نے کئی دوستوں سے یہ کہلوایا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے —— خود سلیم کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں پریشان ہوں لیکن اکیلے میں ہم ہمیشہ عالمگیر اور بنیادی مسائل پر باتیں کیا کرتے تھے۔

احسان یوں تو سلیم کا سب سے قریبی دوست کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بچپن سے ساتھ رہتے ہیں اور
بیٹ ایک کلاس میں پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ تمہارا عزیز بھی ہے۔ مگر میرا اور سلیم کا تعلق سب سے الگ اور
دانگانہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو چنا تھا۔ اور دھیرے دھیرے قریب آئے تھے۔ وہ دن بہت یادگار
تھے جب میں نے اور سلیم نے اپنی دوستی کے ابتدائی دنوں میں LUST FOR LIFE ساتھ ساتھ پڑھی تھی۔
روزانہ کافی ہاؤس میں الگ بیٹھ کر دن کے پڑھے ہوئے حصوں پر باتیں کیا کرتے تھے۔ وان گاگ نے
ہمیں بہت متاثر کیا تھا۔ (وہ منظر ——— اپنی محبوبہ کے گھر پہونچ کر اس کے باپ کے سامنے جلتی
ہوئی شمع کی لو پر ہتھیلی رکھ دی کہ صرف اتنی دیر ——— صرف اتنی دیر کے لئے جب تک وہ شمع کی لو پر ہاتھ
رکھ سکتا ہے اسے اس لڑکی سے ملنے کی اجازت دے دی جائے ——) ——— وہ پاگل پن ——— احساس
کی شدت ——— ہر جذبہ کو ——— پوری زندگی اور وقت کو اپنے بازوؤں میں لے لینے کی شدید طلب۔
میں کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنے دوستوں اور اپنی پسندیدہ ہستیوں پر ناز ہے جو اپنے اپنے راستے سے ہٹ کر
دوست جمع کئے تھے۔ اور ہم سب یونیورسٹی میں کینٹین کے آگے دائرے میں کرسیاں بچھا کر بیٹھا کرتے تھے
اور سامنے ——— اوپر لڑکیاں اپنے کامن روم جاتے ہوئے اُدھر اشارے کیا کرتی ہیں۔
فلم میں میرے وہ آخری دن تھے۔ صرف کبھی کبھی اسٹوڈیو جانا پڑتا تھا اور وہاں میرا جی اکتانے لگتا
تھا۔ ہفتہ میں ایک دو دن میں ضرور سمندر کے کنارے جایا کرتا تھا۔ تم جانتی ہو سمندر سے مجھے بے پناہ عقیدت
ہے۔ میں نے اپنا بچپن ساحلوں پر تنہا ٹہل کر گذارا ہے اور جیسے ہی سمندر میرے لئے وہ دیوتا ہے جس سے
مجھے پیار بھی ہے اور جس سے میں ڈرتا بھی ہوں اور جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔
میں اپنے ایر بیگ میں ڈبل روٹی، مکھن، سینڈوچ یا اسی قسم کی کوئی کھانے کی چیز رکھ کر کلفٹن
سے بہت دور اکیلا جا بیٹھتا تھا۔ اور گھنٹوں یا تو چپ ریت پر لیٹا رہتا تھا یا کبھی کبھی کچھ پڑھنے یا لکھنے
کی کوشش کرتا تھا۔
فون پر تم سے پہلی ملاقات کے بعد میں نے سوچا میں تمہارے نام ایک طویل خط لکھوں اور اس میں
اپنے سارے حالات و نظریات کی تشریح کر دوں۔ اس میں ہر بات ہو جو میں نے سوچی ہے اور یہ کہ میں تم
سے کتنی محبت کرتا ہوں اور یہ محبت میری بقیہ زندگی کے لئے کتنی اہم ہے۔
میں نے ایک کاپی خریدی اور اس پر ایک دن تمہارے نام خط شروع کیا۔ وہ خط افسانے کی طرح
شروع ہوتا تھا اور پہلے ہی دن اس کاپی کے بیس صفحات بے سروپا باتوں سے بھر گئے تھے۔ ایک اور دن میں
اسے کیماڑی لے گیا۔ وہاں ایک پتلا سا راستہ سمندر کے اندر دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے کنارے کے پتھروں

پہ بیٹھ کر میں نے اپنے معصوم۔ بچکانہ اور بھولے جیسے جذبات کو لفظوں کی بالٹیوں میں لینے کی کوشش کی۔ بہت سی اچھی اچھی باتیں لکھیں۔ اور ایک ہفتے بعد اس کاپی کے تقریباً سو صفحے بھر گئے۔

لیکن نہ جانے کیوں ــــ اپنے آپ پر یوں بے اندازہ بھروسہ ہونے کے باوجود مجھے یہ خوف ہر لمحہ ستاتا تھا کہ میں تم سے کبھی نہیں مل پاؤں گا اور اگر کسی نے میری تحریر دیکھ لی تو میرا مذاق اڑایا جائے گا۔ اور ایک بار جب وہ کاپی ساتھ لئے منڈوہ جانے سے پہلے پیٹر پر کھڑا تھا تو شاید مایوسی کے عالم میں ــــ مغلوب ہو کر ــــ میں نے وہ کاپی ہاتھ سے چھوڑ دی۔ میلے کثیف پانی پر وہ چھپ سے گری۔ کافی دیر تک ہچکولے کھاتی ہوئی سطح پر رہی پھر دھیرے دھیرے نیچے چلی گئی۔

اُس رات میں نے اپنے آپ کو رُلایا۔

یہ اکتوبر کے ابتدائی دنوں کی باتیں ہیں اور اپنی بہت سی باتیں میں بھولتا جا رہا ہوں جس حافظے پر مجھے ناز تھا وہ اب مجھے بٹھا کر پہروں اندھیرے میں ڈبکیاں دیتا ہے۔ میں نے ڈائری بھی کبھی نہیں لکھی۔ صرف تاریخوں پر نشان ہیں۔ جس جس دن تمہیں دیکھا یا تم سے بات کی اپنی ڈائری میں اس تاریخ پر ایک چھوٹا سا دائرہ بنا لیا۔

ایسا ہی ایک نشان ــــ اکتوبر کے صفحے پر ہے۔ اس دن کیمرک ہال میں گرلز کانگریس کا کوئی فنکشن تھا اور اس میں تم تینوں بہنیں بھی جا رہی تھیں۔ صبح میں تمہارے یہاں بیٹھا تھا تو یاد آیا کہ اگر میں اپنی کار میں تمہیں چھوڑ آؤں تو شاید تم سے بات ہو جائے۔ میں نے سلیم سے کہا اور تم راضی ہو گئیں۔

ساجدہ اور میری چھوٹی بہن کی دوسری بہت سی سہیلیاں بھی جا رہی تھیں۔ میں پہلے انہیں چھوڑ کر اکیلا ساجدہ کو تمہیں لے جانے کے لئے ساتھ لایا۔ سلیم کے کمرے کے دروازے کے قریب میں نے کار کھڑی کی۔ تم نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ہمیں دیکھا اور دو بہنیں برقعہ اوڑھے ــــ دوہرے نقاب چہرے پر ڈالے باہر آئیں۔

"سلام علیکم ــــ" تم نے کہا ــــ صرف ساجدہ سے یا ہم دونوں سے ــــ "مزاج عالی!"

جاتے ہوئے تم سے براہِ راست کوئی بات نہ ہوئی۔ اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم اپنے کالج کے جنرل سکریٹری کے عہدے کے لئے الیکشن لڑ رہی ہو جو دو دن بعد ہونے والا تھا۔ گھر سے تھوڑی دور جا کر تم نے نقاب الٹ دیئے تھے اور میں پیچھے دیکھنے والے آئینے میں تمہارے دُھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بے تاب تھا۔

ساجدہ وغیرہ کو واپس لانے کے لئے مجھے چھ بجے وہاں پھر پہنچنا تھا۔ میں پہلے ہی چلا گیا ــــ اندر میدان میں میں نے دور کار کھڑی کی اور ہال کی طرف آیا۔ وہاں چوڑے برآمدے میں لڑکیاں پھیلی ہوئی تھیں اور اندر پروگرام ہو رہا تھا۔

میں نے تمہیں دیکھا۔ سفید قمیض، سفید شلوار ــــ بالوں میں گلابی ربن ــــ تم مصروف نظر آرہی تھیں اور بار بار اُدھر آتی تھیں جدھر پالو وغیرہ کا انتظام تھا۔ تمہارا چلنے کا یہ وقار، پراعتماد انداز مجھے اچھا لگا تھا۔ میں اُس طرف گیا اور بڑی کارستانی سے بالکل تمہارے سامنے آگیا۔

"ٹھہریئے ــــ"

تم چونک پڑیں۔ مجھے دیکھا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ فنکشن کب ختم ہوگا۔ معلوم ہوا دیر ہے۔ میں نے کہا میں سامنے کار میں بیٹھا ہوں۔ تم ساجدہ کو بتادو کہ میں آگیا ہوں۔ تم نے بڑے پیار سے اپنا سر ہلایا۔ ایک لحظہ ہم خاموش کھڑے رہے۔ پھر میں پیچھے ہٹ آیا۔

کار میں بیٹھ کر میں تمہیں دیکھتا رہا۔ تم جان بوجھ کر باہر رہیں۔ ہال کے کسی دروازے میں کھڑی تھیں تو اس طرح کہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔ یہ لڑکیوں کے انداز ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ بھی تم نے مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا اور اندر بھی نہیں گئیں۔ ساجدہ باہر آئی۔ اسنے مجھے دیکھا۔ تم اس کے قریب کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ساجدہ میرے پاس کار تک آئی تو میں نے شکایت کی کہ میں کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ وہ بولی اسنے تو بس اسی وقت مجھے دیکھا تھا۔

"تمہیں ثروت نے نہیں بتایا؟"

"نہیں تو ــــ میں نے خود تمہیں دیکھ کر اس سے کہا کہ دیکھو اعظم آگیا ہے۔ اسے تو پتہ ہی نہیں تھا۔"

تمہاری اس رازداری سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تم یقیناً مجھ میں دلچسپی لے رہی تھیں کیا یہ میری قوت ارادی تھی ــــ ؟ یا تم پہلے میرے تصور کی اسیر ہی تھیں؟

واپسی میں ساری لڑکیوں سے کار بھر گئی۔ ہم پہلے تمہیں چھوڑنے گئے۔ جاتے ہوئے تم نے محض مجھے سنانے کے لئے پروگرام پر تنقید شروع کی اور جو چھوٹے چھوٹے ڈرامے ہوئے تھے ان کی ہدایت کاری پر تبصرے کرتی رہیں۔

باتوں باتوں میں تم نے خود بتایا کہ اپنے کالج کے ایک ٹیبلو میں تم لالے کا پھول بنی تھیں۔

یہ بات تم نے صرف مجھے بتائی تھی۔

اس رات آتے ہی میں نے پرانی کتابوں کے انبار میں سے "بانگ درا" نکالی جو ساجدہ کو اسکول کے دنوں میں انعام میں ملی تھی۔ اس میں وہ نظم (محبت) تھی جس پر کئے گئے ٹیبلو میں تم نے لالے کے پھول کا کردار ادا کیا تھا۔

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی۔ داغ پائے لالہ زاروں نے

اس شعر پر میں نے بے تحاشہ لکیریں کھینچیں۔ ساجدہ نے خوب میرا مذاق اڑایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہونے والے الیکشن میں تمہاری پوزیشن بہت اچھی ہے اور تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ یہ جان کر کہ تم اپنے کالج کی سب سے مقبول لڑکی ہو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے سوچا تم اس لائق ہو کہ میں تم سے محبت کروں۔ تم اتنی اچھی ہو کہ میں تمہارے لئے اپنے سارے اثاثے کو داؤ پر لگا دوں۔

تیسرے دن — اکتوبر کو تمہارا الیکشن تھا۔ میں نے وہ دن بڑی بے تابی میں گذارے۔ دو تین بار تمہارے گھر فون کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ لالے کے پھول کو میں نے اسی رات سے اپنی محبت کا سمبل بنا لیا تھا ایسے تمام شعر ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرنا شروع کر دیئے تھے جن میں لالے کا ذکر ہو۔

الیکشن والے دن دوپہر کو میں اور سلیم یونیورسٹی سے ساتھ لوٹے۔ آرام باغ پر بس کا انتظار کرتے ہوئے سلیم نے تمہارے الیکشن کا ذکر کیا۔ اسے نتیجہ معلوم کرنے کی بڑی فکر تھی۔ میں اپنا راز چھپائے اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

گھر آکر میں نے کمروں میں ٹہل ٹہل کر ساجدہ کا انتظار کیا۔ وہ ڈھائی بجے کے بعد آئی۔ پہلے اس نے مجھے خوب ستایا۔ پھر جب قلفیں کھانے، کتابیں خرید کر دینے کے کئی وعدے کرالئے تو اس نے بتایا کہ تم بہت شاندار طریقے پر کئی سو ووٹوں کی اکثریت سے جنرل سکریٹری منتخب ہوئی ہو۔ ساجدہ خود بہت خوش تھی۔

جی چاہا تمہیں اسی وقت مبارکباد دی جائے — ایک پل سیدھا نہ بیٹھا گیا۔ ایک دو گھنٹہ میں میں صدر چلا گیا۔ تمہیں فون کرنا تھا اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ تم مل جاؤ — میری اس کہانی میں ٹیلی فون بوتھوں کا ایک اہم مقام ہے۔ پبلک فون عام طور پر خراب ہوتے ہیں۔ ڈاک خانوں اور صدر کے مرکزی سینما گھروں میں لوگ اکثر لمبی لائن میں کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے اس شام "پام گروو" سے تمہیں فون کیا۔

میں آواز نہ پہچان پایا۔
"ذرا سلیم کو بلا دیجئے —"
"سلیم تو نہیں ہیں"
میرا جی چاہا میں پوچھوں کون بول رہا ہے۔ تم ہو تو تمہیں مبارک باد دوں۔ کوئی اور بات ہو۔ لیکن میں ہمیشہ سے صرف تمنا کرتا آیا ہوں۔ ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز اٹھائی نہیں جاتی۔

"ان سے کہہ دیجئے گا کہ اعظم نے فون کیا تھا۔"

"سلام علیکم۔" یہ تم تھیں اور تم نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے اپنے پیارے مخصوص انداز میں سلام کیا تھا۔

"ثروت صاحبہ ۔۔۔؟"

"جی ہاں۔"

"ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے سعیدہ سے آپ کا رزلٹ معلوم ہوا ۔۔۔ لیکن یہ سخت بے ایمانی ہے ۔۔۔"

"کیا ۔۔۔؟"

"آپ کو اتنے بہت سے ووٹوں سے جیتنے کی کیا ضرورت تھی۔"

تم ہنسیں ۔۔۔ اس دن ہم نے کافی باتیں کیں۔ میں نے یونہی تمہیں مشورہ دیا کہ تم انٹر کالجیٹ باڈی وغیرہ سے الگ رہنا۔ (سیاست سے ہمارے پورے گروپ کو سخت نفرت رہا کرتی تھی) ۔۔۔ اور یہ کہ تم لڑکیوں کے سارے کالجوں کے عہدیداروں کی ایک انجمن بنا لو اور اس کی لیڈر بن جاؤ۔

پتہ نہیں کس طرح میری تعلیم کا ذکر ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں تو "آپ سے بہت جونیر ۔۔۔" یعنی انٹر میں ہوں۔ اس پر تم نے میری ذہانت، بغیر کچھ پڑھے فرسٹ ایر کا امتحان پاس کر لینے اور اچھی انگریزی جاننے کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے کہا تھا انگریزی تو تمہاری بھی اچھی ہونی چاہئے۔ تم نے سلیم سے میری ایک کتاب "ڈائری آف این فرانک" پڑھنے کو لی تھی۔

تم نے کہا کہ تمہاری ایک سہیلی سعیدہ اس کا ترجمہ کر رہی ہے لیکن اسکے ترجمہ کے لئے میرا انداز مناسب ہوگا ۔۔۔ تم نے بتایا کہ تم بھی باقاعدگی سے ڈائری لکھتی ہو۔

"آپ کی ڈائری بھی اتنی اچھی ہوتی ہے ۔۔۔؟" میں نے پوچھا تھا۔

تمہارا لہجہ ۔۔۔ تمہاری آواز۔ تمہاری بے تکلفی اور میرے حالات میں دلچسپی ۔۔۔ ان تمام باتوں سے میں ڈرنے لگا تھا۔ کہیں میں نے تمہیں اپنے لئے ناگزیر سمجھ لیا تو کیا ہوگا۔

رات میں تمہارے گھر گیا۔ سلیم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے فون پر تم سے ملاقات کے متعلق نہیں بتایا۔ وہ خود پریشان تھا اس لئے کہ صفیہ بغیر کسی وجہ کے اس رات الگ روٹھی پڑی تھی۔ ہم عمر ہونے اور ہمیشہ ساتھ رہنے کے باوجود تم دونوں بہنوں میں ایک عجیب کھنچاؤ ۔۔۔ رشک و حسد کا رشتہ تھا۔

اس دن کی گفتگو کے بعد میں نے مسلسل تمہارے متعلق سوچنا شروع کر دیا وہ پر امید ۔۔۔ دھڑکتے

ہوئے دن اب لگتا ہے میں نے نہیں گذارے تھے اب مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ آدمی اپنی جذباتی کیفیات کے ساتھ ساتھ کس طرح اپنے عقیدے اپنے نظریئے بدلتا رہتا ہے پتہ نہیں چیزیں اصل میں کیا معنی ہیں۔ پتہ نہیں ذہن اپنے علم کے صحرا میں کتنے سرابوں پر یقین رکھتا ہے۔

میں نے پہلی بار اپنی زندگی کے بارے میں یوں سوچا کہ وہ کوئی قیمتی۔ عزیز۔ سوچ سمجھ کر بسر کی جانے والی چیز ہے۔ دراصل میں نے محبت کا یوں انتظار کیا تھا جیسے کوئی ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کی راہ دیکھے۔ تم جانتی ہو میں بہت حساس ہوں۔ بہت بچپن سے میری آرزو تھی کہ میں کسی سے بے پناہ محبت کروں۔ گو میں نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گذاری میں نے لوگوں کو پسپا ہوتے ہوئے دیکھا اور ان کی محرومیوں کا رازدار بنا۔ میرے سامنے ـــ میرے ذاتی تجربے میں ایسے حادثے آئے جب زندگی کی خوبصورت ترین جذبات نے اپنی مکروہ ڈراؤنی صورتیں دکھائیں۔ میں نے ہر سہارے کو منہ پھیر کر لوٹتے ہوئے دیکھا۔ پھر بھی ـــ محبت کے اپنے بچکانہ اور جذباتی نظریہ کو میں اپنے سینے سے لگائے رہا۔

مطلب یہ نہیں کہ میں اصولاً محبت کی عظمت کا قائل تھا۔ میں نے تو اپنے لئے ایک خواب بنایا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ میں اور وہ لڑکی جس سے میں محبت کروں، ہم دونوں بس ایک دوسرے کے لئے جئیں ـــ اور جب ہم اس آگ کے طوفان سے گذریں تو ہمارے ملبوس کے کنارے بھی نہ جھلسیں۔

میں نے تمہیں دیکھا تو تمہیں چن لیا۔ ـــ پھر آہستہ آہستہ میری تصوراتی محبوبہ نے تمہارا جسم ـــ تمہاری صورت ـــ تمہارا نام پالیا۔

ـــ اکتوبر کے بعد ایک ہفتہ تک میری ڈائری میں چھوٹے دائرے کا نشان نہیں۔ ہر روز شام کو میں سلیم کو فون کرتا کبھی فون مصروف ہوتا تو دوبارہ فون کرنے کے لئے دیر دیر تک کھڑا رہتا۔ تمہارے ابا جان اٹھاتے تو اس انتظار میں بے مصرف ٹہلتا کہ ان کے مہمان رخصت ہو جائیں تو وہ بیٹھنے کے کمرے سے چلے جائیں اور میں فون کروں تو تم اٹھاؤ ـــ نیو ٹاؤن پوسٹ آفس سے تمہیں فون کرنا ہے تو سنکار پور کالونی کی سڑکوں پر گھوم رہا ہوں۔ صدر میں ہوں تو پیلیس کے آس پاس بے چین، بے تاب پھر رہا ہوں۔

ایک دن خیال آیا تمہارے لئے کوئی تحفہ خریدوں میں اور سلیم ابتداء سے ایک دوسرے کو کتابیں دیتے آئے تھے۔ سالگرہ پر تو یہ بات رسم سی بن چکی تھی ـــ (تھوڑے عرصے پہلے میں نے سلیم کے لئے ـــ جو خریدی تھی اور اس پر میں نے لکھا تھا ـــ بے حد عزیز سلیم کے لئے ـــ راہ نوردِ شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار ملے ـــ) میں تمہارے بارے میں کم جانتا تھا۔ ایک بار تمہارے لئے بے شمار کتابیں نکال نکال کر دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں تم کیا پسند کرو۔ ویسے مجھے تمہارے ذوق کے بارے میں کوئی خاص خوش فہمی نہ تھی۔

تمہیں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ہونا چاہیئے تھا جو مشاعروں میں سستے شعر اپنی کاپیوں میں لکھتی ہیں۔ ایسی تمام لڑکیاں شکیل بدایونی قسم کے شاعروں کو ضرور پسند کرتی ہیں۔ میں نے تمہارے لئے 'شبستان' خرید لی۔ یہ جانتے ہوئے کہ شاید وہ تم تک نہ پہنچے۔

ہم شام کے بعد کیفے نسیم میں بیٹھا کرتے تھے۔ میرے اور سلیم کے علاوہ ظریف اکثر ہوا کرتا تھا۔ تم جانتی ہو وہ مجھ سے اور سلیم سے کتنی محبت کرتا تھا۔ دوستی اور دوسرے رشتوں کے تعصباتی تصورات کے ساتھ ساتھ اس میں عجیب زندگی کا انسانی فشار بھرا پڑا تھا۔ وہ تمہارا کھوج لگانے کی ہر ممکن جستجو کیا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ "کوئی ہے" اور یہ نہ جاننا کہ وہ کون ہے، اسے اپنی توہین لگتا تھا۔ سلیم کے سامنے وہ اس بات کا ذکر کرتا تو سلیم سر جھکا کر مسکرا دیتا۔ کیونکہ وہ اپنے تئیں یہ سمجھتا تھا کہ میری وہ "تصوراتی محبوبہ" جس کا میں زمانے سے ذکر کرتا آیا ہوں، ہو نہ ہو میرے خوابوں کی مکین ہے۔

تم اب میرے لئے لالہ کا پھول تھیں۔ اس ہفتہ کئی بار گھر سے گھر جانا ہوا اور میں نے یہ حماقت کی کہ فائل کا غذوں پر — اخبار کے سادے کناروں پر — سگریٹ کے پیکٹوں پر لالے کا پھول' اور تمہارا ٹیلیفون والا شعر اور اسی قسم کی دوسری باتیں لکھ دیں۔ ایک بار میں نے لکھا کہ اس دنیا میں کیا کچھ نہ ہوا ہے۔ اہرام مصر کے زمانے سے لے کر اب تک لوگوں نے کیا کیا نہ پایا ہے۔ کنیزیں شہزادیاں بنی ہیں۔ غلاموں نے بادشاہت کی ہے۔ کیا انہوں نے اتفاقات سے پہلے اندازہ کائنات کی اس دنیا میں مجھے لالے کا ایک پھول نہیں ملے گا —؟

میں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے شعر جمع کئے تھے جن میں لالے کا ذکر ہو۔ میں نے خود شعر کہے۔ چراغ لالہ جلا ہے مرے شبستاں میں اور لالہ گوں ہیں تری یادیں قسم کی کچی باتیں۔

— اکتوبر کے جب میں نے نیڈ ٹاؤن سے تمہیں فون کیا تو تم سے بات ہوئی۔ پہلے کی طرح تم نے پہل کی۔ تم ہمارے یہاں آنے والی تھیں۔ میں نے کہا ہمارا مکان بہت اچھا نہیں ہے۔ تم بولیں ہم مکان نہیں دیکھنے لوگ دیکھتے ہیں۔ اس دن میرے افسانوں کا بھی ذکر ہوا۔ تم نے پوچھا میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میرے ایک افسانے کی تعریف کی جس کا اختتام یہ تھا کہ ایک کردار کچھ کہنے کی کوشش میں ایک بالکل مختلف بات کہہ دیتا ہے۔

"اب اکثر ہوتا ہے —" تم نے کہا — "ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن بالکل ایک دوسری بات کہہ دیتے ہیں۔"

صرف اس لئے کہ تم سے آئندہ ملاقات کی سبیل ہو۔ میں نے کہا مجھے تم سے (— آپ سے — ظاہر ہے) اپنے ایک افسانے کی ایک لڑکی کے کردار کے بارے میں رائے لینا ہے۔

"آپ ساجدہ سے کیوں نہیں پوچھ لیتے ۔۔۔"

"ساجدہ میں اور آپ میں تو فرق ہے نا ۔۔۔"

تم سنبھلیں ۔۔۔ مان گئیں ۔۔۔ میں نے اندازہ لگایا تم اسے اپنی ہمت افزائی سمجھ رہی ہو ۔ میں نے اتنا اچھا افسانہ نگار، تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں ۔

"فرمائیے ۔"

"ابھی نہیں ۔۔۔ پھر کسی دن ۔"

اس طرح کم از کم تم پر ایک گفتگو ادھار ہو گئی ۔

یہ وہی دن تھے جب میں نے لوگوں سے کٹنا شروع کیا ۔ تنہا، اپنے آپ میں مگن رہنا ۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں کرنا ۔۔۔ جاگتے میں خواب دیکھنا میرا شعار بن گیا ۔ میرے طرح طرح کے دوست ہیں ۔ ایسے لوگ ہیں جو مجھے اپنے سب سے عزیز دوست کی طرح برتتے ہیں لیکن کسی کو بھی میں نے اپنی پوری جھلک نہیں دکھائی ۔ میں اپنے آپ کو پراسرار اور پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا ۔ میں چاہتا تھا صرف تم مجھے جانو ۔۔۔ صرف تم میری رازدار ہو ۔۔۔ یہ سب شرارت سلطانہ کہیں اپنے آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں ۔ اور سب سے زیادہ مجھے اپنے جذبات پر ناز ہے میں سمجھتا تھا کہ جب میں مکمل طور پر تمہارا ہوں تو میرے کسی دوست کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ مجھے اپنانے میں تمہارا حصہ دار بنے ۔ گو ساجدہ ۔۔۔ اور بعد میں ظریف ۔۔۔ میری محبت کے رازدار بنے بہت سی باتیں ہیں جنہیں یہ بھی جانتے ۔

میں نے سلیم کو بتایا تھا کہ ہر دوست سے ملنے کے لئے مجھے اپنے اوپر ایک غلاف ڈالنا پڑتا ہے ۔ صرف وہ ایسا تھا کہ اس کے سامنے میں نے کبھی شعوری طور پر اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کی ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے بازو پھیلا کر ملا کرتے تھے ۔ ہماری ایسی ملاقاتیں ہوئی ہیں کہ ہم ملے اور تنہا، خاموش بیٹھے رہے ۔ گھنٹوں ہم میں سے کوئی نہیں بولا ۔ پھر بھی جیسے ہم نے باتیں کیں اور ایک دوسرے کو سمجھا ۔

جب میں فلم میں تھا اور سلیم اس سلسلے میں بہت مصروف تھا تو کم و بیش ایک سال تک ہماری ملاقات نہ ہوئی ۔ ہم جیسے دو دوستوں کا ایک شہر میں رہ کر اتنے عرصے جدا رہنا سب کو عجیب لگے گا ۔۔۔ پھر ایک دن ۔ عیدگاہ کے قریب ہمارا سامنا ہوا ۔ ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے ۔ منٹوں میں دنوں، مہینوں کی باتیں ہوئیں ۔۔۔ کہاں ہو ۔۔۔ کیسے ہو ۔۔۔ تھوڑی سی دیر کی باتوں نے اتنے لمبے عرصے کو جس میں ہم دونوں غیر معمولی حالات سے گذرے تھے پاٹ دیا ۔

لیکن جس موڑ تک میری کہانی پہنچی ہے وہاں مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ سلیم میرے لئے ایک متوقع جذبیت

کے کنارے پر کھڑا ہے۔ احساس جرم نے میرے اندر سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو بار میں اسے سب بتاتے
بتاتے رہ گیا۔ یہ کہہ کر اپنے آپ کو روکا کہ ابھی تو کچھ ہونے والا ہے۔ ابھی تم بہت دور ہو۔

میری ڈائری کے اگلے صفحات سادہ ہیں۔ ۱۹۵۹ء کا پورا سال یوں تو سادہ ہے اور صرف ان آخری
تاریخوں میں چھوٹے نشانات کے ساتھ ایک آدھ جملہ لکھا ہوا ہے۔ باقی جو کچھ ہوا۔ جن کیفیات سے میں گزرا۔ اور
تمہارے علاوہ میری عادتوں سے بھری زندگی نے جن نقطوں کو چھوا ان کا کوئی اندراج باقاعدہ میرے پاس نہیں۔
ان دنوں اشرووڈ کا ایک خود نوشتی ناول پڑھ کر یہ خواہش بڑی شدت سے جاگی تھی کہ میں اپنی نوجوانی کے دنوں پر
ایک رپورتاژ لکھوں گا، جس میں ان سارے ہمہ رنگ کرداروں کا لب لباب نچوڑ دوں گا جن سے میرا سابقہ
پڑا تھا۔ پر میں نے اپنی یادداشت کے لئے بھی ان کے بارے میں کچھ نوٹ نہیں رکھا۔ اور اب جب میں
تمہاری محبت کے زخم سے پیپ بہا رہا ہوں تو میرے ذہن پر سب گڈ مڈ ہو چکا ہے۔ تمہاری باتیں تمہاری
آمد کے پہلے کی باتوں پر چھپ چکی ہیں۔ بہت سی پرانی باتیں عجیب انداز میں تم سے منسلک لگتی ہیں۔

ہماری فلم کی ایڈیٹنگ ہو رہی تھی اور ہم اثرات کی منظوری کیا کرتے تھے۔ چھوٹی ڈبیوں کے چھوٹے
پردے پر فلم کے کردار بہرے لگتے ہوئے مکالمے بولا کرتے تھے اور میں اونگھتا ہوا تمہارے متعلق سوچا کرتا تھا۔ صبح
ہونے سے ذرا پہلے میں ایڈیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کے باہر سیڑھیوں پر اکیلا بیٹھ کر نیند کے خمار میں تمہاری محبت کا
نشہ گہرا محسوس کرتا تھا۔ ہر بات کا — ہر تصور کا — ہر لمحہ کا رشتہ تم سے جا ملتا تھا۔ یہ واقعی نشہ تھا۔
مجھے شراب اپنا نہیں سکی۔ اس کا نشہ میں صرف سرکشی اور تجربے کے لیے برداشت کر لیتا تھا لیکن تمہاری محبت
— میں جان بوجھ کر اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ میں پناہ لے رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میرا اپنے اوپر اختیار
کم ہوتا جا رہا تھا۔

نومبر کو — پورے نو دن بعد — تم نے مجھے فون پر اپنے اسی پیارے تیزی سے کہے جانے
والے انداز میں سلام کیا۔ ہم دونوں نے پورے تکلف سے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔

"آپ مجھ سے کچھ پوچھنے والے تھے۔" تم نے بالآخر کہا۔

"ہاں — میں نے بہت سنبھل کر ابتدا کی — ویسے مجھے پتہ نہیں میں آپ کو پوری بات سمجھا بھی سکوں
گا یا نہیں۔ دراصل میں لڑکیوں کو ٹھیک طرح جانتا نہیں۔ میرے افسانوں میں پتہ نہیں لڑکیاں کیسی لگتی ہیں۔"

تم شوخی سے بولیں — بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"ان کے کردار مکمل ہوتے ہیں؟"

"بالکل مکمل۔"

میں جانتا تھا تم میری کتنی مداح ہو۔

"لیکن ایک کہانی ہے جو ادھوری لکھی پڑی ہے ایک دو باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ اگر آپ میری مدد کر سکیں ــــ ؟"

"جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔"

میں بہت ڈر رہا تھا۔ جو کچھ کہنا تھا وہ بہر حال کہنا تھا۔ کیونکہ اسکو کھو دینے کے بعد دوسرا ایسا موقع ملنا دشوار نظر آرہا تھا۔ ساتھ ساتھ ہی محبت وغیرہ قسم کے لفظوں سے بچنا چاہتا تھا۔

"ایک کہانی ہے ــــ" میں نے ہمت کی ــــ میں نے انہیں بتایا کہ فرض کیجئے الفنسٹن اسٹریٹ یا صدر کے کسی اور صاف ستھرے علاقہ میں ایک نوجوان جا رہا ہے۔ اس کے کپڑے دھلے ہوئے مگر بے ترتیب ہیں۔ بال الجھے الجھے سے ہیں اور وہ کھویا ہوا ــــ سر جھکا کر چل رہا ہے۔ ایک موڑ پر سامنے سے ایک خاتون ــــ خاصی فیشن ایبل ــــ ساڑھی پہنے ــــ آرہی ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اور اس طرح ایک دوسرے کے سامنے آجانے کے امکانات کتنا تھا، ان کے ذہن میں نہیں تھے۔

نوجوان نے انہیں سلام کیا۔ اس کے چہرے پر بڑی تلخ مسکراہٹ ہے۔

خاتون کچھ گھبرا رہی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ کی تھیلیاں ہیں۔ وہ کچھ خرید و فروخت کر رہی ہیں۔

بات یوں ہے کہ اب سے کچھ سال پہلے ــــ سمجھ لیجئے تین یا چار ــــ وہ دونوں کالج میں ساتھ پڑھا کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ وہ نوجوان بہت ذہین اور پسند کئے جانے کے قابل تھا۔ وہ خاتون کالج کی چیدہ لڑکیوں میں سے تھیں۔ لیکن پتہ نہیں کیا ہوا۔ (یہ میں نے نہیں سوچا تھا) کہ ان صاحبہ کی کہیں شادی ہوگئی۔ اور نوجوان اندرون ملک چلا گیا۔

اب وہ ملے تو خاتون نے بڑی تشویش سے پوچھا کہ وہ کہاں تھا۔ کیوں اس اپنے آپ کو ضائع کیا اور اب کیا کر رہا ہے۔

نوجوان نے کچھ کچھ ہکلاتے بولے۔ اور خاتون سے گذارش کی کہ وہ اس کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے کسی کیفے میں بیٹھ لیں۔ اس سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔

خاتون پس و پیش کرتی ہیں۔ وہ اب شادی شدہ ہیں اور ایسے کام بذ نظر آنے والے نوجوان کے ساتھ دیکھا جانا ان کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔

نوجوان ضد کرتا ہے۔ صرف ایک بار ــــ آخری بار ــــ جیسے یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال

ہے اور جو گفتگو اسے کرنا ہے وہ بے پناہ اہمیت رکھتی ہے۔

بہرحال ـــــ وہ دونوں ایک کیفے میں (جس نے "اے۔ بی۔ سی" کا نام لیا تھا ـــ جاکر بیٹھتے ہیں۔

نوجوان گفتگو کا آغاز کرتا ہے۔ وہ صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہے۔ کیا خاتون بھی پہلے اس میں دلچسپی لیتی تھیں ـ ـ یا نہیں۔

وہ اس کا جواب نہیں دینا چاہتیں ـــــ اب ان باتوں سے کیا حاصل ـ ـ

لیکن نوجوان مصر ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اسے کبھی پسند نہیں کیا گیا تو وہ اس بات کا افسوس کئے بغیر کہ اس نے کچھ کھویا ہے نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرے

اور اگر اصلیت یہ نہ ہو تو ـــــ؟

تو کم از کم اسے یہ کرب تو نہ رہے کہ کبھی کسی نے اسے پسند نہیں کیا۔ وہ اس بات کو اپنے لئے سہارا سمجھے گا اور با مقصد زندگی گذارنے کی کوشش کرے گا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ـــ میں نے کہا: کہ محترمہ کیا کہیں گی ـــ"

"میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ مجھے شادی شدہ ہونے کا تجربہ نہیں"

"اہا! تو یہ آپ ـــ"

"ظاہر ہے ـــ" تمہاری آواز مسکرائی۔

"میں آپ کو بتاؤں میں نے اسے کس طرح ختم کیا تھا۔ وہ خاتون جواب دینے سے کتراتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ تم کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔ اپنی خوبیوں کو استعمال کرو۔ یہ تم نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے ـــ لیکن نوجوان بضد ہے وہ جواب چاہتا ہے۔ دو چار سالوں سے یہ تجسس اس کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہے اسے اب جان ہی لینا چاہئے کہ وہ محترمہ کیا واقعی اس سے ـــ یعنی اس میں دلچسپی لیتی تھیں یا نہیں۔"

"جی ـــ"

"خاتون نے کہا اگر میں نے تمہیں یہ بتایا کہ میں تمہارے متعلق نہیں سوچتی تھی تو تم ساری زندگی تاسف کرو گے۔ اور اگر یہ کہ میں واقعی تم میں دلچسپی لیتی تھی تو تمہیں اس سے بھی زیادہ رنج ہوگا۔ وہ اٹھنا چاہتی ہیں لیکن نوجوان ان کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر خاتون بہت سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں ـــ جناب ـــ آپ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ میں نے کبھی تمہارے متعلق نہیں سوچا ـــ کبھی تم میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ دراصل میں تمہیں سخت ناپسند کرتی رہی ہوں۔ اور جب بھی تم سے ملی ہوں تمہیں زبردستی برداشت کیا ہے نوجوان

سر جھکا لیتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اب تم اسی وقت اٹھ کر چلے جاؤ۔ اس لئے کہ میں تمہارے ساتھ باہر نکلنا پسند نہیں کرتی اور آئندہ کبھی مجھ سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ نوجوان ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ وہ مایوس ہو کر اٹھتا ہے اور تھکے ہوئے قدموں سے باہر چلا جاتا ہے۔ اکیلے ہوتے ہی خاتون بری طرح رونے لگتی ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس نوجوان سے بے حد ——— میرا مطلب ہے اس میں شدید دلچسپی لیا کرتی تھیں ——— یہ اختتام کیسا ہے ؟"

"بہت اچھا ———" تم متاثر ہو گئی تھیں۔

"لیکن یہ تو بتایئے ——— لڑکیاں تو پسند کرتی ہیں کہ کوئی ان میں دلچسپی لے۔ پھر وہ اتنی عجیب حرکت کر سکتی ہیں ——— ؟"

"یہ بات تو لڑکے بھی پسند کرتے ہیں۔ کہ کوئی ان میں دلچسپی لے۔"

"لیکن لڑکیاں خاص طور پر۔"

"شاید۔"

"میں نے یہ کہانی ابھی آدھی لکھی ہے۔ آپ سوچیں کہ اس کا اختتام کیا اچھا رہے گا۔ زور اس بات پر دینا ہے کہ وہ محترمہ اس نوجوان میں پوری پوری دلچسپی لیا کرتی تھیں۔"

"میں سوچوں گی۔"

"ایک بات بتایئے ——— لڑکیاں ہر بات برداشت کیوں کر لیتی ہیں ؟"

تم رکیں ———" سب لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں۔ جیسے میں ہوں ——— میرا جو جی چاہتا ہے میں کرتی ہوں ———"

"مجھے ایسی کہانیاں لکھنا پسند نہیں ———" میں نے کہا تھا ——— "میں نہیں چاہتا کوئی نوجوان اس طرح کسی لڑکی سے ملے۔"

تم چپ رہی تھیں۔

"آپ ہمارے یہاں کب آ رہی ہیں ——— ؟"

"دیکھئے ——— شاید جلد آنا ہو۔"

اس شام جو باتیں ہوئی تھیں وہ بہت تھیں۔ میرے دل میں یہ آس جڑ پکڑ رہی تھی کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور ملو گی۔

زندگی کے سارے ہنگامے پس منظر میں میری دھڑکنیں چھپائے جاری ہیں۔ روز چھ بجے کے قریب تمہا

گھر فون کر کے تم سے بات کرنے کی آرزو کئی دن ناکام ہوتی رہی۔ پھر ایک اتوار سہ پہر کے وقت تمہیں ایک انگریزی اخبار کے نیوز روم سے فون کیا۔ اس وقت کمرے میں صرف دو حضرات اور کافی اور میں نے کافی کھل کر تم سے بات کی۔

"ان دنوں آپ سے کہنے کے لئے بہت سی باتیں جمع ہو گئیں ... "

"کہئے ___"

"اس وقت نہیں کہی جا سکیں۔"

"کیوں ؟"

"اگر آپ کو دو دن روزانہ کئی گھنٹے کوئی بات روکنی پڑے تو وہ تھوڑی سی دیر میں کیسے کہی جا سکتی ہے۔"

تم چپ ہو گئیں ___ مجھے یوں لگا جیسے میں نے تمہارے سانس لینے کی آواز سنی۔

اور میں نے کہا تھا ___ "میں نے آپ کے لئے شبستان خرید لیا ہے۔"

"اتنی عنایت کیوں ___ ؟" تمہاری آواز میں خاصہ حجاب تھا۔

"یونہی ___ دوکان کے قریب سے گذر رہا تھا۔ خرید لی۔ دیکھیے میں نے اس پر لکھا کچھ نہیں ___ آپ جب ہمارے یہاں آئیں تو خود لے جائیے گا۔ یا ساجدہ سے مانگ لیجئے گا۔"

تم خاموش رہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے تحفے کا ذکر بھی پہلی بار اسی دن کیا ___ میں نے کہا ___ "ایک اور تحفہ آپ کو دینا ہے جو میرے پاس پانچ چھ سال سے ہے۔"

"کیا ہے" ___ تم نے پوچھا۔

"میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ وہ بے حد ___ بے حد اچھا تحفہ ہے۔"

تم نے جاننے کے لئے ضد نہیں کی۔ کچھ اور باتیں ہوئیں۔

"میں افسانہ نگار نہیں بننا چاہتا ___"

"کیوں ___ ؟"

"افسانہ نگار بننے کے لئے باقاعدہ غموں کی کھیتی باڑی کرنا پڑتی ہے۔"

"یہ تو ہے ___"

اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں ___ ؟

میں نے کہا تھا ___ "آپ کے مضامین ادب اور سائیکولوجی ہیں اور میں ان دونوں کا شکار ہوں ___"

تم ہنسیں ۔

"ہمارے یہاں کب آرہی ہیں ——؟"

"دو چار دنوں میں ۔"

"ضرور ——؟"

"ضرور ——"

"دیکھئے —— وہ شبستاں ضرور لے جائیے گا۔ اور وہ جو خاص تحفہ ہے نا —— وہ میں بعد میں دوں گا ——"

"کیا ہے وہ آخر ——"

"سسپنس" میں نے اسے پراسرار بنانے کے لئے کہا۔

ہم نے خدا حافظ کہا تو میں ریسیور رکھنے منتظر رہا۔ تم نے بھی کچھ دیر انتظار کیا۔ ہم دونوں خاموش رہے پھر تمہاری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز آئی ۔

اس رات میں نے تمہارے نام اپنا پہلا خط لکھا۔ وہ خط براہ راست خط نہیں تھا۔ عبوری کے ماہنامہ کے لئے میں جس طرح کے جذباتی خاکے لکھا کرتا تھا۔ اسے میں نے اسی انداز میں شروع کیا تھا۔ اس کی کوئی نقل اب میرے پاس نہیں ہے اور اسے ایک بار پھر پڑھنے کی میں کئی بار تمنا کر چکا ہوں لیکن امریکی سفارت خانے کی اطلاعات کی پشت پر لکھے ہوئے ان دس صفحوں میں سے بہت سے جملے مجھے زبانی یاد ہیں۔ وہ میرے جذباتی افسانوں سے بھی زیادہ جذباتی تھا۔ میں نے خواب دیکھے تھے کہ میں پاگلوں کی طرح محبت کروں گا۔ اور وہ خط میری پہلی شکست تھا۔

اس رات میں نے کشتیاں جلادیں۔

کافی رات گئے میں نے وہ خط ریل اور چاند کے ذکر سے شروع کیا تھا۔ پہلی بار تمہیں "تم" کہا تھا۔ اپنی شاید محبت کا اعتراف تھا۔ اور پھر اس کے اچھوتے ہونے پر ناز ——

"میں اس لڑکی کے انتظار میں نہ جانے کب سے ہوں۔ جو میری ہمسفر بنے (میں نے لکھا تھا) میں نے اپنی شخصیت —— اپنے جسم اور اپنی روح کا ہر راز اس کے لئے چھپا کر رکھا ہے۔ میرا تصور بھی کنوارا ہے۔ اور یہ اس لئے بہت اہم ہے کہ مجھ سے لڑکیوں نے محبت کی ہے ——"

اور ——

"تم میرے پاس آ جاؤ میرے لالے کے پھول —— میں تمہیں اپنی روح کی کیاری میں اپنے خونِ دل

بے سینوں گا۔ میں محض ایک لاابالی نوجوان نہیں ہوں جس نے کبھی کبھی افسانے لکھے ہیں۔ مجھے ان چیزوں سے نہ پرکھو جو میرے پاس نہیں ہیں۔ مجھے ان چیزوں سے ماپو جو میں نے کھو دی ہیں اور لٹا دی ہیں ـــــ'

اور ـــــ

'میرے پاس دنیا کی سب سے شدید محبت اور سب سے پُرخلوص شخصیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ اس لئے کہ میں نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ یہ زندگی تو ہمیں ساتھ گذارنی ہے۔ جیسے ہی تم میرا انتظار کرو گی ہم سر جوڑ کر اپنی ساری بقیہ زندگی کا پروگرام بنائیں گے ـــــ'

اور ـــــ

'مجھے لالۂ کا صرف ایک پھول چاہیے۔ ایک پابند گھرانے کی بہت اچھی ـــــ بے حد حسین ـــــ ذہین اور خوش مذاق لڑکی ـــــ وہ جو ایک ایسے نوجوان کی کائنات ہے جو اپنی ذہانت کے جواہرات راستے میں گراتا کسی مقصد کی تلاش میں سرگرداں ہے اور تم اس کا مقصد ہو ـــــ'

اور ـــــ

'یہ بے خواب راتیں مجھ سے میری اس خوش قسمتی کا خراج انتقام لیتی ہیں کہ میں تم جیسی لڑکی کو چاہتا ہوں ـــــ'

اور ـــــ

'کیا مجھے تمہارے خوابوں کی شہریت ملی ہے؟'

ایک جگہ ایک میں نے لکھا تھا ـــــ

تو پھر اے لالۂ دل طے رہا نا؟
کہیں بھی راہ میں منزل نہ ہو گی

اور بہت سی بچپنے کی باتیں ـــــ اب میں سوچتا ہوں تو یہ بات ناقابلِ یقین سی لگتی ہے کہ ان معاملوں کو اتنا سمجھنے کے باوجود میں اتنا کیوں جذباتی ہو گیا۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ صرف اس لئے کہ میں واقعی تم سے بڑی ناسمجھ محبت کرتا تھا اور اس ڈر سے کہ پتہ نہیں کس دن تم سے تعلق نکاحت ختم ہو جائے۔ میں ایک ایک جملے میں اپنے سارے جذبوں کو نچوڑ دینا چاہتا تھا۔

اس دوپہر کی گفتگو کے تیسرے دن تم ہمارے گھر آئیں۔ تمہارے ساتھ فرزانہ بھی تھی۔ ساجدہ ابھی کالج سے نہیں آئی تھی۔ اور میں اکیلا تم دونوں کے ساتھ کافی دیر بیٹھا رہا تھا۔

سچ پوچھو تو یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تم آہستہ سے مسکرا کر

نظریں جھکا لیتیں ۔

فرزانہ ان باتوں میں دلچسپی لے رہی تھی کہ میں کیسے لکھتا ہوں، کہاں بیٹھ کر لکھتا ہوں ۔ میں اس کی باتوں کو بے خیالی سے ٹالتا صرف تمہارے تصور میں گم تھا ۔ تمہارا پورا جسم مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ میں تمہیں اپنی بانہوں میں جکڑ لوں۔

پھر ساجدہ آ گئی ۔ تم دونوں شام تک بیٹھیں ـــــ میں نے محسوس کیا کہ تم بار بار کتابوں کی الماری کی طرف دیکھ رہی ہو۔ مگر شبستاں اٹھانے یا مانگنے کی کوئی کوشش تم نے نہ کی ۔ تم ہمیشہ سے بہت محتاط رہی ہو۔

میں نے خود کتابیں نکالیں ۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد تمہیں شبستاں دی ۔

تم نے اسے میرے ہاتھوں سے لیا اور غیر متعلق باتوں کی آڑ میں اسے بڑے پیار سے اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اس ملاقات کا یہ منظر سب سے پائیدار رہے گا ۔ تم نے کتاب اپنے دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لے کر جس طرح اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا ـــــ اسی چکر میں فرزانہ کو بھی ایک شعری مجموعہ دینا پڑا ۔

میں اور ساجدہ تمہیں کار میں چھوڑنے گئے ۔ جانے سے پہلے تم نے وہ رسالے مانگے جن میں میرے افسانے چھپ چکے تھے ۔ میں نے تین چار رسالے تمہیں دیئے اور تمہارے لئے لکھا ہوا خط اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ہم پہلے فرزانہ کو چھوڑنے گئے ـــــ اس کے بعد برنس روڈ سے واپسی پر جمشید روڈ تک میں اپنے آئینے میں تمہیں بار بار دیکھتا رہا ۔ تم نے ساجدہ سے ایسی باتیں کیں جو میرے لئے تھیں (" ہم بہت محبت کرنے والے لوگ ہیں لیکن کسی سے کہتے نہیں ـــــ ")

جب تمہارا گھر قریب آ رہا تھا تو ساجدہ نے کہا ۔

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہگذر آئی

تم نے جواباً غالب کا شعر سنایا ـــ بڑے پر اثر لہجے میں ـــ

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

میں نے تمہارے دروازے پہ کار روکی ۔ تم پچھلا دروازہ کھول کر اتریں اور دروازہ کھولے کچھ دیر کھڑی رہیں ۔ میں نے اپنی جیب سے وہ خط نکالا ـــــ " یہ سلیم کو دے دیجئے گا ـــ ایک خاکہ ہے "

تم نے اسے لے کر ایک رسالے میں رکھ لیا۔ میری طرف دیکھا۔ لیکن بہرحال تمہیں جانا تھا۔ مجھے لگا تم بہت اداس ہو۔ تمہارا جی نہیں چاہتا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔

اگلے دو تین دن تم سے کوئی بات نہ ہو پائی۔ تمہارے گھر جانا ہوا۔ سلیم کے کمرے میں تمہاری آواز کے لئے کان لگائے بیٹھے رہنے کے کرب سے گذرا۔

تمہیں خط دے چکنے کے بعد ہماری کہانی ایک واضح موڑ مڑ گئی۔ میں بے چینی سے تمہارے ردِ عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر شام تمہیں فون کرنے کے لئے صدر کے پبلک بوتھوں کے اردگرد ٹہلتا پھرتا تھا۔

کچھ روز بعد ۔۔۔ دسمبر تو ۔۔۔ تم نے میرا فون اٹھایا۔ بہت دھیرے سے تم نے اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔ ہم دونوں چپ رہے۔

"ثروت ۔۔۔" میں نے میٹروپول کے بند ایئر کنڈیشن بوتھ میں سے تمہیں پکارا۔

"جی ۔۔۔" تمہاری آواز دور سے آئی۔

"میں نے ایک بڑی سخت غلطی کی ہے۔ بالکل اتنا ہی بات ہے کہ جیسے بچوں کی کہانیوں کا کوئی دیو کسی کو یہ بتا دے کہ اس کی جان کس طوطے میں ہے۔ میں نے سب کچھ کھو دیا۔ پتہ نہیں مجھے کچھ ملا بھی یا نہیں۔"

تمہاری سمت سے کوئی آواز نہ آئی۔

"مجھے کیا ملا ہے ثروت ۔۔۔"

سانسوں میں لپٹی، تمہاری ٹوٹی پھوٹی آواز آئی ۔۔۔ "سب کچھ ۔۔۔!"

ہم نے بڑی سرگوشیوں میں باتیں کیں۔ جیسے ہم دونوں کو یقین تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو پائیں گے۔ اور پھر بھی ہم اپنی محبت کے ہاتھوں بے بس تھے۔ وہ باتیں مجھے کچھ دیر کو بھی یاد نہ رہیں۔ لفظ جیسے اندھیرے میں سے آتے تھے۔ اور کان کے پاس سرسرا کر کھو جاتے تھے۔ جیسے میں گھر میں اکیلا کھڑا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ میٹروپول کے بوتھ کی خاص خوشبو اور شیشے کی دیواروں کے باہر بے آواز گذرنے والے مختلف زمینوں کے لوگ موقع کی پراسراریت میں اضافہ کر رہے تھے۔

تم بہت اداس تھیں۔ تم شاید رو رہی تھیں ۔۔۔ "میں جہاں ہوں وہاں بڑے اندھیرے ہیں۔" تم نے کہا تھا ۔۔۔ "آپ ہمارے ابا جان کو نہیں جانتے ۔۔۔ مجھ سے کوئی امید نہ رکھئے ۔۔۔ ہمارے گھر کا ماحول ۔۔۔"

اور میں تمہیں تسلی دے رہا تھا۔ "میں سب جانتا ہوں۔ سلیم ملازم ہوتے ہی آپ کو اور امی کو الگ لے جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔۔۔"

یں شروع سے بہت دور دیکھ رہا تھا۔ اپنے خط میں میں نے لکھ دیا تھا کہ میں تمہیں مکمل طور پر پا لینا چاہتا ہوں۔ مجھے ناکام، نا تمام تجرباتی محبت نہیں چاہئے تھی۔ محبت صرف اسی کو کہتے ہیں۔ (میں نے سمجھا تھا) جو کامیاب ہو۔ ہمیشہ کے لئے ہو ــــ

"مجھے ڈر لگتا ہے ــــ" تمہارا یہ جملہ اندھیرے میں دیئے کی طرح اب بھی ٹمٹماتا ہے ــــ "مجھے ڈر لگتا ہے ــــ"

اگلے دن پھر اسی وقت تم سے باتیں ہوئیں۔

میٹرو پول کے اگلے برآمدے میں لکڑی کے سہارے پر ہاتھ ٹکا کر آنکھیں موند کر میں نے تمہاری سرگوشیوں کا جواب دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو میں تمہارے حضور بہت جھک گیا۔ اس بات کا مجھے تب اندازہ نہیں تھا کہ سب سے سچی محبت بھی دراصل شخصیتوں کی جنگ ہوا کرتی ہے۔

"ثروت ــــ میرے پاس آجاؤ ــــ"

"کیسے آؤں ــــ"

میرے اندر کوئی چیز موم کی طرح سلگ رہی تھی ــــ

"تم اتنی اچھی کیوں ہو؟ میں تم سے اتنی، اتنی، اتنی شدید محبت کیوں کرتا ہوں؟"

"میں اچھی نہیں ہوں اور آپ مجھ سے محبت نہ کیجئے۔"

"ثروت۔"

"جی۔"

"ثر ــــ وت۔"

تم نے پوچھا ــــ "آپ اتنے جذباتی کیوں ہیں ــــ"

"یہی میری خوبی ہے۔"

"نہیں ــــ جذباتی ہونا اچھی بات نہیں ہے۔"

اسی گفتگو میں میں نے کہا تھا ــــ "میں تو اتنا محروم ہوں کہ میرا ذکر قرآن شریف میں آنا چاہئے تھا ــــ"

تم ہنسیں ــــ "اچھا جملہ ہے ــــ"

اس طرح کی ملاقاتیں اکثر تیس منٹ سے بڑھ جایا کرتی تھیں۔

"مجھے جانے دیجئے ـــــ"

"نہیں فردت ـــــ ابھی نہیں ـــــ"

"پلیز ـــــ بہت دیر ہو گئی ہے ـــــ ابا جان گھر ہی میں ہیں۔"

"صرف ایک منٹ ـــــ صرف ایک بات ـــــ"

"جلدی۔"

"اچھا ـــــ ادھر دیکھو ـــــ میری طرف۔"

"کہاں ـــــ نظر بھی تو نہیں آتے ـــــ"

"تو پھر میرے پاس آ جاؤ ـــــ ابھی، اسی وقت ـــــ سب کچھ چھوڑ کر ـــــ"

"ایسی باتیں نہ کرو جن سے مجھے تکلیف ہو۔"

"پھر کب ملو گی ـــــ؟"

"ایسے ہی ـــــ اچھا اب خدا حافظ۔"

میں کوئی جواب نہ دیتا۔

"مجھے جانے دو۔"

"نہیں ـــــ"

"مجھے جانے دو نا ـــــ" تم بڑی عاجزی سے کہتیں۔

"اچھا جاؤ ـــــ" میں کہتا۔

"خدا حافظ۔"

میں چپ رہتا۔

"کبھی جانے دو نا ـــــ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اچھا اب خدا حافظ ـــــ فائنل۔"

"خدا حافظ ـــــ" اور پھر میں تمہارے فون رکھنے کا انتظار کرتا۔

تم یہ چاہتی تھیں کہ میں اپنی جذباتیت چھوڑ کر بدلنے کی کوشش کروں۔ میں نے تمہیں سمجھایا کہ کوئی بھی شخصیت اپنی ساری خوبیوں اور خامیوں کے امتزاج سے ایک روپ پاتی ہے۔ کسی ایک خصلت یا خصوصیت کے بدلنے سے پورا توازن بگڑ سکتا ہے پھر ہر خوبی کسی خامی اور ہر خامی کسی خوبی کا سبب ہوتی ہے۔ میں جذباتی

ہوں اسی لئے با وفا اور نیک ہوں شریف آدمی بزدل بھی ہوا کرتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اگر تم مجھ سے محبت کرو تو پہلے میری خامیوں اور کوتاہیوں کو جانچو۔

"مجھے جذباتی ہونا اچھا نہیں لگتا —" تم کہتیں۔

"تم جذباتی نہیں ہو —؟"

"نہیں —"

"جھوٹ بولتی ہو — تم شاید مجھ سے زیادہ ہی جذباتی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے —؟"

"مت پوچھو۔"

"کتنی؟"

"مجھے پتہ نہیں۔"

"بہت —؟"

"ظاہر ہے —"

"کیا میں ویسا ہی ہوں جیسا تم نے سوچا تھا کہ میں ہوں گا؟"

"ہاں۔"

"تو تم یہ کیسے چاہ سکتی ہو کہ جس عظم سے تم نے محبت کی تھی وہ بدل جائے یا بدلنے کی کوشش کرے مجھے اپنے بچپنے اور جذباتیت پر ناز ہے۔ اب تو تم یہ نہیں کہو گی کہ میں بدل جاؤں۔"

"نہیں۔"

یہ ملاقات بہت مختصر تھی۔

"تم کبھی ملو تو میں تمہیں وہ تحفہ دوں جو میرے پاس کئی سال سے ہے۔"

"کیا ہے —"

"میں بتاؤں گا نہیں — ننھا منا سا ہے — کب لو گی —؟"

"دیکھا جائے گا۔"

اور اسکے بعد دس گیارہ دن تک تم سے کوئی ملاقات نہ ہو پائی۔

تمہارا تحفہ اب میرے لئے بلائے جان تھا اور میں اسے جلد از جلد تمہیں دے دینا چاہتا تھا۔ وہ

کوکا کولا کی چھوٹی سی — چھینگلی برابر بوتل تھی۔ اس میں کسی طرح کا شروب بھرا تھا۔ اور ابھرے لفظوں میں کوکا کولا لکھا تھا۔

اس تحفہ کی بھی ایک کہانی تھی جو میں نے تمہیں بعد میں سنائی۔ پانچ چھ سال پہلے جب میں اپنے وطن فرخ آباد گیا تو واپسی پر مجھے کچھ دنوں کے لئے رکنا ہوا۔ میں نے اپنا سارا بچپن اسی شہر میں گذارا تھا اور اسی لئے بڑی عقیدت سے میں پہچانی جگہوں پر پھرا کرتا تھا۔ ان دنوں فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ایک فلم کے دوران ایک ہم عمر لڑکے سے دوستی ہوئی۔ نام بھول چکا ہوں بس اتنا یاد ہے کہ اشرف تھا۔ یا کوئی اور جس میں "ش" آتا ہو۔ وہ مجھ سے کوئی بڑا تھا اور ان دنوں ایم۔ اے کے پہلے سال میں تھا۔ لیکن ہم دوست ہو گئے اور کئی بار ملے۔ یہ بوتل اسکے پاس تھی۔ میں نے دیکھی تو مجھے بہت پیاری لگی۔ ہم دو تین بار بڑی تفصیل سے ملے تھے اور ہم نے نوجوانوں کے تمام موضوعات پر کھل کر باتیں کی تھیں۔ محبت اور شادی کے تعلق میرے جذباتی نظریات اسے بہت پسند آئے تھے اور جب اس کی پیشکش کے باوجود میں وہ بوتل لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا تو اس نے کہا کہ میں اسے اس لڑکی کے لئے لے لوں۔ جو زندگی میں میری تمام عمر شریک ہو گی —— مجھے اس بات میں بڑا پراسرار، افسانوی رنگ نظر آیا۔ میں نے وہ بوتل لے لی اور اتنی راز داری سے رکھی کہ میرے دوست اور گھر والوں نے کبھی اسے نہ دیکھا۔ پہلے کچھ دنوں مجھے اسے چھپائے رکھنے میں مزہ آیا۔ پھر میں بھول گیا کہ ایسی کوئی چیز بچپن کی جمع کی ہوئی کتابوں کے بکس میں نیچے کہیں پڑی ہے۔ تمہیں دیکھا —— تمہیں چاہا تو اس کی یاد آئی۔

انہیں دنوں یونیورسٹی میں قائداعظم ویک منایا گیا۔ ہم نے وہی ڈرامہ کھیلا جو پچھلی بار تیار کیا تھا احسان حیدرآباد جا چکا تھا اس لئے اپنے ڈرامہ میں میں نے مرکزی کردار ادا کیا —— سلیم کسی عزیز کی شادی میں بہت مصروف تھا۔ اور تم بھی اسی سبب ہمارا ڈرامہ نہ دیکھ سکیں۔ اگر میں اسٹیج پر پہلی کوشش میں اتنا کامیاب رہا تو اس کی وجہ شاید تم تھیں۔ مجھے ہر کام آسان لگتا تھا۔ یہ بات میرے نظریے کے مطابق تھی۔ کہ میں محبت کو زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام میں ایک نفسیاتی سہارا سمجھتا تھا۔ کوئی ایسی ہستی ہونا چاہئے جس کے لئے آدمی تنہا جیئے۔ یا پسپا ہونے کے بعد جس کا آغوش پناہ دے سکے ——

—— دسمبر کی دوپہر کو نیوٹاؤن کے ڈاک خانے سے میں نے فون کیا تو تم ملیں۔ اتنے دنوں میں بے شمار باتیں جمع ہو چکی تھیں۔ میں بے اختیار ہو گیا۔ تمہیں اپنے جذبات چھپانا خوب آتا ہے۔ تم نے بڑے پیارے، سنبھلے ہوئے انداز میں کہا BE CAREFUL AND WAIT FOR THE RIGHT MOMENT

یہ جملہ جیسے تم نے کہا تھا۔ مجھے کبھی کبھی سنائی دیتا ہے۔ تم اپنے گھر کے ہنگاموں میں بہت مصروف تھیں۔ گھر میں بہت سے لوگ تھے اور تمہارا ہر بار فون اٹھانا بہت مشکل تھا۔ بیچ میں ایک دو بار تم نے فون اٹھا کر محض سلیم کو بلایا تھا۔ تمہارے آس پاس خاندان کی لڑکیاں اکٹھا ہوتی تھیں۔

سلیم نے اپنے دوستوں کو اور تم تینوں بہنوں نے اپنی سہیلیوں کو ایک شام چائے پر بلایا۔ سلیم کے دوستوں کے لئے قریب کے ایک مکان میں انتظام کیا گیا۔ ساجدہ تمہارے گھر گئی۔ وہ میری جاسوس تھی۔ اس نے بتایا کہ تم بہت اداس تھیں۔ تم نے کچھ افسانوی جملے بولے تھے کہ تمہاری قسمت میں صرف اندھیرے ہیں۔ وغیرہ —— ایک بات ساجدہ نے ایسی بتائی کہ مجھے تم پر بڑا پیار آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تمہارے پاس بیٹھی تھی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ تم اچانک چونک پڑیں —— لپک کر اٹھیں —— لیکن صفیہ فون کے بالکل قریب تھی۔ اسنے فون اٹھا لیا۔ تم کافی دیر خاموش رہیں۔ وہ فون سلیم کے لئے تھا اور میرا ہو سکتا تھا۔

تب یونیورسٹی اپنی پرانی بلڈنگوں ہی میں تھی۔ اور کیمپس کا ڈی ین چکا تھا۔ بہت سے لوگ کیمپس کی تعریفیں کر چکے تھے اور کیونکہ کراچی یونیورسٹی کی روایات کی تاریخ کی پیش روی کے ارمان ہم لوگوں کو خوب تھے اس لئے ہم کیمپس دیکھنے جانے والے تھے۔ میں نے ساجدہ اور سلیم کو ملا کر اس منظم کا پروگرام بنایا۔ کہ ایک صبح ہم سب کیمپس چلیں۔ تم اور محسنہ اور ساجدہ —— اور ذکی اور سلیم ——

میں اپنی محبت کے بارے میں بہت عملی ہو کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ تمہارا بی۔ اے کا آخری سال تھا اور میں چاہتا تھا تم ایم۔ اے کرو۔ اس طرح ہمیں دو سال مل جائیں۔ میں اس زمانے میں کچھ کر لوں۔ بہت سی باتیں سوچی جا سکتی تھیں۔ ایم۔ اے کے بہانے تمہاری شادی دو سال کے لئے ٹل سکتی تھی۔ تم ہمیشہ کہتی تھیں کہ یہ تمہارے لئے بہت مشکل ہوگا۔ تمہارے ابا تمہیں نہیں پڑھنے دیں گے۔ میں تم سے آگے پڑھنے کے لئے ضد کیا کرتا تھا۔

سلیم سے —— بہر کیمپس جانا طے ہوا۔ اتفاق سے ایک دن پہلے اتوار کے دن تم سے بات ہوئی۔

"کل چل رہے ہیں نا —— ؟" تم نے پر امید لہجے میں کہا۔

"ہاں"

"ہم دیکھیں گے ——"

"کیا ——"

تمہاری آواز بہت میٹھی تھی۔ "تمہیں ـ"

واقعی ہم نے ایک دوسرے کو زمانے سے نہیں دیکھا تھا۔ کیسی عجیب محبت تھی کہ ایک دوسرے سے دور — صرف آواز کے سہارے اتنی دور پہنچ گئے تھے۔ اب محبت کے اظہار کے بعد پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آ رہے تھے۔

اس دن تمہیں مجھ پر خاصا پیار آ رہا تھا۔ ڈرامہ میں میری اداکاری کا تم نے ذکر کیا جس کی تعریف تم نے سنی تھی۔ اور اس انعام کا جس کا فیصلہ دراصل ہمیں لوگوں نے کیا تھا۔

"مجھے بہت اچھا لگا —" تم نے کہا — "خوشی ہوئی"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ بیچ میں کسی مرد کی آواز آئی "ہیلو" اسنے کہا — "ہیلو" — میں ٹھٹک گیا۔ جلدی سے اپنا فون بند کر دیا۔ مجھے آواز تمہارے بھائی جان کی لگی۔ لیکن وہ درمیان میں کیسے آ گئے —؟ ٹیلی فون آپریٹر ایک دو بار پہلے بھی تنگ کر چکے تھے۔ بعد میں تم نے بتایا کہ وہ تمہارے بھائی جان ہی تھے۔ اپنی سسرال سے وہ گھر فون کرنے کی کوشش کرتے اور ہر بار انہیں لائن مصروف ملتی۔ تنگ آ کر انہوں نے انکوائری فون کیا اور ان کے توسط سے درمیان میں آ کودے۔ بہرحال کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

اگلی صبح میں ساجدہ کو لے کر تمہارے یہاں پہنچا — تم دونوں تیار ہو کر ابا جان کی وجہ سے بے چین تھیں۔ گھر میں جو دو مکان چھوڑ کر تھا ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ذکی اور سلیم بھی وہیں تھے۔ تم دونوں کار میں آ کر بیٹھیں۔ تم نے سلام کیا — "مزاج عالی —!" تمہارے یہ مخصوص الفاظ ساجدہ سے زیادہ میرے لیے تھے۔ تینوں لڑکیاں پیچھے بیٹھیں۔ میں نے پیچھے دیکھنے کا شیشہ اس طرح کر لیا کہ اس میں تم نظر آؤ۔ تم بھی مجھے دیکھ رہی۔ میری جیب میں کوکا کولا کی وہ چھوٹی بوتل تھی جسے میں تمہیں بتا چکا تھا کہ کسی طرح دیدونگا۔

ہم کیمپس پہنچے — نہیں وہ اچھا لگا — ہم نے سوچا ہم یہاں ساتھ پڑھیں گے۔ یہاں کی روایتوں کی نیو کھو دیں گے۔ ہم خالی کمروں میں گھومتے رہے۔ کئی بار تم پیچھے رہ کر اس موقعہ کی تاک میں رہیں کہ میں تمہیں وہ تحفہ دے دوں۔ صرف دو لمحے ہم اکیلے ہو جائیں — لیکن ایسا موقعہ نہیں ملا۔ ہم پہلی منزل کی کھڑکیوں سے روش کی نچلی چھت پر آئے جہاں بازیاں ہوتی رہیں۔

آپ سے پہلے ہم سب ہاکی کے میدان کی سبز گھاس پر بیٹھے۔ وہاں ہم نے بالکل بچوں جیسی حرکت کی۔ ہم نے کہا کہ میں کیمپس میں اپنی پہلی آمد کی کوئی یادگار چھوڑیں گے۔ طے ہوا کہ ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر کسی جگہ دفن کر دیا جائے۔ اور برسوں بعد اسے نکالا جائے۔ کاغذ پر سب سے پہلے انگریزی میں میں نے لکھا: "ہم آئے — ہم نے دیکھا۔ اس امید میں کہ ہم اسے فتح کر لیں گے —"

پتہ نہیں کس نے کیا لکھا۔ تم نے بھی کچھ لکھا۔ محسنہ نے شرارتاً لکھا "یہاں آ کر بہت لوبے ہوئے"

کاغذ دوبارہ میرے ہاتھوں میں آیا۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا ——ایک اور جملہ لکھا —— "یہ جگہ کبھی اتنی اہم نہ ہوتی اگر آج کا دن نہ آتا۔"

موم جامے کی جس تھیلی میں خشک میوہ تھا اس میں اس کاغذ کو لپیٹ کر پھولوں کے ایک تختہ میں دفن کر دیا گیا۔

پھر ذکی نے کچھ گیت سنائے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے تمہارا پرس اٹھا لیا۔ میں اپنے ساتھ ایر بیگ لے گیا تھا اس میں تمہارا پرس رکھ کر چپکے سے میں نے اپنا تحفہ پرس میں رکھ دیا۔ پھر نکال کر پرس تمہارے قریب ڈال دیا۔ تم نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ اور مضبوطی سے اسے تھامے رہیں۔

وہاں سے ہم اٹھ کر مدار آئے اور فلمینگو میں بیٹھے۔ میں مسلسل صرف اس لئے چائے پیتا رہا کہ ہم دیر تک بیٹھے رہیں اور میں تمہیں دیکھ سکوں محسنہ۔ یا ذکی —— بار بار چلنے کے لئے کہتے۔

"ابھی ہم یہاں اور بیٹھیں گے۔"

"کب تک": ذکی نے پوچھا۔

"ابد تک"

لیکن ہمیں وہاں سے اٹھنا پڑا دوپہر ہو رہی تھی۔ تمہارے گھر آتے ہوئے میں تمہارے دیدار میں لیے محو تھا کہ کار تمہارے گھر سے آگے نکل گئی۔ سلیم نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے کار موڑی۔ تم اتریں —————— اپنے پچھلے دروازے کی طرف چلیں اندر داخل ہونے سے پہلے تم رکیں۔ میرے لئے اپنا ہاتھ ہلایا۔

تقریباً انہیں دنوں ظریف میرے راز کے بالکل قریب تک پہنچ گیا۔ اور مجھے اس کو اپنا رازدار بنانا پڑا۔ ویسے وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جن پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے راز کو اس نے بڑی بے تابی سے قبول کیا۔

"یہ تم نے کیا کیا ——" وہ کہا کرتا تھا۔ اور صحیح معنوں میں وہ اپنی دشوار غم انگیز محبت سے زیادہ میرے لئے پریشان رہتا تھا۔

شام کو وہ ملا تو مجھ پر ٹوٹ پڑا —— "بتاؤ کیا ہوا —— بتاؤ ——" اور وہ باہر کھڑا تھا جب میں نے اس شام میٹرو پول سے تمہارا نمبر ڈائل کیا۔

"سلام علیکم —— تمہارا اپنا انداز تکلم ——

"وہ تحفہ تمہیں مل گیا ——؟"

"ہاں ۔۔۔"

"کیسا ہے ۔۔۔؟"

"بہت ۔۔۔ بہت پیارا ۔۔۔"

"شاید یہاں صرف ایک ہو ۔۔۔"

"ساری دنیا میں صرف ایک ہے ۔۔۔ ایک بات بتاؤ ۔۔۔ تم اتنے سویٹ کیوں ہو ۔۔!"

"کون ۔۔۔؟" میں جان بوجھ کر انجان بنا ۔۔۔

"کوئی ہے ۔۔۔ کوئی ہے جو بہت سویٹ ہے"

"ثروت ۔۔۔" میں نے پوچھا ۔۔۔" ثروت ۔۔۔ ڈیر لیسٹ ۔۔۔ کیا تم میری ہو ۔۔۔؟"

میں نے تمہارے جواب کا انتظار کیا۔

"تم کس کی ثروت ہو ۔۔۔؟"

"یہ مجھ سے مت پوچھو ۔۔۔"

اور بہت سی باتیں ہوئیں ۔ صبح کی ملاقات کا تذکرہ ہوا۔

"تمہیں کیسا لگا ۔۔۔ مجھے دیکھ کر ۔۔۔؟"

"بہت عجیب ۔۔۔"

"مجھ سے ملو گی ۔۔۔! اکیلے میں ۔۔۔؟"

"پتہ نہیں ۔۔۔"

میں نے تمہیں اس بات پر راضی کرنا چاہا کہ تم بی۔ اے کر کے ایم اے کرنے کی کوشش کرو سلیم یقیناً تمہارا ساتھ دیگا۔ تم لیکن بہت مایوس تھیں۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ظریف نے بتایا کہ میں پینتالیس منٹ بوتھ میں رہا۔ رات میں نے ڈائری میں ملاقات کا چھوٹا سا دائرہ بنایا اور صرف ایک جملہ لکھا "پتہ نہیں مجھے تم سے زیادہ محبت ہے یا تمہیں مجھ سے ۔۔۔"

۔۔۔ دسمبر کو پھر تم سے تھوڑی سی باتیں ہوئیں۔

نئے سال کے لئے عہد و پیمان کرنے کا زمانہ کچھ سال پہلے ختم ہو چکا تھا۔ بغیر کسی تقریب کے میں نے سلیم اور ظریف کے ساتھ نئے سال کو خوش آمدید کہا۔

پہلے تقریباً گیارہ بجے تک ہم ریو سینما کی بالکونی میں بیٹھے رہے۔ سلیم ابا جان کی کسی بات کے

سبب الجھا الجھا سا تھا۔ میں نے خاموش رہنا سیکھ لیا تھا: در حقیقت میرا راز دار بن چکنے کے بعد بہت
چوکنا رہنے لگا تھا۔ ہم مدھم روشنی میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔

ہمارے پاس سادے کاغذ تھے اور ہر ایک نے کچھ لکھا تھا۔ میں دور کی روشنیوں کو گھورتا ہوا صرف
تمہارے متعلق سوچ رہا تھا۔ پھر میں نے انگریزی میں لمبی لکیروں والی تحریر میں اپنے 'ETERNAL you' کو
مخاطب کیا تھا۔ یہ اب تم تھیں لیکن اس سے پہلے یہ "تم" برسوں سے میری زندگی کا ایک کردار تھا۔

پھر ہم تینوں (میں کار لایا تھا) تمہارے دوسرے مکان میں آ گئے ——— وہاں بارہ بجے کے قریب
ہم نے زبردست اودھم مچایا۔ کار میں آتے ہوئے ہم خوب چیخے چلّائے تھے۔ گاتے گا رہے تھے۔ گالیاں
بکی تھیں۔ بارہ بجے ہم بے تحاشا ہنسے ——— زبردستی ہنسے ——— قہقہے لگائے۔

میں گھر آ گیا ——— اپنے کمرے میں ٹیبل لیمپ کی روشنی کے دائرے میں میں نے سادہ کاغذ رکھا۔
——— سوچا تھا تمہارے نام، تمہارے لئے کچھ لکھوں گا ——— ایک نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ وہ سال جب
مجھے فیصلے کرنے تھے۔ جسے میں اپنی زندگی کا سب سے اہم سال سمجھ رہا تھا۔ جب مجھے اپنی زندگی کی جنگ شروع
کرنا تھی۔

میں نے سوچا کہ میں لکھوں کہ مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے۔ میں نے مڑ کر اپنی پچھلی زندگی کی سمت دیکھا۔
وہ سارے سال جو ضائع کر دیئے تھے۔ وہ مواقع جو کھو دیئے تھے۔ وہ امکانات جنہیں ہاتھ بڑھا کر میں نے
چھوا بھی نہیں ناقابلِ بیان کسک بن کر دل سے برقی لہر کی طرح گذرے۔

ثروت ——— میری محبوب ——— میں باتوں اور چیزوں کو راز میں رکھنے کا بہت قائل ہوں اور
مجھے نہیں معلوم تھا کہ اپنی حیثیت مجھے کبھی اپنے حلقے سے باہر بھی منوانا پڑے گی۔ ایک زمانے میں میں سلیم اور
غیور سے کہا کرتا تھا کہ آؤ ہم تینوں بڑے آدمی بن جائیں اور یہ بات راز میں رکھیں۔

۱۹۶۰ء کی اس پہلی رات ——— اور اس کے بعد ہر رات ——— تقریباً ہر اُس لمحہ جب تم میرے
تصور میں رہیں میں نے ایک سانس میں تمہیں پایا اور دوسری میں گنوا دیا۔ تم میری تھیں اور میری نہیں
تھیں۔

میں نے لکھنا شروع کیا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ لکیریں کئی صفحوں تک پہنچیں۔ پھر میں نے
انہیں پھاڑ دیا۔

آخر میں ——— سفید کاغذ کے درمیان میں نے ایک لائن لکھی ——— "میرے لاڈے ——— میں اس نئے سال کو
تمہارے نام معنون کرتا ہوں"۔

میں نے روشنی گل کر کے تکیہ میں منہ چھپا لیا اور صبح تک جاگتا رہا۔

پہلی جنوری کو صرف تمہیں مبارک باد دینے کا موقع ملا سلیم اور صفیہ تمہارے قریب اچھل کود رہے تھے اور تمہیں تنگ کر رہے تھے۔ تم یوں بات کر رہی تھیں جیسے کسی سہیلی سے مخاطب ہو۔ سلیم رات والے بے مقصد وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ صفیہ کی آواز مجھ تک آ رہی تھی ۔۔۔ "بتاؤ کس کا فون ہے۔ کس کا فون ہے"

میرے پوچھنے پر تم نے بتایا کہ تم نے کوئی فیصلے نہیں کئے۔ تمہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ نیا سال ہمارے لئے کیا لایا ہے ۔۔۔ "کیا تم میری ہو ثروت" کے جواب میں تم اب بھی خاموش تھیں۔

ایسی ہی ایک مختصر گفتگو تیسرے دن ہوئی اور پھر کس روز تک میری کوششوں کے باوجود تم سے بات نہ ہو سکی۔

۔۔۔ جنوری کو میری سالگرہ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس دن ہم زندگی میں پہلی بار تنہا ملیں۔ ہم ساتھ ٹہلیں۔ کسی دوکان میں جا کر کوئی چیز ایسے خریدیں جیسے ہم شادی شدہ ہوں۔ لیکن تم سے کوئی بات نہ ہو پائی تھی۔ اور اپنی سالگرہ میں نے پروگرام کے مطابق سب سے الگ سمندر کے کنارے منائی۔

میں اور سلیم ایک دوسرے کو سالگرہ پر کتابیں دیا کرتے ہیں۔ اس شام اس نے میرے ساتھ ہی کتابیں خریدیں اور ایک تنہا کیفے میں بیٹھ کر اسے اسپیشل سے لکھا۔

"اعظم ۔۔۔ آج تم پیدا ہوئے تھے اور تمہارے ساتھ ایک پوری کائنات ۔۔۔ دنیا کی خوبصورت کائناتوں میں سے ایک ۔۔۔ اپنی اس کائنات کو حسن اور ابدیت دو۔ وقت کا عفریت ایک مستقل خطرہ ہے اور اگر اس سے تمہیں ڈر لگے تو اپنی قریب ترین کائنات سے مجھے بلاؤ ۔۔۔ اس کائنات کے حسن کا نام سلیم ہے۔"

تم سے باتیں ۔۔۔ جنوری کو ہوئیں۔ میں تم سے ملنے کے لئے بیتاب تھا۔ تم ڈر رہی تھیں۔ ٹال دینا چاہتی تھیں۔

"اب تک ۔ میری زندگی میں ایسا نہیں ہوا ۔۔۔" تم نے کہا تھا۔

"اب تک تمہاری زندگی میں کتنے اعظم آئے ہیں؟"

تم لاجواب ہو جاتیں۔ کہتیں یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لوگ دیکھ لیں گے۔ میں کہتا اگر کار ہو تو لوگ کیسے دیکھیں گے۔ میں پورا پروگرام تمہیں بتانے لگتا۔ تم کس طرح فلاں جگہ آؤ گی۔ میں کار لئے منتظر رہوں گا۔ تم نقاب ڈالے رہو گی اور ہم ایسے علاقے میں چلے جائیں گے۔ جہاں اطمینان سے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔

اس شام تم تقریباً راضی ہوگئیں۔ تمہاری چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اور تم باقاعدہ کالج جانے لگی
تھیں۔

"جلدی بولو نا ۔۔۔ جلدی ۔۔۔" میں راز داری کے انداز میں کہتا۔

"ابھی نہیں ۔۔۔ پھر بتاؤں گی ۔۔۔" تم اسی طرح جواب دیتیں۔

دو دن بعد تم سے بڑی پیاری باتیں ہوئیں۔ تم بہت گھما پھرا کر اپنی محبت کا اظہار کیا کرتی تھیں اور
گو تمہارے الفاظ ۔۔۔ تمہارے جملے اب میرے ذہن میں نہیں اس رس بھرے تاثر کی یاد باقی ہے جو تمہاری
باتوں سے ٹپکتا تھا۔

تمہاری ایک کتاب میں اٹھا لایا تھا۔ اس میں عمر خیام کی ایک رباعی تھی جسے میں نے کتاب کے آخر
میں دوبارہ لکھ دیا تھا۔

AH LOVE, COULD YOU AND I WITH FATE CONSPIRE

TO GRASP THIS SORRY SCHEME OF THINGS ENTIRE

WOULD NOT WE SHATTER IT TO BITS AND THEN

REMOULD IT NEARER TO THE HEART'S DESIRE

کئی دن مسلسل تم سے فون پر ملنا جاری رہا لیکن ملاقات کا دن متعین نہ ہو سکا۔ تمہارے لئے فیصلہ کرنا
واقعی مشکل تھا۔ بہت سی باتیں ہیں جو صرف جانی جا سکتی ہیں اور جنہیں میں اس بے ربط داستان میں کسی طور
نہ کہہ پاؤں گا۔ ہم دونوں طویل ترین فاصلوں کے دو کناروں پر تھے۔ تمہارا مجھ سے چھپ کر ملنا تمہیں [illegible]
رومانوں کا کردار بنا سکتا تھا۔

اور چونکہ نہیں یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تم بہت باشعور، باہمت اور باوقار تھیں۔ بہر صورت یہ حال
تمہارا فیصلہ تھا۔

بہت سے دن گزر گئے۔ یوں صرف ایک ہفتہ لیکن ہر شام صدر میں اس آس میں ٹہلتے [illegible]
میں فون کردوں تو شاید تم مل جاؤ۔ یہ جانتے ہوئے کہ سلیم گھر پر نہیں ہے بار بار فون کرنا۔ فریئر [illegible] کے [illegible]
سڑکوں پر اداس بھٹکنا ۔۔۔ اور تم تو جیسے کھو گئی تھیں۔ تمہارے گھر رات کو کئی بار جانا ہوا مگر [illegible]
بھی نہ آئیں۔

میں بے سبب پریشان ہونے لگا۔ ظریف کے ساتھ نیو ٹاؤن کے قریب کے ہوٹلوں [illegible]
رات تک بیٹھتا ۔۔۔ میں چپ چاپ رہتا اور وہ کہانی نویس بن کر حادثوں کو تلے اوپر رکھ [illegible]

داستان کی بھول بھلیوں میں راستہ ڈھونڈتا ۔ یہ اس کی خواہش بھی کہ وہ مجھ پر ایک کہانی لکھے ۔
امی کی بہن کے گھر سے جو جہانگیر روڈ پر رہتی ہیں میں نے ـــــ مجبوری کو تمہیں فون کیا ۔ تم ملیں ۔
(ظریف محبت کے دور تھا)

تمہاری آواز بدلی بدلی لگ رہی تھی ۔

"تم اتنے دنوں کہاں غائب رہیں ـــ" میں نے شکایت کی ۔

"موقع نہیں ملا ـــ" اپنی آواز کو چھپاتے ہوئے تم نے کہا ۔

"تم کب ملو گی ـــ"

"کبھی نہیں ـــ"

میں ہکا بکا رہ گیا ـــ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کہا ۔

تم نے جب میری باتیں سنیں ۔ کچھ ڈرتے ہوئے بولوں میں بات دہرائی " میں نے فیصلہ کیا ہے اعظم کہ میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی ـــ اچھا ہے ہم فون پر بھی نہ ملا کریں ۔ یہ بات یہیں ختم ہو جائے تو اچھا ہے ـــ"

"ثروت ـــ ثروت ۔"

"میں نے تم سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا تھا ۔"

"میری بات سمجھو ثروت ۔"

"یہ سب بچپنا ہے ـــ ہم کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے ـــ"

"میری خاطر ـــ"

"نہیں ـــ"

"تمہیں کچھ ہو گیا ہے ۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے ۔ میں خوب سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہی ہوں ۔"

تقریباً آدھے گھنٹے میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ۔ تم اپنی بات پر اڑی رہیں ۔ تم نے خدا حافظ کہا تو یہ کہہ کر کہ اب تم مجھ سے نہ ملو گی اور نہ فون پر بات کرو گی ۔

مجھے لگا کہانی ختم ہو گئی ۔ اس لئے کہ تمہاری ضد اور قوت برداشت دونوں کا مجھے علم تھا ۔

میں نے ظریف کو بتایا ۔ اسے یقین نہ آیا ۔ اس کے لئے یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ کوئی بھی لڑکی ـــ خواہ تم جیسی ہو ـــ مجھے اس طرح چھوڑ سکتی ہے ۔ خود اپنے اوپر مجھے کبھی اتنا اعتماد نہ ہوا ۔

گھر آکر میں نے ساجدہ کو یہ بات بتائی۔ وہ میری لبوری صورت دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم بغیر دقت کے من جاؤ گی۔

اگلے دن بھی نے تمہیں فون نہیں کیا۔ میں نے پیسے ترا کر دو بڑی انگنیاں لیں۔ میرڈو یول تک گیا پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ اپنا ارادہ بدل دیا۔

ایک اور دن گذرا ــــ کرب، تجسس، سوالات ــــ تم نے جو کہا تھا سچ تھا۔ عقل اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ہماری محبت کی تکمیل حکران بنے تو ہمارے درمیان پر نہ ہوسکنے والی خلیج بنا دے۔ لیکن میں نے تو صرف خواہشوں کے بتوں کو پوجا تھا میسکرائے تو تم تمام عمر کا حاصل بن چکی تھیں۔ کیا میں اتنا کمتر تھا کہ تم دوسری چیزوں کے لئے مجھے ٹھکرا دو ــــ پچھلی ملاقاتوں میں بار بار میں نے کہا تھا ــــ ثروت ــــ میں بہت کمزور ہوں۔ اسی لئے تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم مجھ سے کبھی کوئی بات نہ چھپانا۔ کبھی اکیلے کوئی فیصلہ نہ کرنا۔ ہم ساتھ مل کر ہر مشکل کا حل ڈھونڈیں گے ــــ اور جب تم کہا کرتی تھیں کہ تمہیں اپنی قوت برداشت پر ناز ہے تو میں تم سے وعدہ لیا کرتا تھا کہ تم اپنی یہ قوت برداشت میرے خلاف نہیں استعمال کرو گی۔

ــــ جنوری کو ظریف کی بہن کی سالگرہ تھی۔ اسنے تمہیں اور میری بہنوں کو بلایا تھا۔ میں ساجدہ کو لے کر تمہارے گھر گیا۔

تم کار میں آکر بیٹھیں اور تم نے نقاب الٹی تو میں نے تمہیں دیکھا۔ تم اکیلی تھیں۔ تم خاموش تھیں۔۔ تم نے سلام بھی نہیں کیا۔

ہماری نظریں ملیں۔

تمہیں دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ تم رو تی رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر بلا کا حزن تھا۔

ظریف اپنی بہن کے گھر تمہیں دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔ ہم پہنچے تو میں نے تمہارا تعارف کرایا ــــ زبیدہ سلیم کی بہن ــــ ثروت ہیں) اب تک ہم میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ پھر تم ساجدہ کے ساتھ اندر چلی گئیں۔ سلیم ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ دعوت کے بعد موسیقی کا پروگرام تھا طے پایا کہ میں پہلے لڑکیوں کو چھوڑ آؤں۔ تم، ساجدہ اور میری چھوٹی بہن پچھلی سیٹ پر تھیں جب میں تمہیں چھوڑنے گیا۔ آئینے میں تمہیں دیکھ کر تم سے بات کرنے کو جی چاہا۔

"آپ کے مزاج تو بخیر ہیں ثروت صاحبہ ــــ"

"زندہ ہوں ــــ" اداکس اندھی مونی آواز ــــ

"یہ فیصلہ بھی آپ نے خود ہی کیا ہوگا ۔ شاید ۔۔۔"

تم نے کوئی جواب نہ دیا۔

اگلے روز میں سلیم کے کمرے میں بجھا بجھا بیٹھا تمہارے متعلق سوچ رہا تھا۔ تمہاری آواز ایک دو بار آئی تھی ۔ مجھے خیال آیا کہ تمہیں اکیلے یہ حق کس نے دیا کہ جب چاہے قطع تعلق کر لو ۔ اگر یہ محبت باہمی تھی تو مجھے بھی تم پر کچھ اختیار ہونا چاہئے تھا۔ اگر تم کوئی فیصلہ کر سکتی ہو تو یہ حق مجھے بھی ہے ۔ اور میرا فیصلہ یہ تھا کہ تم مجھ سے ملو گی۔

میں باتیں ادھوری چھوڑ کر جلدی سے اٹھا۔ شام ہو چکی تھی ۔ میں سیدھا اشکار پور کالونی کے ایک پٹرول پمپ پر گئے فون پر آیا اور میں نے تمہیں فون کیا۔

میں نے پہلے تمہیں کہا تھا کہ اگر میں ایک تمھ رحس غلط نمبر پوچھوں تو تم مجھے پہچان لینا ۔ کوئی اور ہو گا تو غلط نمبر کہہ کر رکھ دے گا ۔

تم نے فون اٹھایا۔

میں نے وہی غلط نمبر پوچھا۔ تم ٹھٹکیں ۔ میں نے پھر وہی نمبر دہرایا۔ تم رکیں اور پھر تمہارے اپنے انداز میں تمہاری پیاری آواز آئی ۔۔۔ "سلام علیکم ۔۔۔"

"ثروت ۔"

"جی ۔۔۔"

"تمہیں کیا ہو گیا تھا۔"

"پتہ نہیں ۔۔۔"

"دیکھو ثروت ۔۔۔" اور اس دن میں نے باگ اپنے ہاتھ میں لی ۔ میں نے تمہیں سمجھایا کہ میں بہرحال کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا جس سے تمہیں نقصان ہو ۔ یہ فیصلہ کہ تم مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو تم جب چاہے کر سکتی ہو لیکن بے وجہ نہیں ۔ ابھی تو ہم ملے بھی نہیں ہیں ۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے کیا حیثیت رکھتے ہیں ۔ ابھی ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں جانا چاہئے ۔

اس گفتگو میں میرا پلہ بھاری رہا۔ تم نے میرے نقطہ نظر کی تعریف کی۔ تم اس بات سے خوش ہوئیں کہ میں غیر جذباتی ہو کر سوچ سکتا ہوں ۔ تم نے عہد کیا کہ تم آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کرو گی۔

انہیں دنوں " ڈائری آف این فرانک " آئی ہوئی تھی اور تم وہ فلم دیکھنا چاہتی تھیں ۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں ساجدہ کے ساتھ کوئی ایسا پروگرام بناؤں گا کہ تم بھی چل سکو۔

جس وقت تمہیں آنا تھا وہ گذرا تو میں سمجھا کہ تم نہیں آؤ گی ۔ ایک بار پھر شدید مایوسی میرے حواس کی حکمراں بنی ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے تمہیں بس سے اترتے دیکھا ۔ میں نے تمہاری شاہانہ چال سے تمہیں پہچانا ۔ تم اپنے ہینڈ بیگ کے برقعہ کی دونوں نقابیں احتیاط سے ڈالے تھیں۔

تم میری طرف آئیں ۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور آہستہ سے گلی میں موڑ کر کچھ دور روک لی۔

تم پیچھے پیچھے آئیں ۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئیں ۔

"سلام علیکم ـــ" مخصوص انداز ـــ "دیکھو میں آ گئی ۔"

میں نے کار چلا دی ـــ بے صبرے پن سے تمہیں دیکھا ۔ تم نے ایک نقاب الٹ دیا تھا اور تمہارا صحت مند مسکراتا چہرہ مجھے نظر آ رہا تھا ۔

میں پہلے جیل کی طرف چلا ۔

تمہیں اپنے پاس پا کر ـــ تمہیں اپنے پاس تنہا پا کر بے شمار تمنائیں دروازے پیٹنے لگیں ۔

ثروت ـــ ثروت ـــ ڈیر ـــ" میں نے بچکے بچکے انداز میں کہا ۔

تمہارے پاس کچھ کاپیاں تھیں ۔ ان میں سے ایک کچھ نئی سی تھی ۔ میں سمجھا وہ تم میرے لئے لائی ہو ۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ایک بہت اچھا افسانہ لکھ دوں گا ۔ اور وہ کبھی کوئی اور نہ دیکھے گا ـــ میں نے تمہاری گود میں رکھی ہوئی کاپی کو اٹھانا چاہا ۔ تم نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا ۔ وہ کاپی مجھ سے چھین لینا چاہی ۔

"اچھا میں کاپی نہیں لیتا لیکن تم میرا ہاتھ اسی طرح تھامے رہو ۔"

تم میرا ہاتھ تھامے رہیں ـــ مجھے دیکھتی رہیں ۔

میں شہید ملت روڈ پر سے گذر کر آہستہ آہستہ سوسائٹی کی ان گنت سنسان گلیوں میں گھومنے لگا ۔

ہم نے بہت سی باتیں کیں ۔

"میرے قریب آؤ ـــ" میں بار بار تم سے کہتا تھا ۔ بڑی سی کار میں تم اس طرح سمٹی بیٹھی تھیں کہ میں اپنا بایاں ہاتھ تمہارے گرد نہیں ڈال سکتا تھا ۔ تم ہر بار میری بات ٹال دیتیں ۔ اور میرا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں رہتا ۔

سوسائٹی کی ایک سڑک پر ایک کم عمر امریکن لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے کولھے ٹکراتے ، جھومتے ہوئے جا رہے تھے ۔ انہیں دیکھ کر میں نے تم سے کہا کہ وہ کم از کم اس لحاظ سے تو ہم سے برتر ہیں ۔ کہ اپنی چھوٹی چھوٹی تمنائیں پوری کرنے کی ہمت رکھتے ہیں ۔

تم نے میری طرف دیکھا۔ شریر انداز میں مسکرائیں۔ اور میرے قریب کھسکیں۔ اور قریب — میں نے ہاتھ تمہارے ہاتھوں سے چھڑا کر تمہارے بھرپور جسم کے گرد ڈال کر تمہیں اور بھی قریب کر لیا۔ اور تم شاید میری قربت سے اتنی متاثر ہو چکی تھیں کہ پھر کاریں قریب سے گذریں۔ وگ جو ملے گھورتے لے گئی آوازیں کسی گئیں۔ اور تم مجھ سے لگی، میرے کاندھے پر سر رکھے رہیں۔ تمہارا چہرہ بے نقاب رہا۔ اور میں ایک ہاتھ سے کار چلاتا رہا۔

ان دنوں تمہاری بائیں آنکھ دکھ رہی تھی۔ اور میں نے کہا تھا کہ میں اسے پیار کر لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔ ایک سنسان سڑک پر کار روک کر میں نے تمہارا چہرہ ہاتھوں میں لیا اور آہستہ سے اپنے ہونٹ تمہاری آنکھ پر رکھ دیئے۔

تمہارے خوبصورت چہرے اور جسم کی قربت نے مجھے بہت بے تاب کر دیا تھا۔ میں نے پھر جلدی سے کار چلا دی۔ میرا ہاتھ تمہاری پشت پر سے ہو کر تمہاری کمر پر رہا اور تم اپنا پورا بوجھ لئے مجھ پر جھکی رہیں۔

"کلفٹن چلیں؟"

تم نے اپنا سر جھکا کر ہاں کی۔ تم مجھے بہت، بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

ہم نے کلفٹن کا ایک چکر لگایا۔ تم کسی صورت کار سے اترنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ کلفٹن کے قریب جو میدان کار چلانا سیکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے میں نے تمہیں بتایا کہ تین چار سال پہلے جب میں کار سیکھ رہا تھا تو درمیان میں ایک کار کھڑی تھی جس میں ایک جوڑا ایک دوسرے سے لگا بیٹھا تھا۔ اور جب بھی میں کار اس طرف لے جانا چاہتا تھا ہمارا بوڑھا ڈرائیور اسٹیرنگ موڑ کر میرا رخ بدل دیتا تھا۔

"میں جب سے اس میدان سے اپنے انتقام کا انتظار کر رہا ہوں۔"

ہم اس میدان میں گئے — اس وقت وہاں صرف ہماری ہی کار تھی۔ میں نے اسے بہت دور الگ لے جا کر کھڑا کر دیا اور بڑے اطمینان سے تمہاری طرف مڑا۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ محبت کے ابتدائی دنوں میں یہ عمل کتنا سحر انگیز ہوتا ہے۔

بایاں ہاتھ تمہاری گردن میں ڈال کر میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے تمہارے چہرے کو چھوا۔

"آؤ میں تمہیں پیار کر دوں۔"

تم نے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہا۔

"نہیں انظم — نہیں — نہیں — نہیں —"

لیکن تمہاری مدافعت بہت ہلکی تھی۔ اور، تمہاری ٹھوڑی کو پکڑ کر میں نے تمہارے کھلے ہوئے ہونٹوں پر اپنا منہ رکھ دیا۔

(اپنی محبت کے اس پہلے پیار کا ذائقہ محسوسات کی یادوں میں اب تک سب سے الگ ہے)

ہمارے ہونٹ ملے تو تم نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے تمہارا ساکت چہرہ دیکھا۔

"ثروت۔"

تم نے اپنی مخمور کہر آلود آنکھیں کھولیں۔

"ثروت — تم میری ہو نا؟"

بے بس قیدی کی طرح تم نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے تمہیں اپنے قریب تر کر لیا۔ اپنا سر تمہارے شانے پر رکھ دیا۔

تم بہت بے تاب تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لئے بڑی جد و جہد کر رہی ہو۔

تمہارا ہاتھ میرے چہرے پر آیا۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

تمہاری کتابیں اور بکس پچھلی سیٹ پر پڑے تھے۔ تم نے اپنا بکس مانگا۔ اسے کھول کر تم نے سبز پتوں کے ساتھ کپڑے کا ننھا پھول نکالا۔ اس میں تم نے بہت سا عطر ٹپکایا تھا اور وہ بری طرح مہک رہا تھا۔

"یہ تمہارے لئے ہے —"

میں نے وہ پھول لیا — اسے چوما۔ وہ پھول تمہارے بڑے بھائی لائے تھے اور تمہاری ہدایت تھی کہ میں اسے سلیم کو کبھی نہ دکھاؤں۔

ہمیں ملے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور تم جانے کے لئے ضد کر رہی تھیں۔ دو تین بار میں نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر آنے سے پہلے ہی واپس موڑ لی۔ "ایک بار اور تمہیں پیار کر لوں۔"

بالآخر ہم وہاں سے نکلے۔ واپسی پر تم میرے کاندھے پر سر رکھے تھیں۔ اور بے حد پیار سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں آئینے میں تمہاری محبت بھری ٹکٹکی دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے عمران صاحب مجھ میں دلچسپی لیتے ہیں —"

میں نے کہا — "میں جانتا ہوں۔ میں ہمیشہ ان سے کہا کرتا ہوں کہ آپ کا رقیب بننے کو جی چاہتا

ہے۔ انہیں وہ شعر سناتا ہوں ۔ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔"

تم مسکرائیں۔

ہم نے پندرہ دن بعد دوبارہ ملنے کا پروگرام بنایا۔ اس دن تم "مرر" کا وہ شمارہ بھی لائی تھیں جس میں تمہارے بھائی جان کی شادی کی ایک تصویر چھپی تھی۔ جس میں تم، ابا اور امی کے درمیان کھڑی بہت چھوٹی سی لگ رہی تھیں۔

تم نے خود کہا کہ ہیں تمہارے گھر کے قریب چھوڑ آؤں۔ جیت روڈ پر سے میں نے اسی راستے پر کار موڑی جس پر مجھے چھوڑ کر تمہاری دکٹوریہ ہماری پہلی ملاقات کی رات گئی تھی۔ (تم نے اس کا ذکر کیا) آگے آکر تمہارا گھر سامنے نظر آنے لگا۔

"وہ تمہارا گھر ہے ۔۔۔" میں نے کہا ۔۔۔" اونچی دیواروں والا گھر ۔۔"

میں نے کار کوارٹروں میں موڑ لی اور ایک گلی میں بالکل اس سڑک کے نزدیک آگیا جس کی دوسری سمت تمہارا گھر تھا۔

"خدا حافظ۔"

تم اتریں ۔۔۔

"ڈیر ۔۔۔ ڈارلنگ ۔۔۔" اترتے اترتے تمہارا ہاتھ میں نے زور سے دبایا۔ تم کوارٹروں میں چلی گئیں۔ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی رہیں۔

اسی رات عمران صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مجھ پر شدید تھکن طاری تھی۔

تمہارے گھر سلیم کے کمرے میں جانا بدستور جاری رہا۔ یہ میری عادت ہے کہ میں اخبار کے کناروں، کاغذ کے ٹکڑوں غرض کسی نہ کسی پیپر پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچا کرتا ہوں ۔۔۔ اپنا نام، گفتگو کے دوران آنے والے جملوں کے بے ترتیب لفظ ۔۔۔ کچھ بھی ۔۔۔

تب میں اپنے شعر اور ادھوری نظمیں لکھا کرتا تھا اور یہ تمہارا معمول تھا کہ جیسے ہی ہم دوست سلیم کو ساتھ لے کر کمرے سے نکلتے تم میز پر پڑے کاغذ کے ٹکڑوں اور سگریٹ کے پیکٹوں پر لکھی میری تحریر ڈھونڈتیں۔ انہیں سنبھال کر رکھتیں۔ مجھے معلوم ہوا تو میں باقاعدہ تمہارے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑنے لگا۔ اچھے اچھے شعر ۔۔۔ اپنی محبت کا اعتراف ۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے بار بار تم سے یہ کہنا پسند تھا کہ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے میری نظمیں تمہیں یاد ہیں ۔۔۔؟ آزاد ۔۔۔ بحر سے عاری ۔۔۔ غلط شعر ۔۔۔ (تم میرے ویرانے میں

میری ہی آواز کا زخمی سایہ ہو — وغیرہ وغیرہ۔)

سلیم سے ذاتی باتوں کا ذکر ہوتا تو میں اکثر چپ ہو جاتا۔ مجھے ڈر تھا کہیں میں اس سے دور نہ ہوتا جاؤں۔ ویسے اندر ہی اندر میں اس پر بھروسہ کئے تھا مجھے یقین تھا کہ اگر تم نے مجھے پالنے کا بیڑہ اٹھایا تو وہ بھی میرا ساتھ دے گا۔

اگر میں اپنی داستان کو مختلف ابواب میں تقسیم کروں تو تم سے ملاقات کے بعد ایک نئے باب — نئے دور کا آغاز ہوا۔ داخلی طور پر ہمارے رشتہ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ پہلے اگر تمہارا تصور یوں آتا تھا کہ کوئی لڑکی پھیلے ہوئے پس منظر میں روشنی کا مرکز بنی اکیلی کھڑی ہے تو اب یوں لگتا تھا جیسے تم میری آغوش میں اپنا سانس لیتا جسم چھپائے ہو اور تمہاری آنکھیں اپنی گہرا آلودگی کا آئینہ لئے میرے سامنے ہوں۔ اب مجھے تمہاری محبت کا یقین تھا۔ گو میرے جذبے کی شدت بڑھ چکی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں بے بس نہیں ہوا تھا۔

اور تم اس ملاقات کے بعد جیسے سچ مچ میری محبت کے آغوش میں دم توڑ چکی تھیں۔ میں تقریباً ہر شام تمہیں فون کرتا اور جس دن ہماری بات نہ ہوتی تمہیں مجھ سے زیادہ تکلیف پہنچتی۔

"تمہارا فون آجاتا ہے تو مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے —" تم نے کہا تھا —"میں دن بھر اداس رہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے سب سے چھپ کر خوب روؤں۔ — پھر تم سے باتیں کر لیتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ہے — تم ہر روز مجھے فون کیا کرو — اچھا —؟"

یہ تمہیں معلوم ہے کہ میں چاہے جانے کا عادی ہوں۔ گھر اور دوستوں کے حلقے سے مجھے غیر معمولی محبت ملی ہے سلیم کہتا ہے میں لوگوں میں مادرانہ اور پدرانہ شفقتیں پیدا کرتا ہوں۔ بہت سے لوگ مجھے اپنا بیٹا بنا چکے تھے۔ میں ان سب سے تنگ آچکا تھا جو میری سرپرستی کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات میرے لئے کسی مسرت کا باعث نہ تھی۔ کہ میں پسند کیا جاتا ہوں سلیم اور دوسرے ایسے دوست جو اپنے والدین کی بے رخی کے شاکی تھے میری اس بات پر جھنجلا اٹھتے کہ میں اپنے گھر والوں کی محبت کو بدقسمتی کیوں کہتا ہوں مجھے ایسی محبت اچھی نہیں لگتی جو توقعات اور امیدوں کے ساتھ چلے۔ میں جانتا ہوں میں کبھی اپنے گھر والوں کے لئے باعث فخر نہیں بن سکوں گا۔ میں اپنی زندگی رشتوں کے عوض رہن نہیں رکھ سکتا۔ میں سوچا کرتا تھا مجھے کسی کی محبت نہیں چاہئے۔ مجھے تمہاری محبت چاہئے۔ اس لئے کہ تم ساری زندگی میرے ساتھ رہو گی — تم سے چاہے جانے کی تمنا جس قدر میں نے کی تھی۔ دیوتاؤں نے اپنے ملنے جلنے کے لئے نہ کی ہو گی۔

اور تب میں جانتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔

ہماری دوسری ملاقات دو ہفتہ بعد جس دن ہونے والی تھی اس سے ایک دن پہلے ہی ہو گئی — تم نے

یک دن فون پر بتایا کہ اس دن تم کالج سے جلد فارغ ہو جاؤ گی اور مجھ سے مل لو گی۔

شاید اس دن بھی تم گردمسند پر میری کار میں بیٹھیں۔ یہ بھی یاد نہیں کہ صفحہ آخر کے خطوط کا مجموعہ "زیر لب" میں نے تمہیں اسی ملاقات میں دیا یا اگلی میں ۔۔۔ اور دوسری باتیں بھی تسلسل کھو چکی ہیں۔ جیسے ہوا کے جھونکے آیا کرتے ہیں۔ ایسے ہی کوئی جملہ اپنے گزر جانے والے وقت کے منظر کی لڑی میں بیٹھا دھیان پر چھا جاتا ہے۔

اسی بار آتے ہی تم نے اپنے ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے لیا۔ اپنے کالج کی باتیں بتانے لگیں۔ تمہارا کوئی فنکشن ہونے والا تھا اور سکریٹری ہونے کے باعث وہاں سب کام تم پر تھیں

میں پہلے سوسائٹی کے غائب ہیں خالی سڑکوں پر پھرا۔ تم پھر سے قریب میرے ہاتھ کے حلقے میں آ گئیں۔

ادھوری باتیں کرتے ہٹتے چلے ۔۔۔ "ثروت ۔۔۔ میری ثروت ۔۔۔" اور تمہارا سر ہلانا ۔۔۔ شرارت سے مسکرانا۔

کلفٹن ۔۔ دھیان ۔۔۔ ہماری غیر ازدواجی محبت کی خوابگاہ ۔۔۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے تمہیں اپنے آپ سے لپٹا لیا۔

"تم مجھے خراب کر دو گے ۔۔۔" تم بولیں۔

"نہیں"

بار بار ہم نے بیٹھنے کے انداز بدلے ۔۔۔ کار کی نشست حرکات کو محدود کر دیتی ہے۔ میں نے جس طرح تم بیٹھی تھیں اس طرف کے دروازے پر سر ٹکا کر پاؤں سیٹ پر پھیلا لیے۔ اس طرح میں تمہاری گود میں تھا اور تم اپنا سر جھک کر میرے سینے پر رکھ سکتی تھیں۔

"شریر لڑکے ۔۔۔" تم دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر بڑے پیار سے ڈانٹنے کے انداز میں کہتیں ۔۔۔ "شریر لڑکے ۔۔۔ تو مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے ۔۔۔" مجھے طمانچہ مارتیں۔ ہونٹ دبا کر آنکھیں دکھاتیں۔

"ثروت ۔۔۔ ڈیریسٹ ثروت ۔۔۔ وعدہ کرو ۔۔۔" جب تم سے وعدے لیا کرتا۔ پتہ نہیں کون کون سے ۔۔۔ وعدہ کرو تم ہمیشہ میری رہو گی ۔۔۔ مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپاؤ گی۔ اگر میری کبھی نہ ہو سکو تو مجھ سے گفتگو کا رشتہ ضرور رکھو گی۔ میری باتیں مانو گی۔ اور ہر بات کے جواب میں تم اپنے چہرے کو جنبش دے کر آنکھوں سے اقرار کرتیں۔

"مجھے پیار کرو ۔۔۔" میں ضد کرتا۔

تم انکار کرتیں۔ تمہارا چہرہ اپنی طرف کرنا چاہتا تو تم ہلکی مدافعت کرتیں۔

"مجھ میں کیا خاص بات ہے ۔۔۔ بتاؤ ۔۔۔" میں نے کہا تھا۔

"تم اچھے ہو ۔۔۔"

"اور ۔۔۔"

"تم منتے ہو۔"

"اور ۔۔۔"

"تم انظم ہو ۔۔۔"

"اور ۔۔۔"

"تم تردست کے ہو ۔۔۔"

میں نے تمہیں بے تحاشا پیار کیا۔ پھر جب تم میری گود میں تھیں اور میرے ہاتھ تمہیں اپنے دائرے میں لئے تمہارے سامنے تھے تو تم نے پوچھا ۔۔۔ "یہ بتاؤ ۔۔۔ جسم اور روح میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ ملائے۔ جیسے دعا مانگتے ہیں ۔۔۔ "کچھ لوگ ہوتے جن کی روح اور جسم الگ الگ ہوتے ہیں۔" پھر میں نے ایک ہاتھ کی شہادت ہتھیلی دوسری پر رکھ دی ۔۔۔ "کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی روح اور جسم ملے ہوئے تو ہوتے ہیں لیکن کچھ باتیں یا تو صرف روح سے متعلق رہتی یا صرف جسم سے۔" اب میں نے دونوں ہاتھ اوپر نیچے رکھ لئے ۔۔۔ "اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں ۔۔۔ جیسے ہم ہیں۔ جن کی روح اور جسم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دماغ سے محسوس کرتے ہیں اور دل سے سوچتے ہیں۔"

ہم نے خدا، مذہب اور دوسری بنیادی باتوں پر اپنے نظریے ملائے۔

تم اپنے بھائی جان اور بھابھی کی تین تصویریں لائی تھیں۔ ایک میں تمہاری بھابھی شلوار پر جمپر پہنے کسی قدیم عمارت کے صحن میں کھڑی تھیں۔ دوسری میں دونوں ایک پہاڑی سڑک پر کھڑے تھے۔ پیچھے ان کی فیئٹ کار تھی۔ تیسری تصویر کمرے کے اندر لی گئی تھی ۔۔۔ تمہاری بھابھی پلوور پہنے اپنے شوہر کا بازو تھامے ہنس رہی تھیں۔

اس بار پھر تمہیں تمہارے گھر کے قریب اتارنا پڑا۔

رات میں نے سلیم سے باتیں کرتے ہوئے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کوئی شعر لکھا تھا۔ پھر میں نے اسے چاک کر دیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے ایش ٹرے میں ڈال دیئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب فون پر

تم نے وہی شعر مجھے سنا دیا۔ تم نے ایش ٹرے میں سے وہ کرچیں نکال کر انہیں بڑی محنت سے جوڑا تھا۔
— فروری — میری ڈائری میں تم سے ملاقات کا نشان ہے — ساتھ میں لکھا ہے —
"اداس باتیں —"

چار دن سائے میں سلیم سے ملاقات ہوتی رہی ہوگی۔
— فروری کو دوبار تم سے باتیں ہوئیں۔ اتوار کا دن تھا اور تم صبح ہی سے میرے فون کی منتظر تھیں۔ تمہارے ابا جان کے نام ان کے کسی دوست کا فون آیا تھا تو تم نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ وہ نہیں ہیں اس لئے کہ وہ فون کے پاس دیر تک کے لئے نہ آ بیٹھیں اور پھر اور دن انہیں ملے۔
میں شکار پور کالونی کے پیٹرول پمپ سے بول رہا تھا۔ تم سے کسی بات پر ناراض تھا۔ اور تم مجھے منا رہی تھیں۔
"اپنا منہ ریسیور پہ رکھو —"
میں نے کہا — "رکھ لیا —"
"نہیں — جلدی رکھو —" اور پھر ذرا دیر کے بعد چومنے کی آواز —
"منہ کھولو —" تم نے بعد میں کہا۔
کیوں —؟"
"میں چاکلیٹ کھا رہی ہوں — تم بھی کھاؤ — یہ لو — نہ نہ کرو — اچھے پیارے بچے۔
— کیسا ہے —؟
اب یاد بھی کرتا ہوں تو ان دنوں کی تفصیلات یاد نہیں آتیں — ظریف بڑی طرح میرے معاملے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ہم رات گئے جمشید روڈ کے قریب جوار میں ٹہل کر تمہیں پانے کے امکانات پر غور کرتے رہے — میں غیر جذباتی اور عملی بننے کی کوشش کرتا۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے — میں ہمیشہ تم سے کہا کرتا تھا — ہر فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بات تجارتی انداز میں سوچ لو کہ اسے نہ کرکے جو تکلیف ہوگی وہ زیادہ ہوگی۔ یا وہ دشواریاں جو فیصلے کے بعد پیش آتی ہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میری محبت تمہیں اس طرح اپنی گرفت میں لے لے کہ مجھے چھوڑنا تمہاری زندگی کا سب سے مہنگا سودا بن جائے۔ اور مجھے پا لینے کی ہر چوٹ میری محبت کے مرہم سے ٹھیک ہو جائے۔
تمہیں پا لینا میری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ کوئی موہوم سی ترکیب ذہن میں آتی لگتا ساری گتھیاں سلجھ گئی ہیں۔ پھر ایک آدھ دن میں حقائق کی دھوپ توقع کی اس کونپل کو خاکستر کر دیتی۔

ایک رات میں نے سوچا۔ کیوں نہ تم اپنے خاندان کے چنے ہوئے مرد سے شادی کر لو۔ پھر اس سے طلاق لے کر میری ہو جاؤ۔ میں تمہیں پانے کے لئے یہ بھی برداشت کر لوں گا۔ میں نے سوچا شاید میں تمہیں یہ سمجھا سکوں۔ فون پر میں نے تم سے جلد ملنے کے لئے کہا۔

"کچھ بہت ضروری باتیں ہیں۔"

"ابھی بتاؤ ۔۔۔"

"ابھی نہیں بتائی جا سکتیں ۔۔۔ ملو ۔۔۔"

تم نے کبھی میری جذباتی منتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ ملاقات کا دن کچھ اور آگے بڑھا دیا۔ میں ناراض ہوا تو مجھے منانے لگیں ۔۔۔ محبت بھری باتیں کرنے لگیں۔ تم نے بتایا کہ تم مختلف بہانوں سے اپنی سہیلیوں سے میری تعریفیں کرتی رہتی ہو ۔۔۔ وہ شعر سنایا۔

ہزار ضبطِ محبت کے باوجود اے دوست
مرے لبوں پہ ترا نام آہی جاتا ہے

ہماری تیسری ملاقات ۔۔۔ فروری کو ہوئی۔ میں اس ملاقات کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن یہ ہماری سب سے ناگوار ملاقات تھی۔ تمہاری طبیعت خراب تھی۔ تم بیزار سی تھیں۔ ہم کیونکہ صبح جلد لے تھے اس لئے ہمیں سکون سے ایک جگہ رک کر بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ تنہا جگہوں پر کئی بار میں نے تمہیں اپنی آغوش میں لیا لیکن ہر بار تم نے مجھے پرے ہٹا دیا۔

ہم کار میں اِدھر اُدھر بے مقصد بھٹکتے رہے۔ سوسائٹی کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے گرد گھومنے والی غیر ہموار سڑکوں پر ہم نسبتاً چپ چاپ چکر لگاتے رہے۔

"تم راستہ بھول گئے ہو ۔۔۔" ایک جگہ تم بولیں ۔۔۔ "بتاؤ یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"میں نہیں جانتا ۔۔۔ لیکن اگر یہ سڑک کسی بنگلے پر ختم ہوتی ہے تو یہ تمہاری سڑک ہے اور اگر کسی صحرا میں کھو جاتی ہے تو یہ میری ہے۔"

تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تم جانتی تھیں یہ سچ ہے۔

ہم نے کلفٹن کا ایک چکر لگایا۔ میں نے مستقبل کا موضوع چھیڑا۔

"اعظم ۔۔۔" تم نے بغیر میری طرف دیکھے کہا ۔۔۔ "میں پاگل ہو جاؤں گی ۔۔۔ میں تمہارا انتظار نہیں کر سکتی۔"

تمہارا اشارہ ان باتوں کی طرف تھا جو تمہیں میرے لئے ناقابل حصول بناتی تھیں۔
"اگر یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہو تو دست ـــــ اگر تم اور صرف تم کسی کو چنو تو کیا تم مجھے چنو گی؟"
"ظاہر ہے ـــ"
"لیکن کیا ہم کبھی ـــ"
"نہیں ـــ"
میں نے نہ جانے کیا کیا باتیں کی تھیں۔ آواز میرے حلق میں خراش پیدا کر کے نکل رہی تھی۔ سامنے کی تیزیاں جیسے بھیگے ہوئے شیشے کے پیچھے متحرک تھیں۔
"لیکن تم میری ہو ـــ"
ہم نے خوف سے ایک دوسرے کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر تمہیں یاد دلایا کہ اگر تم ایم۔ اے کر لو تو تمہیں دو سال مل جائیں گے اور ان سالوں میں میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بہر حال کوشش کرنا چاہئے۔
تم بہت بے لطف ہو چکی تھیں۔ میری باتوں کا جواب دیئے بغیر تم چپ بیٹھی تھیں۔ تھوڑی سی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ واپسی پر میں نے تمہیں جمشید روڈ کے پیچھے ایک چھوٹی سی سڑک پر چھوڑا۔ تم فاطمہ جناح کالونی میں اپنی سہیلی سعیدہ کے گھر جانا چاہتی تھیں۔ ہم نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔
شام کو میں نے تمہارے گھر فون کیا ـــ "سلیم ہیں ـــ" میں نے حسب معمول پوچھا۔ تم خود میری آواز پہچان کر بات شروع کرتی تھیں۔
"جی نہیں ـــ" مجھے شک ہوا تم ہو۔
"کون بول رہا ہے ـــ"
"میں ان کی چھوٹی بہن بول رہی ہوں ـــ" میں نے تمہیں پہچان لیا۔
"کونسی چھوٹی بہن ـــــ وہ جو ایک بے ہودہ لڑکی ہے اور مجھ سے لڑتی ہے؟"
"وقت کی بات ہوتی ہے۔ اب نہیں لڑے گی۔"

کچھ دنوں بعد ایک دوپہر تم نے فون پر مجھے اپنے بہت سے شعر سنائے۔ تم کچھ دیر پہلے اپنی شاعری کی کاپی دیکھ رہی تھیں۔ میں نے فرمائش کی کہ تم اپنی غزلیں مجھے لکھ دو ـــ اپنے ساتھیوں میں تو تم شاعر مشہور تھیں۔ ویسے تمہاری صرف دو تین غزلیں چھپی تھیں۔ ایک وہ تھی۔

تمہی غم سے چین پایا ہے + جب سے اپنا انہیں بنایا ہے
ہم سے ثروت یہ فیصلہ نہ ہوا + کس نے کھویا ہے کس نے پایا ہے
دل کی گہرائی میں چھپے ہو تم
آنسوؤں نے تمہیں بلایا ہے

تم نے ہر غزل اور نظم کا ابتدائیہ مجھے بتایا تھا۔ ایک آزاد اور یکانہ سی نظم تم نے اسکول کے آخری دنوں میں کسی صاحب کی محبت میں کہی تھی۔ وہ تمہارے ابا جان کے دوست تھے۔ اور شاید تمہارے وجود سے بھی بے خبر رہے۔

اسی ہفتہ تم سے ملاقات ہوئی۔ تم اپنی شاعری کا انتخاب لائی تھیں۔ وہ کئی چنی نظمیں اور غزلیں تم نے رات دو بجے تک میرے لئے صاف کی تھیں۔ رومان پسند لڑکیوں کی طرح تم نے انہیں "پرانے گیت ــــ پرانے سپنے" کا عنوان دیا تھا۔

وہ کاپی ہاتھ میں لیتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے لئے تمہارے انتساب کی تلاش کی۔ کاپی کے سب سے آخری صفحہ پر تم نے لکھا تھا۔

I CARE NOT FOR THE STARS THAT SHINE
I DARE NOT HOPE TO EVER BE THINE
I ONLY KNOW I LOVE YOU
LOVE ME AND THE WORLD WILL BE MINE!

ابتدا میں ایک آزاد نظم تھی۔ "چاندنی راتوں میں" جس کا اختتام تھا۔
تیری راہوں کو ڈھونڈنے والے
تیرے ہر غم سے پیار کرتے ہیں

اس کے بعد "ایک مسافر کے نام ــــ" اسکول کے دنوں کی دوسری نظم ــــ ایک "اچھے مسافر" سے شکایت تھی کہ وہ تمہیں پیار کی راہیں دے کر دور لب پر چھوڑ گیا۔ پھر "خزاں" ــــ "نقوش ماضی ــــ" غموں سے محبت کرنے والی خود پسند لڑکی کے نوحے ــــ ایک دو نظمیں سہیلیوں کے ناراض ہونے پر بھی تھیں۔ ایک نظم تھی ــــ "کے حضور"

کتنی تصویریں خیالوں میں ابھر آتی ہیں
چاند اٹھتا ہے تو یادیں تری ڈس جاتی ہیں

اپنے کالج کی اردو لیکچرار کے لئے بھی کچھ قطعات تھے۔ ان کی شادی جن صاحب سے ہوئی تھی وہ تمہارے ہم نام تھے

شمسہ کی بڑی بہن کی شادی کے لئے تم نے ایک نظم لکھی تھی۔ ایک صاحب انہیں اپنے عشق میں گرفتار چھوڑ گئے تھے۔ تقریباً پندرہ غزلیں تھیں۔ کچھ اچھی ——— باقی معمولی —— یہ تمام کی تمام تم نے مجھے جاننے سے پہلے کہی تھیں۔ ایک گیت تھا جو یقیناً ہمارے تعلق سے بعد کا تھا۔

تیری یاد چلی آئی ہے + میرے دل میں بن کر دلہن
ضبط کے دامن چھوٹ گئے ہیں + موتی سے کچھ ٹوٹ گئے ہیں
اور —— آنسو کے لے کر نذرانے + کومل نازک میرا من
تیرے دوارے آیا ہے + من جا اور روٹھے ساجن
اپنی آشاؤں کے گیت + تجھ کو آج سناؤں گی
دل کے داغ دکھا کر جھلیا + کچھ روؤں گی گاؤں گی

اس پوری کاپی میں ایک عجیب طرح تمہاری محبت کا اظہار تھا جسے میں نے گھر آکر لوٹ کیا۔ تمہارا ایک شعر تھا۔

یہ تو معلوم تھا تم ہمارے نہیں
پھر بھی بزم تصور سجاتے رہے

یہ شعر تم نے اسی طرح لکھا تھا لیکن بعد میں تم نے 'تم' کے اوپر دوسرے پین سے 'وہ' لکھدیا

یہ تو معلوم تھا وہ ہمارے نہیں

ہماری یہ ملاقات جس دن ہوئی تھی ہم کلفٹن نہیں گئے تھے۔ سوسائٹی کے پیچھے ایک کچی سڑک کے ٹکڑے پر میں نے کار کھڑی کر دی تھی۔ تم نے برقعہ اتار کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔ اور پوری طرح میری باہنوں میں آ گئیں۔

مجھے یاد نہیں ہم نے کتنی باتیں کیں۔ تم چاہتی تھیں میں تمہاری کوئی غزل زور سے پڑھوں۔ میں نے کچھ شعر پڑھے لیکن تمہیں دیکھنے —— دیکھتے رہنے کی چاہت میں میں نے کاپی پیچھے پھینک دی۔ تم نے اپنے پیر میرے پیروں پر رکھ دیئے۔ اور میں نے تمہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ تمہیں پیار کیا — ایک بار میں نے اپنے ہونٹ تمہارے ہونٹوں سے ہٹائے تو تمہارا نچلا ہونٹ کانپتا ہوا دیکھا۔ تم نے ہونٹ کھول کر تیز سانسیں لیں اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"مجھے پیار کرو۔"

تم نے کہا۔۔۔ "لاؤ میں تمہارے ماتھے کو چوموں۔ میرا پیار تمہارے ماتھے پر چمکتا رہے اور سب لڑکیاں دور سے دیکھ لیں کہ تم میرے ہو۔۔۔ کوئی تمہارے پاس نہ آئے۔"

تم نے اپنے ہاتھوں سے میرا سر اٹھایا اور ہونٹ پھیلا کر میرا ماتھا چوما۔

"جب تم ہمارے گھر آتے ہو تو میں صحن میں پاگلوں کی طرح ٹہلتی رہتی ہوں۔"

تمہارے بال بکھر گئے تھے اور تمہاری آنکھوں میں خواہش کی خاموشی پکار تھی۔

میں نے حسب معمول تمہیں تمہارے گھر کے نزدیک چھوڑا۔

"ڈارلنگ۔۔۔" تم نے رخصت ہوتے وقت بے خود ہو کر کہا۔۔۔ "خدا حافظ۔"

انہیں دنوں میں نے اپنے پیغام تم تک پہنچانے کے لئے یہ ترکیب اپنائی تھی کہ میں الماری کی ایک کتاب "پیپرز آف کلچر" میں اپنی پرچیاں رکھ دیتا۔ اس طرح چوری چھپے تمہارے ہی گھر میں تمہارے لئے کچھ رکھ دینا مجھے اتنا اچھا لگتا تھا کہ میں ہر بار حبیب سلیم سے ملنے جاتا کسی نہ کسی طرح تمہارے لئے کوئی تحریر ضرور چھوڑ آتا۔

ملاقات کے دو دن بعد میں نے تمہارے انتسابی قطعے کے جواب میں لکھا۔

LOOK ABOVE AT THE STARS THAT SHINE
AND TELL ME DEAR YOU HOPE TO BE MINE
YOU KNOW I LOVE YOU, ONLY YOU
HAVE ME AND THE WORLD WILL BE THINE

اگلے دن مجھے ہلکا بخار ہو گیا۔ اور میں نے گھر بیٹھ کر تمہارے نام ایک طویل خط لکھا۔ شام کو فون پر تمہیں مجسم محبت پایا۔

"جو کچھ میں نے لکھا تھا تمہیں ملا۔"

"ہاں۔۔۔ تمہیں ہر چیز پر کتنی قدرت حاصل ہے۔"

تمہاری آواز شدید تاثر رکھتی تھی۔

"میں نے تمہیں ایک خط لکھا ہے۔۔۔ اگر آیا تو رکھ دوں گا۔"

"میں بھی رات کچھ لکھ رہی تھی۔"

"کیا۔۔۔"

"تمہارے متعلق ــــ لیکن صرف ایک جملہ لکھ سکی ـــ"

"سناؤ۔"

"تم اتنے بڑے فاتح ہو کہ تم نے ایک ایسی روح کو فتح کیا ہے جس کی تخلیق میں بڑے ریاض سے کام لیا گیا تھا۔"

"اب تم میری ہو؟"

"ہاں۔"

مجھے ایسے لگا جیسے تم بدل رہی ہو۔ اسی طرح ایک دن فیصلہ کر لوگی کہ تم میری بیوی بن سکتی ہو۔ اگلی ملاقات میں جو ایک ہفتہ بعد ہوئی تم نے بغاوت کے واضح اشارے دیئے ـــ سوسائٹی کے عقب میں مختصر سی آغوششوں کے بعد ہم ایرپورٹ کی طرف گئے۔ راستے میں ہم نے گھر بسانے کے خواب دیکھے۔

"تم کسی بے آباد جگہ ـــ خراب مکان میں اکیلی رہ سکتی ہو؟"

"بالکل اکیلی ـــ"

"نہیں ـــ میرے ساتھ۔"

"ہاں۔"

میں نے بتایا کہ میں جب چاہوں دو ڈھائی سو روپے کی نوکری تو کم از کم کر ہی سکتا ہوں۔ اتنے پیسوں میں بہت لوگ رہتے ہیں۔ اگر سنبھال کر خرچ کیا جائے ـــ ہفتہ میں صرف ایک فلم ساتھ دیکھ لی جائے ـــ

"اسکی بھی کیا ضرورت ہے ـــ" تم نے کہا۔

ہم نے ریل گذرتی دیکھی۔ تم نے کار روک لی۔ ریل کے سفر سے اپنی دیرینہ الفت کا ذکر کیا۔

"کبھی ہم ریل میں ایک ساتھ سفر کریں گے۔"

"ہاں۔"

"ابھی ـــ انہیں دنوں ـــ میرٹھ تک تو جایا ہی جا سکتا ہے۔"

تم میرے لئے چاکلیٹ لائی تھیں۔ سوسائٹی میں اپنے پڑاؤ کے دوران میں نے ایک ٹکڑا دانتوں میں دبا کر تم سے کہا کہ نصف تم اپنے دانتوں سے کاٹ لو ـــ جو خط میں تمہارے لئے کتاب میں رکھ آیا تھا وہ تم اس دن واپس لائی تھیں۔ وہ خط تم نے سب سے چھپ کر آدھی رات کو پڑھا تھا اور گھنٹوں روتی رہی تھیں۔

"کس لئے ــــ؟"

"میں بھی تو تمہارا ایک حصہ ہوں۔"

خط میں میں نے اس یقین کے ساتھ لکھا تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کو نہ پاسکیں گے۔ لکھتے وقت مجھے بخار تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی ــــ میں نے لکھا تھا۔

"میرے اندر بھی مینہ برس رہا ہے۔ پانی زمین پر بہہ رہا ہے۔ سرد ہوائیں چل رہی ہیں اور میں اپنے تصور کی راہوں پر پاگلوں کی طرح بھٹک رہا ہوں لیکن تم کسی راستے پر نہیں ملتیں۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے۔ کہ میں تصور میں بھی تمہیں اپنا نہیں سکتا۔ یہ سوچتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ ہم ساتھ ہیں۔ ہم زندہ ہیں۔ ہم محبت کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کی بہت بڑی فتح ہے۔ میں اس ساری دنیا کو جو سمجھ میں نہ آنے والی چیزوں کا مرکب ہے اس کی اس شاندار کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ (اور ــــ آگے ــــ) میں اس وقت بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔ اور بغیر کسی کا خیال کئے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میری روح ــــ میرا سارا وجود تمہیں بلا رہا ہے۔ تم کیسے آؤ گی۔ کب آؤ گی۔ میں نہیں جانتا۔ میں اگر اپنی عقل سے مغلوب ہو کر چپ بھی رہوں تب بھی میرے اندر سے میری ساری زندگی تمہیں پکارے گی ــــ پکارتی رہے گی۔ ناسمجھ ــــ ضدی ــــ فضول زندگی ــــ"

تم نے فرمائش کی تھی کہ میں اس خط کے کچھ حصے خود پڑھ کر تمہیں سناؤں۔ میں نے اسے تمہارے ہاتھوں سے لے کر جیب میں رکھ لیا اور تمہارے بھرے بھرے بازو تھام کر اپنا سر تمہارے سینے سے لگا دیا۔

"یہ بتاؤ کہ تم میری ہو۔"

تم میرے بالوں سے کھیلتی رہیں۔ میرے بال تمہیں بہت اچھے لگتے تھے۔

"ان میں سے ایک خاص خوشبو آتی ہے۔ کبھی کبھی میں گھر میں بیٹھی ہوتی ہوں۔ تو اچانک تمہارے بالوں کی خوشبو کہیں سے آجاتی ہے۔ لگتا ہے تم میرے پاس ہو۔"

تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد تم نے گھر جانے کے لئے ضد شروع کی۔ تم سے ہر ملاقات اور ہر گفتگو کے لمحے مجھ سے چھینے گئے ہیں اور ہر بار صرف ایک بات اور کہہ دینے یا ایک پیار اور لے لینے کی استدعا پر رخصتی کا وقت بڑھا ہے۔

کار سے اترتے وقت تمہارا پیار بے پناہ ہوا کرتا تھا۔

"ڈارلنگ ــــ" تم نے کہا ــــ "ہزاروں پیار۔"

اسی ہفتہ میں میں نے ایک اخبار میں نوکری کر لی۔

تمہیں یہ خبر سنانے کے لئے فون کیا تو تم مل نہ سکیں۔ غلط نمبر بتا بتا کر تھک گیا مگر تمہاری آواز نہ سنائی دی۔

ایک دن ـــ دو دن ـــ چار پانچ دن گذر گئے۔ میں تمہیں اپنا فون نمبر دینا چاہتا تھا۔ اب تم مجھے بھی فون کر سکتی تھیں۔

طرح طرح کے وسوسوں نے مجھے ستایا۔ ایک دو بار تمہارے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس خاص کتب میں پیغامات چھوڑے۔ تمہاری آواز سننے کی ناکام خواہش لئے سلیم کے کمرے پر بیٹھا رہا۔

آخر میں صاحبہ کی مدد طلب کی۔ اسنے کسی معمولی سی بات کا سہارا لے کر تمہارے نام ایک خط لکھا۔ میرے اصرار پر جواب دینے کا شدید مطالبہ بھی شامل کیا۔ میں یہ خط لے کر تمہارے گھر گیا۔

سلیم نے تمہارا جواب اندر سے لاکر دیا۔ جو میں نے واپسی پر پہلا موقعہ ملتے ہی راستے کی روشنی میں پڑھا۔ تمہارے پاؤں میں چوٹ لگ گئی تھی اور تم تقریباً معذور پڑی تھیں۔ تمہارا لہجہ غمگین تھا۔ میری حرکت کو سمجھتے ہوئے تم نے میرے لئے واضح اشارے کئے تھے (... ... سے ننھے منوں کو میری طرف سے خوب خوب پیار کیجئے گا ")

پھر بہت دنوں بعد تمہارا اپس پھرا سلام سنا تو جی چاہا تمہیں کہیں سے گود میں اٹھا لائے۔ صرف آواز کی دوری سے بندھی ہونے کے باوجود وہ قربت کس قدر سچی تھی۔

میں نے ایک سانس میں پوری باتیں بتادیں۔ تم اداس مگر میری باتوں میری محبت کی اسپرنگ رکی تھیں۔ ہمیشہ کی صورت تم بہت جلد خدا حافظ تک آ پہنچیں۔

"میں تمہارے پاس ہوتا تو ابھی تمہارا ہاتھ تھام لیتا کہ فون نہ رکھو۔"

"میرا بس چلے تو میں ساری زندگی فون پہ بیٹھی تم سے باتیں کرتی رہوں۔"

"بس چلے تو بس بھی کرو گی ـــ میرے پاس نہیں آ جاؤ گی ـــ"

"میں پہلے پاگل ہو جاؤں گی ـــ" تم نے ہلکے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"پھر کیا کرو گی۔"

"میں سب کو گالیاں دوں گی ـــ چیزیں توڑوں گی۔ سب مجھ سے تنگ آ جائیں گے اور گھر سے نکال دینگے ـــ میں سیدھی تمہارے پاس آ جاؤں گی۔"

"وعدہ کرو۔"

"ابھی نہیں ـــ ابھی جانے دو۔"

اگلے دن دفتر تمہارا فون آیا۔ گو اس کے بعد اکثر تم مجھے فون کر سکتی تھیں تم نے بہت کم ایسا کیا۔ تمہاری توضیح یہ ہوا کرتی تھی کہ فون کے آس پاس لوگ رہتے ہیں۔ موقع نہیں ملتا۔ اس وقت تمہارا فون آیا تو ڈھنگ سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ مصروفیت کا وقت تھا۔ اور میرے اطراف وہ لوگ تھے جنہیں میں نے مکمل طور پر جانا بھی نہیں تھا۔

شام پانچ بجے دوسرے میں نے فون کیا اور کافی باتیں ہوئیں۔

تم سے ملاقات ہوئی۔ اس بار اور اسکے بعد میں نے جہانگیر روڈ سے ملنے والی ایک سڑک پر تمہارا انتظار کیا اور تم گھر سے سیدھی پیدل وہاں تک آئیں۔

میں تمہیں 'پی' کہا کرتا تھا کیونکہ لالے کا پھول انگریزی میں 'پوپی' کہلاتا ہے (سلیم کی پاکٹ ڈکشنری میں اس لفظ کے ساتھ پھول کی تصویر تھی جسے تم نے لال رنگ سے رنگا تھا)

اس دن آتے ہی تم نے یہ اطلاع دی کہ تم نے بھی میرے لئے نام چن لیا ہے ––– مبلی ––– یہ تم نے اپنی کسی سہیلی کے گھر سنا تھا۔

"مبلی ––– میرے پیارے مبلی"

میں تمہارے لئے 'میرے بھی صنم خانے' لے گیا تھا۔ یہ ناول تمہیں بہت پسند آیا تھا۔

کافی عرصے بعد ہم کلفٹن گئے ––– تم نے اپنا برقعہ اتار کر پیچھے ڈال دیا۔ خود میرے قریب کھسک آئیں۔

میں تمہاری گود میں لیٹ گیا۔ تم میرا چہرہ تھپتھپاتی رہیں۔ جھک کر اپنے آپ میرے ہونٹوں کا طویل بوسہ لیا۔ تمہاری محبت کا اظہار بڑا عجیب ہوا کرتا تھا۔ تقریباً ہر وقت تمہیں اپنے آپ پر قابو رہتا۔ کبھی کبھی تم ڈگمگا جاتیں ––– وعدے کرنے لگتیں۔ پھر اچانک سنبھل جاتیں۔ تمام باتوں سے تمہاری اندرونی کشمکش کی جھلک ملتی۔ تم میرے قریب آتیں۔ میرے بازوؤں میں یوں سمٹ جاتیں۔ جیسے تمہیں اور کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ تم پر نیم بے خودی کی حالت طاری ہو جاتی۔ پھر تم اپنی ڈوبتی ہوئی قوتِ ارادی کا سہارا لے کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے دور ہٹانے کی کوشش کرتیں۔

"نہیں اعظم ––– نہیں ––– نہیں ––– "

میں اپنی گرفت مضبوط کر دیتا۔ تم سر ڈھلکا کر اپنا ہونٹ کاٹتیں۔

"اب میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی ––– " تم جھنجھلاہٹ میں کہتیں۔

میری محبت کا اظہار ہمیشہ غیر معمولی رہا۔ میں نے سب سے پہلے ہی اپنی انا تمہارے حوالے کر دی۔

یہ میری ناتجربہ کاری تھی۔ یا بے بسی لیکن میں نے اپنا فیصلہ تمہیں دے دیا۔ ہر وہ تجویز جسے تمہاری منظوری نہ ملی، ناتمام رہی۔ جیسے وہ تصویر والا معاملہ تھا۔ تم بہت پہلے اپنا گھریلو البم لائی تھیں ـــ (اس میں تمہاری بچپن کی ایک تصویر سلیم کے ساتھ تھی۔ پانچ چھ سال کا سلیم ٹب میں کھڑا تھا۔ اور تم گڑیا جیسی اس کے پاس تھیں۔) تمہاری باجی، بہنوں اور سہیلیوں کی تصویروں کے علاوہ اس میں تمہاری لانے کے پھول والی تصویر تھی۔ جو ٹیبلو کے دوران لی گئی تھی۔ اس تصویر میں تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ میں نے وہ تصویر مانگی تو تم نے وعدہ کر لیا کہ دوسری کاپی مجھے دے دو گی۔ تمہارا ایک تازہ پورٹریٹ بھی تھا جو تم مسلسل کئی ملاقاتوں میں اپنے پاس ہی لائیں لیکن میں نے تمہاری درخواست پر اسے نہیں لیا۔ لانے کے پھول کی تصویر بھی مجھے کبھی نہیں ملی۔ تم شاید محتاط ہو گئی تھیں۔ یہ تمہاری دانش تھی کہ تم دستاویزی شہادتیں نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ میرے نام خط تم نے اسی لئے نہیں لکھے۔ آخر میں تم نے کہا کہ تم ساجدہ کو اپنی تصویر دو گی۔ اس طرح وہ مجھ تک پہنچے تو اچھا ہے۔

کبھی کبھی مجھے غصہ آتا کہ تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتیں۔ لیکن تم بہت جلد مجھے بہلا لیتیں۔

ملاقاتوں میں بہت بے ربط باتیں ہوتیں۔ ایک دوسرے سے دور گزار سے ہوئے وقت کا ذکر ہوتا۔ چپ رہتے تو ایک دوسرے کو دیکھا کرتے۔ ابتدائی دست درازیوں کے بعد ایک دوسرے سے لگ کر سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ ادھورے جملے گفتگو بنتے۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ـــ" تم کہتیں۔

"سناؤ۔"

"ایک سیڑھی سی ہے ـــ میں اس پر چڑھتی جا رہی ہوں۔ تم میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہو۔ اوپر ایک چبوترہ سا ہے۔ میں وہاں سے نیچے کود جاتی ہوں اور تم بھی میرے پیچھے ـــ"

"ثروت۔"

"ہوں۔"

"ہم ہر وقت ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟"

"نہیں رہ سکتے۔"

"چلو ـــ کہیں بھاگ چلیں۔"

"چلو ـــ" ہم بیٹھے رہتے۔ ایک دوسرے کے جسم کی نرمی سے لگے۔

"تمہیں سمندر سے محبت ہے ـــ"

ہے "

"ہم اکس سے رہ جائے گے — مسلسل گھر والی — کیلئے —"

"تم میرا ستیاناس کر دو گے "

"مجھے دیر ہو گئی — " تم تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتیں — " امی ناراض ہوں گی "

ہم اسی طرح کلفٹن کی طرف نیچے کی سیڑھی تک جاتے۔ پہلے کلفٹن کا ایک چکر لگاتے — گویا وہ علاقہ ہماری محبت کی تحویل میں ہو۔

رخصت ہونے سے پہلے تم پرس میں سے کنگھی نکال کر اپنے بال درست کرتیں۔ اپنا ربن باندھتیں۔ برقعہ اٹھاتیں۔ یاد ہے ایک بار میں نے تمہیں باہر کھڑا کر کے تمہارے برقعے کے بٹن لگائے تھے۔

میری تمنا تھی کہ ہم ساتھ سڑکوں پر چلیں۔ ساتھ دوکانوں میں داخل ہوں اور روزمرہ ضروریات کی چیزیں چنیں۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ تم کسی دن کتابوں کی دوکان میں میرے ساتھ چلو اور اپنے لئے کوئی کتاب پسند کرو۔

ہماری محبت کو عام مرد عورتوں کی محبت کی طرح ہونا چاہئے تھا۔ ہم بشیر زفت بہت عنصلہ اور دوسروں سے مختلف دم ترتیب کا لعیل کھیتے رہتے تھے۔ یونیورسٹی میگزین کے پروگرام میں ریڈیو پر ایک مباحثہ میں شریک ہوا تھا۔ کچھ موضوع (معاشیات) میری ہبینخ سے باہر تھا اور کچھ میں بھی مایوس کن رہا تھا۔ نسیم نے میرے کمرے میں بیٹھ کر اس سلسلے میں نکتہ چینی کی جو تم نے سنی۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی جب تم نے عام عورتوں کی طرح نسیم کو برا بھلا کہا۔

"وہ ہوتا کون ہے ایسی باتیں کرنے والا"

میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرا جی چاہا میں اندر جا کر اس کا منہ نوچ لو — بڑا آیا "

(اسی طرح کی دوسری باتیں اب میری یاد کے احاطے کا پھول ہیں۔)

اگر میں اپنی محبت کو مختلف ادوار میں تقسیم کروں تو میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کے وقفے کے ان پانچ چھ ملاقاتوں کو ایک الگ عنوان دوں گا۔ ان تمام ملاقاتوں میں تم اداس لیکن میرے سب ہی رہیں۔ اس زمانے میں فون پر زیادہ باتیں نہ ہوئیں۔ اور ایسا بھی ہوا کہ میں نے فون نہ کیا تو تمہیں فکر کا یت ہوئی۔ ہمارے امتحان بہت قریب آگئے تھے اور ایک دو ملاقاتیں تو صرف اس کتاب کی وجہ سے ہوئیں

جو تمہیں چاہیے تھی۔ اور غلط نام یاد رکھنے کی وجہ سے مجھے کافی دنوں اس کے چکر میں گھومنا پڑا تھا۔

ایک بہت اہم بات جس کا تم پہ گہرا اثر ناگزیر تھا اس دور کے ابتدا میں ہوئی — تمہارے گھر میں کوئی ہنگامہ ہوا۔

تم سے فون پر اس بارے میں باتیں ہوئیں۔ میں نے اپنے 'ڈاک خانہ' میں ایک طویل رقعہ چھوڑا — انگریزی کے چھوٹے چھوٹے بہت خوبصورت جملے — یہ کہ تمہارا غم اور ملال ہی میری غیرت کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے تم سے اور زیادہ محبت ہو جاتی ہے — تجھ میں سمجھ سکھاتی ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ اور یہ کیوں ہماری زندگیوں کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو جانا ہے۔

ان دنوں تمہارے گھر کا ماحول کوئی ناموزوں تھا۔ تم بھی ان سے کسی بات پر خفا تھیں اور اداس تم بہت تھیں۔ ان دنوں تمہاری اپنی امی سے بول چال بند رہی۔

اس کے بعد تم ملیں تو مجسم خزاں تھیں۔ تمہارے گھر کے قریب سوسائٹی میں میں نے تمہارا انتظار کیا اور تم نڈھال ہو کر بیٹھ گئیں۔ آہستہ سے سلام کیا۔ میں نے پیار سے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا لے کے چوما۔

"اعظم —" تم نے کہا — "مجھے کہیں لے چلو — میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔"

میں نے تمہیں بہت پیار سے اپنے قریب کر لیا۔ اور تم نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔

میں نے دلاسے دیئے۔ سمجھایا۔ اگر تم اپنا امتحان پاس کر لو اور ایم۔ اے میں داخلہ لے لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اپنا ایک گھر الگ لے لوں گا۔ اور ہم ساتھ رہیں گے۔

"میں پاگل ہو جاؤں گی —" تم نے کہا — اکثر کہا کرتی تھیں — "تم نہیں جانتے اعظم۔ میں بہت تنگ آ چکی ہوں۔"

میں کیا کرتا —؟

گو میں تم سے اتنی محبت کرتا تھا کہ ساری دنیا تمہارے قدموں میں ڈال دیتا۔ اتنی کہ اپنی ساری زندگی تمہیں بھینٹ دے دیتا۔ اتنی کہ میرا سارا وجود اس کی آگ میں سلگ رہا تھا — پھر بھی — پھر بھی ثروت — میں کیا کرتا — کیا کر سکتا تھا —؟

کلفٹن کے میدان میں میں نے تمہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ "جب تم میرے پاس ہوتی ہو۔ تب تو تمہیں تکلیف نہیں ہوتی۔؟"

تمہاری شوخی دھیرے دھیرے واپس آ گئی۔ تم نے مجھے سیٹ پر لیٹ جانے دیا۔ میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"سو جاؤ — پیارے منے۔"

تمہیں ماں بننے کا بہت شوق تھا۔ اور یہ بات تمہیں خوب یاد رہتی تھی کہ تمہاری ایک واقف لڑکی نے خودکشی کی دھمکی دے کر اپنی پسند کی شادی کی تو اس کے بہت تندرست، خوبصورت لڑکا پیدا ہوا۔ ایک بار تم نے خواب میں دیکھا تھا کہ تم ہسپتال میں سفید چادروں میں چھپی لیٹی ہو اور ایک لڑکے کی ماں بن چکی ہو۔

ہم پتہ نہیں کیا کیا کرتے رہے۔ تمہیں کار چلانے کا شوق تھا۔ میں نے تمہیں اپنے اس قدر قریب کر لیا کہ تم ایکسیلیریٹر پر پاؤں رکھ کر اسٹیئرنگ موڑ سکو۔ ہم نے پورے میدان کے ایک دو چکر لگائے۔ تم میری رفاقت میں بہت مسرور تھیں۔

میں نے اپنے دفتر کا حال بتایا۔ تم وہاں آنا چاہتی تھیں —" دیکھوں تم کیسے لگتے ہو میز پر بیٹھ کر کام کرتے ہوئے — چھوٹے سے ننھے منے سے۔"

میں نے اپنے ایڈیٹر سے تمہارا ذکر کیا تھا اور وہ یہ جان کر متعجب ہوئے کہ میری گرل فرینڈ برقعہ اوڑھتی ہے اور میرے ساتھ فلم دیکھنے نہیں جا سکتی۔

"جب میں زہر کھاؤں گی تو سیدھی تمہارے دفتر آ جاؤں گی اور تمہارے پاس آ کر دم دوں گی۔ تم اپنے ایڈیٹر کو بتانا یہ میری گرل فرینڈ ہے۔"

شمیم غزالی کے فرضی نام سے میری ایک نظم چھپی تھی اور یہ راز سلیم کے علاوہ صرف تم جانتی تھیں

اب نہ تڑپا مجھے، میرے دل، میرے دل
آ انہیں بھول جانے کی کوشش کریں

تم نے اس نظم کو پسند کیا تھا۔ میرے افسانے زیرِ بحث آئے تھے۔ "ایسی باتیں تم کیسے لکھ لیتے ہو تمہیں کون بتاتا ہے" تم نے میرا گال ہاتھ سے دبا کر کہا تھا۔

ہم اپنے ساتھیوں، اچھے لوگوں کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا تھا اچھے لوگ تو دنیا میں بہت سے ہیں لیکن وہ سب ملتے نہیں۔ لوگوں سے ملنا۔ انہیں پہچاننا ایک طویل اور دشوار مرحلہ ہے۔ پھر ایک دفعہ جسے جان لیا جائے وہ زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسے چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ ممکن ہے میرے لئے تم سے کوئی اچھی لڑکی موجود ہو۔ تمہارے لئے کوئی مجھ سے زیادہ مناسب لڑکا ہو۔ لیکن ہم راہ چلتے لوگوں کو رد کر

کر ان کے ساتھ آزمائشی طور پر کچھ کچھ دنوں رہ کر تو اپنا ساتھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔ یہ تو بالکل ناممکن ہے۔
تم بولیں ۔۔۔ مجھے دوسرے لڑکوں سے کوئی مطلب نہیں میرے لئے صرف تم ہو (واپسی پر
ہم کلفٹن کے پل پر سے اتر رہے تھے) تمہارے علاوہ میں کسی کو نہیں جاننا چاہتی "
تمہیں رخصت کرتے ہوئے میں بلا دیہ طیش میں تھا۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے میں نے کہا تھا کہ جس
کے لئے ہم ہر لحہ پریشان رہتے ہیں۔ اس سے ملتے ہیں تو صرف چند گھنٹوں کے لئے ۔ نہ کوئی بات ہو پاتی
ہے نہ طبیعت سیر ہوتی ہے۔ آخر کار تمہیں تمہارے گھر کے نزدیک کہیں اتار دینا پڑتا ہے۔ تم اترتے اترتے
پیار کے کچھ جملے کہتی ہو۔ کوارٹروں کے پیچھے کی کسی گلی میں جاتے جاتے مڑ کر مجھے دیکھتی ہو پھر اپنے محفوظ،
بند گھر میں پہنچ جاتی ہو۔
تم سے فون پر ملاقاتیں بہت کم ہو گئیں۔ اس ملاقات اور اگلی (آٹھ روز بعد) کے دوران
صرف ایک بار فون پر تمہیں پا سکا۔ مختصر باتیں ہوئیں۔
(فون دراصل ہماری کہانی کا ایک کردار ہے۔ بڑی اکتیوں نے میرے لئے وہی حیثیت حاصل کر
لی تھی جو محبت ناموں کی ہوتی ہے۔)
اب بھی تمہارے گھر میں ہر بار کوئی نہ کوئی شعر ۔۔۔ جملہ ۔۔۔ پورا خط اس کتاب میں ضرور
چھوڑ آتا تھا۔ ایک بار کافی عرصہ تمہیں فون پر نہ پانے کے بعد میں نے لکھ دیا۔

تم سے الفت کے تقاضے نہ سنبھالے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

تم بہت ناراض ہوئیں۔ جیسے میں نے تمہاری محبت کی توہین کی ہو۔
اگلی ملاقات (۔۔۔ اپریل) صرف اس لئے ہوئی تھی کہ میں تمہارے لئے وہ کتاب خرید لایا تھا۔
جس کی تمہیں ضرورت تھی۔ اس میں تقریباً سارے اردو شاعروں کا تذکرہ اور نمونۂ کلام تھا۔ تم نے مجھے
بڑا انتظار کرایا تھا۔ کوارٹروں کی کھڑکیوں سے عورتوں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع
کر دیا تھا۔
تمہارے انتظار میں میں نے اس کتاب کے سب سے آخری صفحہ پر کچھ لکھا تھا ۔۔۔ (۔۔۔ اس
کتاب میں بہت سے حساس لوگوں کی محبتوں کے اقرار ہیں۔ لیکن محبت کے جتنے پھول اس کتاب میں
جمع ہیں اس سے زیادہ تو میں نے تمہارے لئے صرف اپنے پیار کی دہلیز پر بچھائے ہیں ۔۔۔ بلی)
تم آئیں ۔۔۔ تم نے آخری صفحہ چاک کر کے بڑی حفاظت سے اپنی گردن کے نیچے اڑس

لیا۔

"لکھا مت کرو" تم کہتی تھیں ــــ "محسوس کیا کرو۔"

میں تمہیں لئے زرگر روڈ سے ہوتا ہوا کلفٹن آ گیا۔

"تم مجھے بہت تنگ کرتے ہو ــــ" تم نے شکایت کی۔ "میں تم سے نہیں ملوں گی ــــ"

"اگر تم میری ہو تو بالکل میری ہو۔"

"نہیں ــــ"

"پھر کس کی ہو؟"

"پتہ نہیں۔"

تمہارے موڈ ہواؤں کی طرح آتے تھے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم میدان کے درمیان ایک دوسرے سے الگ بیٹھے ہیں۔ تم ناراض ہو اور باہر دیکھ رہی ہو۔ میں چپ چاپ تمہیں گھور رہا ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد تمہیں مجھ پر بے حد پیار آ رہا ہے۔ تم شرارت سے مسکرا رہی ہو۔ میں تمہارا ہاتھ تھامتا ہوں۔ تمہارے قریب سرک آتا ہوں۔ تم بغیر کسی مدافعت کے میری گرفت میں آ جاتی ہو۔

"بلی ــــ" تم ڈانٹتیں ــــ "شریر لڑکے ــــ تو اتنی بدتمیزی کیوں کرتا ہے۔ تیری ماں سے جا کر کہوں گی اور تیری خوب پٹائی ہو گی ــــ"

اپنی ملاقاتوں میں دنیا زمانے کی باتیں ہوتیں۔ ذکی کا کہیں معاشقہ چل رہا تھا۔ اور اس لڑکی سے ملنے کے لئے اسے سلیم سے تمہارے دوسرے مکان کی کنجی مانگی تھی۔ جو پروگرام بنا تھا میں نے تمہیں اس کی اطلاع پہلے ہی دیدی تھی۔ اور اس واقعہ کے روز تم سب کچھ جان گئی تھیں۔ خود ذکی اور ان کی محترمہ نے بھی راز تقریباً فاش کر دیا تھا۔ ایک رات جب ذکی اور سلیم امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور تم ان کے لئے چائے لے کر گئی تھیں۔ تو سلیم نے تمہیں اندر بلا لیا تھا۔ تم نے ذکی کے معاشقے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ تم نے کہا تھا اگر تم خود کسی سے اس طرح جا کر ملو تو وہ دونوں کیا کہیں گے۔ دونوں نے برجستہ کہا انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

"پھر میں سلیم کو بتا دوں۔"

"نہیں۔"

"کیوں ــــ؟"

"انہیں اچھا نہیں لگے گا۔"

"مجھ سے اچھا لڑکا وہ تمہارے لئے کہاں سے لائے گا؟"

"تم انہیں نہیں جانتے۔"

"پھر ہمارا کیا بنے گا ۔۔۔؟"

اس سوال سے ہم دونوں بہت ڈرتے تھے۔ تم نے سنجیدگی سے کبھی آنے والے دنوں پر بحث نہ کی تھی۔ میں خود بانی کی بنیادوں پر عمارت بناتا تھا (لوگ تمہیں بیگم ثروت اعظم سلطان کہیں گے اور چند سالوں بعد تم گڑیوں کی نمائشوں اور کالجوں کے مباحثوں کا افتتاح کیا کرو گی)

تمہاری محبت پر یقین کے باوجود یہ جانتا تھا کہ تمہارے گھر نے تمہیں وضعداری کے آہنی سلاسل سے باندھ رکھا ہے۔ تمہارے ابا جان کی اتھاہ خود سری نے تم سب کو اپنی امی سے قریب ترین کر دیا تھا۔ تم سب کے لئے تمہارے ابا ایسی علامت تھے جس سے بغاوت کی جاتی ہے۔ اور تمہاری امی ایک ایسے مقدس وجود جیسے آگے سجدے کئے جاتے ہیں۔ مصیبت یہ تھی کہ تمہاری امی کے لئے روایات کی سربلندی سب سے مقدم فریضہ تھا۔ یہ تمہیں نے تو بتایا تھا کہ تمہارے بھائی جان نے اپنی جوانی کے دنوں میں اپنی کسی کزن سے محبت کی تھی۔ تمہاری باجی بھی کسی کے متعلق سوچا کرتی تھیں۔ تمہاری امی نے غیر معمولی چابکدستی سے خاندان میں ایسی شادی کرا دی کہ یکایک وقت بھائی جان اور باجی کی محبتیں چھن گئیں۔ بقول تمہارے، تمہارے بھائی جان صحن میں چارپائی پر لیٹ کر بے آواز رویا کرتے تھے۔ اور امی کہا کرتی تھیں جان سے مار دوں گی اگر آواز نکالی۔

تمہاری قربت میں میں ان باتوں پر کم دھیان دیا کرتا تھا۔ تم پاس ہوتیں تو صرف اس لئے کہ تمہیں پیار کیا جائے۔ تیئیس سال کی اوسط زندگی میں ملے ہوئے ان چند گھنٹوں کے ایک ایک لمحے میں اپنا دل چھپا دیا جائے۔

"میری ثروت ۔۔۔" میں بار بار کہتا ۔۔۔ "میں نہیں جانتا میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ بار بار تم سے یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تم یہ بات بھول جاؤ گی ۔۔۔"

تم میری قربت کی آگ سے سلگتے ہوئے چہرے کو ہلا کر انکار کر دیتیں۔ تمہاری کھوئی ہوئی گہری آلود آنکھیں مجھے یوں دیکھتیں جیسے مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہوں۔

"تم مجھے بہت تنگ کرتے ہو ۔۔۔" تم گہری سانس لیتیں۔

میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا تھا تم اپنے مکان کے باورچی خانے میں فرش پر بیٹھی چاول بین رہی ہو۔ اور تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہاں کوئی نہیں ہے ۔۔۔ میں سیدھا تمہارے

پاس جاکر جھک کر اپنے ہونٹوں سے تمہارے آنسو پونچھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

وہ دن صرف سوالوں کے دن تھے۔ چھلاووں کی طرح سوال ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اتنی تیزی سے سامنے آکر اوجھل ہو جاتے تھے کہ جواب دینے کی کوشش بھی بے سود تھی۔

"میں نے ایک نظم لکھی ہے ـــ" ایک رات تم نے اطلاع دی۔ تم رات پڑھتے پڑھتے تھک گئی تھیں اور تم نے کچھ یہ لکھا تھا۔

میں کہیں دور ـــ بہت دور چلی جاؤں گی۔
تم جہاں میرے تصور کے سہارے بھی کبھی آ نہ سکو

ـــ اپریل سے امتحانات شروع ہوئے۔ ہر مضمون کے لئے بمشکل ایک دو دن پڑھائی ہو سکی۔ امتحان کے دوسرے پرچے کے دن تم سے ملنا طے تھا۔ یہ ہمارے اس دور کی آخری ملاقات تھی۔ میں نے نمائش کے قریب تمہیں اپنی کار میں بٹھایا۔ اسی محبت سے تم ملیں۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم دو گھنٹے سے زیادہ ساتھ رہے۔ بچوں جیسی باتیں ہوتیں۔ تمہیں پیار کیا۔ تمہیں سینے سے لگایا۔ تمہیں تنگ کیا۔ اور تم تھکی ہاری میری باہوں میں اکھڑی سانسیں لیتی رہیں۔

میرے امتحان کا دن چار۔ ایک پرچے کے لئے تمہیں بیسٹر لیکچر سے نوٹس حاصل کرنا تھے۔ میں شام کو تمہارے یہاں گیا۔ تم نے ایک کاپی اور ساجدہ کے نام ایک خط لفافہ میں رکھ کر بھجوایا۔ اس میں میرے نام بھی ایک پرچہ تھا۔ لفافہ بند کر کے تم نے پھر کھول دیا تھا کہ کہیں میں اسے بغیر کھولے ساجدہ کو نہ دے دوں۔ انگریزی میں تم نے لکھا تھا۔ پی (دہلی کے لئے) میں تمہارے لئے بہت فکرمند ہوں۔ آج بہرصورت ہماری بات ہونا چاہئے ـــ امتحان کے لئے میری طرف سے بہترین تمنائیں ـــ پی ـــ"

اسے پڑھتے ہی میں نے تمہیں فون کیا۔ لیکن وہاں تمہارے ابا جان تھے۔

تمہارے امتحان بھی شروع ہو گئے ـــ تم سے گفتگو بمشکل ہفتہ میں ایک ہو پاتی۔ کبھی بہت جی چاہا کر تم سے کچھ کہوں۔ تم ملو۔ لیکن امتحانات کے دوران یہ مشکل تھا۔ اور فون پر تمہیں پانا محض قسمت کی بات تھی۔

ایک پیر صبح صبح تمہارا فون آیا۔ اتوار کے دن تمہیں میں بے حد یاد آیا تھا اور تم نے چاہا تھا کہ اسی وقت مجھے رنگ کرو۔ پھر خیال آیا ہے اتوار ہے میں دفتر میں نہ ہوں گا۔ ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

"اگر مجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہے تو میرے پاس آ کیوں نہیں جاتیں ـــ؟

"تمہارے پاس آنا تو ایک لمبا پروگرام ہے ——"

"نہیں —— ابھی آؤ۔"

"اچھا —— آرہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"تمہارے دل میں۔"

دو چار دن خاصی باقاعدگی سے باتیں ہوئیں۔

تیسرے دن شام (—— مئی) ایک اجنبی آواز نے فون کا جواب دیا۔ ایسے لگا جیسے گھر میں کافی لوگ ہیں۔

"سلیم کو بلا دیجئے۔" میں نے کہا۔

انہوں نے بتایا کہ سلیم کے کسی قریبی عزیز کے انتقال کا تار آیا ہے۔ ویسے وہ خود گھر پر نہیں ہے۔ یہ مختصر زمانے میں تمہاری قسمت پر دوسری کاری ضرب تھی۔ تمہارے لئے میرا دل مچل گیا۔ میں بہت دور تک پیدل چلا۔ میں نے اپنے آپ کو تھکا کر چور کر دیا۔

دوسرے دن صبح اتفاق سے تمہیں نے فون اٹھایا۔ روتے روتے تمہاری آواز بدل گئی تھی۔ حفاظتاً میں نے سلیم کو پوچھا۔

"وہ یہاں نہیں آ سکتے —— یہاں عورتیں ہیں۔"

"ثروت؟"

"جی۔"

"ثروت —— مجھے معلوم ہے۔"

تم اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ابھی نہیں ثروت —— ابھی نہیں —— تم اپنے آنسو بھی میرے لئے بچا لو۔ اگر رونا ہے تو میرے پاس آ کر رونا —— اکیلے نہیں ——"

میں نے ساجدہ کو تمہارے پاس بھیجا۔ خود سلیم کے پاس جا کر بیٹھا۔

اس حادثہ سے کچھ ہی دن قبل تمہارے پھوپھا تمہارے پڑوس میں آ گئے تھے۔ اور دو مکانوں کے بعد رہ رہے تھے۔ ایک کزن بھائی (تم سے دو تین سال بڑا) اور دو تین بہنیں —— ان سب کی قربت سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ تم بہل گئیں لیکن ہماری دوری اور بڑھ گئی۔ فون پہ تمہارا ملنا اس لئے

محال تھا کہ تم تقریباً ہر وقت اپنے پھوپھا کے گھر ہوا کرتی تھیں چھٹیوں کے دن تم کیرم اور لوڈو کھیل کر گذار رہی تھیں۔ محبت سے گفتگو کا واسطہ ہفتہ میں ایک تھا۔ ملاقات کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ان دنوں تمہیں کہیں باہر نہ جانا چاہئے تھا۔

یہ دن یاد ہی نہیں آتا کیسے گذرے۔ سلیم سے ملتا ہوتا تھا دیر دیر تک ہم ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ تمہارے گھر اکثر میں جانے کے لئے منع کیا کرتا تھا۔ اور کئی بار تم نے صرف میرے لئے چائے بنائی تھی۔

تمہارے کزن بھائی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ اس شخص کو دیکھ کر میں سلگ اٹھتا تھا جو سیدھا تمہارے گھر کے اندر جا سکتا ہو۔ مجھے تمہارا رشتے دار ہونا چاہئے تھا۔ یہ فاصلے تو بہت ہیں کہ نہ کسی کے ذریعے تمہیں بلایا جا سکے اور نہ تم خود آ سکو۔

ایک دو بار تم سے پیاری پیاری باتیں ہوئیں۔ تم شعر سنائیں۔ اپنے گھر کی باتیں کریں۔ تم نے ایک خواب دیکھا تھا کہ میں تمہارے ہی گھر میں تمہیں گود میں لئے بیٹھا ہوں اور کسی اور کمرے میں محسنہ کسی اور سے تھی ہے۔

— جون کو ہم مل سکے۔ دو گھنٹے ہم ساتھ رہے میں کار لئے بھٹکتا رہا۔ لیکن یہ ملاقات اتنی گرمجوشی کی نہ تھی۔ میری دست درازیوں ہی کی ہوئی تھی۔ تمام وقت میں تم سے شنا ہتیں کرتا رہا تھا۔ — تم ملتیں نہیں — تم سے بات نہیں ہو پاتی۔

"اب تو میں تمہارے پاس ہوں۔" تم مجھے بہلاتیں۔

"ابھی تمہیں دیر ہونے لگے گی۔ پھر تم نہ جانے کب ملو گی۔"

"جب پھر موقعہ ملے گا۔"

مجھے غصہ آتا تھا۔ میں چاہتا تھا تم میرے لئے کچھ کرو۔ جھوٹ بولو۔ کسی کو دھوکہ دو۔ دوسروں کو نظر انداز کر کے مجھ سے ملو۔ اس ملاقات کو دوسری چیزوں سے اہم سمجھو۔

لیکن تم بہت محتاط۔ اور مضبوط۔ اور اپنے تئیں بہت عقلمند تھیں۔ تمہیں تو اپنی قوتِ برداشت پر ناز تھا۔

"میں ایسی ہوں جیسا اگر اکنواں۔"

اور میں کہتا تھا — "تم میرے مقبرے پر بھی اپنی قوتِ برداشت کا کتبہ لگانا۔"

"جذباتی مت بنو —" تم بہت عجیب انداز میں ادا سے کہتیں۔ "کتنے اچھے ہو تم۔"

تم میرا سر سہلاتیں — "سو جاؤ —" تم اپنی گود میں رکھے میرے سر پر ہلکا طمانچہ مارتیں —

تمہیں نیند بہت آیا کرتی تھی نا ـــ اور شب بھر جگے منایا کرتا تھا۔ میں اسی لئے کہتا تھا کہ جب ہم ساتھ سو کرینگے تو تم سویا کرنا۔ اور میں جاگ کر پہرہ دیا کروں گا۔

"اپنے آپ کو مصروف رکھو ـــ" تم مشورہ دیتیں۔

"اور ـ"

"اچھے اچھے کام کرو ـــ خوب تندرست ہو جاؤ۔ میرا کہنا بالکل نہیں مانتے۔ وعدہ کرو۔ تم ورزش کرو گے ـــ"

"اور کیا کروں ؟"

"مجھے بھول جاؤ ـ"

"تم مجھے بھول سکتی ہو ـــ؟"

"پتہ نہیں ـــ"

مجھے یہ احساس ہو چلا تھا کہ اپنے آپ کو پوری طرح تمہارے حوالے کر کے میں نے غلطی کی ہے میں خود کتنا ہی ثابت قدم، نڈر اور عملی تھا میری وہ شخصیت جو تم سے محبت کرتی تھی نرم، اور ناسمجھ تھی۔

یہ فیصلہ تو میں نے بعد میں کیا کہ ہر وہ شخص جس سے پاگلوں کی طرح محبت کی جائے اب بن جاتا ہے کہ جواباً ایسی جنون انگیز محبت نہ کر سکے اور ہر وہ شخص جو کسی کو دیوانگی سے چاہے اس قابل نہیں رہتا کہ اسے متوازن رہ کر چاہا جائے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے کہ اس پر دیوتاؤں کو ماتم کرنا چاہئے۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ میری چاہت نے تمہارے احساس کی ہر سرحد کو چھوا ہے۔ یہ میری قسمت تھی کہ تمہارے خاندان کی فصیل گہری بنیاد رکھتی ہے۔

ملاقات کے بعد پورے تیرہ دن تم سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ اپنے دفتر میں ہی خاصا مصروف رہا۔ پھر بھی تمہاری دوری نے بہت دکھ دیا۔ اکثر میں فون کرتے کرتے تھک جاتا۔ تم اپنے رشتے کے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتیں۔ یا تمہیں موقعہ نہ ملتا

انہیں دنوں ہمارے ایک دوست کی مشکوک حالات میں موت ہوئی۔ زیادہ لوگوں نے اسے خودکشی کہا۔ جس دن اس نے دم توڑا اسی دن تم نے میرا فون اٹھایا۔ تم بڑے پیار سے ملیں۔ ڈھنگ سے باتیں کیں۔ اتنے دنوں غائب رہنے کی معافی مانگی لیکن جلد رخصت ہونا چاہا۔

"ہم بلی سے کہہ رہے ہیں ـــ بلی ہمیں جانے دو ـــ"

"نہیں ـ"

"بُری بات ہے۔ سب گھر میں موجود ہیں۔"

"میں کیا کروں۔"

"پھر کسی دن — پلیز —"

تم نے خدا حافظ کہہ دیا۔

محرم کے دن تھے اور ایک دن تمہاری امی وغیرہ کسی مجلس میں گئی ہوئی تھیں جب میں سلیم اور کچھ دوست مکان کے اندر دالان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تم نے چائے بھی بنائی تھی۔ تم پڑ بس میں اپنے پھوپھا کے تھیں۔ ایک بار پچھلے دروازے سے اندر آئیں تو مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تم بہت مضمحل اور بے چین نظر آئیں۔ دوسرے لوگوں کو دیکھ کر تم واپس چلی گئیں۔

اس طرح تمہیں دیکھ لینا — دیکھ لینا اور بات نہ کر سکنا۔ میرے لئے قیامت ثابت ہوا۔ میں ذرا دیر وہاں نہ ٹھہر سکا۔

دو روز بعد مجھے اس کتاب میں ایک کاغذ ملا جس پر صرف ایک شعر لکھا تھا۔

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے

ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

فون پر تم ملیں اور تم نے ملنے کا وعدہ کیا۔ میں نے مقررہ وقت اور مقام پر تمہارا انتظار کیا۔ تم نہیں آئیں۔ — ایک گھنٹہ — دو گھنٹے — تین گھنٹے گذر گئے۔

شام کو تم فون پر کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ کوئی بات ہو گئی تھی۔ اور اس کی تفصیل تم نے مجھے نہیں بتائی۔

میں اپنے الجھے ہوئے جذبات لئے رات گئے تک سڑکوں پر پھرتا رہا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر چیز میرے ہاتھوں سے سرکتی محسوس ہوتی تھی۔ میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ کوئی فیصلہ — کوئی ایسی بات جو مجھے امکانات کے خوف سے بچائے۔ شکوک کی اس تاریکی میں سلیم مجھے روشنی کی طرح واضح اور راہبر نظر آتا۔

ہماری ملاقاتوں کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب تم نے وعدہ وفا نہ کیا تھا۔

میں نے چاہا کہ میں سلیم کو اپنا رازدار بنالوں۔ یہ میرے لئے آسان تھا ضروری بھی تھا لیکن تم نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی تھی اور ظاہر ہے میں مشعل تمہارے ہاتھ میں دے چکا تھا۔

کئی دنوں تم سے بات نہ ہو سکی۔ دفتر کے ہنگامے مجھے دن میں مصروف رکھتے۔ کبھی کبھی شام کو کسی تقریب میں جانا پڑتا۔ جہاں میں سب سے الگ الگ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا اور خود اپنے آپ پر

رتم کھایا کرتا۔

پھر ایک دن تم سے بات کرنے کا موقع ملا۔ تم نے نہ آنے کی معافی مانگی۔ اپنی مجبوریاں بتانے لگیں۔

"پھر کب ملوگی" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا

"بہت جلد۔"

میں تم سے بہت کچھ کہنے کے لئے مرا جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم ۔ آخری فیصلہ کر لو کہ تم میری ہو۔ میں ابتدا سے اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا تھا کہ تم میرے لئے اپنا گھر چھوڑ دو ۔۔۔ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو بہر حال قائم رہتے ہیں۔ بھائی بہن سب آخر میں مان جاتے ہیں۔ پھر ایسے فیصلے تو امتحان ہوا کرتے ہیں۔ وہ جو اہم ہیں۔ وہ جو محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں لیکن یہ تمام باتیں جس طرح سلجھے ہوئے انداز میں میرے ذہن میں آتیں میں تمہیں کبھی نہ بتا پاتا۔ تمہارے سلسلے میں جو باتیں میں نے سب سے گہری محسوس کیں وہ اب تک اظہار کی دسترس سے باہر ہیں۔

تم دراصل میرے اور حقائق کے درمیان ایک پل تھیں۔ میں دنیا کی بے ثباتیوں اور سچائیوں کی چاپ راہی سے واقف تھا۔ مجھے ہر جستجو کا انجام معلوم تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں تمہاری محبت کو اپنا عقیدہ بنا کر دنیا کے تھپیڑوں سے بچ جاؤں گا۔ مجھے صرف اپنی محبت کی سچائی پر یقین تھا۔ بذاتِ خود محبت کا وجود یا عدم وجود میرے لئے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ میں اپنی محبت کو فریب بھی سمجھ سکتا تھا لیکن یہ میرے لئے آخری سہارا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں تمہیں ایک پل کے لئے بھی یہ بتا سکا کہ میرے جذبات عام ہونے کے علاوہ کتنے مختلف بھی ہیں تو تم کبھی محبت سے دور نہ جاؤ گی۔ تم مجھے میری ساری محرومیوں اور بدقسمتیوں سے بچا لوگی۔

ایک بار پھر تم نے ملنے کا وعدہ کیا۔

ایک بار پھر تم نہیں آئیں۔

میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ کرتا رہا۔ یہ میں جانتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو لیکن یہ محبت دوسری چیزوں سے اتنی جلدی ہار کیوں جاتی تھی؟

میرا نتیجہ نکلا ۔ (سیکنڈ ڈویژن)

میں نے کئی دن تمہیں فون نہ کیا تھا۔ تم سے ناراض ہونے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ کے دو چار دن بعد میں نے بے قابو ہو کر تمہارا نمبر ڈائل کیا۔

تمہارا مخصوص ادائیں بھرا اسلام سننے کو ملا۔

"میں بہت خوش ہوں۔ تمہارے اتنے اچھے نمبر آئے ہیں"

سلیم یونیورسٹی سے میرے نمبر نکلوا کر لایا تھا اور اس وقت تم ان کا حساب لگا رہی تھیں۔ کچھ مضامین میں واقعی اچھے نمبر تھے۔

تم نے ہی کھول کر مبارک باد دی

"مجھے یقین نہیں آتا۔" تم بولیں

"اگر تم نے میری ہو جاؤ تو میں کبھی، کسی چیز میں فیل نہیں ہو سکتا۔"

تم نے جھٹ ملنے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن صبح دفتر تمہارا فون آیا۔ ہم اسی دن ملنے والے تھے۔ تم نے کسی مجبوری کی وجہ سے اسے ایک دن آگے بڑھا دیا۔ تمہاری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہ تھی اور تم اپنے گھر کے بہت قریب مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔

—— جولائی کو میں نے کوارٹروں میں سے تمہیں کار کی طرف آتے دیکھا۔ سیاہ برقعہ میں ڈھکی۔ اپنی پُر وقار چال چلتی ہوئی تم بہت نفیس لگیں۔ میں نے کار آگے بڑھا کر تمہارے قریب ذرا دیر کو روکی۔

"ہائے اللہ۔ کتنے سویٹ لگ رہے ہو۔" تم نے میرا ہاتھ اپنی گود کی طرف کھینچ لیا —— "یہ لو تمہارے پاس ہونے کا تحفہ۔"

خوبصورت سے چھوٹے رومال میں گلاب کا ایک تازہ پھول۔

میں نے اسے لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"یہ ہمارے گھر کے گلاب کا پہلا پھول ہے۔ پتہ ہے میں تم سے اس دن کیوں نہیں ملی تھی —— ؟ میں اس پھول کے کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے نم آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھا۔ ٹریجڈی یہ تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ ٹریجڈی یہ بھی کہ ہمارے لئے ایک دوسرے سے دور جانے کا کوئی بہانہ نہ تھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو۔"

"میں جانتی ہوں تم یہ کہو گے۔"

اس دن ہم کلفٹن نہیں گئے۔ میں نے تمہیں سوسائٹی کی وہ سڑکیں دکھائیں جہاں میں تمہارا تصور لئے ٹہلا کرتا تھا۔

ایک جگہ میں نے کار روکی۔

"اپنا ہاتھ لاؤ ——" اور پھر تم نے چاندی کا ایک چھلا اپنے ہاتھ میں سے اتار کر میرے بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنا دیا —— "یہ بھی تمہارے لئے ہے۔"

تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چھلا تم نے خاص طور پر صفیہ کے ہاتھ صدرت منگایا تھا۔ چھلا دے کر تم مجھے چھوٹ دے گئیں۔ میں زمانے سے یہ سوچا کرتا تھا کہ کسی دن تمہیں میں سونے کی ایک انگوٹھی پہناؤں گا۔ اور وہ ساری منگنی کی انگوٹھی ہو گی۔

"میں اسے ہمیشہ پہنے رہوں ۔۔۔؟" میں نے پوچھا

"ہاں۔"

"لوگ پوچھیں گے تو میں ان سے کہوں گا یہ میری منگنی کا چھلا ہے۔"

"کہہ دینا۔"

تم بہت کمزور لگ رہی تھیں۔ تمہارے چہرے پر زردی تھی۔ جاتے وقت التجا کی تھی کہ میں تمہیں تنگ نہ کروں اور میں نے بہت نرمی سے تمہارا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر تمہیں پیار کیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی جو دوسری باتیں تم نے ہم نے کی تھیں، احساس کی شدت میں کھو کر یاد سے مٹ چکی ہیں۔ ذہن میں تسلسل کے بغیر تصویریں بنتی ہیں۔

تم پیار سے میرے بالوں سے کھیل رہی ہو۔ تم اس گیت کے بول سنا رہی ہو جو تمہیں پسند آیا تھا۔ مجھکو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو۔ صرف تمہارا چہرہ تصور کے چوڑے پردے پر چھایا ہوا ہے اداس مگر مسکراتا چہرہ۔ کھوئی کھوئی سی آنکھیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم کس قدر یاد آتی ہو۔ میں کتنا بے بس ہوں تمہارے ہونٹ کھلے ہیں۔ تم کچھ نہیں کہتیں۔ میری طرف جھک جاتی ہو۔

"بلی ۔۔۔"

محبت کا وہ سارا بچپنا ۔۔۔ بے چین ہاتھوں کی مسافتیں۔ اور ۔۔۔ بالآخر ۔۔۔ رخصت۔

"خدا حافظ ۔۔۔ ڈارلنگ ۔۔۔" تم نے کہا۔

اس کے بعد کافی دنوں تمہارا پتہ نہ چلا۔ تمہارا نتیجہ آیا (تھرڈ ڈویژن) صرف اس بات سے بے پناہ خوشی ہوئی کہ تم پاس ہو گئی ہو۔ اور یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتی ہو۔ تمہارے ابا جان نے تمہارے ایم۔ اے کرنے کی سخت مخالفت کی مگر سلیم کی مدد نے انہیں نرم کیا۔ صفیہ نے باقاعدہ انہیں یہ پٹی پڑھائی کہ یونیورسٹی میں لڑکیاں اور لڑکے بالکل الگ الگ رہتے ہیں۔

پتہ چلا تم ایم۔ اے کرو گی۔

مجھے بڑا سکون ہوا۔ میں نے سوچا اب تم حاصل کی جا سکتی ہو۔

ان دنوں کے جذبات ایک مستقل اور گہرے احساس کا حصہ تھے۔ اس لئے واقعات کے تنوع کے باوجود

ہر بات ایک ہی رنگ کا عکس رکھتی ہے۔

تمہارا داخلہ کافی مشکل تھا۔ جس سبجیکٹ میں تم داخلہ چاہتی تھیں اس میں تمہارے نمبر خاصے کم اور درخواستیں سیٹوں سے بہت زیادہ تھیں۔

ایک دو بار تمہارے یونیورسٹی جانے کا علم ہوا۔ یہ سوچ کر کہ تم یونیورسٹی گئی ہو گی۔ پہلی بار مجھ میں رقابت کا جذبہ پیدا ہوا۔ تم وہاں جاؤ گی اور سب تمہیں دیکھیں گے۔ وہ تمہارا نام معلوم کریں گے۔ تم سے ملنا چاہیں گے۔ تمہارے متعلق غلط فہمیوں میں پڑیں گے۔

پتہ نہیں تم فون سے دور دور کیوں رہنے لگی تھیں۔

تمہارے داخلے کا چکر چل رہا تھا کہ ملنے کا طے ہوا۔ وہیں جہاں ہم سب سے پہلی بار ملے تھے۔ میں نے تمہاری راہ دیکھی۔ تم نہیں آئیں۔

میں بہت تلملایا۔ بے تاب ہوا۔ تڑپا۔ اسی وقت تمہیں فون کیا۔ تمہارا پتہ نہ چلا۔ بعد میں تم نے بتایا کہ اس وقت تمہارا داخلہ گھر میں زیر بحث تھا۔ ابا جان کچھ ناراض تھے اور انکار کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ تم اپنے بستر پر پڑی رو رہی تھیں۔

۔۔۔ اگست کو تم نے فون پر بتایا کہ تم دوسرے دن یونیورسٹی جانے والی ہو۔ اور اگر میں کسی بہانے کار لے کر تمہارے گھر آسکوں تو اچھا ہے۔ تم مجھے دیکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے ساجدہ کو راضی کیا کہ وہ یونیورسٹی کا کوئی کام نکالے۔ ہم دونوں تمہارے گھر گئے۔ تمہارے کمرے کے قریب کار کھڑی کی۔ تمہاری امی نے ہمیں دیکھا اور ساجدہ کو ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ سلیم کپڑے بدل رہا تھا۔ میں باہر کار کے قریب اکیلا کھڑا رہ گیا تو تم نے اور صفیہ نے اندر سے جھانکا۔ کسی بات پر ہنس دیں۔

ہوا یہ تھا کہ صفیہ نے مجھے دیکھ کر تم سے کہا کہ میں بہت اسمارٹ لگ رہا ہوں اور کیونکہ سلیم اپنے کمرے میں ہے اور ساجدہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔ اس لئے تم پچھلے دروازے سے نکل کر چپکے سے میرے ساتھ بھاگ جاؤ۔

ہم ساتھ یونیورسٹی گئے۔ سلیم کسی کام سے اپنے ڈپارٹمنٹ چلا گیا۔ ہم تینوں کچھ دیر ساتھ رہے۔ یہ ہماری بے تکلف ملاقاتوں کے بعد پہلا موقع تھا کہ ہم دوسروں کے سامنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے صرف موقعہ ملنے پر دوسرے کو دیکھنا اور سامنے ہونے کے باوجود بھی اتنی دور ہونا ناقابلِ برداشت ہوا جا رہا تھا۔

میں تم سے الگ ہو کر کینٹین گیا۔ کچھ لوگوں سے ملا۔ تمہارے داخلہ کا سلسلہ پھر ٹل گیا۔

تمہارا برقعہ کار میں تھا اور میں تم پر تقریباً سارے لڑکوں کی نگاہوں کا اجتماع دیکھ رہا تھا۔ میرا

ہے صرف چاہا کہ سب کسی طرح جان لیں کہ تم میری ہو۔ ہم ساتھ ساتھ چلیں۔

ساجدہ کو جلد واپس آنا تھا۔ میں نے تم سے کہا کہ ہم تمہیں بھی گھر چھوڑ دیں گے۔ سلیم کو رکنا تھا۔ اسنے تمہیں ہمارے سپرد کر دیا۔

ہم تینوں واپس ہوئے۔

سب سے پہلی شرارت میں نے یہ کی کہ تمہارے گھر کی طرف کار نہیں موڑی۔

"چلئے۔ ہم آپ کو اپنے گھر لے چلیں۔"

تم کھوئی کھوئی بیٹھی رہیں ادھوری ملاقات کا اثر دونوں طرف برابر ہوا تھا۔

میں نے کار گرومندر پر اپنے گھر کی طرف بھی نہیں موڑی

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا — میں نے ساجدہ سے کہا" تمہیں تو شریف کے گھر جانا ہے۔" ساجدہ بے چاری کچھ نہ بولی اور جب میں نے شریف کے گھر جا کر کار روکی تو ثروت اسے اتر نے دیا۔ تم بھی اترنے کے لئے اٹھیں — "چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں"

میرا یہ کہنا بیکار ہی تھا کیونکہ ساجدہ کے اترتے ہی میں نے کار چلا دی تھی۔

تم چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ میں سولجر بازار ہوتا ہوا اپنے منحوس راستہ پر آیا۔

"ثروت — میں نے آئینہ ٹھیک کر کے تمہیں دیکھا۔

تم پچھلی سیٹ پر سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

"ثروت — ایک بات مجھے بہت تنگ کر رہی ہے"

تم نے سر اٹھایا۔

"کئی دنوں سے میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے تم سے محبت کر کے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے — تمہارے دکھ بہت بڑھ گئے ہیں۔ مجھے تم سے محبت نہیں کرنا چاہئے تھی نا —؟"

"محبت سے تو کسی کو دکھ نہیں ہوتا —" تم نے آہستہ سے کہا۔

جیل کے قریب میں نے کار روکی — تم آگے آکر بیٹھ گئیں۔

آگے آتے ہی تم نے میرا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اتنے پیار سے اپنے سینے سے لگایا کہ میرا دل بہہ گیا۔

اس دن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم کلفٹن جاتے۔ سوسائٹی کے پیچھے ایک تنہا جگہ پر تم میرے بازوؤں میں آگئیں — اپنی ساری ملاقاتوں میں تم نے کبھی اس سے زیادہ شدید الفت کا

منظاہرہ نہیں کیا۔ میرے بازوؤں میں اپنی انگلیاں گاڑ کر تم نے کہا تھا "میں کیا کروں ــــ تمہیں کھا جاؤں ؟"

اور جب میں بار بار تمہیں پیار کر رہا تھا تو تم اکھڑی ہوئی سانسوں میں لپٹی آواز میں کہہ رہی تھیں ــــ "اس سے کیا ہوتا ہے ــــ اس سے کیا ہوتا ہے ۔"

میرے پیر پر ایک بہت معمولی چوٹ کا نشان تھا تم نے اپنی انگلیوں سے اسے چھوا ــــ "تم بالکل اچھے رہا کرو ــــ سمجھے ۔ ــــ"

"اگر میں بیمار پڑ جاؤں تو تم مجھے دیکھنے آؤ گی ؟"

"نہیں آ سکتی جبھی تو کہہ رہی ہوں ــــ اچھے رہو ہمیشہ !"

کافی دیر میں تمہارے سینے پر سر رکھے نیم دراز رہا۔ تم میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

اس وقت جب تم پاس تھیں تو لگتا تھا تم مکمل ہمیشہ کے لئے میرے بس میں ہو۔ میری ہو۔ پھر جب تمہیں تمہارے گھر کے نزدیک اتار دیا تو لگا تم میری پہنچ سے باہر چلی گئی ہو۔ اس لئے کہ فون پر تمہارے ہاتھ آنے کے امکانات کم سے کم ہو چکے تھے۔

فون پر کافی دنوں تم سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ تم زیادہ وقت اپنے پھوپھا کے گذارتیں۔ محبت ہزار طرح کے شبہات پیدا کرتی ہے۔ اور اس یقین کے باوجود کہ کوئی میرا بدل نہیں بن سکتا۔ تم سے بڑی شکایتیں پیدا ہو چکی تھیں۔

تمہیں بہرحال داخلہ مل گیا۔ تم یونیورسٹی جانے لگیں۔ جب فون پر تمہیں نہ پاتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ کیمپس جا کر تمہیں پکڑ لوں۔ اول تو تم منع کر چکی تھیں کہ وہاں سب کے سامنے مجھ سے نہ مل سکو گی۔ دوسرے کیمپس اب میری محرومیوں کا سمبل بن چکا تھا۔

لیکن کافی دنوں تم سے بے تعلق رہنے کے بعد مجھے ــــ ستمبر کو یونیورسٹی جانا پڑا۔ آرٹس کے بلاک میں میں نے تمہیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ دیکھا۔ تم نے میری طرف نظر کی۔ رازداری سے مسکرائیں۔ تمہیں بغیر برقعے کے سامنے دیکھ کر دل بھر گیا۔ یہ سوچ کر تکلیف ہوئی کہ تم اس طرح وہاں روز آتی ہو۔ اور میں دنوں تمہاری آواز بھی نہیں سن پاتا۔ میں نے کافی دیر تمہیں اپنی نظر میں رکھا۔ اور بے دلی سے اپنے واقفوں سے مصروف گفتگو رہا۔ تم اپنی کلاس میں گئیں۔ دوبار کینٹین کی طرف تمہارا جانا ہوا۔ میں نے سوچا تھا اتنے دنوں مجھ سے دور رہنے کے بعد تم بے اختیار ہو کر میرے پاس آؤ گی اور مجھ سے کچھ کہو گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ مجھے ہی اس کمرے کے دروازے پر سے تمہیں بلانا پڑا جہاں تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ تم سمٹی سمٹائی آئیں۔ ادب سے سلام کیا۔

"کیا حال ہیں؟" تم نے آہستہ سے پوچھا۔

میں نے شکایت کی۔ "فون پر تم نہیں ملتیں۔ کہاں ہو۔ میں بہت بے چین ہوں۔ کب ملوگی۔"

تم نے بتایا کہ تمہیں فرصت نہیں ملتی۔ فون پر نہ ملنا محض اتفاق ہے۔ میں نے جلدی سے تم سے اتوار کو ملنے کا وعدہ لیا۔ تم اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں کہ کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے۔

"یہاں نہیں — بس تم جاؤ۔"

"اتوار کو ملنا —" میں نے جدا ہوتے ہوئے تمہیں یاد دلایا — "صبح دس بجے — گرومندر۔"

اتوار — ستمبر تک بھی تم سے کوئی بات نہ ہوئی۔ میں نے اپنی مخصوص کتاب میں تمہارے لئے پرچہ رکھ دیا تھا کہ تم ضرور آؤ۔ وقت پر آؤ۔

اور تم نہیں آئیں۔ میں نے تمہارے لئے بہت مہنگے چاکلیٹ خریدے تھے جو بار بار تنگ کرنے والے فقیروں میں بانٹ دیئے۔

کافی دیر راہ دیکھنے کے بعد میں سیدھا تمہارے گھر گیا۔ سلیم سے ملاقات ہوئی۔ اس کے ہاتھ تمہیں پیغام بھجوایا — "احمد نے ثروت سے پوچھا ہے کہ وہ اس سے کب ملے گی۔"

سلیم اندر گیا۔ تمہارا جواب لے کر آیا — "کہہ رہی ہے کل آؤں گی —— کل چھٹی ہے ——"

یہ زیادہ اچھا ہوا کیونکہ دوسرے دن تمہاری سالگرہ تھی۔ اور میں نے بہت پہلے سے یہ پروگرام بنا رکھا تھا کہ اس دن تم سے ضرور ملوں گا اور تمہیں کوئی اچھا سا تحفہ دوں گا۔

یوں میں تم سے سچ مچ خفا تھا۔ تقریباً مایوس بھی تھا کہ تم نہیں آؤگی۔ پر پیار کرنے والے جذبات حاوی تھے۔

لیکن تم آئیں۔ تم نے سلام نہیں کیا۔ تم آئیں اور کار میں آکر بیٹھ گئیں۔ میں نے ایک نظر تمہیں دیکھا اور کار چلا دی۔ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کردینا چاہتا تھا اس لئے چپ رہا۔ شکارپور کالونی کے پیٹرول پمپ سے میں نے پیٹرول ڈلوایا۔ بغیر تم سے بات کئے شبیر بابت روڈ پر اپنی کار موڑ دی۔ خاموشی کا طویل عرصہ گذر چکا تو میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ ہلکے نقاب کے پیچھے دو موٹے موٹے آنسو تمہاری آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر آچکے تھے۔ میرا دل پسیج گیا۔

"ثروت —— ڈیرسٹ ——" میں نے بائیں ہاتھ سے تمہیں تھاما —— "کیا ہوا ہے تمہیں —— تم کیوں رو رہی ہو؟"

تم نے کوئی جواب نہ دیا۔

"مجھے تنگ نہ کرو ثروت ۔۔۔ بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے"
میں نے تمہیں اپنے قریب کر لیا۔ تم اب بھی خاموش تھیں۔ "آج تمہاری سالگرہ ہے نا ۔۔۔ بتاؤ کیا تحفہ لو گی تم ۔۔۔؟"
تم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اور میرے سینے پر سر رکھ کر اپنے آنسو پونچھے ۔۔۔ تم بہت ملول اور کھوئی کھوئی تھیں۔ میں تمہیں کلفٹن لے گیا۔ تم مان گئیں۔ میں نے کہا ہم ساتھ کسی دوکان میں جا کر تمہارا تحفہ خریدیں گے یہ تمہارے لئے بہت مشکل تھا۔
تم نے یونیورسٹی کی بہت سی باتیں بتائیں۔ میری گود میں لیٹی مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے تمہارا دیا ہوا چھلا تمہیں اتار کر دے دیا۔
"اگر یہ ہماری منگنی کا چھلا ہے تو تم مجھے دوبارہ پہنا دو۔ نہیں تو اسے واپس لے لو۔"
تم نے سحر زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
"یہ ہماری منگنی کا چھلا ہے نا ۔۔۔؟"
تم نے میری انگلیوں کو چوما۔ آہستہ سے وہ چھلا پہنا دیا۔
"آج تم کتنے سال کی ہو گئی ہو ۔۔۔؟"
"بیس ۔۔۔"
"اس میں سے کتنے سال میرے ہیں؟"
"سب ۔۔۔ اس لئے کہ میری زندگی میں تم پہلے مرد ہو۔"
میں نے مستقبل کی باتیں کرنا چاہیں۔ تم میرا ساتھ نہ دے سکیں۔ تم نے بتایا کہ میرے متعلق صرف وہ باتیں تمہارے ذہن میں آتی ہیں جو ہو چکی ہوں۔ ہماری ملاقاتیں تمہیں یاد آکر تنگ کرتی ہیں۔ گھر کے کاموں میں تم کئی بار میرے دھیان میں غلطیاں کر چکی تھیں اور تمہاری امی نے تمہاری خبر لی تھی۔
میں تمہاری سالگرہ کا کوئی تحفہ نہیں لے گیا تھا۔ ضد کر کے میں نے تمہیں بیس روپے دیئے کہ تم اپنی پسند کی کوئی چیز خرید لو۔ ویسے بھی دو ٹکے کی قسم کی کوئی کارآمد چیز میں تمہیں کیسے دے سکتا تھا۔
"میں تمہارے لئے کوئی چیز خریدوں گی"
حسب معمول غیر ضروری باتیں ہوئیں۔ ہم دونوں نے اپنے حالات تفصیل سے دوسرے کو سنائے۔ تم نے بتایا تم کتنے بجے اٹھتی ہو کس طرح یونیورسٹی جانے کے لئے تیاری شروع ہوتی ہے۔ کس طرح صفیہ سے آئینہ اور کنگھی وغیرہ کے استعمال پر جھگڑا ہوتا ہے اور اس بیان کے دوران کئی بار تمہیں محبت کے عذر سے

تمہاری باتیں سننے کی تاکید کرنا پڑی۔ میں گویا سوا تمہاری صورت دیکھتا رہتا تھا۔

"ثروت ـــ میں نے تم سے کہا تھا ـــ میں تم سے جو کچھ مانگوں گا تم مجھے دیدو گی؟"

"ہاں ـــ سوائے سیکر" کے ہر چیز۔"

مجھے تم پر بہت غصہ آیا۔ میری خواہش تھی کہ تم میری محبت پر اس طرح بھروسہ کرو جس طرح لوگ خداؤں پہ کرتے ہیں۔ تم کسی ایسی بات پر یقین نہ کرو جو میری بے وفائی کی گواہی دے۔ آنکھیں غلط دیکھ سکتی ہیں۔ کان غلط آوازیں سن سکتے ہیں۔ لیکن میری محبت ـــ اور اسی لئے جب تم مجھ پر کم بھروسہ کرتی تھیں۔ اپنی تصویر یا تحریر دیتے ڈرتی تھیں۔ تو مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ اور پھر تمہارے تو موڈ ہوا کرتے تھے۔

ایک دن بڑے عزم سے میں نے تم کو کہا تھا ـــ میں تم سے شادی نہیں کروں گی اور تمہارے ساتھ رہونگی۔"

تم اسی عجب سے رخصت ہوتیں۔ جاتے جاتے تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اگلے جمعہ کو پھر ملوگی۔ یہ جو پچھلے دنوں تم کم ملتی تھیں۔ تو تمہیں اس کا ادھار چکانا تھا۔

لیکن تم نہیں آئیں۔

میں تمہارے انتظار میں کڑھتا رہا۔

"دوسرے دن تم سے فون پہ بات ہوئی تو تم نے نہ آنے کی کوئی واضح سبب نہ بتایا۔

"کوئی بات ہوگئی تھی" تم نے کہا۔

"کیا ہوا تھا"

"کچھ تو ہوا ہی ہوگا"

جلدی میں زیادہ باتیں نہ ہو پائیں۔

اس گفتگو کے بعد بہت سی تاریخیں میری ڈائری میں سادی ہیں۔ کوئی چھوٹا دائرہ نہیں بنا۔ ان تمام دنوں جو کچھ ہوا ہوگا احساسات کی تہہ بہ تہہ گرائی میں میں انہیں نہیں پہچان سکتا۔ بالکل ایسی بات ہے جیسے اندھیرے میں سیاہی مائل چیزیں چھپی ہوں۔

تمہارے گھر جانا ہوتا ہی ہوگا۔ وہاں مجھے ٹھیک طرح بیٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ اندر سے تم سب لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آتی تھیں۔ بہت سے لوگ اندر آتے جاتے تھے۔ اپنی کتاب میں کئی پیغام مات چھوڑنے کے بعد بھی تمہارا نشان نہ ملا۔ تم انہیں اٹھا لیتیں۔ اور شاید ان سے اپنی خود پرستی کی آگ کو ایندھن پہنچاتیں۔ تم نے کہا تھا کہ بہت سے خط تم نقل کر کے اصل ضائع کر دیتی ہو۔ تمہارا خیال تھا وہ سب اپنی اپنی جگہ شاہکار ہوتے ہیں۔

۔۔۔ستمبر کو تم سے بات ہوئی۔

تم نے کہا ۔۔۔" میں تمہاری عادت ڈال رہی ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ ۔"

پھر ذرا سی دیر میں بے رخی سے بے خودی کی منزل پہ آگئیں۔

"ہماری بات مانو ڈیر ببلی ۔۔۔ ہمیں جانے دو ۔۔۔" تم نے رخصت کی اجازت چاہی۔

"ببلی ۔۔۔ پلیز جانے دو ۔"

"نہیں پی ۔۔۔" مجھے تمہیں پی کہنا اچھا لگتا تھا۔ پی ۔۔۔ پاپی ۔۔۔ پوپی ۔۔۔ للے ۔۔۔ سب ایک ساتھ۔

ایک بار پھر تم نے ملنے کا وعدہ کیا۔

ایک بار پھر تم نہیں آئیں۔

یہ وہ دور تھا جب میں ابتدا سے بھی زیادہ بے بسی سے تمہیں چاہتا تھا۔ ان دنوں کے فاصلوں اور تشنہ ملاقاتوں نے مجھے صحرا میں پیاسا چھوڑ دیا تھا۔ جس جذبا تیت سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا اسی کی مجھ پر حکمرانی تھی۔

ایک صبح میں سب سے پہلی بس سے کیمپس گیا۔ کینٹین کے قریب میں نے تمہیں بس سے اترتے دیکھا جن صاحب سے میں بات کر رہا تھا انہیں جھٹک کر میں تمہارے پیچھے آیا۔ اور جب تم کامن روم میں اپنا برقعہ لپیٹ کر رکھ رہی تھیں میں دروازے پر تھا۔ تم نے مجھے دیکھا ۔۔۔ مسکرائیں ۔۔۔ میری طرف آئیں۔ گذرتی لڑکیوں کے باوجود ہم نے تھوڑی باتیں کیں۔ میں اگلے دن تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تم بمشکل راضی ہوئیں۔ پھر جلدی سے رخصت ہوئیں۔

میں کافی دیر وہاں رہا۔ پردیسی کی طرح ان برآمدوں میں ٹہلتا رہا جہاں سب سے پہلے تمہارے ساتھ آیا تھا۔ جہاں تم ہر روز دوپہر تک ہر ایک کی دسترس میں تھیں۔

یہ بات ۔۔۔ بہت سی باتیں۔ تب اور اب بھی ایک ساتھ اتنے چھینے اور کاٹ کر گذر جانے والے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ کہ میں نہ ان کا تصور کر سکتا ہوں اور نہ ان کا ذکر چاہتا ہوں۔ مجھ میں کبھی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ میں ان کے بارے میں رسان سے سوچوں۔

تمہارے ہی شعبے کے ایک لڑکے کے ساتھ جب میں واپسی سے ذرا پہلے آرٹس بلاک میں تھا کہ تم اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ وہاں آئیں۔ تم نے آگے بڑھ کر اس لڑکے سے بڑے پیارے انداز میں کسی کتاب کے دینے کا شکریہ ادا کیا۔ تمہارے خوبصورت جملے ۔۔۔ بھولا انداز ۔۔۔ اور یہ سب کسی اور سے ۔۔۔ میں

جانتا ہوں تم صرف میری موجودگی کی وجہ سے وہ ادائیں دکھا رہی تھیں۔ اور پس پردہ کوئی جذبہ نہ تھا پھر بھی۔

میں نے خود تم سے بات کی۔ "ہم جا رہے ہیں۔ — آپ کل ساجدہ سے ضرور ملیں گی نا؟"
تم نے کھوئے ہوئے سے انداز میں سر ہلایا اور چلی گئیں۔

دوسرے دن میں نے ایک گھنٹہ تمہارا انتظار کیا۔ تمہاری بار بار کی وعدہ خلافیوں کے بعد اب میں تقریباً مایوس سا ہو چکا تھا۔ کئی بار سوچا تمہیں کوئی بہت جذباتی خط لکھوں اور پھر کبھی تم سے نہ ملوں۔ یہ بھی جانتا تھا میرے لئے یہ کرنا ناممکن ہے۔ اس دن پہلی بار ایسا ہوا کہ میں انتظار کر کے چلا آیا اور تم بعد میں آئیں۔ تمہیں یونیورسٹی میں دیر ہو گئی تھی۔ اور پھر گھر دس منٹ رکی میں نے انتظار کرایا تھا۔

دو روز بعد ہمیں حسان سے سنتے حیدر آباد جانا تھا میں اور سلیم راشد کے ساتھ جانے والے تھے۔ مگر سلیم بغیر اطلاع کے غائب ہو گیا۔ آخری وقت تک ہم اس کا انتظار کرتے رہے اور جب تیز گام کی روانگی سے تھوڑی دیر پہلے میں نے اسٹیشن سے فون کیا تو تم مل گئیں۔ راشد ساتھ کھڑا تھا اس لئے کھل کر باتیں نہ ہو سکیں۔ ساجدہ کا نام لے کر میں نے گفتگو کی۔ تمہاری آواز سنکر جی نہ چاہا کہ ایک دن کے لئے بھی اس جگہ سے دور جاؤں جہاں تم ہو۔

اسی دن شریفہ کی شادی تھی۔ اور راشد کی باتوں اور حرکات سے میں پہلے یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ شریفہ سے محبت کرتا ہے۔ حیدر آباد کے سفر میں وہ شدید ماتمی رہا۔ ہم سارا راستہ ڈائننگ کار میں بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ساتھ فراق کا ایک مجموعہ اور اپنی غزلوں کی کاپی لئے ہوا تھا۔ اور سرخ بھیگی آنکھوں سے باہر دیکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں شعر گنگنا رہا تھا۔

حیدر آباد کا قیام میرے لئے بہت تکلیف دہ رہا۔ یونیورسٹی میں خود تمہیں کسی اور سے باتیں کرتے دیکھ کر مجھے ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی تھی۔ اگر یہ بات سب کے علم میں ہوتی کہ تم میری ہو، اگر تم واقعی میری ہوتیں تو مجھے ایسی کسی بات کا دکھ نہ ہوتا۔

سنیچر کی رات ہم دو بجے تک ٹہلتے رہے اور جب ایک اوسط ہوٹل کے کمرے میں میں اور راشد سونے لیٹے تو یاد آتے رہنے والا کرب میرا ہم بستر بنا۔ کھانے سے پہلے ہم نے ایک بار کے تنگ، چھوٹے اور اونچی چھت والے کمرے میں تھوڑی سی وسکی پی تھی۔ اور اس وقت دور سے آنے والی اس گیت کی آواز نے مجھے تنگ کیا تھا — "میں نے اب تم سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے" ہمیشہ لگتا تھا یہ تمہارا گیت ہے — یہ تم گا رہی ہو۔

اتوار کے دن ہم بہت سے لوگوں سے ملے۔ بہت سی جگہیں دیکھیں۔ تمہارے لئے میں نے ایک سستی، سرخ مٹی کے موتیوں کی مالا اور دو چوبی کنگھے خریدے۔ بیراج پر تمہیں مسلسل یاد کیا۔ رات جب کچھ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھانے آئے تو کسی نے میرا بایاں ہاتھ تھام کر تمہارے چھلے کو چھوا۔ "یہ منگنی کا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

دفتر سے متعلقہ نت نئی مصروفیات کے باوجود ہر دن اپنا پورا محصول وصول کرتا تھا۔ صبح کا وقت زیادہ مشکل گذرتا۔ میں سوچتا رہتا اس وقت تم یونیورسٹی میں ہوگی۔ لوگ تمہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ تم سے کوئی مل رہا ہوگا۔

اس قسم کے جذبات بڑے خودسر ہوتے ہیں۔ آدمی جان بھی لے کہ ایسا سوچنا بیکار ہے پھر بھی ان سے مفر نہیں۔ جب بے معنی ہوتے ہیں تو زیادہ پکڑ کے رکھتے ہیں۔

تمہارے گھر جانا بہت کم ہوگیا۔ خود میری ہمت نہ پڑتی۔ یہ دور دور، ایک دوسرے سے بے تعلق رہنے والی محبت وہ محبت نہیں تھی جس کی میں نے تمنا کی تھی۔ محبت کے ان مراحل کو چھوڑ کر میں نے تو ہمیشہ ساتھ رہنے والی زندگی کے پروگرام بنائے تھے۔ اب بہت سی باتیں میرے تصور کا منہ چڑا رہی تھیں۔

تم سے — اکتوبر کو فون پر ملاقات ہوئی۔ میں نے تمہیں جب بتایا کہ مجھ میں رقابت کا شدید جذبہ ہے تو تم نے کہا تھا کہ یہ بہت بُری بات ہے — اس سے آدمی بہت چھوٹا بھی بن جاتا ہے اور بہت بڑا بھی — لیکن میرے لئے یہ غیر متعلقہ بات تھی۔ تمہیں مجھ سے یہ پوچھنا چاہئے تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ محبت مکمل شخصیتوں سے ان کی خامیوں کے باوجود کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔

جمعہ کو میں دفتر دیر سے پہنچا تھا۔ معلوم ہوا کسی خاتون کا فون آیا تھا۔ پیغام تھا میں سلیم کو فون کرلوں۔

تم فون کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ تم نے فون اس لئے کیا تھا کہ تمہیں نفسیات کی ایک کتاب چاہیئے تھی۔ تمہارا کوئی ٹیسٹ ہونے والا تھا اور کتاب کی تمہیں اشد ضرورت تھی۔ میں نے کوشش کی لیکن وہ کتاب مجھے نہ مل سکی۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ سلیم سے پوچھوں — شاید اس کی بہن کے پاس ہو۔

شام کو بڑی مفصل باتیں ہوئیں۔ تم بہت مایوس تھیں اور ایسی حالتوں میں ہمیشہ تمہیں مجھ پر بڑا پیار آیا کرتا تھا۔ گھر میں کوئی بات ہوگئی تھی اور تم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب تم یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔ ساری تعلیم ختم — ! میں نے تمہیں سمجھایا۔ میں نے کہا تم میری بات مان لو اس لئے کہ وہ جو محبت کرتے ہیں ایک دوسرے کی بات

پہچان لیتے ہیں

اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ مجھ سے پیر کے دن ملنے کا وعدہ کیا۔ میری بات نہ ماننے کے باوجود تم نے مجھ
سپردگی کے ڈھنگ سے۔ بتیں کیں۔ مجھے لگا اب تم میری ہو۔ ماضی قریب کی ساری ترشی اور اکھڑاپن
آج دکھائی دی۔ ابتدا کی طرح ہم نے بچپنے کی باتیں کیں۔

سرے دن دفتر میں پھر تمہارا فون آیا۔ پر اس وقت لیکچر سے ہوئے ہوں کی خبر لکھ رہا تھا۔ تھوڑی سی
تھہ رہا۔ تم ٹیسٹ دینے نہیں گئی تھیں۔ لیکن تعلیم ختم کر دینے سے متعلق اپنا فیصلہ بدل چکی تھیں۔ ہماری
یقینی تھی۔ تمہاری طبیعت کچھ خراب تھی اور مجھے تمہارے گھر کے بہت قریب سے تمہیں لینا تھا۔
ر ۔۔۔ کتنی، کو میں نے تمہیں دور سے آتے دیکھا تو اپنی کار اسٹارٹ کر دی۔ تمہارے قریب پہنچ کر میں
کار میں تم بیٹھیں۔

یسے ہو ڈیر ۔۔۔ ڈارلنگ ۔۔۔" تم نے کہا۔۔۔ "ڈیجر زون سے جلدی سے نکل چلو۔"
یلی جنگ تو ڈینجر زون ہی میں ہوتی ہے۔"
حسبِ معمول سوسائٹی ۔۔۔ ڈرگ روڈ اور پھر فریئر ہال ہوتے ہوئے کلفٹن گئے جس میدان میں ہم
تے تھے وہاں کئی کاریں تھیں۔ میں اس سے اگلے میدان کی طرف گیا
جہاں آج یہ اچھے کا میدان ہے۔"
نہیں ۔۔۔ درمیان میں کار کھڑی کرنے کے بعد میں نے تمہیں اپنی پوری توجہ دی۔ تم نے برقعہ اتار کر
۔ تم ایک کاپی لائی تھیں جس میں تمہارا سالوں پہلے لکھا افسانہ تھا۔ تم وہ مجھے سنانا چاہتی تھیں۔
ے بھی تمہارے ہاتھ سے لے کر پرس سمیت پیچھے ڈال دیا۔
ابھی نہیں ۔۔۔ ابھی تو میں تمہیں بہت، بہت پیار کروں گا۔"
تم کسمسائیں۔ تم نے سر جھکا لیا۔
میں نے تم سے شکایتیں کیں۔ تمہیں بتایا یہ تمام دن کیسے لہولہان کر کے گزرے ۔۔۔ میں نے راتوں کو
تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میری محبت کی بے پناہ شدت کے اثر سے تارے آسمان پر تمہارا نام

تم نے مجھے اپنی گود میں لٹا لیا اور اپنا افسانہ پڑھ کر مجھے سنایا۔ ایک شادی شدہ عورت اپنے پڑوسی
وہ اپنا بھائی سمجھتی تھی، وائلن سیکھتی ہے لیکن شوہر کو کچھ اور شک گزرتا ہے۔ افسانہ کا نام مبہم
ہوں۔ ایک کردار ندیم تھا اور یہ نام تمہیں بہت پسند تھا۔

تم نے میرے سپرد یہ کام کیا کہ میں یونیورسٹی جا کر اس ٹیسٹ کے بارے میں کچھ معلوم کروں جو تم نے نہیں دیا۔

کئی بار تم نے چلنے کے لئے کہا۔ دو ایک بار تو ہم تقریباً چل دیئے۔ مگر صرف ڈھائی تین گھنٹے بعد تمہیں چھوڑ دینے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تم پہلے مجھے دور ہٹاتیں۔ پھر ڈھیلی پڑ جاتیں ایسے لمحوں ہم ایک دوسرے میں ایسے کھو جاتے کہ اردگرد کا قطعاً ہوش نہ رہتا۔ اسی لئے جب میں اچانک تمہارے جھٹکے سے پیچھے ہٹا تو کار کی کھڑکی میں سے کوئی جھانک رہا تھا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ وہ سرکاری ملازم کا اوسط جسامت رکھنے والا کوئی آوارہ گرد لگ رہا تھا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر اس نے کرخت لہجے میں کہا ـــ "اچھا ـــ تو یہ ہو رہا ہے۔"

میں نے جھٹ چابی لگا کر کار چلانے کی کوشش کی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی مجھ سے چھیننا چاہی۔ تم بھی پریشان ہو کر اس کا ہاتھ ہٹانے لگیں۔ چابی آخر کار اس نے چھین ہی لی۔

میں سست ہو کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں کیا چاہئے ـــ" میں نے اس سے پوچھا۔

"جب مارشل لا کے کوڑے پڑیں گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔"

یہ جان گیا اس سے زیادہ دیر رہنے کا۔ میں کافی گھبرایا ہوا تھا صرف تمہاری وجہ سے ـــ اس نے دھمکی دی کہ وہ فوج کا ملازم ہے اور ہمیں سیدھا تھانے لے جائے گا۔ پچھلا دروازہ کھول کر وہ دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔

"تمہاری ہمت قابلِ داد ہے ـــ" تم نے بپھر کر اس سے کہا ـــ "سیدھی طرح یہاں سے چلے جاؤ۔ ـــ جانتے نہیں ہو میں ایک پولیس افسر کی بیٹی ہوں۔"

وہ اس دھونس میں بھی نہیں آیا ـــ "سب پتہ چل جائے گا۔"

اس نے شناختی کارڈ اور ایک سیٹی نکال کر رعب جمایا ـــ "ابھی ہماری پارٹی ادھر سے گزرے گی۔ میں تمہیں سیدھا تھانے لے جاؤں گا۔"

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر واقعی اس کے ساتھی آ گئے تو پھر ہماری خیر نہیں۔ اگر ہماری محبت کھلی حقیقت ہوتی تو گھبرانے کی کوئی خاص بات نہ تھی۔ لیکن موجودہ حالات میں واقعی زندگیاں خطرے میں تھیں۔

میں نے مکالمے بولنا شروع کئے۔ "سے منایا۔ بہت سے لوگ دور سے مجرم اور خراب نظر آتے ہیں۔ اگر انہیں قریب سے دیکھا جائے، ان کے حالات جانے جائیں تو وہ بڑے قابلِ رحم نظر آئیں۔ تم نے بھی کچھ

اچھی باتیں کیں۔ پیچھے سے برقعہ اٹھا کر تم پہن چکی تھیں۔ اور سیاہ لبادے میں لپٹا تمہارا گلاب سا چہرہ بہت
پیارا تھا۔ تم نے بھی ضرور کسی سے محبت کی ہوگی۔ محبت کرنا کوئی بری بات نہیں ہے ——— سب محبت کرتے
ہیں۔ اگر کبھی تم نے محبت کی ہے تو تمہیں اس کی قسم ——— اگر، اگر تم نے کسی کو نہیں چاہا ہے تو تمہیں اپنی جان
کی قسم ——— تم نے اس سے کہا ———

وہ اتر کر باہر ٹہلنے لگا۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس کی منت کی۔ بہت دیر بعد وہ اس مقام تک آیا جس
کی مجھے توقع تھی۔ اپنے پیسے مانگے۔ میرے پاس صرف تین روپے تھے۔ وہ تقریباً سو کی بات کر رہا تھا۔ میں نے
تمہارا پرس لیا۔ اس میں تمہاری فیس کے تقریباً بیس روپے تھے لیکن کیونکہ پانچ پانچ کے دو نوٹوں کے
بیچ ایک ایک کے نوٹ رکھے تھے اس لئے بہت سے لگ رہے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ گن کر کوئی
اور مطالبہ نہ کرے میں نے بالکل بے پروائی سے کہا ——— "انہیں گنو مت ——— مجھے شرم آتی ہے۔"
اس نے نوٹ رکھ لئے۔ چابی مجھے لوٹا دی اور اس بات کا خیال مجھے شام کو آیا کہ ہوا نکل چکنے کے
بعد [illegible] اس طرح لٹکی تھی کہ میں اس کے بغیر بھی کار چلا سکتا تھا۔ یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکا اور یہ کہ
[illegible] اسی وقت اسے کیوں نہ جانا میرے لئے ایک مستقل کسک بنی رہے گی۔

وہ پیچھے سے [illegible] جل دیا "میرے [illegible] پاس آؤ ———" میں نے تم سے کہا۔ تم اچھل کر میرے قریب
آ گئیں۔ [illegible] پیارے میں نے تمہارے گرد ایک بازو ڈالا اور کار چلا دی۔

میں نے اس شخص کے لئے ایک کہانی گھڑی۔ وہ ایک واحد شخص ہے جو ہماری محبت کا گواہ ہے جس سے تم نے
اپنی زبان سے محبت کا اعتراف کیا تھا۔ وہ چند منٹوں کے جہنم کی یاد کے باوجود کچھ عجیب طرح دھیان میں آتا ہے
(اب اگر وہ کہیں مجھے اکیلا دیکھے اور مجھ سے پوچھے کہ وہ لڑکی کہاں ہے تو میں اسے کیا جواب دوں گا ——— ؟)

دوسرے دن میں تمہارے کام سے یونیورسٹی گیا۔ دفتر واپس پہنچ کر تمہیں فون کیا [illegible] میں
نے تمہیں بلوایا۔ مختصر باتیں ہوئیں۔ میں نے تمہاری تعریف کی تم بڑی باہمت ثابت ہوئیں۔ تم اپنی سمت
سے، ظاہر ہے، کچھ نہ کہہ سکیں۔

دو تین روز بعد تم نے مجھے بتایا کہ اس رات تم خاصی پریشان رہی تھیں۔ میں تم سے پھر جلد ملنا چاہتا
تھا۔ ایک تو تمہیں وہ پیسے لوٹانے تھے۔ دوسرے میں اپنے لئے کچھ چیزیں خریدنا چاہتا تھا۔ چیزیں جو تم چنو۔
کپڑے وغیرہ۔ پھر حیدرآباد سے لائی ہوئی سوغات ——— فیض کے تینوں مجموعے اور "سفینۂ غمِ دل" جو میں
تمہارے لئے خرید چکا تھا ——— تم نے جلد ملنے کا وعدہ کیا مگر کوئی دن طے نہ ہو سکا۔

"اب تم گڑبڑ نہیں کرو گے ———"

"ظاہر ہے ـــ"
"اس بار اگر تم نے کچھ کیا تو میں خود پکڑ کر تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی ۔"
پھر دس گیارہ دن تک تم سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ میں نے رقابت کا جو الاؤ جلایا تھا اس کی آگ پھیلتی گئی۔

ساتھیوں نے پوچھا مجھے کیا ہوا ہے ـــ میں سچ مچ بدلنے لگا۔

دن گذر جاتے تھے۔ راتیں بہت ڈراؤنی تھیں۔ صرف اس لئے کہ میں تھک جاؤں اور سو جاؤں میں میلوں پیدل چلتا تھا۔ رات کو بہت دیر تک باہر رہتا تھا۔ رات دو دو بجے کسی دوست کو چھوڑنے کے بہانے ایرپورٹ جا کر گیلری میں اکیلا کھڑا رہتا تھا۔

سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ خود اپنے آپ پر غصہ آتا تھا۔

ـــ اکتوبر کو تمہاری آواز سننے کو ملی ۔ سرسری ملاقات ہوئی۔ تمہاری چھٹیاں تھیں۔ طبیعت کچھ ناساز تھی۔ دو دن بعد صبح ملنے کا وعدہ کیا۔

تم نہیں آئیں۔

دفتر آ کر میں نے تمہیں فون کیا ـــ صفیہ تھی ـــ "ٹھہریئے ـــ" وہ بولی "کیا آپ سے بات کریں گی ـــ"

تم آئیں ـــ تمہاری آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ "ساجدہ سے کہہ دیجئے گا کہ میری طبیعت بہت خراب ہے اس لئے میں آ نہ سکی۔"

تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہ تھی۔ کئی دن جب پھر تم غائب رہیں تو میری تشویش بڑھ گئی ۔ میں نے ساجدہ سے تمہارے نام ایک خط لکھوایا۔ ایک کونے پر خود لکھ دیا کہ جواب ضرور دینا۔ طبیعت کیسی ہے؟
تم نے جواب نہیں دیا۔ زبانی کہلوا دیا کہ طبیعت اب ٹھیک ہے۔

اس بات سے میں اتنا مایوس ہوا کہ میں نے فیصلہ کر لیا اب کبھی تمہیں فون نہیں کروں گا ـــ تمہارے گھر جانا تو ویسے ہی ناقابلِ برداشت بن گیا تھا۔

ایک دن ـــ دو دن ـــ کئی دن گذرے اور میں اپنے عہد پر قائم رہا۔ ہر روز میں انتظار کرتا کہ شاید تمہارا فون آئے۔ کسی طرح معلوم ہو کہ تمہیں میری ناراضگی کا علم ہے۔

کچھ نہیں ہوا۔

میں دن گنتا رہا ـــ اب چھ دن ہو گئے ـــ اب سات دن ہو گئے۔ یونیورسٹی جانے کے لئے سوچتا

بس نہ پڑتی۔ یہ سوچ سوچ کر جسم چلنے لگتا کہ آخر تم مجھے فون کیوں نہیں کر لیتیں۔

پندرہ دن یہ عہد کامران رہا — پھر تیا نے : سے توڑا — تمہیں فون کیا۔

تم نہیں ملیں۔

ہر روز دو دو تین تین بار فون کرنے پر بھی تمہارا پتہ نہ چلا۔

لیکن مایوسی کی یہ پہلی منزل تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے اس پر اب تک یقین نہیں آتا۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی وقت کے بیان میں اگر میں غیر معمولی اختصار سے کام لوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اپنے تصور میں بھی اسے تفصیل سے دہرانے کی ہمت نہیں رکھتا۔

میں نے فون کیا تم نے اٹھایا۔

"ہیلو" تمہاری آواز آئی۔

"میں اعظم بول رہا ہوں"

تم خاموش رہیں۔

"سلیم ہیں --- ؟"

تم خاموش رہیں۔

میں نے اپنا مخصوص غلط نمبر بتایا۔

تم اب بھی خاموش رہیں۔

"ثروت —" میں نے تنگ آ کر کہا — "ثروت —"

تم نے کچھ نہ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے اسی وقت دوبارہ فون کیا۔

تم نے پھر بغیر کچھ کہے ریسیور رکھ دیا۔

دوسرے دن — ایک ہفتہ — پندرہ بیس دن تک یہی ہوا۔ اگر تم فون اٹھاتیں تو جواب دیئے بغیر بند کر دیتیں۔ بار بار فون کرتا تو ریسیور الگ رکھ کر باقاعدہ انگیج کر دیتیں۔

میں کس کس طرح تنگ ہوا تمہیں کچھ کہنا چاہیے تھا — کچھ بھی — یہ کہ تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔ یا یہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے — کچھ تو کہتیں — تمہاری خاموشی نے تو معاملہ کو بے حد پراسرار اور تکلیف دہ بنا دیا۔

میں نے نزاہت کو بتایا۔ اس نے طرح طرح کے جواز ڈھونڈے۔ اسپر وہ کسی طرح یقین نہیں کر سکتا تھا۔ کہ مجھ سے بات نہ کرنا اکیلے تمہارا فیصلہ ہے۔ اور اس پر کہ تم کبھی بھی کسی اور کی بھی ہو سکتی ہو۔

میں نے ساجدہ کو بتایا۔ وہ کہنے لگی کہ خود تم سے اس سلسلے میں بات کرے گی۔ بڑی مشکل سے اسے روکا۔

میں یونیورسٹی گیا۔ معلوم ہوا کہ تم نہیں آتی ہو۔ یہ دسمبر کے مہینوں کی ابتدائی تاریخوں کی بات ہے۔ اس کے بعد تم کی۔ ان تک۔ یونیورسٹی نہیں گئیں۔

میں تمہیں فون کرتا اور تم اٹھاتیں تو بغیر کوئی بات کئے رکھ دیتیں۔

ایک بار صفیہ سے میں نے کہا وہ تمہیں بلا دے۔ اسنے بتایا تم اپنے پھوپھا کے گھر گئی ہو۔

ہر گزرے ہوئے دن کے ساتھ میری پریشانی بڑھتی گئی۔ پتہ نہیں تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ طرح طرح کے خیال تنگ کرتے تھے۔ کیا کیا نہ کرنے کے ارادے باندھتا تھا۔

کچھ دوستوں کی رفاقت نے تھوڑا بہت سہارا دیا۔ میری شاعرانہ طبیعت اور روایتی داخلیت پسندی نے بہت کچھ چھپایا۔ ایک صاحب اکثر مجھے کلفٹن لے جاتے اور میں سی بریز کی نیم تاریکی میں ان کے جانے بغیر اپنی نم آنکھیں جھپکایا کرتا۔

مجھے بالکل ابتدا سے کسی ایسے ہی حادثے کا خوف تھا۔ غیر شعوری طور پر شاید یقین تھا۔ اسی لئے تو میں اتنا بے قرار ہو کر تم سے ملا کرتا تھا۔ ہماری ہر ملاقات آخری ملاقات تھی۔ ہر لمس الوداعی تھا۔ جتنی بار میں تم سے ملا ہوں پہلے جدا ہونے کا دکھ برداشت کیا ہے۔ اور یہی اندیشہ مجھ سے بار بار کہلواتا تھا۔ ثروت ــــ خواہ کچھ ہو جائے وعدہ کرو تم اچانک نہیں کھو جاؤ گی ــــ تم کوئی بات مجھ سے چھپاؤ گی نہیں ــــ تم کبھی مجھ سے یوں الگ نہ ہو گی کہ ہم بات بھی نہ کر سکیں۔

اور اب یہ ہوا تھا کہ تم فون اٹھاتیں بھی تو کوئی بات نہ کر پاتیں۔ "ہوں" یا "ہاں" تک نہیں ــــ کچھ بھی نہیں ــــ

مجھے پاگل ہو جانا چاہیے تھا۔ نہیں تو اپنی قوتِ برداشت پر ناز ہے۔ تم یہ کیسے جان پاؤ گی کہ میں کن انگاروں پر سے گزرا ہوں۔

میں ایک جذباتی مریض بن گیا۔ مجھ سے بند جگہوں پر بیٹھا نہ جاتا۔ سردی کے باوجود میں ضد کر کے برآمدے میں سوتا۔ کمرے میں دم گھٹتا تھا۔ آسمان دیکھ کر کچھ سہارا ہوتا تھا۔

ہر لمحہ یہ ڈر لگا کرتا تھا کہیں مجھے نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ ایک شام میں یونہی ایک سینما ہال میں جا بیٹھا۔ فلم کا نام یاد نہیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے ایسا لگا جیسے میں ابھی بے ہوش ہو جاؤں گا۔ یہ خیال آیا لوگ

"جو میں کہنا چاہتا ہوں ـــــ تم جانتے ہو ـــــ؟"

"نہیں ـــــ بتاؤ ـــــ"

بڑی مشکلوں کے بعد میں نے ابتدا کی۔ شروع سے جو کچھ ہوا تھا بے ربط اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں اسے بتایا۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو ـــــ؟" اسنے دھیرے سے معصومیت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ـــــ" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ میں نے اسے بتایا میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ نہ میری خاطر تمہارے خاندان کے اصول توڑے جائیں۔ لیکن جو بات مجھے کھائے جارہی ہے وہ یہ ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے اچانک اپنا رویہ کیوں بدل لیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہیں اسکے پیچھے کوئی حادثہ یا واقعہ نہ ہو۔

"تمہیں معلوم ہے ایسا کیوں ہوا ہے۔ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی ؟"

اسنے بتایا کہ اسے کسی خاص وجہ کا علم نہیں لیکن تم پچھلے دو ہفتوں سے بہت پریشان اور غمگین تھیں تمہاری طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔ سارے لوگ متفکر تھے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور کہتی تھیں کہ اب تم نہیں پڑھو گی۔ سلیم تمہیں سمجھایا کرتا تھا۔ تم کسی کی بات نہ مانتیں۔ تمہاری سلیم سے ایک جھڑپ بھی ہوئی تھی۔

لیکن اب تم تقریباً ٹھیک تھیں اور اس صبح سے تم نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔

ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے تاکید کر دی کہ وہ تمہیں یہ نہ بتائے کہ وہ تمہارا راز جانتا ہے۔ ہم دس بجے کے قریب کلفٹن سے صدر تک پیدل آئے۔ تمہارے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔

"اگر وہ یہ چاہتی ہے تو میں اُس سے کبھی نہیں ملوں گا ـــــ اسے اپنی قوتِ برداشت پر ناز ہے اور میں بھی جیسے تیسے جی لوں گا لیکن یہ ـــــ یہ جو وہ کر رہی ہے۔"

سلیم کو تم پر غصہ تھا ـــــ اس لئے بھی کہ تم نے اسے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔ جب کہ تم دونوں کے تعلقات اس قسم کے تھے۔ میں نے اسے اپنے پیار کی چھوٹی بڑی بہت سی باتیں بتائیں۔ اس کتاب کے بارے میں جس میں میں اپنے پیغام رکھا کرتا تھا۔

"مجھے بتاؤ وہ کونسی کتاب ہے۔ میں اسے کبھی ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔" اسنے کہا۔

دو تین روز میں نے تمہیں فون نہیں کیا۔ لیکن تم سے بات بہرحال کرنا تھی۔ ایک شام میں نے فون

کیا تو صفیہ تھی۔ میں نے تمہیں بلانے کے لئے کہا معلوم ہوا تم یونیورسٹی سے تھکی ہوئی آئی تھیں اور سو رہی ہو۔

دوسرے دن پھر میں نے صفیہ سے تمہیں بلا دینے کی درخواست کی۔ تم آئیں۔

"ثروت ـــ" میں نے تھرتھراتی آواز میں تمہیں پکارا۔ "ثروت"

"جی ـ ـ" آہستہ سے ـــ

"ثروت تمہیں کیا ہو گیا ہے ـــ؟"

"کچھ نہیں"

"تم نے کوئی فیصلہ کیا ہے؟"

"نہیں"

"مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں"

"کل کروں گی"

"تم نہیں کرو گی"

"اچھا نہیں کروں گی ـ ـ خدا حافظ"

"خدا کے لئے رکو ـــ ٹھہرو"

"کل ـــ" تم نے فون رکھ دیا۔

اور دوسرے دن پھر تم نے بغیر بات کئے فون رکھ دیا۔ اپنے اندر سلگ سلگ کر میں نے اپنی طبیعت خراب کر لی۔ دو دن میں بستر پر پڑا رہا۔ ایک سہ پہر ساجدہ بہت گھبرائی ہوئی کالج سے آئی۔ اس نے وہ روح فرسا خبر سنائی۔

تم بزم ادب کی کوئی عہدہ دار ہو گئی تھیں۔ اور بہت جلد ہونے والے یونیورسٹی کے سالانہ فنکشن میں ایک ڈرامہ میں حصہ لے رہی تھیں۔

پتہ نہیں میری رات کیسی گذری۔ کسی تصور۔ کسی خیال نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھنے کی زبردست جدوجہد کی ـــ میں نے سوچا میں خدا پر یقین کرنے لگوں گا اگر وہ میرا سہارا بنا۔ میں ہر اس چیز پر ایمان لے آؤں گا جو مجھے سکون دے سکے۔ میں اپنی روح ابلیس کو بیچ دوں گا اگر وہ اس کے عوض مجھے اس جہنم سے نجات دلا دے۔ کوئی مجھے بچا لے اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ پر سے اختیار کھو دوں۔ اس سے پہلے کہ مجھے کچھ ہو جائے ـــ میں کوئی حرکت کر بیٹھوں۔ کوئی مجھے اس پانی جیسے کالے اندھیرے سے نکال لے جائے۔ جس نے مجھے درمیان میں معلق کر رکھا تھا۔

صبح بخار میں تپتا ہوا میں یونیورسٹی گیا۔ تمہاری کلاس ہو رہی تھی۔ اور تم سب سے آگے ہاتھ پر چہرہ رکھے بیٹھی تھیں۔ میں باہر تمہارا انتظار کرتا رہا۔ تمہارا پیریڈ ختم ہوا تو تم ایک لڑکی کے ساتھ باہر نکلیں۔ میں تمہاری طرف بڑھا۔ تم مجھے دیکھ کر رکیں۔ تیزی سے میری طرف آئیں۔

"خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے کہا — "مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہو گیا ہے — صرف اتنا —"

تم نے میری بات کاٹ دی — "یہاں سے چلے جاؤ۔ میں ساجدہ کو بتا دوں گی۔"

اور تم مڑ کر چلی گئیں۔ میں اکیلا وہاں کھڑا رہ گیا۔

گھر آ کر میں نے تمہارے نام ایک خط لکھا۔ میں نے تمہیں اپنی محبت کے واسطے دیئے۔ میں نے لکھا ہر بات مجھے منظور ہے۔ تم جو چاہے کرو۔ صرف مجھے بتا دو تم نے کیا سوچا ہے۔ جواب دے دو۔ میں نے اس میں تمہاری اتنی منتیں کی تھیں اور ہاتھ جوڑے تھے کہ مجھے یقین تھا کہ اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی محبت ہے تو تم اسی وقت مجھے جواب دو گی۔ کسی نہ کسی طرح مجھ تک اپنی بات پہنچاؤ گی۔

اپنے آپ کو میں اتنا کبھی نہیں گرا سکتا۔ جیسا اس خط میں میرا رویہ تھا۔ اسے پڑھ کر شاید دنیا کی تمام عورتیں تم پر رشک کرنے لگیں کہ کوئی تم سے اتنی محبت کرتا ہے۔ نہ جانے اس میں کیا کیا تھا۔ تمہارے شعر تھے پرانی ملاقاتوں کے حوالے تھے۔ اپنی ہر اس خامی کا اعتراف تھا جو کبھی مجھ میں نہ تھی۔

شام کو میں سلیم کے پاس گیا۔ اسے بتایا کہ میں تمہارے لئے خط چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اس لئے وہ میرے ساتھ باہر چلے — میں نے وہ خط کتاب میں رکھا۔ یہ لکھا کہ تم اسی وقت کوئی جواب چھوڑ دو — ہم کیفے سعید میں جا کر بیٹھے جہاں سلیم مجھے دلاسے دیتا رہا۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہاتھ کسی چیز کو مضبوطی سے تھام نہیں سکتے تھے۔ کافی دیر بعد میں نے سلیم سے گھر چلنے کے لئے کہا۔ یہاں تم خط لے چکی تھیں۔ لیکن جواب غائب تھا۔

دوسرے دن میں پھر تمہارے گھر گیا۔ اپنے پتہ کا لفافہ اور ایک اور خط تمہارے لئے چھوڑا۔

دو تین دن گذر گئے۔ تمہارا کوئی جواب نہ ملا۔

میں نے فون کیا — شاید تم تھیں۔ بس رسیور اٹھایا اور دوبارہ رکھ دیا۔ بار بار یہی ہوا۔

اتوار — دسمبر تم سے بات ہوئی۔ میں نے فون کیا۔

"ذرا ثروت کو بلا دیجئے —" میں سمجھا صفیہ ہے۔

"میں بول رہی ہوں۔"

"ثروت ـــ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔"

"اب میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔"

میں رکا ـــ میں نے سہارا لیا۔ جہاں سے میں نے فون کیا تھا وہاں خوش قسمتی سے کوئی نہ تھا۔

"کیوں ـــ؟"

"بس۔ میری مرضی۔"

میں نے بہت چاہا کہ تم کوئی بات کرو۔ مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہوئی ہے۔ لیکن تم نے صرف یہی دہرایا کہ اب تم مجھ سے کبھی بات نہیں کرو گی ـــ کبھی نہیں ملو گی ـــ ورنہ یونیورسٹی جاؤ گی ـــ جو جی چاہے گا کرو گی ـــ ہم دونوں کا اب کوئی تعلق نہیں ہے ـــ میں تمہارے سامنے سے ہٹ جاؤں ـــ تم نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کیا تھا جو تم مجھ سے ملی تھیں۔

میں نے تمہیں بتایا کہ میں سلیم کو اس راز سے آگاہ کر چکا ہوں۔

"تم اپنے اعلان میں پورے نہیں اترے ـــ"

تمہاری آواز کچھ عجیب سی الگ رہی تھی۔ لیکن یہ تم تھیں ـــ یہ تمہارا فیصلہ تھا کہ اب مجھ سے کبھی نہیں ملو گی۔ تمہارے انداز میں محبت، نفرت، بے رخی، استقلال ـــ سب چیزوں کا کچھ عجیب آنے والا مرکب تھا۔

"خدا حافظ ـــ" تم نے کہا۔

"ہمیشہ کے لئے ـــ؟"

"ہاں۔"

"ثروت ـــ پلیز ـــ مجھ سے کچھ باتیں ہی اور کر لو۔"

"نہیں ـــ خدا حافظ۔"

تم نے فون رکھ دیا ـــ میں سوسائٹی کے دفتر سے یہ فون کر رہا تھا۔ جب باہر آیا۔ بس کے اڈے پر لوگ تھے۔ رکشائیں کھڑی تھیں۔ ہر چیز ویسی ہی جیسی ہوا کرتی ہے۔ میں ایک بالکل نیا احساس اپنے اندر رینگتا محسوس کر رہا تھا۔

یہاں سے وہ کہانی شروع ہوتی ہے جو میں تمہیں نہیں سناؤں گا۔ پھر کیا ہوا اس سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ حالانکہ اپنے آپ سے صلح کرنے کی یہ خوں ریز جنگ تم سے ملتے رہنے کی کہانی

سے طویل، پرپیچ اور واقعات سے پُر ہے لیکن میں یہاں رک جانا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد فون پر تم سے تین بار اور باتیں ہوئیں۔

پہلی بار ایک ماہ بعد ——— میں نے تمہارا حال پوچھا۔ تم نے کہا تم اچھی ہو۔

دوسری بار میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے تمہیں فون کیا۔ صفیہ سے تمہیں بلایا۔ تم آئیں۔ مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔

تم سے آخری بار اسی سال ——— فروری کو ملاقات ہوئی۔

تمہاری رنگا رنگ مصروفیات اور مقبولیت کی خبریں کچھ اتنا تنگ کرتی تھیں کہ دنوں ایک پل سویا نہ جا سکتا تھا۔ کبھی معلوم ہوتا تم کسی ڈرامہ کی ہیروئن بنی ہو۔ کوئی اطلاع دیتا تم نے بزم ادب میں غزل پڑھی تھی۔ تم مختلف تقریبات کی استقبالیہ کمیٹی میں شامل ہوتیں۔ ایک واقف نے بتایا اسکے پاس تمہاری کئی تصویریں ہیں۔

میں نے ساجدہ سے، ظریف سے، سلیم تک سے کہہ دیا تھا کہ کوئی میرے سامنے تمہارا ذکر نہ کرے۔ تمہاری یہ خبریں سنکر مجھ سے سنبھلنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

آخری گفتگو میں میں نے تم سے استدعا کی تھی کہ تم یونیورسٹی کے ہنگاموں میں اس قدر حصہ بھی نہ لو کہ میں تمہیں بھولنے کی کوشش نہ کر سکوں۔ اس دن تم سے بہت باتیں ہوئیں۔ کچھ اس افسانے کے کردار کی طرح جس کے بارے میں تم سے میں نے شروع میں بات کی تھی تم نے مجھ سے تقریباً اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ کہا میں بچہ ہوں۔ میں باتیں سمجھتا نہیں ——— تم بہت سمجھدار ہو۔ نفسیات جانتی ہو——— تم نے مجھے طعنہ بھی دیا تھا کہ میں زندہ کیوں ہوں——— میں نے خودکشی کیوں نہ کر لی۔

یہاں تم نے صلیب گاڑ دی۔

تو ڈیر ثروت سلطانہ ——— یہ اختتام ہے ——— تم خود جانتی ہو کہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ تمہیں اس کہانی کے بہت سے پہلوؤں کا علم ہے۔ جو باتیں ساتھ ساتھ ہوئیں، بعد میں ہوتی رہیں میں نے ان صفحات سے پرے رکھی ہیں۔ بہت سی باتیں میں نے تم سے اب تک نہیں کہی ہیں۔ اب کہنا بھی فضول ہے۔ مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں نے تمہیں کھو دیا۔ بہت سی لڑکیاں اب بھی میرے لئے گھر چھوڑ سکتی ہیں۔ میرا المیہ یہ ہے کہ جس چیز کو میں نے اپنا مذہب جانا تھا وہ جھوٹی نکلی ——— میرا خدا پتھر کا تھا۔ میں محبت کے سہارے اپنی خامیوں کی نفی چاہتا تھا۔ محبت میرا فریب تھا۔ جسے دانستہ میں نے تاروں کی مالا پہنائی تھی۔

اور ثروت — تمہیں بتاؤں میں نے خودکشی کیوں نہیں کی — ؟ اگر میں تمہارے چلے جانے کے بعد کی کہانی سناؤں تو اس میں مر جانے کی سچی کوششوں کا ذکر کرے گا۔ لیکن میں مرتا تو کس کے لئے — ؟ تمہارے لئے — ؟ اور پھر یہ لسیٹ بھی ہماری موت تو قسطوں میں ہوتی ہے جب بھی ہم کسی کو خدا حافظ کہتے ہیں ہمارے وجود کا ایک حصہ مر جاتا ہے۔

اور اب میں تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں۔

اب اس کہانی کو ختم ہو جانا چاہئے لیکن ٹریجڈی تو یہ ہے کہ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں — کبھی نہیں — میں ساری زندگی تم سے الگ رہوں گا۔ تمہارے گھر نہیں جاؤں گا — تمہیں فون نہیں کروں گا۔ کسی ایسی جگہ کا راستہ نہ دیکھوں گا جہاں تمہارے موجود ہونے کا امکان ہو۔ پھر بھی — پھر بھی یہ کہانی اپنے روپ بدلے گی — اپنے رنگ بدلے گی — یہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔

آیا بسنت سکھی

واجدہ تبسّم

گولو باہر سے بھاگتا ہوا آیا اور رجی کی گردن میں جھول گیا۔

"آپا آپا آپ کی اصل آگئی ہے ۔۔۔"

رجی کمرے کے بیچ میں بڑی میز کے پاس کھڑی چائے دان میں کچھ ہلا رہی تھی ـــ گولو کو یوں سراسیمہ دیکھ وہ بیتابی سے بولی۔

"میری اصل ـــ کیا بک رہا ہے رے ـــ" اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی باہر باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ ـــ باغ کی روشوں اور درختوں سے الجھتی ٹکراتی اس کی نگاہ سیاہ رنگ کی چھوٹی سی موٹر سے جا ٹکرائی۔

"یا خداوند ـــ یہ کیا مصیبت آگئی" وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی ہوئی زیر لب بولی۔ گولو اب تک کھڑکی میں بیٹھ چکا تھا اور تتلا تتلا کر اپنا مطلب واضح کئے جا رہا تھا۔

وہ آپا ـ وہ ... عقیل لیا تو کرتی . . . . .

"اتنے بڑے ہو گئے گولو تم ـــ ابھی تک توتلی باتیں کرتے ہو ـــ" رجی کے کچھ پلے نہ پڑ رہا تھا سوائے گولو پہ جھلانے کے چارہ ہی کیا تھا۔

تب دروازے پہ ہارن بجتا جا رہا تھا ـــ جیسے کوئی شرارت پہ اتر آیا ہو ــــ رجی ہڑبڑاتی اپنے لمبے دامنوں کو سنبھالتی کمرے کے وسط میں آکھڑی ہوئی۔

"ثمو ـــ" وہ ایک کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے چلائی ـــ "چلو چائے پی لو ـــ آگئے ہی کمبخت ٹھنڈی پالا ہو گئی ہے"

ثمو جیسے ہی گھبراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو رجی اسے دیکھتے ہی بولی ـــ "اور جناب جاوید کہاں غائب ہیں ـــ" وہ پیالی میں شکر ملاتی، آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی ـــ صوفے کے قریب ـــ جہاں ثمو سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"جاوید صاحب غائب نہیں آپا حاضر ہیں ـــ" ثمو کی بجائے خود جاوید نے کمرے میں آتے آتے

بڑی شائستگی سے جواب دیا — رجی نے سر اٹھایا اور ٹھٹک سی گئی — جاوید کہہ رہا تھا۔

"وقت پر پہنچ ہی نا آیا ہم — " پھر مڑ کر بولا — " چلئے اظہر بھائی آپ بھی ڈٹ جائیے —"

اظہر بڑی بے تکلفی سے ہنس رہا تھا — اس کی کسی ادا سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس گھر میں نووارد ہے اور ابھی چند لمحے پہلے ہی اس نے اس گھر میں قدم رکھا ہے — رجی اس کی یہ بات سن کر اتنی گھبرائی کہ چائے کی پیالی پیالے تو انگلیاں گئی اور پھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک چھناکے کے ساتھ فرش پر گر کر کرچی کرچی ہو گئی۔ — اس کے چہرے پر خوف اور حیرت ابھر آئی — بالکل خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ مگر اس مسکراہٹ کو خوف نے دبا سا دیا تھا۔ اور سب سے شدید اور گہرا تاثر اس کے چہرے پر حیرت کا تھا — حیرت جو آنکھوں آنکھوں میں کئی سوال کر رہی تھی۔

"اس مصیبت کو کہاں سے پکڑ لائے —؟"

جاوید اتنی کم مدت میں بڑی اپنائیت سے اس بھلے آدمی کو بھائی کا رشتہ دے چکا تھا ہنس کر بولا۔

"یہی دن رات یونہی پیالے پیالیاں توڑتی رہتی ہیں — اور جب پیالیوں سے جی بھر جاتا ہے تو ہمارے سر توڑتی ہیں۔"

شمو کو اس بات پر اس قدر زور سے ہنسی آئی کہ باوجود کوشش کے بھی اس کی کھلکھلاہٹ کھل کھل کی آواز نہ رک سکی۔

رجی نے سر جھٹک کر ادھر ادھر دیکھا اور جیسے ہمت سمیٹ کر بس اتنا ہی بولی۔

"بد تمیز —"

شرمندگی اور خوف سے رجی کے چہرے کا رنگ ہلکا گلابی ہو گیا تھا۔ اور اترتے سورج کی کرنوں کی سنہری شعاعوں نے اس کے بالوں کو سونے کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں — وہ سر جھٹک کر مڑی اور اس کے ساتھ ساتھ لمبے لمبے دامن بھی چلنے لگے —

اظہر نے بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھا —!

چائے دان پر جھکے جھکے وہ بولی۔

"موٹر میں تو تھا جاوید —"

"جی ہاں اور اظہر بھائی بھی۔"

اب کے اظہر بھائی نے بھی زبان کھولی — اس کے چہرے کی رنگت کو بھانپ کر وہ بولے —

"اور اسی لئے جب گو نے پوچھا اندر جا کر کیا کہوں یہ کون آیا ہے، تو مجھے اس کی تتلاہٹ پر ایک

بہت اچھی بات سوجھ گئی —"

رجّی نے حیرت سے سر اٹھا کر اظہر کو دیکھا — "جی —!"

"یہ گُو لُو صاحب توتلے ہیں نا —؟ جاوید نے جب ان سے کہا — اندر جا کر آپا سے کہو — "اظہر بھائی آئے ہیں" تو آپ بولے — "جی تا تہا — اجل بھائی —"؟ میں نے کہلوا دیا —

"آپ کی اجل آئی ہے —" (رجّی کے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی —) اور سچ مچ یہ خواہ مخواہ کسی کا آ جانا، اور اتنے اتنے دنوں کے لئے بھی نہیں، پورے سال چھ ماہ کے لئے — اجل سے کیا کم ہے؟ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"آپ کی اجل آئی ہے نا —؟"

اب کے ذرا غور سے رجّی نے اظہر کو دیکھا — جانے کیسے ایک جملہ اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

"اتنی خوب صورت موت بھی کیسے ملتی ہے —؟" (وہ خود حیران رہ گئی —" یہ میں نے کیا کہہ دیا؟")

اظہر کی ہنسی اک دم رک گئی — وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر بڑے تعجب سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ رجّی کی توجہ دوسری طرف منتقل ہو گئی۔

"اری شمو — تم اتنی بڑی ہو گئی ہو لڑکی — یہ چائے تو دیکھو کم بخت — موری کا پانی اس سے بُرا ہو نا بھلا —" (وہ خود کو باتوں میں بہلا نا چاہ رہی تھی —) شمو ٹرے اٹھا کر چلی تو رجّی بھی اسکے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

"ہائے شمو — میرا دماغ ایک کھڈے کا ہے سے ہو گیا — یہ تو صبح سے طے تھا کہ آج ابّو جان کے بھتیجے آنے والے ہیں — پھر میں کیسے بھول گئی۔"

"بے چاری کو کام بہت رہتے ہیں نا —؟" شمو نے یوں جواب دیا جیسے آپا کو نہیں کسی اور کو سنا رہی ہو —!

"یہ گُو لُو بھی نرا نکمّا ہے — ایسی توتلی باتیں کرتا ہے کہ خاک بھی پلّے نہیں پڑتا۔ بھلا میں کیا سمجھ سکتی تھی۔ آپ کی اجل آئی ہے —" کوئی بات بھی ہو بھلا —!!"

"اجل کے معنی موت ہیں آپا —؟" شمو بیٹر کا سوئچ آن کرتی ہوئی بولی۔

"ہاں ہاں — رجّی ذرا گھبرا کر بولی —" پھر —؟"

شمو زور سے ہنس پڑی — تب تو آپا سچ مچ آپ کی موت آئی ہے — کم بخت بڑا ڈھیٹ

لتا آ رہا ہے ـــ ہنسی تو رکتی نہیں ـــ"

"ہنستا ہے۔ ہمیں کیا ـــ" رجّی لاتعلق سے بولی ـــ "ہنسی پر کوئی کنٹرول تھوڑی ہی ہے بیچارا"

"مگر آپا یہ ہمارے ہی گھر کیوں آن پڑا ـــ شہر میں ہوٹل نہیں ہیں کیا ـــ؟"

رجّی نے ذرا ناراضگی سے اُسے دیکھا ـــ "شمو کیسی باتیں کرتی ہے تو ـــ مہمان کو ایسا نہیں کہا کرتے ـــ وہ بے چارہ تو ٹریننگ کے لئے آیا ہوا ہے سال چھ ماہ بعد تو فارغ ہو جائے گا۔ بھلا ہمارا کیا لے جائے گا ـــ"

شمو نے یونہی بے خبری میں کہا ـــ "سب کچھ لے جائیگا"

"رجّی چیخی ـــ "ارے پاگل ـــ" پھر ذرا دھیرے سے بولی ـــ "پاگل اُبل رہا ہے شموپتّی تو جھونک دے ذرا سی ـــ"

ماحول میں سب پانی کی سی سی گونج رہی تھی ـــ رجّی بولی۔

"سب کیا لے جائےگا"؟

"ارے بھئی خواہ مخواہ خرچہ بڑھے گا نا ـــ" شمو بڑھیا بن کر بولی ـــ "پھر قرضہ بڑھے گا ـــ آرام سکون چین لے جائے گا کہ نہیں ـــ" وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بول رہی تھی۔

رجّی کو غصہ سا آ گیا۔

"کسی کے احسانوں کا بدلہ چکانے کی بات بڑی ہلکی ہوتی ہے شمو۔ مگر تجھے یاد نہیں کیا ابو دہلی گئے تھے تو ان کے دوست نے کتنی خاطریں کی تھیں ـــ اور ابو اپنے کام کے سلسلے میں کتنے دن وہاں رہے۔؟ اب انہی دوست کا بیٹا مجبوری ناطے ہمارے ہاں آتا ہے تو تو کہتی ہے . . . . ."

شمو نے اس کی بات کاٹ دی ـــ "اتنے امیر تو ہیں۔ ہوٹل میں کیوں نہیں رہ جاتے"

رجّی نے ذرا ناگواری سے اسے دیکھا ـــ "گھر کا سا آرام ہوٹلوں میں ملنے لگے تو لوگ گھر بسانے ہی چھوڑ دیں"

"تو کیا وہ یہاں گھر بسانے آیا ہے" شمو حیرت سے بولی۔

"چھی چھی چھی ـــ انٹر میں پڑھنے والی لڑکی ایسی احمقانہ باتیں سوچے تو ـــ اللہ ہی حافظ ہے ـــ"

شمو کچھ جھینپ گئی ـــ رجّی اس کا نوٹس لئے بغیر بولی۔

"میں چائے لے کر جاتی ہوں تو تھوڑے سے میوے لے آ ـــ"

کمرہ سنہری روشنی اور جوان قہقہوں سے اُبل رہا تھا ۔۔ (وہ دونوں اس قدر پکے دوست نظر آتے تھے ۔۔) جاوید کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی ۔

"نہیں ۔۔ یہ سب آپا کرلیتی ہیں ۔۔ گھر کے کام کاج سے جانے کیسے فرصت نکال لیتی ہیں ۔۔ یہ سارے پھول انہی کے کھلائے ہوئے ہیں ۔۔۔ اور پھر ان کے ذمہ کام نہ ہو تب بھی ڈھونڈ ڈھونڈھ کر نکالتی ہیں ۔"

"پاگل جو ٹھہری ۔۔۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رجّی نے جملہ پورا کر دیا ۔

جاوید کھلکھلا کر پلٹا ۔

"کمال کرتی ہیں آپا آپ بھی ۔۔۔ میں تو ایک طرح سے آپ کی تعریف کر رہا تھا ۔۔ پوچھیئے تو اظہر بھائی سے ۔۔۔ سچ ہے سوائے آپ کے اور کوئی دوسرا ٹاپک ہم دونوں کے بیچ آیا ہی نہیں ۔"

رجّی خوش دلی سے ہنس دی ۔۔ "اچھا ۔۔۔" اور اسنے اپنی آنکھیں شرارت سے گھمادیں ۔

اظہر بڑی مستعدی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر رجّی کے قریب آکر اس کی آنکھیں دیکھنے لگا ۔۔ "اوہ ۔۔۔ بڑی بڑی ۔۔ روشن روشن جیسے دو چراغ ۔۔۔" پھر وہ پلٹا اور مسکرا کر جاوید سے کہنے لگا ۔

"کیوں بھئی تمہارے ہاں لائٹ کا بل کتنا آتا ہے ۔۔۔؟" جاوید کچھ سراسیمہ ہو گیا تھا ۔۔ ابھی کچھ جواب دے بھی نہ پایا تھا کہ اظہر خود ہی بول اٹھا ۔۔۔ "جب اتنے روشن چراغ موجود ہوں تو پھر ۔ ۔ ۔

رجّی کا سانس سینے میں ہی کہیں ٹھہر گیا تھا ۔۔ اظہر اس قدر قریب آیا ۔۔۔ جھکا ، دیکھا اور چلا بھی گیا ۔۔۔ اور یونہی پرسکون تھا ۔ یہاں تو سمندر میں جوار بھاٹے کی آمد آمد تھی ۔ اسنے گھبرا کر الٹی سیدھی چائے پیالیوں میں انڈیلنی شروع کر دی ۔

"آپ سب لوگ میرے لئے قطعی اجنبی نہیں ہیں ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ چچا جان کتنی باتیں سناتے تھے آپ سبھوں کی ۔۔۔ پھر جب اتنا گہرا تعارف کروا دیا جائے تو اجنبیت کہاں باقی رہ جاتی ہے ۔۔۔ اور پھر میرے البم میں آپ سبھوں کی تصویریں ہیں ۔۔۔" آپ کی ۔۔ "وہ جاوید کی طرف مڑا" ۔۔۔ اور جناب آپ کی ۔۔ "وہ دروازے میں کھڑی شمو کو دیکھ کر بولا ۔۔ "اور جناب گولو مہاراج کی ۔۔۔ اور ۔۔۔ اسنے اپنا رُخ رجّی کی طرف پھیر دیا ۔

"اور جناب بی بی مریم کی ۔۔۔؟"

اخروٹ کی طشتری رجّی کے ہاتھوں میں کانپنے لگی ۔۔ شمو جو اب اسکی بے تکلفی اور خوش مزاجی سے ناراض ہو چلی تھی ۔۔۔ بشاشت سے ہنس کر بولی ۔

"یہ بی بی مریم آپ نے آپا کو کہا ہے۔؟"

"ہاں اور کیا ۔۔۔؟ وہ پیالی ہاتھ میں لئے لئے گھوم گیا۔ ۔۔۔ ان بی بی کے بہت برس بعد کی معصومیت ہے۔۔۔ میں نے میوزیم میں بی بی مریم کا مجسمہ دیکھا ہے۔ بس ایسی ہی ملتی جلتی معصومیت ہے۔"

"سچ ۔۔۔ منیزہ ذرا کھل کر بولی۔

"ہاں جب سے اور یہ ۔۔۔ ایسی معصوم کا کوئی دل دکھائے تو غضب نہ ہو ۔۔۔ ویسے سچ پوچھو تو یہ ہے کہ یہ اس دنیا کی معلوم پڑتی ہی نہیں ہیں ۔۔۔" اس نے شرارت سے جھک کر رتی سے پوچھا۔

"کیوں بھابھی ۔۔۔ یہ آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں ۔۔۔؟ آسمانوں سے تو کوئی تعلق نہیں ہے آپ کا؟"

جواب میں بولا "اور اظہر بھائی ۔۔۔ آپا کا لباس کچھ عجیب ہوتا ہے نا ۔ یعنی ہمارے گھرانوں میں عام طور سے جیسے لوگ پہنتے جاتے ہیں، ویسے تو یہ تو کبھی نہیں پہنا۔"

اب کے اظہر نے ذرا غور سے رتی کو دیکھا ۔ پھول دار لمبا۔ سادہ سا ۔۔۔ لباس کبھی یہ پتہ نہ چلتا وہ کوئی اجنبی دیش کی رہنے والی دکھائی دیتی تھی ۔۔۔۔ وہ لبادہ ۔۔۔ جو ہاؤس کوٹ بھی نہیں ہو سکتا تھا ۔۔۔ سلیپنگ گاؤن بھی نہیں ۔۔۔ ڈریسنگ گاؤن بھی نہیں ۔ کمر کے پاس سے تنگ ہوتا ہوا، وہ نیچے آ کر بہت پھیل جاتا ہے ۔۔۔ اور جب رتی چلتی تھی تو وہ جھول دار دامن اس کے پیچھے پیچھے یوں چلتے تھے جیسے انگریز شہزادیوں کے فرغل ۔۔۔ اس لبادے پر وہ دوپٹہ یا اوڑھنی کچھ نہیں اوڑھتی ۔۔۔ ہاں اڑتے رہنے والے بالوں کو البتہ ایک اسکارف سے ضرور باندھ لیا کرتی ۔۔۔

"اظہر بھائی ۔۔۔ آپا شلوار اور لمبی قمیض میں اتنی پیاری نہیں لگتیں، اسمارٹ تنگ پاجاموں میں لگتی ہیں ۔۔۔" وہ اظہر سے بڑی گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔

"نہیں منی ۔۔۔ نہیں تو اس لبادہ میں ہی بھلی لگ رہی ہیں ۔۔۔" اظہر بڑی اپنائیت سے بولا۔

رتی کو اپنے وہاں بیٹھنا اتنا مشکل ہو گیا ۔۔۔ وہ اٹھی اور شہزادیوں کی سی تمکنت سے چلتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

رتی باہر آ کر بیٹھ تو گئی مگر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ۔ اتنے سارے کام کرنے کے پڑے تھے ۔۔۔ شام ڈھل رہی تھی ۔ رات کا کھانا پکوانا تھا، پودوں کو پانی دینا تھا۔ سب کے بستر لگوانے تھے ۔ کیا کچھ نہ کرنا تھا اور وہ یہاں سست ماری بیٹھی تھی ۔ اس کے ہاتھ پاؤں جیسے بے دم ہو چکے تھے ۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

اس نے پاؤں جھٹک جھٹک کر اپنی طاقت کا اندازہ لگانا چاہا ۔۔۔ اس نے محسوس کیا کہ پاؤں جھٹکنے

کی حد تک تو وہ خود کو مطمئن کر سکتی تھی، مگر ٹھہرے ہونے کو کہا جانا تو شاید وہیں گر پڑتی۔۔۔ کچھ کرے نہ کرے نگرانی کو کھانا بھجوانا تو ضروری تھا۔۔۔ ہاسپٹل کا ٹائم گذر جائے تو پھر کون اندر جا سکے گا؟؟

اندر سے باتوں اور ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔۔۔ اب سب مل کر اس قدر اپنائیت اور خلوص سے ہنس بول رہے تھے کہ دور دور پتہ نہ لگتا تھا کہ ان میں ایک نووارد اجنبی بھی بیٹھا ہے۔۔۔ گرتے پڑتے ادھورے فقرے اور پھر اظہر کی گونج دار ہنسی اس کے کانوں میں سما رہی تھی۔

" رستے یہ کہاں چلی گئی۔۔۔" اچانک اظہر کی آواز آئی۔

اتنی بے تکلفی سے کسی نے اس کے بارے میں آج تک نہ پوچھا ہوگا۔۔۔ بھائی بہن تو سب چھوٹے ہی تھے۔ امّی اور ابو تک اُسے اتنی ملنساری اور نرمی سے پکارتے جیسے وہ ان کی بیٹی نہ ہو کوئی قابلِ احترام ہستی ہو۔۔۔ پھر اب یہ کون آگیا تھا جو سارے احترام کو بالائے طاق رکھ کر اتنی بے تکلفی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔۔۔ یہ کون تھا جو آسمان نہیں تھا، مگر آسمان بن کر اس پر چھا رہا تھا۔ وہ تو آج تک سر اٹھا کر چلتی آئی تھی۔ یہ اس کا سر کس نے جھکا کر رکھ دیا تھا؟ کیا وہ خدا تو نہیں تھا۔۔۔؟؟

اس نے زور سے سر کو جھٹکا۔۔۔" یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔۔۔ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔۔۔ مجھے سنبھلنا چاہیئے۔۔۔"

وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر صحن میں جا سکی۔

" اچھا تو اب وہ چولہے چکی میں گھس گئی ہے۔۔۔" اظہر نے ذرا حیرت سے شمّو سے پوچھا۔

" جی ہاں۔۔۔ وہی سب میں بڑی ہیں نا۔۔۔ وہی سب کام کرواتی ہیں۔۔۔"

(تو اظہر صاحب۔۔۔ یہ لڑکی وہ لڑکی ہے جو آپ کی صحبت سے زیادہ اہمیت اپنے گھریلو دھندوں کو دیتی ہے)

اظہر نے ذرا دکھ سے، کچھ رکتے جھجکتے پوچھا۔۔۔" کیوں نوکر نہیں ہیں گھر میں۔۔۔؟"

" جی ہیں تو۔۔۔ ایک لڑکا ہے۔۔۔ ایک ماما ہے۔۔۔ مگر نوکر سنتے کب ہیں؟؟ امّی جب تک بیمار نہ تھیں وہی سب کچھ کرتی کرواتی تھیں۔۔۔ اب بیمار کیا پڑی ہیں سب جھمیلے آپا کے سر منڈھ گئے۔۔۔ کالج بھی کہاں جا رہی ہیں اب۔۔۔"

" کیوں"۔۔۔ اظہر نے گھبرا کر پوچھا۔۔۔ پھر خود ہی اپنے لہجے میں شرمندہ سا ہو گیا۔

" بس یہی گھر کے دھندے۔۔۔" شمّو ہاتھ ہلا کر بولی۔۔۔" ان ان پڑھائی میں دل لگائے کہ گھریلو

بھیڑوں میں ــــ"

"پھر اب کالج نہیں جاتی وہ ــــ"

"جی نہیں ــــ دراصل ہوا ایسے کہ انہوں نے اپنی بی اے کی فیس . . . . . ایکدم اس نے جاوید کی گیلی آنکھوں کو دیکھا اور رک گئی ــــ پھر اٹکتے اٹکتے بولی ــــ" یہ بات جاوید بھائی کو بھی طرح معلوم ہے ــــ کیا بات تھی بھیا وہ ــــ؟"

اظہر جاوید کی طرف مخاطب ہو گیا ــــ جاوید نے جیسے بڑے کرب سے سنایا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی اظہر بھائی ــــ میرا میڈیکل کا تھرڈ ایر تھا اور آپا کا بی اے کا فائنل ــــ فیس کی ضرورت تو دونوں کو تھی، مگر فیس ایک ہی کی بھری جا سکتی تھی۔ آپا نے کہا میری تعلیم ایسی کچھ اہم نہیں ہے ــــ اور ــــ" وہ بات بنانے کو ذرا جوش سے بولا ــــ "اب میں فورتھ ایر میں ہوں اظہر بھائی۔ اللہ نے چاہا تو جیسے تیسے یہ دن کٹ جائیں گے، پھر تو اپنے وارے نیارے ہیں ــــ"

شمو کی آنکھوں میں بڑی حسرت اور اداسی تھی ــــ وہ بالکل بچوں کی طرح منہ کھولے جاوید کی باتیں سن رہی تھی ــــ اظہر نے یہ سب کچھ سنکر بڑی بے اطمینانی اور بے چینی محسوس کی ــــ تاجر باپ کا اکلوتا بیٹا ــــ حد درجہ سوشل ــــــــــ زندگی کے دکھوں کو کبھی سمجھا نہ محسوس کیا ــــ آج اس کے سینے میں یہ درد کہاں سے امل پڑا ہے ــــ وہ تو جس سوسائٹی میں پل رہا تھا وہاں فکر اور دکھ نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی ــــ زندگی وہاں کتنی حسین کتنی رنگین اور بھرپور تھی۔ کوئی حسرت نہیں ــــ کوئی دکھ نہیں ــــ لڑکیاں جہاں بھنورا بنی آس پاس پھرتی تھیں اور ــــ اور ــــ (مگر رتی صحن میں جھاڑو اٹھانے کے لئے جا رہی تھی ــــ وہ اب پھولوں اور پودوں کو پانی دے گی ــــ)

اظہر کو کچھ دکھ بھی تھا ــــ کچھ خوشی بھی تھی ــــ دکھ تھا تو یہ کہ رتی نے اس کی آمد کو ذرا بھی اہمیت نہ دی ــــ چائے پانی کر کے وہ روز ہی کی طرح اپنے کاموں سے الجھنے چل دی ــــ جیسے اظہر اسی گھر کا ایک فرد تھا ــــ غیر اہم سا ــــ اور خوشی اس بات کی تھی کہ اسے بھی کوئی نظر انداز کر سکتا تھا؟ خوشی تھی تو یہ تھی کہ اب وہ خود کسی کا بھنورا بننے جا رہا تھا ــــ مرد کی فطرت کچھ کچھ شیر کی سی ہوتی ہے ــــ شیر مردے پر نہیں لپکتا، اپنی بہادری سے کسی کو زیر کرتا ہے اور اس کارنامے پر خوش ہوتا ہے اور مزے لوٹتا ہے ــــ مرد بھی اس سے دور نہیں ــــ سامنے آئی بے بس چیز اسے بھاتی نہیں ــــ جو اس کی مردانگی کو للکارے، جو اس کے لئے جھکے، اس کو جھکائے، اس کو پا کر وہ خوش ہوتا ہے۔ اسی میں اس کی خودی اور انا کو تسکین ملتی ہے۔

رات کو سب ... کھانا پینے ختم ہو گئے تو رتّی گول کمرے میں آئی ——— (وہ کمرہ گول وول تو تھا نہیں ——— یونہی اس کا نام گول کمرہ پڑ گیا تھا) اظہر بیٹھا مزے سے بھک بھک سگار پی رہا تھا ——— رتّی آئی اور اپنی بڑی خوبصورت سی آنکھوں سے اس کے پھیپھڑوں کو دیکھتی بولی ——— "یہ بدتمیزی کیا ہے ——— سارے کمرے کو انجن بنا رکھا ہے ——— شرم نہیں آتی بار بار وہی حرکت کرتے ———"

اظہر کو ان چراغوں کی لو باقاعدہ اپنی پیٹھ میں گھستی محسوس ہوئی ——— گرم گرم ——— کیسی جان لیوا حرارت ——— وہ مڑا ———

"ہا ———" بس رتّی کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

"آپ ———" بڑی دیر بعد وہ اتنا ہی بول سکی۔

——— جھٹ سگار میز تلے پھینک دیا ——— "چلو بھائی اب تم کہتی ہو تو کبھی نہیں پئیں گے سگار ———"

رتّی اس قدر حیرت زدہ رہ گئی تھی ——— کچھ شرمسار بھی تھی ——— خوف، حیرت اور مسکراہٹ کی دبی دبی سی پرچھائیں اس کے چہرے پر ڈول رہی تھی ——— یہ سب چیزیں رتّی کو اکدم بہت خوبصورت، بہت معصوم، بہت اونچا اور بڑا قابلِ احترام بنا دیتی تھیں۔

"میں تو سمجھی بھاوید ہوگا ——— وہ اکثر یہ حرکت کرتا ہے ——— بری حرکت ———" اس نے سگار کی بو سے بچنے کو ناک سکوڑی ——— "میں آپ کو کیسے منع کر سکتی تھی ———؟"

اظہر نے جھک کر سگار اٹھایا ——— "تو مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے بھائی کو کسی بری چیز سے بچنے کو کہہ سکتی ہیں، مگر ہمیں نہیں ——— ہاں ٹھیک تو ہے ——— ہم کون ٹھہرے آپ کے ———"

رتّی گھبرا گئی (اور زیادہ خوبصورت ہو گئی ———) تھوڑی دیر تو اسے سوجھا ہی نہیں کہ کیا کرے ——— پھر لپکی اور اظہر کے لبوں سے سگار نکال کر پھینکتی ہوئی بولی ———

"اب سے کبھی سگار منہ میں نظر آئے ——— پھر سمجھوں گی ———"

(ارے ——— وہ ڈر رہی ہے ——— مجھ سے سہم رہی ہے، مجبور ہے ——— ورنہ اس کی اس ادا میں یہ خوف کیوں ہوتا ——— ہاتھوں میں یہ لرزش کیوں ہوتی ——— گویا اس نے میرا حکم مانا ہے ——— مگر کیوں ——— کیوں؟)

رتّی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی ——— باہر دیکھتی ہوئی بولی ——— "ارے آپ نے اپنی موٹر یونہی باہر کھڑی کر رکھی ہے اور جو رات کو پانی وانی برس پڑا ——— تو؟؟" کچھ ندامت لئے وہ بولی ——— "ہمارے

ہاں گیراج تو ہے نہیں ——— ہاں دیکھئے وہ باہر کی طرف ایک کھلا سا کمرہ، خالی ضرور ہے ——— وہاں آپ اپنی گاڑی . . . . .

ذرا اچھا ——— تو اب سمجھا ——— پیسہ ——— پیسہ ——— پیسہ ——— پر مجھے یہ رکاوٹ ہے ——— یہ پہنچ ——— ! وہ شاید سمجھتی ہے کہ اس کے سامنے جھک کر ہی چلنا چاہئے ——— یہ رکاوٹ تو دور کرنی ہی ہوگی۔

"گاڑی ——— ارے ہٹاؤ ———" وہ لاپروائی اور کچھ لغضہٹ سے بولا ——— "تم کیا سمجھ رہی ہو بڑی اچھی گاڑی ہے وہ ——— پیش ——— بالکل کھٹارا ہے ——— مجھے تو شرم آتی ہے اس پر بیٹھتے ——"

رتی کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی چمکنے لگیں ——— "آپ بھی خوب باتیں کرتے ہیں ——— واہ" اس کا انداز اس قدر سادگی بھرا اور پہلے کی سا تھا ——— معصوم سی بے باکی اس کے لہجے سے صاف ہویدا تھی۔) اتنی اچھی چیز کو کہتے ہیں کہ اس سے شرم آتی ہے . . . اگر مجھے ڈرائیونگ آتی تو میں خود ہی اسے . . . کھڑی کر دیتی ———"

"میں سکھا دوں ڈرائیونگ ———" اظہر نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

رتی نے اس کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا ——— "سیکھ ہی لوں تو گاڑی کہاں سے آئے گی"

"اونہہ ——— اس کی فکر نہ کرو تم ——— اللہ دے ہی دے گا۔"

"کہاں سے دیگا ——— ؟ آج تک گاڑی میں بیٹھنے کی تو نوبت نہیں آئی اور گاڑی دے دے گا۔ ایسی باتوں سے صرف بچے خوش ہو سکتے ہیں ———" وہ ذرا جل کر بولی ———

اظہر اسے بازو سے گھسیٹتے ہوئے بولا ——— "اچھا آؤ میں گاڑی گیراج میں لے جا رہا ہوں۔ تم پیچھے بیٹھ جاؤ ———"

زمین پر زلزلہ آیا تھا نہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹے تھے ——— آسمان ٹوٹا تھا نہ کسی طوفان میں درخت بہے تھے ——— صرف اظہر نے اس کا بازو تھاما تھا ———!

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی ——— جاوید سے اتنا ہی کہہ سکی ——— "اظہر بھائی کو اپنا نہلانے ——— انہیں سونے کا کمرہ دکھا دینا ——— مجھے تو بڑی نیند آ رہی ہے۔"

"اور ان کی کار ———" جاوید بے چینی سے بولا۔ "باہر والی آپا تو ———"

"ہاں وہ ہم دونوں نے ابھی گیراج میں لے جا کر کھڑی کی ہے ———" وہ عجیب زمین میں اندر ہی اندر کہیں ڈوبتی ہوئی بولی۔

صبح حسبِ معمول اُسی انداز سے طلوع ہوئی ــــ رات والے زلزلے کا اب نام و نشان بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے دامن جھلاتی روزمرّہ کے کاموں میں مصروف نظر آ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد جب اظہر بن ٹھن کر باہر نکلا تو رجّی برآمدے میں کھڑی بلیوں کو دودھ پلا رہی تھی۔

"اچھا یہ شوق بھی آپ نے لگا رکھا ہے ــــ" وہ بشاشت سے بولا ــــ پھر ذرا جھک کر بلیوں کو دیکھتا ہوا بولا ــــ مگر آپ نے یہ کیسی نیلی آنکھوں والی بلیاں پال رکھی ہیں جناب ــــ سنا ہے ایسی آنکھوں والی بلیاں بڑی بے وفا ہوتی ہیں ــــ چھوڑ کر چلی جاتی ہیں مالکن کو۔"

وہ بلی کی پشت پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی ــــ "آنکھیں تو آپ کی بھی نیلی ہیں۔"

وہ اک دم چونکی، اظہر زور زور سے ہنس کر کہہ رہا تھا۔

"مگر بھائی میں تو بلی نہیں ہوں نا ــــ"

جلنے لیے اس کے منہ سے پھسل پڑا ــــ "سوال تو نیلی آنکھوں کا تھا۔"

اظہر کے قہقہے بھی تھم گئے ــــ وہ سنجیدگی سے بولا ــــ "ہاں رجّی سنا تو میں نے بھی ہے پر پتہ نہیں سچائی کہاں تک ہے کہ نیلی آنکھ کبھی وفا نہیں کرتی۔"

رجّی مسکرائی ــــ "واہ آپ بھی سچ سمجھتے ہیں ایسی باتوں کو ــــ میں تو یونہی کہہ رہی تھی ــــ" اور وہ خالی طشتری اٹھا کر وہاں سے چلی گئی ــــ اظہر اسے دیکھتا رہا ــــ یہ لڑکی اپنے آپ میں کس قدر گم ہے ــــ اپنی مصروفیتوں، اپنی ذمہ داریوں کا اسے کتنا شدید احساس ہے ــــ!؟ وہ تو باتوں میں اپنا ٹائم تک نہیں گنوانا چاہتی ــــ!!

اظہر اب تک چاند تھا جس کے اطراف چکور دیوانہ وار طواف کئے جاتے تھے، اسے اس درد اور خلش کا پتہ نہ تھا ــــ اب وہ دھیرے دھیرے چکور بن رہا تھا۔ اور وہی درد اور خلش اس کا مقدر ہوئی جا رہی تھی جو ازل سے چکور سے عبارت ہے۔ اسے اس تڑپ اور کرب میں لطف آنے لگا۔

بہت کم دن بیتے تھے مگر ایسا لگتا ہی نہ تھا کہ اظہر کوئی اجنبی ہے ــــ کچھ یوں لگتا جیسے وہ ڈار سے بچھڑی کونج تھا جو پھر اڑتے اڑتے اپنی ڈار سے آملا ہو ــــ اور یوں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس ان کے بیچ نہ تھا ــــ رجّی اس گھر کو یوں لے کر چل رہی تھی جیسے اُس سے بڑا کوئی نہ ہو ــــ ابو تھے ضرور مگر ان کی حیثیت نہیں کے برابر تھی ــــ ان کی ساری عمر محکمۂ تعلیمات میں گذری تھی ــــ اب وہ خالی وقت میں مطالعہ میں مشغول رہتے ــــ ایک کالج میں تھوڑی دیر پڑھانے جاتے بھی تھے، مگر لوٹ کر آتے تو پھر کتابوں کے اندر میں دفن ہو جاتے ــــ یوں اپنی جوانی ہی سے وہ کچھ بیمار اور خاموش طبع سے آدمی رہے تھے ــــ گھر کے

بڑے جھلے میں کبھی دخل نہ دیتے ـــ جو کرتیں بیگم ہی کرتیں ـــ ان کا واسطہ بس اتنا ہی تھا کہ وقت پر کھانا کھا لیتے ـــ ہفتے میں ایک آدھ بار بیوی بچوں کو لے کر پکچر یا آؤٹنگ بھی کرا تے ـــ پھر گھر کا بچھی گھر ہی میں آ پڑتا ـــ امی بی ماں باپ بن کر پال رہی تھیں کہ ان پر اچانک برانکائٹس کا شدید حملہ ہوا ـــ بیماریوں میں بیماریاں نکلتی گئیں اور جب ان کا تفصیلی معائنہ ہوا تو ٹی بی کا خدشہ نکلا ـــ وہ ہاسپٹل میں تھیں اور اب زندگی کی باگ ڈور رجّی کے ہاتھ میں!

رجّی بائیس تئیس سال کی تھی ـــ اور زندگی کی اس منزل پر تھی جہاں پہونچ کر ہر عورت کی ایک ہی تمنّا باقی رہ جاتی ہے ـــ زبان کہے نہ کہے، آنکھ کہہ دیتی ہے کہ وہ کون تمنّا ہوتی ہے ـــ آنکھ جھک جائے تو انگ انگ بولنے لگتا ہے ـــ مگر رجّی خود کو یوں سنبھالے سنبھالے چل رہی تھی ـــ اور یہی اس چال پر مطمئن بھی تھی ـــ کہ جیسے اس کی سوئی سوئی زندگی میں جا گل سی پڑ گئی ـــ پانی سامنے ہو تو پیاسا بہت دنوں دل پر جبر نہیں کر سکتا ـــ صبر نہیں کر سکتا۔

مگر شاید وہ ابھی خود کو آزما رہی تھی۔

جاوید، شمو، نود اور اظہر کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے اور رجّی حسبِ معمول غائب تھی ـــ اظہر پائپ کی راکھ جھٹکنے کے بہانے اٹھا اور کھڑکی تک ہو آیا ـ اسنے جھک کر دوسری طرف دیکھا، ہتھیلیوں میں ٹھوڑی ٹکائے وہ بڑی معصومیت سے بیٹھی تھی۔

"اوہو، سرکار ـــ آپ نے کیا حضور کیا کر رہی ہیں ـــ" وہ کھڑے کھڑے چہکا۔

رجّی تیزی سے پلٹی ـــ اس کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا ـــ گھبرا کر بولی۔

"جی ـــ جی کچھ بھی تو نہیں ـــ"

اظہر اسے ڈانٹ کر بولا ـــ "کچھ بھی نہیں تو پھر ہم میں آ کر بیٹھتی کیوں نہیں ـــ کیا ہم کوئی دھیڑ چمار ہیں ـــ!؟"

رجّی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ـــ (مجھے اس لمحے سے ڈرنا چاہئے ـــ مجھے اس لمحے سے ڈرنا چاہئے ـــ خداوندا!)

وہ بنا کچھ کہے سنے اٹھی اور پرلی طرف سے سیڑھیاں پھلانگ کر گول کمرے میں آ گئی۔

"اب تو آپ خوش ہوئے ـــ" وہ بے پناہ سنجیدگی سے بولی۔

تینوں ہنسنے لگے ـ مگر اظہر اٹھ کر اسکے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"جا بھئی جو تو اپنا کام کر ۔۔۔ ایسی بیزار ہو کر کیوں بیٹھی ہے ۔۔۔ ہماری محفل میں بوریت پھیلا رہی ہے تو ۔۔۔"

جاوید نے ذرا حیرت سے اظہر کو دیکھا مگر شمو تالیاں پیٹ کر ہنستی ہوئی بولی۔

"بہت اچھے اظہر بھائی۔ یہ اسی لائق ہیں ۔۔۔ یہ سمجھتی تھیں جیسے کوئی ان سے بڑا ہے ہی نہیں ۔۔۔ بس ہر دم ہم پر رعب جماتی رہتی تھیں ۔۔۔ اب آیا نہ مزا ۔۔۔؟؟"

"کیوں ری چڑیل ۔۔۔ میں نے تجھ پر کب رعب گانٹھا ۔۔۔" رجی ہنس کر ذرا ندامت سے بولی۔

"جاوید بھائی سے پوچھئے ۔۔۔ گولو سے پوچھئے اور مجھ بدنصیب سے پوچھئے ۔۔۔ اور یہ نہیں تو اظہر بھائی آپ خود ہی بتائیں ۔۔۔ اس رجی کی بچی نے آپ پر بھی رعب گانٹھنے کی ناکام کوشش کی تھی یا نہیں ۔۔۔؟"

۔۔۔ رجی تیزی سے اٹھی اور شمو کے پیچھے لپکی مگر راستے ہی میں اظہر نے اسے جا لیا اور ہنس کر بولا۔

"ہاں ہاں ۔۔۔ اتنی تیزی بھی اچھی نہیں ۔۔۔"

رجی نے گلابی آنکھوں کا سارا خمار سمیٹ کر اظہر کو دیکھا ۔۔۔ یونہی ۔۔۔ سادگی سے۔ جیسے وہ شمو کو دیکھتی تھی۔ گولو کو دیکھتی تھی۔ جیدی کو دیکھتی تھی ۔۔۔ اظہر میں کون خاص بات تھی ۔۔۔ وہ تو سب کو ایسے ہی دیکھے گی۔ وہ کسی سے نہیں ڈرے گی۔ ہاں ہاں اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ۔۔۔؟ مگر اظہر اس کی بے پناہ معصومیت سے، اس کی آنکھوں کے حسن سے، حسن جو بڑا ظالم تھا ۔۔۔ بڑا قاتل تھا، اس کی بے باک خوبصورتی اور بھولپن سے ڈر گیا ۔۔۔ سہم گیا ۔۔۔ وہ الٹے پیروں یوں جیسے کسی دیوی کے چرن چھو کر جا رہا ہو، چلتے چلتے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا ۔۔۔ اف ۔۔۔ کس قدر گہرا طوفان تھا ۔۔۔ اسنے ٹھنڈا سانس بھرا ۔۔۔ میں یقیناً ڈوب جاتا ۔۔۔ یقیناً ڈوب جاتا ۔۔۔ یقیناً ۔۔۔

"یقیناً ۔۔۔" وہ بآواز بلند بولا ۔۔۔ "تمہاری یہ الگ تھلگ رہنے کی ادا اچھی نہیں ۔۔۔" پھر وہ بڑا خوش ہوا کہ وہ بھی رجی کے سامنے کچھ بول سکتا ہے ۔۔۔ ہونٹ ہلا سکتا ہے ۔۔۔ زبان کو کام میں لا سکتا ہے ۔۔۔ ورنہ اس کے مرجانے میں کیا کسر باقی رہ گئی تھی ۔۔۔ (ویسے اظہر میاں سچ بتانا ۔۔۔) اس نے خود سے پوچھا کیا تم اب بھی اپنا شمار زندوں میں کرتے ہو ۔۔۔؟؟

صبح سے امی کی طبیعت بہت خراب تھی اور رجی سارے میں گھبرائی گھبرائی سی پھر رہی تھی ۔۔۔ اگر امی کو کچھ ہو گیا تو ۔۔۔؟ تو ۔۔۔ تو ۔۔۔؟ یوں امی کرتی دھرتی کچھ نہیں تھیں، مگر ان کی موجودگی کا، زندگی کا احساس ہی اس کے لئے سب کچھ تھا ۔۔۔؟؟ خدا کو دیکھا کس نے ہے؟ وہ ماں ہی کی شکل میں کس کے دکھ

دہ بانٹنے آتا ہے؟ مگر اس کی موجودگی اور بڑائی کا احساس ہی تو سب کچھ ہے ــــ کوئی ــــ وہ کوئی
دم سے بڑا ہے، ہم پہ چھایا ہوا ہے، نظر نہیں آتا نہ سہی، مگر ہمارے درمیان موجود تو ہے ــــ اس کا احساس
زندگی بخش ہے ــــ امّی بھی اس گھر کے لئے کچھ کچھ وہی درجہ رکھتی تھیں ــــ یعنی انسان اگر کسی انسان
کو خدا کہنے کی بے باک جرأت اور گستاخی کر سکتا ہے تو امی خدا تھیں ــــ ہاں اس گھر کی خدا ــــ

رجی کی پریشانی بالکل بجا تھی۔

شام کو وہ برآمدے میں نکل کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی ــــ جاوید سامنے سے آیا تو وہ
بے حد محبت سے بولی۔

"جیدی پیارے ــــ مجھے ایک ذرا کشادہ سے ناگڑے ــــ ہاسٹل جانا ہے ــــ"

پہلے سرے سے اطہر سر نکال کر بولا۔

"اور جناب ہمارا کھٹارا کس دن کام آئے گا ــــ" اور وہ باہر نکل آیا ــــ

رجی نے تھوڑی دیر کو اس کی طرف دیکھا پھر نگاہیں ہٹا لیں۔

"ہم کسی کا احسان کیوں لادیں اپنے سر ــــ" وہ جیسے خود کو بہلانے کی ناکام کوشش میں بولی۔

"ہائے ہم کسی ہیں نا ــــ آپ کے کوئی نہیں ــــ" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"ہیں کیوں نہیں ــــ ابو کے دوست کے بھتیجے بیٹے ــــ ابو کے چہیتے بھتیجے اور ۔ ۔ ۔ ۔ یکدم
اس کی زبان رک گئی اور اسنے بوکھلا کر اطہر کا نوٹس لئے بغیر ذرا درشتی سے کہا ــــ" جیدی ہاسٹل کا ٹائم
نکلا جا رہا ہے۔"

اطہر نے بھی رجی کا نوٹس نہ لیا ــــ بڑے بڑے ڈگ بھرتا وہ سیڑھیوں سے اترا اور کار میں گھس
گیا ــــ ہلکی سی گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور کار سیڑھیوں کے پاس آ کر رک گئی ــــ وہ مشین کی سی تیزی
سے اترا اور رجی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار میں دھکیل دیا اور مڑ کر جیدی سے بولا۔

"یار اگر اس لڑکی پہ میرا بس چلتا نا تو ۔ ۔ ۔ ۔ موٹر کی گھڑگھڑاہٹ میں رجی نے بعد کے الفاظ سنے
نہیں ــــ مگر راستے میں چلنے والے جھاڑ، بجلی کے کھمبے، چلتی لڑھکتی گاڑیاں لمبی لمبی بسیں جیسے کانوں میں
چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں ــــ

اگر میرا بس چلتا ــــ اگر میرا بس چلتا ــــ اگر میرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور بڑی خوشی سے سوچنے لگی ــــ" اچھا ہی ہے کہ مجھ پہ کسی کا بس نہیں چلتا
ــــ ہاں ــــ!"

اَبو اَمّی کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور ساری فضا میں عجیب غم کی سی پھیلی ہوئی تھی ـــــ وہ دونوں
داخل ہوئے تو ایک لمحے کو دونوں نے رجّی اور اظہر کو دیکھا اور پھر اسی ماحول کا ایک حصہ ہو گئے ۔ اظہر نے
بڑے تعجب سے سوچا کہ امّی نہ ابو کسی نے رجّی کو میرے ساتھ دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھائی ـــــ یہ
کیسا گہرا اعتماد ہے ـــــ ؟ کیا سچ مچ یہ عبادت کئے جانے کے لائق کوئی چیز ہے ـــــ یا میں ہی ایسا
سمجھتا ہوں ـــــ ؟؟

اسے کچھ پتہ نہیں وہ کتنی دیر بیٹھا ـــ کیا کیا ہوا ـــ لاحول ولا قوۃ ـــــ اچھا بھلا وہ دلی کی
ہائی سوسائٹی میں (MOVE) کرتا تھا ـــ یہاں آکر تو وہ پجاری بن بیٹھا تھا ـــــ بڑی مشکل سے
زبان کھول بھی پاتا تو اسے لگتا کہ وہ سب کچھ تو دل ہی میں رہ گیا ـــ الٹی سیدھی باتیں ہی کر جاتا تھا۔
ایسی کیسی بے بسی ہے یہ ـــ ؟؟

" چلئے ـــ " اور وہ اپنی دنیا سے اس دنیا میں لوٹ آیا۔

" ہاں ہاں چلنا تو ہے ہی ـــ " پھر وہ اپنے چچی جان کی طرف مڑا ـــ " چلئے آپ بھی بیٹھ جائیے "

وہ اپنی ازلی مصروفیت جتاتے ہوئے بولے ـــ " ناں بھائی ـــ میں تو ادھر سے سیدھے
حیدر صاحب کے ہاں جاؤں گا ـــ کل ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے "

" یہ تو بہت اچھی بات ہے جناب " (اسنے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ جملہ اسنے زور سے نہیں کہدیا)

دروازے سے نکلتے نکلتے اسنے دیکھا امّی ابو ان دونوں کو بڑی غمگین اور بے بس نگاہوں سے دیکھ رہی
تھیں ـــ رجّی آگے آگے اپنے لمبے لمبے دامنوں کو جھلاتی جا رہی تھی ـــ وہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا ـــ اس
کے قدموں کے نقش پر اپنے قدم جماتے ہوئے ـــ

" دیکھئے ـــ آپ میرے سامنے چلئے ـــ آپ کو نہیں معلوم بدنصیبوں کے نقشِ قدم پہ چلنے
سے بڑی . . . . . .

اسنے جملہ ادھورا چھوڑ دیا ـــ اظہر ہنس دیا۔

" آپ کو الہام بھی ہوتا ہے کیا ـــ " رجّی نے اسے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بولا ـــ " ہاں ہاں ٹھیک ہی
تو پوچھتا ہوں ـــ ورنہ آپ نے کیسے جانا کہ میں آپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں ۔؟؟

" ہنک " ـــ بس اتنی سی ہنسی تھی ـــ ہلکی سی ہنک ـــ کے ساتھ جو شروع بھی ہوئی اور ختم بھی ۔ مگر کتنی
باتیں اس ننھی سی آواز نے کہہ دیں ـــ ؟؟

" امی کی طبیعت بہت خراب ہے ـــ جنرل وارڈ کا واسطہ ہے نا ـــ کسی کو پاس رہنے بھی نہیں

دیتے ۔۔۔ ورنہ آج میں یہیں رہ جاتی ۔۔۔" وہ اظہر کو سُنا ضرور رہی تھی مگر مخاطب نہیں کیا تھا۔

اظہر نے اسے دیکھا ۔۔۔ بہت دیر تک دیکھتا رہا ۔۔۔ بولا کچھ نہیں ۔۔۔ رجّی نے یکبار چلتے چلتے ذرا کی ذرا رک کر اسے دیکھا اور اظہر گڑبڑا کر بولا۔

"پتہ نہیں آپ لوگ پوز کرتے ہیں یا واقعی کچھ غریبی کا معاملہ ہے ۔۔۔ آپ کا چھوٹا سا بنگلہ تو ایسا فس کلاس ہے۔ سامنے مزے دار باغیچہ بھی ہے۔ ہماری دلّی میں تو ایسا مکان پیسے ملتے پچاس ساٹھ ہزار سے کم میں نہیں ملنے کا ۔۔۔"

"تو کیا آپ کا مطلب ہے ہم مکان بیچ دیں ۔۔۔" وہ بڑی سنجیدگی اور طنز سے بولی۔

"لاحول ولا ۔۔۔ میں نے یہ کب کہا ۔۔۔" وہ بھاگل گیا۔

"وہ تو دادا جان کا بنایا ہوا ہے ۔۔۔ اور پھر یہ ہے ناکہ اگر بیچنے کے بارے میں سوچ بھی لیں تو مکان کا کرایہ تو جائے گا ہی ۔۔۔ پھر کیا فائدہ کسی کی روح کو دکھ پہونچا کر ۔۔۔"

"آپ کو صرف روپوں کے سکھ کا خیال رہتا ہے یا آئندہ انسانوں کی بھی بات کرسکتی ہیں آپ ۔۔۔" وہ بڑی بے ڈھنگی سے بول گیا۔

"جی ۔۔۔؟" وہ بنا مجھے بولی اور سیڑھیاں اتر کر کار کے پاس پہونچ گئی ۔۔۔ "اللہ جانتا ہے ۔۔۔" وہ خود سے کہنے لگی ۔۔۔ "مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا کہ ان کو خواہ مخواہ زیربار کیا جائے ۔۔۔ جیدی اور ٹولو کو کتنی بار منع کیا، مگر وہ سنتے نہیں۔"

اظہر سمجھ گیا ۔۔۔ "اچھا تو آپ سمجھتی ہیں ذرا سے پٹرول سے میں زیربار ہو جاؤں گا !!! ۔۔۔ مگر یہ تو سوچیے جناب ۔۔۔ سبھوں کے کالج اسکول راستے میں پڑتے ہیں، جاتے جاتے اتار دیتا ہوں۔ آپ کیوں بگڑتی ہیں ۔۔۔"

"مجھے اُلّو نہ بنایئے ۔۔۔ حیدرآباد میرا دیکھا بھالا شہر ہے ۔۔۔ آپ راستے میں چھوڑ جاتے ہیں یا نہیں یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہنس پڑی ۔۔۔ "باتیں تو خوب بناتے ہیں آپ ۔۔۔؟"

رجّی بہت کم ہنستی تھی اور جب ہنستی تھی تو اس قدر خوبصورت ہو جاتی تھی کہ اظہر کی نگاہ اسکے چہرے پر ٹھہر نہ سکتی ۔۔۔ اسے ہنستا دیکھ ایک بار یونہی اظہر نے سوچا تھا ۔۔۔ "بھلا بجلی پر نگاہ کیسے ٹھہر سکتی ہے ۔؟"

کار تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اسکے بال ہوا کے جھکوروں سے رومال سے بھی قابو میں نہیں آرہے تھے۔

اظہر گھبرا رہا تھا ۔ پتہ نہیں کیوں ؟ یونہی بات چلانے کو بولا ۔

"میرے البم میں آپ کی کئی تصویریں ہیں ۔"

"مگر میرے البم میں تو آپ کی کوئی تصویر نہیں ——" وہ ذرا مسکرا کر بولی —— (مگر دل میں تو موجود ہے —— جیسے کوئی قریب سے بولا ——) اسنے گھبرا کر اظہر کو دیکھا اور بولی —— "آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا؟ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے —— پتہ نہیں امی کیسی ہوں —— ؟" اس کا چہرہ گہرے غم میں ڈوب گیا —— اظہر کو اسپر رحم سا آ گیا۔

"اچھی ہو جائیں گی —— گھبرانے کی کیا بات ہے ؟" اسنے نہایت بھونڈے انداز میں تسلی دی —— رجی نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے وہ اچھی ہو جائیں گی ——؟؟"

اظہر سٹ پٹا گیا —— وہ تو اپنی رو میں جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا —— بولا —— "خدا اتنا بے رحم بھی تو نہیں ہو سکتا نا ——"

"ہاں ——" وہ طنز سے بولی اور چپ ہو گئی۔

رات کو خوب پانی برسا —— جگہ جگہ پانی ٹھہر گیا —— سرد سرد ہوائیں چلنے لگیں اور کھڑکیوں کی راہ آ آ کر برچھیاں چبھونے لگی —— رجی ہڑبڑا کر اٹھی —— کھڑکیاں بند کیں اور گڈو اور شمو کی رضائیاں گردن تک اڑھا دیں —— جیدی تو ہمیشہ سے اوڑھ لپیٹ کر سونے کا عادی تھا —— وہ خود بھی لیٹ گئی۔

(اور اظہر کے کمرے کی کھڑکی بند کی رجی تم نے ——" جیسے کوئی قریب سے بولا۔)

رجی کتنی ہی دیر بالکل ساکت پڑی رہی —— کیا جواب دے اس پکار کا —— کیا بولے ——؟ کیا کہے —— کھڑکی یقیناً کھلی ہو گی اور تیز ہوا سے برچھیاں چبھو رہی ہو گی —— پھر کیا یہ اس کا ذمہ نہیں تھا کہ جس طرح گڈو، شمو، اور جیدی کی دیکھ ریکھ کرتی تھی، اظہر کی بھی کرے —— مگر وہ اتنی رات گئے اپنے کمرے میں مجھے دیکھ کر کیا سوچے گا —— ؟ کیا کہے گا ؟؟ اونہہ —— سوچے گا کیا —— کیا میں کسی بُری نیت سے جا رہی ہوں ؟!

اور وہ اپنی رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی —— دھیرے دھیرے وہ ایک آوارہ اور بھٹکی ہوئی روح کی طرح برآمدوں اور کمروں سے ہوتی ہوئی اظہر کے کمرے تک پہونچ گئی —— اس کا خیال کتنا صحیح تھا ——؟! کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور شمالی دریچے کی تیز ہوائیں تو سیدھی اس کے سرہانے پڑ رہی تھیں —— رضائی جانے کب کی زمین پر گر پڑی تھی —— اسکے بال تیز ہوا سے کانپ رہے تھے —— اور وہ پھر بھی گہری نیند میں تھا —— ! کتاب اس کے سینے پر پڑی ہوئی تھی اور رات کو وہ زیرو پاور کا ٹائٹ بلب جلانا بھول گیا تھا، تب ہی اس کے کمرے میں جگ مگ روشنی ہو رہی تھی —— رجی نے کھڑکی سے باہر جھانکا —— پھول

پودے ہواؤں میں جھوم رہے تھے اور باہر ساتھ ساتھ ساتھیں رات کے سناٹے کو بوندوں کی رم جھم نے ایک دل آویز اور کبھی نہ فنا ہونے والی موسیقی میں ڈھال دیا تھا ـــ کمرے کے پردے ہواؤں سے کانپ رہے تھے ـــ اور خود رجی کا دل بھی۔

"کس قدر حسین رات ہے ـــ" اسنے جیسے خود سے کہا ـــ پلنگ پر اظہر سو یا تھا۔ گلابی پپوٹوں کے اندر اس کی نیلی پتلیاں بھی خوابوں میں گم ہوں گی ـــ اف یہ رضائی ـــ کیا اسے سردی نہیں لگتی ـــ؟؟

وہ دھیرے سے آگے بڑھی ـــ اور آگے ـــ اور آگے ـــ پھر اسنے آہستگی سے رضائی اٹھائی اور اسی آہستگی سے اس کی گردن تک اڑھا دی ـــ دفعتاً اس کا ہاتھ اسکے چہرے سے جا ٹکرایا ـــ اف ناک کس قدر ٹھنڈی ہو رہی تھی ـــ اسنے بے تابی سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ـــ تیز ہواؤں کی دھار نے اس کے ماتھے، چہرے، ناک اور گالوں کو برف بنا دیا تھا ـــ اسنے اپنے چھوٹے چھوٹے گرم گرم ہاتھ اس کے گالوں پر رکھ دیئے ـــ یہ احساس اسے زندگی بخش رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کی اپنے خون کی گرمی سے کسی کی زندگی کا سامان کر سکتی تھی۔

اک دم تیر کی تیزی سے اظہر اٹھ کر بیٹھ گیا ـــ گہری نیند سے جیسے اُسے کسی نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہو ـــ رجی کے ہاتھوں کے لمس نے اس کے سوئے ہوئے جسم کو بیدار کر دیا تھا ـــ اب وہ قیامت تک نہیں سو سکتا تھا ـــ اسے گہری نیند سے رجی نے یوں جگایا تھا کہ اب وہ کبھی نہ سو سکتا تھا ـــ کبھی نہیں ـــ کبھی نہیں ـــ

بوندوں کی رم جھم رم جھم موسیقی اور دل آویز ہو گئی ـــ سرسر ہواؤں نے گیتوں کا سماں باندھ دیا پھولوں کی خوشبو باغوں سے ہوتی ہوئی یہاں تک آگئی تھی۔ اور پتوں کی سرسراہٹ ایک نغمہ بن گئی۔

اظہر سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا ـــ ہلکے نیلے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی دلکش ہو گیا تھا۔ سفید لباس کے لمبے دامن فرش پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ اس کے بال رومال کی قید سے آزاد تھے اور وہ یوں ساکت صامت کھڑی تھی جیسے جان ہی نہ ہو ـــ اظہر اٹھا ـــ اس کے قریب گیا اور اس کا چہرہ اپنے دونو ہاتھوں میں آہستگی سے یوں تھاما جیسے ہلکے دھکے سے چٹخ جانے والا کانچ ہو ـــ رجی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی ـــ اس کا چہرہ اظہر کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کی آنکھیں اظہر کی آنکھوں سے اس قدر قریب تھیں ـــ اس کا چہرہ اظہر کے چہرے سے اس قدر قریب تھا ـــ اس کے ہونٹ اظہر کے ہونٹوں سے اس قدر قریب تھے ـــ اظہر کے اپنے چہرے پر ایک جلا سی تھی ـــ اس کی تابناک آنکھوں سے یہ روشنی نکل نکل کر اظہر کے چہرے کو بھی منور کر رہی تھی ـــ اظہر اس عبادت خانے میں تم کیسے نکل آئے! کیا تم خود کو اس کا اہل بھی پاتے ہو ـــ؟ تم

—تم — تم —

اظہر خائف ہو گیا — ڈر گیا — سہم گیا — اس کے نیچے ٹپکتے ہوئے ہونٹ، اس کا گرم اور تپا ہوا چہرہ — اس کی نیلی نیلی جھیلی آنکھیں ایک لمحے میں، لمحے کے ہزارویں حصے میں اک دم دور ہو گئیں — اسنے رجی کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور وہ تڑپ کر پلنگ پر آ بیٹھا — اس کا سانس تھل تھل ہو رہا تھا۔ یوں جیسے کڑے کوسوں چل کر آیا ہو — نہیں وہ کبھی اسے چھونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا — وہ اس قدر معصوم اور پاک تھی — وہ دنیا کے چھل اور فریب سے بالکل ناواقف معصوم سی عورت — وہ کیسے اُسے گنہ گار بنا سکتا تھا اظہر کا سانس رکا اور وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔

"رجی — میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں — بولو رجی — جواب دو — رجی — رجی —"

رجی نے کچھ جواب نہ دیا — اس کی زندگی کا سارا غم، سارا کرب اس کی چراغوں ایسی آنکھوں میں سمٹ آیا — چراغوں کی روشنی بہنے لگی — وہ لپک کر آگے بڑھی اور اظہر سے لپٹ گئی۔

"رجی — وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولا — " میں شاید تم سے محبت نہیں کرتا۔ کر بھی نہیں سکتا — میں نے جب اپنی اس آگ کا، اس تپش کا اس جلن کا تجزیہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ محبت کا نام اس جذبے کے لئے موزوں نہیں — یہ جملہ تو بہت گھسا پٹا، بڑا ذلیل سا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں — نہیں رجی یہ اسے محبت کا نام نہیں دے سکتا — تم محبت نہیں کچھ اور ہو — شاید وہ، جو زندگی کے لئے سب سے اہم ہوتا ہے — مجھے معاف کرنا رجی — مجھے الفاظ بنانے نہیں آتے ورنہ شاید میں اپنے دل کی صحیح ترجمانی کر بھی دیتا —" اسنے ایک بار رجی کو دیکھا۔ اور پھر رجی میں جذب ہوتا ہوا بولا —

"رجی میں تمہاری عبادت کرتا ہوں رجی —؟"

باہر رات ہوتے ہوتے بیت رہی تھی اور وہ کبھی نہ ختم ہونے والی، لازوال اور دل آویز کو سیتی، تیز تر ہو گئی تھی — رم جھم — رم جھم۔

آج رجی کے آنسوؤں کو راہ مل گئی تھی —

دوسرے دن امی کا انتقال ہو گیا۔

رات بھر وہ بڑی بے کلی محسوس کر رہی تھیں — تیز بخار میں، جب کہ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ ہاسپٹل کے باغ میں پڑے بنچ پر جا کر بیٹھ گئیں — برسات کا سارا پانی ان کے سر، جسم اور کپڑوں میں رستا رہا — جذب ہوتا رہا — ڈیوٹی نرس جب دوا پلانے ان کے بیڈ پر آئی تو وہ غائب تھیں — اسنے ادھر اُدھر

دیکھا، بازو دِلانے پیشنٹ سے پوچھا، اور جب کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ بیچ بے ہوشی کی حالت میں پڑی کھائی دیں ـــــ مگر دنیا کی کوئی دوا ان کو ہوش میں نہیں لا سکتی تھی ـــــ ان کا سینہ جکڑ گیا تھا۔ اور سانس چلنا بند ہو گیا تھا۔

وہ رات بڑی بھیانک بڑی جان لیوا اور بڑی اداس تھی ـــــ صحن میں امی کی لاش رکھی ہوئی تھی ـــــ فضا میں عود اور لوبان کی خوشبو تھی ـــــ گھر کے سارے لوگ یوں چپ چاپ تھے جیسے انسان نہ ہوں روحیں ہوں ـــــ رجی صبح سے بے ہوش پڑی تھی ـــــ اسے کچھ پتہ نہ تھا گھر میں کیا ہو رہا ہے ـــــ وہ صبح سے ہی کچھ نڈھال اور ڈری ڈری تھی ـــــ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا ـــــ کوئی پاپ نہیں کیا تھا۔ اس کی کنواری جوانی ابھی تک ویسی ہی اچھوتی تھی۔ اور بے داغ تھی ـــــ کنول کی منہ بند کلی کی طرح اس کا سارا شباب اس کی ساری خوبصورتیاں ابھی اسکے اپنے سینے میں بند تھیں مگر گھر کی چار دیواری میں پلنے والی معصوم اور ڈرپوک لڑکی کے لئے محبت کا اظہار بھی کسی گناہ سے کم نہ تھا ـــــ اور پھر وہ تپش اور وہ آگ جو اظہر کی آنکھوں سے نکل کر اس کی اپنی آنکھوں میں ضم ہو گئی تھی اسے بن مرت مارے ڈال رہی تھی ـــــ وہ حد درجہ نڈھال تھی ـــــ ایسے میں جب گیارہ بجے کے قریب اسے اپنی ماں کی موت کی خبر ملی وہ سنتے ہی جہاں تھی وہیں گر پڑی ـــــ

گھر کی ویرانیوں اور اداسیوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا ـــــ دن پہلے بھی ایسے ہی تھے جیسے اب ـــــ امی کا جسم پہلے بھی کب موجود تھا ـــــ وہ تو ایک خیال تھیں ـــــ مگر اب خیال جو حقیقت سے بھی سوا ہوتا ہے ـــــ اب چار بجے ہاسٹل کھانا جانے کی گڑبڑ نہ ہوتی ـــــ مغرب کے وقت واپسی پر گھر میں موٹر کی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ، جیدی، گولو اور شمو کے قہقہے نہ گونجتے ـــــ اظہر کی بے تکلف باتوں اور لطیفوں کی بھی جیسے موت ہو گئی تھی ـــــ رجی اب سچ مچ کی روح بن کر رہ گئی تھی ـــــ غم اور لباس کنگھی سے بے نیازی نے اسکے حسن کو اور بڑھا دیا تھا ـــــ میلے کپڑوں اور روکھے بالوں میں وہ جہاں بیٹھتی بیٹھی ہی رہ جاتی ـــــ ایک ماڈل کی طرح ـــــ گھنٹوں اسی طرح گزر جاتے اور وہ پلک تک نہ جھپکاتی۔

جیدی ایک دن کالج سے واپسی پر سیدھا رجی کے کمرے میں چلا آیا ـــــ وہ بڑی بے دلی سے کھڑکی سے باہر گھورے جا رہی تھی۔

"آپا ـــــ کل میری فیس کی آخری تاریخ ہے ـــــ" وہ اس کے کان میں بولا۔

"اچھا ـــــ وہ چونکی ـــــ "مگر ـــــ مگر ـــــ" وہ کچھ دکھ سے بولی ـــــ "جو کچھ روپیہ تھا وہ تو امی پر

اٹھ گیا —" آنسوؤں کی شدت نے اس کا گلا جکڑ لیا —
"خیر کوئی بات نہیں — میں امتحان نہیں دوں گا — کوئی نوکری ڈھونڈھ لوں گا —"
"شرم نہیں آتی ذرا سی —" رجی غصے سے بولی —" ڈاکٹر بننے میں کل ایک سال رہ گیا ہے اور یوں ذرا سی مصیبت کے لئے پڑھائی ادھوری چھوڑ دوگے — میں انتظام کر دوں گی —"
"کہاں سے کریں گی — مجھے بھی تو بتایئے —" جیدی محبت سے بولا۔
"تجھے اتنی باتوں سے غرض —" وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی —
"اور آپا میری فیس بھی تو دینی ہے —" شمو بھی کمرے میں آ دھمکی تھی — پیچھے سے گو نے کورم پورا کر دیا —" اور میری —؟"
وہ تینوں اسکے سامنے بچوں کی طرح کھڑے اپنا سوال دہرا رہے تھے — اس کو اپنی بزرگی کا شدید احساس ہوا۔ اور وہ کھلے دل سے بولی — (حالانکہ امی نے زیورات نہ توڑنے کو قسم دے رکھی تھی)
"ابھی تو میرے پاس سونے کی چوڑیاں ہیں — بعد کا بعد میں دیکھا جائے گا۔"
وہ تینوں کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی — جیدی اسکے پیچھے پیچھے گیا اور بولا —" آپا میری ایک بات مانیں گی آپ —؟"
"کیا ہے —" وہ آنکھیں اٹھا کر بولی۔
"آپ شادی کر لیجئے —"
رجی کے منہ پر گلال بکھر گیا — وہ خود کو سنبھال کر بولی — "بہت پگلے — بڑی بہن سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے —"
"ارے آپا سچ کہہ رہا ہوں۔ مذاق نہیں — میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو چکی کی طرح پستے ہی دیکھا ہے۔ شادی ہو گی تو آپ بھی ذرا سکھ سے سانس لے سکیں گی۔"
رجی نے کچھ ناگواری سے جیدی کو گھورا —" اچھا اور میں چلی گئی تو آپ سب لوگوں کا کیا بنے گا —؟"
"کیوں —؟ جیدی طنز سے بولا" — آپ ہماری خدا ہیں کیا —؟"
رجی مسکرائی —" تھوڑی دیر کو ایسا ہی سمجھ لو —"
جیدی چڑ کر بولا —" ابو نہیں ہیں کیا —؟"
"ابو کی صحت اس قابل ہے کہ وہ گھر چلا سکیں —؟ اور میاں جیدی مرد بھلا کیا خانہ داری میں الجھے گا۔ تم تو پاگل ہو بس —"

"شمو دیکھ ریکھ کرے گی "

"بہت خوب — کیا کہنے ہیں — بے چاری کی چٹیا پکڑ کر تم گھمایا کرو گے روزانہ — ارے وہ تو بالکل بچی ہے جیدی — وہ کیا سنبھالے گی گھر داری —" اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"تو جہاں تک آپ کی باتوں سے میں اندازہ لگا سکا ہوں، آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ شادی نہیں کریں گی —"

رجی شرمانے لگی —" نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں ہے — مگر مجھ جیسی ناکارہ لڑکی سے کون شادی کرے گا — ؟؟"

جیدی کو سچ مچ غصہ آ گیا —" آپ ناکارہ ہیں —؟"

وہ اٹھ کر گیا اور دوسرے ہی لمحے اظہر کو گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

"اظہر بھائی — ہماری ان بہن صاحبہ کو سمجھائیے ذرا —"

"کیا — کیا بات ہے بھئی —" اظہر پریشان ہو کر بولا۔

"یہ کہتی ہیں یہ اتنی ناکارہ ہیں کہ کوئی ان سے شادی ہی نہیں کرے گا "

اور وہ غصے سے رجی کو دیکھنے لگا — رجی کی حالت غیر تھی — مارے شرم اور خجالت کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا — اکرم جیدی مڑا —

"اظہر بھائی — ایک بات پوچھوں — سچ سچ جواب دیں گے آپ —؟"

اظہر مسکرایا تو جیدی اچانک بولا —" آپ آپا سے محبت کرتے ہیں نا —؟؟"

اظہر بُری طرح گھبرا گیا — رجی کا سارا بدن کانپنے لگا — ماحول کا نقشہ ہی بدل گیا — بڑی دیر بعد اظہر سنبھلا اور صلاحیت سے کہنے لگا۔

"جیدی — آسمان پر چمکنے والا چاند کسی کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتا میری محبت کا بھی کچھ یہی حال ہے — چاند سی روشن شے بھلا چھپائی بھی کیسے جا سکتی ہے — سات بدلیوں میں سے بھی جوت محض چھن ہی جاتی ہے —" اس نے رجی کی طرف دیکھا — رجی کے لئے یہ لمحہ بڑا عجیب، بڑا کٹھن، بڑا خوبصورت، بڑا لذت آمیز تھا —

" اور یار — اظہر کہہ رہا تھا —" تم میرے اس جذبے کو محبت کا نام دے کر اس کی توہین کر دبھی مت — میں تمہاری آپا سے محبت نہیں کرتا — نہیں کر سکتا — میں جب ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں ان کو پوج ہی سکتا ہوں — کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اگر میں نے انہیں حاصل کر بھی لیا تو شاید

چھونے کی ہمت مجھ میں پیدا ہوگی ہی نہیں — وہ تو آسمان ہے جیدی — اور میں —؟"

جیدی نے سر اٹھایا تو اظہر کمرے سے جا چکا تھا۔

رجی کی زندگی بہاروں سے بھر گئی —!

برسات کی اس رم جھم کرتی رات، جب ملگجے اندھیرے نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا — رجی اندھیرے سے اٹھی اور دبے پاؤں چلتی اظہر کے کمرے میں پہونچ گئی — اظہر گہری نیند سو رہا تھا، مگر شاید اس کا احساس جاگ رہا تھا — جیسے ہی رجی نے اس کے کمرے میں قدم رکھا اس کا انگ انگ بیدار ہو اٹھا — مگر وہ یونہی پڑا رہا — رجی آہستگی سے اس کے قریب آئی جھکی — اور جھکی — اس کے نتھنے سرخ سرخ نتھنے جو گلاب کی کومل پتیوں کی طرح، ہلنے میں لرزنے لگے تھے، بے طرح پھڑک رہے تھے — اس کی آنکھوں سے گرم گرم شعاعیں نکل رہی تھیں — ہونٹوں کے کنارے بے قراری سے کانپ رہے تھے — اس نے اور جھک کر اظہر کو دیکھا — وہ بڑا معصوم دکھائی دے رہا تھا — رجی نے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا اور اس کی آدھے چاند ایسی پیشانی پر اپنے بے قرار، کانپتے ہونٹ رکھ دیے — زندگی کی ساری، ساری کلفتیں، رنج و غم کا ہر احساس مٹ گیا تھا۔ فنا ہو گیا تھا — اب زندگی میں کوئی حسرت تھی نہ تمنا — بس سکون تھا — اب سکون جو مر کر ہی مل سکتا ہے — اس نے دھیرے سے اپنے ہونٹ ہٹائے۔ اظہر کی پیشانی پر اس کے ہونٹوں کا سرخ سا نشان پڑ گیا تھا — یہ داغ محبت — جو بیک وقت چاند بھی تھا اور اسکے پیار کی مہر بھی —

"تم میرے ہو — صرف میرے — صرف میرے — وہ دھیرے دھیرے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتی رہی — جاتے جاتے اس نے غور سے ایک بار پھر اظہر کو دیکھا اور — دو آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے — باہر رم جھم رم جھم موسیقی تھی اور فضا میں پھولوں کا عطر —!

رجی خوش تھی — بہت خوش — اس کی خوشیوں کا کوئی کنارا نہ تھا — ماحول گنگناتا محسوس ہوتا — گھر کے ذرے ذرے سے نغمے پھوٹتے محسوس ہوتے — کیا وہ بدل گئی تھی —؟ کیا زندگی ہی نئے راستے پر چل پڑی تھی — اسنے طے کر لیا کہ وہ اظہر سے ضرور شادی کرے گی — اب وہ اظہر کے سامنے آتے جھجھکنے لگی تھی۔ وہ وہی تھی، اظہر بھی وہی تھا — مگر ایک حجاب دونوں کے بیچ حائل ہو گیا تھا۔ اگر اکیلے میں کبھی اظہر اس کے پاس آ جاتا تو وہ کانپنے لگتی — منہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی — جب تک اظہر چلا نہ جاتا، اس پر یہی بے قراری چھائی رہتی —

ایک دن شمو نے زبردستی رجّی کو پکڑ کر تپی ساڑی، بلاؤز پہنا دیا ــ اور اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر گردن کے پاس بڑی سی گرہ ڈال دی ــ رجّی بالکل بدل گئی ــ کوئی اور ہی چیز بن گئی ــ سنگار میز کے سامنے بیٹھی وہ ناخنوں پر پالش لگا رہی تھی کہ نشیلا لینے اظہر آگیا۔

"ارے ــ رجّی یہ تم ہو ــ" وہ گھبرا کر طاسمہ ہو رہا اُسے دیکھنے لگا

شمو باہر سے دوڑی آئی اور آتے ہی بچپنے سے بولی ــ "کیوں اظہر بھائی آپا کتنی پیاری لگ رہی ہیں نا ــ؟"

"ارے ہاں بھئی ــ پہچانی ہی نہیں جاتیں ــ"

"پہچانے نہ جانے کا تو نہیں پوچھ رہی ــ شمو بور ہو کر بولی ــ" یہ بتایئے کیسی لگ رہی ہیں ــ"

"کاش میں بتا سکتا ــ" اظہر سانس بھر کر بولا ــ پھر رجّی سے مخاطب ہو گیا۔ "رجّی تم ساڑی کیوں نہیں پہنتیں ــ"

بڑی سادگی سے شمو بولی ــ "جی نہیں اظہر بھائی ساڑی پہننا آپا کو برا تھوڑی لگتا ہے مگر بات یہ ہے کہ وہ آپا والے لبادے میں کپڑا کم لگتا ہے نا ــ ساڑی ہو تو پھر پیٹی کوٹ بھی ہو، پھر بلاؤز بھی ہو ــ جتنے میں یہ ایک جوڑا بنے ہماری آپا کے دو جوڑے بن جاتے ہیں ــ"

"اچھا صاحب ــ" وہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر ذرا سا مسکرایا ــ "پھر آپ ہی اپنی آپا کی طرح لبادے کیوں نہیں پہنتیں ــ؟"

"آپ نہیں جانتے اظہر بھائی۔ میری آپا تو بڑی پیاری ــ بڑی خیال والی ہیں۔ وہ خود تکلیف برداشت کر لیتی ہیں، دکھ سہہ لیتی ہیں، مگر کسی کو تکلیف میں، یا دکھ میں نہیں دیکھ سکتیں ــ"

"بڑی سادھو مہاتما قسم کی معلوم ہوتی ہیں آپ کی آپا ــ" وہ مسکرایا۔

"ہاں اظہر بھائی ــ ایسے ہی ایک بار میں نے آپا سے کہا تھا مجھے ساڑی اچھی لگتی ہے ــ بس اب مجھے ہمیشہ ساڑیاں خرید کر دیتی ہیں ــ میں لاکھ روکوں ــ مانتی کب ہیں ــ وہ احسان مند ہو کر آنسوؤں میں ڈوب کر بڑی مشکل سے بولی ــ "آپا تو سورج ہیں اظہر بھائی ــ جو خود جلتا ہے مگر دوسروں کو روشنی دیتا ہے۔"

دھڑ ــ دھڑ ــ دھڑ جیسے کہیں آگ لگ گئی اور شعلے بھڑکنے لگے ــ آگ اونچی ہی اونچی ہوتی گئی اور رجّی اس میں جھلستی گئی ــ رجّی کا پور پور جل گیا ــ رواں رواں جھلس گیا ــ ابھی ابھی وہاں ساڑی پہنے حسن کی مورت بنی جو رجّی بیٹھی تھی وہ جل گئی تھی ختم ہو گئی تھی اور اب کرسی پر ہاتھوں میں تھوڑی لئے جو رجّی بیٹھی تھی وہ کوئی اور رجّی تھی ــ بچوں کی ماں ــ گھر کی بزرگ ــ!

شمو باہر چلی گئی تھی — اظہر ابھی تک کھڑا تھا اور رجّی وہاں جھلسی ہوئی مٹی کی بیٹی رہ گئی تھی۔

"شاید یہ خوشی میں برداشت نہ کر سکوں رجّی — یہ سورج میرے سر آسمان پہ چمکے گا ؟؟ میں دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی نہیں — ؟؟" وہ جھکا!

یہ لمحہ بڑا جان لیوا تھا — زندگی اور موت کا سوال اس میں چھپا ہوا تھا — لرزتا کانپتا، جھجکتا یہ لمحہ اس کے قریب آیا — اور قریب اور قریب — وہ سمٹ گئی — ضبط کا دامن ہاتھ سے جا رہا تھا — وہ اظہر کی تھی — اپنے اظہر کی — کوئی مجبوری، کوئی دکھ، کوئی وجہ اسے اظہر سے دور نہیں کر سکتی — نہیں — نہیں — نہیں — وہ اظہر کے بغیر نہیں جی سکتی — نہیں جی سکتی —

"تو رجّی تمہارے بعد اس گھر کا — گولو کا — جیدی کا، شمو کا کیا ہوگا ؟ تمہارے بیمار ابو کو کون دیکھے گا — میں بھی نہیں — تم بھی نہیں — پھر زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی رجّی بیٹا —" اس کی امی کہیں قریب سے بولیں — رجّی نے سر اٹھا کر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا — یہ آواز — یہ آواز کہاں سے آئی تھی ؟؟ کہاں سے آئی تھی — کیوں آئی تھی — یہ تو اس کے اپنے دل کی آواز تھی — اس کی دھڑکنیں بول رہی تھیں — وہ کیسے منہ پھیرے — وہ کیا کرے، کدھر جائے — ؟؟ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ آس پاس شور ہونے لگا — سائیں سائیں ہوائیں چل رہی تھیں — بادل گرج رہے تھے — پہاڑ ٹوٹ رہے تھے — زلزلے آ رہے تھے — وہ ڈول رہی تھی — کبھی ادھر کبھی ادھر — کبھی ادھر — کبھی ادھر — پھر سب کچھ ساکت ہو گیا — ماحول پرسکون ہو گیا۔ اسے راستہ مل گیا — اس نے فیصلہ کر لیا — ایک چراغ سے چار چراغوں کی روشنی، چار چراغوں کی زندگی کہیں بہتر ہے — کہیں بہتر ہے — اس کے سامنے روشنی پھیل گئی اور خود اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اظہر کے دلّی پہونچنے کے بعد اس کے ابّا کا رجّی کے ابّو کے نام خط آیا۔ انہوں نے اظہر کے لئے رجّی کو مانگا تھا — جیدی توکل کی بجائے آج ہی آپا کی شادی کر دینا چاہتا تھا، مگر خود آپا نے ضد کر کے جیدی کی زبانی ابو کو کہلوا دیا — "ان لوگوں سے کہہ دیجئے ہمیں شادی کی اتنی جلدی نہیں — اب تھوڑے دنوں کی بات ہے جیدی ڈاکٹر ہو جائے گا — شمو بی۔ اے ہو جائے گی — زندگی کسی ایک راستے پر ہو لے تو پھر آگے کی سوچی جائے گی —!" ابو اپنی صحت کی وجہ سے جلد از جلد یہ کام کروا دینا چاہتے تھے مگر رجّی کے آگے ان کی ایک نہ چلی — رجّی کی بات ٹالنا ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں — وہ اس گھر کا چراغ تھی جس کی روشنی میں سب راہ پاتے تھے —!

رجّی کی اس حرکت پر جیدی اتنا ناراض ہوا کہ اس نے بہن سے بول چال ہی بند کر دی۔

دن بڑی بے رنگی اور اداسی لئے گذر رہے تھے ـــــ بادل کبھی ایک جگہ نہیں رکتے ـــــ وقت بھی بادلوں کا ساہی تو ہوتا ہے ـــ ابھی یہاں ـــ کبھی وہاں ـــ چپ چپاتے اتنے دن گذر گئے کہ رجّی کے دل میں پیار کا داغ ناسور بن گیا ـــ

جیدی ڈاکٹر بن گیا ـــ رجّی کے دل کی بڑی تمنا تھی جو خدا نے پوری کر دی تھی۔ مگر جیدی اس سے اتنا خفا تھا کہ منہ دے کر بات نہ کرتا۔

رجّی اپنی صحت کی طرف سے جان بوجھ کر لاپرواہ بنتی گئی ـــ اس پہ غزیں کام کئے جاتی ـ ہر لمحہ خود کو مشغول رکھنا چاہتی۔ نتیجے میں اس کی صحت اور تباہ ہوتی جا رہی تھی ـــ سردیوں کے دنوں میں ایک بار وہ جان کر آنگن میں رہی اور صبح اس کی حالت غیر تھی ـــ بستر پہ پڑے پڑے اسے صبح سے شام ہو گئی۔ جیدی گھر لوٹا تو رجّی کو منہ لپیٹے سویا پایا ـــ بڑے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ گردخوں کی تہیں پڑی ہے ـــ کل کی دیا سلائی کی تیلیاں اور ایش ٹرے میں پڑی راکھ بھی فریاد کر رہی ہے ـــ کھڑکی میں سے جھانکا تو دیکھا باغ کی روشوں پہ پتیاں اور کچرا پڑا ہوا ہے ـــ آنگن میں دھول اڑ رہی تھی اور بھوک لگی تو کھانے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ـــ شمو کے کالج میں ڈرامہ ہونے والا تھا وہ صبح سے غائب تھی اور گولو میاں اپنے اسکول گئے ہوئے تھے ـــ وہ گول کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ان دنوں کا غبار جو اسکے دل میں جما ہوا تھا، آنکھوں کی راہ بہہ بہہ کر دل کو صاف کرنے لگا۔

"آپا ٹھیک ہی تو کہتی ہیں ـــ جو کرتی ہیں اچھا ہی تو کرتی ہیں ـــ واقعی ان میں جتنی عقل اور ذمہ داری ہے، اتنی ہم سبھوں میں ملا کر بھی نہیں ہے ـــ ایک دن وہ بستر پر پڑی ہیں تو گھر کا کیا حال ہو گیا ہے ـــ وہ اتنی حساس اتنی محبت پرور ہیں، امی کے بعد ہمیں تنہا چھوڑ بھی کیسے سکتی تھیں ـــ ؟

جیسے جیسے وہ سوچتا آنسو اسی تیزی سے بہے چلے آتے ـــ روتے روتے جیدی کی ہچکی بندھ گئی۔ اپنی امی کی موت پر بھی وہ اتنا نہ رویا تھا ـ اس کا پورا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا اور ضبط کی ناقابلِ برداشت شدت سے اس کی سسکیاں اب ننھی ننھی چیخوں میں بدل رہی تھیں ـــ ساتھ والے کمرے سے رجّی، تباہ حال باہر نکل آئی ـــ بخار کی تپش سے اس کا منہ تمتما رہا تھا ـــ وہ لپک کر آگے بڑھی ـــ

"کیا ہوا جیدی ـــ کیا ہوا میرے عزیز ـــ" جیدی نے اپنے کندھے پر اس کا جلتا جلتا ہاتھ محسوس کیا ـــ

"آپا ـــ" اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

رجّی تو یونہی تباہ ہو رہی تھی ــــ بھائی کو روتا دیکھ برداشت نہ کر پائی اور سسک سسک کر رونے لگی ــــ

"آپا ــــ ہم سب نے آپ پر بہت ظلم ڈھایا ہے۔ آپا اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کیا کہہ رہے ہو میرے پیارے ــــ کون کہتا ہے تم نے مجھ پر ظلم ڈھایا ہے۔ تم لوگوں نے تو مجھے زندگی دی ہے ــــ وہ سسک سسک کر کہہ رہی تھی ــــ "تمہاری وجہ سے تو میری زندگی میں خوشیاں ہیں ــــ"

"نہیں آپا ــــ" جیدی رونے لگا ــــ "میں جانتا ہوں آپ کے دل پر کیا بیتتی ہے مجھ سے آپ کا دل چھپا نہیں ہے آپا ــــ میں ــــ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہ رو میرے لال ــــ نہ رو میرے بیٹے ــــ" رجّی کے ٹوٹے ٹوٹے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں ــــ اس کے ہونٹ شدتِ ضبط سے کانپ رہے تھے ــــ جیدی نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"آپا ــــ آپ نے مجھے لال کہا ــــ بیٹا کہا ــــ آپا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں جیدی ــــ اب مجھے خیال آتا ہے اظہر نے ایک بار مجھے مریم کہا تھا ــــ مریم بھی تو کنواری ماں تھی نا بہ بھی ــــ میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس نے روتے روتے اپنا سر جیدی کے سینے پر ٹکا دیا ــــ

جیدی کا دل ٹوٹ گیا ــــ آپا دل ہی دل میں اظہر بھائی کو کتنا یاد کرتی ہیں ــــ ان کی کہی باتیں کیسے ان کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں ــــ یہ کیسا دکھ ہے خداوند ــــ یہ کیسی رات ہے؟ اس رات کی سحر کہاں ہے ــــ ہے بھی یا نہیں ــــ؟ اس نے رجّی کو زور سے لپٹا لیا۔

جیدی کی پوسٹنگ کسی دیہات پر ہو گئی تھی اور رجّی کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ مسافروں جیسی زندگی گذارے ــــ اور جب انسان پڑھ لکھ کر کمانے لگتا ہے تو اسے زندگی کا ساتھی بھی چن ہی لینا چاہئے۔

"جیدی میں تیرے لئے لڑکی دیکھ رہی ہوں ــــ چاہتی ہوں تیری روانگی سے پہلے شادی ہو جائے۔"

"آپا ــــ" جیدی چیخا ــــ "میں اس قسم کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا ــــ" غصے اور رنج کے مارے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"اچھا ــــ؟" رجّی مصنوعی خوش دلی سے بولی۔

"ہاں آپا میں کہے دے رہا ہوں میں شادی وادی عمر بھر نہیں کروں گا ــــ"

رجّی ہنسی ــــ "ارے تیرے تو بڑے بھی شادی کریں گے۔ تو کیا مجھے دھونس بتاتا ہے؟"

"اچھا یہ بات ہے تو کر دیجئے میرے بڑوں کی شادی ــــ" وہ پلٹ کر بولا۔

مذاق مذاق میں بات کتنی دور پہونچ گئی تھی — رجی چونکی اور جیسے کراہ کر بولی —

"جیدی — تو میرے دل میں تیر کیوں چبھاتا ہے — تو — تو اتنا ظالم تو کبھی نہیں تھا میرے عزیز —" جیدی نے سر اٹھا کر آپا کو دیکھا — دنیا کے سارے غم سمٹ کر اس کے چہرے پہ جمع ہو گئے تھے۔ وہ کچھ نہ بول سکا۔

"جیدی اگر تو نے میری یہ بات نہ مانی تو یاد رکھو —" رجی چپ ہو گئی — "میں ابھی نہیں بتاتی میں تجھ سے کیا انتقام لوں گی، ہاں پہلے تو انکار کر، پھر خود ہی دیکھ جائے گا۔ — —" جیدی کانپ گیا — "آپا مجھ سے کیا انتقام لے گی ؟ یقیناً آپا خود اپنی ہی جان کو کوئی دکھ پہونچائے گی، ورنہ آپ جیسے محبت بھرے دل کسی کو کیا دکھ دے سکتے ہیں — ؟" وہ داؤ بچانے کو بولا۔

"آپا میں اپنی پوسٹنگ کوشش کر کے حیدرآباد ہی میں کروا لوں گا۔ اور کم بخت نہ ہوئی تو لات مار کر اپنی پرائیویٹ ڈسپنسری کھول لوں گا۔"

"وہ جو گا تب ہو گا۔ مگر میں تجھے یونہی نہ چھوڑوں گی — اپنے لئے نہیں تو میرے لئے تجھے شادی کرنی ہی پڑے گی — میرا کہنا لے جیدی —"

رجی نے سفید ساڑھی، سفید بلاؤز پہن کر اور جوڑا باندھ کر جب آئینے کے سامنے آئی تو اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ وہ بے حد معتبر اور سنجیدہ نظر آ رہی تھی — خصوصیت سے جوڑے نے اسے بہت گریس فل بنا دیا تھا — شمو کی ایک سہیلی اس کی نظر میں تھی، جو بی۔ اے کر رہی تھی اور بہت اچھے خاندان سے تھی — صورت شکل کی بھی بہت پیاری تھی — معین صاحب یقیناً جیدی جیسے لڑکے کو داماد بنانا اپنی خوش بختی خیال کریں گے — اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

مسز معین بہت خوبصورت تھیں — پچاس سے اوپر ان کی عمر رہی ہو گی مگر رکھ رکھاؤ ابھی تک نئی نویلیوں کا سا تھا — جب رجی نے ستارہ کے لئے ان سے بات چھیڑی تو وہ بولیں۔

"مگر لڑکے کی ماں کون سی ہیں۔"

"رجی پر وہ ایک لمحہ ایک صدی بن کر گزرا — اس نے بڑے ضبط سے جواب دیا —" جی میں ہی لڑکے کی ماں ہوں — ؟"

مسز معین اپنی جگہ سے اچھل پڑیں — "آپ یعنی — یعنی کہ آپ لڑکے کی ماں ہیں ؟ آپ تو مجھ سے بھی چھوٹی ہوں گی — ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے — آپ کے لڑکے بالے کہاں سے آئے —"

رجی نے بہت سنبھل سنبھل کر جواب دیا ۔" جی امی کے مرنے کے بعد میں نے چھوٹے بھائی بہنوں کو ماں بنکر پالا ہے ــــ میں ہی تو ان کی ماں ہوئی ۔"

" تو آپ نے ان لوگوں کی وجہ سے اپنی شادی نہیں کی ــ " وہ ذرا حیرت اور ستائش بھرے لہجے میں بولیں۔

رجی نے بڑی سادگی سے جواب دیا " جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں کہ وہ لوگ میری زندگی میں پتھر بن گئے ہوں ۔ میں نے خود ہی نہیں کی ۔"

مسز معین بھی بچہ نہیں تھیں ۔ اس کے چہرے مہرے سے اس کے دلی کرب کا حال جان گئیں ۔ انہوں نے حسرت سے اسے دیکھا ــ وہ اتنی چھوٹی سی لڑکی ــ کس قدر عظیم تھی !

حمیدی ایک نہ ایک بہانہ ڈھونڈھ نکالتا ۔ تب تھا چڑ کر بولا ـــ " اور آپ شادی کے لئے پیسے کہاں سے لائیں گی ــــ ؟"

رجی ہنس کر بولی ۔" اتنی نادان تو میں ہوں نہیں کہ ہاتھ میں پیسہ نہ ہو اور اتنا بڑا کام کرنے بیٹھ جاؤں زیور تو پاس ہے ہی ـــ " (حالانکہ اس کو امی کی قسم یاد تھی !)

حمیدی ہنس کر بولا ـــ " بس بس آپا بہت ہو چکا ۔ اب آپ چاہتی ہیں کہ رہا سہا آپ کا زیور بھی میں مار دوں ــــ میں سچ آپ سے مرتے دم تک بات نہ کروں گا ۔"

رجی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔" مریں تیرے دشمن ـــ بازو برابر تو میرا بھائی ہے حمیدی ـــ تجھے تو میں بھلا کبھی بھلا سکتی ہوں میرے عزیز ــ تو جیے تیری کمائی سے میں کتنے ہی زیور بنوا لوں گی ۔" پھر بہت دیر بعد دکھی لہجے میں بولی ۔" اور اب یوں دیکھا جائے تو میری عمر ہی کون زیور پہننے کی رہ گئی ہے حمیدی ــ ؟!"

حمیدی نے چونک کر سر اٹھایا ـــ آپا اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا ۔ حمیدی نے بڑے غم سے دیکھا کہ ابھی سے آپا کے بالوں میں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے ـــ !!

حمیدی بہت خوبصورت تھا ۔ رجی چاہتی تھی دلہن بھی ویسی ہی ملے اور دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی کہلائے ــــ ستارہ رجی کے معیارِ حسن پر پوری اتری تھی اور معین صاحب نے بھی زیادہ حیل حجت نہ کی ۔ بلکہ دل ہی دل میں تو وہ بے حد خوش ہوئے کہ ڈاکٹر داماد ملا ــــ رجی نے کسی کو کچھ نہ بتایا کہ شادی کا انتظام اس نے کس روپے سے کیا ہے ــ وہ خود ہی خوشی خوشی سارے کام سنبھال رہی تھی ـــ صبح سے جو جاتی

تو شام تک بازاروں کے چکر لگاتی رہتی ــــ جبیدی اس کا بڑا پیارا، بڑا اچھا بھائی بھی تھا، جو اس کا بھائی ہی تھا، دوست بھی ــــ اس کے غم کو بھی سمجھتا تھا اور خوشیوں کو بھی ــــ وہ چاہتی تھی جبیدی کی شادی میں کوئی کسر باقی نہ رہے ــــ

شادی بہت اچھی طرح ہوئی ــــ مہمانوں سے بٹے ہوئے گھر میں کون ایسا نہ تھا جس نے دل سے بھی اور منہ سے بھی رجی کی تعریف نہ کی ہو ــــ بہن ہو تو ایسی ــــ ماں کا سا سلوک کیا ہے ــــ" مگر ایک جبیدی تھا جس کی آنکھ سے آنسو ڈھلکنے کو تھا ــــ تعریف و تحسین کا ایک حرف بھی اس کی زبان سے نہ نکلا ــــ

شادی میں دلی والے چچا جان بھی اپنے گھر آئے تھے ــــ شادی کے سارے مہمان جا چکے تھے۔ وہ اب تک نہ گئے تھے ــــ انہوں نے چپکے چپکے زور دینا شروع کیا کہ اب تو ماشاء اللہ سے جبا دید میاں بھی کام سے لگ گئے ہیں اور دوسرے بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں ــــ پھر خیر سے گھر میں بہو بھی آ گئی ہے اب کس بات کا ڈر ہے ــــ؟ ابھی بات رجی کے کانوں تک نہ آئی تھی، ڈھلمل ڈھلمل سی تھی کہ قدرت نے ایک داؤ اور کیا ــــ ایک رات اچانک ابو ختم ہو گئے ــــ!! اور کئی دن یونہی روتے گزر گئے

اظہر جب حیدرآباد آیا تھا جیسے پرانا اظہر نہ رہ گیا تھا ــــ نہ اس کے وہ قہقہے تھے نہ وہ ادائیں ــــ بس ہونٹوں پر چپکی سی لگی رہتی ــــ رجی سے اس کی بات چیت بھی نہ ہوئی تھی، رجی خود ہی اسے بات کا موقع نہ دیتی ــــ وہ جانتی تھی کہ اگر اظہر کو موقع ملا تو وہ کیا کہے گا ــــ اکیلے میں اگر کبھی وہ ایک جگہ ہوتے بھی تو رجی فوراً کسی نہ کسی کام کا بہانہ بنا کر چلی جاتی ــــ

ایک دن سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اظہر بار بار ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا تھا ــــ شمو اچانک بولی۔

"اظہر بھائی یہ آپ پیشانی پر کیا تلاش کر رہے ہیں ــــ؟"

اظہر نے ڈوبتے لہجے میں کہا ــــ "نہیں شمو مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ یہاں میرے ماتھے پر چاند کا نشان سا تھا ــــ ڈھونڈھ رہا ہوں کہ میرا وہ چاند کہاں کھو گیا ــــ" اس کی آواز میں شدید دکھ اور کرب کا احساس تھا۔

"چاند ــــ؟" شمو حیران رہ گئی ــــ اچانک رجی بول پڑی ــــ

"جی ہاں مجھے یاد ہے ــــ میں نے ضرور دیکھا ہے وہ چاند ــــ"

"پھر آپ بتا سکتی ہیں کہ اب اس کی جگمگاہٹ کہاں کھو گئی ــــ"

رجی نے باتوں باتوں میں لاپروائی سے کہا ــــ اندھیری راتوں میں چمکنے والے اس چاند کو کیسے بھلایا جا

سکتا ہے جس نے زندگی میں روشنی بھر دی تھی ۔۔۔" وہ شمو کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ۔ "شمو اب تو بی اے کے بعد کیا کرے گی ۔۔۔؟ اونہہ کچھ بھی کرے، مگر بہر حال تجھے میری ناراضی اور میری محبت کی ضرورت باقی رہے گی" شمو اس کی ان اوٹ پٹانگ باتوں سے بوکھلا سی گئی ۔۔۔

"آپا آپ آج کیسی الٹی پلٹی باتیں کر رہی ہیں ۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ۔۔۔؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں ہوا شمو ۔۔۔ میں بہت اچھی ہوں" وہ ہنسی ۔۔۔ "میں اکثر سوچتی ہوں کہ اب تو اس گھر سے میرا اتنا گہرا رابطہ ہو چکا ہے کہ میں کہیں جا ہی نہیں سکتی ۔۔۔ جیدی یہاں رہے گا نہیں ۔۔۔ گولو کی تعلیم نامکمل ہے ۔ اور پھر تو اکیلی ۔۔۔ یہ سب کیسے ممکن ہے کہ تم سب کو اس اندھیرے میں چھوڑ کر میں اپنے لئے کوئی چاند تلاش کروں ۔۔۔!"

اس رات جب اظہر اُسی پرانے کمرے میں سویا ہوا تھا، تو بالکل ویسی ہی رات تھی ۔۔۔ وہی ماحول ۔ وہی زندگی ۔۔۔ سب کچھ وہی تھا ۔۔۔ بالکل وہی ۔۔۔ مگر رجّی وہ نہ تھی ۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے آئی ضرور مگر وہیں ٹھٹھک گئی ۔۔۔ پھر اس نے جھجکتے سہمتے قدم بڑھائے اور اس کے پلنگ کے پاس آکر ٹھہر گئی ۔۔۔ کتنی ہی دیر اُسے دیکھتی رہی اور یونہی مڑ گئی ۔۔۔ آنکھوں میں آنسو لئے ۔۔۔ اظہر جاگ رہا تھا ۔۔۔ جیسے ہی وہ پلٹی، وہ لپک کر اٹھا اور اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا ۔

"رجّی ۔۔۔ تم اگر پہلے دیوی تھیں تو اب اس سے بھی کچھ سوا ہو گئی ہو ۔۔۔ سچ کہہ دوں رجّی ۔۔۔ اب تم خدا ہو گئی ہو ۔۔۔ میں تمہارے بغیر زندہ تو رہ سکتا ہوں رجّی، مگر خوش نہیں رہ سکتا ۔۔۔ ہاں میں سچ ہی کہہ رہا ہوں، تمہارے سامنے کوئی جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا ۔۔۔ پھر میں یہ جھوٹ کیسے کہوں کہ تمہارے بنا میں زندہ نہیں رہ سکتا ۔۔۔ مگر رجّی ایسی زندگی کس کام کی ۔۔۔ اس سے تو موت ہی اچھی ہے ۔۔۔ تم میری زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہو رجّی ۔۔۔ تم ..... تم ....."

رجّی کا سارا بدن ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی اور ہونٹوں کے کونے اُسی بے قراری سے کانپ رہے تھے جس میں وہ بے صدا آواز سے کسی سے گلے مل جانے کے بارے میں کہتے ہیں ۔۔۔ وہ یونہی کانپتی ہوئی اظہر سے لگی کھڑی رہی ۔۔۔ اسکے روکھے سوکھے بالوں میں سے اظہر کو وہ زندگی بخش مہک آرہی تھی جس سے وہ آج تک محروم رہا تھا ۔ اسنے سر جھکا کر ان روکھے سوکھے بالوں کو چوم لیا ۔۔۔

"میری زندگی ۔۔۔ میری جان ۔۔۔"

رجّی کا جسم کانپا اور وہ بے دم ہو کر اظہر کے بازوؤں میں گر پڑی ۔۔۔

جیدی نے جو درخواست اُسے رکھی تھی وہ منظور ہو گئی تھی اور اب جیدی پھر حیدرآباد میں تھا ــــ رجی بہت خوش اور مطمئن تھی کیونکہ ان دنوں وہ ستارہ کو اکیلی رکھنا نہیں چاہتی تھی ــــ جب ستارہ متلی یا چکر کی شکایت کرتی تو رجی بڑے بوڑھوں کی طرح معنی خیز انداز سے مسکراتی اور بچے ہوئے ٹائم میں ننھے گدیلے، روئی دار توشکیں اور چھوٹے چھوٹے کپڑے سیتی رہتی۔

نغاآشو گھر بھر کی مسرت کا سامان بن کر آیا ــــ بہت دنوں بعد اُس گھر میں بچے کی کلکاریاں گونجی تھیں ــــ اب رجی کو لمحہ بھر کی فرصت بھی نہ ملتی ــــ وہ ساری زندگی کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے چل رہی تھی ــــ اسے بیتے دنوں کی یاد کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی ــــ مگر رات اب بھی اس کے لئے قہر بنکر آتی تھی ــــ اور خصوصیت سے برسات کی راتیں تو اس کا صبر آزمانے آتی تھیں ــــ رہ رہ کے اس کے تصور میں ایک داغ ابھرتا ــــ جو کبھی وقت چاند بھی تھا اور کبھی امٹ پیار کی مہر بھی۔

اظہر نہایت بد دل ہو کر اپنے دوست کے ساتھ لندن چلا گیا تھا ــــ وہاں وہ بڑی پریشان اور تنہا زندگی گذار رہا تھا ــــ وہاں اسنے یہ بھی سنا کہ رجی نے شمو کی شادی کر دی ہے اور اب وہ ننھا جیدی تین بچوں کا باپ بن چکا ہے ــــ وقت کیسے گذر جاتا ہے ــــ کیسے ــــ کیسے ــــ؟ اُسے تو یہ بھی پتہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے ساتھ کتنے دکھی دلوں کی آہیں اور کتنی آنکھوں کے آنسو لے گیا ہے ــــ بس بڑھا چلا جاتا ہے ــــ گذرتا چلا جاتا ہے۔

بہت دنوں بعد اُسے ایک خط ملا تھا۔

اظہر ــــ

یہ دکھ کبھی میرے جی سے نہیں مٹتا کہ میں نے ایک دل دکھایا ہے ــــ ایک کعبہ ڈھایا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں اظہر ــــ رات میرے لئے قہر بن کر آتی ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جھلمل کرتا چاند ادھر سے اُدھر ڈھل جاتا ہے، تارے ایک ایک کر کے دم توڑ دیتے ہیں مگر میری بے خواب آنکھیں نیند کے لئے یونہی ترستی رہ جاتی ہیں۔ ان میں نیند آئے بھی کہاں سے ــــ ان میں تو آنسو سما چکے ہیں ــــ کتنے ستاروں کی میتیں ان آنکھوں نے دیکھی ہیں ــــ کتنے چاندوں کو ان آنکھوں نے کفن پہنایا ہے ــــ اے زندگی ــــ اے دل!!

مجھے بڑا دکھ اُس لمحے ہوتا ہے اظہر جب یہ سوچتی ہوں کہ میں نے تمہاری بھی زندگی تباہ کی ہے ــــ کتنے دکھ اس دل نے پال رکھے ہیں ــــ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے اظہر ــــ کیا مجھے معاف نہ کر دو گے؟

گولو اس سال میٹرک میں ہے ــــ پھر میرے سارے سکھ پورے ہو جائیں گے اظہر۔ مجھے یہ خوشی رہے گی کہ میں نے امی کی روح کو کوئی دکھ نہیں دیا ــــ مگر کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر بڑی ہنسی آتی ہے اظہر کہ میں بھی

تیس کی بھی نہیں ہوئی ہوں اور میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔
میں تمہیں کیا بھیجوں ـــــ میری زندگی اور زندگی کا سارا پیار تمہارے ہی لئے تب!
رجی

جیدی کے بڑے بیٹے کی تیسری سالگرہ تھی ـــــ
شمو بھی اس فنکشن کے لئے اپنی سسرال سے آگئی تھی ـــــ وہ اور ستارہ مل کر سب تیاری کر رہی تھیں ـــــ رجی ہدایات دے رہی تھی ـــــ جیدی نے اب گورنمنٹ سروس چھوڑ کر اپنی پرائیویٹ ڈسپنسری کھول لی تھی اور اس کی پریکٹس خوب چل نکلی تھی ـــــ کسی بات کی کمی اب محسوس نہ ہوتی۔ پہلے دنوں کا وہ ظالم سورج جو سدا بادلوں کے پیچھے چھپا رہا کرتا تھا اب بادلوں کا سینہ پھاڑ کر کھلے آسمان پر جگ مگ کرتا تھا ـــــ رجی بے حد مطمئن تھی ـــــ وہ کھلے دل سے خوب پیسہ اٹھا رہی تھی۔
کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں ـــــ ستارہ اور شمو ہنس ہنس کر بیلوں اور صراحی دار غباروں میں پھونکوں سے ہوا بھر رہی تھیں ـــــ سارے میں شور او ہنگامہ تھا ـــــ خوشی تھی ـــــ ایک دم رجی پرانے سامان والے کمرے میں گئی اور وہاں سے گرامو فون اور ریکارڈ اٹھا لائی ـــــ اسنے اپنے دامن سے ریکارڈ کی گرد صاف کی اور ریکارڈ پر سوئی لگا دی ـــــ پہلے کھر کھر سرسراتی سی آواز نکلی پھر میوزک بجنے لگی اور کوئی غم بھری آواز سے پکارا ـــــ

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

رجی ہاتھوں میں اپنا اداس چہرہ لئے بڑی محویت سے سن رہی تھی۔

کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے . . . . .

ایک دم ستارہ اور شمو نے چونک کر صحن کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ جہاں ایک اسٹول پر گرامو فون دھرا تھا اور ایک نیچی کرسی پر رجی یوں گم سم بیٹھی تھی جیسے رجی نہ ہو پتھر کی مورت ہو ـــــ پھر دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی ـــــ

"ارے آپا" ـــــ دونوں چلائیں ـــــ "یہ کیا پرانا دھرانا ریکارڈ چڑھا رکھا ہے"
رجی دھیمے سے چونک کر بولی ـــــ "مجھے یہ ـــــ ـــــ ـــــ"
ستارہ ہنس کر بولی ـــــ "آپا آپ کے بھائی ابھی پرسوں ہی تو تازہ فلموں کے کوئی اٹھارہ ریکارڈ

لائے ہیں ــــ ریڈیو گرام پر کیوں نہیں سنتیں ــــ یہ کیا پھر توس باجہ بجانے جا رہی ہیں آپ ــــ!"

رجّی مسکرا کر بولی ــ "نہیں ستارہ یہ تو بڑا اچھا گانا ہے ــــ نسیم بانو نے گایا ہے۔"

شمّو بولی ــ "وہ تو ٹھیک ہے آپا۔ مگر ایسا سڑیل گانا اور ایسے خوشی کے موقع پر۔؟؟ اٹھئے نا ــ"

وہ لاڈ ناز پر اتر آئی۔

ہے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی

اک تری اور اک مری آواز ہے

اک تری ــــ اک مری ــــ اک تری ــــ اک مری ــــ

رجّی کچھ نہیں سن رہی تھی اور سب کچھ سن رہی تھی ــــ ستارہ اور شمّو ہنستی ہنستی کھڑی تھیں۔ اسی دم باہر سے جیدی چلا آیا ــــ اور آتے ہی ٹھٹھک گیا۔

ہے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی

زندگی آواز ہی آواز ہے

ریکارڈ گھمر گھمر بجے جا رہا تھا ــــ سوئی آخری سرے پر آ کر یونہی گھومنے لگی تو رجّی نے اٹھا کر پھر ریکارڈ چلا دیا ــــ

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

"جیدی بھیا ــــ دیکھئے نا ذرا ــ" شمّو کی ہنسی سے بھری آواز کہیں دور سے رجّی کے کان میں پڑی اور اسنے بُری طرح چونک کر سر اٹھایا ــــ اسنے دوسرے ہی لمحے تیزی سے ریکارڈ پر سے سوئی ہٹائی اور دھڑ سے گرام فون کا کور گرا دیا ــــ نہ وہ اس کا دوست، وہ اس کا بھائی، وہ اس کا غم خوار ــــ وہ کیسے اپنے دل کا درد اس بخوبی سے چھپائے؛ اسنے ہنس کر (وہ ایک ہنسی جو لاکھ آنسوؤں کو روکنے سے پیدا ہوتی تھی) جیدی کو دیکھا اور بولی ــــ

"بیٹے کی سالگرہ کا ہنگامہ دیکھو اور باپ اب چلے آ رہے ہیں۔"

وہ دھیرے دھیرے ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح برآمدوں سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے کو جانے لگی۔

جیدی کا بیٹا آشو تھا تو تین سال کا، مگر عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا ــــ گو توتلا کی طرح تتلانا اسے نہیں آتا تھا ــــ پٹر پٹر باتیں کئے ہی جاتا ــــ سالگرہ کی تقریب کے بعد بچے ادھر ادھر بکھر گئے اور مہمان عورتیں دھیرے

باغ میں کرسیاں ڈالے باتیں کرنے لگیں ـــــ جانے اُدھر بچوں میں کیا تو تو میں میں ہوئی کہ آشو ایک دم تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور اپنی ممی کے گھٹنوں سے لپٹ کر سسکنے لگا۔

"مم ـــــ می ـــــ ممی وہ نرگس کی بچی بولتی ہے کہ ـــــ اوں ـــــ اوں ـــــ بولتی ہے کہ تمہیں تو گرینی ہے ـــــ تمہاری گرینی نہیں ہے ـــــ ہاں ممی! ہمیں گرینی نہیں ہے ؟؟" اس نے دور اشارہ کیا نرگس اپنی دادی کی انگلی تھامے گملے سے کوئی پھول نوچ رہی تھی ـــــ مسز معین آج طبیعت خراب ہونے کی وجہ اس فنکشن سے غائب تھیں، ستارہ نے بالکل لاپرواہی سے منے کو اٹھا کر گھٹنوں پر بٹھایا اور بولی ـــــ

"بھلا کیا کہتی ہے وہ نرگس ـــــ میں بھی سنوں ـــــ"

آشو نے رو رو کر وہی بات دہرادی ـــــ "ہاں ممی ہمیں گرینی نہیں ہے ـــــ ؟؟"

رجی سفید سلک کی ساری اور بلاؤز پہنے، ڈھیلا سا جوڑا باندھے، سامنے ہی کرسی پر بیٹھی تھی ـــــ ستارہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کون کہتا ہے میرے منے کی گرینی نہیں ہے ـــــ وہ دیکھ تیری گرینی بیٹھی ہیں ـــــ کتنی پیاری ہیں نا ـــــ" وہ ماتا بھرے انداز سے آشو کی خوشی دیکھ، رجی کی طرف دیکھ کر مسکرائی ـــــ

دہڑ ـــــ دہڑ ـــــ دہڑ ـــــ آگ ہی آگ ـــــ شعلے ہی شعلے ـــــ یہ دوسری بار تھی کہ رجی کی زندگی میں ایسے آگ لگی تھی اور ایسی آگ جس کا بچاؤ ہی نہ تھا ـــــ ایسی آگ جو نہ آبلے پیدا کرتی تھی نہ بدن جھلساتی تھی، پھر بھی سب کچھ جل جاتا تھا بھسم ہو جاتا تھا۔

"ہاں ہاں بیٹے آؤ ـــــ میں تمہاری دادی ہوں نا ـــــ تمہاری دادی ـــــ دا ـــــ دی ـــــ اور وہ دیوانہ وار قہقہہ لگا کر ہنسی ـــــ ایسی ہنسی جو ہنسی نہیں کچھ اور ہی تھی ـــــ اور وہ آشو کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مہمان سب جا چکے تھے ـــــ سب نے جاتی دفعہ بار بار رجی کو پوچھا، مگر ستارہ نے جب بھی اس کے کمرے میں جھانکا اسے منہ لپیٹے پایا ـــــ

"صبح سے کام میں لگی ہیں نا ـــــ شاید تھک کر سو گئی ہیں ـــــ آپ محسوس نہ کیجئے گا ـــــ" ستارہ ایک ایک سے معذرت کرتی رہی ـــــ مگر ستارہ نہیں جانتی تھی کہ اب رجی عمر بھر کے لئے جاگ چکی تھی۔ شاید اب وہ کبھی نہیں سوئے گی۔

کھانے کی میز لگ چکی تھی کہ ہنستی جھومتی رجی کمرے میں داخل ہوئی ـــــ اس نے سر پہ پوڈر تھوپ رکھا تھا اور بوڑھوں کی طرح کمر جھکا کر چل رہی تھی ـــــ سین مکمل کرنے کو اس نے ایک لاٹھی تھام رکھی تھی۔

"ہا ہا ۔۔۔ اب میں پوری دادی لگتی ہوں نا جیدی ۔۔۔ میں تیرے بچوں کی دادی۔ اور شمو کے بچوں کی نانی ۔ ۔ ۔ ۔ بی بی بی ۔۔۔" وہ دیوانہ وار ہنسے جا رہی تھی۔

جیدی نے ہاتھ کا نوالہ پھینک دیا ۔۔۔ "آپا ۔۔۔ آپا ۔۔۔" وہ چلایا ۔۔۔ "آپ کو کیا ہو گیا ہے ۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ۔۔۔"

اس کی کرخت آواز سن کر رجی نے گھوم کر ایک لمحے کو اپنے جیدی کو دیکھا ۔۔۔ کچھ اس طرح جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو ۔۔۔

"آپا ۔۔۔ میں جیدی آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں ۔۔۔ آپ کا بھائی ۔۔۔ آپا آپ کا اپنا ۔۔۔"

وہ جیدی کے سینے سے لپٹ کر رو پڑی ۔۔۔ جیدی یہ سب لوگ کہتے ہیں، میں بوڑھی ہو گئی ہوں ۔ میں دادی بن گئی ہوں ۔۔۔ ہاں جیدی کیا یہ ممکن ہے ۔ اگر اظہر کسی لڑکی کسی بوڑھی کو بیاہ لے جائے گا ۔۔۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا نا جیدی کہ اندھیری رات میں، راستہ بتانے والا وہ چاند بھی ڈوب گیا جو ماتھے پر سپیار کی مہر بن کر جگمگاتا تھا جو داغ محبت بھی تھا اور تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کا دم پھر گھٹ گیا ۔۔۔ آنکھیں پھٹ گئیں ۔۔۔ وہ تھک کر جیدی کے بازوؤں میں گر پڑی ۔۔۔ جیدی جو ایک بھائی بھی تھا، دوست بھی تھا ۔۔۔ اور ڈاکٹر بھی ۔۔۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف منہ پھیرا ۔۔۔ صدیوں کا غم اس کے چہرے پر ایک لمحہ میں سمٹ آیا تھا ۔

"ستارہ ۔۔۔" وہ ڈوبتے ہوئے بولا ۔۔۔ "آپا پاگل ہو گئی ہیں ۔۔۔"

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

رجی اپنی دھن میں میٹھی گائے جا رہی تھی ۔۔۔ بیچ بیچ میں وہ لا معنی بک بک بھی شروع کر دیتی ۔۔۔

"اب میں یہ لبادہ کیوں پہنوں ۔۔۔ میرا بھائی تو اب ہزاروں سے کما رہا ہے ۔۔۔ جچی جچی ۔۔۔ اس میں بھی کوئی روح نظر آتی ہوں ۔۔۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ میں اظہر کی گاڑی میں ضرور بیٹھوں ۔۔۔ اب تو جیدی بھی گاڑی خریدنے والا ہے ۔۔۔"

جیدی آنکھوں میں آنسو لئے اسے بیٹھا دیکھ رہا تھا ۔۔۔ جب سے وہ پاگل ہوئی تھی، ہر بات میں کسی نہ کسی طرح اظہر کا ذکر ضرور نکل آتا اور جیدی کا دل یوں ہو کر رہ گیا تھا جیسے کسی نے چاقو سے کھانچے لگا کر ان میں نمک بھر دیا ہو۔

"جیدی وہ جب پہلی بار تم اور اظہر آئے تھے نا تو وہ تو دلی سے آیا تھا ــــ راستے میں اسے تم نے کیسے بلا لیا؟ اس نے گھر کا راستہ کس نے بتایا تھا ــــ تم نے ــــ؟ اچھا تو شاید تم اسٹیشن سے پہ جا کر اس کی راہ دیکھ رہے تھے ــــ کیا پتہ مجھے ــــ؟"

اس کا تھکا ہوا دماغ جب کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیتا تو وہ پیشانی پر بل ڈال کر سوچتے سوچتے نڈھال سی ہو جاتی اور پھر چپ ہو جاتی۔

"مشکل ہے اب تو تو نے تتلانا چھوڑ دیا ــــ ورنہ مجھے یاد ہے کہ پہلی بار جب اظہر آیا تھا تو اس نے مذاق سے کہلوا دیا تھا ــــ آپ تی اجل آئی ہے ــــ یعنی میری موت آئی ہے ــــ ارے واہ ــــ وہ تو زندگی کا پیام بن کر آیا تھا میرے لئے ــــ"

وہ رجی جس نے عمر بھر کبھی جیدی اور شمو کے سامنے اظہر سے آنکھ ملا کر بات نہ کی اب کھلے دل سے اپنی محبت کے داغ انہی کے سامنے عریاں کرتی ــــ اس کا ماسق الضمیر ان باتوں کو دہراتا رہتا جس نے اس کا دل کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

جب چاندنی راتوں میں جگمگاتا چاند آسمان کے بیچوں بیچ آ ٹکتا تو وہ گھنٹوں محویت کے ساتھ چاند کو تکے جاتی ــــ پھر چاند سے باتیں شروع کر دیتی ــــ کھانا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ نیند اس کے پاس نہ پھٹکتی ــــ شمو کی شادی ہوئی تھی تو وہ اپنے پرانے کپڑے اور سادی ساڑیاں چھوڑ گئی تھی۔ اور اب جیدی کے ہاتھ میں بے حساب پیسہ آیا تو رجی نے ساڑیاں پہننی شروع کر دی تھیں ــــ ستارہ اسے جبر کر کے کپڑے بدلواتی تو وہ خوش ہو کر بولتی۔

"ہاں ساڑی میں ضرور پہنوں گی ــــ ایک بار اظہر نے کہا تھا میں ساڑی میں کوئی اور ہی چیز بن جاتی ہوں۔"
مسلسل بک بک کے بعد وہ خاموش ہوتی تو وہی نسیم بانو والا پرانا گھسا پٹا گیت گانے لگتی ــــ کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے ــــ سنسان کمروں میں اس کی درد بھری آواز گنبد کی صدا بن کر لوٹتی ٹکراتی گونجا کرتی ــــ وہ ایک ایک کھڑکی، ایک ایک دروازے میں جاتی ــــ کبھی باغ میں پھولوں کے پاس جا کر کھڑی ہوتی اور جیسے سوچتی رہ جاتی کہ اسے کیا تلاش ہے ــــ کیا کھو گیا ہے ــــ ایک بار اس نے بڑی بے چارگی سے جیدی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب میرے دل میں ــــ اس جگہ درد سا کیوں ہوتا ہے؟ کہیں پھوڑا تو نہیں ہے میاں ــــ؟"
جیدی کے گلے میں اسٹیتھسکوپ دیکھ کر اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر درد کی جگہ بتائی تھی۔

جیدی میز پر سر ٹکا کر اس رات دو بجے تک روتا رہا ــــ جب وہ بوجھل دل اور سرخ آنکھیں لئے برانڈے میں اترا تو دیکھا ملگجی چاندنی میں آدھے چاند کو گھورتی رجی اس سے کہہ رہی تھی۔

"شاید نہ — تم چمک رہے ہو پھر بھی میری دنیا میں اندھیرا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی اُس برسات کی رات کے بعد اب تم . . . ."

جیدی ساکت رہ گیا۔

کئی دن گذر گئے — رجی مسلسل باتیں کئے جاتی — اتنے دنوں سے جو اُسے چپ سی لگی تھی اور اس کے دل میں جو باتیں گھٹ کر رہ گئی تھیں، وہ انہیں ایک ایک سے سناتی — پھولوں سے، ستاروں سے، چاند سے جیدی سے، ستارہ سے، بچوں سے — بچے اس کے پاس آتے تو وہ مسز بن کر بولتی۔

"بچو میں تمہاری دادی ہوں — ہاں — بڑوں کا کہنا مانتے ہیں —"

اکیلے میں جانوروں سے بھی باتیں کئے جاتی — بلی کو گود میں تھام کر کہتی —

"دیکھ تیری آنکھیں نیلی ہیں — تو چھوڑ کر نہ بھاگ جانا — بے وفائی نہیں کرنا — مگر نیلی آنکھوں والوں کا بھروسہ ہی کیا ہے —" اور وہ ہنسے جاتی — بے تحاشہ ہنسے جاتی

اب تک رجی بے ضرر پاگل تھی — وہ صرف اپنے آپ میں الجھی رہتی — مگر اب چند دنوں سے اس نے توڑ پھوڑ شروع کر دی تھی — کوئی بھی چیز اٹھا کر پھینک دیتی — شیشے کے برتن چکنا چور کر ڈالتی — جیدی اسے سمجھاتا تو وہ تیزی سے بولتی —

"تم میری بات کا جواب نہیں دیتے کمبخت — میں بات کرنے کو ترس گئی۔ میں نے بھی انتقام لے لیا۔"

اور وہ اونچے اونچے ہنسنے لگتی — ہنس ہنس کر گاتی —

اک تری اور اک مری آواز ہے
زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

رجی کے سنبھلنے کا کوئی امکان نہ رہا تو اس نے طے کر لیا کہ آپا کو اب مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا دینا چاہیے — اس نے بھاگ دوڑ کی مگر ہاسپٹل میں داخلہ ملنا بھی قیامت سے کم نہ تھا — کچھ اس کا ڈاکٹر ہونا کام آیا اور کچھ رسوخ سے کام لے کر اس نے بھاگم بھاگ کی۔ پولیس ڈاکٹر انچارج سے ملا اور رجی کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد انچارج ڈاکٹر نے اسے مطمئن کر دیا۔

لیڈی ڈاکٹر جیدی سے بہت خلوص سے ملی — اس نے رجی کی لگاتار لایعنی بکواس سنی اور پھر کہا۔

"مسٹر آپ مجھے پہلے اس کیس کی رپورٹ دے دیجئے — اس کے بغیر ہم آسانی سے مریض کو سنبھال نہیں سکتے —"

جیدی نے دکھ سے سر اٹھا کر لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا۔
"کیا آپ کے خاندان میں کوئی پہلے بھی پاگل ہوا تھا۔؟"
"جی نہیں ــــ" وہ آہستگی سے بولا۔
"پھر ان کے دماغ کو کوئی صدمہ ضرور پہونچا ہوگا ــــ" وہ پین سنبھالتی ہوئی بولی۔
جیدی رکا اور پھر ریکارڈ کی طرح بجتا چلا گیا ــــ لیڈی ڈاکٹر کا قلم بھی اسی تیزی سے چلتا گیا ــــ ایکدم وہ رک گئی۔
"مسٹر ــــ یہ کچھ ذاتی سا سوال ہو جاتا ہے۔ مگر میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے جو اس صدمے کی نوعیت بتائی ہے تو مس رضیہ پر کسی کا دباؤ تھا کہ شادی نہ کریں۔"
"جی ہاں ــــ اور بہت گہرا دباؤ تھا ــــ"
"صریح ظلم تھا ــــ کس نے روکا تھا انہیں ــــ؟"
"ان کے دل نے ــــ" جیدی آہستگی سے بولا ــــ "وہ بہت حساس ہے ڈاکٹر ــــ اس نے دوسروں کو سکھ دے کر جینا سیکھا تھا ــــ مگر برداشت کی بھی حد ہوتی ہے ــــ میں بھی آخر ایک ڈاکٹر ہوں ــــ دماغی نہ سہی مگر اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ پے در پے صدموں نے اسے نڈھال کر دیا ــــ جس دن اس کا دماغ چلا اس دن ایک بہت سنگین واقعہ رونما ہوا تھا ــــ"
"وہ کیا ــــ" ڈاکٹر دلچسپی سے بولی۔
"دیکھئے رجّی ابھی تیس کی بھی نہیں ہوئی ہے ــــ مگر صدموں نے اس کے بال جگہ جگہ سے سفید کر دیئے ہیں ــــ ہمیشہ سے جس طرح وہ سب سے ہنس کے پیش آتی رہی ہے اس کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس دل میں بھی کوئی آرزو کوئی ارمان پل سکتا ہے۔ وہ میرے بیٹے کی سالگرہ کا دن تھا، جب اپنے دوستوں کی ترغیب میں اس نے اپنی ممی سے پوچھا تھا کہ میری دادی کہاں ہیں ــــ اس کی ممی نے بے دھیانی میں رجّی کو دکھا کر کہا ــــ "وہ ہیں تیری گرنی"۔ اور اس وار نے اس کا دل کاٹ دیا ــــ وہ پیالہ جو بھر چکا تھا، مگر چھلکا نہیں تھا، اس دن چھلک پڑا ــــ مجھے اس کے پاگل ہو جانے پر قطعی تعجب نہیں ہے ڈاکٹر ــــ" اور جیدی چپ رہ گیا۔
"کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جس لڑکے سے وہ محبت کرتی تھیں آپ کسی نہ کسی طرح ان کی شادی کروا دیتے ــــ؟"
جیدی ایک ٹھائی پہلے تھا، ڈاکٹر بعد میں ــــ اس نے بے بسی سے سر اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا اور میز پر سر رکھ کر سسکنے لگا۔
جیدی چلنے لگا تو بالکل ایک عام آدمی بن کر، ایک عام انسان بن کر، جاہل بن کر پوچھنے لگا ــــ "ڈاکٹر

میری اپا کو یہاں کوئی تکلیف تو نہ ہوگی ــــ"

ڈاکٹر نے اس کا شانہ تھپ تھپا کر کہا ـــ "میں جانتی ہوں مسٹر ــــ آپ ایک ڈاکٹر بعد میں ہیں اور درد مند بھائی پہلے ــــ" وہ کچھ رکی اور بولی ـــ "بہتر ہوگا اگر آپ ہفتہ پندرہ دن میں صرف ایک بار آیا کریں ــــ ایسے ذہنی مریضوں پر ان کے پیاروں کی موجودگی اچھا اثر نہیں ڈالتی ــــ ہم ان کے مزید معائنوں کے بعد الکٹرک شاک جلد ہی شروع کر دیں گے ــــ"

جیدی بوجھل دل لئے آفس سے نکل آیا۔

ہفتہ بھر کے بعد جیدی ہاسپٹل پہونچا ــــ بے تابی سے وہ آفس میں گھسا۔

"میں آپا سے ملنا چاہتا ہوں ڈاکٹر ــــ کہاں ہیں وہ" ــــ وہ اندر لپکنے کو ہوا۔

"آپ یہیں بیٹھیے میں ابھی انہیں یہاں بلواتی ہوں ــــ اُدھر دوسری پاگل عورتیں بھی ہیں۔ کیا کیجئے گا آپ وہاں جاکر ــــ!"

تھوڑی دیر میں ایک نرس کے ساتھ رجی آتی دکھائی دی ــــ ہلکی سفید ساڑی ــــ بال بکھرے۔ پیلی پیلی رنگت ــــ ننگے پیر ــــ چھوٹے چھوٹے پاؤں اٹھاتی اپنے آپ میں گم۔

جیدی تڑاہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر ــــ کیسا آپ لوگوں کا انتظام ہے، ان کے پیر میں چپل تک نہیں ہے ــــ"

لیڈی ڈاکٹر پیار سے مسکرائی ــــ "ہم ان باتوں کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں مسٹر جاوید ــــ ابھی اور چند روز انہیں چپلیں نہیں مل سکتیں ــــ وہ چپلوں سے نرسوں کی، ڈاکٹروں کی تواضع شروع کر دیتی ہیں"

جیدی ــــ "اوہ" کہہ کر چپ رہ گیا۔

رجی آکر چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہوگئی ــــ ڈاکٹر نے حسب کہا۔

"رضیہ بی بی! ان سے ملئے ــــ آپ کے بھائی ہیں ــــ" تو وہ منہ پھیر کر بولی ــــ "میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ان سے کہہ دو یہاں سے چلے جائیں ــــ" اور وہ پھر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

"ڈاکٹر یہ اس قدر بے تحاشہ ہنستی کیوں ہیں ــــ" جیدی دکھ سے بولا۔

"جہاں تک ہم کیس کی ریڈنگ کر سکی ہوں، ان کی ہنسی کا صرف ایک واضح سبب ہے ــــ وہ زندگی بھر ہنسی کے لئے ترستی اور گھٹتی رہیں۔ اب وہ اپنے پرانے دنوں کا بدلہ لے رہی ہیں۔"

رجی نے کھڑے کھڑے گانا شروع کر دیا تھا ــــ بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔

"دیکھئے" ــــ لیڈی ڈاکٹر بولی ــــ "زندگی کی محرومیوں کا کتنا خوبصورت اظہار ہے!"

جیدی چپ چاپ سنتا رہا ——— ڈاکٹر بولی۔
"کل سے ہم نے بجلی کے شاک شروع کئے ہیں ——— اس سے یقیناً نتائج بہتر ہوں گے ———"
"رہنے کے لئے بیڈ وغیرہ کا معقول انتظام ہے یا نہیں ڈاکٹر ———" وہ بچوں کی طرح ایک ایک سوال کر رہا تھا۔
"آپ اطمینان رکھیں ———"
"اگر دیکھ بھال کے لئے میں خود رہ جاؤں تو ———؟"
"ڈاکٹر کو مریض اتنا ہی پیارا ہوتا ہے ———!" وہ اس کی پیٹھ تھپ تھپا کر بولی۔

جیدی تو اپنے حواسوں میں تھا نہیں ——— پتہ نہیں ستارہ یا شمو کس نے اظہر کو رجی کی بیماری کی اطلاع دے دی تھی ——— اظہر لندن سے واپسی پر دلی میں اپنے والد کا کاروبار سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ——— خط ملتے ہی وہ حیدر آباد دوڑا آیا ———
"ارے اظہر بھائی یہ آپ ہیں ———؟" شمو نے اس کے تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا ——— "کیا ہو گیا تھا آپ کو ——— اچھے تو رہے ———!"
"ہاں اچھے تو رہے ———" وہ بے رنگ لہجے میں بولا ——— "اچھے نہ ہوتے تو زندہ کیسے رہتے ——— بار بار پیاس کو تھوک رہنا اب اس کی کبھی نہ ٹوٹنے والی عادت ہو کر رہ گئی تھی۔

جیدی اور اظہر ابھی آفس ہی میں بیٹھے تھے ——— لیڈی ڈاکٹر کا غذوں پر جھکی ہوئی تھی ——— اظہر جلد سے جلد رجی کو دیکھ لینا چاہتا تھا ——— بڑی دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی ———
"آپ کو یہ سنکر خوشی ہو گی کہ اب وہ کچھ کچھ حواسوں میں آ چلی ہیں ———"
"سچ ———" جیدی خوشی سے اچک کر بولا۔
"جی ہاں" ——— لیڈی ڈاکٹر متانت سے بولی "مگر میں نے کچھ کچھ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے ——— یاد ہو گا جب وہ یہاں آئی تھیں تو کسی کو پہچانتی تک نہ تھیں۔ توڑ پھوڑ کرتی رہتی تھیں ——— پچھلی بار بھی آپ آئے تھے تو نفرت سے منہ پھیر لیا تھا انہوں نے ——— مگر کل پہلی بار پوچھا کہ میں کہاں ہوں ——— مجھے یہاں کیوں لائے ہیں ———"
"پھر آپ نے کیا جواب دیا ڈاکٹر ———" جیدی بے تابی سے بولا۔

"یہی کہا کہ آپ کی طبیعت کچھ خراب تھی — یہ ہاسپٹل ہے۔ کچھ دنوں بعد آپ چلی جائیں گی۔"

اطہر خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا — جیدی نے پوچھا۔

"ڈاکٹر وہ بالکل اچھی ہو جائیں گی نا —"

بہت دیر تک اسنے کوئی جواب ہی نہ دیا — پھر سر اٹھا کر جیدی کو دیکھا اور رک رک کر بولی —

اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے — ہم تو علاج پھر دوسرا ہی کر سکتے ہیں بس — سائنس نے اتنی ترقی ضرور کر لی ہے۔ مگر پھر بھی خدا کے وجود کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے —"

آج رجی نسبتاً بہتر حالت میں تھی — پوڈر میں سلیپر پہنے اور بالوں میں تیل بھی پڑا تھا — اور پہلے کی سی وحشت بھی اس کے چہرے پر نہ برس رہی تھی — مگر جیسے ہی اسے جیدی اور اس کے ساتھ اطہر کو دیکھا — گم سم سی رہ گئی۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی قریب آ گئی — اور قریب — اور قریب — پھر اطہر کے چہرے کو چھوا — اس کے ماتھے کو چھوا — اس کے بالوں کو سمیٹا۔ پیچھے گیا اور جیسے خواب میں بڑبڑائی۔

"یہ تو وہی ہے — وہ سے دیکھا ضرور ہے — مگر —" وہ دماغ پر زور ڈال ڈال کر سوچتی رہی — سوچتی رہی — پھر تھک سی گئی — اور منہ سے کر کے وہ ڈاکٹر کی طرف مڑی اور بولی۔

"کیا میں پاگل ہوں ڈاکٹر؟"

"کون کہتا ہے — وہ وہ پورے یقین اور وثوق سے ذرا مسکرا کر بولی — آپ تو بالکل اچھی ہیں —"

"ہاں وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ میں بالکل اچھی ہوں — میں پاگل نہیں ہوں۔ ورنہ میں ان لوگوں کو پہچانتی کیسے —! یہ وہی ہیں نا جنہوں نے میری زندگی میں زہر گھولا ہے — یہ وہی ہیں نا — وہ جوش میں آ کر پتہ نہیں اور کیا کیا کہتی کہ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس اسے لے کر چلی گئی۔

یہی وہ حیدرآباد کی سڑکیں اور شاہراہیں تھیں جن پر اطہر کئی بار جیدی کو، شمو اور رجی کے ساتھ گھوما تھا — وہ دھیرے دھیرے کار چلائے جاتا اور راہ چلتوں پر فقرے کسے جاتا — گو نو اور شمو ہنسی سے لوٹ پوٹ جاتے اور وہ کنکھیوں سے دیکھتا کہ رجی پر اس کا کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں — رجی کی ایک مسکراہٹ کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا — راستہ یونہی ہنستے بولتے کٹتا اور جب وہ گھر پہنچتے تو مارے ہنسی کے رجی کے گال تمتمائے رہتے۔

آج بھی وہی سڑکیں تھیں، کار کی وہی دھیمی رفتار — وہی ماحول وہی سب کچھ — مگر وہ دل

کہاں تھا — ؟ رم جھم موسیقی کی ہمراہی میں تھرکنے والے گورے گورے پیروں کی وہ چاپ کہاں تھی — ؟ جلتے جلتے ہونٹوں کے وہ چاند کہاں تھے — گرم گرم ہاتھوں کا وہ لمس کہاں تھا — ؟ نیلی آنکھوں کو بے رفت کہنے والے وہ ہونٹ کہاں تھے — ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن کر بھٹکتی ہوئی روح کی طرح دھیرے دھیرے گھومنے والی وہ روح کہاں تھی جو ہرگز خدا نہیں تھی مگر آسمان پر رہتی تھی — جو چاند نہیں تھی مگر چاند کی طرح چمکتی تھی — جو سورج نہیں تھی مگر سورج کی طرح جلتی تھی — یہ سب کچھ کہاں کھو گیا تھا — کہاں — کہاں — اے دل — اے دل !!

گھر پہونچنے کے بعد جیدی نے پہلی بار اظہر کو غور سے دیکھا — غموں کی زبان نہیں ہوتی۔ مگر کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جو بے زبان ہوتے بھی سب کچھ کہہ جاتے ہیں — جیدی کیا پوچھ سکتا تھا — !؟

"چچا جان کیسے ہیں — ؟" وہ ماحول کی بے حسی دور کرنے کچھ بھی پوچھ بیٹھا۔

"بہت خفا ہیں۔"

"کیوں —" جیدی حیرت سے بولا۔

"کہتے ہیں شادی کر لو۔ میری زندگی آج کل ہو رہی ہے — کون جانے کب مر جاؤں۔ اکلوتی اولاد کا سکھ تو دیکھ لوں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں —" وہ بے تسکین کر بولا۔

"اچھا — تم بھی یہی کہتے ہو —" اظہر طعن سے بولا۔

"انتظار اس چیز کا کیا جاتا ہے اظہر بھائی جو واپس آنے والی ہو — ایسی چیز کے انتظار کا فائدہ بھی کیا جس کی واپسی کی امید ہی نہ ہو — !"

"جاوید —" اظہر پوری طاقت سے چلایا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اظہر بھائی — آپا کے دماغ کو صدمہ پہونچا ہے وہ ایک دو دن کے عطا کردہ غم کا نتیجہ نہیں — برسوں کے دبے ہوئے غم نے ان کے صبر کو للکارا ہے — اچھے ہوتے ہوتے بھی انہیں سال بیت جائیں گے — ان کا انتظار فضول ہے —"

اظہر چپ چاپ سن رہا تھا۔

"آپا جیسی فطرت رکھتی ہیں اسے دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس حالت میں بھی اگر وہ آپ سے کوئی التجا کر سکتی تھیں تو بس یہی کہ اب میرا تو سب کچھ ختم ہو چکا ہے، اپنے ابو کی خواہش کا احترام ہی کر لیں — !"

"مگر دل — یہ دل کیسے مانے میرے دوست —" اظہر ہاتھ ملتے ہوئے بولا — کچھ یوں لگتا

ہے جیسے سینے میں ہر دم آگ سی لگی ہے ـــــ اب دنیا میں کوئی خوشی، کوئی سکھ باقی نہیں رہا ـــــ وہ رک کر دھیرے دھیرے بڑے غم سے بولا ـــــ "میں دل میں آرزو ہے وہ دل برباد ہے ـــــ برباد ہے ـــــ..."

اگلے ہفتے جب حیدری اور اظہر رجی سے ملنے ہاسپٹل پہونچے تو رجی انہیں دیکھ کر گم سم یا حواس باختہ نہ ہوئی ـــــ وہ لپک کر آئی اور اظہر کی ہتھیلی کو چھو کر بولی ـــــ "یہاں کبھی کوئی چاند طلوع ہوا تھا ـــــ یاد ہے نا؟ ـــــ" کوئی جواب نہ پا کر وہ اظہر سے لپٹ گئی ـــــ "دنیا میں بہت دکھ ہیں اظہر ـــــ بہت غم ہیں ـــــ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی ـــــ مجھے یہاں سے کہیں بھگا لے چلو ـــــ" اور وہ اظہر کی قمیض میں اپنا منہ چھپائے سسکتی رہی ـــــ

حیدری تھرا گیا ـــــ "آپا اب بھی اچھی نہ ہو سکیں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ وہ تو اظہر بھائی سے ہماری موجودگی میں بات بھی کھل کر نہ کرتی تھیں اور آج ـــــ آج انہوں نے . . . . نہیں ـــــ نہیں اب ان کا انتظار فضول ہے۔

حیدری نے ایک نانی اور اظہر کی شادی ہوگئی ـــــ رجی کی زندگی سے تو ساری خوشیاں ختم ہی تھیں ـــــ بھائی غم نہ تھا کہ اب اظہر کی زندگی کو بھی غموں کی پوٹ بنا دیا جاتا اور پھر چچا جان بے چارے نے کیا تصور کیا تھا کہ اکلوتی اولاد کا سکھ نہ دیکھنے ـــــ!

کتنے ہی بے رنگ و بو مہینے زقند بھر کر اڑ گئے۔

ایک دن رجی لیڈی ڈاکٹر سے بولی ـــــ "آپ نے مجھے یہاں کیوں ڈال رکھا ہے ـــــ میں تو بالکل اچھی ہوں ـــــ مجھے اپنے گھر کی بہت یاد آرہی ہے ـــــ"

ڈاکٹر کھل اٹھی ـــــ مریض اس حد پر پہونچ جائے ـــــ ایسا بہت کم ہوتا تھا مگر رجی نہ صرف سکون سے اپنے ماضی کو دہراتی تھی ـــــ بلکہ ڈاکٹر کو اپنا سچا ہمدرد پا کر اس سے اپنے دکھڑے بھی بیان کرتی تھی۔ ـــــ مگر عجیب بچوں کی سی معصومیت سے ـــــ اس کا ڈاکٹر کو مخاطب کرنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے زندگی کے سارے فیصلے ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھے۔

"کیوں ڈاکٹر ـــــ یہ سراسر میری زیادتی ہوتی نا اگر میں محض اپنے آرام، سکون، محبت اور جسمانی لطف کی خاطر اتنے سارے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر شادی کر لیتی ـــــ؟"

"بالکل بالکل —" ڈاکٹر اس کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

"میرا فیصلہ بہت اچھا تھا نا —" وہ معصومیت سے پوچھتی۔

"اس میں کیا شک ہو سکتا ہے —!"

"پھر بھی یہ لوگ مجھی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں —" وہ بھولپن سے بولتی۔

"زیادتی ہے ان لوگوں کی —"

"اچھا آپ کی رائے میں میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا تھا —"

"ایسے غلط کام کرنے والے کو تو میں دیوی کہوں گی — ہاں —" ڈاکٹر اسے خوش کرنے کو بولتی۔

"بس تو آپ کہتی ہیں تو یقیناً میں صحیح راستے پر تھی —"

اس دن تو رجی نے خود ہی گھر جانے کے بارے میں کہا — مگر ڈاکٹر نے کبھی کی رپورٹ دے دی تھی کہ وہ بالکل صحت مند ہو گئی ہے — دوا نہیں پیتی کسی کو اپنا کام نہیں کرنے دیتی — صاف کہتی میں خود اپنا کام کر سکتی ہوں — مجھے اپنا اچھا برا خود سمجھتی ہے۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے بعد جیدی رجی کو گھر لے آیا۔

اس دن جیدی، شمو اور ارلو کی خوشی قابل دید تھی — جیدی تو مارے خوشی کے ناچتا پھر رہا تھا۔ اس نے اس رات بہت زوردار پارٹی دی۔ سارے دوستوں اور ملاقاتیوں کو بلایا — رجی کے لئے اس نے خاص طور سے خود جا کر ایک بھاری سفید زریں ساڑی خریدی — ویسا ہی بلاؤز — سفید چپلیاں — اور جوڑے کے لئے سفید پھول —

رجی بھی بھرپور کی سی خوشی اور معصومیت کے ساتھ سب میں مل کر ہنستی بولتی رہی — سب اسے مبارکباد دیتے تو وہ بس اتنا ہی بولتی —

"ارے یونہی میری طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی — آپ اسے اتنا محسوس کیوں کر رہے ہیں"

رجی ماضی کی کئی باتیں یکسر بھول چکی تھی — بیٹھے بیٹھے وہ اچانک عجیب سوال کر دیتی۔

"یہ پھول یہاں کس نے لگائے ہیں — میں نے تو نہیں —!"

"ارے اپنے اس کمرے میں ایک گرا نون ہوا کرتا تھا نا جیدی — وہ کہاں رہ گیا —"

معقول جواب سے وہ مطمئن بھی ہو جاتی۔ ورنہ اس کا دماغ کھوج کئے ہی جاتا — ایک چیز جسے وہ آج تک نہ بھول پائی تھی وہ تھا آدھا چاند — جب کبھی چڑھتی راتوں میں آدھا چاند آسمان پر تیرتا وہ دیر تک نظریں گاڑے اسے دیکھتی رہتی اور پھر ہنس کر دل ہی دل میں مطمئن ہو جاتی —

وہ اب تک اظہر کو یاد کرتی تھی ۔۔۔ اس کے ماضی کا یہ دریچہ آج بھی کھلا تھا ۔۔۔ وہ اس دریچے میں جھانک کر دیکھتی تو بیتی باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگتیں ۔۔۔ وہ کسی سے مارے شرم کے پوچھ بھی سکتی تھی کہ اظہر کہاں ہے ۔۔۔ لندن سے آیا یا نہیں ۔۔۔ کئی بار اسنے خط لکھنے کے بارے میں سوچا ۔۔۔ مگر ایک انجانی سی شرم نے اس کے ہاتھ روک دیئے ۔

رات سے رتی بہت بے چین تھی ۔۔۔!

برسات کے ظلم ڈھانے والے دن تھے اور رنگ رنگانے والی راتیں ۔۔۔ اس رات پانی خوب برسا ۔۔۔ رتی تیز ہوا کے جھونکوں کی گستاخیوں سے پریشان ہوکر جاگ پڑی ۔۔۔ اور جاگتے ہی اسے کئی دنوں پہلے کی وہ رات یاد آگئی جب اسنے عملی طور پر اپنے پیار کا اظہار کیا تھا ۔۔۔ محبت جیسی بے زبان شئے کو زبان بخشی تھی ۔۔۔ وہ دھیرے سے اٹھی اور کمرے در کمرے ہوتی اسی کمرے میں آکر رک گئی جہاں آج سے سالوں پہلے اظہر کا پلنگ ہوا کرتا تھا ۔۔۔ رم جھم رم جھم کی دل آویز اور کیف زا سماں باندھنے والی وہ موسیقی آج بھی کانوں میں گونج رہی تھی ۔۔۔ پھول کچھ زیادہ ہی بے تابی سے مہک رہے تھے ۔۔۔ ہوا کے جھونکے اسی طرح شمالی دریچے سے ہو ہو کر کمرے میں طواف لگا رہے تھے ۔

"تم کہاں ہو ۔۔ کہاں ہو ۔۔۔ کہاں . . . . .

وہ بے تابی سے ادھر ادھر ٹہلتی پھری ۔۔۔ پھر دریچے میں آکر رک گئی ۔۔۔ ٹھنڈے شیشے سے گال لگائے وہ کتنی ہی دیر کھڑی رہی ۔۔۔ آج ماضی، حال بن گیا تھا ۔۔۔ برسات کے ننھے ننھے آبدار قطروں نے اس کے ذہن کی گرد دھو دی تھی اور وہ پوری طرح ہر ہر عکس کو صاف جھلکتے دیکھ سکتی تھی ۔۔۔ اسی ٹھنڈک میں بھی اس کے ہونٹ جلنے لگے ۔۔۔ کسی کی پیشانی پر محبت کا داغ چھوڑنے کے لئے ۔۔۔ اس کے ہاتھ مچلنے لگے ۔۔۔ کسی کے چہرے کو پیار سے چھونے کے لئے ۔۔۔ اور وہ خود کسی خزاں رسیدہ پتی کی طرح تھر تھر کانپے جا رہی تھی ۔۔۔ ملن کی چاہ آج تیز سے تیز تر ہوئی جا رہی تھی ۔۔۔ اسی رات کو وہ کمروں سے ہوتی ہوئی پرانے سامان والے کمرے میں پہونچی اور پھر وہ ٹھوڑی کو ہاتھ میں لئے بڑی محویت سے سن رہی تھی ۔

آیا بسنت سکھی برہا کا انت سکھی

پھر گیت کے بولوں کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹ بھی گنگنانے لگے ۔۔۔ برہا کا انت سکھی ۔۔۔ برہا کا انت سکھی . . . . .

دوسرے دن وہ حد سے زیادہ نڈھال تھی ـــــ پرانی یادوں نے آج اس کے زخموں کو کھرچ کھرچ کر رکھ دیا تھا ـــــ وہ باولی باوری سی جگہ جگہ پھرتی رہی ـــــ بار بار وہ گنگناتی۔

آیا بسنت سکھی برہا کا انت سکھی ـــــ

جیدی ہاسپٹل جانے کے لئے باہر نکلا تو دیکھا رجی باغ میں بیٹھی گنگنا رہی ہے۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا ـــــ آخر آپا اپنی دنیا میں لوٹ ہی آئیں۔

شام کو جیدی نے پکچر کا پروگرام بنایا تھا اور سب مل کر رات انجوائے کرنے جا رہے تھے ـــــ جیدی خوشی سے بولا۔

"بھئی یہ آپا بہت کام چور ہو گئی ہیں ـــــ آج چائے انہی سے بنوائی جائے گی ـــــ" وہ مسکرایا ـــــ

"کیوں آپا ـــــ؟"

"میں کوئی کام سے ڈرتی تھوڑی ہی ہوں ـــــ ساری زندگی ہی تم لوگوں کا کام کیا ہے ـــــ" اور وہ اپنا لبادہ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی ـــــ

جیدی بور ہو کر بولا ـــــ "آپا آپ نے پھر وہ اپنی شاہی پوشاک پہن لی ـ مجھے اس سے دکھ ہوتا ہے ـــــ"

رجی پیار سے ہنسی ـــــ رات کو اس نے کس ذہن میں، کس لمحے میں ساڑی اتار کر یہ لبادہ پہن لیا تھا۔ اب اسے خود حیرت ہو رہی تھی۔ یونہی ہنستی ہوئی بولی ـــــ "جیدی میرے عزیز ـــــ انسان کو چاہئے اپنے ماضی کو کبھی نہ بھولے ـــــ"

"ہاں مگر اس صورت میں کہ ماضی بھی ڈھنگ کا رہا ہو ـــــ"

"میرا ماضی تو بہت رنگین تھا ـــــ بہت خوبصورت جیدی ـــــ تو کیا جانے ـــــ" اور وہ کمرے کے وسط میں میز کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اکدم باہر سے جیدی کا چھوٹا بیٹا بھاگتا ہوا آیا۔

"ڈیڈی ـــــ ڈیڈی ـــــ اجل چچا آئے ہیں ـــــ"

"ایں ـــــ یہ بغیر اطلاع ہی کے چلے آئے اظہر بھائی ـــــ" جیدی کہتا ہوا اٹھا اور دوسرے ہی لمحے رجی نے دیکھا اظہر ایک عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا ـــــ برسات کے پہلے سورج کی مریض اور زرد کرنیں رجی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں ـــــ وہ چائے کی پیالی تھامے کھڑی تھی ـــــ ستارہ بولی۔

"آپا ـــــ اظہر بھائی کی دلہن سے ملئے نا ـــــ جب آپ کی طبیعت خراب تھی نا۔ تب اظہر بھائی کی شادی ہوئی تھی ـــــ" پھر وہ مڑی ـــــ

"آیئے اظہر بھائی — آیئے نا بھی . . .

پیالی فرش پر گر کر چکنا چور ہو چکی تھی — سورج کی زرد کرنوں نے یک لخت سارے کمرے کو اپنی زد میں لے لیا تھا — آج پھر وہی آگ جل اٹھی تھی — وہی بالکل وہی — لال لال زبانیں نکالے وہ شعلے بلندی بلند ہوتے جا رہے تھے — سائیں سائیں کرتے شعلے جیسے کوئی گیت سنا رہے تھے — آیا بسنت سکھی — آیا بسنت سکھی — آج برہا کا انت ہو گیا تھا۔

اب رجی، رجی نہ رہ گئی تھی — جس کا جسم کہیں تحلیل ہو چکا تھا اور سفید لبادے میں لپٹی کوئی روح باقی رہ گئی تھی — اسے اظہر بھی کسی آوارہ روح کی طرح اجڑا اجڑا نظر آ رہا تھا — وہ دھیرے دھیرے چلتی دریچے کے پاس جا پہنچی — اس کے ہونٹ کانپے اور وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولنے لگی — تم کو یاد ہے نا اظہر — آج سے سال بھر پہلے تم آئے تھے تو مجھ سے کہلوایا تھا — آپ کی اجل آئی ہے — وہ جیسے قبر کی گہرائیوں سے بول رہی تھی — اس نے ایک گہرا سانس لیا — اور اپنے نحیف ہاتھوں میں اپنا زرد چہرہ چھپا کر سسکنے لگی —!

اترتے سورج کی زرد شعاعیں کمرے میں ناچ ناچ کر بسنت کی آمد کے گیت گانے لگیں — اور رم جھم کی تال پر گیت کے بول شعلے بن بن کر لپکنے لگے۔

تبصرہ

پاکستان ٹیکسیشن سروس میگزین

صفحات :- ۳۳۳
(اردو اور انگریزی)
قیمت :- پانچ روپے
ناشر :- پاکستان ٹیکسیشن سروس ایسوسی ایشن۔ کراچی
نگران :- زیڈ۔ اے۔ زبیری
ادارہ :- نیک محمد قریشی۔ عبدالعزیز خالد اور جمیل جالبی۔

گزشتہ ایک سال میں کئی سرکاری محکموں نے اپنے اپنے رسالے شائع کئے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے محکمہ انکم ٹیکس کا رسالہ ہے جو آرٹ پیپر پر اردو اور انگریزی میں خوبصورت طباعت، نفیس گیٹ اپ اور لے آؤٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس وقت تک جتنے رسالے ہماری نظر سے گزرے ہیں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ظاہری اور معنوی لحاظ سے یہ رسالہ سب سے سبقت لے جاتا ہے۔ اس کے ہر صفحہ سے سلیقہ اور ادارہ کی خوش مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔

اس رسالہ کے مطالعہ سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ محکمہ انکم ٹیکس اپنی "حساب دانی اور حساب فہمی" کے باوجود ایسے لوگوں سے مرتب ہوا ہے جن کی ذہنی سطح اور ذہانت بلند معیار کی حامل ہے۔ اردو کے حصہ میں مضامین نثر بھی ہیں اور منظومات بھی۔ نثر کے مضامین میں سب سے پہلا مضمون جناب زیڈ اے زبیری کا ہے اور مضمون کا عنوان "لطیفوں کی اہمیت" ہے۔ اس مضمون کا خاص طور پر ہم اس لئے ذکر کر رہے ہیں کہ یہ مضمون ہر اعتبار سے ادب کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہے۔ انداز بیان ایسا شگفتہ کہ آدمی پڑھے اور مزا لے اور خیالات کی سطح اتنی بلند کہ آدمی سوچنے کی طرف مائل ہو۔ محمد شریف صاحب نے "جھنگ" کے عنوان سے شعری زبان میں خوبصورت نثر لکھی ہے۔ مقبول الٰہی صاحب کا مضمون "چھکڑ" ایک دلچسپ انشائیہ ہے۔ جس میں

انسانی چہروں کا ایک تیکھے انداز سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ انداز بیان شگفتہ اور لہجہ کا چہرہ جاذب نظر ہے۔ جمیل جالبی صاحب کا مضمون "شعور کی عینک" فکر کے اعتبار سے ایک نئی سطح کا پتہ دیتا ہے۔ ابلیس کی داستان کو جس انداز سے نئے سمبل کی شکل دی ہے وہ کیرک گارڈ کی "ابراہیم وسترہ" اور البرٹ کامیو کی "میتھ اوف سیسی فس" کی سی فکر انگیزی لئے ہوئے ہے۔ شعیب عباسی نے غالب کے لطیفوں کو بڑی خوبصورتی سے ایک رشتہ میں پرو کر ڈرامہ کا جامہ پہنایا ہے جس میں ایک طرف غالب کی شخصیت اور دوسری طرف اس دور کے لوگوں کی ذہنی اور سماجی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جناب اظہر حسن صدیقی نے "چوری" کے عنوان سے خود اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ذات پر دلچسپ پیرایہ میں طنز کیا ہے۔

حصہ نظم میں جناب عبدالرزاق فاضلی کی غزل خاصہ کی چیز ہے جس سے شاعر کی کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے۔ جناب نیک محمد قریشی کے قطعات نظم اور غزل میں جذبات و احساسات سچے موتی کی طرح چمک دے رہے ہیں۔ ان میں جاذبیت اثر بھی ہے اور اظہار کی خوش سلیقگی بھی۔ عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیل اپنے موضوع اور طرز بیان کے اعتبار سے ہمیشہ کی طرح ایک اچھی چیز ہے۔ اس نظم سے شاعر کی قدرت بیان اور وسعت فکر و احساس کا پتہ چلتا ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر اداریہ کی داد نہ دی جائے۔ دفتری زندگی پر جس فلسفیانہ انداز سے خوبصورت پیرایہ میں طنز کیا گیا ہے اور جس طور پر اپنے محکمہ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس سے ادارہ کی ذہنی صلاحیت اور انداز نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ انکم ٹیکس جیسے خشک اور غیر ادبیانہ محکمہ نے ایک ایسا خوبصورت رسالہ شائع کیا ہے جو اچھے سے اچھے عام ادبی و فنی پرچوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔

(ہم نے صرف اردو کے حصہ پر تبصرہ کیا ہے۔ انگریزی کے حصہ پر تبصرہ کرنا ہماری حدود سے باہر ہے)

—— ثنا اللہ

Yes, I use this white fragrant soap
Lily
CREAM TOILET SOAP
ZULFEQAR INDUSTRIES LTD
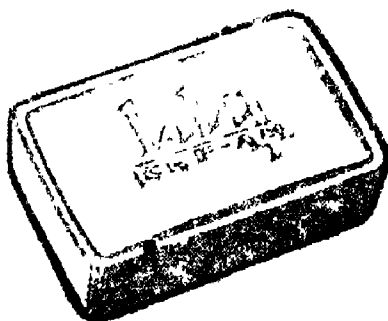
You have tried
the rest.
Now... try
the best...
BAWANY
PRINTS
in
Multi-colour
attractive
designs.
BAWANY
Violin Textile Mills Ltd.
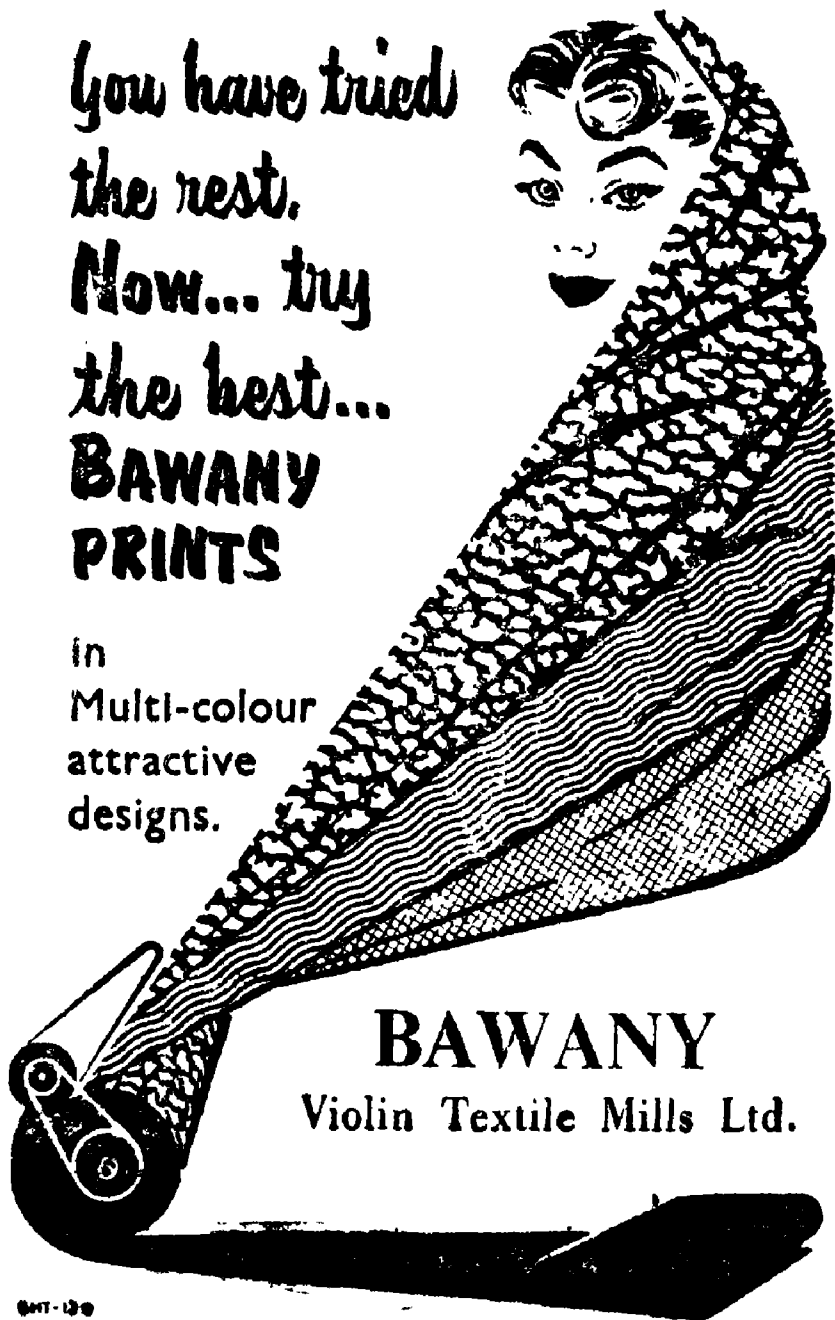
ترقیاتی
امور کے لئے آپکی
بچت
پاکستان کو درکار ہے
پنج سالہ ترقیاتی منصوبے کے تحت
آپ کی بچت سے ۱۲ کروڑ روپیہ
سالانہ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ
سیونگ بنک کھاتہ کھولیں۔ تو آپ
آسانی سے بچت کرسکتے ہیں۔ اپنا
کھاتہ ہماری کسی شاخ میں
کھول لیجئے۔
اپنی بچت
حبیب بنک لمیٹڈ میں جمع کیجئے